المنتقى

من

منهاج السنة النبوية

اردو

للإمام العلامة ابن تيمية رحمه الله

ادارۂ
احیاء السنۃ
[illegible] مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
فون ۰۴۲-۱۱۳۶۴۴

المُنتقیٰ

جزء

مِن

مِنْهاجِ السُّنّةِ النَّبويّةِ

للإمامِ العلّامةِ ابْنِ تيميةِ رحمہ اللہ

○

ادارۂ

احیاء السنہ گھرجاکھ

رحمان مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اُردو بازار لاہور

فون ۴۴ ۲۲۳۶ - ۴۲:

نام کتاب :- (۱) منہاج الاعتدال فی نقض کلام اہل الرفض والاعتزال

(۲) منہاج السنہ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ

تصنیف :- شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ ۶۶۱ - ۷۲۸ھ

تلخیص :- بنام المنتقی للحافظ ابوعبداللہ محمد بن عثمان الذہبی ۶۷۳ - ۷۴۸ھ

تحقیق و تعلیق :- علامہ محب الدین الخطیب زادہ اللہ عزاً وشرفاً وتوفیقاً

ترجمہ و تحشیہ :- پروفیسر غلام احمد حریری ؒ ایم۔ اے (عربی) ایم۔ اے (علوم اسلامیہ)

ایم۔ او۔ ایل (عربی) فاضل السنہ شرقیہ و درس نظامی۔ صدر شعبہ اسلامیات

اسلامیہ کالج۔ فیصل آباد

ناشر :- ادارہ "احیاء السنہ" مین روڈ گھرجاکھ گوجرانوالہ

طابع :- مولانا خالد بن مولانا نور حسین گھرجاکھی رحمتہ اللہ علیہ

صفحات :- ۲۰ x ۲۶ / ۸ = ۸۵۶ ۔ سفید کاغذ

قیمت :- مجلد دیدہ زیب = [illegible] روپے
300/-

فہرست مضامین کتاب منہاج السنۃ

مضمون | صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ
شیعہ کی دروغگوئی	۱۳۲
صفات باری میں اشاعرہ پر شیعہ کی بہتان طرازی	۱۳۴
فرقہ نصیریہ اور ان کے لغو عقائد (حاشیہ)	۱۴۴
شیعہ کے فرقے اور ان کے عقائد	۱۴۸
فلاسفہ کی تردید	۱۵۹
مشبہہ کون ہیں؟	۱۶۳
مسئلہ تقدیر	۱۷۹
مسئلہ تقدیر پر شیعہ مصنف کا اعتراض اور اس کا جواب	۱۸۷
روافض کی امام ابوحنیفہ پر دروغگوئی	۲۰۱
ارادہ و امر میں فرق و امتیاز	۲۱۰
فلاسفہ کی جہالت و ضلالت	۲۱۹
کیا رویت باری تعالیٰ ممکن ہے	۲۲۳
مسئلہ عصمت انبیاء	۲۲۸
مذاہب اربعہ پر شیعہ کا اعتراض	۲۳۲
آیت تطہیر	۲۴۶
مناقب اہل بیت کی موضوع روایات	۲۴۸
ان روایات کے جوابات	۲۵۷
انبیاء کی میراث	۲۸۳
مسئلہ فدک	۲۸۵
خلیفہ کی تعریف	۳۰۶
شیعہ کی تردید کہ قتل عثمان پر اجماع ہوا	۳۲۸
مناقب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (حاشیہ)	۳۳۷

مضمون	صفحہ
صحابہ پر مشاجرات کی وجہ سے کوئی فتویٰ نہیں لگ سکتا	۳۴۲
حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ سے دلیل	۳۴۴
بڑے آدمی کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں	۳۴۶
حضرت فاطمہ مظلوم نہ تھیں	۳۵۳
ازواج النبی امہات المومنین ہیں	۳۵۶
حضرت امیر معاویہ کاتب وحی تھے	۳۶۱
کیا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ باغی تھے؟	۳۶۴
حضرت معاویہ رضؓ پر اعتراضات	۳۶۸
مناقب ابوسفیان رضی اللہ عنہ (حاشیہ)	۳۷۰
حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ آزمائی کے باوجود معاویہؓ خارج از اسلام نہیں	۳۷۹
کیا حضرت معاویہ نے حضرت حسن کو زہر کھلایا تھا؟	۳۸۸
سیف اللہ کون تھا؟	۳۹۳
حضرت خالد کی اجتہادی غلطی	۳۹۵
بقول روافض اہل یمامہ مرتد نہ تھے	۳۹۹
لڑنے والے دونوں فریق مومن ہیں	۴۰۲
جنگ جمل وصفین کی شرعی حیثیت	۴۰۴
ابلیس فرشتوں سے زیادہ عبادتگذار نہ تھا	۴۰۶
یزید کے حق میں ابن الحنفیہ کی شہادت	۴۰۹
یزید میں اہلیت امارت (حاشیہ)	”
یزید کی ولیعہدی (حاشیہ)	۴۱۲
آیت الا المودۃ فی القربیٰ حسن وحسین کے بارے میں نازل نہیں ہوئی	۴۲۲
کیا یزید پر لعنت بھیجنا جائز ہے؟	۴۲۵

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

فصل رابع

فصل خامس

مضمون	صفحہ
اصحاب ثلاثہ کے بارے میں شیعہ کی دروغگوئی	۷۸۷
فصل سادس	۸۰۱
حضرت ابوبکر صدیق کی امامت وخلافت کے دلائل	؍؍
ایک یا دو شخصوں کی مخالفت خلافت کے لیے مضر نہیں	۸۰۶
احادیث نبویہ سے حضرت ابوبکر کی افضلیت کا اثبات	۸۱۶
امامت ابوبکر کے بارے میں رسول کریم کی پیشگوئی۔	۸۳۱
فہرست رسالہ صحابہ کا مثالی گروہ	
دنیا کا ایک مثالی گروہ اور ازمنہ قدیمہ میں مثالی گروہ کی تلاش	۸۳۳
چین اور مثالی گروہ۔ اور حکمائے یونان کی اس میں ناکامی	۸۳۴
مثالی گروہ اور حضرت مسیح علیہ السلام	۸۳۵
مثالی گروہ کے اسباب کمال	۸۳۶
بنی اسرائیل اور صحابہ کا موازنہ	۸۳۷
میدان حرب وضرب میں صحابہ کی شجاعت	۸۳۸
صحابہ کے اخلاق جلیلہ	۸۳۹
صحابہ کے حق میں ایک شیعہ عالم کی شہادت	۸۴۰
ظہور اسلام سے قبل عربوں کی خصوصیات	۸۴۲
بعثت نبوی کے لیے عربی قوم کا انتخاب	۸۴۴
صحابہ کے اوصاف خصوصی	؍
اقوام عالم میں اخلاق عالیہ کا فقدان	۸۴۵
فہرست مضامین	۸۴۹

تمت بالخیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ مترجم

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی اَمَّا بَعۡدُ

مشہور شیعہ عالم حسن بن یوسف بن علی بن المطہر الحلی (۶۴۸-۷۲۶ھ) نے جو نصیرالدین طوسی (۵۹۷-۶۷۲ھ) کا خصوصی شاگرد تھا۔ "منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب اہل سنت و شیعہ کے مابین متنازع مسائل و مباحث سے لبریز تھی یہ کتاب موضوعات کا پلندہ تھی اور اس میں سابقین اولین صحابہ کو جی بھر کر گالیاں دی گئی تھیں۔

اُمتِ مُسلمہ شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) کے عظیم احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے کتاب مذکور کے جواب میں "منہاج الاعتدال فی نقض کلام اہل الرفض والاعتزال" کے نام سے ایک کبیر الحجم کتاب لکھی جو لوگوں میں "منہاج السنۃ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ کتاب ۱۳۲۱ھ میں مطبع بولاق سے "منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ" کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

اس ضخیم کتاب سے استفادہ "کارے دارد" والی بات تھی۔ اس لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید مشہور محدث امام ابو عبد اللہ محمد بن عثمان ذہبیؒ (۶۷۳-۷۴۸ھ) نے اس کتاب کا ایک ملخص "المنتقیٰ" کے نام سے تیار کیا۔ المنتقیٰ کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا رہا کہ یہ مفقود ہے۔ پہلی مرتبہ حجاز کے نامور سلفی المشرب فاضل شیخ محمد نصیف کو دیار شام کی سیاحت کے دوران "المنتقیٰ" کا ایک مخطوطہ حلب کے مکتبہ عثمانیہ میں ملا۔ یوسف شافعی کا تحریر کردہ یہ ایک قدیم نسخہ تھا۔ کاتب رقمطراز ہے کہ وہ اس کی کتابت سے جمادی الاولیٰ ۸۲۴ھ میں یعنی امام ذہبی کی وفات کے ۷۶ سال بعد فارغ ہوا خلاصہ یہ کہ امام ذہبی کی مساعی سے ہم بسہولت منہاج السنۃ سے استفادہ کے قابل ہوئے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور امام ذہبی رحمہما اللہ کے بعد دیار شام کے نامور فاضل اور سلفی المشرب

عالم علامہ محب الدین الخطیب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے حد درجہ محنت و کاوش سے المنتقی کے مخطوطہ کو ایڈٹ کیا۔ منہاج السنۃ کے اصل نسخہ مطبوعہ بولاق کے ساتھ تقابل کر کے اسکی تصحیح کا اہتمام کیا اور اس پر فاضلانہ حواشی لکھے۔

کتاب کا موضوع اہلسنت و شیعہ کے باہمی متنازع مسائل ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ شیعہ مصنف ابن المطہر کی کتاب کی عبارت نقل کر کے اس کا ابطال کرتے ہیں۔ فریقین کے دلائل کی موجودگی میں ایک بانصاف اور سلیم العقل انسان کے لیے فیصلہ صادر کرنا کچھ مشکل نہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ شیعہ مصنف کی پیش کردہ احادیث جھوٹ کا پلندہ ہیں اور وہ اکثر موضوعات سے احتجاج کرنے کا خوگر ہے۔

اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ احادیث صحیحہ و سقیمہ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں اور یا یہ کہ روافض کا مایۂ استناد اسی قسم کی احادیث ہیں۔

جہاں تک ترجمانی کا تعلق ہے میری یہ مخلصانہ کوشش رہی کہ مصنف کا مطلب آسان سے آسان الفاظ میں واضح کر دوں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ کتاب کا ابتدائی حصہ دقیق و عویص علمی مباحث پر مشتمل ہے اور میں انتہائی جہد و سعی کے باوجود بھی اسے عام قارئین کے لیے قابل فہم نہ بنا سکا۔ کتاب کے کسی حصہ کو حذف کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ اس لئے عام قارئین سے صرف معذرت ہی کر سکتا ہوں میں اخی الکریم مولانا خالد بن مولانا نور حسین گھرجاکھی کا خلوص دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے عربی زبان و ادب کے ایک ادنی طالب علم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ایسے یگانہ فاضل کی گرانبہا اور دقیق علمی مباحث پر مشتمل کتاب کے ترجمہ کا اہل سمجھا اور کتاب کو بصرف زر کثیر بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔

میں کسی درجہ میں بھی اپنی ترجمانی کو حرف آخر تصور نہیں کرتا۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی اور کم سوادی کا پورا پورا احساس ہے میں بارگاہ ربانی میں دعاگو ہوں کہ جس اجر و ثواب کی امید پر میں نے یہ خدمت انجام دی ہے اسے میرے لیے مقدر فرمائے۔ میں بارگاہ خداوندی میں ملتجی ہوں کہ اس ناچیز خدمت کو میرے لئے میرے والدین و اساتذہ۔ مصنف۔ طابع و ناشر و کاتب اور قاری سب کے لیے اخروی فلاح و نجات کا سبب بنائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء)

خاکسار مترجم۔ غلام احمد حریری عفی عنہ پروفیسر و صدر شعبۂ اسلامیات اسلامیہ کالج فیصل آباد

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مقدمہ

(از علامہ محب الدین خطیب مصری زادہ اللہ عزاً و شرفاً)

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ‌ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا‌ ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى‌ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ"۔

یہ حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے طویل وقفہ کے بعد دین اسلام کا ظہور و شیوع تاریخ کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ دین اسلام کا مقصدِ وحید اقامت حق و صواب ہے خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے اتفاق ہو یا اختلاف معاملات ہوں یا احکام، علمی مباحث ہوں یا تنظیمی امور یا انسانی بہبود کے سلسلہ میں تعاون و اشتراک ان جملہ امور میں حق و انصاف کی جو شعاع نظر آئے گی وہ شمع اسلام ہی کی ضیا پاشیوں کا نتیجہ ہو گی۔ تاریخ ادیان میں دین اسلام کی عظمت و شرافت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دین حق کے لقب سے نوازا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ" (سورہ توبہ۔ ۳۳۔ الفتح۔ ۲۸)

دین اسلام مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ جادۂ عدل و انصاف پر قائم رہیں اپنے علم کی حد تک انصاف کی شہادت دیں اور نہ صرف دارالاسلام بلکہ جملہ اکناف ارضی میں عدل و انصاف کا بول بالا کریں اور اس کے لیے مصروف جہد و سعی رہیں اور اس میں کد و کاوش کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں۔ اگرچہ قیام عدل و انصاف سے بذات خود انھیں یا ان کے آباد و ابناء کو نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ حق و عدل کا قیام و بقاء اور شہادتِ حق اسلام کی اساس اوّلین اور اس کا امتیازی شعار ہے۔ بنا بریں اہل اسلام پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ بطیب خاطر و طہارت فکر و نظر۔ رضائے الٰہی اور مخلوقات خداوندی کے سکون و اطمینان کے پیش نظر عدل و انصاف میں ممتاز ہوں۔ نظام اسلام میں عدل تقوی میں شمار

ہوتا ہے اور تقویٰ ہی وہ بہترین وصف ہے جو مسلمانوں کے مابین معیارِ عزّ و شرف ہے
ذات باری تعالےٰ بخوبی آگاہ کہ کون تقویٰ سے بہرہ ور ہے اور کون اس سے تہی دامن ہے
اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔

دین اسلام کی یہی وہ حسین و جمیل صورت تھی جس کے لیے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو تیار کیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ بنی نوع انسان کو دعوت
دینے میں آپ کے جانشین قرار پائیں۔ چنانچہ آقائے دو جہاں صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی
سے متصل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں دارِ فانی کو خیرباد کہہ کر جب "الرفیق الاعلےٰ"
سے ملاقات کی تو آپ بے حد مسرور و مطمئن تھے۔ آپ کے برگزیدہ و منتخب صحابہ تحفظ دین
کے لیے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑے تھے۔ یہ اصحاب کرام خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں اپنے نفوس و قلوب کو خدا کی طاعت و عبادت میں جھکائے رکھتے۔
یاد رہے یہ وہی ابوبکر ہیں جن کی شان میں ——— نیز ان کے محب مخلص عمر فاروق رضؓ کے
متعلق ——— ان کے بھائی حضرت علی نے کوفہ کے منبر پہ خطبہ دیتے ہوئے یہ کلمات
ارشاد فرمائے تھے۔

"خَیْرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِیِّهَا اَبُوْبَکْرٍ ثُمَّ عُمَرُ"

(نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے بہتر ابوبکرؓ ہیں اور انکے بعد عمرؓ)

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد صحابۂ کرام نے جزیرۂ
عرب میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی اور جہاد کے لیے اسی طرح صف آرا ہوئے جیسے وہ
آنحضور کے حین حیات نماز کے لیے صفیں باندھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ
عنہ کی فوجیں رسالتِ محمدی کی امانت اٹھائے عازم عراق و شام ہوئیں اور قریبی اقوام تک
پہنچ کر دم لیا۔ ان کے مخلصانہ جہاد کا نتیجہ یہ تھا کہ تائید ربانی نے ان کا ساتھ دیا اور جن علاقوں
میں خلیفۂ اول کے سپہ سالاروں کے جھنڈے لہرا رہے تھے وہاں "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" کی صدائیں
گونجنے لگیں۔ عہد صدیقی کے نامور سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ۔ خالد بن ولید۔ عمرو بن العاص
اور یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم تھے۔ جن قوموں سے بھی ان کا واسطہ پڑا۔ یہ ان کے حق میں

اسلام کے علم و داعی اور اللہ و رسول کے پیام رساں ثابت ہوئے۔ ان کی مخلصانہ دعوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دیار و امصار میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ شہروں کے دروازے ان کے لیے کھل گئے اور وہاں کے رہنے والوں نے ان کی تعلیمات و ارشادات کو لبیک کہا۔ وادیٔ دجلہ و فرات اور دیار شام میں جب خداوندی نصرت و تائید سے حضرت ابو بکر ہر طرح مسرور و مطمئن ہو گئے تو خداوند کریم نے انھیں عالم آخرت میں صحبت نبوی کے لیے پسند فرما کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایسی معیت بخشی جیسا کہ دنیا میں وہ اس سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کے بعد کشتیٔ اسلام کے ناخدا قرار پائے اور جیسا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے آپ حضرت ابو بکر کے بعد امت محمدی کے افضل ترین فرد تھے۔

کاروانِ اسلام خدا کی نصرت و حفاظت میں رواں دواں رہا۔ چنانچہ دعوت محمدی کی علم بردار فوجیں ایک طرف سے وادیٔ نیل اور وہاں سے شمالی افریقہ پہنچیں اور دوسری جانب ایران کی آخری سرحد تک پہنچ کر دم لیا۔ جب حضرت فاروق نے یہود و مجوس کی دسیسہ کاریوں سے جام شہادت نوش فرمایا اور اللہ تعالے نے ان کے لیے دو قدیم رفقا کی رفاقت آسان کر دی تو مسلمانوں نے خلافت کے لیے ایک پاکیزہ خصال، رحمدل، حافظِ قرآن، سخی اور حوادث روزگار پر صبر کرنے والی شخصیت کو پسند کیا —— وہ تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ —— آپ نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں سے یکے بعد دیگرے عقد نکاح باندھا۔ اور اگر آپ کی تیسری بیٹی ہوتی تو بھی آپ حضرت عثمان کو دوسروں پر ترجیح دیتے۔ حضرت عثمان آنحضور کے چیدہ و برگزیدہ اصحاب کے مخلص بھائی اور ان کے بیٹوں کے شفیق باپ تھے۔ تابعین کبار میں سے حسن بصری اور ان کے معاصر ابن سیرین کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں امت ہر طرح خوشحال تھی اور ہر طرف امارت و ثروت کا دور دورہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بہادر مجاہدین نے اسلامی جھنڈوں کو سرزمین قفقاز میں جا لہرایا جب کہ کسریٰ کے سپہ سالار وہاں پہنچنے کی امید بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بہرکیف مشرقی اور مغربی اقوام نے صحابہ کی سیرت وکردار ان کے عدل وانصاف رفق وتدبّر اور راہ حق پر استقامت واستقلال سے اسلام کا سبق سیکھا اور اسی سے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کی تصدیق ہوئی ارشاد ہوتا ہے۔

"خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ"

(سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں (تابعین) پھر وہ جو ان کے قریب ہیں (تبع تابعین)

امام ربانی احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یہ روایت ۳۵۹۴ نمبر کے تحت بروایت عبیدہ سلمانی قاضی کوفہ نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔

امام محمد بن اسمعیل بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب نمبر ۶۲ باب اول میں یہ روایت حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔ عمران فتح مکہ کے دن عسکر نبوی میں قبیلہ خزاعہ کے علمبردار تھے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے۔

مذکورہ صدر حدیث نبوی آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے اسلام کو جو عزت وعظمت اور استقامت دور صحابہ۔ تابعین وتبع تابعین میں حاصل ہوئی آئندہ ادوار میں نصیب نہ ہو سکی۔ اموی خلافت پر اس مبارک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ بنو عباس کے وہ اولین خلفاء جنہوں نے اموی ماحول میں تربیت پائی تھی اسی عہد میں شامل ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ تبع تابعین میں سے آخری شخص جس کا قول مقبول ہے وہ ہے جو سنہ ۲۲۰ھ تک بقید حیات رہا۔ اس کے بعد بدعات کا دور دورہ ہوا اور حالات بڑی حد تک بدل گئے"۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۴)

اسی مبارک زمانہ کو خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم نے "خیر القرون" سے تعبیر فرمایا تھا۔ جو آپ کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔ یہ اسلام کا زرّیں دور تھا۔ دین اسلام نے اس سے بڑھ کر نہ کبھی خیر وبرکت کا مشاہدہ کیا نہ اہل اسلام نے اس سے بڑھ کر کبھی عزّ وشرف حاصل کیا نہ اس دور سے بہتر کبھی جہاد خالص دیکھا گیا نہ کرۂ ارضی کے دور افتادہ گوشوں تک کبھی

دعوت اسلام اس وسعت کے ساتھ پہنچی۔ اسی عصر و عہد میں حفاظ قرآن نے اکناف ارضی تک پہنچ کر لوگوں کو قرآن سے روشناس کرایا۔ نوجوان تابعین مختلف دیار و امصار میں پہنچ کر وہاں کے رہنے والے صحابہ سے حدیث نبوی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مبادا صحابی کی موت سے وہ احادیث بھی ناپید ہو جائیں جو ان کے سینہ میں محفوظ ہیں۔ پھر تبع تابعین کا زمانہ آیا۔ وہ ہر ایسے خطۂ ارضی میں پہنچے جہاں تابعین کیار اقامت گزین تھے اور ان سے وہ امانت حاصل کی جو انھوں نے صحابہ کرام سے سن کر یاد کر رکھی تھی علیٰ ہٰذا القیاس سنت نبوی کی یہ امانت ان لوگوں تک پہنچی جنھوں نے اس کی جمع و تدوین کا بیڑا اٹھایا۔ مثلاً امام مالکؒ امام احمدؒ اور ان کے شیوخ و تلامذہ اور معاصرین۔ رجال تدوین کے یہاں پہنچتے وقت حدیث نبوی بالکل تر و تازہ اور عطر نبوت سے بھرپور تھی۔ حدیث نبوی کے امانت دار محافظین نے جوں کی توں یہ امانت دوسرے امانتدار محافظین تک پہنچا دی آگے چل کر یہ امانت کتاب اللہ کے بعد مسلمانوں کے لیے نہایت گراں قدر ورثہ قرار پائی

خلاصۂ کلام! صحابہ کے طفیل اللہ تعالےٰ نے حدیث نبوی کا لازوال خزینہ ہمارے لیے محفوظ کر لیا۔ ان کی تلواروں سے یہ دیار و امصار و بلاد فتح کیے ان کی مساعی جمیلہ سے اسلامی دعوت پھلی پھولی۔ اور آج ہمارے لیے یہ عالم اسلامی منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوا جس میں کثرت سے اوطان و اقوام موجود ہیں اور ان علوم و علماء کی بھی کمی نہیں جو اسلام کے اولین ادوار میں کرۂ ارضی کی زینت اور بے حد ناگزیر سمجھے جاتے تھے۔ زمانہ حال و استقبال میں علماء کی صلاحیت اور رجوع الی اللہ کے باعث اسلام کی شوکت رفتہ پھر لوٹ کر آئے گی۔ اور انھی کی جد و جہد کے بل بوتے پر اسلامی نظام کو حیات نو حاصل ہو گی۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

جس طرح امرا اور اہل ثروت کے بیٹے اپنے آباء سے املاک و اموال ورثہ میں پا کر دنیا میں عزت و منصب حاصل کرتے ہیں ـــ یہ دوسری بات ہے کہ برے ساتھی ان کو اس وہم میں مبتلا کر دیں کہ ان کی خوشحالی و فارغ البالی کا راز اس مال کو برباد کرنے میں مضمر ہے۔ اسی طرح ہم نے یہ اسلامی عزو مجد صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم سے ورثہ

میں پائی۔

ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسا گراں بہا درثہ نہیں پایا۔ اسلامی ورثہ میں تقدس و برکت کے اعتبار سے گراں تر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی وہ خدمت ہے جو آپ نے قرآن کی جمع و تدوین اور اس کو مصاحف میں محفوظ کرنے کے سلسلہ میں انجام دی۔

اگر کرۂ ارضی پر رہنے والے تمام مسلمان اس عظیم احسان و عنایت پر شب و روز ان کے لیے اجر و ثواب کی دعائیں مانگیں تو بھی وہ ان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالے ہماری جانب سے ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

اس عظیم میراث میں سے گراں قدر خزانہ ہر صحابی کی وہ توجہ ہے جو انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ارشادات، سیرت و کردار اور اوامر و نواہی کے تحفظ کے سلسلہ میں انجام دی۔ صحابہ نے یہ امانت جوں کی توں اپنے بھائیوں بیٹوں اور تابعین کو سپرد کر دی۔ کسی نبی کے اصحاب نے امانت کی سپردگی میں ایسی احتیاط سے کام نہ لیا ہوگا۔

اس سے عیاں ہے کہ اخلاق و تشریع، اقوام و امم کی تکوین و تخلیق اور مختلف انسانی طبقات اور اجناس و اوطان میں یگانگت پیدا کرنے کے لیے یہ عظیم ترین انسانی وراثت تھی بنی نوع انسان کی ان خدمات جلیلہ کے پیش نظر صرف وہی شخص صحابہ کی تنقیص شان کا مرتکب ہو سکتا ہے جو غیر مسلم ہو اور دوسروں کو دھوکہ دینا چاہتا ہو یا زندیق ہو اور اس کے ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہو۔

صحابہ کرام سے تکسیر اورثہ ہم نے یہ پایا کہ انہوں نے اپنے اسلامی اخلاق و اعمال کو اسلام کا نمایندہ بنا کر اقوام عالم کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کو الفت و محبت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ صحابہ اسلام کا بہترین عملی نمونہ قرار پائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کے زمانہ میں اقصائے ارضی میں بسنے والی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں۔

خلفاء راشدین کے زریں عہد کے بعد جن خوش نصیب صحابہ و تابعین نے صحیحین کی جابر بن سمرہ سے بیان کردہ روایت کے مصداق خلفاء قریش کے جھنڈے تلے جہاد کیا۔ وہ بھی اس فضیلت میں برابر کے شریک ہیں۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قباء میں حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ کے جہاد سے متعلق جو خواب دیکھا تھا وہ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے آپ کا دوسرا خواب یزید بن معاویہ کے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے سے متعلق تھا۔ صحیحین کی حضرت جابر بن سمرہ سے روایت کردہ حدیث میں قریش کے جن عظیم اشخاص کا ذکر پایا جاتا ہے وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے جہاد میں شرکت کی اور اسلامی دعوت کو برّ اعظم ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے دور افتادہ گوشوں تک پہنچا دیا۔ ہمارے قلوب ان کی سپاس گذاری میں کتنے ہی مشغول رہیں ہماری زبانیں ان کی مجاہدانہ مساعی کی مدح و ثنا میں کتنی ہی رطب اللسان ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم ان کے شکر واجب کا عشر عشیر بھی ادا نہیں کر سکتے۔

اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ صحابہ کی عظمت و مجد اور ان کی جرأت و بسالت کے اثبات میں ہم نے صحیح معلومات پر مبنی جو علمی مقالات لکھے ہیں ان سے صحابہ کی مدح و ثنا کا حق کیونکر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دور حاضر کی تصنیفات سے صحابہ کی مدح گوئی کیونکر ممکن ہے اگرچہ یہ تصانیف صحابہ کے مناقب و فضائل سے پر ہیں اور ان کتب کا اقصائے ارضی کے نوجوانوں تک پہنچنا ناگزیر ہے۔

ان کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری ان غزوات میں بذات خود شریک ہے۔ وہ اسلامی فوج کا ایک فرد ہے اور اسلامی جھنڈے تلے کفار کے خلاف نبرد آزما ہے قاری اس تصور میں کھو جاتا ہے کہ صحابہ و تابعین کے ہاتھوں جو فتوحات حاصل ہوئیں اور اہل اسلام نے ان دنوں جو معرکے سر کئے وہ اپنے جذبات، احساسات اور دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ان میں شامل ہے اور جہاد میں بھرپور حصہ لے رہا ہے۔

منہاج الکرامہ گالیوں کا پلندہ

یہی وہ صحابہ و تابعین تھے جن کے بارے میں "ابن المطہر" نامی .... نے "منہاج الکرامہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب گالیوں کا پلندہ ہے۔ جس میں صحابہ کی مجاہدانہ مساعی کی مذمت کر کے ان کے محاسن کو معائب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ہجو و قدح کا کوئی دقیقہ

فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ اس کی حد یہ ہے کہ اگر اعداء دین مثلاً مجوس۔ رومی۔ ترک اور دیالمہ میدان حرب وقتال میں جب وہ صحابہ کے خلاف برسرپیکار تھے اگر ان کے اخلاق واعمال کی تصویر کشی کرنا چاہتے تو اس شرمناک طریق کار سے اجتناب کرتے۔

جب مسلمان ہسپانیہ میں برسر اقتدار تھے تو وہاں کے پادری امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف شیعہ کے اس قول سے احتجاج کیا کرتے تھے کہ قرآن محرّف ہو چکا ہے ان کی تردید میں امام موصوف مجبوراً فرماتے۔

"وَاَمَّا قَوْلُهُمْ فِي دَعْوَى الرَّوَافِضِ بِتَبْدِيْلِ الْقُرْاٰنِ فَاِنَّ الرَّوَافِضَ لَيْسُوْا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" (کتاب الفصل ج ۲ ص ۷۸)

غالباً پادری کافی کلینی سے بیان کردہ جھوٹی روایات سے احتجاج کیا کرتے تھے۔ مثلاً کافی کلینی کی مذکورہ ذیل روایات۔

کافی کلینی کی موضوع روایات

(۱) جابر جعفی سے روایت ہے کہا میں نے ابوجعفرؒ سے سنا فرماتے تھے کہ جھوٹے آدمی کے سوا کوئی شخص یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ قرآن کریم اسی طرح جمع کیا گیا ہے جیسے کہ نازل ہوا تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور بعد میں آنے والے ائمہ کے سوا کسی نے قرآن کو یاد کیا اور نہ جمع کیا"۔ (کافی کلینی طبع ۱۲۷۸ھ ص ۵۴)

(۲) "ابوبصیر روایت کرتے ہیں کہ میں ابوعبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا۔ ہمارے یہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قرآن موجود ہے"۔ میں نے عرض کیا مصحف فاطمہ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا۔ وہ تمہارے قرآن سے تین گنا زائد ہے۔ بخدا اس میں تمہارے قرآن کا ایک لفظ بھی موجود نہیں"۔ (کافی کلینی ص ۵۷)

کافی کلینی شیعہ کے یہاں اسی طرح مستند سمجھی جاتی ہے جس طرح مسلمانوں کے نزدیک کتب حدیث میں صحیح بخاری حالانکہ وہ ایسی کفریات سے لبریز ہے۔ "ابن المطہر" جس کی تردید کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے یہ کتاب تحریر فرمائی۔ شیعہ کی کتاب روضات الجنات میں طرح طرح کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ مثلاً اسے فخر علماء۔ مرکز دائرہ اسلام۔ آیۃ اللہ

فی العالمین ۔ استاذ الخلائق ۔جمال الملۃ و الدین وغیرہ القاب سے ملقب کیا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ابن المطہر کی "منہاج الکرامہ" اور اس کے معاصر امام ابن تیمیہؒ کی گراں قدر تصنیف "منہاج الاعتدال" یا "منہاج السنۃ" کی تسوید و تحریر کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کو شیعہ بنایا جائے یا شیعہ کو اسلام کی جانب لوٹایا جائے اس لیے کہ یہ امر "این خیال است محال ست وجنون" کا مصداق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مذاہب کے اصول اساسی ایکدوسرے سے یکسر مختلف ہیں اور دونوں میں گہرا فرق و اختلاف پایا جاتا ہے چند اصول ملاحظہ فرمائیے۔

اہل اسلام و شیعہ کا اساسی فرق و امتیاز مصدر شریعت کے لحاظ سے

اہل اسلام کے نزدیک شارع اور معصوم صرف آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے آپ کے بعد نہ کوئی شارع ہے نہ معصوم بخلاف ازیں شیعہ بارہ اماموں کو معصوم اور مصدر شریعت قرار دیتے ہیں۔

امام غائب کی وضعی حکایت

اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ شیعہ کے ائمہ معصومین میں سے گیارہواں امام لاولد فوت ہوا اور ان کے بھائی جعفر نے اسی اساس پر ان کا ورثہ تقسیم کیا کہ آپ لاولد ہیں۔ مزید براں ان کی بیویوں اور لونڈیوں کو عدت وفات اور عدت استبراء گذارنے کے لیے روکے رکھا یہانتک کہ جعفر اور بنی طالب کے نقباء پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ امام حسن عسکری بے اولاد تھے۔

ان تاریخی حقائق کے علی الرغم شیعہ یہ رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ امام حسن عسکری کا ایک لڑکا تھا اور آج سے گیارہ صدیاں پہلے وہ اپنے والد کے گھر کے تہ خانہ میں چھپ گیا تھا۔ بقول شیعہ وہ تا حال بقید حیات ہے اور مسلمانوں کا شرعی حاکم ہے۔ شیعہ کی رائے میں ان کے سوا کرۂ ارضی پر جو مسلمان حاکم ہے وہ ظالم و غاصب ہے اور ناحق مسلمانوں پر حکومت و سلطنت کا دعوے کرتا ہے۔ شیعہ اس سے تجاوز کر کے یہاں تک کہتے ہیں کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جتنے مسلم حاکم یا امام یا خلیفہ قرار پائے وہ ظالم

وغاصب اور غیر شرعی حاکم تھے۔ شیعہ کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ان کا بارہواں بن باپ و بن اولاد امام کسی نہ کسی وقت ظہور پذیر ہوگا۔ اس کے زمانہ میں حضرت ابوبکر وعمر اور دیگر مسلم خلفاء و حکام دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ امام مذکور ان پر حکمرانی کرے گا اور جس ظلم وغصب کا ارتکاب وہ کر چکے ہیں (نعوذ باللہ من ذلک) اس کی سزا دے گا۔

قرآن کی جمع و تدوین اور صحابہ کرام

دین اسلام اور شیعہ مذہب کے مابین ایک اساسی فرق اور ہے۔ اہل اسلام کے ہاتھوں میں جو قرآن صدیوں سے چلا آرہا ہے اس کی جمع و تدوین کا بیڑا حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ اور دیگر اہل علم صحابہ نے اٹھایا۔ مزید براں جن احادیث نبویہ پر تشریع اسلامی کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ بھی صحابہ کی روایت کردہ ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان خدمات جلیلہ کے ادا کرنے میں حضرات صحابہ کے رفیق کار تھے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ کمال صدق اور استقامت علی الحق کے اعتبار سے وہ ایک مثالی گروہ تھا۔ جس کی نظیر دنیائے انسانیت میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ کتاب ہذا کی آخری فصل میں اس کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں گے۔

ہم قبل ازیں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث صحیح بیان کر چکے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے

"تمام زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں پھر وہ جو انکے قریب ہیں"

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن صحابہ سے سیکھا وہ صحابہ ہی تھے جنہوں نے آنحضور کی احادیث صحیحہ روایت کیں جن پر بیان شریعت کے ضمن میں ہمارا اعتماد ہے جب مذکورہ حدیث کی روشنی میں صحابہ افضل الامت ہیں اور جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے منبر پہ فرمایا حضرت ابوبکر و عمر افضل الصحابہ ہیں اس سے ظاہر ہے کہ صحابہ کے بارے میں اہل اسلام کا عقیدہ مذکورہ صدر حدیث اور حضرت علیؓ کے ارشاد کے عین مطابق ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی حقائق بھی اس کے موید و مصدق ہیں۔ چونکہ ہم نے علوم کتاب وسنت کو صحابہ کرام کے ذریعہ حاصل کیا ہے لہذا صحابہ کی مدح و تعدیل سے گویا ہمارے اعتماد کتاب وسنت کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ ابن المطہر

اور دیگر شیعہ امامیہ ہیں۔ ـــــ جن کو امام زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ رافضی کہہ کر پکارتے ہیں ـــــ کا زاویۂ نگاہ اس ضمن میں ہم سے مختلف ہے چنانچہ اس کی تفصیل مناسب موقع پہ آئے گی۔

حدیث نبوی اور شیعہ

جو اصول و قواعد ہمارے اور شیعہ کے مابین وجہ فرق و امتیاز ہیں ان میں سے ایک اساسی امر یہ ہے کہ احادیث نبویہ کتاب الٰہی کے بعد تشریع اسلامی کا مدار و معیار ہیں یہ احادیث ان صحابہ کے ذریعہ ہم تک پہنچیں جو حد درجہ عادل و امین اور حافظ و ضابط تھے۔ فن حدیث کے نقاد ان کی سیرت و کردار اور فنی مہارت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ محدثین نے روایت حدیث میں بے حد احتیاط سے کام لیا جو شخص حد درجہ عبادت گذار اور صلاح و تقویٰ میں یگانۂ روزگار ہو اگر روایت حدیث میں سہل انگاری سے کام لیتا ہوں تو اس کی روایت محدثین کے نزدیک ساقط عن الاحتجاج ہے جو شخص آغاز زندگی میں حافظ و ضابط اور امانت و عدالت کی صفات سے بہرہ ور ہو پھر بڑا ہو کر نسیان کے عارضہ کا شکار ہو جائے تو اندریں صورت محدثین کے نزدیک اس کی وہ روایات مقبول ہیں جو اس نے حالت صحت میں اس مرض میں مبتلا ہونے سے قبل روایت کیں ۔ مرض میں مبتلا ہونے کے بعد کی روایات پایۂ استناد سے ساقط ہیں۔

بخلاف ازیں شیعہ روایت حدیث میں امانت و عدالت اور حفظ و اتقان کی چنداں پرواہ نہیں کرتے۔ شیعہ کی معتبر کتب مثلاً کافی کلینی اور دیگر کتب میں حد درجہ دروغ گو لوگوں کی روایات درج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ کے یہاں ثقاہت و صداقت کا معیار یہ امر ہے کہ راوی کس حد تک شیعہ مذہب کا حامی اہلبیت کا محب اور ان کے اعداء سے کہاں تک بغض و عناد رکھتا ہے۔ ہم قبل ازیں ان کی معتبر کتاب الکافی سے چند روایات نقل کر چکے ہیں۔ جن میں انہوں نے قرآن کی صحت کو مشتبہ قرار دیا ہے۔ بنا بریں اس میں مزید جدل و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہسپانیہ کے پادریوں نے امام ابن حزم کے خلاف شیعہ کے قول سے احتجاج کرتے ہوئے ثابت کیا کہ قرآن کریم کی موجودہ صورت اصلی نہیں ہے اور وہ محرف ہو چکا ہے تو انہوں نے برملا فرمایا۔

اِنَّ الرَّوَافِضَ لَیْسُوْا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (روافض (شیعہ) مسلمانوں میں سے نہیں ہیں)

احمد بن سلیمان تستری مشہور محدث ابو زرعہ رازی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا۔

"جب کسی شخص کو اصحاب رسول کی توہین کرتے دیکھو تو جان لو کہ وہ زندیق ہے اس لیے کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حق ہیں۔ قرآن حق ہے۔ قرآن اور احادیث نبویہ ہم تک صحابہ کے ذریعہ پہنچیں۔ صحابہ کی تنقیص شان سے شیعہ کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے گواہوں کو مجروح کر کے کتاب وسنت کو ناکارہ کر دیں۔ حالانکہ زندیق ہونے کی حیثیت سے وہ اس امر کے زیادہ اہل ہیں کہ ان کو مجروح قرار دیا جائے"

شیعہ کے نزدیک دین اسلام نجات کے لیے کافی نہیں

اہل اسلام اور شیعہ کے مابین ایک اور فرق یہ ہے کہ شیعہ کے نزدیک دین اسلام سعادت دنیوی واخروی کے حصول کے لیے کافی نہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ امت اسلامیہ ائمہ معصومین کی اطاعت کے بغیر قاصر رہے گی اور اس استحکام واستقلال اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اہل اسلام کے نزدیک حق کا مقام کہیں اس سے زیادہ بلند ہے کہ اسے اطاعت ائمہ کا محتاج قرار دیا جائے۔ مزید براں یہ احترام مومن کے بھی خلاف ہے۔ اللہ تعالے نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی یہ آخری آیت نازل فرمائی جو سورۂ مائدہ کی تیسری آیت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اپنی نعمت پوری کردی اور اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے تمہارے لیے پسند کر لیا۔

خلاصۂ کلام! دین اسلام قرآن کریم اور صحیح احادیث نبویہ کی موجودگی میں وہ مرشد وحید اور ہادیٔ کامل ہے جس کے ہوتے ہوئے آنحضور کی وفات کے بعد امت مسلمہ کو کسی امام معصوم کی ضرورت نہیں۔ اس امت راشدہ میں اسی کا نام سنت ہے۔ اسی بنا پر تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کو اہل السنت کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ اس کے عین برعکس امت مسلمہ کو ناقص قرار دینے والے جن کا دعویٰ ہے کہ ائمہ معصومین کی اطاعت کے بغیر اسلام انسانی فلاح ونجات

کے لیے کافی نہیں تاریخ میں امامیہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ائمہ شیعہ میں سے امامت نافذہ صرف ایک ہی امام (حضرت علیؓ) کے حصہ میں آئی۔ وہ بھی اپنے خطب و رسائل میں شیعہ کے گلہ گذار رہے اور ہمیشہ ان سے اظہار بیزاری کرتے رہے۔ پھر حضرت علیؓ کے قائم مقام (امام حسنؓ) نے جو دوسرے امام معصوم تھے "عام الجماعۃ" والے سال امام المسلمین (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لی۔ مگر شیعہ برابر مخالفت کرتے رہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شیعہ ان کے امام معصوم ہونے کے عقیدہ سے منحرف ہو گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دانستہ ان کی اطاعت و اتباع سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ جب یہ بے کار قسم کی امامت گیارہویں امام کے لاولد فوت ہونے سے ختم ہو گئی۔ تو اب کوئی امام باقی نہ رہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ امامیہ کا اس لقب سے ملقب رہنا محال تھا اب انھوں نے بن باپ اور بے اولاد امام کا عقیدہ گھڑ لیا۔ یہ واقعہ کتاب ہذا کے صفحہ ۱۴۴/۱۵۴ پر آئے گا۔ شیعہ مہدی ماضی کے فرضی معبودوں کی طرح اسے زندہ تصور کرتے ہیں۔ اسلام کو امت مسلمہ کے لیے ناکافی قرار دینا اس امر کا واضح اعتراف ہے کہ اسلام ناقص مذہب ہے اور اہل اسلام نجات سے قاصر ہیں۔ ابن المطہر کی کتاب کا موضوع صرف ان اعتراضات کا ازالہ ہے جو اس بیہودہ عقیدہ پر وارد ہوتے ہیں۔ اس کے عین برخلاف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف لطیف میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام دین کامل ہے۔ اہل اسلام مستحق رشد و فلاح ہیں اور آنحضورؐ کی وفات کے بعد ائمہ معصومین کی اطاعت سے بے نیاز ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی تیسری آیت میں اللہ تعالےٰ نے دین اسلام کو کامل اور نوع انسانی کی نجات کے لیے کفایت کنندہ قرار دیا ہے۔ مزید براں مسلمانوں کے امام دوسرے مسلمانوں کے برابر ہیں اور انہی کی طرح شرعی احکام و اوامر کے مکلف و مامور ہیں۔ اہل اسلام پر ائمہ کی اطاعت صرف نیک اعمال کی حد تک ضروری ہے اس لیے کہ خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

انکار اجماع اور شیعہ

اہل اسلام اور شیعہ میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ شیعہ دین اسلام کو ایک اجتماعی دین تسلیم نہیں کرتے علاوہ ازیں شیعہ کے یہاں غیر منصوص شرعی احکام میں مسلمانوں کا اجماع حجت نہیں۔ بخلاف ازیں اہل السنۃ والجماعت

کے تشریعی نظام میں یہ امر مسلّم ہے کہ فقہ و تشریع میں مہارت رکھنے والے علماء کا اجماع اللہ و رسول کے دین میں ایک شرعی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے امام حاکم اور دیگر محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آنحضور نے فرمایا

"لَا یَجْمَعُ اللّٰہُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ" (اللہ تعالےٰ میری امت کو ضلالت پر جمع نہیں کرے گا)

حجیت اجماع کے دلائل

آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ (خدا کی تائید جماعت کے شامل حال ہوتی ہے)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور نے ارشاد فرمایا۔

"جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوا تو اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا یہانتک کہ اس کی طرف لوٹ آئے"۔

سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

"عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ" (سواد اعظم سے وابستہ رہیے جو الگ ہوا تو اسے تنہا دوزخ میں ڈالا جائے گا)

احادیث نبویہ کے علاوہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "سبیل المؤمنین" کو اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ مقرون و متصل قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (سورۃ النساء آیت ۱۱۵)

(جو شخص ظہور ہدایت کے بعد رسول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے علاوہ دوسری راہ پر چل دیتا ہے تو وہ جدھر کا رخ کرتا ہے ہم اسے اسی جانب پھیر دیتے ہیں اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے)

صرف نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے روگردانی ہی جہنم لے جانے کے لیے کافی تھی تاہم مذکورہ صدر آیت میں مومنوں کی اختیار کردہ راہ کے سوا دوسرے راستوں کی جانب

میلان درجحان کو بھی دخول جہنم کا باعث قرار دیا۔ جس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت اور "سبیل المومنین" باہم لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورہ آل عمران آیت ۱۱۰) (تم بہترین جماعت ہو جسے لوگوں (کے فائدہ) کے لیے ظاہر کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو)

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان بہ حیثیت مجموعی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ضلالت پر جمع نہ ہوں گے اور صرف ایسی چیز کو واجب یا حرام قرار دیں گے جس کے وجوب و حرمت کا فتوی اللہ ورسول نے صادر کیا ہو۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بحیثیت مجموعی حق گوئی سے سکوت اختیار کریں جبکہ وہ شرعاً امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مکلف و مامور ہیں۔ یہ صریح نص قرآنی کے خلاف ہے۔

مذکورہ بالا دلائل اور دیگر لاتعداد براہین و دلائل کی بنا پر مسلمان دین اسلام کو ایک اجتماعی دین قرار دیتے چلے آتے ہیں اور اسی بنا پر ان کو "اہل السنۃ والجماعۃ" کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے بایں ہمہ شیعہ اجماع امت کو تسلیم نہیں کرتے۔ امتِ مسلمہ ان کی نگاہ میں ایک منتشر جماعت ہے جس میں کوئی شیرازہ بندی نہیں اور اس کے قیام و بگاڑ کے لیے نبی کے سوا کسی غیر معصوم امام کا وجود ازبس ناگزیر ہے۔

شیعہ کا قبلہ وکعبہ

ہمارے اور شیعہ کے مابین آخری نقطۂ فرق و اختلاف یہ ہے۔ کہ مسلمان جب عبادت بجا لانے کے لیے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوتے ہیں یا دعا کرتے وقت اس کے حضور میں اظہار عجز و نیاز کرتے ہیں تو صرف ایک ہی کعبہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ مگر شیعہ خانہ کعبہ کے ساتھ دوسرے کعبہ جات کو بھی شریک کرتے ہیں۔

شیعہ کا ایک کعبہ مغیرہ بن شعبہ کی قبر ہے جو نجف کے مقام میں واقع ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں شہادت پائی اور وہیں مسجد کوفہ اور قصر کے مابین مدفون ہوئے۔

عرصہ دراز کے بعد شیعہ نے یہ دعوی کر دیا کہ حضرت علی بمقام نجف مغیرہ کی قبر میں مدفون ہیں شیعہ نے اس قبر کو کعبہ کی حیثیت دے رکھی ہے اس کا اصلی اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے، جو وہاں جا کر بہ چشم خود شیعہ کی حرکات کا ملاحظہ کرے شیعہ کا دوسرا کعبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی من گھڑت قبر ہے جو بقول شیعہ کربلا میں واقع ہے۔ ایک شیعہ شاعر کے اشعار ملاحظہ کریں شاعر کہتا ہے ؎

هی الطفوف فطف سبعا بمغناها	فما لمكة معنى مثل معناها
ارض ولكنما السبع الشداد لها	دانت وطاطا اعلاها لادناها

(یہ ارض کربلا ہے یہاں سات مرتبہ طواف کیجئے جو مقام اسے حاصل ہے وہ مکہ کو کہاں نصیب! اگرچہ یہ زمین ہے مگر ساتوں آسمان اس کے تابع ہیں اور عرش عظیم بھی اس کے سامنے جھکتا ہے)

اب بتائیے اس کفر صریح کو سالار انبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک سے کیا نسبت جو آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ (اللہ تعالےٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا)

نیز فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ

(اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے۔ اس قوم پر خدا کا سخت غضب ہوا جنہوں نے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا)

امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو ہیاج حیّان بن حصین اسدی کو فرمایا "کیا میں آپ کو اس کام کے لیے نہ بھیجوں جس پر مجھے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا تھا اور وہ یہ ہے کہ کسی تصویر کو مٹائے بغیر نہ چھوڑئیے اور جو بلند قبر دیکھو اسے زمین کے برابر کر دو (صحیح مسلم حدیث نمبر ۹۳)

اگر شیعہ امت محمدیہ میں شامل ہیں تو خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ صحیح ترین حدیث

ان کے لیے کافی ہے اور اگر وہ ائمہ معصومین کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں تو یہ ہے حضرت علیؓ کا فعل جو وہ آنحضور کی اطاعت میں بجا لاتے اور اس کام کے لیے دوسرے اشخاص ود جال کو بھیجا کرتے تھے! اور اگر قبور انبیاء کے ساتھ ان کا رویہ یہود ونصاریٰ ہونے کی حیثیت سے ہے تو ہمیں ان سے کوئی سرور کار نہیں اس لیے کہ ؎

وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشِقُونَ مَذَاهِبُ

اَلْمُنْتَقٰی پر ایک نظر

تمہیدی طور پر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ حافظ ابو عبداللہ محمد بن عثمان ذہبی رحمۃ اللہ علیہ المتوفیٰ (۶۷۳ — ۷۴۸ھ) کی کتاب المنتقیٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی (۶۶۱ — ۷۲۸) کی شہرہ آفاق کتاب "منہاج الاعتدال فی نقض کلام اہل الرفض والاعتزال" کا اختصار ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ صدر کتاب "منہاج الاعتدال" ۲۲ — ۱۳۲۱ء میں مطبع بولاق میں چار جلدوں میں "منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ" کے نام سے چھپی۔ المنتقیٰ کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ کتاب خطۂ ارضی سے ناپید ہو چکی ہے۔

سب سے پہلے حجاز کے مشہور رئیس اور جید عالم محب مکرم شیخ محمد نصیف نے گذشتہ سال اس کا سراغ لگایا۔ شیخ موصوف ان دنوں دیار شام کی سیاحت کے لیے گئے تھے۔ دورانِ سفر حلب کے مکتبہ عثمانیہ میں انہوں نے المنتقیٰ کا مخطوطہ دیکھا۔

بارھویں صدی ہجری کے وسط میں عثمان پاشا حلبی المتوفی ۱۱۶۰ھ نے یہ مکتبہ وقف کر دیا تھا۔ عثمان پاشا عبدالرحمن پاشا کے بیٹے تھے جو ۱۱۰۷ھ میں فوت ہوئے۔

حال ہی میں مکتبہ عثمانیہ کو حلب کے "دار مکتبات الاوقاف الاسلامیہ" میں شامل کر دیا گیا ہے۔ المنتقیٰ کے مخطوطہ کا نمبر اس مکتبہ میں ۵۷۹ ہے

یہ ایک قدیم نسخہ ہے - اس کے کاتب کا نام یوسف شافعی ہے۔یوسف شافعی نے اس نسخہ کی کتابت سے ماہ جمادی الاولے کے آخر میں امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ۷۶ سال بعد ۸۲۴ھ میں فارغ ہوا۔
ایسے معلوم دیتا ہے کہ یہ مخطوطہ کسی صحیح نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔اگرچہ مخطوطہ کا کاتب علوم عربیہ اور عربی زبان میں ماہر نظر نہیں آتا۔یہی وجہ ہے کہ نقل کرتے وقت اس سے بڑی فحش غلطیاں صادر ہوتی رہیں۔چنانچہ کتاب کا قاری جو ایسے مخطوطات پڑھنے میں مہارت رکھتا ہو اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے۔
بایں ہمہ ہم نے بولاق میں طبع شدہ اصل کتاب "المنتقیٰ کا تقابل کیا اور امکانی حد تک اس سے فائدہ اٹھایا۔یہی وجہ ہے کہ کتاب المنتقی بکمال صحت زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔
اصل کتاب ("منہاج الاعتدال") سے تقابل کرتے وقت ایسے فقرات ہماری نگاہ سے گذرتے جن کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ان کی افادیت کے پیش نظر ہم ان کو المنتقے میں درج کر دیتے۔ اور اصل کتاب سے ممیز کرنے کے لیے ان فقرات کو قوسین (   ) میں لکھ دیتے۔
جس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا اختصار المنتقے خالصتا ان کی خواہشات کے مطابق رہے (اور کوئی دوسرا شخص اصل کتاب سے اس میں اضافہ نہ کر سکے)
اس طریق کار کے پیش نظر ہم دو خوبیوں کو بیک وقت جمع کر سکے ہیں۔
(۱) قاری ان زیادات سے بھی مستفید ہو سکا جو اصل کتاب میں تھیں۔اور المنتقی کا دامن ان فوائد سے خالی تھا۔
(۲) دوسرا یہ کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا المنتقے اپنی اصلی حدود کے اندر رہا اور شیخ محمد نصیف نے اس کا جو عکسی فوٹو لیا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو

پائی - چنانچہ میں نے مقدمہ ہذا کے آخر میں المنتقیٰ کے پہلے صفحہ اور کتاب کے اخیر میں المنتقیٰ کے آخری صفحہ کا فوٹو دے دیا ہے -

المنتقیٰ کی طباعت کے دوران میں نے اس کے بعض مقامات پر حواشی لکھے - میرا خیال ہے کہ یہ حواشی اہم مطالب کے فہم و ادراک میں قاری کے لیے مفید ثابت ہوں گے اور وہ آسانی سے کتاب کا مطلب سمجھ سکے گا - حاشیہ نویسی کا محرک یہ امر تھا کہ دور حاضر میں شیعہ نے کتب و رسائل کی اشاعت کے ذریعہ اہل السنت کے برخلاف اس قدر بھرپور حملے کیے کہ ان پر خاموش رہنا حق و صداقت کی رسوائی ہے - چنانچہ میں توفیق ایزد متعال صداقت اسلامی کے تحفظ و دفاع کے لیے گوشۂ عافیت سے اٹھ کھڑا ہوا اور یہ مباحث قلمبند کیے -

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَصْحَابِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِ مُحَمَّدٍ وَذُرِّيَّةِ مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ -

محب الدین الخطیب
دار الفتح بجزیرۃ الروضۃ بالمقابل
فسطاط مصر - نصف شعبان
سنہ ۱۳۷۴

مترجم
غلام احمد حریری - ایم - اے - (عربی و اسلامیات)
۲۹ رجون سنہ ۱۹۶۵
۶۱ - ڈی پیپلز کالونی - لائل پور

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَبِہٖ نَسۡتَعِیۡنُ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الۡمُنۡقِذِ مِنَ الضَّلَالِ، اَلۡمُرۡشِدِ اِلَی الۡحَقِّ، اَلۡهَادِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ

حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ چند مفید و نفیس مسائل ہیں جن کو میں نے علامۂ زمان - فاضل دوران استاد محترم ابو العباس احمد بن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب منہاج[1] الاعتدال فی نقض کلام اہل الرفض والاعتزال" سے انتخاب کیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ ان کے سامنے ایک معاصر شیعہ "ابن المطہر[2]" کی کتاب پیش کی گئی - یہ کتاب اس نے شیعہ امامیہ کے مذہب

---

[1] یہ کتاب ۱۳۲۱ھ میں بولاق کے مطبعہ امیریہ میں منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ کے نام سے چار جلدوں میں چھپی تھی ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنی تصانیف کا نام مقرر نہیں کیا کرتے تھے ۔ سرعت تالیف میں یکتا تھے ۔ حافظہ اس قدر قوی پایا تھا کہ کتابوں کی طرف مراجعت کئے بغیر حافظہ کی مدد سے احادیث کی عبارتیں اقوال ائمہ اور تاریخی واقعات لکھتے چلے جاتے تھے ۔ علماء آپ کے تلامذہ سے یہ تصانیف ہاتھوں ہاتھ لیتے اور جنگل کی آگ کی طرح یہ کتابیں اقطار ارضی میں پھیل جاتیں ۔ کتابوں کے مندرجات دیکھ کر لوگ خود ان کا نام مقرر کر لیتے ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی بعض تصانیف کے متعدد نام ملتے ہیں ۔ چونکہ امام ذہبیؒ المتوفی ۶۷۳ - ۷۴۸ھ ابن تیمیہؒ کے خصوصی تلامذہ سے تھے اس لیے ہم نے المنتقی کی اصل کا وہی نام ذکر کیا ہے جو امام ذہبیؒ نے ذکر کیا ورنہ عام لوگوں میں یہ کتاب "منہاج السنۃ" کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کے باوجود ہم نے ٹائیٹل پیج پر دوسرے نام کی طرف اشارہ کر دیا ہے ۱۲

[2] ابن المطہر کا پورا نام حسن بن یوسف بن علی ابن المطہر المتوفی (۶۴۸ — ۷۲۶) ہے ۔ یہ نصیر الدین طوسی المتوفی (۵۹۷ - ۶۷۲) کا شاگرد خاص اور شیعہ کے علماء کبار میں سے ایک ہے ۔ اس کی تربیت ہی صحابہ و تابعین کرام کے بغض و عناد پر ہوئی تھی ۔ جو صحابہ نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور دنیا ئے انسانیت جن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ ابن المطہر ان کو غضب آلود نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ ابن المطہر نے اپنی کتاب کے جو اوراق سیاہ کیے ہیں ان میں جگہ جگہ اس کی عداوت صحابہ کے مظاہر نظر آتے ہیں ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی کتاب کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے اور اسے اولین و آخرین کے لیے سامان عبرت بنا دیا ہے ۱۲

کی ترویج واشاعت کے لیے تحریر کی تھی۔ حالانکہ امامیہ خود جاہل[1] اور علم و دین سے بہت ہی کم واقفیت رکھنے والے ہوتے ہیں۔

ابن المطہر نے یہ کتاب ایک مشہور بادشاہ کے لیے تحریر کی جس کا نام اس نے خدا بندہ[2] ذکر کیا ہے

---

[1] صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنت اخذ کی پھر ان کے ہاتھوں یہ مقدس امانت تابعین کرام تک پہنچی جو بات بھی اس کے خلاف ہو وہ جاہلیت میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی نظامات و احکام کسی زمان میں ہو یا کسی مکان میں ان کی دو ہی قسمیں ہیں (۱) اسلام (۲) جاہلیت۔ صحابہ سے جو سنن و احکام ہم نے اخذ کیے وہ اسلام ہیں اور اس کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ جاہلیت ہے قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیت کب ایجاد ہوئی یا اس کا گھڑنے والا کون تھا۔

[2] خدا بندہ فارسی لفظ ہے عربی میں اس کے معنی ہیں عبد اللہ (خدا کا بندہ) خدا بندہ ایلخانی بادشاہوں میں سے آٹھواں بادشاہ اور چنگیز کی چھٹی پشت میں سے تھا۔ اس کا اصل نام الجائیتو المتوفی (۶۸۰-۷۱۶ھ) ہے۔ اس کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔

۱	الجائیتو	متوفی (۶۸۰ - ۷۱۶ھ)
	بن	
۲	ارغون	" سنہ ۶۹۰ھ
	بن	
۳	ابغا	" سنہ ۶۸۱ھ
	بن	
۴	ہلاکو	" سنہ ۶۶۳ھ
	بن	
۵	تولی	" سنہ ۶۲۸ھ
	بن	
۶	چنگیز	" (۵۴۹ - ۶۲۴ھ)

چنگیز کا لقب ایلخان تھا۔ یہ سلطنت اسی کی جانب منسوب ہے۔ خدا بندہ کا والد ارغون صنم پرست تھا ارغون کا چچا نکودار بن ہلاکو سیاسی مصلحت کے پیش نظر مسلمان ہو گیا تھا اور اپنا نام احمد نکودار رکھ لیا تھا۔ ارغون نے خراسان میں اس کے برخلاف بغاوت کر کے سنہ ۶۸۳ھ میں اسے قتل کر دیا اور اس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ ارغون نے اپنے والد کے وزیر شمس الدین محمد ی کے خلاف یہ بہتان باندھا کہ اس نے زہر دے کر اس کے والد کو ہلاک کر دیا ہے اس جرم میں وزیر اور اس کے چار بیٹوں کو ہلاک کر کے عنان سلطنت اپنے یہودی طبیب سعد اللہ کے سپرد کر دی اور خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ جب یہودی طبیب ملک کا نظم و نسق (باقی بر ص ۲۷)

(بقیہ حاشیہ ص۲۶) سنبھالنے سے قاصر تھا اور ملک میں بدامنی کا دور دورہ ہوا تو عمال سلطنت نے اسے تہ تیغ کر دیا چنانچہ ارغون سنہ ۶۹۰ھ میں بڑی بے کسی کی موت مرا۔ ارغون کے دو بیٹے تھے (۱) الجایتو جسے خدا کا بندہ کے نام سے پکارا جاتا ہے (۲) غازان المتوفی (۶۷۰ھ - ۷۰۳ھ) چونکہ رعایا مسلمان تھی لہذا یہ دونوں سیاسی مصلحت کے پیش نظر مسلمان ہو گئے۔ غازان نے اہلسنت کا مذہب اختیار کیا۔ جب سنہ ۷۰۳ھ میں اس کا بھائی خدا بندہ اس کا قائم مقام قرار پایا تو اس نے شیعہ مذہب اختیار کیا۔ اس کے امراء خواص اکثر شیعہ تھے۔ ایک واقعہ مشہور ہے کہ خدا بندہ نے ایک روز اپنی بیوی سے ناراض ہو کر اسے طلاق دے دی پھر جلد ہی نادم ہو گیا اور اسے گھر میں آباد کرنا چاہا۔ اہل سنت علماء نے متفقہ فتوی دیا کہ دوسرے خاوند سے نکاح کیے بغیر خانہ آبادی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ خدا بندہ کو بڑی مشکل پیش آئی۔ اس کے شیعہ خواص و امراء نے مشورہ دیا کہ شہر حلہ کے مشہور شیعہ عالم ابن المطہر کو بلا کر مشورہ کیجئے وہ اس کا کوئی حل پیش کرے گا۔ ابن المطہر حاضر ہوا تو سلطان نے صورت مسئلہ پیش کر دی۔ ابن المطہر نے پوچھا کیا آپ نے دو عادل گواہوں کے سامنے طلاق دی تھی؟ سلطان نے کہا نہیں! ابن المطہر نے کہا چونکہ طلاق کے شرائط موجود نہیں لہذا طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اور سلطان حسب سابق اپنی بیوی کو آباد کر سکتا ہے۔ بادشاہ اس فتوی سے بہت خوش ہوا اور ابن المطہر کو اپنا مخصوص مصاحب بنا لیا۔ ابن المطہر کے بہکانے سے خدا بندہ نے دیار و امصار میں حکم ارسال کیا کہ منبر پر خطبہ دیتے وقت بارہ اماموں کا نام لیا جائے۔ ائمہ کے نام سکول اور مساجد کی دیواروں پر کندہ کیے جائیں۔ ابن المطہر کی حیلہ جوئی نے سلطان کو اس تہمت سے بچا لیا کہ اس کی بیوی عقد ثانی کے بعد اس کے یہاں لوٹ کر آتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں شیعہ مذہب نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ یہ خراسان و ایران میں رسمی تشیع کی جانب پہلا قدم تھا کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ سنہ ۷۰۷ھ میں پیش آیا۔

اس واقعہ کے تین سو سال بعد شیعہ مذہب کی جانب دوسرا قدم اٹھا جس نے سلطنت صفویہ کے قیام سے پورے ایران کو تشیع کے آتشی کنویں میں دھکیل دیا۔ متقدمین شیعہ جن افکار و آراء کو غلو سے تعبیر کیا کرتے تھے اور ان کے معتقد کی روایت کو تسلیم نہیں کیا کرتے تھے۔ سلطنت صفویہ ان کی پشت پناہی کرنے لگی اور سب شیعہ غالی بن گئے جو افکار و معتقدات متقدمین شیعہ کے یہاں غلو تصور کیا جاتے تھے۔ صفوی دور میں انکو ضروریات مذہب میں سے سمجھا جانے لگا چنانچہ شیعہ کے دوسرے بڑے علامہ المامقانی المتوفی (۱۲۹۰ - ۱۳۵۱) نے اپنی کتاب تنقیح المقال جو جرح و تعدیل میں بے حد اہم کتاب ہے خود اس کا اعتراف کیا ہے ۱۲

الناس ہیں[۱] اور عقلی دلائل کے ذکر و بیان میں اجہل الناس[۲]۔ یہی وجہ ہے کہ علماء انہیں اجہل الطوائف کہتے چلے آئے ہیں۔ ان کی وجہ سے دین اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا بخوبی اندازہ صرف رب العلمین ہی کو ہے۔ اسماعیلیہ[۳] باطنیہ اور نصیریہ ایسے گمراہ فرقے اسلام میں شیعہ ہی کے دروازہ سے داخل ہوئے۔ کفار و مرتدین بھی شیعہ کی راہ پر گامزن ہو کر اسلامی دیار و بلاد پر چھا گئے۔ وہاں مسلم خواتین کی آبروریزی کی اور ناحق خون بہایا۔ ابن المطہر نے اپنی کتاب کا نام "منہاج الکرامہ فی معرفۃ الامامۃ" رکھا ہے۔ شیعہ خبث باطن اور ہوائے نفس میں یہود سے ملتے جلتے اور غلو و جہل میں نصاریٰ کے ہمنوا

---

[۱] اس کی وجہ یہ ہے کہ مرویات و منقولات میں شیعہ کے یہاں ثقاہت و عدالت کا معیار حب اہل البیت اور بغض صحابہ ہے جو شخص اپنے دل میں صحابہ کے لیے زیادہ بغض و عداوت رکھتا ہے وہ اسی قدر زیادہ مقبول الروایت ہے۔ جو اس ضمن میں نرمی برتتا ہے اور حضرت عائشہ حضرت معاویہ اور دیگر صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم پر لعنت نہیں بھیجتا وہ اس مقبولیت سے محروم ہے۔

[۲] اجہل الناس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ مذہب کی اساس اباطیل و اوہام پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ آگے چل کر آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ جہالت کی حد یہ ہے کہ شیعہ امامیہ کو دور حاضر میں اپنا بلا امام ہونا بھی تسلیم نہیں۔ بخلاف ازیں وہ اپنے کو شیعہ امامیہ کہے جاتے ہیں اور اس امر کے مدعی ہیں کہ وہ امامیہ ہیں۔ ان کا امام ہزار سال کی مدت مدید گذرنے کے باوصف ہنوز بقید حیات ہے۔ البتہ وہ سامرہ کے تہ خانہ میں پوشیدہ ہے۔ امامیہ امام غائب کے خروج کے منتظر ہیں اور ان کے عاجلانہ ظہور و خروج کے لیے دست بدعا رہتے ہیں ۱۲

[۳] اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ عصر حاضر تک بقید حیات رہتے تو انہیں یہ ارشاد فرمانے میں کوئی باک نہ ہوتا کہ شیخیت کشفیت اور بہائیت شیعہ مذہب کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ شیعہ کی رکیک روایات ہی سے استدلال کر کے جادۂ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔

اللھم صل علی محمد و الہ و صحبہ و ازواجہ و سلم

تسلیما کثیرا و اغفر لکاتبہ و لمن

سعی فیہ آمین۔ ثم آمین

ہیں۔ ابن المطہر بھی اپنے پیش روؤں مثلاً ابن النعمان[1] المفید، کراجکی[2] و ابوالقاسم[3] موسوی۔ اور نصیر الدین طوسی[4] کی راہ پر گامزن رہا۔ شیعہ دراصل طریق بحث و مناظرہ معرفت دلائل اور اصطلاحات

---

[1] اس کا نام و نسب محمد بن محمد بن نعمان بن عبد السلام بغدادی المتوفی (۳۳۶ - ۴۱۳ھ) ہے یہ حلہ نامی شہر کا شیخ المشائخ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چھوٹی بڑی دو صد سے زائد کتب کا مصنف ہے ۱۲

[2] محمد بن علی بن عثمان الکراجکی المتوفی ۴۴۹ھ یہ شیخ ابن نعمان المفید کے تلامذہ میں سے تھا۔ کراجک ایک گاؤں کا نام ہے

[3] اس کا پورا نام ابو القاسم علی بن حسین بن موسیٰ المعروف بالمرتضیٰ ہے۔ تاریخ وفات (۳۵۵ - ۴۳۶ھ) ہے۔ یہ محمد بن حسین الرضی کا بھائی تھا جو مشہور شاعر تھا۔ اس کی تاریخ وفات (۳۵۹ - ۴۰۶ھ) ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات میں اضافہ کرکے ان میں طرح طرح کے عجائبات و غرائبات جمع کر دیئے۔ حالانکہ حضرت علی کا دامن ایسی افترا پردازی سے پاک ہے ۱۲

[4] محمد بن محمد بن حسن خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی (۵۹۷ - ۶۷۲) ہے۔ مشہور ظالم و سفاک ہلاکو نے ۶۵۵ھ میں بغداد میں قتل عام کا جو بازار گرم کیا تھا اس کی براہ راست ذمہ داری نصیر الدین طوسی ابن علقمی اور اس کے مشیر ابن ابی الحدید پر عائد ہوتی ہے۔ طوسی ایک ملحد فلسفی تھا اور زوال بغداد کا اولین محرک تھا۔ زوال بغداد سے قبل یہ بلاد الجبل اور قلعہ الموت میں سکونت پذیر تھا اور فرقہ اسمٰعیلیہ کا طرفدار تھا۔ طوسی نے اپنی مشہور تصنیف اخلاق ناصری اسمعیلی سلطان علاؤ الدین محمد بن جلال حسن کے وزیر ناصر الدین کے لیے تحریر کی تھی۔ ناصر الدین بلاد الجبل (قوھستان) کا حاکم تھا اور بڑا بدباطن شخص تھا۔ طوسی کے نفاق اور خبث باطن کی بین دلیل یہ ہے کہ اس نے بنی عباس کے آخری خلیفہ المستعصم المتوفی (۵۸۸ - ۶۵۶) کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا تھا۔ حالانکہ زوال بغداد کا محرک یہی طوسی تھا۔ شیعہ طوسی کی اس رسوا کن خیانت اور خبث باطن کو اس کے انتہائی کمالات میں سے شمار کرتے ہیں (دیکھیے شیعہ کی کتاب روضات الجنات طبع ثانی صفحہ ۵۷۸)

طوسی ایسے ملحد کی یہ خیانت اتنی بڑی تھی کہ اس سے بڑی خباثت و خیانت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا طوسی اس قدر خیانت کار تھا کہ یہ ہلاکو کے خلاف سازش کرنے سے بھی باز نہ رہا۔ ہلاکو کو اس سازش کا پتہ چل گیا تھا وہ اس کی پاداش میں طوسی کو جہنم رسید کرنا چاہتا تھا مگر قتل کرنے سے یہ امر مانع ہوا کہ طوسی بیاعوں

(باقی بر صفحہ ۳۰)

مناظرہ مثلاً منع و معارضہ سے بالکل ناآشنا ہیں۔ اسی طرح منقولات سے بھی وہ قطعی طور پر تہی دامن ہیں

شیعہ سے متعلق ائمہ دین کی رائے

شیعہ کا اعتماد منقطع[۱] روایات پر ہے جن میں سے اکثر مشہور جھوٹے لوگوں کی وضع کردہ ہوتی ہیں مثلاً شیعہ کے یہاں ابو مخنف[۲] لوط بن یحییٰ اور ہشام بن کلبی[۳] کی روایات بھی قابل اعتماد ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) کی حرکات معلوم کرنے کے لیے ایک زائچہ تیار کر رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ تکمیل پذیر ہو جائے ہلاکو نے جب طوسی کو بلا کر بھلا برا کہا اور اس کی خیانت کی قلعی کھول کر اسے قتل کی دھمکی دی تو طوسی کا شاگرد قطب الدین شیرازی موقعہ کو غنیمت جان کر اس زائچہ کی تکمیل کے لیے تیار ہو گیا اور ہلاکو سے کہا۔

"اگر آپ کی رائے مبارک اس شخص (طوسی) کو قتل کرنے کے حق میں ہے تو زائچہ کی تکمیل کے لیے میری خدمات حاضر ہیں"۔

مقام افسوس ہے کہ علم و فضل کے یہ مدعی شرم و حیا کے کسی احساس کے بغیر اخلاقی گراوٹ کی اس حد تک پہنچ جاتے تھے ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ سند میں انقطاع کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تسلسل ٹوٹ جائے اور ایک یا دو راوی محذوف ہوں۔ مثلاً ایک شخص ایسے شخص سے روایت کرے جو اس سے پہلے ہوا ہے اور اس نے اس کا زمانہ نہیں پایا۔ تاہم وہ جھوٹ موٹ اس سے روایت کرنے کا مدعی ہے۔ یا اس نے کسی اور شخص کے واسطہ سے روایت کی اور چونکہ وہ شخص معروف بالکذب تھا اس لیے اس کا نام دانستہ سلسلۂ سند سے حذف کر دیا تاکہ اس روایت کا جھوٹا ہونا عوام میں مشہور نہ ہو۔

۲؎ ابو مخنف شیعہ رواۃ میں سے مقابلتاً کم درجہ کا ضعیف راوی ہے اور اس میں ضعف کم پایا جاتا ہے۔ تاہم محدث ابن عدی اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "یہ کٹر شیعہ اور راوی اخبار ہے"۔ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں۔ "یہ ایک قصہ گو شخص ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ابو حاتم نے اس کی روایت قبول نہیں کی"۔ فیروز آبادی نے بھی اپنی کتاب "القاموس المحیط" میں یونہی لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوط بن یحییٰ ابو مخنف ۱۵۷ھ میں فوت ہوا۔

۳؎ ہشام کا نام و نسب ابو المنذر ہشام بن محمد بن سائب المتوفی ۲۰۶ھ میں ہے۔ یہ قصہ گو اور ماہر انساب تھا اس کے بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول سب سے زیادہ سچا ہے۔ فرماتے ہیں

(باقی بر صفحہ ۳۱)

یونس بن عبد الاعلی روایت کرتے ہیں کہ اشہب نے کہا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جب روافض کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

لَا تُکَلِّمْهُمْ وَلَا تَرْوِ عَنْهُمْ فَإِنَّهُمْ يَكْذِبُوْنَ

(نہ شیعہ سے بات کیجئے اور نہ ہی ان سے روایت کیجئے اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں)

حرملہ کہتے ہیں میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا۔

لَمْ اَرَ اَحَدًا اَشْهَدَ بِالزُّوْرِ مِنَ الرَّوَافِضَةِ

(میں نے شیعہ سے زیادہ جھوٹی گواہی دینے والا کوئی نہیں دیکھا)

مؤمل بن اہاب کہتے ہیں میں نے یزید بن ہارون کو سنا فرماتے تھے

(بقیہ حاشیہ صد ۲۹) "یہ قصہ گو اور ماہر انساب ہے۔ میں یہ نہیں خیال کرتا کہ کوئی اس سے حدیث روایت کرتا ہو۔ بیان اخبار و انساب کا مرجع ہے۔ جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک حدیث رسول کا تعلق ہے مسلمان اس سے زیادہ دانشمند ہیں کہ وہ اس کے دھوکہ میں آئیں"۔

کلبی کے بارے میں محدث ابن عساکر نے حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔

"کلبی شیعہ ہے اور اعتماد کے قابل نہیں"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱ یہ اپنے زمانہ میں امام مصر اور وہاں کے جید فاضل تھے ۲۶۳ھ میں وفات پائی۔

۲ اشہب بن عبد العزیز قیسی المتوفی (۱۴۰ - ۲۰۴) یہ ائمہ مصر میں سے تھے اور امام مالک اور لیث بن سعد کے شاگرد تھے۔

۳ حرملہ بن یحییٰ تجیبی المتوفی ۲۴۳ھ یہ امام شافعی کے تلمیذ خاص اور مصر کے یکتائے روزگار فاضل تھے۔ انھوں نے امام مالک کے تلمیذ خاص ابن وہب سے تقریباً ایک لاکھ روایات اخذ کیں۔

۴ مؤمل بن اہاب ربعی المتوفی ۲۵۴ھ ان سے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

۵ یزید بن ہارون واسطی مشہور حافظ حدیث اور امام احمد کے استاد تھے۔ ان کی مجلس درس میں ستر ہزار طلبہ ہوا کرتے تھے۔ یہ ۲۰۶ھ میں فوت ہوئے۔

اللهم صل وسلم دائما ابدا علی نبیك خیر الخلق کلهم

اللهم اغفر لکاتبه ولمن سعی فیه

"ہر بدعتی کی روائیت قبول کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ بدعت کا داعی نہ ہو البتہ شیعہ کی روایت مقبول نہیں کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں"۔

محمد بن سعید[1] اصفہانی فرماتے ہیں میں نے شریک[2] کو یہ کہتے سنا۔

"جس آدمی سے ملو اس سے علم حاصل کر لو البتہ شیعہ سے علم حاصل نہ کرو اس لیے کہ وہ حدیثیں وضع کرتے ہیں اور پھر انھیں دین بنا لیتے ہیں"۔

ابو معاویہ[3] کا قول ہے کہ میں نے سنا اعمش[4] فرماتے تھے۔

لوگ اصحاب مغیرہ[5] بن سعید کو کذاب کا نام دیتے ہیں اور کذاب کی شہادت بالاتفاق مردود ہے"

جو شخص کتب جرح و تعدیل کو بغور پڑھنے کا عادی ہے اسے معلوم ہے کہ ان کتب کے مصنفین کے نزدیک لوگوں کے ہر طبقہ میں شیعہ زیادہ تر معروف بالکذب ہوتے ہیں۔ بخلاف ازیں خوارج دینی

۱ؔ محمد بن سعید اصفہانی مشہور محدث شریک کے تلامذہ میں سے تھے۔ امام بخاری نے ان سے روایت کی ہے یہ ۲۲۰ھ میں فوت ہوئے۔

۲ؔ شریک بن عبد اللہ نخعی المتوفی (۹۵ - ۱۷۷) کوفہ کے قاضی اور عبد اللہ بن مبارک کے شیوخ میں سے ہیں۔ یہ محدث ثوری اور امام ابو حنیفہ کے معاصر اور رفیق تھے۔

۳ؔ ابو معاویہ محمد بن حازم المتوفی ۱۹۵ھ یہ نابینا ہونے کے باوصف بہت بڑے فاضل تھے۔ یہ اعمش کے تلامذہ میں سے تھے۔

۴ؔ اعمش کا اصلی نام سلیمان بن مہران ہے۔ ان کی تاریخ وفات (۶۱ - ۱۴۸) ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ اور قاری تھے سفیان بن عیینہ اعمش کے بارے میں فرماتے ہیں "یہ بہت بڑے حافظ، قاری اور عالم تھے۔ صداقت بیانی کی وجہ سے انکو المصحف کہا جاتا تھا"

۵ؔ مغیرہ بن سعید کوفی مشہور رافضی اور کذاب تھا۔ اسے ۱۱۹ھ میں خالد بن عبد اللہ قسری کے عہد امارت میں سولی دیا گیا تھا۔ یہ آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ کی تحریف کر کے اسے غلط معانی پہنایا کرتا تھا یہ حضرت علی کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا تھا اور حضرت علی کے رفقاء کے سوا ابو بکر و عمر اور جملہ صحابہ کی تکفیر کرتا تھا۔ یہ ایک یہودی عورت سے کچھ پڑھا کرتا تھا۔ جب دریافت کیا گیا کہ تم کیا پڑھتے ہو تو کہنے لگا "میں جادو سیکھتا ہوں"۔ ائمہ اہلبیت اسکی دروغ بافی اور دین اسلام میں کفر و الحاد کے ارتکاب کی بنا پر اس سے اظہار برائت کیا کرتے تھے ۱۲

حدود سے تجاوز کر جانے کے باوجود اصدق الناس ہوتے ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ ان کی نقل کردہ روایت کو اصح الحدیث کہا جاتا ہے[۱]۔ شیعہ یہ کہہ کر خود اپنی دروغ گوئی کا اعتراف کرتے ہیں کہ "ہمارا دین تقیہ ہے"[۲]۔ اسی کا نام نفاق ہے۔ اس کے باوصف وہ مومن ہونے کے دعویدار ہیں اور سابقین اولین صحابہ کو ارتداد و نفاق[۳] سے متہم کرتے ہیں۔ گویا وہ اس مثل

---

۱ کیونکہ خوارج کے نزدیک جھوٹ بولنے والا گناہ کبیرہ کا مرتکب اور ابدی جہنمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوارج ظالم ہونے کے باوجود جھوٹ نہ بولتے تھے (خالد گھرجاکھی)

۲ حافظ ابن عساکر تاریخ دمشق میں رقمطراز ہیں کہ حسن بن مثنیٰ بن حسن سبط بن علی بن ابی طالب نے ایک رافضی سے کہا۔

"اگر ہمارا بس چلا تو ہم تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے اور تمہاری توبہ قبول نہیں کریں گے"۔ یہ سن کر ایک شخص بولا۔ "آپ ان کی توبہ کیونکر قبول نہ کریں گے"۔ حسن مثنیٰ نے فرمایا۔ "ہم ان سے تمہاری نسبت زیادہ واقف ہیں۔ اگر یہ چاہیں تمہاری تصدیق کردیں اور اگر چاہیں تکذیب کردیں۔ ان (شیعہ) کا خیال ہے کہ تقیہ میں ان سب باتوں کی گنجائش ہے۔ مقام افسوس ہے کہ تقیہ کی رخصت مسلمان کو اضطراری صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً وہ سلطان سے ڈرتا ہو تو اپنے ضمیر کے خلاف بات کہہ کر اپنی جان بچائے تقیہ میں عظمت و فضیلت کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ فضیلت کا موجب یہ امر ہے کہ ہر قیمت پہ آدمی حق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور سچی بات کہہ دے۔ بخدا تقیہ کی بنا پر خدا کے کسی بندے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ کے بندوں کو گمراہ کرتا پھرے"۔ (تاریخ دمشق از ابن عساکر ج ۴ ص ۱۶۵)

۳ اہل سنت کے ایک عالم سید ابراہیم نے ایک شیعہ مجتہد محمد مہدی سبزواری کو بتاریخ ۴ صفر ۱۳۴۷ھ ایک خط لکھا۔ سید ابراہیم نے اپنے خط میں ایک شیعہ عالم بہاؤ الدین عاملی کا شکوہ کیا تھا کہ اس نے تفسیر بیضاوی کے حاشیہ میں آیت "يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ سید ابراہیم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

اگر حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر صحابہ جن کی تعداد آنحضور کی وفات کے وقت ایک لاکھ سے بھی زائد تھی۔ پانچ چھ یا سات کے سوا سب کافر منافق اور مرتد ہوئے تو وہ دین جاہلیت کا اعلان کرتے اور مرتدین (باقی بر صفحہ ۳۴)

کے مصداق ہیں "رَمَتْنِی بِدَائِہَا وَانْسَلَّتْ"۔ (وہ اپنی بیماری مجھ پر پھینک کر کھسک گئی)۔
عقلیات میں شیعہ کا اعتماد آجکل معتزلہ کی تصانیف پر ہے۔ انکار تقدیر اور سلب صفات میں
شیعہ معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔ بخلاف ازیں کوئی معتزلی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت سے منکر نہیں۔
بلکہ جمہور معتزلہ ان کی عزت و عظمت کے قائل ہیں۔ شیعہ متکلمین مثلاً ہشام[1] بن حکم۔ ہشام جوالیقی[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳) کے خلاف نبرد آزما ہوتے۔ مقام حیرت ہے کہ ۲۳ سال تک کافر آپ کے مصاحب رہے
اسی طرح طویل مدت تک ایک کافرہ بیوی آپ کی زوجیت میں رہی۔ اور آپ کو پتہ نہ چل سکا۔ حالانکہ اللہ تعالے
نے آپ کو اولین و آخرین کا علم عطا کر رکھا تھا۔"

مہدی سبزواری نے ۱۴ ربیع الآخر کو اس کا حسب ذیل جواب دیا۔

"آپ نے شیعہ کا قول نقل فرمایا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ حضرت ابوبکر کا کفر (معاذ اللہ) بت پرستوں کی طرح
حقیقی و واقعی نہیں بلکہ حکمی کفر ہے۔ مزید براں شیعہ اس بات کے قائل نہیں کہ حضرت عائشہ اور صحابہ آنحضور کی
زندگی میں کافر ہو گئے تھے۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ آپ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے (العیاذ باللہ)

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ بہاؤ الدین آملی کا یہ قول دروغ گوئی پر مبنی ہے
کہ مذکورہ صدر آیت حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ تاہم عاملی اور سبزواری اس امر
میں باقی شیعہ کے ہمنوا ہیں کہ صحابہ اگر آپ کی وفات سے قبل نہیں تو بعد میں ضرور مرتد ہو گئے تھے۔ ہم کہتے
ہیں کہ اگر شیعہ کے افکار و معتقدات کا انکار کفر ہے تو بلاشبہ اس اعتبار سے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو کافر
کہنا درست ہے۔ سید ابراہیم اور مجتہد سبزواری کی مراسلت کے لئے دیکھئے مجلہ "الفتح" جمادی الآخرہ سنہ ۱۳۶۶ھ

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ہشام بن حکم مشہور زندیق ابوشاکر دیصانی کا غلام اور اس کا تربیت یافتہ تھا۔ ابوشاکر
ہی سے اس نے الحاد و زندقہ اور تجسیم کی تعلیم پائی۔ جب ابوشاکر مر گیا تو یہ کسی اور ملحد استاد کی تلاش میں سرگرداں
رہنے لگا۔ اتفاقاً اس کی ملاقات ایک جہمی العقیدہ شخص سے ہو گئی۔ ہشام تجسیم کا عقیدہ رکھتا تھا اس کے
عین برخلاف جہمی شخص نفی صفات کا قائل تھا۔ تاہم الحاد و زندقہ اور غلو فی البدعت میں دونوں ایک دوسرے
کے ہمنوا تھے۔ برامکہ مجوس کے آتشکدہ کے متولی چلے آتے تھے۔ جب انہیں ہشام کا پتہ چلا تو وہ اسے بے حد
چاہنے لگے۔ روپیہ پیسہ سے اس کی مدد کی اور اس کی ذہانت کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنے لگے۔ شاید
برامکہ کی وجہ ہی سے ہشام شیعہ سے وابستہ ہو گیا۔ جس سے برامکہ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح غالی شیعہ کو

(باقی بر صفحہ ۳۵)

اور یونس بن عبد الرحمن القمی[1] صفات آلہی کا اثبات کرتے تھے۔ اور تجسیم کا عقیدہ رکھتے تھے۔

شیعہ کی نگاہ میں مسئلہ امامت کی اہمیت اور اس کی تردید

شیعہ مصنف ابن المطہر آغاز کتاب میں رقمطراز ہے۔

"یہ ایک مفید رسالہ اور لطیف مقالہ ہے۔ جو دین کے اشرف و اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ اور وہ مسئلہ امامت ہے۔ اس لیے کہ اس کے فہم و ادراک سے عز و شرف کے دروازے کھلتے ہیں۔ یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴) اس کا تعاون حاصل رہے گا اور وہ نو عمر لوگوں کو تشیع کے جال میں پھنسا سکیں گے۔ علاوہ ازیں وہ اکابر شیعہ سے مل کر برامکہ کے بڑے بڑے کام نکالے گا۔ شیعہ مذہب کے مختلف عنصر کے لوگ پائے جاتے تھے۔ ہشام کے عہد اقتدار ہی میں خلیفہ ہارون رشید اپنی خواب غفلت سے چونکا اور برامکہ شعوبیہ اور زنادقہ کو سزا دینے کے درپے ہوا۔ نتیجہ کے طور پر برامکہ زوال پذیر ہو گئے۔ ان واقعات کے دوران ہشام کہیں چھپ گیا اور لوگوں سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت ۱۹۹ھ میں واقع ہوئی۔ ہشام کے عقائد کے لیے دیکھیے (مختصر تحفہ اثنا عشریہ ص ۶۳)

۵ ہشام بن سالم جوالیقی۔ اس کا لقب علاف ہے۔ یہ کہا کرتا تھا کہ خدا کی ایک صورت ہے اور اس نے حضرت آدم کو اپنی صورت کے مطابق پیدا کیا تھا۔ اس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ سر سے لے کر ناف تک کھوکھلا ہے اور ناف سے قدم تک ٹھوس ہے۔ جرح و تعدیل کے شیعہ علماء اسے ثقہ قرار دیتے ہیں۔ یہ سابق الذکر ہشام بن حکم کا معاصر تھا ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یونس بن عبد الرحمن القمی علی بن یقطین کا مولی تھا۔ یہ ہشام بن عبد الملک کے عہد خلافت میں پیدا ہوا۔ یہ امام موسیٰ رضا اور خلیفہ مامون کا معاصر تھا اور فاسد عقائد رکھتا تھا۔ شیعہ روایت کرتے ہیں کہ محمد بن داؤدیہ نے موسیٰ رضا کو بلا کر یونس کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ امام موسیٰ نے جواباً تحریر فرمایا۔ "خدا اس پر اور اس کے اصحاب پر لعنت کرے اللہ تعالیٰ اس سے اور اس کے اصحاب سے بیزار ہے"۔ ایک مرتبہ امام موسیٰ رضا نے یونس کی تالیف کردہ کتاب زمین پر دے ماری اور فرمایا "یہ زانی اور زانیہ کے بیٹے کی تصنیف ہے۔ یہ زندیق کی کتاب ہے"۔ جب امام موسیٰ رضا خلیفہ مامون کی دعوت پر خراسان تشریف لے گئے تو یونس نے ان کے بارے میں کہا۔

(باقی بر صفحہ ۳۶)

ارکان ایمان میں سے ایک ہے اور اس کی وجہ سے جنت میں دائمی زندگی نصیب ہوتی ہے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو شخص امام زمانہ کو پہچانے بغیر مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرا"۔ میں نے سلطان اعظم، شاہ عرب وعجم، غیاث الملۃ والدین خدابندہ کی لائبریری کے لیے یہ کتاب تحریر کی۔ اور اسے چند فصلوں میں ترتیب دیا۔

(۱) پہلی فصل میں امامت کے مسئلہ میں جو مذاہب پائے جاتے تھے بیان کیے۔

(۲) فصل ثانی میں یہ بیان کیا کہ امامیہ کا مسلک واجب الاتباع ہے۔

(۳) فصل ثالث میں حضرت علی کی امامت کے دلائل بیان کیے۔

(۴) فصل رابع میں بارہ اماموں پر روشنی ڈالی۔

(۵) فصل خامس میں خلافت ابوبکر وعمر کا بطلان ثابت کیا (العیاذ باللہ)"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا بیان پر کئی طرق سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ابن المطہر کا یہ قول کہ مسئلہ امامت اہم المطالب ہے بالاتفاق کذب ہے اس لیے کہ ایمان سے اہم اور کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کفار جب عہد نبوی میں مشرف باسلام ہوا کرتے تھے تو ان پر اسلامی احکام جاری کر دیے جاتے تھے اور مسئلہ امامت کا ان کے پاس ذکر تک نہ کیا جاتا۔ پھر یہ مسئلہ اہم المطالب کیونکر ہوا؟ مزید براں شیعہ چار سو ساٹھ[1] سے کچھ زائد سالوں سے انتظار کر رہے ہیں کہ امام محمد بن حسن سامرہ کے تہ خانہ سے نکلے گا۔ اب بتائیے ان کی امامت پر ایمان لانا، ایمان باللہ، ایمان بالرسل اور دیگر معتقدات پر ایمان لانے سے کیونکر اہم ہو سکتا ہے؟

روافض سے کہا جائے گا کہ جو شریعت تمھارے پاس موجود ہے اگر دینی ضرورت کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵) "اگر وہ اس معاملہ میں بخوشی یا ناخوشی داخل ہو گئے تو وہ باغی ہیں"۔

بایں ہمہ وہ شیعہ کے نزدیک ثقہ اور ان کے لیے سرمایۂ افتخار ہے اور وہ اس کی بریت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کی بات ہے اور اب تو تقریباً ہو وہ صدیاں گذر گئیں مگر شیعہ ہنوز امام موصوف کے منتظر ہیں۔ (مترجم عفی عنہ)

کافی ہے تو امام منتظر کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ناکافی ہے تو تم نے خود ہی اپنے دین کے ناقص ہونے کا اعتراف کر لیا اور یہ تسلیم کر لیا کہ تمہاری سعادت آنے والے امام کے حکم کے تابع ہے اور یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا حکم صادر کرے گا۔

ابن العود الحلی کا قول ہے۔

"جب امامیہ کے کسی مسئلہ میں دو قول ہوں ایک کا قائل معلوم ہو اور دوسرے کا نا معلوم۔ تو جس قول کا قائل معلوم نہیں وہی حق ہے۔ اس لیے کہ امام معصوم جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اسی گروہ میں شامل ہے"۔

شیعہ کی جہالت ملاحظہ فرمائیے! جب یہ معلوم نہیں کہ اس قول کا قائل کون ہے اور کسی نے امام سے وہ قول نقل بھی نہیں کیا تو اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ قول اسی کا ہے۔ خلاصہ کلام! شیعہ کا دین مجہول و معدوم پر مبنی ہے۔ امام سے مقصود یہ ہے کہ اس کے اوامر و احکام کی اطاعت کی جائے جب اس کے احکام معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تو عقل و نقل کے اعتبار سے اس کی امامت بے کار ہے۔

شیعہ امام منتظر کے وجود کو ازبس ضروری قرار دیتے ہیں اور اس کی عصمت کے قائل ہیں۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ دین و دنیا کی مصلحتیں وجود امام سے وابستہ ہیں۔

شیعہ کا یہ خیال اس لیے درست نہیں کہ امام منتظر کے عقیدہ سے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اور جو لوگ اس کے قائل نہیں۔ ان کو کوئی دینی و دنیوی نقصان نہیں پہنچا وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

امام منتظر پر ایمان لانا ضروری نہیں

اگر شیعہ کہیں کہ ہم امام منتظر پر اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جیسے بہت سے عابد و زاہد حضرات حضرت الیاس حضرت خضر اور غوث و قطب بزرگوں پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ نہ ان کے وجود کا کچھ پتہ ہے اور نہ ان کے اوامر و نواہی کا[1]

[1] سلطان العلماء العز بن عبد السلام السلمی المتوفی (۵۷۷-۶۶۰) کا ایک رسالہ حلب میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ابدال غوث قطب اور نجباء کے ناموں کی دین میں کوئی اصل نہیں اور یہ کسی حدیث صحیح و ضعیف میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ۱۲

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ کسی عالم کے نزدیک ان پر ایمان لانا ضروری نہیں جو ان پر ایمان لانے کو واجب قرار دیتا ہے اس کا قول اسی طرح مردود ہے جیسے شیعہ کا قول۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہتے ہیں کہ ان کی تصدیق کرنے والا منکر سے افضل ہے۔ حالانکہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کو مشروع قرار نہیں دیا۔ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ قطب و غوث ہدایت و نصرت اور رزق میں اہل زمین کی امداد کرتے ہیں اور یہ چیزیں ان کے توسط کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتیں تو ایسا شخص گمراہ ہے اور اس کا قول اس باب میں نصاریٰ سے ملتا جلتا ہے۔

حضرت خضر و الیاس فوت ہو چکے ہیں

جیسے بعض جہلاء نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے شیوخ کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا علم خدا کے علم و قدرت پر حاوی ہے اور وہ اسی قسم کے علم و قدرت سے بہرہ ور ہیں جیسے ذات خداوندی۔ مزید براں محققین کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ خضر و الیاس فوت ہو چکے ہیں[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ایک شیعہ کا مناظرہ

ایک شیعہ مجھے ملا اور دینی مسائل پر گفتگو کا تقاضا کیا۔ میں نے شیعہ کے نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیا اور منہیات سے روکا۔ لہذا ضروری تھا کہ وہ بندوں پر مہربان ہوتا۔ امام بھی لوگوں پر عنایت خداوندی کی ایک علامت ہے اس لیے کہ امام واجبات کا حکم دے گا اور برے اعمال سے روکے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ شرعی اوامر و اعمال کی اطاعت کریں گے لہذا امام کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو تاکہ مقصد حاصل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ آنحضور کے بعد معصوم صرف حضرت علی المرتضیٰ تھے۔ لہذا آپ کا امام ہونا متعین

---

[1] سنت اللہ یہی چلی آتی ہے کہ انبیاء یا غیر انبیاء سب وقت مقدر پر فوت ہو جاتے ہیں۔ جو شخص دین اسلام کی طرف ایسی نقل منسوب کرے جو اس کے خلاف ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اسے منظر عام پر لائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح حدیث میں ایسی کوئی نقل موجود نہیں ہے۔ ۱۲

ہوا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ آنحضور کے بعد حضرت علیؓ کے سوا اللہ کوئی معصوم نہیں۔ حضرت علی نے حسنؓ کو معصوم قرار دیا۔ حضرت حسنؓ نے حضرت حسین کو یہاں تک کہ نوبت امام منتظر محمد بن حسن تک پہنچی۔ شیعہ نے شیخ الاسلام کی تقریر سن کر اعتراف کیا کہ یہ بڑی اچھی تقریر ہے

جب شیخ الاسلام نے شیعہ[1] کے طرز استدلال کو بیان کیا اور شیعہ نے اسے سراہا تو شیخ اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ:۔ میں اور آپ حق و ہدایت کے طالب ہیں۔ شیعہ کا قول ہے کہ جو امام منتظر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے۔ بتائیے! کیا آپ نے کبھی اسے دیکھا یا ایسے شخص کو دیکھا جس نے امام کو دیکھا ہو؟ یا اس کی کوئی خبر سنی یا اس کی گفتگو کا کچھ علم ہو؟ شیعہ نے کہا "نہیں"۔ شیخ نے کہا پھر ایسے ایمان کا کیا فائدہ اور اس کے ذریعہ ہم پر خدا کی کونسی مہربانی ہوئی؟ مزید براں اللہ تعالے ہمیں ایسے شخص کی اطاعت کا مکلف کیونکر کرتا ہے جس کے امر و نہی سے ہم ناواقف ہیں اور اس کی پہچان کا کوئی طریق ممکن نہیں۔ شیعہ تکلیف مالا یطاق کا شدید انکار کرتے ہیں کیا اس سے زیادہ تکلیف مالا یطاق بھی کوئی ہو سکتی ہے"؟

شیعہ:۔ اس امر کا اثبات تو انہی مقدمات پر مبنی ہے جو آپ نے ذکر کیے۔

شیخ الاسلام:۔ مگر مقصود چیز تو وہی ہے جو ہم سے متعلق ہو اگر امر و نہی ہم سے وابستہ نہ

---

[1] شیخ الاسلام نے شیعہ کے طرز استدلال کو اس لیے واضح کیا تاکہ اسے مناظرہ کی اساس قرار دیا جا سکے یہ غلط ہے کہ حضرت علی نے امام حسن کے معصوم ہونے کی صراحت کردی تھی۔ امام احمد اپنی مسند میں وکیع سے وہ اعمش سے وہ سالم سے اور وہ عبد اللہ بن سبع سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی سے سنا وہ اپنی شہادت کا ذکر کر رہے تھے لوگوں نے کہا "ہم پر خلیفہ مقرر کر دیجئے"۔ فرمایا نہیں۔ میں تمہیں اسی طرح چھوڑ جاؤں گا جیسے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہیں چھوڑا تھا"۔ لوگوں نے کہا آپ خدا کے دربار میں حاضر ہو کر اسے کیا جواب دیں گے؟ فرمایا۔ میں عرض کروں گا کہ بار خدایا تو نے جب تک چاہا مجھے زندہ رکھا پھر فوت کر لیا اور تو ان میں موجود تھا اگر تو چاہتا تو ان کی اصلاح کرتا اور اگر چاہتا بگاڑ دیتا"۔ (مسند احمد ج اول ص ۱۳۰ حدیث نمبر ۱۰۷۸) امام احمد نے اسی قسم کی روایت بطریق اسود بن عامر نقل کی ہے۔ دونوں روایات کی سند صحیح ہے۔ دیکھئے العواصم من القواصم ص ۱۹۹)

ہو۔ تو ہمیں اس سے کیا سروکار؟ جب ان مقدمات کا تذکرہ کسی فائدہ سے خالی ہے تو معلوم ہوا کہ امام منتظر پر ایمان لانا جہالت کی کرشمہ سازی ہے اور اس کا لطف و عنایت ایزدی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر وہ بات درست اور موجب سعادت ہے جو امامیہ اپنے اکابر سے نقل کرتے چلے آئے ہیں تو امام منتظر کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر وہ سعادت و نجات کی موجب نہیں تو امام منتظر کا وجود بے کار ہے۔ مزید براں صرف امام وقت کو پہچاننے یا دیکھنے سے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی جب تک اس کے اوامر و نواہی کی اطاعت نہ کی جائے۔ آخر وہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تبلیغ کرنے والا تو نہیں۔ پھر وہ شخص اعزاز کا مستحق کیونکر ہو سکتا ہے جو فرائض کو ضائع کرتا۔ ظلم و تعدی کا ارتکاب کرتا اور حدود شرعیہ سے تجاوز کرتا ہو۔

امامت ارکان ایمان میں شامل نہیں

شیخ الاسلام نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ شیعہ کا قول ہے کہ حب علیؓ ایک ایسی نیکی ہے جس کی موجودگی میں بدی سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر حب علی کے ہوتے ہوئے گناہوں سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا تو امام معصوم کی قطعاً ضرورت نہیں۔

شیعہ کا یہ قول کہ امامت ارکان ایمان میں سے ہے جہل و بہتان ہے۔ اس لیے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان اور اس کی شاخیں بیان کرتے وقت امامت کا ذکر تک نہ فرمایا۔ قرآن کریم میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں بلکہ ارشاد باری ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال-۲)

(مومن وہ ہیں کہ جب خدا کو یاد کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں)

دوسری جگہ فرمایا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات-۱۵)

(مومن تو وہ ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان لائے پھر شک نہ کیا اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا یہی لوگ اپنے دعوی ایمان میں سچے ہیں)

لے دیکھئے اختصار تحفہ اثنا عشریہ ص ۱۲۰۴

ارشاد ہوتا ہے۔

"لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ ـــــــ اِلیٰ قَوْلِہٖ ـــــــ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ" (البقرہ)

مذکورہ صدر آیات کے علاوہ متعدد آیات اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں مگر کسی میں بھی امامت کے رکن ایمان ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا۔

جہاں تک شیعہ کی ذکر کردہ حدیث "مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ" کا تعلق ہے ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ یہ روایت کس نے بیان کی؟ اس کی اسناد کہاں ہے؟ بخدا آنحضور نے یہ الفاظ یوں نہیں فرمائے۔ البتہ صحیح مسلم کی یہ حدیث معروف ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ واقعہ حرہ کے زمانہ میں عبد اللہ[۱] بن مطیع کے یہاں آئے تو انہوں نے خدام سے تکیہ لانے کے لیے کہا حضرت عبد اللہ نے فرمایا میں آپ کے یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں بلکہ ایک حدیث سنانے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے سنا کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ اللہ تعالے سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور جس کی موت اس حال میں آئے کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

ترکِ بیعت

مذکورہ صدر حدیث حضرت عبد اللہ نے اس وقت بیان کی جب لوگوں نے امیر وقت یزید بن معاویہ کی بیعت توڑی حالانکہ وہ ظالم تھا۔ حدیث ہذا سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شخص حکام وقت کا مطیع نہ ہو یا شمشیر بکف ان کے خلاف نبرد آزما ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

شیعہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ جبر و اکراہ کے بغیر ہمیشہ امراء کی اطاعت سے

۱؎ عبد اللہ بن مطیع مدینہ منورہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا داعی اور یزید کے برخلاف بغاوت کا اولیں محرک تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے امام وقت یزید بن معاویہ کے خلاف جھوٹ کا طوفان کھڑا کیا۔ عوام بھی ان اکاذیب کی تصدیق کرنے لگے اور اس طرح مدینہ میں فتنہ پروری کا آغاز ہوا۔ محمد بن علی بن ابی طالب نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"میں یزید کی صحبت میں رہا ہوں۔ میں نے اسے نماز کا پابند نیکی کا پابند اور متبع سنت پایا۔ لوگ اس سے فقہی مسائل دریافت کرتے تھے" (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۳۳۔ نیز العواصم من القواصم ص ۲۲۳)

منحرف رہتے ہیں۔ یہ حدیث طرفداری کی بنا پر لڑنے والوں کو بھی شامل ہے اور شیعہ بنا بر تعصب لڑنے والوں کے سرفہرست ہیں۔ البتہ طرفداری کے نقطۂ خیال سے لڑنے والے مسلمان کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ اگر وہ اطاعتِ امام سے نکل جائے اور جاہلیت کی موت مرے تو وہ کافر نہیں ہوگا۔ صحیح مسلم میں حضرت جندب بجلی سے مرفوعاً روایت ہے

"جو شخص عصبیت کی دعوت دیتا یا اس کا معاون ہو کہ اندھا دھند لڑ رہا ہو اور وہ مارا جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے"۔

لے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ منہاج السنۃ میں لکھتے ہیں

"سلاطین اسلام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی سلطان اچھا نہیں گذرا جب آپکے عہد خلافت کا تقابل بعد میں آنے والے سلاطین کے ادوار سے کیا جائے تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ رعایا کو جو امن و عافیت آپ کے زمانہ میں نصیب ہوئی وہ کسی بادشاہ کے دور میں حاصل نہ ہو سکی۔ اور جب خلافت حضرت معاویہ کا حضرت ابوبکر کے زمانہ سے مقابلہ کیا جائے تو خلافت راشدہ کی فضیلت نمایاں ہوتی ہے۔ عباسی خلافت کے زمانہ میں لوگ حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت کو مثالی عدل کا دور کہا کرتے تھے۔ مشہور محدث سلیمان بن مہران اعمش ان سے کہا کرتے تھے اگر تم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت پا لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ (یعنی امیر معاویہ کا عہد خلافت عمر بن عبد العزیز سے بھی بہتر تھا) لوگوں نے کہا کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ امیر معاویہ بڑے حلیم و بردبار تھے؟ فرمایا "نہیں بخدا وہ عدل میں بھی بے نظیر تھے"۔ یزید کا عہد خلافت بھی امیر معاویہ کے زمانہ سے چنداں مختلف نہ تھا۔ اراکین سلطنت وہی تھے جو حضرت معاویہ کے زمانہ میں تھے البتہ ہر حکومت کی ضروریات کا اندازہ ایک دوسری سے مختلف ہوتا ہے۔ عبد اللہ بن مطیع نے محمد بن حنفیہ کے عین برعکس افترا پردازی سے کام لے کر یزید کے خلاف جو اتہامات باندھے تھے انکا نتیجہ اس فتنہ سامانی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا جس سے ڈرانے کے لیے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن مطیع کے پاس آئے تھے۔ عبد اللہ بن عمر کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ عبد اللہ بن مطیع نقض بیعت کا جو اقدام کر رہا ہے وہ ظلم ہے جس کا مرتکب جاہلیت کی موت مرتا ہے ابن مطیع کے ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید بھی اسی قسم کے ظلم پر اتر آیا۔ اہل عرب کے نزدیک ظلم کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کو اسکی اصلی جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے۔ سیدھی راہ سے بھٹک جانے کو بھی ظلم کہتے ہیں۔ ابن مطیع اور اسکے رفقاء کار کا ظلم وہ فتنہ سامانی ہے جس کا بیڑا انہوں نے واقعہ حرہ سے قبل اٹھایا اور یزید کا ظلم وہ افسوسناک نتائج ہیں جو اس سے رونما ہوئے (منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱۸۵)

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔
"جو شخص اطاعت امام سے خروج اختیار کرے اور جماعت کو ترک کر کے مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔

شیعہ عرصہ دراز سے اطاعتِ امام سے نکل چکے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی جماعت کو ترک کر دیا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہو تو اس پر صبر کرے۔ اس لیے کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوتا ہے اور اسی حالت میں مر جاتا ہے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے"۔

اور اگر شیعہ کی ذکر کردہ روایت کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہم ان سے پوچھیں گے کہ تم میں سے کون شخص امام زمان کو پہچانتا ہے یا کس نے اسے دیکھا یا ایسے شخص کو دیکھا جو زیارتِ امام سے مشرف ہو چکا ہو؟ یا اس نے امام سے سن کر کوئی مسئلہ یاد کر لیا ہو۔ اس کے برخلاف شیعہ جس امام کے داعی ہیں وہ تین یا پانچ سال کا بچہ[1] ہے جو چار سو ساٹھ سال کی طویل مدت سے ایک تہ خانہ میں چھپا بیٹھا ہے۔ کسی شخص کو اس کا نشان پتہ معلوم نہیں اور نہ اس کے متعلق کوئی خبر سنی گئی ہے ہم صرف ان ائمہ و سلاطین کی اطاعت کے مامور ہیں جو موجود ہوں۔ حکومت و سلطنت سے بہرہ ور ہوں اور لوگ انہیں عام طور سے جانتے ہوں۔ مزید براں ان کی اطاعت صرف معروف میں ضروری ہے منکر میں نہیں۔

---

[1] منہاج السنۃ ج ۱ ص ۲۹ میں ۲۶۰ھ کی بجائے ۲۵۰ھ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام نے منہاج السنۃ سنہ ۷۱۰ھ کے بعد تصنیف کی۔ امام ذہبی نے اختصار کی تاریخ سنہ ۷۲۰ھ تحریر کی ہے اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ امام ذہبی نے یہ اختصار شیخ الاسلام کی زندگی میں ان کی وفات سے آٹھ سال پہلے کیا۔ اس وقت امام ذہبی کی عمر ۴۷ سال تھی۔ اس لیے کہ بقول شیعہ ان کا آخری امام سنہ ۲۶۰ھ میں تہ خانہ میں داخل ہوا ۱۲

ائمہ معصوم نہیں

صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تمہارے بہترین امراء وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہوں اور جو تمھیں چاہتے ہوں تم ان کے جنازہ میں شرکت کرتے ہوں اور وہ تمھارے جنازہ میں۔ تمھارے بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں جن پر تم لعنت بھیجتے ہو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہوں ہم نے عرض کیا حضور کیا ہم ان کی بیعت توڑ نہ ڈالیں؟ فرمایا جبتک وہ نماز کی پابندی کریں تم ایسا نہیں کر سکتے آپ نے دو مرتبہ یہ الفاظ دہرائے جس پر کسی شخص کو حاکم بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے کوئی برا کام کرتے دیکھے تو اسے نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھے مگر اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے" (صحیح مسلم)

اس ضمن میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ ائمہ معصوم نہیں[1]۔

شیعہ امامیہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ امامت کی ضرورت صرف فروعات میں ہوتی ہے۔ اصول میں نہیں۔ اس لیے کہ دینی اصول وقواعد اہم واشرف ہوتے ہیں۔ وہ یہ بات بھی مانتے ہیں کہ امام زمان کے ذریعہ ابھی تک کوئی مصلحت حاصل نہیں ہوئی۔ اب بتلائیے اس شخص کی سعی وجہد سے زیادہ بے کار کوشش کس کی ہوگی۔ جو اطاعت ائمہ میں بڑی زحمت اٹھاتا۔ اکثر قیل وقال سے کام لیتا۔ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوتا۔ سابقین اولین پر لعنت بھیجتا اور کفار ومنافقین کا دست راست بنا رہتا ہے۔ بایں ہمہ وہ حیلہ گری سے بھی نہیں چوکتا۔ دشوار گذار راستوں پہ گامزن ہوتا۔ جھوٹی شہادت سے تقویت حاصل کرتا اور اپنے متبعین کو فریب دہی

---

[1] شیعہ کے گیارہ امام خود غیر معصوم ہونے کے معترف تھے۔ لوگوں نے ائمہ سے سن کردہ دعائیں ذکر کی ہیں جن میں بارگاہ ایزدی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کیا کرتے تھے اگر وہ معصوم ہوتے تو گناہوں سے پاک ہوتے اور مغفرت طلب کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ بارہواں امام بقول شیعہ نوعمری ہی میں تہ خانہ میں داخل ہو گیا نہ انھیں کسی نے دیکھا اور نہ ان سے کوئی دعا سن کر یاد رکھی۔ عصر حاضر تک کسی شخص نے ان کی آواز تک نہیں سنی ۱۲

سے پھانستا رہتا ہے[1]

اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک امام کا وجود از بس ضروری ہے جو اسے احکام خداوندی سے آگاہ کرتا رہے۔ حالانکہ امام سے اسے کوئی مصلحت ومنفعت حاصل نہیں ہوتی۔ بجز اس کے کہ وہ حسرت وندامت کا شکار رہو۔ خطا کا مرتکب ہو۔ دور دراز سفر میں مبتلا رہ کر امام غائب کا منتظر رہے اور تہ خانہ میں داخل ہونے والے ایک امام کی وجہ سے امت محمدی سے بغض وعداوت کا سلوک روا رکھے۔ حالانکہ اس امام نے نہ کوئی کام کیا اور نہ اس کی زبان سے ایک لفظ صادر ہوا۔ مزید براں اگر امام مذکور کا وجود یقینی ہوتا تو بھی شیعہ کو ان سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ امت کے دانشمند لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ شیعہ کے یہاں افلاس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مزید براں حسن بن علی عسکری کے یہاں سرے سے کوئی اولاد ہی نہ تھی جیسا کہ مورخ ابن جریر طبری اور عبد الباقی بن قانع وغیرہ نسب دانوں نے ذکر کیا ہے[2]

---

[1] شیعہ پر الزامات کا طویل سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ الزامات بلا دلیل نہیں بلکہ ان کے تاریخی دلائل وشواہد موجود ہیں۔ علاوہ ازیں خود شیعہ کی تصنیفات میں ایسے حقائق کی کمی نہیں اگر عمر ووقت میں گنجائش ہو تو شیعی تصنیفات میں سے مواد لیکر ضخیم مجلدات تحریر کی جا سکتی ہیں ۱۲

[2] مورخ ابن جریر طبری ۳۰۲ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حسب ونسب کا ایک جھوٹا دعویدار حیلہ جوئی کر کے خلیفہ المقتدر عباسی کے دربار میں حاضر ہوا اور یہ دعوی کیا کہ وہ محمد بن حسن بن علی بن موسی بن جعفر ہے۔ خلیفہ نے بنی ہاشم کے مشائخ کو بلایا ان کا سردار ان دنوں احمد بن عبد الصمد تھا جو ابن طومار کے نام سے مشہور تھا ابن طومار نے کہا کہ حسن کی کوئی اولاد نہ تھی پھر تم محمد بن حسن کیسے ہو گئے؟ بنی ہاشم چلا چلا کر کہنے لگے کہ اسے سخت سزا دے کر لوگوں میں اس کی تشہیر کی جائے چنانچہ اسے ایک اونٹ پر سوار کر کے ذو الحجہ کی آٹھویں اور نویں تاریخ کو شہر کی دونوں جانبوں میں پھرا کر مغربی جانب ایک قید خانہ میں قید کر دیا گیا۔ طبری کے ذکر کردہ واقعہ میں قابل غور بات ابن طومار کا یہ قول ہے کہ "حسن عسکری نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی"۔ یہ قول ان لوگوں کے قول سے زیادہ وقیع ہے جن کا دعوی ہے کہ حسن عسکری کی لونڈی نرگس کے یہاں آپ کی زندگی یا بعد از موت ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ حسن عسکری کا بھائی جعفر بن علی بن موسی باقی لوگوں کی نسبت آپ کا نہایت قریبی تعلقدار تھا۔ حسن عسکری کی وفات کے بعد اس نے سب ترکہ خود لے لیا تھا۔ اس لیے کہ دوسرا کوئی شخص ان کا وارث نہ تھا (باقی بر صفحہ)

امام غائب کے عقیدہ کا ابطال

شیعہ کا قول ہے کہ امام منتظر دو تین یا پانچ سال کی عمر میں تہ خانہ میں داخل ہوا۔ نظر بریں وہ یتیم ہو گا جس کی تربیت اور مال کی حفاظت نص قرآنی کی بنا پر ضروری ہے۔ سات سال کی عمر میں اسے نماز کی ادائیگی کا حکم دیا جائے گا۔ غور فرمائیے! جس نے ہنوز نہ وضو کیا نہ نماز ادا کی اور اگر بقول شیعہ وہ زندہ بھی ہوتا تو وہ مجبور ہوتا (اور ولی کی اجازت کے بغیر اسے تصرفات کی اجازت نہ ہوتی) ایسا شخص امام کیونکر ہو سکے گا؟ اتنی طویل مدت میں کوئی امام کیوں نہ مقرر کیا گیا اور امامت کی مصلحت کو کیونکر پیش نظر نہ رکھا گیا؟

فصل اول

مسئلہ امامت میں مختلف مذاہب کا بیان

شیعہ مصنف ابن المطہر مسئلہ امامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"امامیہ کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ خداوند تعالےٰ عادل و حکیم ہے۔ وہ ظالم نہیں وہ افعال قبیحہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ وہ بندوں پر بڑا مہربان ہے اور وہی کام کرتا ہے جو ان کے لیے سودمند ہو۔

سلسلۂ تحریر کو جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔

"سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امامت کا سلسلہ جاری کیا اور معصوم اولیاء مقرر کیے تاکہ لوگ سہو و خطا سے مامون رہیں اور یہ عالم ارضی لطف و عنایت ربانی سے خالی نہ رہے۔ جب آنحضور کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو آپ رسالت کی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے اور اس امر کی تصریح کر دی کہ آپ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے۔ پھر حسب ذیل خلفاء علی الترتیب ظہور پذیر ہوں گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵) جعفر بن علی نے ان کی لونڈی کو بھی روکے رکھا تھا اور اس وقت اجازت دی جب پتہ چل گیا کہ ان میں کوئی بھی حاملہ نہیں۔ تاریخ کے اوراق ایسی شخصیت سے آشنا نہیں جسے حسن عسکری کی اولاد کہا جا سکے۔ گروہی تعصب کی بنا پر یہ دعویٰ کرنا الگ بات ہے وہ تا حال بقید حیات ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس (افسانے) کے آغاز کا حقیقت سے اتنا ہی تعلق ہو جتنا اس کے انجام کا۔ وسبحان واهب العقول۔

(۱) حسن بن علی

(۲) حسین بن علی

(۳) علی بن حسین

(۴) محمد (باقر)

(۵) جعفر (صادق)

(۶) موسیٰ بن جعفر

(۷) علی بن موسیٰ

(۸) محمد بن علی جواد

(۹) علی بن محمد ھادی

(۱۰) حسن بن علی عسکری

(۱۱) محمد بن حسن

سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم امامت کی وصیت کرنے کے بعد فوت ہوئے۔ بخلاف ازیں اہل سنت ان جملہ امور کے قائل نہیں وہ خدا کے لیے عدل و حکمت کا اثبات نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ افعال قبیحہ اور اخلال بالواجب کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں بلکہ حکمت و مصلحت سے یکسر خالی ہیں بقول ان کے اللہ تعالیٰ ظلم و عبث کا مرتکب ہوتا ہے اور وہ کام نہیں کرتا جو بندوں کے لیے اصلح ہو بلکہ وہ انواع و اقسام کے معاصی و کفریات بھی انجام دیتا ہے۔ کرۂ ارضی پر جس قدر فسادات رونما ہوتے ہیں وہ سب اس کی طرف منسوب ہیں۔ بقول اہلسنت اطاعت کنندہ ثواب کا مستحق نہیں اور عاصی عذاب کا استحقاق نہیں رکھتا۔ بعض اوقات وہ انبیاء کو عذاب میں مبتلا کرتا اور ابلیس و فرعون کو جزا دیتا ہے انبیاء معصوم نہیں بلکہ ان سے خطا اور فسق و کذب کا صدور ممکن ہے۔ آپ نے کسی کو امامت کی وصیت نہیں کی بلکہ بلا وصیت فوت ہو گئے۔ آنحضور کے بعد بقول اہلسنت حضرت ابوبکر خلیفۂ اول ہوئے کیونکہ حضرت عمر اور چار دیگر صحابہ یعنی ابوعبیدہ، سالم مولےٰ ابی حذیفہ، اسید بن حضیر اور بشیر بن سعد رضی اللہ عنہم نے آپ کی بیعت کر لی تھی۔ پھر حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو خلیفۂ

ثانی مقرر کیا۔ بعد ازاں حضرت عمر نے چھ اشخاص کو خلافت کے لیے منتخب کیا ان میں سے بعض نے حضرت عثمان کو خلافت کے لیے چن لیا۔

پھر لوگوں نے حضرت علی کی بیعت کر لی۔ اور آپ خلیفہ قرار پائے[1]۔ اس کے بعد اہل سنت کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے بعض حضرت حسن کی امامت کے قائل ہیں اور بعض معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ سفاح عباسی کے ظہور تک خلافت بنو امیہ میں ہی رہی"۔

شیعہ مصنف کی تردید میں شیخ الاسلام کی تقریر

شیعہ مصنف نے اہل سنت اور شیعہ کے جو افکار و معتقدات بیان کیے ہیں وہ تحریف و کذب سے خالی نہیں۔ چنانچہ ہم اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اہلسنت اور شیعہ کے عقاید بیان کرتے ہوئے انکار تقدیر اور عدل کا ذکر بے سود ہے اس لیے کہ فریقین کے بعض گروہ ان دونوں کے قائل ہیں مثلاً شیعہ کے بعض فرقے قدر کو تسلیم کرتے اور عدل وجور کا انکار کرتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے قائلین میں بعض لوگ مثلاً معتزلہ عدل و جور کے قائل ہیں۔ چنانچہ اکابر شیعہ مثلاً شیخ مفید۔ موسوی۔ طوسی اور کراجکی نے یہ عقیدہ معتزلہ سے اخذ کیا۔ قدیم شیعہ اس کے قائل نہ تھے۔ اس سے واضح ہوا کہ مسائل امامت بیان کرتے ہوئے تقدیر کا ذکر و بیان قطعی طور سے غیر متعلق ہے۔ امامیہ سے جو بیان نقل کیا ہے وہ بھی تشنۂ تکمیل ہے۔ ان کے افکار و عقائد کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ کسی نے آپ کو خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے چھٹے روز حضرت علی نے منبر پر جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "لوگو! میں تمہاری اجازت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ (امامت و خلافت) تمہارا ذاتی معاملہ ہے اس میں کسی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں بجز اس کے کہ تم کسی کو امیر مقرر کر دو۔ قبل ازیں اس ضمن میں ہمارے مابین اختلاف رونما ہو چکا ہے۔ اگر تمہیں (میرا خلیفہ ہونا) پسند ہے تو میں (مسند خلافت پر) بیٹھ جاؤں گا۔ ورنہ میں کسی پر اظہار ناراضگی نہیں کرتا۔ اس واقعہ کی تفصیلات تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۵۶-۵۷ا پر ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد "کہ کسی کو مداخلت کا حق نہیں"۔ اس پوری عمارت کو منہدم کر دیتا ہے جو شیعہ نے ۱۳ صدیوں سے آج تک تعمیر کر رکھی ہے۔ دیکھئے (العواصم من القواصم ص ۱۴۲-۱۴۳)

شیعہ کے عقائد

شیعہ کہتے ہیں۔
(۱) اللہ تعالےٰ نے حیوانات کے افعال کو پیدا نہیں کیا بلکہ حوادث اس کی خلق وقدرت کے بغیر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

(۲) اللہ تعالےٰ کسی گمراہ کو راہ راست پر نہیں لاسکتا اور نہ ہدایت یافتہ کو گمراہ کرنے پر قادر ہے۔

(۳) کوئی انسان ہدایت خداوندی کا محتاج نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ہر چیز واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ اس سے ہدایت یاب ہونا بندے کا اپنا کام ہے۔ خدا کی مدد سے ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

(۴) ہدایت ربانی مومن وکافر سب کے لیے یکساں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے جس طرح مومنین کو دین کی نعمت سے بہرور کیا ہے اسی طرح کفار کو بھی اس نعمت سے محروم نہیں کیا جس طرح حضرت علی کو ہدایت یافتہ بنایا اسی طرح ابوجہل کو بھی ہدایت سے نوازا۔ یوں سمجھیے کہ ایک والد دو بیٹوں کو یکساں رقم دیتا ہے ایک اسے اطاعت میں صرف کرتا ہے اور دوسرا معصیت میں۔

(۵) مشیت ایزدی ایسے امور میں متعلق ہوتی ہے جو ظہور پذیر نہیں ہوتے اور بعض امور اس کی مشیت کے بغیر وجود میں آتے ہیں گویا وہ ذات خداوندی کے لیے مشیت عامہ وقدرت تامہ کا اثبات نہیں کرتے۔ شیعہ کی رائے میں اللہ تعالےٰ کی صفت خلق جملہ حوادث کو شامل نہیں۔ بعینہ معتزلہ بھی یہی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں شیعہ کے دو قول ہیں۔

باقی رہا شیعہ کا یہ قول کہ "اللہ تعالےٰ نے ائمہ معصومین کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ یہ عالم ارضی اس کی عنایات سے خالی نہ رہے"۔

بقول شیعہ ائمہ معصومین مجبور ومظلوم اور حد درجہ بے بس ہیں۔ انھیں کوئی قدرت واختیار حاصل نہیں۔ شیعہ حضرت علی اور بارہ اماموں کے بارے میں بھی —— آنحضور کی وفات سے لیکر آپ کے مسند خلافت پر متمکن ہونے تک —— انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ شیعہ اس بات کے معترف ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ائمہ معصومین کو تصرفات واختیارات کا مالک نہیں بنایا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ثُمَّ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝"

(ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت سے نوازا اور ان کو عظیم سلطنت عطا کی۔)

اگر کہا جائے کہ تقرر ائمہ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر ان کی اطاعت ضروری قرار دی جو ان کا اطاعت شعار ہوتا وہ اسے ہدایت سے بہرہ اندوز کرتے مگر لوگ ان کی نافرمانی کرتے تھے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ لوگ صرف اسی بنا پر خداوندی لطف وعنایت سے محروم نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کی تکذیب کرتے اور ان کے احکام سے سرتابی کے مرتکب ہوتے تھے۔

باقی رہا امام منتظر کا مسئلہ! تو اس عقیدہ سے کوئی بھی نفع اندوز نہیں ہوا۔ نہ اس کے ماننے والے اور نہ انکار کرنے والے۔

جہاں تک حضرت علیؓ کے علاوہ دیگر ائمہ اثنا عشر کا تعلق ہے ان سے لوگ اسی طرح مستفید ہوتے رہے جیسے دیگر علماء و فضلاء سے۔ البتہ اولی الامر سے جو منفعت مطلوب ہوتی ہے وہ ائمہ سے حاصل نہ ہو سکی۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ابن المطہر نے جس عنایت ربانی کا ذکر کیا ہے وہ دجل و فریب کی کرشمہ سازی ہے اور بس۔

ابن المطہر کا یہ قول کہ اہل سنت ذات باری کے لیے عدل وحکمت کا اثبات نہیں کرتے۔ دو لحاظ سے باطل ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ بہت سے اہل نظر و فکر جو منکر نصوص ہیں خدا کے لیے عدل و انصاف کا اثبات کرتے ہیں مثلاً معتزلہ اور ان کے ہمنوا۔ اہل سنت میں سے کوئی شخص بھی خدا کے حکیم ہونے کا منکر نہیں اور کوئی بھی اسے قبائح کا مرتکب نہیں ٹھہراتا۔ اہل اسلام میں جو شخص علی الاطلاق ایسا عقیدہ رکھتا ہو وہ مباح الدم ہے۔

مسئلۂ تقدیر

تقدیر کا مسئلہ متنازع فیہا ہے۔ متاخرین امامیہ جمہور اہل اسلام صحابہ تابعین اور اہل بیت اس مسئلہ میں معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔ یہ امر اختلافی ہے کہ خداوندی عدل وحکمت اور اس ظلم سے کیا مراد ہے جس سے خداوند کا منزہ ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے افعال و احکام کے معلل ہونے میں بھی اختلاف ہے۔

۱۔ ایک گروہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خدا سے ظلم کا صدور ممکن نہیں اور وہ جمع بین الضدین کی طرح ذات باری کے لیے محال لذاتہ ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو چیز ممکن ہو اور قدرت خداوندی کے دائرہ میں داخل ہو اسے ظلم سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ اگر اطاعت شعار کو عذاب میں مبتلا کر دے

اور عاصی پر انعامات کی بارش کرے تو بقول ان کے یہ ظلم نہیں۔ وہ کہتے ہیں ظلم اس تصرف کا نام ہے جس کا حق حاصل نہ ہو۔ جب اللہ تعالے جملہ اختیارات سے بہرہ ور ہے تو اس کا یہ فعل ظلم کیونکر ہوا؟ عقیدۂ قدر پر ایمان رکھنے والے بہت سے متکلمین اور فقہا یہی رائے رکھتے ہیں۔

۲۔ دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ ظلم قدرتِ خداوندی کے احاطہ میں داخل ہے اور وہ ممکنات سے بھی ہے چونکہ اللہ تعالے عادل ہے اس لیے وہ ظلم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اس نے خود اپنی ذات کی مدح ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡـًٔا (یونس۔۴۴)

(اللہ تعالے لوگوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا)

ظاہر ہے کہ مدح اسی کام کے چھوڑنے پر کی جاسکتی ہے جس کے کرنے پر آدمی قدرت رکھتا ہو مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلۡمًا وَّلَا ھَضۡمًا (طٰہٰ۔۱۱۲)

(جو حالت ایمان میں نیک کام کرے وہ ظلم اور کمی سے نہیں ڈریگا)

(۲) وَقُضِیَ بَیۡنَھُمۡ بِالۡحَقِّ وَھُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ (الزمر۔۶۹)

(انکے مابین صحیح فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا)

(۳) وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ (ق۔۲۹)

(میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں)

مذکورہ آیات میں اللہ تعالے نے اپنی ذات کو اس امر سے منزہ قرار دیا ہے۔ جس پر وہ قدرت رکھتا ہے نہ کہ ایک محال بات سے جس پر وہ سرے سے قادر ہی نہیں۔

صحیح حدیث میں آنحضور سے منقول ہے کہ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

"میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے"۔

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالے نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر رکھا ہے۔ جس طرح اس نے رحمت کو اپنے لیے ضروری قرار دے رکھا ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

"کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ" (الانعام۔۱۲)

(اس نے رحمت کو اپنی ذات پہ لکھ رکھا ہے)

صحیح حدیث میں وارد ہے

اللہ تعالے نے جب مخلوقات کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک کتاب میں جو عرش پہ رکھی ہے یہ الفاظ تحریر کیئے۔ "میری رحمت میرے غضب پہ غالب ہے"۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کو ذات باری نے اپنے لیے واجب یا حرام کر رکھا ہے وہ اس پہ قادر ہے اس لیے کہ جو چیز ممکنات میں سے نہیں وہ خدا کی ذات پہ حرام یا واجب کیونکر ہو سکتی ہے۔؟

اکثر اہلسنت و محدثین و مفسرین نیز فقہاء صوفیا اور متکلمین جو تقدیر کے قائل ہیں یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ بنابریں یہ لوگ خداوندی عدل و احسان کے قائل ہیں نہ کہ وہ قدریہ جن کا قول ہے کہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے سے ایمان ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ ظلم کی وہی قسم ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے اپنی ذات کو منزہ قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزلہ۔ ۸)

جو شخص ذرہ بھر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھے گا اور جو ذرہ بھر برائی کا ارتکاب کریگا وہ اسے دیکھے گا۔

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ مومن کو ہدایت یاب کر کے اس پر احسان دھرنا اور کافر کو اس سے محروم رکھنا ظلم ہے۔ اس کا یہ عقیدہ دو اعتبار سے جہل کا مترادف ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ چونکہ مومن کافر پہ فضیلت رکھتا ہے بنابریں وہ اس اعزاز کا مستحق ہوا۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الحجرات ۱۷)

بلکہ اللہ تم پہ احسان دھرتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی جانب متوجہ کیا اگر تم سچے ہو۔

دوسری جگہ انبیاء کرام کی زبانی ارشاد ہوا۔

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (ابراہیم۔ ۱۱)

ہم تو صرف تمہاری طرح کے انسان ہیں مگر جس پر چاہتا ہے اللہ اپنا احسان فرماتا ہے

آیت سے آشکارا ہوا کہ اللہ تعالے صرف اسی کو سزا دیتا ہے جو اس کا مستحق ہو نیکوکار کو کبھی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔

اسی لیے یہ مثل مشہور ہے۔

كُلُّ نِعْمَةٍ مِّنْهُ فَضْلٌ وَكُلُّ نِقْمَةٍ مِّنْهُ عَدْلٌ

ہر احسان اس کا فضل ہے اور ہر سزا اس کا عدل ہے

خداوند کریم خود فرماتا ہے کہ وہ گناہوں کے باعث لوگوں کو سزا دیتا ہے اور اس کے انعامات محض اس کے فضل و احسان کی کرشمہ سازی ہے۔

حدیث صحیح میں وارد ہے۔

"جو اللہ تعالے کا فضل و احسان پائے تو اس کا شکر ادا کرے اور جو اس کے سوا (حوادث و آلام وغیرہ) پائے تو اپنے آپ کو ملامت کرے"۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (النساء-۷۹)

تجھے جو آرام پہنچتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو پسندیدہ نعمتیں مثلاً نصرتِ خداوندی اور وسعت رزق وغیرہ تجھے حاصل ہوتی ہیں یہ عین عنایت ربانی ہے اور جو تکلیف آتی ہے وہ تمھارے گناہوں کا ثمرہ ہے اس آیت میں الحسنات سے نعمتیں اور السیئات سے مصائب و آلام مراد ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا۔

وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ (الاعراف - ۱۶۸)

ہم نے تم کو آرام و عافیت اور تکلیفات سے آزمایا

نیز فرمایا۔ إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ (التوبہ-۵۰)

اگر تجھے آرام پہنچتا ہے تو انہیں برا محسوس ہوتا ہے

مزید ارشاد فرمایا۔

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا (آل عمران-۱۲۰)

(اگر تمہیں خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو انھیں برا محسوس ہوتا ہے اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں)

کیا افعالِ خداوندی معلّل ہیں؟

مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالےٰ موصوف بالحکمت ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک حکمت کے معنی یہ ہے کہ اسے افعال العباد کا علم ہے اور وہ حسب ارادہ ان کو وجود میں لاتا ہے۔ جمہور اہلسنت کا خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے خلق و امر میں حکیم ہے۔ حکمت سے مشیت علی الاطلاق مراد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر صاحب ارادہ حکیم بھی ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں (۱) محمود۔ (۲) مذموم۔ اللہ تعالےٰ کے خلق و امر میں جو عواقب محمودہ پائے جاتے ہیں اسی کو حکمت کہتے ہیں۔
پہلے نظریہ کے قائلین مثلاً ابوالحسن اشعری اور ان کے ہم خیال فقہاء کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جن افعال خداوندی کا ذکر آیا ہے ان میں لام تعلیل نہیں بلکہ لام عاقبت ہے (یعنی افعال اللہ معلل نہیں ہیں)، بخلاف ازیں جمہور کے نزدیک خداوند تعالےٰ کے افعال و احکام معلل ہیں۔
تعلیل افعال کے مسئلہ کا امامت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اکثر اہل سنت حکمت و تعلیل کا اثبات کرتے ہیں۔ جو انکار کرتے ہیں وہ دو دلیلوں سے احتجاج کرتے ہیں۔

منکرین تعلیل کی پہلی دلیل

پہلی دلیل یہ ہے کہ افعال خداوندی کو معلل ماننے سے تسلسل لازم آتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالےٰ جب کسی علت کے پیش نظر کوئی کام کرتا ہے تو وہ علت کسی دوسری علت کی محتاج ہو گی بشرطیکہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ہر حادث کے لیے علت کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر حوادث بلا علت بھی ظہور پذیر ہو سکتے ہیں تو سرے سے اثبات علت کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوتی۔

منکرین تعلیل کی دوسری دلیل

منکرین تعلیل دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ جب علت کی بنا پر کوئی کام انجام دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ علت سے اس کے فعل کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر علت کا وجود اس کے عدم سے اولیٰ نہ ہوتا تو اسے علت ہی نہ کہتے ظاہر ہے کہ جو اپنے افعال کی تکمیل میں کسی دوسرے کا محتاج ہے وہ بذات خود ناقص ہے اور ناقص ہونا ذات باری کے لئے ممتنع ہے
منکرین تعلیل معتزلہ کے اصولوں کے مطابق ان پر حجت قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جس علت کی بنا پر کوئی فعل انجام دیا گیا ہے اگر ذات خداوندی کے اعتبار سے علت کا وجود و عدم یکساں ہے تو وہ علت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر علت کا وجود اس کے عدم سے افضل ہے تو پھر دو حال سے خالی نہیں (۱) علت ذات باری سے جدا ہو گی اندریں صورت اس فعل کی تکمیل کسی اور کے ذریعہ ہو گی (۲) دوسرا یہ کہ علت کا قیام ذات باری کے ساتھ ہو اس صورت میں اس کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا۔

مجوزین تعلیل کے دلائل مجوزین تعلیل کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ معتزلہ تعلیل کی بنا پر جس بات کا اثبات کرتے ہیں وہ بالائے ادراک ہے ان کی رائے میں جس علت سے فعل کا صدور ہوتا ہے وہ فاعل سے منفصل ہوتی ہے اور فاعل کے لیے اس کا وجود و عدم یکساں ہوتا ہے۔ قائلین تعلیل کے افکار و نظریات کی توضیح یہ ہے۔

"اللہ تعالےٰ میں حب و رضا کی صفت پائی جاتی ہے۔ یہ ارادہ کی نسبت اخص ہے۔ بخلاف ازیں معتزلہ اور اکثر اشاعرہ محبت رضا اور ارادہ کو یکساں قرار دیتے ہیں۔ جمہور اہل سنت کی رائے میں اللہ تعالےٰ کفر کو پسند نہیں کرتا۔ اگرچہ دیگر مخلوقات کی طرح کفر بھی اس کے ارادہ کی حدود میں داخل ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی حکمت پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کفر فاعل کے اعتبار سے شر ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جو فعل فاعل کے نقطۂ خیال سے شر ہو وہ کسی حکمت سے خالی ہو۔ بلکہ مخلوقات خداوندی میں بعض حکمتیں نگاہ سے اوجھل رہتی ہیں"۔

مانعین تعلیل نے علت کے تسلسل کا جو اعتراض وارد کیا ہے۔ تعلیل کے قائلین اس کے دو جواب دیتے ہیں۔

پہلا جواب یہ ہے کہ حوادث کا یہ تسلسل مستقبل میں ہو گا نہ کہ حوادث ماضیہ میں۔ اللہ تعالےٰ بنا بر حکمت جب کوئی فعل انجام دیتا ہے تو وہ حکمت بعد از فعل رونما ہو جاتی ہے۔ جب اس حکمت سے ایک اور حکمت مطلوب ہو گی تو یہ تسلسل فی المستقبل ہو گا جو جمہور امت کے نزدیک جائز ہے اس لیے کہ انعامات جنت اور عذاب دوزخ دونوں دائمی ہیں حالانکہ ان میں بھی حوادث رونما ہوتے رہیں گے۔ البتہ جہم[۱] اس کا منکر ہے اس کی رائے میں جنت و دوزخ فانی ہیں۔

---

[۱] جہم بن صفوان کوفہ میں پیدا ہوا۔ یہ بڑا طلیق اللسان تھا البتہ علم سے بے بہرہ تھا۔ کوفہ زنادقہ کا گھر (باقی بر صفحہ ۵۶)

ابو ہذیل علاف کا خیال ہے کہ اہل جنت و دوزخ کی حرکات ختم ہو جائیں گی اور وہ دائمی سکون میں رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ اعتقاد ہے کہ حوادث کا تسلسل ماضی میں ممتنع ہے۔ اس میں اہل اسلام کے دو قول ہیں۔

بعض کا قول ہے کہ اللہ تعالے ازل ہی میں جب چاہتا کلام کرتا اور وہ ہمیشہ سے فعال رہا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کے سوا ہر چیز حادث ہے اور ذات باری کی طرح کوئی چیز قدیم نہیں ہے۔

فلاسفہ کے عقائد و دلائل

بخلاف ازیں فلاسفہ افلاک کو قدیم مانتے اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ذات باری تعالے اشیاء کی مُبدع (ایجاد کنندہ) ان کی علت تامہ اور موجب بذاتہ ہے۔ یہ گمراہانہ نظریہ ہے اس لیے کہ علت و معلول باہم لازم و ملزوم ہوتے ہیں اور علت معلول سے متاخر نہیں ہو سکتی۔ حوادث دنیائے ارضی میں مشہور و معروف ہیں۔ اگر صانع موجب بذاتہ حوادث کی علت تامہ اور معلول کو مستلزم ہوتا تو حوادث ہرگز عالم وجود میں نہ آتے۔ اس لیے کہ حوادث کا ظہور علتِ تامہ ازلیہ سے ممتنع ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵) تھا۔ جہم ایک زندیق سے ملا اور اس سے انکار صفات کا عقیدہ اخذ کیا۔ جہم کی رائے میں ذات باری کو صفات مخلوق سے متصف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر جہم جبر کا قائل ہو گیا اور کہنے لگا کہ انسان مجبور محض ہے اور اس میں استطاعت بالکل نہیں پائی جاتی۔ یہ عراق سے نقل مکانی کر کے خراسان اور مشرقی ممالک میں پہنچا اور وہاں حارث بن شریح کا کاتب بن گیا جس نے والیٔ خراسان نصر بن سیار کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ یہاں اس نے اپنے گمراہانہ عقائد کی نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ محدث ابن ابی حاتم بطریق صالح بن احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں کہ میں نے ہشام بن عبد الملک اموی کا خط بنام نصر بن سیار پڑھا تھا۔ ہشام لکھتا ہے۔ "تمہارے علاقہ میں دہریہ میں سے جہم نامی ایک شخص اٹھا ہے اگر قابو چلے تو اسے تہ تیغ کر دو"۔ حارث بن شریح اور نصر بن سیار کے اعوان و انصار کے مابین جو جھڑپیں ہوتی تھیں ان میں حارث کو قتل کیا گیا تھا اور جہم قیدی ہوا۔ نصر نے اپنے کوتوال سلم بن احوز کو حکم دیا کہ وہ جہم کو قتل کر دے۔ چنانچہ ۱۲۸ھ میں الحاد کے جرم میں جہم کو تہ تیغ کیا گیا۔ محدث ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں "جہم بن صفوان گمراہ اور بدعتی تھا۔ یہ جہمیہ کا سردار تھا۔ تو عمر تابعین کے زمانہ میں ہلاک ہوا۔ اس سے کوئی حدیث مروی نہیں مگر اس نے عظیم شرارت کی تخم کاری کی۔"

اگر عالم کو قدیم مانا جائے تو اس کے مبدع کو علت تامہ تسلیم کرنا پڑے گا اور علت تامہ کا معلول اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ بنابریں حادث کا ظہور و شیوع اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا فاعل علت تامہ نہیں ہے۔ جب ازل میں علت تامہ منتفی ہو گئی تو اس سے قدم عالم کے عقیدہ کا بطلان ثابت ہو گیا۔ مگر اس سے ذات خداوندی کے متعلق ازلی اور فعال لما یشاء ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔

قدامت عالم کی سب سے اہم دلیل فلاسفہ کے نزدیک یہ ہے کہ حوادث کا ظہور سبب حادث کے بغیر ممکن نہیں۔ بنابریں ایسی ذات کا وجود بھی ممتنعات میں سے ہو گا جو پہلے افعال سے معطل رہی اور پھر کسی سبب کے ظاہر ہوئے بغیر افعال کو انجام دینا شروع کیا۔ فلاسفہ کی اس دلیل سے قدامت عالم ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خداوند تعالےٰ ازل ہی سے فعال رہا ہے۔ جب یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ وہ ایسے افعال کا فاعل ہے جن کا قیام ذاتِ خداوندی کے ساتھ ہے۔ یا اسے ایسے افعال کا فاعل قرار دیا جائے جو رفتہ رفتہ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں تو اس سے یہ دلیل پوری ہو جائے گی اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالےٰ کے سوا ہر چیز پہلے معدوم اور پھر عالم وجود میں آئی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی متعدد سورتوں مثلاً سورۂ انعام، الرعد، غافر اور زمر میں فرمان باری تعالےٰ ہے۔

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (وہ ہر چیز کا خالق ہے)

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مخلوق وہی چیز ہوتی ہے جو پہلے معدوم ہو۔ لہٰذا مخلوقات میں سے کوئی چیز بھی خدا کی مقارن نہیں ہو سکتی۔ بخلاف ازیں فلاسفہ کا قول ہے کہ عالم معلول ہے اور ذات باری اس کے لیے موجب و مفیض ہے۔ اللہ تعالےٰ کو جو تقدم عالم پر حاصل ہے وہ عظمت و شرافت کے اعتبار سے ہے زمانہ کے لحاظ سے نہیں۔

ایک دوسری دلیل سے اثبات مقصود

دوسری وجہ یہ ہے کہ وجود مفعول کے وقت فاعل کا پایا جانا ضروری ہے اس کا معدوم ہونا جائز نہیں۔ اس لیے کہ معدوم کسی دوسری چیز کو وجود میں نہیں لا سکتا علاوہ ازیں مفعول کے وجود میں آنے ہی سے اللہ تعالیٰ کی صفت ایجاب و احداث کا اثبات ہو گا۔ اگر فرض کیا جائے کہ اس نے کوئی کام انجام دینا اسے چاہا اور وہ فعل معدوم ہونے کے بعد وجود میں آ گیا۔ تو اس سے

لازم آئے گا کہ اس کے فعل وایجاب کے وقت معلول موجود نہ ہوگا۔ بنابریں جب موجب حوادث کے متعلق یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ دوسری چیز کو پہلی کے بعد وجود میں لاتا ہے بجز اس کے کہ اس کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا ہو جس کی بنا پر وہ دوسری کو پیدا کر سکے تو وجود اثر کے وقت موثر تام معدوم ہوگا اور یہ محال ہے۔

مثلاً جب کوئی شخص فاصلہ طے کر رہا ہو اور مسافت کی جزء ثانی کا طے کرنا جزء اول کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں پہلی جزء طے کرتے وقت چند امور رونما ہوں گے جو اس کے ساتھ قائم ہوں گے مثلاً قدرت اور ارادہ وغیرہ۔ انہی کی بنا پر جزء ثانی وجود میں آئے گی اس لیے نہیں کہ جزء اول کے معدوم ہونے سے ہی وہ جزء ثانی کو طے کر لے گا۔ جب اللہ تعالےٰ کے احداث حوادث کو سابق الذکر مثال کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ ہر حادث کو وجود میں لاتے وقت اللہ تعالےٰ کے احوال بدلتے رہیں گے۔ اس لیے کہ اگر اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی اور اس کی حالت حادث کو پیدا کرنے سے پہلے اور بعد یکساں رہتی ہے تو دونوں وقتوں میں سے ایک کے مختص بالاحداث ہونے کے لیے کسی مخصص کی ضرورت ہوگی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ صدور حوادث کے لیے فاعل کا وجود ناگزیر ہے۔ حالانکہ ایزد متعال ازل سے ابد تک ایک ہی حالت پر ہے اس میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اندریں صورت ایک وقت کا کسی حادثہ سے مختص ہونا ممتنع ہوگا۔

ابن سینا اور قائلین قدامت عالم نے معتزلہ کے خلاف مذکورہ صدر دلیل سے احتجاج کیا ہے وہ اپنا نظریہ یوں بیان کرتے ہیں۔

بقول معتزلہ جب اللہ تعالےٰ ازل میں بے کار تھا اور کچھ نہیں کرتا تھا تو اب بھی وہ اسی حال پر قائم ہے لہٰذا بے کار ہوگا حالانکہ اسے فرض کیا گیا ہے کہ وہ فاعل ہے۔ یہ خلاف مفروض ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ استحالہ ذات باری کو معطل عن الفعل تسلیم کرنے سے لازم آیا۔

اس دلیل کے جواب میں قدامت عالم کا عقیدہ رکھنے والوں سے کہا جائے گا کہ یہ دلیل تمہارے خلاف پڑتی ہے تم ذات باری کو بسیط مانتے ہو جس سے حوادث تو صادر ہوتے ہیں مگر کوئی فعل و وصف اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں۔ اگر حوادث کا صدور ان وسائط کی وجہ سے ہوتا ہے جو ذات باری کے لیے لازم ہوتے ہیں تو ذات باری کی قدامت کی وجہ سے وسائط بھی قدیم ہوں گے۔ حالانکہ قائلین قدامت کا

قول ہے کہ اس ذات قدیم سے حوادث کا صدور ممتنع ہے جو ایک ہی حالت پہ قائم رہے۔

معتزلہ کی تیسری دلیل

معتزلہ کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ذات باری فیاض ہے اور اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات کو حدوث کے ساتھ اس لیے مختص کر دیا جاتا ہے کہ استعداد قبول میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور استعداد قبول کا حدوث حدوثِ حرکات کا سبب ہے۔ یہ ظاہر البطلان ہے اس لیے کہ یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ذات باری جو کہ فعال اور دائم الفیض ہے استعداد قبول کو خود جنم نہ دیتی ہو جیساکہ عقل فعال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دائم الفیض ہے۔

جب اللہ تعالےٰ جملہ اشیاء کا خالق ہے تو وہ ایسی علتِ تامہ نہیں ہو سکتا ہے جو ازلی ہو اور اپنے معلول کو مستلزم ہو۔ کیونکہ اس سے جلول کا ازلی ہونا لازم آتا ہے اور جب ذاتِ باری کے سوا ہر چیز اس کی معلول ہے تو اس کے ماسوا کو ازلی تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ دلیل خلافِ حس اور بدیہی العناد ہے۔ البتہ یہ دلیل ان متکلمین پر حجت ہو سکتی ہے جن کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و مشیت کے لحاظ سے ازل میں فعل و کلام پر قادر نہ تھا بلکہ فعل اور کلام اس کے لیے ممتنع تھے اور جو کام ممتنع ہو وہ قدرت کے دائرہ سے خارج ہوتا ہے بعد ازاں اللہ تعالیٰ فعل و کلام پہ قادر ہو گیا اور وہ امتناع ذاتی سے امکان ذاتی میں منقلب ہو گیا۔ معتزلہ اور ان کے ہم نوا شیعہ اور کرامیہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

کلام باری سے متعلق علماء کے مذاہب

ابن کلاب[1] اور ابو الحسن اشعری[2] کا قول ہے کہ کلام شے واحد لذاتہ ہے اور وہ قدرت و مشیت کے تحت داخل نہیں۔

---

[1] ابن کلاب کا نام عبد اللہ بن سعید تمیمی بصری ہے۔ سید مرتضیٰ زبیدی شرح قاموس مادہ کلب میں لکھتے ہیں۔ مجلس مناظرہ میں شدت مجادلہ کی بنا پر اسے ابن کلاب کہنے لگے۔ کلاب اس کے دادا کا نام نہ تھا۔ یہ اہل سنت کے فرقہ کلابیہ کا سردار تھا۔ ماموں کے عہد خلافت میں ابن کلاب اور معتزلہ کے مابین مناظرے ہوا کرتے تھے۔ یہ ۲۴۰ھ کے بعد فوت ہوا۔ ابن السبکی کی طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۵۱ میں اس کا تذکرہ موجود ہے ابن الندیم نے الفہرست ص ۲۵۵ میں ایک شخص عبد اللہ بن محمد بن کلاب القطان کا ذکر کیا ہے مگر وہ عبد اللہ بن سعید بن کلاب کے علاوہ کوئی اور شخصیت ہے ان دونوں کے والد کا نام بھی الگ الگ ہے۔ اس (باقی بر صفحہ ۶۰)

بعض متکلمین محدثین و فقہاء اور بقول علامہ شہرستانی سلف و حنابلہ کے نزدیک کلام یا حروف و اصوات قدیمۃ الاعیان کا نام ہے جو اس کی مشیت و قدرت سے وابستہ نہیں۔ یہ عقیدہ سالمیہ[1] کی جانب بھی منسوب کیا جاتا ہے مگر جمہور ائمہ حنابلہ[2] یہ عقیدہ نہیں رکھتے۔ بلکہ ان میں سے ایک گروہ اس کا معتقد ہے۔ بعض مالکیہ اور شافعیہ بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ ان کے طریق استدلال کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حوادث ہمیشہ نہیں رہتے اور ان کا ایک مبدا ہوتا ہے۔ حوادث میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس سے پہلے کوئی دوسرا حادث نہ ہو وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حوادث جس چیز سے متقارن و متصل ہوں وہ بھی حادث ہوگی۔ لہذا باری تعالے کا اپنی مشیت کے

(بقیہ حاشیہ ص۵۹) شخصیت پر بحث ہو سکتی ہے ۱۲

۲؎ ان کا نام علی بن اسمٰعیل کنیت ابو الحسن اور نسبت اشعری ہے ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۴ھ میں وفات پائی۔ یہ کبار ائمہ متکلمین میں سے تھے۔ آغاز کار میں معتزلی المشرب اور جبائی المتوفی (۲۳۵-۳۰۷) کے شاگرد رشید تھے۔ ۳۰۰ھ میں پختہ سالی کو پہنچے تو اللہ تعالے نے ہدایت نصیب فرمائی۔ مسلک اعتزال کو خیرباد کہہ کر یہ معتزلہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور ان کی تردید میں درس و مناظرہ کا آغاز کیا۔ ابتداءً یہ طریق جدل و تاویل اور مسلک سلف کی درمیانی راہ پر گامزن ہوئے۔ پھر خالص جادۂ سلف کے پیرو بن گئے اور غیبی افکار و معتقدات میں صرف اسی کا اثبات کرنے لگے جو نصوص سے ثابت ہو۔ اس عقیدہ کی تشریح و توضیح کے لیے آپ نے اپنی آخری کتب تصنیف کیں۔ ان میں "کتاب الابانۃ" عام طور سے متداول ہے۔ اشعری کے سیرت نگاروں کے نزدیک یہ ان کی آخری تصنیف ہے (دیکھئے شذرات الذہب)، مشیت ایزدی یہی تھی کہ امام اشعری کو طریق سلف کا پیروکار بنایا جائے۔ اشاعرہ طریق سلف کے خلاف جو کچھ کہتے ہیں اور انھیں امام اشعری کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اشعری کی دامن اس سے پاک ہے اور وہ ان سب مسائل سے رجوع کر کے صرف انہی باتوں کے قائل ہو گئے تھے جو کتاب الابانۃ میں درج ہیں (حاشیہ صفحہ ہذا)

۱؎ سالمیہ ہشام بن سالم جوالیقی کے پیروکار تھے۔ قبل ازیں ہشام بن سالم کا حال مذکور ہو چکا ہے۔

۲؎ حنابلہ غیبی معتقدات میں نصوص کے پیروکار تھے اور انکو بدون تاویل ظاہر پر محمول کرتے تھے۔ البتہ یہ پابندی عاید کرتے تھے کہ "لیس کمثلہ شئ" ۱۲

شروع ہی سے فاعل و متکلم ہونا ممتنع ہے بلکہ ذات باری کا فعل و کلام پہ قادر ہونا بھی محالات میں سے ہے اس لیے کہ محال پر قدرت رکھنا بھی محال ہوتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ مذکورہ صدر دلیل سے جسم کا حادث ہونا ثابت ہوا۔ کیونکہ جسم حوادث سے خالی نہیں اور جو چیز حوادث سے خالی نہ ہو وہ خود حادث ہوتی ہے۔ وہ نوع حوادث اور عین حوادث کے مابین کچھ فرق نہیں کرتے۔

اس دلیل کے جواب میں فلاسفہ اور ان کے ہم عقیدہ علماء سے کہا جائے گا کہ جس دلیل سے تم نے عالم کا حادث ہونا ثابت کیا ہے بعینہ یہی دلیل عدم حدوث پر دلالت کرتی ہے اور اس سے تمہارا مدعا ثابت ہونے کی بجائے اس کی نقیض ثابت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حادث کا ممکن ہونا ناگزیر ہے اور ممکن کا ایک پہلو دوسرے پہلو پر کسی مرجح تام کی بنا پر راجح ہوتا ہے۔ اور امکان کے لیے کوئی مقرر وقت نہیں۔ جو وقت بھی مقدر کیا جائے گا۔ امکان اس سے قبل ثابت ہوگا۔ لہذا فعل کا شروع ہی سے ممکن اور جائز ہونا واجب ٹھہرا۔ اس سے یہ بھی لازم آیا کہ ذات باری ازل ہی سے اس پر قادر تھی۔ نیز ایسے حوادث کا جواز ثابت ہوا جن کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔

قدریہ و معتزلہ کا زاویۂ نگاہ

قدریہ و معتزلہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ امکان حوادث کا کوئی نقطۂ آغاز نہیں۔ البتہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حوادث کا مسبوق بالعدم ہونا شرط ہے اس کی کوئی ابتداء نہیں۔ اس لیے کہ ہماری رائے میں حوادث کا قدیمۃ النوع ہونا ہونا محال ہے بلکہ ان کا حادث النوع ہونا ضروری ہے مگر حدوث کسی خاص وقت میں واجب نہیں۔ بنا بریں حوادث کا آغاز نہیں ہوتا۔ اور وہ مسبوق بالعدم ہوتے ہیں برخلاف جنس حوادث کے۔

مزید فرمایا۔

سوال یہ ہے کہ آیا امکانِ حوادث کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں؟ جس طرح اس سے بالآخر جمع بین النقیضین لازم آتا ہے اسی طرح پہلی دلیل سے آغاز ہی میں دو نقیضوں کا جمع ہونا لازم آتا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

شیعہ مصنف کی غلط بیانی

قادر مختار وہ ذات گرامی ہے کہ اگر چاہے کرے اور اگر چاہے نہ کرے وہ جو جس چیز کو وجود میں لانا چاہتا

ہے وہ ظہور پذیر ہوتی ہے اور جسے نہیں چاہتا وہ عالم وجود میں نہیں آتی"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

مقصود یہاں اصل مسئلہ تعدیل کی توضیح و تشریح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ مصنف اہلسنت کے مسائل کا حلیہ بگاڑ کر غلط انداز میں پیش کر کے انھیں طعن و تشنیع کے تیروں سے چھلنی کرتا اور ان مسائل کے حقائق و دلائل کو دانستہ بیان نہیں کرتا۔ شیعہ مصنف اہل سنت سے جو مسائل نقل کرتا ہے یا وہ غلط ہوتے ہیں یا جمیع اہلسنت یا اکثر اہل سنت پر دروغ بافی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جن مسائل کا ذکر و بیان میں وہ سچا ہوتا ہے ان میں اہل سنت کا قول اس کے طرز بیان سے بہتر ہوتا ہے۔ زیادہ تر شیعہ مصنف اشاعرہ[۱] کو ہدف ملامت بناتا ہے حالانکہ وہ معتزلہ اور روافض دونوں سے بہتر ہیں۔

اشاعرہ کے خلاف استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

معتزلہ کے خلاف اشاعرہ کا استدلال

تمہارے نقطۂ نظر کا انحصار اسی دلیل پر ہے یہی وجہ ہے کہ دہریہ و فلاسفہ اور ابن سینا کو تمہارے خلاف صف آرائی کا موقع ملا۔

درحقیقت یہ دلیل حدوث عالم کی مثبت نہیں بلکہ اس کے منافی ہے۔ جب حادث کے لیے کسی سبب حادث کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دلیل حدوث حادث بلا سبب کو مستلزم ہے تو اس سے یہ لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔

---

[۱] اشاعرہ ابو الحسن اشعری کی جانب منسوب ہیں امام اشعری کے حالات پر حاشیہ گزر چکا ہے۔ امام اشعری تین مختلف مراحل وادوار سے گزرے تھے (۱) پہلے معتزلی المشرب تھے (۲) پھر معتزلہ کے مخالف ہو گئے تاہم ان کا مسلک طریق سلف اور اہل اعتزال کے بین بین تھا (۳) امام اشعری پر تیسرا دور یہ آیا کہ خالص سلفی المشرب ہو گئے اور اس ضمن میں "کتاب الابانۃ" تصنیف کی وہ چاہتے تھے کہ اسی مسلک پر وہ مالک حقیقی سے ملیں۔ جہاں تک اشاعرہ یعنی اس کلامی فرقے کا تعلق ہے جو آپ کی جانب منسوب ہے وہ پہلے اور تیسرے دور میں امام اشعری کی نمائندگی نہیں کرتا اشاعرہ کا مسلک امام اشعری کے ان ارشادات سے ماخوذ ہے جو آپ کے دور ثانی سے تعلق رکھتے ہیں اس کے بعد آپ نے ان مسائل سے طریق سلف کی جانب رجوع کر لیا تھا ۱۲

جب ہمارے نزدیک ممکن کے دونوں پہلوؤں میں سے بلا مرجح ایک کو ترجیح دینا جائز ہے تو اس سے اثبات صانع کا راستہ بند ہو جائے گا حالانکہ تم اسی پہ گامزن ہو۔"

اشاعرہ معتزلہ کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"تم اللہ تعالیٰ کے افعال کو علل حادثہ سے معلل قرار دیتے ہو۔ تم سے کہا جائے گا کہ آیا تمہارے نزدیک حوادث کا کوئی سبب حادث بھی ہے یا نہیں؟ اگر تم اثبات میں جواب دو تو حوادث کا تسلسل لازم آتا ہے جو تمہارے نظریہ کے خلاف ہے اور اگر تم سبب حادث کو ضروری تصور نہیں کرتے تو پھر تم سے کہا جائے گا کہ حوادث کی کوئی غایت حادثہ بھی نہیں اس لیے کہ فاعل محدث کے فعل کے لیے کسی سبب یا غایت کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ اگر تم کہو کہ احداث حوادث کا کوئی سبب نہیں ہوتا۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ پھر اس کی غایت مطلوبہ بھی کوئی نہیں۔ اگر تم یہ کہو کہ جس فاعل کے فعل سے کوئی حکمت مقصود نہیں وہ نادان ہے اور اس کا فعل عبث ہے۔ جواباً کہا جا سکتا ہے کہ سبب حادث کے بغیر کسی چیز کو پیدا کرنا بھی نادانی ہے۔ بلکہ عقلاً یہ اس سے مذموم تر ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال مشیت کے تابع اور بلا علت ہوتے ہیں اس کا قول تمہارے قول سے بہتر ہے کیونکہ یہ قول تسلسل سے خالی ہے اور اس سے یہ استحالہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ ایسی حکمت کی بنا پہ کام کرتا ہے جو اس سے منفصل ہوتی ہے۔ بلاشبہ معتزلہ کا قول تسلسل کی زد میں نہیں آتا۔ مگر اہل السنت والحدیث میں سے جو لوگ تعلیل کے معتقد ہیں وہ جملہ اعتراضات سے بچ جاتے ہیں۔

فعل قبیح اور ذات باری

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ فعل قبیح اور اخلال بالواجب کا مرتکب ہو سکتا ہے۔"

قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ کوئی مسلم یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ البتہ منکرین تقدیر اللہ تعالیٰ کو مخلوقات پر قیاس کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ بھی واجبات اور محرمات کا پابند ہے۔ گویا وہ افعال خداوندی کو افعال مخلوق ایسا تصور کرتے ہیں بخلاف ازیں شیعہ اور اہل سنت میں سے جو لوگ تقدیر کے قائل ہیں وہ بالاتفاق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ذات وصفات میں بے نظیر ہے اسی طرح وہ اپنے افعال میں بھی عدیم المثال ہے۔ بنا بریں جو اشیاء و امور ہم پر واجب یا حرام ہیں اس پر واجب و

حرام نہیں اور جو چیز ہمارے لیے قبیح ہے وہ اس کے حق میں قبیح نہیں۔ وہ اس ضمن میں بھی متحد الخیال ہیں کہ اس کے وعدہ کا وقوع ناگزیر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (آل عمران ۹، الرعد ۳۱)

اللہ تعالے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا

اسی طرح اللہ تعالے انبیاء و اولیاء کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ بلکہ جنت میں داخل کرے گا۔ البتہ دو مسائل میں ان کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

پہلا مسئلہ

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ آیا بنی نوع انسان اپنی عقل کے بل بوتے پر بعض افعال کے حسن کو معلوم کر سکتے ہیں یا نہیں۔ نیز یہ کہ کیا ذات خداوندی اپنے افعال سے متصف ہے یا نہیں؟ اسی طرح کیا وہ بعض افعال کی قباحت اور ذات باری کے ایسے افعال سے منزہ ہونے کو بھی جانتے ہیں یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ عقل کی مدد سے حسن و قبح کو معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کی ذات میں تو اس لیے نہیں کہ قبیح کا صدور اس سے ممتنع لذاتہ ہے اور بندوں کے حق میں حسن و قبح کے نہ معلوم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حسن و قبح کا اثبات صرف شریعت سے ہوتا ہے۔ یہ اشاعرہ اور بہت سے فقہاء کا قول ہے۔ اگر حسن کو ملائم و موافق اور قبیح کو منافی و مخالف کے معنی میں لیا جائے تو یہ ان کے نزدیک بالاتفاق عقل سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ علی ہٰذا القیاس اگر حسن سے صفت کمال اور قبح سے صفت نقصان مراد لی جائے تو اس کا عقل سے دریافت کرنا ممکن ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ عقل کی مدد سے اللہ تعالے اور بندوں کے بہت سے افعال کا حُسن و قبح معلوم کیا جا سکتا ہے۔ معتزلہ کے دوش بدوش کرامیہ[۱]۔ جمہور حنفیہ ابوبکر ابہری مالکی اور حنابلہ

---

[۱] کرامیہ محمد بن کرّام سیستانی المتوفی ۲۵۵ھ کی پیروی کرتے ہیں یہ بڑا عابد و زاہد تھا اسکی شب زندہ داری کے پیش نظر ہزاروں لوگ اسکے دام فریب میں آگئے۔ محدث ابن حبان اسکے بارے میں فرماتے ہیں۔ "اس نے سب مذاہب میں سے گھٹیا مذہب اختیار کیا تھا احادیث نبویہ میں سے ضعیف ترین احادیث جمع کر رکھی تھیں"۔ اس نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک کتاب بھیج کر اس میں درج کردہ احادیث کے متعلق دریافت کیا ان میں یہ حدیث بھی تھی "زہری سالم سے اور وہ اپنے والد سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ ایمان کم و بیش (باقی برصفحہ ۶۵)

میں سے ابو الحسن تمیمی اور ابو الخطاب کلوا ذی بھی اسی کے قائل ہیں۔ ابو الخطاب نے بیان کیا ہے کہ بہت سے اہل علم یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً محدثین میں سے ابو سنجری اور سعد زنجانی کا یہی نظریہ ہے۔

ورود شرع سے پہلے حظر و اباحت کا مسئلہ

اگر کسی معاملہ میں شریعت کا کوئی حکم وارد نہ ہو تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ صادر کیا جائے؟ ائمہ دین اس ضمن میں مختلف الخیال ہیں۔ علماء احناف اور بہت سے شوافع وحنابلہ ایسی چیز کو مباح خیال کرتے ہیں۔ ابن سُریج، ابن اسحٰق مروزی، ابو الحسن تمیمی اور ابو الخطاب کی یہی رائے ہے۔

متعدد علماء مثلاً ابو علی بن ابی ہریرہ، ابن حامد اور قاضی ابو یعلیٰ ایسی چیز کو حرام تصور کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ یہ دونوں قول ایسی صورت میں درست ہو سکتے ہیں جب حسن و قبح کا انحصار عقل پر ہو۔ جو شخص عقل سے احکام معلوم کرنے کا قائل نہیں وہ شرعی حکم کے وارد ہونے سے قبل کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ امام اشعری، ابو الحسن جزری، ابو بکر صیرفی اور ابن عقیل کا نقطۂ نظر یہی ہے۔

دوسرا مسئلہ

علماء کے یہاں یہ مسئلہ محل نزاع ہے کہ آیا ذات باری پر کوئی امر واجب یا حرام ہے یا نہیں؟ اور آیا اس کی ذات کو وجوب و حرام سے موصوف کر سکتے یا نہیں؟

علماء کی ایک جماعت یہ رائے رکھتی ہے کہ ذات خداوندی پر کوئی چیز واجب یا حرام نہیں بلکہ کسی چیز کے اس پر واجب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز وقوع پذیر ہوگی اور حرام ہونے سے یہ

(بقیہ ص٦٤) نہیں ہوتا"۔ امام بخاری نے کتاب کی پشت پر ارقام فرمایا: "جو شخص یہ احادیث بیان کرے وہ ضرب شدید اور حبس طویل کا مستوجب ہے۔" ابن الکرام کا نظریہ تھا کہ قول باللسان کا نام ایمان ہے اگر دل میں کوئی شخص کفر کا معتقد ہو تو زبان سے کلمہ پڑھ کر وہ مومن ہو سکتا ہے۔ کرامیہ کہتے ہیں خدا کا جسم ہے مگر باقی اجسام کی طرح نہیں۔ ابن الکرام کو بدعات کے جرم میں نیشاپور کے شہر میں اسے آٹھ سال تک محبوس رکھا گیا تھا۔ پھر نکال دیا گیا۔ چنانچہ وہ بیت المقدس کی طرف چلا گیا اور اسکی موت فلسطین ہی میں واقع ہوئی ۱۲

مراد ہے کہ وہ ظہور پذیر نہیں ہوگی۔
علماء کا دوسرا گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذات خود بعض اشیاء کو اپنے پر واجب اور بعض کو حرام ٹھہرایا ہے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلیٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام ۵۴)

تمہارے رب نے اپنے آپ پر رحمت لکھ رکھی ہے

نیز فرمایا

وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الروم ۴۷)

مومنوں کی مدد کرنا ہم پر حق ہے۔

حدیث نبوی میں وارد ہے۔

"میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دے رکھا ہے"۔
البتہ ہم اس کی ذات پر کسی چیز کو واجب یا حرام نہیں ٹھہرا سکتے[1]۔ جو یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ کہ ذات باری پر کوئی چیز حرام یا واجب نہیں تو اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ نہ قبیح کا مرتکب ہو سکتا ہے اور نہ اخلال بالواجب کا۔
بخلاف ازیں جو یہ کہتا ہے کہ اس نے بندوں کو آگاہ کر کے اپنی ذات پر بعض اشیاء کو واجب یا حرام قرار دے رکھا ہے اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر عائد کردہ پابندیاں میں خلل انداز ہی نہیں کرتا۔
شیخ الاسلام ابن تیمیہ شیعہ مصنف کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
"تم اسی راہ پر گامزن ہو جس پر تمہارے نظائر و امثال چل رہے ہیں۔ ایک چیز کو بطریق الزام نقل کرتے اور اہل سنت کو ایسے امور کا قائل قرار دیتے ہو جو انھوں نے نہیں کہی۔ تم نے اہل سنت کے اقوال سے یہ قول استنباط کر لیا کہ "خدا پر کوئی چیز واجب نہیں اور کوئی چیز اس کے لیے قبیح بھی نہیں" یہ دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔
مزید برآں اہل سنت تقدیر کے قائل ہیں اور بصراحت کہتے ہیں

---

[1] دیکھیے کتاب التوسل والوسیلہ از شیخ الاسلام ابن تیمیہ طبع السلفیہ ص ۵۷-۵۸ نیز ۶۱-۶۲

"مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ"

(اللہ نے جو چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا)

اہل سنت کے نزدیک ہدایت فضلِ خداوندی ہے۔ بخلاف ازیں تمہارے خیال میں بندہ کے لیے وہ کام کرنا جو ذات باری نے اپنے آپ پر واجب کر رکھا ہے اس کے لیے ضروری ہے۔ اور اس کی ضد حرام ہے۔ خلاصہ کلام! تم نے بعض اشیاء کو اللہ تعالے پر واجب اور بعض کو حرام قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ اس نے خود ان کو واجب نہیں ٹھہرایا اور نہ ان کا وجوب شرع وعقل کی روشنی میں ثابت ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ انکو واجب نہ ٹھہرانے والوں کی جانب تم یہ قول منسوب کرتے ہو۔ کہ اللہ تعالے اخلال بالواجب کا مرتکب ہوتا ہے یہ صریح قسم کا دجل وفریب ہے۔

شیخ الاسلام شیعہ مناظر سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کیا افعال خداوندی معلّل بالحکم ہیں

تم اہل سنت کے متعلق یہ کہتے ہو کہ ان کے یہاں افعال باری تعالے غرض و حکمت پر مبنی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالے کے افعال واحکام کے معلّل بالحکم ہونے میں اہل سنت کے دو قول ہیں۔ اکثر علماء فقہیات پر تبصرہ کرتے وقت تعلیلِ احکام کو تسلیم کرتے ہیں علماء اصول میں سے بھی بعض بصراحت تعلیل کے معترف ہیں۔

جہاں تک افعالِ خداوندی کی "غرض" کا تعلق ہے۔ معتزلہ امامت شیخین (ابوبکرؓ وعمرؓ) کے قائل ہونے کے باوصف اس کی تصریح کرتے ہیں۔ البتہ فقہاء اور ان کے ہم نوا علماء کے نزدیک لفظ غرض سے نقص کا مفہوم مترشح ہوتا ہے لہٰذا وہ ذات باری پر اس کا اطلاق نہیں کرتے مثلاً جب کسی سے کہا جاتا ہے فُلَانٌ لَہٗ غَرَضٌ یا کہا جاتا ہے فَعَلَ لِغَرَضٍ تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے مذموم مقصد کے پیش نظر وہ کام انجام دیا۔ حالانکہ ذات باری اس سے منزّہ ہے۔

تم یہ کہتے ہو کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالے ظلم وعبث کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ ایسی

بات کسی مسلمان کے منہ سے نہیں نکل سکتی تَعَالَی اللّٰہُ عَنْ ذٰلِکَ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔

البتہ اہل سنت اللہ تعالے کو افعالِ عباد کا خالق قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

ھُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (الانعام - ۱۰۲) (وہ ہر چیز کا خالق ہے)

ظلم کا صدور اس شخص سے ہوتا ہے جو اس کا مرتکب ہوتا ہے۔ ظلم کو پیدا کرنے والا (ذاتِ خداوندی) ظالم نہیں ہو جاتا۔ غور کیجئے کہ عبادات روزہ اور حج وغیرہ کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے مگر ان کو پیدا کرنے سے وہ عابد۔ روزہ دار اور حاجی نہیں بن گیا۔ اسی طرح بھوک کو بھی اسی نے پیدا کیا مگر وہ بھوکا نہیں بن گیا۔ تو پھر ظلم کی تخلیق سے وہ ظالم کیونکر ٹھہرا؟

قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالے جب کسی جگہ کسی صفت یا فعل کو پیدا کرتا ہے تو وہ اس فعل یا صفت سے متصف نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے تمام پیدا کردہ اَعراض (جمع عَرض وہ چیز جو بذاتِ خود قائم نہ ہو بلکہ اس کا وجود کسی چیز کے باعث ہو) کے ساتھ موصوف کر دیا جاتا۔

معتزلہ کی لغزش

معتزلہ اور ان کے اتباع نے یہاں زبردست ٹھوکر کھائی ہے انکا قول ہے کہ کلام خداوندی وہی ہے جو اس نے دوسروں میں پیدا کی اور اس کے افعال وہی ہیں جو اس کی ذات سے الگ ہیں۔ خلاصۂ کلام کوئی قول و فعل ذاتِ الٰہی سے وابستہ و قائم نہیں۔ ملائکہ اور انبیاء و رسل جو کچھ فرماتے رہے وہی کلام ربانی ہے۔

معتزلہ سے کہا جائے گا کہ کوئی صفت جب کسی محل میں قائم ہو تو اس کا حکم اس محل پر عائد ہوتا ہے۔ غیر پر نہیں مثلاً جب اللہ تعالے کسی جگہ حرکت کو جنم دے گا تو وہی چیز متحرک کہلائے گی نہ کہ حرکت کا پیدا کنندہ۔ اسی طرح جب وہ کسی محل میں رنگ ہوا یا علم و قدرت کو پیدا کرے گا تو وہی چیز رنگین ہوادار اور قادر و عالم کہلائے گی نہ کہ ان امور کا پیدا کرنے والا۔ نظر بریں جب باری تعالے کسی میں کلام کو جنم دے گا تو وہی شخص متکلم کہلائے گا نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

معتزلہ اپنے نقطۂ نگاہ کے اثبات میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالے جس طرح محسن و عادل ہے اور اس کی صفت عدل و احسان کا تعلق اس کی مخلوقات سے ہے اسی طرح وہ متکلم ہے۔ اور اس کی صفت کلام مخلوقات سے وابستہ ہے۔ یہ دلیل اشاعرہ کے یہاں حجت ہو سکتی ہے۔

کیونکہ ان کی رائے میں کسی فعل کا قیام بھی ذات خداوندی کے ساتھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کا مظہر مخلوقات ہیں اور بس۔ امام شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے اصحاب کی ایک جماعت بھی یہی رائے رکھتی ہے۔ بخلاف ازیں جمہور کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ صفت خلق اور مخلوق میں فرق ہے اور دونوں ایک نہیں۔ احناف بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام اشعری نے چونکہ مذکورہ صدر نظریہ اختیار کیا ہے بنا بریں انھیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ بندوں کے افعال خدا کے افعال ہیں اس لیے ان کے نزدیک افعال العباد اور افعال باری کے مابین کوئی دیوار حائل نہیں۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ بندوں کی جانب افعال کی نسبت مجازاً کردی جاتی ہے۔ اشعری کے نزدیک بنی نوع انسان جو افعال انجام دیتے ہیں اس کا نام کسب ہے۔ وہ کسب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ جو چیز قدرتِ حادثہ کے محل میں قدرت کی معیت و رفاقت کے ساتھ حاصل ہو وہ کسب ہے۔ اکثر لوگ اس کا ابطال کرتے اور کہتے ہیں۔ کہ علم الکلام میں تین عجائبات ہیں (۱) نظام[1] کا طفرہ (۲) احوال[2] ابی ہاشم (۳) امام اشعری کا کسب۔ جمہور اہل سنت کا قول ہے کہ بندے درحقیقت اپنے افعال کے فاعل ہوتے ہیں۔ امام اشعری[3] کا آخری قول یہی ہے

۱؎ ابراہیم بن سیار نظام المتوفی (۱۸۵-۲۲۱) بصرہ کے اکابر معتزلہ میں سے تھا۔ عالم شباب میں ثنویہ دہریہ اور ملاحدہ کی صحبت میں رہا۔ اور ہر فرقہ کے نظریات سے استفادہ کیا۔ بے حد درجہ ذہین تھا مشہور ادیب جاحظ کہا کرتا تھا کہ نظام ایسے آدمی صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ طفرہ نظام کی ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جس کی تشریح یہاں خارج از بحث ہے ۱۲

۲؎ ابوہاشم عبدالسلام بن ابوعلی محمد الجبائی المتوفی (۲۴۷-۳۲۱) ابوہاشم اور اس کا والد کبار معتزلہ میں سے تھے ۱۲

۳؎ امام اشعری کے افکار و عقائد تغیر پذیر رہے۔ آغاز کار میں وہ معتزلی المشرب تھے۔ پھر معتزلہ کے خلاف صف آرا ہوئے اور ان کے نظریات کا ابطال کرنے لگے۔ پھر ان کا خاتمہ بالخیر ہوا اور خلوص نیت سے سلف کے پیرو بن گئے۔ قبل ازیں ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں ۱۲ اللھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ولوالدیہم اجمعین آمین یارب العالمین

شیخ الاسلام شیعہ مناظر کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تم اہلسنت کے متعلق یہ کہتے ہو کہ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ وہ کام نہیں کرتا جو بندوں کے لیے اصلح ہو بلکہ وہ ایسے کام کرتا ہے جو فساد کے موجب ہوں مثلاً کفر و عصیان وغیرہ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب ہیں (تَعَالَى اللهُ عَنْ ذٰلِكَ)

ہم جواباً کہتے ہیں کہ

اللہ تعالےٰ بندوں کی حرکات وعبادات کا خالق ہے

بے شک بعض اہلسنت اور شیعہ کا نقطۂ نظر یہی ہے مگر جمہور اہلسنت اس کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ جملہ اشیاء کا خالق و مالک ہے باری تعالےٰ نے ان کو بھی پیدا کیا اور ان کی حرکات عبادات اور ارادات کو بھی جنم دیا۔

منکرین تقدیر اس چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت سے خارج قرار دیتے ہیں جو اس کی مخلوقات میں سب سے اولیٰ و اعلیٰ ہے ___ اور وہ اللہ کے انبیا اولیا اور ملائکہ کی طاعت و عبادت ہے۔ منکرین تقدیر کا عقیدہ یہ ہے کہ باری تعالےٰ نے عبادت کو پیدا نہیں کیا وہ بندے کو عبادت پر نہ لگا سکتا ہے اور نہ اس کے ذہن میں عبادت کا خیال القاء کر سکتا ہے۔ وہ کسی کو ہدایت عطا کرنے پر بھی قادر نہیں۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی منقول ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرہ۔ ۱۲۸)

اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنے لیے اطاعت شعار بنا لے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلم جماعت تیار کر دے

نیز فرمایا۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ (ابراہیم۔ ۴۰)

اے میرے رب مجھے نماز کا پابند بنا دے

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کے لیے وہ کام نہیں کرتا جو ان کے لیے اصلح ہو۔ قائلین تقدیر میں سے ایک جماعت یہی عقیدہ رکھتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ اللہ تعالےٰ کا خلق و امر اس کی مشیت کے تابع ہے کسی مصلحت پر موقوف نہیں اس کے عین برعکس

جمہور علماء یہ رائے رکھتے ہیں کہ اللہ تعالے بندوں کو اسی بات کا حکم دیتا ہے جس میں ان کی فلاح و بہبود مضمر ہوتی ہے اور اسی چیز سے روکتا ہے جو باعث فساد ہوتی ہے انبیاء کی بعثت بھی مصلحت عامہ کے تحت عمل میں آئی ہے۔ اگر بعض لوگوں کو اس سے نقصان پہنچتا ہو تو بھی یہ مبنی بر حکمت ہے۔ اکثر محدثین و فقہاء صوفیاء اور کرامیہ یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ خدا کی پیدا کردہ اشیاء میں بعض ضرر رساں ہیں مثلاً گناہ تاہم یہ کہنا پڑے گا کہ ان میں کوئی حکمت و مصلحت ضرور ہے جس کی بنا پر ان کی تخلیق عمل میں آئی۔

تم جو بات کہہ رہے ہو وہ شیعہ اکابر کے افادات میں سے نہیں بلکہ یہ معتزلہ کا قول ہے جو انھوں نے مسائل تقدیر میں مبالغہ کرنے والے اشاعرہ کے خلاف کیا۔ اشاعرہ نے تقدیر کے مسئلہ میں اس حد تک اغراق و مبالغہ سے کام لیا کہ انھیں جبریہ کہا جانے لگا۔ حیوانات میں جن طبائع و قوی کو ودیعت کیا گیا ہے وہ ان کے منکر تھے ان کے خیال میں مخلوقات کی تخلیق کسی حکمت و علت پر مبنی نہیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالے جو کام انجام دیتا ہے اس کی غرض بندوں کے لیے جلب منفعت یا دفع مضرت ہے۔ حالانکہ وہ یہ نہیں کہتے کہ باری تعالے مصلحت کے پیش نظر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ ان کا قول صرف یہ ہے کہ مصلحت کو پیش نظر رکھنا اس پر واجب نہیں۔ ان کی رائے میں اللہ تعالے کوئی کام کسی غرض کے پیش نظر نہیں کرتا بلکہ محض ارادہ کی بنا پر کرتا ہے۔

اہل سنت پر بہتان عظیم

"تم اہل سنت کا یہ قول نقل کرتے ہو کہ اطاعت گذار ثواب کا استحقاق نہیں رکھتا اور عاصی سزا کا مستوجب نہیں بلکہ اللہ تعالے بعض اوقات نبی کو سزا دیتے اور ابلیس پر رحم فرماتے ہیں"۔

یہ اہل سنت پر عظیم بہتان ہے۔ اہل سنت کا کوئی فرد یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالے نبی کو سزا دیتا اور ابلیس پر رحم کرتا ہے۔ بخلاف وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالے کے لیے گنہگار کو معاف کرنا اور اہل کبائر کو دوزخ سے نکالنا جائز ہے وہ کسی اہل توحید کو دائمی طور پر جہنم رسید نہیں کرے گا۔ جہاں تک نفس استحقاق کا تعلق ہے اہل سنت کے نزدیک بندہ کا کوئی حق اللہ پر واجب نہیں۔ البتہ یہ امر ضروری ہے کہ وہ حسب وعدہ نیکوکاروں کو جزا دے گا کیونکہ وہ وعدہ شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا

جہاں تک اپنے پر جزا و سزا کو واجب کرنے اور عقل سے اس کی معرفت حاصل کرنے کا تعلق ہے یہ متنازع فیہ ہے۔ تاہم اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ جسے چاہے عذاب میں مبتلا کرے تو کوئی شخص اسے روکنے پر قادر نہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ (المائدہ ۵ - ۱۷)

آپ فرمائیں کون اللہ تعالےٰ سے کسی چیز کا مالک ہے اگر وہ مسیح ابن مریم ان کی والدہ اور کرۂ ارضی پر بسنے والے سب لوگوں کو ہلاک کر دے۔

مخلوقات میں سے جدل و بحث کرنے والوں سے اگر اللہ تعالےٰ بھی مناقشہ کرتا تو انھیں عذاب دیتا۔ حدیث میں وارد ہے آنحضور علیہ السلام نے فرمایا۔

"جس سے محاسبہ کرتے وقت (بروز قیامت) نوک جھونک کی گئی وہ ہلاک ہوا۔"

نیز آپ نے ارشاد فرمایا۔

"کوئی شخص اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت میں نہیں جائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا حضور! کیا آپ بھی نہیں۔ فرمایا نہیں۔ مگر یہ کہ رحمت خداوندی مجھے اپنے دامن میں چھپا لے"۔

حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی کسی کو عذاب دیگا تو وہ حق کی بنا پر دے گا کیونکہ اسکی ذات ظلم سے بلند تر ہے۔

شیخ الاسلام شیعہ مصنف کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تم کہتے ہو کہ اہل سنت کے نزدیک انبیاء غیر معصوم ہیں"۔ یہ باطل ہے۔ اہل سنت اس ضمن میں متحد الخیال ہیں کہ شرعی احکام کے پہنچانے میں انبیاء معصوم ہیں۔ رسالت کا اصلی مقصد بھی یہی ہے۔ بعض اوقات ان سے گناہ کا صدور ہوتا ہے مگر وہ گناہ اور فسق و خطا پر قائم نہیں رہتے۔ گویا وہ ہر ایسی بات سے منزہ ہیں جو نبوت میں قادح ہو جمہور میں سے جن علماء کے نزدیک انبیاء سے صغائر کا صدور ممکن ہے وہ کہتے ہیں کہ انبیا صغائر پر مصر نہیں رہتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو توبہ کرنے کے بعد جو مرتبۂ عالی ملا وہ توبہ سے پہلے حاصل نہ تھا۔ بندہ بعض اوقات ایک برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کی وجہ سے

جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

مگر شیعہ کا معاملہ مختلف ہے وہ بڑی حد تک نصاریٰ سے ملتے جلتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اوامر و اخبار میں انبیاء کی اطاعت و تصدیق کا حکم دیا اور لوگوں کو غلو و شرک سے روکا۔ مگر نصاریٰ بدل گئے۔ اور اس حد تک غلو سے کام لیا کہ شرک میں مبتلا ہو گئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو بدل ڈالا اور اس طرح ان کی نافرمانی کے مرتکب ہو کر عاصی ٹھہرے دین میں غلو کر کے اس کی حدود سے تجاوز کر گئے۔

روافض کا غلو روافض نے انبیاء کرام اور ائمہ کی شان میں اس حد تک مبالغہ آمیزی کا مظاہرہ کیا کہ انھیں رب بنا لیا۔ انبیاء کی توبہ و استغفار کے ضمن میں جو نصوص وارد ہوئی تھیں ان کی تکذیب کرنے لگے۔ تم دیکھتے ہو کہ مساجد میں جمعہ و جماعت کا نام نہیں مگر قبروں پر بنا کردہ مقابر کی تعظیم و تکریم میں وہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان پر اعتکاف بیٹھتے اور ان کا حج کرنے جاتے ہیں اس کی حد یہ ہے کہ بعض شیعہ ان زیارتوں کو حج بیت اللہ کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔

آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"اللہ تعالےٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔"

آپ ان کے فعل سے ڈراتے تھے۔ نیز آپ نے فرمایا۔

"وہ بدترین لوگ ہوں گے جن کی زندگی میں قیامت آئے گی اور جو لوگ قبروں کو مسجدیں بناتے ہیں۔"

محدث ابن حبان نے اپنی صحیح میں یہ روایت ذکر کی ہے۔ آپ نے مزید ارشاد فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ (موطا امام مالک)

اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے اس قوم پر خدا کا شدید غضب نازل ہوا جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔

شیعہ کے مشہور عالم شیخ المفید نے "حج المشاہد" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے جسمیں مخلوقات کی قبروں کی زیارت کو حج سے تعبیر کیا ہے[۱]۔

(حاشیہ آئندہ صفحہ پر دیکھیں)

تم نے اہل سنت کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضور علیہ السلام نے کسی کو امام مقرر نہیں کیا تھا۔ اور آپ بلاوصیت فوت ہو گئے۔ واضح ہو کہ یہ جمہور اہلسنت کا قول نہیں۔ اہل سنت میں سے ایک جماعت کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت نص سے ثابت ہے۔ ابویعلی نے اس ضمن میں امام احمد سے دو روایتیں ذکر کی ہیں۔

(۱) ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکر انتخاب کی بنا پر خلیفہ قرار پائے۔

(۲) امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی امامت نص خفی اور اشارہ سے ثابت ہے۔ حضرت حسن بصری بکر بن اخت عبدالواحد اور بعض خوارج اسی کے قائل ہیں۔

سه اکابر شیعہ نے شیخ المفید کی کتاب کے علاوہ بھی متعدد کتب مقامات مقدسہ کی زیارت پر لکھی ہیں اور عوام کے یہاں اسی طرح مقبول و متداول ہیں جیسے قرآن کریم۔ شیعہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ مقامات مقدسہ کو مکہ مکرمہ۔ خانہ کعبہ اور سات آسمانوں کے مقابلہ میں افضل قرار دیا جائے۔

میں نے ایک مرتبہ فارسی زبان کے ایرانی رسالہ "پرچم اسلام" مجریہ ۱۰ محرم ۱۳۶۶ھ بروز جمعرات میں حسب ذیل عربی اشعار اور ان کا فارسی ترجمہ دیکھا تھا۔ اس رسالہ کا ایڈیٹر عبدالکریم فقیہی شیرازی ہے ؎

هِيَ الطُّفُوْفُ فَطُفْ سَبْعًا بِمَغْنَاهَا   فَمَا لِمَكَّةَ مَعْنًى مِّثْلَ مَعْنَاهَا

أَرْضٌ وَلٰكِنَّمَا السَّبْعُ الشِّدَادُ لَهَا   دَانَتْ وَطَأْطَأَ أَعْلَاهَا لِأَدْنَاهَا

(یہ اشعار اور ان کا ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔)

الطفوف طف کی جمع ہے یہ ارض کربلا کا نام ہے۔ اس میں ایک فرضی قبر ہے جس کی تزئین و آرائش پر شیعہ نے کروڑوں روپیہ صرف کیا اور یہ کہہ کر اپنے لیے تسکین و اطمینان کا سامان بہم پہنچایا ہے کہ یہ نبیرۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبر ہے یہ شاعر ان کفریات کے سامع و قاری کو اس فرضی قبر پر سات مرتبہ طواف کرنے کا حکم دیتا ہے اور بتاکید کہتا ہے کہ جو فضیلت انکی تعمیر کردہ فرضی قبر کی بنا پر اس کربلا کو حاصل ہے وہ سرزمین مکہ کو خانہ کعبہ کی وجہ سے کہاں نصیب! پھر یہاں تک کہتا ہے کہ اس کی نشیب ترین زمین کے سامنے سات آسمانوں کی بلند ترین جگہ سجدہ ریز ہے۔ غالبا اس کا اشارہ عرش اعظم کی جانب ہے۔ رسالہ کے ایڈیٹر عبدالکریم شیرازی کو یہ خطرہ دامنگیر تھا کہ شاید اس کے عام قارئین ان کفریہ اشعار کو سمجھنے پر قادر نہ ہوں اس لیے اس نے بکمال امانت و دیانت فارسی زبان میں اشعار کا ترجمہ کر دیا ۱۲

ابن حامد کہتے ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کی نص وہ حدیث ہے جسے امام بخاری رح مسنداً جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

احادیث نبویہ سے خلافت ابی بکر کا اثبات

ایک عورت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے اسے دوبارہ حاضر ہونے کیلئے مامور فرمایا۔ وہ بولی "اگر میں آؤں اور آپ کو موجود نہ پاؤں" (یعنی آپ وفات پا جائیں) فرمایا "اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر کی خدمت میں حاضری دیجئے"۔ (بخاری کتاب الکتاب قیس)

ابن حامد نے متعدد احادیث ذکر کر کے لکھا کہ "یہ احادیث امامت ابی بکر کے بارے میں نص ہیں"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا۔

"ان دونوں کی پیروی کیجئے جو میرے بعد (خلیفہ) ہوں گے"۔ آپ نے حضرت ابوبکر و عمر کے بارے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ (ترمذی مشکوٰۃ)

عبدالرحمن بن ابی بکرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

"کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا حضور میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو لٹکایا گیا ہے۔ پھر آپ کو حضرت ابوبکر کے ساتھ وزن کیا گیا اور آپ بھاری نکلے۔ پھر حضرت عمر و ابوبکر کو تولا گیا تو ابوبکر والا پلڑا جھک گیا۔ پھر حضرت عمر کو حضرت عثمان کے مقابلہ میں وزن کیا گیا تو حضرت عمر وزنی ثابت ہوئے۔ پھر ترازو اٹھ گیا۔ آنحضور علیہ السلام نے فرمایا یہ خلافت نبوت کی جانب اشارہ ہے اس کے بعد اللہ جسے چاہے حکومت و سلطنت سے نوازے۔

(مسند احمد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج ایک نیک آدمی نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکر کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھ دیا گیا ہے اسی طرح حضرت عمر کو ابوبکر سے اور حضرت عثمان کو عمر فاروق سے وابستہ کر دیا گیا تھا"۔ جابر کہتے ہیں جب ہم بارگاہ رسالت سے اٹھے تو ہم نے کہا نیک آدمی سے آنحضور کی ذات اقدس مراد ہے اور ایکدوسرے کے ساتھ وابستہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کے خلفاء ہیں۔ (ابوداؤد)

صالح بن کیسان زہری سے روایت کرتے ہیں وہ عروہ سے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا جس روز آنحضور کو درد شروع ہوئی تو میں خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے فرمایا "اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکر کو ایک عہد نامہ لکھ دوں"۔ پھر فرمایا "اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے"۔ (بخاری و مسلم)

ابن ابی ملیکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا جب سرور کائنات کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو آپ نے فرمایا۔ "عبدالرحمن بن ابی بکر کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکر کے لیے (ایک عہد نامہ) لکھ دوں جس کی موجودگی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہے۔ پھر فرمایا۔ "پناہ بخدا کہ مسلمان ابوبکر (کی خلافت و امارت) میں مختلف الخیال ہوں"۔

ابن عابد پھر وہ احادیث ذکر کرتے ہیں جن میں حضرت ابوبکر کے امام نماز ہونے کا ذکر کیا گیا۔ ان کے علاوہ کچھ اور احادیث بھی قلمبند کی ہیں جو احادیث صحیحہ کے درجہ سے فروتر ہیں۔

خلافتِ صدیقی سے متعلق ابن حزم کا زاویۂ نگاہ

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں[1]۔

"امامت ابی بکر کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے (۱) ایک گروہ کا خیال ہے کہ آپ نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا (۲) دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ جب آپ نے حضرت ابوبکر کو امام نماز بنایا تھا تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ امامت و خلافت کے اولین مستحق تھے (۳) تیسرے گروہ کے نزدیک افضلیت کی بنا پر آپ کو امام نماز بنایا گیا تھا۔ اس سے ان کی خلافت کی جانب اشارہ کرنا مقصود نہیں (۴) چوتھے گروہ کے نزدیک آپ نے صراحتاً حضرت ابوبکر کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔

ابن حزم فرماتے ہیں کہ درج ذیل براہین و دلائل کی روشنی میں ہم نے آخری نظریہ اختیار کیا ہے۔

پہلی دلیل:۔ خلافت ابی بکر رضی اللہ عنہ کی پہلی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

---

[1] ابن حزم کا یہ بیان ان کے رسالہ "الامامۃ والمفاضلۃ" میں مندرج ہے۔ یہ رسالہ کوئی مستقل کتاب نہیں۔ بلکہ ان کی شہرہ آفاق کتاب "الفصل فی الملل والنحل" جلد چہارم میں شامل ہے۔ دیکھیے کتاب مذکور ص ۱۰۷ طبع مصر ۱۳۲۱ھ۔ خلافت کے مسئلہ پر یہ اہم ترین کتاب ہے ۱۲

"اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ" (الحجرات-۱۵) (یہی لوگ سچے ہیں)

اس آیت میں جن صحابہ کی صدق بیانی اور راست گوئی کی شہادت دی گئی ہے وہ آپ کو "خلیفۃ الرسول" کہنے میں یک زبان تھے۔ خلیفہ[1] عربی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کو کسی نے اپنا قائم مقام بنایا ہو۔ جو خود کسی کا نائب بن جائے اسے خلیفہ نہیں کہتے۔ خود بخود نائب بننے والے کو "خالف" کہتے ہیں۔ خلیفۃ الرسول سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ آپ نماز پڑھانے میں آنحضور کے قائم مقام تھے اس لیے کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضور کے عین حیات خلیفہ کے لقب سے مشہور نہیں ہوئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیابت امامت نماز کے علاوہ جداگانہ نوعیت کی تھی۔

دوسری دلیل :- دوسری دلیل یہ ہے کہ جن لوگوں کو آپ نے بعض مواقع پر اپنی نیابت کا شرف ارزانی فرمایا۔ مثلاً غزوۂ تبوک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غزوہ خندق میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضؓ اور غزوۂ ذات الرقاع میں حضرت عثمانؓ کو علاوہ ازیں دیگر صحابہ جن کو یمن اور بحرین وغیرہ میں عامل بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ان میں سے کوئی شخص بھی علی الاطلاق خلیفہ کے لقب سے مشہور نہیں ہوا۔ اس سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ خلافت سے آنحضور کی وفات کے بعد آپ کی قائم مقامی و نیابت مراد ہے یہ بات محالات میں سے ہے کہ صحابہ نے یونہی حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر اجماع کر لیا ہو حالانکہ آپ نے صراحتہً کسی کو بھی یہ منصب تفویض نہ فرمایا ہو۔

مزید براں صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک عورت نے آنحضور علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "حضور اگر میں لوٹ کر آؤں اور آپ موجود نہ ہوں تو پھر کیا کروں؟" ــــــ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ فوت ہو جائیں تو پھر کیا کروں ــــــ فرمایا ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو جائیے۔

ابن حزم اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

---

[1] خلیفہ بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے بنابریں خلیفہ وہ شخص ہے جسے کسی نے اپنا نائب مقرر کیا ہو۔ جن لوگوں کی شان میں وارد ہے "اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ" انہی لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۃ الرسول یعنی نائب رسول کے لقب سے ملقب کیا تھا۔ حالانکہ وہ آنحضور علیہ السلام کے اقوال و احوال کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ خداوند کریم نے انکو صادق بھی قرار دیا ہے ۱۲

"یہ حدیث حضرت ابوبکر کی خلافت پہ نص جلی ہے" ۔ (کتاب الامامۃ والمفاضلۃ ص ۱۰۸)

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کی حالت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"میں نے ارادہ کیا تھا کہ تمہارے والد اور بھائی کو بلا کر ایک عہد نامہ لکھ دوں مبادا کوئی کہنے والا یہ کہے کہ میں (خلافت کا) زیادہ حقدار ہوں یا کوئی آرزو کرنے والا (خلافت کی) تمنا کرے مگر اللہ تعالے اور مومن ابوبکر کے سوا کسی کو (خلیفہ) تسلیم نہیں کر سکتے"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں اس حدیث سے یہ مستفاد نہیں ہوتا کہ آنحضور نے حضرت ابوبکر کو خلیفہ مقرر فرما دیا تھا۔ البتہ اس حدیث کے پیش نظر آپ جانتے تھے کہ امت آپ کے بعد حضرت ابوبکر کو خلیفہ منتخب کرے گی اور آپ نے اس پہ اظہار پسندیدگی فرمایا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نص جلی سے سکوت اختیار کر کے صرف امت کے اجماع پہ اکتفاء فرمایا تھا۔

قائلین عدم استخلاف کے دلائل

امام ابن حزم فرماتے ہیں جن لوگوں کی رائے میں آنحضور نے کسی کو بھی خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا وہ حضرت عمر کا درج ذیل قول پیش کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کر دوں تو حضرت ابوبکر نے جو مجھ سے افضل تھے ایسا ہی کیا تھا اور اگر مقرر نہ کروں تو آنحضور کا نمونہ میرے پیش نظر ہے"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا تھا۔ کہ

"اگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو خلیفہ بنانے والے ہوتے تو کسے یہ منصب تفویض فرماتے"؟

حضرت عائشہ نے جواباً فرمایا "حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو"۔

محدث ابن حزم کا قول ہے

"حضرت عمر و عائشہ کا قول اجماع صحابہ اور دو قول مرفوع احادیث کے خلاف نہیں حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کو حضرت ابوبکر کے خلیفہ مقرر کیے جانے کا علم نہ تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ آنحضور نے حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں کوئی تحریری دستاویز تحریر نہیں کی تھی"۔

امام ابن تیمیہؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

"بصراحت کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے بارے میں شیعہ کے یہاں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ راوندیہ کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ امامیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہی دعوی کرتے ہیں۔

قاضی ابو یعلی لکھتے ہیں۔

"راوندیہ کی ایک جماعت کا دعوی ہے کہ آپ نے بعینہ حضرت عباس کو خلیفہ مقرر کر کے اس کا اعلان کیا تھا۔ مگر امت نے اس نص کا انکار کر کے کفر و عناد کا مظاہرہ کیا اور مرتد ہو گئی۔ بعض یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ نے تا قیام قیامت حضرت عباس رضی اللہ تعالے عنہ کی اولاد کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔"

ابن بطہ مبارک بن فضالہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سنا کہ بخدا آنحضور علیہ السلام نے حضرت ابوبکر کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔

جن لوگوں کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً حضرت صدیقؓ کو خلافت سے نوازا تھا۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحابہ حضرت ابوبکر کو خلیفۂ رسول کہہ کر پکارتے تھے اور خلیفہ وہی ہوتا ہے جس کو کوئی اپنا قائم مقام مقرر کر دے اس لیے کہ خلیفہ بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ لفظ خلیفہ کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے (۱) وہ شخص بھی خلیفہ ہے جس کو کوئی اپنا نائب بنائے (۲) جو دوسرے کا از خود نائب بن جائے وہ بھی خلیفہ ہے ہادی اعظم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"جس نے کسی کو جہاد کے لیے تیار کر کے بھیجا گویا اس نے خود جہاد میں شرکت کی اور جو اس کی عدم موجودگی میں اس کا خلیفہ (قائم مقام) بنا وہ بھی غازی ٹھہرا۔"

مذکورہ صدر حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث بھی صحیح ہے۔ آپ دعا فرمایا کرتے تھے۔

"اے اللہ تو میرا رفیق سفر ہے اور اہل و عیال میں میرا خلیفہ ہے (یعنی قائم مقام)

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (الانعام-۱۶۵)

ذاتِ خداوندی وہی ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنا دیا)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِھِمْ (یونس-۱۴)

پھران کے بعد تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دیا

نیز فرمایا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرہ-۳۰)

میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں

ایک اور جگہ فرمایا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ (ص-۲۶)

اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے

مذکورہ صدر آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہیے لوگوں کا خلیفہ بنایا یہ مقصود نہیں کہ حضرت داؤد خدا کے نائب تھے جیسا کہ قائلین وحدت الوجود[1] کا نظریہ ہے۔ وحدت الوجود کے قائل یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان کو ذات باری سے وہی تعلق ہے جو آنکھ کی تپلی کو آنکھ سے (یعنی دونوں

---

[1] الحادیہ ان ملحدین کو کہتے ہیں جو نظریہ وحدۃ الوجود کے داعی ہیں اور واجب الوجود و ممکن الوجود کے مابین کسی فرق و امتیاز کے قائل نہیں۔ یہ خالق و مخلوق میں اتحاد و یگانگت کا نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ عالم ارضی عین ذات باری ہے دونوں میں کوئی تغایر نہیں پایا جاتا۔ دراصل جو ملاحدہ ذات باری سے اعلانیہ انکار کی جرأت نہیں کر سکتے وہ وحدت الوجود کے داعی بن بیٹھتے ہیں۔ وحدۃ الوجود درحقیقت برہمنوں کا عقیدہ ہے۔ دور حاضر کے ایک برہمن ٹیگور نامی نے اس کے اثبات میں متعدد کتب تالیف کی ہیں۔ شرق و غرب کے سب منافق ملحدین عقیدہ وحدۃ الوجود کے قائل و داعی ہیں۔ دور حاضر کے وہ خالص ملحدین جو اعلانیہ اپنے ملحدانہ عقائد کا اعتراف کرتے ہیں وحدۃ الوجود کا نقاب اوڑھنے والے منکرین کی نسبت کم ضرر رساں ہیں۔

اللھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ولوالدیہم اجمعین

ایک ہیں اور ان میں کچھ فرق نہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان اللہ تعالے کے اسماء حسنیٰ کا جامع ہے اس کی دلیل میں وہ مدرج ذیل آیت پیش کرتے ہیں۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرۃ-۳۰) (اور حضرت آدم کو سب نام سکھلا دیئے)

اہل وحدۃ الوجود کا نقطہ خیال ہے کہ انسان خدا کی مثل ہے (تعالی اللہ عن ذٰلک) کوئی شخص خدا کا نائب نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ نیابت اس شخص کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو اور ذات باری ہمیشہ حاضر و ناظر اور مخلوقات کی ناظم و مدبر ہے۔ البتہ بندہ جب اپنے اہل و عیال میں موجود نہ ہو تو اللہ تعالے اس کی نیابت کرتے اور اس کی عدم موجودگی میں اہل و عیال کی حفاظت فرماتے ہیں۔ مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا گیا تو آپ نے فرمایا میں تو صرف خلیفۂ رسول ہوں میرے لیے یہی کافی ہے"۔

جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نص خفی کی بنا پر ہوئی تھی ان کی دلیل مذکورہ ذیل حدیث نبوی ہے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

نصّ خفی سے استخلاف ابی بکر

۱۔ "میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک کنوئیں سے پانی کھینچ رہا ہوں۔ ابوبکر نے میرے ہاتھ سے ڈول لیا اور پانی سے لبریز ایک یا دو ڈول کھینچے۔ ابوبکر کے ڈول کھینچنے میں کمزوری پائی جاتی تھی۔ خدا انھیں معاف فرمائے۔!

پھر یہ ڈول حضرت عمر نے لے لیا۔ میں نے کسی اعجوبۂ روزگار شخصیت کو نہیں دیکھا جو عمر کے سے طرز عمل کا حامل ہو۔ یہاں تک کہ لوگ حوض سے پانی پلاکر اونٹوں کی تشنگاہ سے واپس جانے لگے"۔

۲۔ سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"ابوبکر سے کہئے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں"

چنانچہ آنحضور کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں حضرت ابوبکر آپ کی بیماری کے دنوں میں نماز پڑھاتے رہے تا آنکہ آپ نے دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ حضرت ابوبکر کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے اس پر اظہار مسرت فرمایا۔ اسی روز آپ نے وفات پائی۔

۳- آنحضور علیہ السلام نے فرمایا۔

"اگر میں اہل زمین میں سے کسی کو دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو دوست بناتا۔ ابوبکر کے سوا مسجد کی جانب کسی کی کھڑکی باقی نہ رہنے دی جائے"۔

۴- ابوبکرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ایک روز فرمایا۔

"کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ ایک آدمی نے کہا میں نے آسمان سے ایک ترازو اترتا ہوا دیکھا۔ پھر آپ (نبی صلے اللہ علیہ وسلم) اور ابوبکر کو وزن کیا گیا تو آپ بھاری نکلے۔ پھر ابوبکر و عمر کو تولا گیا تو ابوبکر کا پلڑا جھک گیا"۔

۵- عبدالرحمن بن ابی بکرہ نے یہ روایت اسی طرح اپنے والد سے ذکر کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں:

"یہ خلافت نبوت ہے پھر اس کے بعد خدا جسے چاہے سلطنت عطا کرے"۔

استخلاف کے بارے میں دیگر احادیث نبویہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آج رات ایک نیک آدمی نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکر کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اسی طرح حضرت عمر کو ابوبکر کے ساتھ اور حضرت عثمان کو حضرت عمر کے ساتھ معلق کیا گیا تھا۔ صحابہ کا بیان ہے کہ جب ہم بارگاہ رسالت سے اٹھے تو ہم نے کہا نیک آدمی سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ لٹکانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات آپ کے بعد پیام رسالت کے پہنچانے میں آپ کے قائم مقام ہوں گے (ابوداؤد)

۶- حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا حضور! میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ڈول لٹکایا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے اس کے دونوں کنارے پکڑ کر کچھ پانی پیا پھر حضرت عمر آئے اور ڈول کو دونوں کناروں سے پکڑ کر خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر حضرت عثمان آئے اور ڈول کو دونوں کناروں سے پکڑ کر خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر حضرت علی آئے اور ڈول کو کناروں سے پکڑا تو اس کی گرہ کھل گئی اور آپ پر پانی کے چھینٹے پڑ گئے"۔

۷- سعید بن جمہان سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"خلافت نبوت تیس[۳۰] سال ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ جسے چاہے سلطنت سے نوازے میں نے سفینہ سے کہا[۱] بنی مروان کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ نہ تھے۔ سفینہ نے کہا وہ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اہل سنت کا قول ان لوگوں کے قول سے بہتر ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت علی یا حضرت عباس کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے پاس دروغ گوئی کے سوا کوئی دلیل موجود نہیں جس کا بطلان اظہر من الشمس ہے۔ مزید براں دین اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نیز خلافت علی کے اثبات میں وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ اس مسئلہ پر دلالت نہیں کرتے۔ مثلاً یہ حدیث کہ جس میں مذکور ہے کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبوک جاتے وقت حضرت علی کو مدینہ کا امیر مقرر کیا تھا۔

کیا آنحضور نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کسی کو بھی خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا بلکہ مختلف طریقوں سے لوگوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جانب متوجہ کیا۔ آپ کی امامت و خلافت پر اظہار خوشنودی فرمایا اور اس ضمن میں ایک عہدنامہ لکھنے کا ارادہ کیا پھر آپ کو معلوم ہوا کہ مسلمان

---

[۱] سفینہ سے یہ بات راوی حدیث سعید بن جمہان نے کہی تھی۔ محدث ابوحاتم رازی سعید کے متعلق لکھتے ہیں "اس کی روایت قابل احتجاج نہیں"۔ اس روایت کی سند میں حشرج بن نباتہ واسطی ہے۔ امام نسائی اس کے متعلق فرماتے ہیں "لیس بالقوی" (یہ قوی نہیں) عبداللہ بن احمد بن حنبل یہ روایت سوید طحان سے روایت کرتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں "یہ ضعیف راوی ہے"۔ چونکہ سفینہ کی روایت کردہ حدیث میں متعدد ضعیف راوی موجود ہیں لہٰذا ابوبکر ابن العربی العواصم من القواصم ص ۲۰۱ میں لکھتے ہیں "یہ حدیث صحیح نہیں"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے خلافت راشدہ کے اثبات میں احادیث صحیحہ ذکر کرنے کے بعد یہ روایت تقویت و تائید کے نقطہ خیال سے بیان کی ہے۔ اصالۃً اس روایت کا ذکر و بیان مقصود نہیں۔ خلافت راشدہ کے ضمن میں ذکر کردہ نصوص مسئلہ امامت میں شیعہ کے دلائل سے اولےٰ و اعلیٰ ہیں۔ اللہم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ولوالدیہم اجمعین آمین یارب العالمین

بالاتفاق آپ کو خلیفہ منتخب کر لیں گے۔ اگر اس یقین کے بارے میں آپ کو کوئی شبہ لاحق ہوتا تو دانشگاف الفاظ میں اس کو الم نشرح فرماتے۔ جیسے آپ کا ارشاد ہے۔

اللہ تعالیٰ اور مومن حضرت ابوبکر کے سوا کسی (کی خلافت) پر راضی نہیں"۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ امتِ محمدی کا اتفاق اور اس پر آنحضور کا اظہار خوشنودی کرنا عہد نامہ لکھنے سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

شیعہ مصنف کا قول ہے کہ "اہلسنت کے نزدیک حضرت ابوبکر اس لیے خلیفہ منتخب ہو گئے تھے کہ چار صحابہ کے ایماء سے حضرت عمر نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی"۔

ہم جواباً کہتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے بخلاف ازیں سب صحابہ آپ کی خلافت پر رضامند تھے اور سب صحابہ نے بالاتفاق آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی تھی۔ خواہ شیعہ مصنف اس کے ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔ حضرت سعد کا تنہا بیعت نہ کرنا حضرت ابوبکر کی خلافت کے انعقاد میں مخل نہیں ہو سکتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہ کی ایک کثیر جماعت حضرت علی کی بیعت میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ جب اس کے باوصف حضرت علی خلیفہ منتخب ہو گئے تھے تو پھر حضرت ابوبکر کی بیعت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

خلافت کا مقصد اور اس کی اہم شرط

اہل سنت کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ امامت و خلافت کا اصلی مقصود قوت و اقتدار کا حصول ہے لہٰذا جب اصحاب قوت و شوکت کسی شخص کی خلافت پر متفق ہو جائیں تو اس کی خلافت منعقد ہو جائے گی۔ اہل سنت کا قول ہے۔

"جو شخص قوت و شوکت حاصل کر لے جس کی بنا پر وہ مقاصد خلافت کی تکمیل کر سکتا ہو۔ تو وہ ان اولی الامر میں شمار ہو گا جو واجب الاطاعت ہیں۔ جبتک وہ معصیت خداوندی کا حکم صادر نہ کرے۔ نظریں خلافت ملوکیت و سلطنت کا نام ہے نیک ہو یا بد۔ کوئی شخص صرف تین یا چار آدمیوں کی موافقت کے بل بوتے پر بادشاہ نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی کی بیعت کر لی گئی اور قوت و اقتدار سے بہرہ ور ہو گئے تو امامت و خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے عبدوس عطار کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا "جو شخص مسند خلافت پر قابض ہو اور لوگ اس کی خلافت پر اجماع کر لیں اور اسی طرح جو شخص

بزورِ شمشیر خلیفہ بن بیٹھے اس کو صدقات دینا جائز ہے۔ خواہ وہ نیک ہو یا بد"۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرتبہ اس حدیث کا مفہوم دریافت کیا گیا آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

"جو شخص مرجائے اور اس کا کوئی امام نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔

سائل نے دریافت کیا کہ امام سے کون مراد ہے؟ امام احمد نے جواباً فرمایا امام وہ ہے جس کی امامت پر سب مسلمان متفق ہو جائیں"۔

خلفاء راشدین کی امامت و خلافت

ان دلائل کی روشنی میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ چونکہ خلافت صدیقی پر سب مسلمانوں کا اجماع منعقد ہوا تھا اور اللہ و رسول نے بھی اس پر اظہار خوشنودی فرمایا تھا اس لیے آپ امامت کے مستحق تھے پھر اہل قوت و اقتدار کے بیعت کرنے کی بنا پر آپ خلیفہ منتخب ہو گئے اسی طرح بیعت عامہ اور مسلمانوں کے اطاعت اختیار کرنے کی بنا پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ قرار پائے۔ اگر اس مفروضہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ صحابہ نے حضرت عمر کے بارے میں حضرت ابوبکر کے عہد نامہ کو درست تسلیم نہیں کیا تھا تو آپ امامت کے منصب پر فائز نہ ہوتے۔ قطع نظر اس سے کہ آپ کی خلافت جائز تھی یا ناجائز؟ حلت و حرمت کا تعلق افعال سے ہے۔ جہاں تک خلافت و امارت کا تعلق ہے وہ صرف حاصل شدہ اقتدار کا نام ہے۔ بعض اوقات یہ اقتدار جائز طریقہ سے حاصل ہوتا ہے جیسے خلفائے راشدین کی خلافت اور بعض اوقات ناروا طریق سے بھی قوت و شوکت حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی ظالم کی سلطنت و حکومت۔ اگر اس مفروضہ کو صحیح تصور کیا جائے کہ صرف حضرت عمرؓ اور چند صحابہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی تھی اور باقی صحابہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔ تو آپ کی امامت و خلافت کا انعقاد نہیں ہوتا۔ بخلاف ازیں آپ جمہور مسلمانوں کی بیعت کی بنا پر خلیفہ منتخب ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سعد کے بیعت نہ کرنے سے آپ کی خلافت میں قدح وارد نہ ہوئی۔ کیونکہ خلافت کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ حضرت عمر نے آپ کی بیعت کرنے میں جو سبقت فرمائی تھی تو اس میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ بیعت کرتے وقت کوئی شخص تو پہلا

ہوگا جو باقی لوگوں سے سبقت کرے گا۔ اگر چند افراد آپ کی بیعت پر خوش نہ بھی ہوتے تو اس سے بھی آپ کی خلافت میں کوئی قدح وارد نہیں ہوتی۔ کیونکہ شرعی دلائل سے آپ کے بیعت کا استحقاق ثابت ہو چکا تھا۔

حضرت ابوبکر نے عمر فاروق کے حق میں جو وصیت کی تھی اس کی تکمیل حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد مسلمانوں کی بیعتِ عام سے ہوئی اور آپ بالاتفاق خلیفہ قرار پائے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ بعض صحابہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت عثمان کی بیعت پر اجماع عام ہوا تھا اور ایک شخص بھی بیعت سے الگ نہ رہا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل بروایت حمدان بن علی فرماتے ہیں۔

حضرت عثمان کی بیعت باقی خلفاء راشدین کی نسبت زیادہ مستحکم تھی کیونکہ آپ کی خلافت اجماع صحابہ کی بنا پر عالم وجود میں آئی تھی۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام احمد کا بیان حق و صداقت کا آئینہ دار ہے بالفرض اگر عبدالرحمن بن عوف آپ کی بیعت کرتے اور حضرت علیؓ و طلحہؓ و زبیرؓ رضی اللہ عنہم اور دیگر اصحاب اثر و رسوخ بیعت میں شریک نہ ہوتے تو حضرت عثمان منصب خلافت پر فائز نہ ہوتے۔ حضرت عمر نے چھ اشخاص پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ قائم کر دی تھی کہ یہ باہمی مشورہ سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر دیں حضرت طلحہ، زبیر اور سعد حسب مرضی شوریٰ میں سے نکل گئے۔ اور حضرت عثمان۔ علی اور عبدالرحمن بن عوف باقی رہے ان تینوں میں سے حضرت عبدالرحمن بن عوف مسلسل تین شب و روز نہ سوئے۔ اور انصار و مہاجرین سے مشورہ کرنے میں مصروف رہے۔ ان سب نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا اور پھر کسی کی ترغیب و ترہیب کے بغیر حضرت عثمان کی بیعت کر لی۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت علی کثیر مخلوقات کی بیعت کی بنا پر خلیفہ قرار پائے"۔ تخصیص بلا مخصص ہے۔ اس لیے کہ قبل ازیں خلفاء ثلاثہ کی بیعت بھی اسی طرح بلکہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوئی تھی۔ حضرت علی کی بیعت شہادتِ عثمان کے بعد عمل میں آئی تھی۔ جب کہ دل سکون و اطمینان سے یکسر محروم تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انھیں بحالت جبر و اکراہ بیعت کے لیے لایا گیا تھا۔ مدینہ میں شر پسندوں کا بڑا زور تھا۔ بکثرت صحابہ بیعت میں

شریک نہ ہو سکے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

بایں ہمہ صرف حضرت علی کے بارے میں یہ کہنا کہ کثیر مخلوقات نے ان کی بیعت کی۔ اور خلفاء سابقین کے بارے میں سکوت اختیار کرنا کہاں تک قرین عدل و انصاف ہے۔

حضرت علی سے متعلق علماء کے مختلف افکار و آراء

مزید براں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے والوں نے ان کے خلاف شورش بپا کر دی تھی۔

ایک گروہ آپ کی بیعت تک سے منحرف ہو گیا۔ اہل شام اس وقت تک آپ کی بیعت کرنے کے لیے تیار نہ تھے جب تک قاتلین عثمان سے قصاص نہ لے لیا جائے۔

پہلا گروہ:۔ ایک گروہ اس امر کا قائل تھا کہ حضرت علی و معاویہ دونوں خلیفہ برحق ہیں۔

دوسرا گروہ:۔ دوسرے گروہ کا زاویہ نگاہ کہ وہ انارکی کا دور تھا اور اس وقت کوئی بھی جائز خلیفہ نہ تھا۔ بصرہ کے محدثین میں سے ایک گروہ کی یہی رائے ہے۔

تیسرا گروہ:۔ تیسرا گروہ حضرت علی کی خلافت کا قائل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت علی، طلحہ و زبیر کے برخلاف لڑنے میں حق بجانب ہیں۔ تاہم طلحہ و زبیر کو بھی غلط کار نہیں کہتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر حضرت علی کے برخلاف نبرد آزما تھے۔ اور یہ مشہور مقولہ ہے کہ کُلُّ مُجْتَہِدٍ مُصِیْبٌ۔

ابو ہذیل علاف جبائی۔ ابو ہاشم بن جبائی اور ابن الباقلانی[۱] کی یہی رائے ہے۔ امام ابو الحسن اشعری کا ایک قول یہی ہے ان کی رائے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد کی بنا پر خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ اور اپنے اجتہاد میں جادۂ صدق و ثواب پر گامزن تھے۔

چوتھا گروہ:۔ چوتھے گروہ کے نزدیک حضرت علی امام برحق تھے اور ان کے خلاف لڑنے والے اگرچہ بنا بر اجتہاد ان کے خلاف برسرپیکار تھے۔ مگر ان کا اجتہاد مبنی بر خطا تھا۔ بہت سے حنفیہ، شافعیہ،

---

[۱] ابوبکر محمد بن طیب باقلانی المتوفی ۴۰۳ھ یہ ابو الحسن اشعری کے تلمیذ رشید تھے استاد کی وفات کے بعد معتزلہ کے خلاف صف آرا رہے۔ یہ بڑے وسیع العلم حاضر جواب اور کامیاب مناظر تھے۔ کثیر التصانیف تھے ان کی اعجاز القرآن اور التمہید زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ۱۲

مالکیہ اور حنبلیہ اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔

پانچواں گروہ:۔ پانچویں گروہ کا خیال ہے کہ اس دور میں خلیفۂ برحق صرف حضرت علی تھے آپ حضرت معاویہ کے مقابلہ میں حق و صداقت سے قریب تر تھے۔ تاہم ان دونوں کے خلاف نبرد آزما ہونا مناسب نہیں بلکہ اس سے احتراز و اجتناب اختیار کرنا افضل ہے۔

وہ اس کی دلیل میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں۔

"ایک فتنہ بپا ہوگا اس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے کی نسبت افضل ہوگا"۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا۔

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالٰے اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا"۔[1]

اس حدیث میں آپ نے صلح کرانے کی بنا پر حضرت حسن کی مدح و ستائش فرمائی۔ اگر نبرد آزمائی واجب یا مستحب ہوتی تو آپ اس کے تارک کی مدح نہ فرماتے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰے نے باغیوں کے خلاف ابتداءً جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ہی ہر باغی کے خلاف قتل و قتال کو ضروری ٹھہرایا۔ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوْا۔ (الحجرات ۔ ۹)

"اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم برسرپیکار ہوں تو ان میں صلح کرا دیجئے اور اگر ایک گروہ دوسرے پر ظلم کر رہا ہو تو اس سے لڑو"۔

متحارب فریقین میں صلح کی ضرورت و اہمیت

مذکورہ صدر آیت میں پہلے صلح کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر کوئی فریق ظلم و تعدی کا مرتکب ہو تو اس سے لڑا جائے یہاں تک کہ وہ حکم خداوندی کی تعمیل کے لیے سر تسلیم خم کر دے۔ بنا بریں فریقین کے لڑنے میں کوئی مصلحت نہیں پائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ جس بات کا خدا نے حکم دیا ہو اس کی مصلحت فساد کی نسبت راجح ہوگی۔ امام ابن سیرین (مشہور تابعی) فرماتے ہیں۔

[1] حدیث مذکور کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ص ۱۹۹-۱۲

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو شخص بھی فتنہ کی لپیٹ میں آجائے مجھے اس کے جادۂ مستقیم سے بھٹک جانے کا خطرہ دامنگیر رہتا ہے مگر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ میں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ فتنہ و فساد سے محمدؓ بن مسلمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا"۔

ثعلبہ بن ضبیعہ روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے فرمایا مجھے وہ شخص معلوم ہے جسے فتنہ پردازی سے کوئی نقصان اور ضرر لاحق نہیں ہوتا چنانچہ ہم باہر نکلے تو ایک خیمہ نصب کیا ہوا دیکھا جس میں محمد بن مسلمہ تشریف فرما تھے۔ ہم نے اس ضمن میں ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا میں نہیں چاہتا کہ بلاد و امصار جس فتنہ سے دوچار ہیں میں بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤں یہاں تک کہ فتنہ کی آگ فرو ہو جائے۔

چنانچہ ابن مسلمہ کلیتہً جنگ و جدل سے کنارہ کش رہ کر فتنہ سے محفوظ و مصئون رہے۔

اسی طرح سعد بن ابی وقاص۔ اسامہ بن زید۔ عبداللہ بن عمرؓ۔ ابوبکرہ۔ عمران بن حصین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سابقین الاولین میں سے باقی ماندہ صحابہ کسی فریق کے ساتھ مل کر شریک جنگ نہیں ہوتے تھے۔ ان کا یہ طرز عمل اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ لڑائی نہ واجب تھی اور نہ مستحب۔ جمہور اہلسنت محدثین امام مالک، سفیان ثوری۔ امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ دین اس ضمن میں یہی رائے رکھتے ہیں۔

سابقاً ذکر کردہ افکار و معتقدات کے علاوہ درج ذیل نظریات کے حامل بھی موجود تھے۔

(۱) خوارج حضرت عثمان و علی اور ان کے اتباع کی تکفیر کرتے تھے۔

(۲) روافض سابقین اوّلین صحابہ کو کافر یا فاسق قرار دیتے۔ اور حضرت علی کے خلاف لڑنے والے کی تکفیر کرتے تھے۔

(۳) نواصب اور اموبہ حضرت علی اور ان کے اتباع کو فاسق اور ظالم و متعدی کے القاب سے نوازتے تھے۔

جس مثالی امت کی تربیت آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں انجام پائی تھی اس میں محمد بن مسلمہ ایک معجزہ کی حیثیت رکھتے تھے اس ضمن میں مجلہ الفتح ماہ شوال ۱۳۶۶ھ ملاحظہ فرمائیے۔

(۴) معتزلہ کی ایک جماعت جنگ جمل میں شرکت کرنے والے ایک فریق کو فاسق قرار دیتی تھی مگر معتزلہ اس فریق کی تعیین نہیں کرتے تھے۔

ان افکار و معتقدات موجودگی میں یہ کہنا کیونکر درست ہوگا کہ حضرت علی کی بیعت میں خلفائے سابقین کی نسبت زیادہ لوگوں نے شرکت کی تھی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ شیعہ مصنف کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"ایک جانب تمہارا دعوی یہ ہے کہ حضرت علی نص کی بنا پر مسند خلافت پر متمکن ہوئے تھے دوسری طرف تم یہ بھی کہتے ہو کہ آپ کی خلافت کا انعقاد لوگوں کی بیعت کے بل بوتے پر ہوا تھا"

تم (شیعہ مصنف) اہل سنت کا یہ قول نقل کرتے ہو کہ ان کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے حضرت علی کے بعد بعض ان کے لخت جگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ قرار دیتے ہیں۔ اور بعض امیر معاویہ رضؓ کو۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اہل سنت کے یہاں سرے سے اس ضمن میں کوئی اختلاف پایا ہی نہیں جاتا بلکہ اہل سنت اس امر میں یک زبان ہیں کہ اہل عراق نے حضرت علی کی جگہ ان کے بیٹے حضرت حسن کی بیعت کرلی تھی۔ پھر انھوں نے بخوشی منصب امارت و خلافت امیر معاویہؓ کو تفویض کر دیا۔

لہ ہم العواصم من القواصم ص ۱۹۷ - ۱۹۸ کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔

حضرت حسن ان کے والد ان کے بھائی اور ان کے بھائی کی اولاد میں سے ۹ افراد کی طہارت و عصمت کا عقیدہ شیعہ کے ایمان کا اولیں عنصر ہے۔ عصمت ائمہ کے عقیدہ کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے خطا کا صدور نہیں ہوتا اور ان کا ہر قول و عمل حق و صواب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ حق و صواب تناقض سے پاک ہوتا ہے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اہم ترین کارنامہ امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت ہے جب بقول شیعہ آپ کا یہ طرز عمل ایک امام معصوم کا فعل ہے تو شیعہ کو اس بیعت میں شرکت کرنا اور اس کی صداقت و حقانیت پر ایمان لانا چاہئے تھا مگر مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بیعت کے منکر ہیں اور اس ضمن میں اپنے امام معصوم کی مخالفت کا ارتکاب کرتے ہیں اس کے صرف دو اسباب ہیں

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ شیعہ ائمہ اثنا عشرہ کی عصمت کے دعوی میں دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں (باقی برصفحہ ۹۱)

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اہل سنت کے یہاں بنو امیہ میں خلافت جاری رہی"۔

ہم جواباً کہتے ہیں کہ اہل سنت کا ایک فرد بھی یہ نہیں کہتا کہ اموی خلفاء جمیع اوامر و احکام میں واجب الاطاعت تھے اور کسی بات میں ان کے حکم سے سرتابی کرنا روا نہ تھا۔ بخلاف ازیں وہ کہتے ہیں کہ بنو امیہ مسند خلافت پر متمکن ہو گئے تھے وہ قوت و اقتدار سے بھی بہرہ ور تھے اور امور سلطنت کے انتظام و انصرام سے بھی نابلد نہ تھے۔ مزید براں وہ مقاصد امامت کی تکمیل میں بھی کامیاب تھے مثلاً وہ جہاد میں حصہ لیتے تھے۔ حج کرنے جاتے۔ جمعہ جماعت اور عیدین کی پابندی کرتے اور سرحدوں کی حفاظت کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ تاہم خدا کی نافرمانی کر کے ان کی اطاعت نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ ان کی اطاعت صرف بر و تقوی کی حد تک تھی۔ نہ کہ اثم و عدوان میں۔

ائمہ اثنا عشرہ مقاصدِ امامت کی تکمیل سے قاصر تھے

یہ حقیقت "عیاں را چہ بیاں" کی مصداق ہے کہ امراء و حکام کے بغیر انسانی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ ظالم امام نہ ہونے سے بہتر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

"امارت ناگزیر ہے خواہ نیک ہو یا بد"۔ لوگوں نے دریافت کیا۔ نیک امارت تو ہمیں معلوم ہے۔ امارتِ فاجرہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ جواباً فرمایا۔ جس سے راستے محفوظ رہیں۔ شرعی حدود کا قیام عمل میں آئے۔ دشمنانِ دین سے جہاد کیا جائے اور مالِ غنیمت کو تقسیم کیا جائے"۔ شیعہ عالم علی بن معبد نے اپنی تصنیف کتاب الطاعۃ والمعصیۃ میں یہ روایت ذکر کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰) اس سے شیعہ مذہب کی امارت دھڑام سے گر پڑے گی اس لیے کہ عصمت ائمہ کا عقیدہ شیعہ مذہب کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مذہب کی کوئی اساس نہیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ شیعہ کی نگاہ میں بلاشبہ امام حسن معصوم تھے اور حضرت حسن کا حضرت معاویہ کی بیعت سے مشرف ہونا ایک معصوم کا فعل ہے مگر شیعہ دین سے بغاوت کا ارتکاب کر رہے ہیں اور امام معصوم کی مخالفت سے باز نہیں آتے اور اس پر طرہ یہ کہ آئندہ نسلوں کو بھی یہی وصیت کیے جاتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ امام معصوم کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں اور دانستہ کفر و عناد اور مکابرہ کی بنا پر امام کے احکام کی خلاف ورزی پر مصر ہیں ہم نہیں جانتے ہیں کہ مذکورہ ہر دو وجوہ میں سے کونسی وجہ شیعہ کو قعر ہلاکت میں گرانے کے لیے دوسری وجہ کی نسبت قوی تر ہے ظاہر ہے کہ ان ہر دو اسباب کے علاوہ تیسرا سبب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ (حاشیہ صفحہ ہذا بر صفحہ ۹۲ ملاحظہ فرمائیں)

خلاصہ کلام (تاریخ کے مختلف ادوار میں) جو خلفاء مسند خلافت و امارت پر جاگزین ہوئے وہ بہر کیف شیعہ کے امام منتظر سے بہتر ہی تھے۔ جن کے انتظار میں شیعہ صدیوں سے جھوٹی آس لگائے بیٹھے ہیں۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ قرار دیا جائے تو امام منتظر کے جملہ آباؤ اجداد قوت و شوکت سے محروم، امامت سے قاصر اور امور مملکت سے بے بہرہ تھے۔ نظر بریں ان سے کسطرح امامت کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے فرمایا۔

جو شخص اپنے امیر سے کوئی بری حرکت صادر ہوتی دیکھے تو صبر سے کام لے اس لیے کہ جو شخص اطاعت سلطان سے ایک بالشت بھر باہر نکلا اور پھر اسی پر اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ جاہلیت کی موت مرا" (بخاری مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو اطاعت سے نکلا اور پھر جماعت کو چھوڑ کر مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے، اور جو طرفداری اور تعصب کی خاطر لڑتا ہوا مارا جائے تو وہ میری امت میں سے نہیں۔ (صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچا تو وہ بروز قیامت اللہ تعالےٰ کو ملے گا اور اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں کسی (خلیفہ و امام) کی بیعت کا جوا نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔

نیز آنحضور علیہ السلام نے فرمایا۔

"خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت روا نہیں۔ اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے"۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۹۱) سلہ علی بن معبد ایک شیعہ عالم تھا، در بغداد میں سکونت پذیر تھا۔ المامقانی نے اپنی کتاب "تنقیح المقال" ج ۲ ص ۳۰۹ پر لکھا ہے کہ یہ امام حسن عسکری کے والد محمد کے بیٹے ہادی علی کے اتباع میں سے تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن معبد خلیفہ مامون و معتصم کا معاصر تھا ۱۲

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔
"امیر و خلیفہ کی بات سننا اور اس پر عمل پیرا ہونا مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ خواہ وہ بات اسے پسند ہو یا ناپسند۔ البتہ اگر اسے خدا کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ضروری ہے اور نہ اطاعت کرنا۔" (صحیح بخاری و مسلم)

۲۔ دوسری فصل

واجب الاتباع مذہب کے بیان میں

کونسا مذہب واجب الاتباع ہے؟

شیعہ مصنف ابن المطہر لکھتا ہے۔

فصل ثانی میں یہ مسئلہ زیر بحث آئے گا کہ امامیہ کا مذہب احق المذاہب ہونے کی بنا پر واجب الاتباع ہے۔

نیز اس لیے کہ اصول عقائد میں ان کا مسلک تمام اسلامی فرقوں سے جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ نجات اخروی کا کامل یقین رکھتے ہیں۔ ان کا دین ائمہ معصومین سے ماخوذ ہے۔ امامیہ کے علاوہ دیگر فرقے مختلف الخیال ہیں اور ان کے طرز فکر و نظر میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ درج ذیل افکار و آراء سے اہل سنت کے تغایر و تخالف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ اہل سنت میں سے بعض لوگ بلا استحقاق امارت و خلافت کے طلبگار رہتے اور اکثر لوگ محض دنیا طلبی کے نقطۂ خیال سے ان کے پیرو بن گئے تھے۔ مثلاً عمر بن سعد بن مالک[۱] کو جب یہ اختیار دیا گیا کہ اگر چاہے تو امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہو کر اور اگر چاہے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لے تو اس نے لڑنا پسند کیا۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ امام حسین کے قاتل جہنمی ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

(۱) فَوَاللّٰهِ مَا اَدْرِیْ وَاِنِّیْ لَصَادِقٌ ۔۔۔ اُفَکِّرُ فِیْ اَمْرِیْ عَلٰی خَطَرَیْنِ

[۱] مالک کی کنیت ابو وقاص تھی یہ مشہور صحابی فاتح عراق حضرت سعد یکے از عشرہ مبشرہ کے والد تھے ۱۲

(۲) أأترك ملك الري والري منيتي　　　أو أصبح مأثوما بقتل حسين

(۳) وفي قتله النار التي ليس دونها　　　حجاب ولي في الري قرة عيني

ترجمہ (۱) بخدا میں سچ کہتا ہوں کہ میں دو خطرات کے بارے میں سوچ بچار کر رہا ہوں اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا

(۲) آیا میں رَے کی سلطنت چھوڑ دوں حالانکہ یہ میری دلی تمنا ہے یا قتل حسین کا مرتکب ٹھہروں۔

(۳) حضرت حسین کے قتل کی سزا دہ آگ ہے جس میں کوئی پردہ حائل نہیں اور رَے کی حکومت میرے لیے فرحت و سرور کی موجب ہے۔

(۲) بعض اہلسنت شبہات کا شکار ہو کر دنیا دار لوگوں کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ کوتاہ بینی کی بنا پر انھیں حق تک رسائی حاصل نہ ہو سکی اور وہ خداوندی گرفت کے مستوجب ٹھہرے

(۳) بعض لوگ کوتاہ فہمی کی بنا پر مقلد محض ہو کر رہ گئے اور لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر یہ سمجھے کہ شاید کثرت افراد حق و صداقت کی علامت ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انھیں ہی کی بیعت کر بیٹھے اور اس آیت کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (ص - ۲۴)　　　(وہ (حق پرست) کم ہی ہوتے ہیں)

(۴) بعض لوگ حق کی بنا پر امارت و خلافت کے طالب تھے۔ چنانچہ قلیل التعداد با اخلاص مسلمانوں کی ایک جماعت نے جنھیں دنیوی زیب و زینت سے کچھ سروکار نہ تھا ان کی اطاعت کا اقرار کر لیا اور ان کے اوامر و احکام کی اطاعت کرنے لگے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے

أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ (ہود - ۱۸)　　　(ظالموں پر خدا کی پھٹکار)

(شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

شیعہ مصنف کے نظریات کا ابطال

شیعہ مصنف نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کو چار فرقوں میں تقسیم کیا ہے۔ حالانکہ یہ صریح قسم کی دروغ بافی ہے اس لیے کہ معروف صحابہ میں سے ایک فرد واحد بھی ان اقسام چہارگانہ سے وابستہ نہ تھا۔ بلا استحقاق طالب خلافت سے شیعہ مصنف کے زعم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حق کی بنا پر طالب خلافت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ یہ دونوں کے حق میں صاف جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں حضرات نے کبھی خلافت و امارت کا مطالبہ

نہس کیا تھا۔

باقی ماندہ دو قسموں میں سے پہلی قسم کے وہ لوگ تھے جو طلب دنیا کے لیے دوسروں کی تقلید کا دم بھرتے تھے اور دوسرے وہ جو کوتاہ بینی کے پیش نظر دوسروں کے پیرو تھے۔ حق کی معرفت حاصل کر کے اس کی پیروی کرنا انسان کا فرض ہے۔ یہود نے حق کو پہچانا مگر اس کی اتباع سے قاصر رہتے تھے اس لیے وہ مورد غضب الٰہی ہوئے۔ نصاریٰ حق کی معرفت حاصل نہ کر سکے اور جادۂ مستقیم سے بھٹک گئے۔ مگر اس کے عین برخلاف امت محمدی خیر الامم ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ (آل عمران - ۱۱۰) (تم بہترین امت ہو)

امت محمدی میں سب سے افضل لوگ بفرمان نبی صلے اللہ علیہ وسلم قرن اول کے تھے۔ پھر ان کے بعد آنے والے۔ روافض[1] ان کی شان میں جو کچھ گل افشانی کرتے ہیں وہ معلوم ہو چکی۔ ان کے

---

[1] شیعہ اپنی علمی تصانیف میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو "الجبت و الطاغوت" (جادوگر اور شیطان) کے القاب سے نوازتے ہیں حالانکہ حضرت علی نے متعدد مرتبہ کوفہ کے منبر پر چڑھ کر یہ بات کہی تھی۔ ہزاروں اشخاص نے ان سے یہ بات سنی اور اس کثرت سے روایت کی کہ وہ متواتر کی حد تک پہنچ گئی آپ نے فرمایا خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا أَبُو بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ (نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر ہیں اور ان کے بعد حضرت عمر) مشہور شیعہ عالم المامقانی اپنی کتاب "تنقیح المقال" کے مقدمہ ص ۲۰۷ پر ان احادیث کا ذکر کرتے ہوئے جو اس نے دو اماموں کے علاوہ دیگر ائمہ کے کفر و ضلالت پر استدلال کرتے ہوئے تحریر کی ہیں رقمطراز ہے۔

"دسویں حدیث وہ ہے جو محمد بن ادریس الحلی نے "السرائر" کے آخر میں کتاب "مسائل الرجال" سے نقل کی ہے محمد بن علی بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے ابوالحسن علی بن محمد بن علی بن موسیٰ کو تحریر کیا کہ آیا ناصبی وہ شخص ہے جو الجبت والطاغوت (حضرت ابوبکر و عمر) کی تکریم بجا لاتا اور ان کی امامت کا قائل ہو یا کسی اور طریقہ سے بھی اس کی آزمائش مطلوب ہے؟ ابوالحسن نے اس کے جواب میں تحریر کیا کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ ناصبی ہے"۔

سلیمان بن خالد کی ذکر کردہ حدیث دوم بھی انہی احادیث میں شامل ہے۔ سلیمان امام جعفر صادق سے روایت کرتا ہے کہ آپ نے فرمایا "اہل شام اہل روم سے بدتر ہیں۔ اہل مدینہ اہل مکہ سے بدتر اور مکہ والے علانیہ کفر باللہ کا ارتکاب کرتے ہیں"۔ اس میں شک نہیں کہ امام جعفر صادق بحیثیت مجموعی امت محمدی کو کافر قرار نہیں دے سکتے یہ صرف سلیمان بن خالد کی دروغ بافی ہے۔

(باقی برص ۹۶)

مزعومات کے مطابق وہ سب لوگوں سے کم علم اور خواہشات کی پیروی کرنے میں سب سے آگے تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ امت آنحضور کی وفات کے بعد راہ حق سے منحرف ہو گئی تھی جب آنحضور کی وفات کے فوراً بعد یہ حالت ہو گئی تھی تو پھر شیعہ کے پیش کردہ دلائل و براہین کہاں تک قدر و قیمت کے حامل ہوں گے (جبکہ وہ سب دلائل عہد صحابہ سے نقل کیے گئے ہیں)

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ صحابہ کے جذبات و احساسات کی طرح ان کے افکار و آراء بھی مختلف تھے۔

حضرات صحابہ پر یہ بہتان عظیم ہے جس سے ان کا دامن پاک ہے۔ یہ امر قابل دریافت ہے کہ اس جاہل کے مخاطب کون لوگ ہیں؟ کیا یہ گل افشانی انہی صحابہ کے بارے میں کی جا رہی ہے جن کی شان میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (التوبۃ - ١٠٠)

اور مہاجرین و انصار میں سے جو سابقین اولین ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے نیکی کے کاموں میں انکی پیروی کی اللہ تعالے ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ تعالے سے راضی ہو گئے۔

(بقیہ حاشیہ ص٩٥) گیارہویں حدیث ابو حمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا۔

سب سے بہتر جگہ کونسی ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ، رسول اور ابن رسول ہی کو بہتر علم ہو گا۔ فرمایا سب سے بہتر جگہ وہ ہے جو رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان ہے۔ اگر کوئی شخص نوح علیہ السلام کی طرح ٩٥٠ سال کی عمر پائے اور رکن و مقام کے مابین روزہ رکھتا اور راتوں کو قیام کرتا رہے اور ہماری امامت کو تسلیم کیے بغیر مر جائے۔ تو اسے اس عبادت کا کچھ فائدہ نہ ہو گا۔

شیعہ نے ائمہ کی امامت تسلیم کرنے کے جو شرائط مقرر کر رکھے ہیں ان میں حضرت ابوبکر و عمر کو الجبت والطاغوت کے نام سے یاد کرنا اور انکی خلافت کا انکار نہ کرنے والوں کو کافر قرار دینا بھی شامل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے الہام ربانی کی بنا پر اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے کہ جب حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر صحابہ نے وفات پائی۔ اور ان کی نیکیوں کا سلسلہ بند ہو گیا تو اللہ تعالے نے اولاد مجوس میں سے کچھ ایسے لوگ پیدا کر دیئے جو یہ فریضہ (یعنی سب و شتم اور تکفیر و تفسیق) انجام دیتے رہتے ہیں۔ تاکہ اجر و ثواب کا سلسلہ جاری رہے اس ضمن میں شیعہ کی ایک دعا بھی قابل ذکر ہے جسے وہ کفار قریش کی دعا سے یاد کرتے ہیں۔ ہم کسی دوسری فرصت میں اس فاجرانہ دعا پر روشنی ڈالیں گے۔

نیز فرمایا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ (الفتح۔۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں ملیت و شفیق ہیں۔

متعدد قرآنی آیات میں مہاجرین و انصار کی مدح وستائش کی گئی ہے۔ بعد میں آنے والوں کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی۔

"رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ" (الحشر۔۱۰)

اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے باایمان گذرے ہیں۔

صحابہ کے بعد آنے والے (تابعین) بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ ان کے دل عداوت صحابہ سے پاک رہیں۔ روافض صحابہ کے لیے دعا نہیں کرتے بلکہ ان کے دل صحابہ کے خلاف بغض و عداوت سے لبریز ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے یہ جانتے ہوئے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ باہم لڑا کرتے تھے"۔

عروہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ "اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر لوگوں نے برا بھلا کہنا شروع کر دیا"۔

ابوسعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میرے صحابہؓ کو گالیاں نہ دو اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے تو ان کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا (بخاری و مسلم)

صحیح مسلم میں یہی روایت بعینہ حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے نیز مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا "کچھ لوگ اصحاب محمد یہاں تک کہ ابوبکر و عمر کی شان میں سوء ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں"

حضرت عائشہ نے جواباً فرمایا۔

اس میں حیرت و استعجاب کی کونسی بات ہے۔ دار فانی سے کوچ کرنے کے باعث ان کے نیک اعمال کا سلسلہ بند ہو گیا تھا خداوند کریم نے چاہا کہ ان کے اجر و ثواب کا سلسلہ بند نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

صحابہ کے فضائل و مناقب

اصحاب محمدؐ کی شان میں گستاخی سے احتراز کیجئے بخدا نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کی ایک گھڑی کی رفاقت و صحبت تمہارے چہل سالہ اعمال سے افضل ہے"۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِہِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْہِمْ وَاَثَابَہُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا (الفتح ۱۸)

اللہ تعالے مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اس نے معلوم کر لیا۔ ان پر اطمینان و سکون نازل کیا اور انہیں قریبی فتح سے نوازا۔

مذکورہ صدر آیت اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ اللہ تعالے نے اصحاب رسول کے قلبی اسرار کو معلوم کر کے ان سے رضامندی کا اظہار فرمایا ہے[۱]۔ درخت کے نیچے بیعت کرنے والے صحابہ کی تعداد ۱۴۰۰

---

[۱] یہ حدیث معجزات نبوت میں سے ایک عظیم معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بیعت رضوان پر ۱۳۶۸ سال کی مدت مدید گذر چکی ہے اور مسلمان ہنوز بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے صحابہ کے بارے میں لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمؤمنین" کی شہادت خداوندی پر قانع چلے آ رہے ہیں۔ عصر حاضر میں ایک جاہل نابینا پیدا ہوا ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر دو اصحاب (ابوبکر و عمر) اور رفقائے دنیا و آخرت کے ایمان کو مشتبہ قرار دینے سے بھی نہ شرمایا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "احیاء الشریعۃ فی مذہب الشیعۃ" کی جلد اول ص ۶۳-۶۴ پر لکھتا ہے"

"اگر اہل سنت یہ کہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر بیعت رضوان کرنے والے صحابہ میں شامل ہیں جن کے متعلق واضح الفاظ میں رضائے خداوندی کا اظہار کیا گیا ہے تو ہم جواباً کہیں گے کہ اگر قرآن میں یہ الفاظ ہوتے کہ "لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ بَایَعُوْکَ" (اللہ تعالے ان لوگوں سے راضی ہوا جنھوں نے آپ کی بیعت کی) تو آیت اس بات پر دلالت کرتی کہ اللہ تعالے بیعت رضوان میں شامل ہونے والے تمام صحابہ سے راضی ہے۔ مگر آیت (باقی بر ص ۹۹)

تھی۔ پھر الٰہی صحابہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت میں حصہ لیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا یَدْخُلُ اَحَدٌ مِّمَّنْ بَایَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ النَّارَ (صحیح مسلم)

درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی شخص آگ میں داخل نہیں ہوگا۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (التوبۃ ۱۱۷)

اللہ تعالیٰ نبی اور مہاجرین و انصار کی طرف (اپنی رحمت کے ساتھ) لوٹ آیا جنھوں نے تکلیف کے وقت آپ کی پیروی کی (تکلیف کے وقت سے جنگ تبوک مراد ہے)

نیز فرمایا اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (المائدۃ ۔ ۵۵)

تمہارا دوست تو صرف اللہ تعالیٰ اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ (التوبۃ ۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸) کے الفاظ یہ ہیں "لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ" (اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہوا) بنا بریں آیت سے صرف یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہے"۔

صحیح مسلم میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔ اس جاہل اندھے کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے اور ایک تھپڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جاہل اندھے کے دین و ادب اور فہم و فراست کا یہ عالم ہے کہ اس کی رائے میں آیت "اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ" حضرت ابوبکر کی مدح و ستائش کے لیے نہیں بلکہ ان کی مذمت میں نازل ہوتی ہے۔ یہ اندھا شیعہ مجتہدین میں سے ایک ہے۔ جب مجتہدین کا یہ حال ہے تو درجۂ اجتہاد سے قاصر رہنے والوں کی کیا حالت ہوگی؟

اللھم اغفر لکاتبہ و لمن سعی فیہ۔ آمین

اس آیت میں صحابہ سے دوستی لگانے کا حکم دیا گیا ہے مگر روافض اس کے برعکس ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک جاہل کا قول ہے کہ درج ذیل آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے اس کے اثبات میں ایک موضوع روایت بھی بیان کردی کہ آپ نے نماز کے دوران اپنی انگوٹھی صدقہ کے طور پر کسی کو دیدی تھی۔ تب یہ آیت اتری۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ (المائدہ ۵۵-۵)

جو نمازوں کی پابندی کرتے۔ زکوۃ ادا کرتے اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔

یہ طرز استدلال سراسر غلط ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جبکہ حضرت علی ایک تھے۔ مزید براں وَھُمْ رَاکِعُوْنَ میں واو حالیہ نہیں ہے۔ اگر واؤ کو حالیہ قرار دیا جائے تو زکوۃ کا حالت رکوع میں ادا کرنا ایک ضروری امر ہوگا۔ علاوہ کسی کی مدح امر واجب یا مستحب کی بنا پر کی جاتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حالت نماز میں زکوۃ ادا کرنا بالاتفاق نہ واجب ہے اور نہ مستحب۔

نیز یہ کہ نماز میں ایک طرح کی مشغولیت ہوتی ہے اور زکوۃ کی ادائیگی اس کے منافی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ عہد نبوی میں سرے سے حضرت علی پر زکوۃ ہی فرض نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس انگوٹھی بھی نہ تھی۔ بفرض محال اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ کے پاس انگوٹھی موجود تھی تو آخر یہ انگوٹھی دے کر کس مال کی زکوۃ ادا کی گئی؟ اس لیے کہ اکثر فقہاء زکوۃ میں انگوٹھی دینے کو ناروا خیال کرتے ہیں۔ شیعہ کی کتب حدیث میں تحریر ہے کہ حضرت علی نے یہ انگوٹھی ایک سائل کو دی تھی زکوۃ میں مدح کا پہلو صرف یہ ہے کہ فوری طور پر بلا تاخیر ادا کی جائے۔

قرآنی آیات سے مدح صحابہ

ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ آیت قرآنی میں کفار کی دوستی سے منع کر کے مومنین سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بخلاف ازیں روافض اہل ایمان سے بغض وعداوت رکھتے اور مشرکین تاتار سے دوستی لگاتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے۔ خداوند کریم آنحضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (الانفال ۶۱-۶۲)

وہ خدا کی ذات ہی ہے جس نے اپنی اور مومنوں کی مدد سے آپ کی تائید کی۔ اور ان کے دلوں میں الفت پیدا کر دی۔

آیت کے مفہوم کے عین برخلاف شیعہ جھوٹ بول بول کر اکابر امت کیلئے دلوں میں نفاق کا بیج بوتے ہیں۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر ۳۳)

جو سچ کو لایا اور اس کی تصدیق کی وہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

مذکورہ صدر آیت میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اشرف الامت ہیں۔ اللہ تعالے نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے بقول شیعہ حضرت علی جب گناہوں سے پاک ہیں تو اس آیت کا مصداق کیونکر ہو سکتے ہیں؟ قرآن میں فرمایا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (النور - ۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اللہ تعالے نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں خلافت ارضی عطا کرے گا۔

مذکورہ بالا آیت میں ان امور پر روشنی ڈالی گئی ہے

۱۔ صحابہ کو خلافت سے نوازا جائے گا۔

۲۔ اللہ تعالے ان سے راضی ہے۔

(۳) اللہ تعالے نے ان پر سکون واطمینان نازل کیا ہے۔

(۴) صحابہ تقوی کے وصف سے بہرہ ور ہیں۔

جن صحابہ نے حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعت کی وہ ان صفات سے بہرہ ور تھے۔ وہ امارت و خلافت سے بہرہ ور ہوئے۔ قوت و شوکت نے ان کے قدم چومے خطرات کا ازالہ کر کے ملک میں امن وامان قائم کیا۔ فارس و روم کو زیر نگین کیا۔ ان کی فتوحات کا سلسلہ شام و عراق مصر و مغرب و خراسان و آذربائیجان تک پہنچ گیا۔

جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد فتنہ پردازی کا آغاز ہوا تو فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور رومی اور دوسرے لوگ اسلامی بلاد و امصار کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ دوسری جانب بدعات کا آغاز ہوا اور مختلف فرقے مثلاً خوارج، روافض اور نواصب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گئے۔ خون ریزی کا بازار گرم ہوا۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ شہادتِ عثمانؓ کے ماقبل و مابعد کے حالات میں کس حد تک فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ منافق اس دور میں بظاہر مسلم ہونے کے دعویٰ دار تھے تو اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ منافقین میں کوئی اچھا وصف نہ تھا۔ انھیں رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مومنین صحابہ میں سے کسی کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل نہ تھا۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل آیات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

(۱) لَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (العنکبوت - ۱۰)

اگر اللہ کی جانب سے مدد آئے تو منافق کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ تھے۔

(۲) وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ (التوبۃ - ۵۶)

وہ (منافق) قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں۔

(۳) اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء - ۱۴۵)

منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

اللہ تعالےٰ ان آیات میں فرماتے ہیں کہ منافق ایمان سے بہرہ ور نہیں نیز یہ کہ وہ یکسوئی سے محروم ہیں اور تذبذب کی حالت میں مبتلا ہیں۔ بعینہٖ روافض کی بھی یہی حالت ہے۔

(۴) لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِى الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ (الاحزاب - ۶۰)

اگر منافق باز نہ آئے اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کھوٹ ہے اور مدینہ میں افواہیں پھیلانے والے تو ہم آپ کو ان کے خلاف آمادہ کریں گے۔

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین سے جنگ آزمائی کے لیے آمادہ نہ کیا اور نہ ہی آپ نے عام منافقین کو تہ تیغ کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق

اپنے رویہ سے باز آگئے تھے۔ بیعت رضوان میں جدّ بن قیس کے سوا کوئی منافق موجود نہ تھا۔ وہ بھی اونٹ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ خلاصہ کلام! منافق صحابہ کے آگے مجبور و بے بس ہوا کرتے تھے۔ جنگ تبوک کے بعد آنحضور کی زندگی کے آخری ایام میں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

(۵) لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (المنافقون۔۸)

اگر ہم مدینہ کو لوٹ کر گئے تو ہم میں سے معزز آدمی ذلیل کو وہاں سے نکال دے گا۔

۶ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ (المنافقون۔۸)

اور عزت اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے مگر منافقوں کو معلوم نہیں۔

یہ آیت اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے کہ اصحاب محمد عزت و قوت سے بہرہ ور تھے اور منافق ان کے درمیان ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

(۷) يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ (التوبۃ ۶۲)

وہ تمھیں راضی کرنے کے لیے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں

(۸) يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ (التوبۃ ۹۶)

وہ (منافق) قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ

(۹) وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ (التوبۃ ۵۶)

وہ منافق گھبراہٹ میں پڑی ہوئی قوم ہیں (مبادا آشکارا نہ ہو جائیں)

مذکورہ صدر آیات میں ذکر کردہ صفات ایک ذلیل اور مقہور و مجبور قوم کی صفات ہی ہو سکتی ہیں۔ اس کے عین برخلاف سابقین اولین مہاجرین و انصار آپ کی زندگی میں اور بعد از وفات ہمیشہ باعزت زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ آیات اس امر کی شاہد عدل ہیں کہ آنحضور کے باعزت صحابہ کسی طرح بھی منافق اور ذلیل و رسوا نہ تھے۔

منافق کون ہے؟

سابق الذکر امور و اوصاف کا اصلی مورد و مصدر شیعہ ہیں۔ عزت و رسوائی میں ان کا شمار ہے۔ نفاق و تقیہ ان کا اوڑھنا بچھونا اور کذب بیانی اور جھوٹی قسمیں ان کا سرمایۂ افتخار!

ان کی زبانوں سے وہ باتیں صادر ہوتی ہیں جو دل میں نہیں ہوتیں۔ شیعہ امام جعفر صادقؒ پر

بہتان طرازی کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا

"اَلتَّقِیَّۃُ دِیْنِیْ وَ دِیْنُ اٰبَائِیْ"۔ (تقیہ میرا اور میرے آباء کا دین ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالے نے اہل بیت کو اس سے بے نیاز رکھا تھا اور ان کا دامن اس سے پاک تھا۔ وہ لوگوں میں سب سے سچے اور ایمان میں عظیم تر تھے۔ بنابریں ان کا دین تقوی تھا نہ کہ تقیہ۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

"لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً" (آل عمران۔ ۲۸)

اہل ایمان مومنوں کو چھوڑ کر کفار کو دوست نہ بنائیں جو ایسا کرے گا تو اللہ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں البتہ یہ کہ کفار سے بچاؤ حاصل کرو تو الگ بات ہے۔

اہل بیت مقہور و مجبور نہ تھے

اس آیت میں کفار سے بچاؤ حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ کذب و تقیہ۔ البتہ جس شخص کو کفر پر مجبور کیا جائے اسے کلمۂ کفر کہنے کی اجازت ہے، مگر اہلبیت کا معاملہ مختلف نوعیت کا ہے ان کو کسی شخص نے کسی بات پر مجبور نہیں کیا تھا۔ اس کی حد یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اہلبیت کو اپنی بیعت پر مجبور نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی مرضی سے بخوشی بیعت کی تھی۔ حضرت علی اور دیگر اہل بیت کرام کسی جبر و اکراہ کے ماتحت صحابہ کے فضائل و مناقب نہیں بیان کرتے تھے۔ بنو امیہ و بنو عباس کے عہد خلافت میں بہت سے لوگ ایمان و تقوی میں حضرت علی سے فروتر تھے۔ وہ خلفاء میں گونا گوں عیوب و نقائص ملاحظہ کرتے۔ مگر ان کی مدح و ثناء میں رطب اللسان ہوئے نہ ان کی تعریفوں کے پل باندھتے اور نہ ہی خلفاء جبراً ان سے یہ کام لیتے۔ خلفائے راشدین تو باقی سلاطین کی نسبت جبر و اکراہ سے بالاتر تھے۔ مقام حیرت ہے کہ مٹھی بھر نصاریٰ مسلمانوں کے قیدی ہونے کے باوصف واشگاف اپنے مذہب کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت علی او آپ کے عیال و اطفال بھلا اپنے مذہب کے اظہار میں نصاریٰ سے ضعیف تر کیونکر ہو سکتے تھے۔ اخبار متواترہ کی بنا پر ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت علی اور ان کی اولاد کو کسی نے بھی خلفاء ثلاثہ کی مدح و ستائش

پر مجبور نہیں کیا تھا۔ مگر بایں ہمہ وہ خلفاء ثلاثہ کی تعریف کرتے ان کے لیے دعائے رحم فرماتے اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے احباب و خواص کے روبرو یہ سب کچھ بیان کرتے تھے۔

شیعہ مصنف کا یہ دعوی کہ "بعض صحابہ بلا استحقاق خلافت کے طالب تھے اور اکثر لوگوں نے دنیا طلبی کے نقطۂ خیال سے ان کی بیعت کر لی تھی"۔

شیعہ مصنف کا یہ اشارہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی جانب ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت صدیق امارت و خلافت کے طلبگار نہ تھے۔ آپ نے برملا فرمایا تھا۔

"میں تمہارے لیے عمر فاروق رض یا عبدالرحمن بن عوف یا ابو عبیدہ کو پسند کرتا ہوں"۔

اس کے جواب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا

بخدا اگر میں آگے بڑھوں اور آپ میری گردن کاٹ ڈالیں اس سے بہتر ہے کہ میں اس قوم کا سردار بنوں جس میں ابو بکر موجود ہو"۔

بخلاف ازیں حضرت عمر، ابو عبیدہ اور تمام مسلمانوں نے یہ جانتے ہوئے آپ کی بیعت کر لی تھی کہ آپ افضل الصحابہ ہیں۔ آنحضور کا ارشاد گرامی ہے۔

"اللہ تعالے اور مومن ابو بکر کے سوا کسی کی خلافت و امارت کو پسند نہیں کر سکتے"۔

بفرض محال اگر حضرت صدیق امارت کے طالب تھے اور لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی تھی۔ تو شیعہ کا یہ قول صریح قسم کی دروغ بافی ہے کہ لوگوں نے طلب دنیا کی بنا پر آپ کی بیعت کی تھی یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ حضرت صدیق نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حین حیات اپنا سب مال خرچ کر دیا تھا۔ اور خلافت کے دوران آپ خالی ہاتھ تھے۔ مزید براں آپ کی بیعت کرنے والے دنیا طلبی سے بے نیاز تھے۔ یہ حقیقت دور و نزدیک، سب کو معلوم ہے کہ حضرت عمر، ابو عبیدہ، اسید بن حضیر اور ان کے نظائر و امثال زہد و تقوی میں اپنی مثال آپ تھے۔ مزید براں آنحضور کی وفات کے وقت کوئی بیت المال نہ تھا جس سے آپ ان کی حرص و آز کا سامان بہم پہنچاتے۔ حضرت علی کی طرح حضرت ابو بکر صدیق بھی مال غنیمت کی تقسیم میں مساوات کے قائل تھے۔ اگر صحابہ حضرت ابو بکر کی بجائے حضرت علی کی بیعت کرتے تو وہ بھی انھیں اسی قدر مال دیتے جتنا حضرت ابو بکر نے عطا کیا تھا۔ حالانکہ آپ کا قبیلہ بنی تمیم سے افضل تھا۔

مزید براں آپ کا کنبہ قبیلہ اور چچازاد بھائی حسب و نسب کے اعتبار سے افضل الصحابہ تھے۔ مثلاً حضرت عباس، ابوسفیان اور آپ کے دو پھوپھی زاد بھائی حضرت عثمان و زبیر رضی اللہ عنہم۔ ابوسفیان نے تو اس ضمن میں حضرت علی سے بات بھی کی تھی اور اپنے حسب و نسب کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ مگر حضرت علی نے اپنے علم و فضل اور دین و مذہب کی بنا پر ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ غور کیجئے! حضرت ابوبکر کی بیعت سے عام لوگوں کو کیا فائدہ پہنچا؟ خصوصاً جبکہ تنخواہ کے معاملہ میں آپ سابقین اولین اور ایک عامی میں کچھ فرق نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

"لوگ اللہ سے اجر و ثواب پانے کی امید میں مشرف باسلام ہوئے ہیں، اور وہ انہیں اجر عطا کرے گا۔ جہاں تک تنخواہ کا تعلق ہے وہ صرف بقائے حیات کا ذریعہ ہے اور بس"!

اہل سنت و شیعہ کا باہمی رابطہ

اہل سنت کا شیعہ سے ربط و تعلق بعینہ اسی طرح ہے جیسے مسلمانوں کا نصاریٰ کے ساتھ۔ اہل اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں مگر نہ انکی شان میں نصاریٰ کی طرح غلو کرتے ہیں اور نہ یہود کی طرح انکی تنقیص شان کرتے ہیں۔ نصاریٰ غلو سے کام لیتے ہیں اور حضرت مسیح کو معبود سمجھتے، اور ہمارے نبی کریم کے مقابلہ میں افضل قرار دیتے ہیں۔ مبالغہ آمیزی کی حد یہ ہے کہ نصاریٰ حضرت مسیح کے حواریوں کو رسولوں سے بھی افضل تصور کرتے ہیں۔

شیعہ کا بھی یہی حال ہے وہ حضرت علی کی تائید و نصرت کے لیے لڑنے والوں مثلاً اشتر اور محمد بن ابی بکر کو حضرت ابوبکر و عمر اور سابقین اولین صحابہ رضوان اللہ علیہم کے مقابلہ میں افضل سمجھتے ہیں۔ بنظر بریں ایک مسلم جب نصرانی سے مناظرہ کرے گا تو وہ صرف حق بات کہے گا۔ مگر نصرانی کو اس کی ہرگز پرواہ نہیں۔ اس کا بہترین مداوا یہ ہے کہ مسلم کی بجائے ایک یہودی نصرانی کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر میدان مناظرہ میں آئے۔ نصرانی یقیناً یہودی کو وہی جواب دیگا جو وہ مسلم کو دے رہا تھا مگر وہ جلد ہی لاجواب ہو جائے گا جب عیسائی کو محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لیے کہا جائے گا اور وہ آپ پر نکتہ چینی کرے گا تو یہودی اس سے کہیں بڑھ کر حضرت عیسیٰ کی توہین کا مرتکب ہو گا۔ اس لیے کہ آنحضور کی نبوت کا اثبات کرنے

والے دلائل حضرت عیسیٰ کی نبوت کے دلائل دبراہین سے کہیں بڑھ کر ہے۔ علاوہ ازیں وہ علیسوی دلائل کی نسبت شکوک وشبہات سے بعید تر ہیں۔

حضرت ابوبکر و علی کی نسبت ایک سنی و شیعہ کا معاملہ بعینہ اسی نوعیت کا ہے ایک شیعہ اس وقت تک حضرت علی کے ایمان و عدالت اور دخول جنت کو ثابت نہیں کرسکتا جبتک حضرت ابوبکر و عمر کے لیے ان کا اثبات نہ کیا جائے اگر وہ حضرت علی کے لیے ان جملہ امور کا اثبات کرے گا اور حضرت ابوبکر و عمر کو اس سے مستثنیٰ قرار دے گا تو دلائل و براہین اس کا ساتھ نہیں دینگے۔ اسی طرح ایک عیسائی جب آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نظر انداز کر کے حضرت مسیح کی نبوت کا اثبات کرے گا تو دلائل اس کی موافقت نہیں کریں گے۔

خوارج حضرت علی کی تکفیر کرتے اور نواصب آپ کو فاسق قرار دیتے ہیں جب خوارج و نواصب شیعہ سے کہیں گے کہ حضرت علی ظالم اور خلافت کے خواہاں تھے۔ اسی بنا پر وہ شمشیر بکف اپنے اعدائ سے لڑتے تھے۔ آپ نے ہزارہا بے گناہ مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بے بس ہوگئے۔ رفقاء کار آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے۔ اور آپ کو کافر قرار دے کر یوم النہروان میں آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

اگر یہ گفتگو خلاف تہذیب اور مبنی بر فساد ہے تو حضرت ابوبکر کی شان میں روافض کی گستاخی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ شیعہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں جو گل افشانی کرتے ہیں اگر وہ درست اور مبنی بر حق و صواب ہے تو اس کلام کے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ جب ابوبکر بن باقلانی سفیر بن کر شاہ روم کے دربار میں قسطنطنیہ پہنچے تو آپ کی عظمت شان کے پیش نظر رومیوں نے محسوس کیا کہ آپ بادشاہ کو سجدہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ آپ کو ایک چھوٹے سے دروازہ سے داخل کیا تاکہ جھک کر داخل ہوں۔ علامہ باقلانی تاڑ گئے اور دربار میں الٹے پاؤں داخل ہوئے۔ جب ایک رومی مسلمانوں پر تنقید کرتے ہوئے کہنے لگا "تمہارے پیغمبر کی بیوی کے بارے میں کیا کہا گیا ہے"۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک کی جانب اشارہ تھا۔" باقلانی یہ سنکر بولے۔

"بیشک دو پاکدامن عورتوں پر بہتان لگایا گیا تھا ـــــ اور وہ ہیں حضرت مریم و عائشہ ـــــ

حضرت مریم دوشیزہ ہی تھیں کہ ان کے یہاں بچہ تولد ہوا۔ مگر حضرت عائشہ خاوند کے باوجود بے اولاد رہیں۔ نصرانی ہکا بکا رہ گیا۔ کچھ جواب بن نہ آیا اور اس پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی۔ کہ حضرت عائشہ کی عفت و براءت حضرت مریم کے مقابلہ میں نمایاں تر ہے۔

شیخین کے اوصاف خصوصی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت بلا جبر و اکراہ لوگوں کی مرضی سے عمل میں آئی اور استحکام پذیر ہوئی تھی۔ نہ آپ نے اپنے اقارب میں سے کسی کو کوئی عہدہ تفویض کیا۔ نہ اپنے وارثوں کے لیے مال باقی چھوڑا۔ بخلاف ازیں اپنا سب اثاثہ راہ خدا میں لٹا دیا اور فوت ہوتے وقت یہ وصیت کر دی کہ گھر میں جو کچھ ہے سب بیت المال کی نذر کر دیا جائے۔ گھر میں ایک بوسیدہ چادر ایک لونڈی اور ایک اونٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

آپ کے بارے میں یہاں تک کہا گیا تھا کہ

"ابوبکر! خدا تجھ پر رحم فرمائے تو نے بعد میں آنے والے امراء کو بڑی مشکل میں مبتلا کر دیا"۔

آپ کے عہد خلافت میں کوئی مسلمان قتل نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ آپ نے مسلمانوں کی معیت میں مرتدین و کفار کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ جب آخری وقت آیا تو حضرت عمر فاروق[۱] رضی اللہ

---

[۱] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عمر فاروق کو "القوی الامین" کے لقب سے یاد کیا۔ حضرت فاروق زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ مصروف تھے۔ حضرت علی و عثمان آپ کی مدد کر رہے تھے۔ حضرت علی نے جناب فاروق کی طرف اشارہ کر کے حضرت عثمان کو یہ آیت سنائی۔

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ

حضرت فاروق کا لقب "عبقری" (نادرۂ روزگار) آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب سے ماخوذ ہے جس کی تفصیلات قبل ازیں بیان کی جا چکی ہیں۔ تاریخ کی یہ دو عظیم ترین شہادتیں اسلامی بلکہ اس سے بڑھ کر انسانی عدل و انصاف کی زندہ جاوید مثالیں ہیں۔ اسلامی تاریخ گویا بزبان حال یوں کہہ رہی ہے۔

"غیظ و غضب میں گھل گھل کے مر جاؤ۔ در اصل تم ابوبکر و عمر کے دشمن نہیں ہو بلکہ اس دین اسلام سے عداوت رکھتے ہو جس کے وہ دونوں نمائندہ ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ تم اس انسانیت کے دشمن ہو جس کی جانب منسوب ہونے کے تم مدعی ہو"۔

عنہ ایسے نادرۂ روزگار تندرست و توانا اور صاحب امانت و دیانت کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ حضرت عمر کے تقرر میں کنبہ پروری اقربا نوازی اور دنیا طلبی کا کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کی نفع رسانی کی خاطر آپ نے یہ اہم کام سرانجام دیا۔ چنانچہ آپ کی بصیرت و فراست کو سراہا گیا اور آپ کے اس بے پایاں احسان کا شکریہ ادا کیا گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف دیار و امصار فتح کیے۔ دفتر بنائے۔ بیت المال کو زر و مال سے بھر دیا اور لوگوں میں عدل و انصاف کو فروغ دیا۔ بایں ہمہ آپ اسی شاہراہ پہ گامزن رہے جس پر قبل ازیں حضرت ابوبکر چلا کرتے تھے۔ عیش و تنعم کی زندگی سے کنارہ کش رہے۔ اقربا نوازی سے احتراز کیا تاآنکہ شہادت پا کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ان مسلّمہ حقائق کے علی الرغم اگر ایک شیعہ کہے کہ یہ سب کچھ طلب دنیا اور جاہ طلبی کے جذبہ کے پیش نظر تھا اور حضرت ابوبکر و عمر طالب دنیا تھے تو ایک ناصبی بڑی آسانی سے حضرت علیؓ کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ آپ ریاست و امارت کے خواہاں تھے اور یہی جذبہ جدال و قتال کا محرّک ہوا۔ آپ کبھی کفار کے خلاف صف آرا نہ ہوئے اور کبھی ایک شہر بھی فتح نہ کیا۔

اگر شیعہ یہ کہے کہ حضرت علی طالب رضائے الٰہی مجتہد مُصیب اور دین کے معاملہ میں مداہنت کرنے والے نہ تھے مگر دوسرے لوگ خطا کار تھے۔

---

[1] جس طرح اس جاہل نصرانی نے قسطنطنیہ میں امام باقلانی کے روبرو حضرت عائشہ صدیقہ کی شان میں گستاخی کر کے اپنے اہل مذہب کا منہ چڑایا تھا۔ اسی طرح شیعہ کا یہ فعل مسلم کامل خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے باعث ننگ ہے نوع انسانی میں سے چیدہ و برگزیدہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شیعہ کا مسلک مقابلہ و موازنہ پر مبنی ہے۔ حضرت علی اور ان کی اولاد کا مقام اہل سنت کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ ان کو میدان مقابلہ میں کھینچ لائیں۔ جس طرح انبیاء و رسل کے متعلق ہمارا موقف حسب ارشاد ربانی لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ عدم تفریق پر مبنی ہے اسی طرح صحابہ کرام کے متعلق ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے استاد محترم (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا

اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّہِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ

(میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ تم جس کی پیروی کرو گے راہ راست کو پا لو گے)

حضرت علیؓ کے ایمان کا اثبات ایمان صحابہ پر موقوف ہے

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اسی طرح حضرت علی کے پیش رو بھی طلب امارت و ریاست سے پاک تھے۔ واقعۂ تحکیم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت علیؓ و معاویہؓ ہر دو کو معزول کرنے اور شوریٰ سے خلیفہ منتخب کرنے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہمنوا تھے۔ بنا بریں حضرت ابو موسیٰ کے شبہات کو عبداللہ بن سبا اور اس کے نظائر و امثال کے شکوک سے کیا نسبت جن کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی الٰہ تھے یا معصوم تھے یا نبی تھے۔

یہ دلائل و شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ ایک رافضی حضرت علی کے پیشرو صحابہ کے ایمان کی نفی کر کے حضرت علی کا عدل و ایمان ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر رافضی حضرت علی کے اسلام اور ہجرت کے وجہاد کے اثبات میں احادیث متواترہ سے استناد کریگا تو ایسی متواتر روایات حضرت ابوبکر کے بارے میں بھی موجود ہیں۔

اگر شیعہ کہے کہ صحابہ اندرونی طور پر منافق اور دین اسلام کے معاند و مخالف تھے تو ایک خارجی بڑی آسانی سے حضرت علی کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ آپ اپنے چچا زاد بھائی پر حسد کرتے تھے اور اس طرح اپنے کنبہ و قبیلہ میں عداوت کے مرتکب ہوتے تھے علاوہ ازیں آپ دین میں فساد بپا کرنے کے خواہاں تھے۔ جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو خونریزی کا بازار گرم کیا اور تقیہ و نفاق کی راہ پر گامزن ہوئے۔ باطنیہ فرقہ بھی جو سب سے حضرت علی پیروی کرنے والے آپ کی جانب وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جن سے حضرت علی کا دامن حضرت ابوبکر و عمر کی طرح پاک ہے۔

علیٰ ہذا القیاس شیعہ جس آیت کو بھی حضرت علی سے مختص تصور کرتے ہوں بڑی آسانی سے اس آیت کو ابوبکر و عمر کے ساتھ مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرکیف دعویٰ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ فریقین کے لیے اس کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اگر شیعہ اقوال و آثار سے حضرت علی کے

قضیہ تحکیم سے متعلق صحیح بات یہی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اور عمرو بن العاص اس امر میں متحد الخیال تھے کہ کبار صحابہ کے مشورہ سے خلیفہ منتخب کیا جائے۔ ہم نے العواصم من القواصم ص ۱۷۲-۱۸۱ کے حواشی میں اس کے دلائل پیش کیے ہیں۔ کتاب ہذا میں اپنے موقع پر ان عظیم حقائق کی نشاندہی کی جائے گی۔

فضائل ومناقب ثابت کریں تو حضرت ابوبکر وعمر کی شان میں وارد شدہ آثار اکثر واضح ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی کہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فقیہ تھے مگر حضرت علی فقیہ نہ تھے یا حضرت عمر فقہیات کے عالم تھے اور عبداللہ بن مسعود فقہ سے نابلد تھے۔ یہ ظلم وجہل کی راہ ہے اور شیعہ اسی راہ کے سالک ہیں۔

جہاں تک عمر بن سعد کی پیش کردہ مثال کا تعلق ہے کہ عبیداللہ بن زیاد نے اسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے لڑنے یا اپنے منصب سے الگ ہو جانے کا اختیار دیا تھا۔ قیاس کی بدترین قسم ہے۔ اس لیے کہ عمر بن سعد جاہ طلبی اور محرمات کا مرتکب ہونے میں مشہور ومعروف تھا۔ اس کی مثال پیش کرنے سے یہ کیسے لازم آیا کہ (العوذ باللہ من ذلک) سابقین الاولین صحابہ بھی اسی کی مانند تھے۔

عمر بن سعد کے والد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بہت بڑے فاتح تھے تاہم امارت وریاست سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب مسلمانوں میں فتنہ پردازی کا آغاز ہوا تو آپ اپنے محل میں گوشہ نشین ہو گئے جو عقیق نامی جگہ میں واقع تھا۔

آپ کا بیٹا عمر بن سعد خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ "لوگ سلطنت وحکومت کے بارے میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور آپ یہاں بیٹھے ہیں"

حضرت سعد بولے "اپنی راہ لیجئے! میں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِیَّ الْخَفِیَّ الْغَنِیَّ (اللہ تعالیٰ متقی گمنام اور بے نیاز آدمی کو پسند کرتے ہیں)

اہل شوریٰ میں سے صرف حضرت علی اور سعد رضی اللہ عنہما باقی رہ گئے تھے۔ حضرت سعد نے سرزمین عراق کو زیر نگیں کر کے کسریٰ کے لشکر کو نیچا دکھایا تھا۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے۔ اور سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ جب حضرت سعد کو ان کے بیٹے عمر بن سعد کو مشابہ قرار نہیں دے سکتے تو حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان اس کی مثل کیونکر ہوئے۔

مقام حیرت ہے کہ شیعہ کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے محمد بن ابی بکر کے ہم پلہ نہ تھے بلکہ محمد بن ابی بکر کا مرتبہ ان سے بلند تر تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمد بن ابی بکر نے حضرت عثمانؓ کو ایذا پہنچائی تھی اور حضرت علی کا تربیت یافتہ ہونے کی بنا پر وہ آپ کے خاص اعوان

(حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

و انصار میں شمار ہوتا تھا۔ مگر شیعہ محمد کے والد حضرت ابوبکر کو برا بھلا کہتے اور لعنت تک بھیجنے سے نہیں شرماتے[1]

اگر نواصب عمر بن سعد کے ساتھ یہی سلوک کریں یعنی قتل حسین کی بنا پر اس کی مدح و ستائش کریں اس لیے کہ وہ حامیان عثمانؓ میں سے تھا اور ان کا قصاص لینا چاہتا تھا۔ اس کے دوش بدوش وہ عمر بن سعد کے والد حضرت سعد بن ابی وقاص کو اس لیے برا بھلا کہیں کہ وہ عملی طور پر قصاص عثمان کا مطالبہ کرنے والوں یعنی حضرت معاویہ اور ان کے رفقاء کے ساتھ شریک جنگ نہ ہو سکے۔ تو ان کے اس فعل اور شیعہ کے فعل میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ بلکہ شیعہ کا فعل نواصب کے فعل سے شنیع تر ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کا مرتبہ سعد بن ابی وقاص سے بلند تر تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو حضرت عثمان حضرت حسین سے بھی قتل کیے جانے کا کم استحقاق رکھتے تھے۔ تاہم دونوں کے مظلوم اور شہید ہوتے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قتل عثمان کی بنا پر امت اسلامیہ جس فتنہ سے دوچار ہوئی وہ قتل حسین کی نسبت عظیم تر تھا۔ حضرت عثمان سابقین اولین صحابہ میں سے تھے۔ آپ خلیفۂ مظلوم تھے۔ بلاوجہ آپ سے معزول ہونے کے لیے کہا گیا تھا جس کے لیے آپ تیار نہ تھے۔ آپ نے مدافعت کے لیے جنگ بھی نہ کی اور شہادت سے مشرف ہوئے[2]۔

(حاشیہ صفحہ سابق) [1] حضرت علی نے صدیق اعظم کی وفات کے بعد ان کی بیوی کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ محمد بن ابی بکر اسی بیوی کے بطن سے تھا۔ بنابریں محمد بن ابی بکر حضرت علیؓ کا ربیب تھا۔ ۱۲

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) [1] ہم قبل ازیں شیعہ کی معتبر کتب کے حوالہ سے تحریر کر چکے ہیں کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کو "الجبت" (جادوگر شیطان) اور حضرت فاروق کو "الطاغوت" (باغی۔ سرکش) کے القاب سے نوازتے ہیں۔ جب تاریخ انسانیت میں عدل و انصاف کے ایک مثالی کردار فاروق اعظم کو ــــــ جن کی بدولت اسلام کا نام روشن ہوا تھا ــــــ طاغوت کہا جاتا ہے تو باقی لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔ دراصل یہ لوگ حضرت ابوبکر و عمر کی توہین کا ارتکاب نہیں کرتے بلکہ اس اسلام کی مذمت بیان کرتے ہیں۔ جو ان دونوں حضرات کے طفیل اکناف ارضی میں پھیلا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ نے ایک ایسا دین گھڑ لیا ہے جس سے ابوبکر و عمر۔ عثمان و علی اور حسن و حسین اور ان کے اخلاف آشنا ہی نہ تھے۔ اس حقیقت کے اثبات کے لیے دیکھئے کتاب "مختصر التحفۃ الاثنا عشریہ" ۱۲ [2] شہادت عثمان کے لیے دیکھیے کتاب العواصم من القواصم مع التعلیقات از صفحہ ۵۲ تا ۱۴۷۔ ۱۲

حضرت حسین رضی اللہ عنہ امیر و خلیفہ نہ تھے۔ البتہ خلافت کے طلبگار تھے۔ جب یہ بات مشکل نظر آئی اور آپ سے کہا گیا کہ آپ ایک قیدی کی حیثیت میں یزید کے روبرو پیش ہوں تو آپ نے یہ گوارا نہ کیا اور دشمن کے خلاف صف آرا ہوئے یہاں تک کہ بحالت مظلومی شہادت سے بہرہ ور ہوئے[1]

یہ واقعات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ حضرت عثمان حضرت حسین کی نسبت مظلوم تر تھے اور آپ کا صبر و حلم بھی مقابلتہً اتم و اکمل تھا۔ تاہم دونوں کا مظلوم اور شہید ہونا کسی شبہ سے بالاتر ہے۔ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ حضرت علی و حسین رضی اللہ عنہما حکومت و امارت کے اسی طرح ناحق کے طلبگار تھے جیسے اسماعیلیہ میں سے الحاکم وغیرہ اور دیگر سلاطین بنی عبید[2] تو ایسا شخص بلاشک و شبہ دروغ گو اور مفتری ہوگا۔ اس لیے کہ حضرت علی و حسین ہمارے نزدیک اعلیٰ درجے کے مومن تھے جبکہ اسماعیلیہ ان کے مقابلہ میں منافق اور ملحد تھے۔

علی ہذا القیاس جو لوگ حضرت علی و حسین کو ان جھوٹے طلبگارانِ خلافت کی مثل قرار دیتے ہیں جو بنی طالب میں پیدا ہوئے یا وقتاً فوقتاً سرزمین حجاز اور دیگر بلاد و امصار میں سر اٹھا کر ناحق لوگوں کی جانیں تلف کرتے اور مال چھینتے رہے تو کیا ایسے لوگ ظالم و کاذب نہ ہوں گے؟ یقیناً وہ جھوٹے ہوں گے۔ نظر بریں جو شخص حضرت ابوبکر و عمر کو عمر بن سعد کا مماثل قرار دیتا ہے اس کا ظلم و کذب سابق الذکر سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

عمر بن سعد اگرچہ نیکی کے تصور سے کوسوں دور تھا۔ تاہم اس نے اپنے عظیم گناہ کا اعتراف کر لیا تھا لہٰذا وہ مشہور کذاب مختار ثقفی سے بہتر ہی تھا جس کا دعویٰ تھا کہ جبریل میرے پاس وحی لے کر آتا ہے۔ مختار کا کہنا تھا کہ وہ حضرت حسین کے قصاص کا طالب ہے۔ چنانچہ وہ آپ کے قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتا تھا۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ یہ شیعہ (مختار ثقفی) عمر بن سعد اور حجاج دونوں سے بدتر تھا۔ اور اس کی وجہ اس کی اللہ و رسول پر کذب بیانی تھی۔

۱؎ شہادت حسین کے لیے دیکھئے مقالہ محب الدین الخطیب جس کا عنوان ہے "مَنْ هُمْ قَتَلَةُ الْحُسَيْنِ" (حضرت حسین کے قاتل کون تھے؟) مجلہ الفتح شمارہ ۸۵۱ - محرم ۱۳۶۷ھ ۱۲

۲؎ بنی عبید کے مذہب اور ان کی تاریخ نشو و ارتقاء کے لیے دیکھئے ہمارا مقالہ مجلۃ الازہر (م ۲۵ ج ۵ جمادی الاول ۱۳۷۳ھ ص ۶۱۲ - ۶۳۱) مقالہ کا عنوان ہے "مَنْ هُمُ الْعُبَيْدِيُّوْنَ"

صحیح مسلم میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"قبیلہ ثقیف میں ایک کذاب اور ایک سفاک (ناحق خون بہانے والا) ہوگا"۔

آپ کے ارشاد گرامی کے مطابق ثقیف کا کذاب مختار بن ابی عبید تھا اور سفاک حجاج بن یوسف ثقفی۔

روافض نواصب کی نسبت بدتر ہیں

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ عمر بن سعد جو حضرت حسین کو شہید کرنے والی فوج کا سپہ سالار تھا۔ ظالم اور طالب دنیا ہونے کے باوصف حضرت حسین کے حامی اور ان کے قاتلوں کے قاتل مختار بن ابی عبید سے زیادہ گنہ گار نہ تھا۔ بلکہ عمر بن سعد کے مقابلہ میں مختار گنہگار اور کاذب تر تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیعہ مختار، عمر بن سعد ناصبی سے بدتر تھا۔ اسی طرح حجاج بن یوسف بھی مقابلتاً مختار سے بہتر تھا۔ حجاج کا جرم یہ تھا کہ وہ ناحق خونریزی کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں مختار وحی کا دعویدار تھا اور کہا کرتا تھا کہ مجھ پر جبریل امین نازل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نزول وحی کا دعویٰ قتل نفوس سے عظیم تر ہے۔ یہ کفر ہے اور اگر مختار اس سے تائب نہیں ہوا تھا تو وہ یقیناً مرتد تھا۔ فتنہ پردازی یوں بھی قتل سے عظیم تر جرم ہے۔

یہ سلسلہ یہاں ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک وسیع باب ہے۔ جائز یا ناجائز شیعہ جس کی بھی خدمت کرتے ہیں ان میں اس سے بھی بدتر آدمی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح شیعہ جس کی مدح وثنا کرتے ہیں ان کے حریف خوارج میں اس سے بہتر آدمی پائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ روافض اپنے حریف نواصب سے بدتر ہوتے ہیں نیز یہ کہ شیعہ جن کو کافر و فاسق قرار دیتے ہیں وہ ان لوگوں کی نسبت افضل ہیں جو نواصب کے نزدیک کافر و فاسق ہیں۔

اہلسنت کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے وہ جملہ اہل ایمان سے الفت و محبت کا سلوک کرتے اور گفتگو میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ جہالت زدہ اور اہل اہواء میں سے نہیں اور روافض و نواصب دونوں سے بیزار ہیں۔ ان کے افکار و معتقدات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اہل سنت سابقین اولین صحابہ سے محبت رکھتے ہیں۔

(۲) وہ صحابہ کے مناقب و فضائل کے قدر داں ہیں۔

(۳) اہلسنت اہل بیت کے جائز حقوق کی نگہداشت کرتے ہیں۔

(۴) اہل سنت مختار ثقفی اور حجاج ایسے ظالم و سفاک کے رویہ کو پسند نہیں کرتے۔

(۵) حضرت ابوبکر و عمر افضل الصحابہ ہیں۔ حضرت عثمان و علی یا کوئی اور صحابی اس فضیلت میں ان کا سہیم و شریک نہیں ہو سکتا۔

قرن اول میں یہ عقائد و افکار متفق علیہ تھے۔ شاذ و نادر کسی کو اختلاف ہو تو اور بات ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ قرن اول کے شیعہ اور حضرت علی کے رفقاء و احباب حضرت صدیق اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی عظمت و فضیلت میں کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ تھے۔ حضرت علی سے بتواتر یہ روایت ثابت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔

خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا أَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر و عمر اس امت میں سب سے افضل ہیں

تاہم شیعان علی میں سے ایک جماعت حضرت علی کو حضرت عثمان سے افضل قرار دیتی تھی۔ مگر یہ اتنا اہم مسئلہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اہلسنت حضرت ابوبکر و عمر کی افضلیت میں یک زبان تھے۔ امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل، سفیان ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد اور دیگر متقدمین و متاخرین محدثین، مفسرین، اہل فقہ و اہل زہد سب یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ البتہ حضرت عثمان و علی کی افضلیت میں اہل مدینہ کی ایک جماعت توقف کرتی تھی۔ امام مالک سے بھی ایک روایت یہی منقول ہے۔ اہل کوفہ کی ایک جماعت حضرت علی کو افضل قرار دیتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت سفیان ثوری بھی اسی کے قائل تھے۔ بعد ازاں حضرت ایوب سختیانی سے مل کر اس مسلک سے رجوع کر لیا تھا۔ حضرت سفیان ثوری بعد ازاں فرمایا کرتے تھے۔

"جس نے حضرت علی کو حضرت عثمان سے افضل قرار دیا اس نے مہاجرین و انصار پر عیب لگایا"

اہل سنت کے سب امام حضرت عثمان کو افضل قرار دیتے ہیں۔ جمہور محدثین کا نظریہ یہی ہے نقل اجماع اور قیاس بھی اسی کے مؤید ہیں۔ بعض متقدمین سے جو منقول ہے کہ وہ حضرت جعفر اور طلحہ رض کو افضل قرار دیتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے افضل تھے بلکہ بعض خصوصیات کے اعتبار

سے ان کو جزوی فضیلت حاصل تھی۔ حضرت علی کو افضل قرار دینے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ بعض خصوصیات کی بنا پر جزوی فضیلت کے حامل تھے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "بعض صحابہ پر حق مشتبہ رہا اور طلب دنیا کے نقطۂ خیال سے بیعت کی گئی تھی"

شیخ الاسلام اس کی تردید میں فرماتے ہیں

اس مفتری نے صحابہ کو تین اقسام میں منقسم کر دیا ہے

(۱) اکثر صحابہ دنیا کے طلبگار تھے۔

(۲) کوتاہ بین تھے اور دور اندیشی سے محروم تھے۔

(۳) صحابہ کی تیسری قسم عاجز اور بے بس تھی۔

صحابہ کے اقسام ثلاثہ میں منقسم ہونے کی وجہ بقول شیعہ مصنف یہ ہے کہ شر کے محرکات و اسباب مندرجہ ذیل ہوا کرتے ہیں۔

(۱) قصد و نیت کی خرابی

(۲) جہالت۔ جہالت کے دو اسباب ہیں۔ (۱) کوتاہ بینی (۲) عجز و قصور

شیعہ مصنف رقمطراز ہے کہ صحابہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت کرتے وقت کوتاہ بینی سے کام لیا تھا مگر وہ غور و فکر سے کام لیتے تو حق و صداقت کو پہچان لیتے۔ صحابہ کی یہ کوتاہی قابل گرفت ہے کہ انھوں نے لازمی غور و فکر سے احتراز کیا۔ بعض صحابہ نے غور و فکر سے قطع نظر اکثریت کی تقلید پر اکتفا کیا تھا۔ اس سے شیعہ مصنف کا مقصد حضرت ابوبکر کی بیعت کے اسباب کی جانب اشارہ کرنا ہے۔

اس کے جواب میں شیعہ سے کہا جائیگا کہ یہ صریح قسم کی دروغ گوئی ہے جس میں کوئی اشکال نہیں اور ہر شخص بڑی آسانی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ روافض کی قوم حیرانی و سرگردانی کا شکار رہتی ہے۔ چنانچہ اس افترا پرواز سے اگر اس کی دلیل طلب کی جائے تو وہ کوئی دلیل پیش نہ کر سکے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بلا دلیل کوئی بات کہنے کو حرام قرار دیا ہے۔ خصوصاً جبکہ حق بیان کردہ بات کے خلاف ہو۔ اگر ہم صحابہ کے حالات سے نابلد ہوتے تو بھی بلا ثبوت ان کو بد ارادہ اور جاہل قرار دینا روا نہ تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (الاسراء ۳۶) (جس بات کا تجھے علم نہیں وہ بیان نہ کر)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ (آل عمران - ۶۶)

تم وہ لوگ ہو جنھوں نے ایسی باتوں میں تکرار کی جن کا تمھیں علم تھا تو پھر ایسی باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں۔

جب ہمیں معلوم ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم علم وعقل اور دین ومذہب کے اعتبار سے امت محمدی کے کامل ترین افراد تھے تو پھر اس کے برعکس خیالات کا اظہار کرنا کیونکر روا ہوگا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"خداوند کریم نے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو سرور کائنات کے دل کو سب سے افضل پایا چنانچہ اسے اپنے لیے مخصوص کرلیا۔ پھر بندوں کے دلوں کو دیکھا تو حضور کے صحابہ کے دلوں کو سب سے افضل پایا اور انھیں اپنے نبی کے وزیر بنا دیا۔ جو اس کے دین کی خاطر لڑتے ہیں جس چیز کو مسلمان اچھی سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جسے برا سمجھیں وہ خدا کے نزدیک بھی بری ہے آنحضور کے صحابہ نے حضرت ابوبکر رضؓ کو اپنی صوابدید سے خلیفہ بنایا تھا۔"

حضرت عبد اللہ بن مسعود مزید فرماتے ہیں۔

"جو کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہو تو وہ اس شخص کے نقش قدم پہ چلے جو فوت ہو چکا ہو اس لیے کہ زندہ شخص کے مبتلائے فتنہ ہونے کا خطرہ دامنگیر رہتا ہے۔ بخدا آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس امت میں سب سے افضل، نیک دل، عمیق العلم اور تکلف وتصنع سے پاک تھے۔ اللہ تعالے نے ان کو اپنے نبی کی صحبت ورفاقت اور دین اسلام کی نشر واشاعت کے لیے منتخب کیا تھا۔ لہذا ان کی فضیلت کا اعتراف کیجئے۔ ان کے نقش قدم پہ چلئے۔ دین ومذہب اور اخلاق وعادات میں ان کی پیروی کیجئے۔ کیونکہ وہ صراط مستقیم پہ گامزن تھے۔"

یہ روایت ابن بطہ نے قتادہ سے نقل کی ہے اور دیگر محدثین کے یہاں یہ روایت زر بن حُبیش سے مروی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا ارشاد اس جاہل مصنف کے ان دعاوی کے عین برخلاف ہے کہ حضرات صحابہ طالب دنیا۔ جاہل اور حق کی تلاش سے قاصر تھے۔ اس سے ثابت

ہوا کہ صحابہ کامل العلم اور نیک دل تھے۔ اور ان کا زمانہ سب زمانوں سے بہتر تھا۔ شیعہ مصنف کا یہ بیان اس کی جہالت و تشیع کی غمازی کرتا ہے۔ ہم اس سے محفوظ و مصئون رہنے کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں۔ اس لیے کہ تشیع بدترین فرقوں مثلاً نصیریہ۔ اسماعیلیہ۔ ملاحدہ۔ اہل الجبل اور قرامطہ کا ملجا و مامن ہے ظاہر ہے کہ یہ فرقے علم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔

علامہ ابن القاسم[1] فرماتے ہیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت ابوبکر و عمر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

"جن اکابر سے میں نے ہدایت پائی ہے ان میں سے کوئی بھی ابوبکر و عمر کی افضلیت میں شک نہیں رکھتا تھا"

شیعہ مصنف کا قول ہے کہ "حضرت علی نے مستحق ہونے کی بنا پر خلافت کا مطالبہ کیا تھا اور بہت کم لوگوں نے آپ کی بیعت کی تھی"۔

بلاشک و شبہ شیعہ کا یہ قول باطل ہے۔ اہل سنت اور شیعہ اس امر میں متحد الخیال ہیں کہ حضرت علی نے حضرت عثمان کی شہادت کے بعد اپنی بیعت کی دعوت دی تھی اور اسی وقت لوگوں نے اپنی حسب مرضی آپ کی بیعت میں حصہ لیا تھا۔

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔

شیعہ کے افکار و معتقدات

ہمارا مذہب اس لیے واجب الاتباع ہے کہ یہ جملہ مذاہب کی نسبت احق و اصدق اور باطل کی آمیزش سے خالص تر ہے۔ یہ مذہب اللہ، رسول اور اوصیاء کی تنزیہ و تقدیس میں جملہ مذاہب سے آگے ہے۔ ہمارا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخصوص بالقدامت ہے وہ جسم نہیں وہ مکان کے دائرہ

---

[1] امام عبدالرحمن بن قاسم المتوفی (۱۳۲ - ۱۹۱) مقام الفسطاط کے مشہور علماء میں سے تھے۔ یہ امام مالک بن انس المتوفی (۹۳ - ۱۸۱) کے تلامذہ میں سے تھے اور ان کے علم و فضل کے مبلغ و ناشر تھے۔ اسد بن الفرات المتوفی (۱۴۲ - ۲۱۳) نے ابن القاسم سے المدونہ کی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۱ھ میں یہ کتاب لے کر قیروان پہنچے۔ ابن القاسم سے متعلق دیکھئے ہمارا مقالہ جمع الرعیل الاول مجلہ الازہر م ۲۵ ج ۹ ص ۹۹۶ - ۹۹۷ رمضان ۱۳۷۳ھ)

میں محدود نہیں۔ کیونکہ اس سے اللہ تعالے کا حادث ہونا لازم آتا ہے۔ آگے چل کر لکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حواس سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ وہ کسی جہت میں محدود نہیں اس کے اوامر و نواہی حادث ہیں اس لیے کہ معدوم سے امر و نہی کا صدور ممکن نہیں۔ ائمہ دین انبیاء کی طرح صغائر و کبائر سے پاک ہیں۔ انھوں نے اپنے جدّامجد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست احکام اخذ کیے اور قیاس و استحسان اور رائے کی جانب مطلقاً توجہ نہ کی"

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ذکر کردہ مسائل کا مسئلہ امامت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بعض امامیہ ان کو تسلیم بھی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ طریق سراسر عقلی ہے اور امام کا تقرر سمعی دلائل کا محتاج ہے۔ مزید براں ان میں جو مسائل حق ہیں اہل سنت ان کو تسلیم کرتے ہیں اور جو باطل ہیں وہ بہرکیف مردود ہیں۔ یہ قواعد و عقاید دراصل جہمیہ و معتزلہ سے ماخوذ ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ ذات باری صفت علم قدرت اور حیات سے عاری ہے نہ وہ بولتا نہ راضی ہوتا نہ ناراض ہوتا نہ محبت کرتا اور نہ عداوت رکھتا ہے۔

جہاں تک اہل سنت کے افکار و آراء کا تعلق ہے وہ خدا کے لیے ان اثبات کا اثبات کرتے ہیں جو اس نے خود اپنے لیے ثابت کی ہیں اور ان صفات کی نفی کرتے ہیں جو صفات مخلوق سے مشابہ و مماثل ہیں۔ اہل سنت اثبات بلا تشبیہ اور تنزیہ بلا تعطیل کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوری-۱۱) (اس کی مثل کوئی چیز نہیں)

یہ آیت مُشبّہہ یعنی ان لوگوں کے نظریات کی تردید کرتی ہے جو صفات باری کو مخلوق کی صفات کی مانند قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا۔ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ یہ آیت مُعَطِّلہ یعنی اس فرقہ کی تردید کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو صفات سے عاری قرار دیتے ہیں۔

صفاتِ خالق و مخلوق میں فرق و امتیاز

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ذات باری تعالےٰ اپنی خصوصیات میں بندے کی مشارکت سے پاک ہے۔ اگرچہ وجود۔ علم اور قدرت کی صفات عبد اور معبود دونوں میں پائی جاتی ہیں اور وہ دونوں اس کے ساتھ موصوف ہیں۔ مگر یہ مشترک صفات ذہن انسانی میں ایک کلی کی حیثیت رکھتی

ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں اور ان میں سے جو صفات موجودات عالم میں پائی جاتی ہیں وہ جداگانہ نوعیت کی ہیں۔ اور ان میں سرے سے کوئی اشتراک موجود نہیں۔ اس مقام پر بہت سے لوگوں نے ٹھوکر کھائی اور یہ سمجھ لیا ہے کہ ان صفات کے متحد فی الاسم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صفت "وجود" جو باری تعالے میں پائی جاتی ہے۔ وہی بندے میں ہے ان کی رائے وجود کا لفظ مشترک لفظی ہے۔

دراصل یہ صفات قابل تقسیم ہیں اور سب ایک ہی قسم کی نہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ وجود کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) واجب الوجود

(۲) ممکن الوجود۔

(۳) قدیم

(۴) حادث

بعض الفاظ مشترک المعنی ہوتے ہیں۔ مثلاً "مشتری" ایک ستارہ کا نام بھی ہے۔ اور خریدار کو بھی مشتری کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اگر مشترک المعنی لفظ کو کلی مشکک قرار دیا جائے ــــ جس کے افراد یکساں نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں تفاوت پایا جاتا ہے ــــ تو اس سے جملہ شبہات کافور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ واجب الوجود میں جو وجود پایا جاتا ہے وہ ممکن الوجود کی نسبت اعلیٰ و اولی ہے۔

مگر یہ ہرگز درست نہیں اس لیے کہ مشترک کلی کے ایک فرد میں اگر معنی کی زیادتی ہوگی تو اس سے اس کے مشترک ہونے کی نفی نہیں ہوتی وہ لفظ پھر بھی مشترک ہی رہے گا (اس لیے کہ وہ دونوں پر یکساں طور سے بولا جاتا ہے)

ایک گروہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جن کے نزدیک کلی متواطی ہے ــــ جس کے جملہ افراد یکساں ہوتے ہیں ــــ اس رائے میں خالق کا وجود اس کی حقیقت سے زائد ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اس کی حقیقت اور وجود میں کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا وہ وجود کو مشترک لفظی قرار دیتا ہے۔

خلاصۂ کلام! اس ضمن میں غلطی کی اصل وجہ لوگوں کا یہ وہم ہے کہ ان اسماء عامہ (مثلاً وجود۔ علم اور قدرت وغیرہ) کا مسمّٰی ایک کلی ہے اور یہ ایک چیز ہیں بھی وہی ہے جو دوسری ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ جو چیز خارج میں موجود نہ ہو وہ ایک عام کلی کی حیثیت سے پائی نہیں جاتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ معین و مخصوص ہوگی۔ ان اسماء سے جب اللہ تعالیٰ کو موسوم کیا جائے گا تو ان کا مسمّی مختص ہوگا اور جب بندے کو ان سے موسوم کیا جائے گا تو بندہ ان سے مخصوص ہوگا۔ جب یہ کہا جائے کہ عبد و معبود صفت وجود میں مشترک ہیں تو ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے ان کا ایک دوسرے سے متمیز ہونا ضروری ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ اشتراک صرف وجود ذہنی میں پایا جاتا ہے۔ ماہیت و حقیقت اور ذات و نفس کے مسمّیٰ میں سرے سے کوئی اشتراک موجود ہی نہیں۔ اس غلطی کا منشاء معدد یہ ہے کہ وجود کو علی الاطلاق اخذ کیا گیا ہے اور حقیقت کو مخصوص قرار دیا گیا حالانکہ وجود اور حقیقت دونوں کو مطلقاً بھی اخذ کیا جاسکتا ہے اور ان کو مخصوص بھی کر سکتے ہیں۔ اندریں صورت وجود مطلق حقیقت مطلقہ کے مساوی ہوگا اور وجود مخصوص حقیقت مختصہ کے برابر۔ گویا وجود مطلق حقیقت مطلقہ سے ہم آہنگ ہوگا اور وجود مخصوص حقیقتِ مختصہ کے مطابق و موافق۔ دونوں کا مسمی ایک ہوگا۔ مگر تسمیہ کی جہت متعدد ہوگی مثلاً کہا جاتا ہے "ھٰذَا ھُوَ ذَاکَ" اس میں مشار الیہ ایک ہے مگر جہتیں مختلف ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اسماء و صفات ثابت کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مخلوقات کے مشابہ و مماثل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ باری تعالیٰ ایسی صفات سے متصف ہے جو اس کی ذات کے ساتھ لازم ہیں یہ صفات اسی طرح قدیم، ازلی اور واجب ہیں جس طرح اس کی ذات قدیم و واجب ہے۔ اس میں اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ کہنا کہ اسماء الٰہی ثابت ہیں مگر صفات نہیں، ایک قسم کا عقلی مغالطہ[1] ہے۔ مزید براں یہ نظریہ

---

[1] یہاں سفسطہ کا مغالطہ کیا گیا ہے۔ سفسطہ ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے اور یونانی سے ماخوذ ہے۔ اہل سفسطہ کو سوفسطائیہ کہا جاتا ہے۔ سوفسطائیہ کے نزدیک موجودات عالم میں سے کوئی چیز بھی موجود نہیں بلکہ یہ سب کچھ قوت وہمیہ کی کرشمہ سازی ہے۔ آگے چل کر اس پر مفصل بحث آئے گی۔

قرامطہ کی پیروی کا غماز ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ تقسیم ایک شنیع قسم کی خطا اور بدعت ہے سنت کی پیروی کرنے والے اہل حق کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ جسمانیت سے ہرگز موصوف نہیں ہو سکتا۔ (تعالی اللہ عن ذلک) بلکہ دور جاہلیت و اسلام کے عرب بھی اللہ تعالےٰ کو جسم سے منزہ تصور کرتے تھے۔

مسئلہ تجسیم شیعہ مصنف کا قول ہے "لَیْسَ بِجِسْمٍ" (اللہ تعالےٰ مجسم نہیں) ہم کہتے ہیں کہ جسم کا لفظ محتاج تشریح ہے۔ یہ لفظ ان معانی کے لیے مستعمل ہے۔

(۱) وہ مرکب جس کے اجزاء الگ الگ ہوں اور ان کو یکجا کر دیا جائے۔

(۲) جو تفریق و انفصال کو قبول کرتا ہو۔

(۳) جو مادہ و صورت سے مرکب ہو۔

ذاتِ باری تعالےٰ مذکورہ صدر جملہ امور و اوصاف سے منزہ ہے۔

بعض اوقات جسم سے وہ چیز مراد ہوتی ہے جس کی جانب اشارہ کیا جا سکے، جسے دیکھا جا سکے یا جس کے ساتھ صفات وابستہ ہوں۔ بلاشبہ اللہ تعالےٰ ان صفات سے موصوف ہے۔ چنانچہ دعا کہتے وقت اس کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔ آنکھ اور دل سے بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مومن بروز قیامت اسے کھلم کھلا دیکھیں گے۔ علاوہ ازیں صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔ اگر شیعہ یہ کہے کہ اللہ تعالےٰ کے جسم نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ان امور سے بھی بہرہ ور نہیں تو ہم کہیں گے کہ یہ امور و اوصاف نقل صحیح اور عقل صریح سے ثابت ہیں اور تم ان کی نفی پر کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے جسم کا لفظ نفی و اثبات دونوں اعتبار سے بدعت ہے۔ اس لیے کہ نصوص شرعیہ اور اقوال سلف میں لفظ جسم کے اطلاق کی نہ نفی کی گئی ہے اور نہ اثبات۔ اسی طرح "جوہر" اور "متحیز" کے الفاظ کا بھی

---

[۱] قرامطہ ایک باطنی فرقہ ہے جس کا ظہور فرقہ اسماعیلیہ میں سے ہوا تھا۔ قرامطہ شیعہ ہوتے ہیں وہ نصوص کا مفہوم متعین کرنے میں جعل و بحث کا آغاز کرتے ہیں وہ نصوص کو ایسے معانی پہناتے ہیں جو اہل زبان نے بھی مراد نہیں لیے ۱۲

[۲] جو بات غیبی امور سے تعلق رکھتی ہو اس کا ذکر نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس کا ذکر صرف انہی الفاظ میں مناسب ہے جو منصوص ہوں اور شارع سے منقول ہوں اس میں سلف صالحین کی پیروی کا التزام زیادہ بہتر ہے۔ ۱۲۳

نصوص میں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "لا فی مکان" (اللہ تعالیٰ مکان میں محدود نہیں) لفظ مکان دو معانی کے لیے مستعمل ہے۔

(۱) مکان وہ چیز ہے جو کسی پر حاوی و محیط ہو اور وہ چیز اس کی محتاج ہو۔

(۲) لفظ مکان کا اطلاق بعض اوقات مافوق العالم پر بھی کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ موجود بھی نہ ہو۔

لفظ مکان سے اگر پہلا مفہوم مراد لیا جائے تو ذات باری اس سے منزہ ہے۔ البتہ دوسرے معنی کے اعتبار سے اللہ پر لفظ مکان کا اطلاق کر سکتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فوق الخلق ہے۔ جب اس کائنات ارضی میں خالق و مخلوق کے سوا کوئی موجود ہی نہیں تو خالق کا مخلوق سے الگ ہونا ضروری ہے خدا کی ذات ظاہر ہے اور اس پر کوئی چیز نہیں۔ وہ آسمان و زمین کے اوپر ہے اور مخلوقات سے جدا ہے۔ جیسا کہ کتاب و سنت سے مستفاد ہوتا ہے۔

شیعہ کا یہ قول کہ "وَاِلَّا لَکَانَ مُحْدَثًا" (ورنہ اس کا حادث ہونا لازم آئے گا) مطلب یہ ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۲) از بس ناگزیر ہے۔ نائب السلطنت افرم کی مجلس میں بمقام دمشق ۷۰۵ھ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے معاصر علماء کے مابین جو مناظرہ ہوا تھا اس میں شیخ کے حریف علماء نے جب تشبیہ و تجسیم کی نفی کا ذکر چھیڑا تو شیخ الاسلام نے اپنے رسالہ "العقیدۃ الواسطیہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میرا قول مِنْ غَیْرِ تَکْیِیْفٍ وَلَا تَمْثِیْلٍ" ہر باطل کی تردید کے لیے کافی ہے۔ میں نے تشبیہ و تمثیل کی بجائے تکییف و تمثیل کے الفاظ اس لیے انتخاب کیے کہ "تکییف" کی نفی سلف سے منقول ہے۔ چنانچہ امام مالک اور ابن عُیینہ کا یہ مقولہ علماء کے یہاں زبان زد خاص و عام ہے "اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْکَیْفُ مَجْهُوْلٌ وَالْاِیْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ" "اللہ تعالیٰ کا مستوی علی العرش ہونا معلوم ہے اس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں اس پر ایمان لانا واجب اور اس سے متعلق سوال کرنا بدعت ہے"۔ خلاصہ کلام! شیخ الاسلام اپنی تصانیف میں نہ صرف لفظ جسم کا اطلاق کرنے سے احتراز کرتے بلکہ تجسیم تک کا لفظ تحریر نہیں کرتے۔ ذات باری کی تنزیہ کرتے ہوئے وہ مِنْ غَیْرِ تَکْیِیْفٍ وَلَا تَمْثِیْلٍ کے الفاظ ذکر کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد شرعی اصطلاحات کا تتبع اور طریق سلف کی پیروی کرنا ہے۔ جو الفاظ غیبی امور سے متعلق ہوں ورود نص کے بغیر ان کا استعمال نفیاً و اثباتاً کسی طرح بھی درست نہیں ہے ۱۲

خدا کو جسم یا مکان میں محدود تسلیم کرنے سے اس کا حادث ہونا لازم آتا ہے۔ ہم اس کے قائل سے دریافت کرتے ہیں کہ اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے؟ گویا تم نے اپنے اسلاف معتزلہ کی اس دلیل پر اکتفاء کیا ہے کہ اگر خداوند تعالےٰ جسم ہوگا تو وہ حرکت و سکون سے خالی نہ ہوگا (ظاہر ہے کہ حرکت و سکون حادث ہیں) اور جو حوادث سے خالی نہ ہو وہ خود حادث ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا کوئی حادث نہیں جس کے پہلے کوئی دوسرا حادث نہ ہو۔

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر صفات علم و قدرت اور حیات و کلام کا قیام ذات باری کے ساتھ تسلیم کیا جائے تو اس سے اس کا حادث ہونا لازم آئے گا۔ ہم جواباً کہیں گے کہ تم اللہ تعالےٰ کو حیّ اور علیم و قدیر قرار دیتے ہو اور اس کے باوصف تمہارے نزدیک اس کا مجسم ہونا لازم نہیں آتا۔ حالانکہ جو حی اور عالم و قادر ہو وہ تمہارے نزدیک جسم ہوتا ہے۔ اگر تمہاری بات کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ ممکن ہوگا کہ اللہ تعالےٰ صفت علم قدرت اور حیات سے موصوف ہو وہ اس خاکدان ارضی سے مبائن اور اس کے اوپر ہو اور اس کے باوصف جسمانیت سے پاک ہو۔

اگر شیعہ یہ کہے کہ جو مخلوقات سے جدا اور عالم ارضی کے اوپر ہو اس کا مجسم ہونا ضروری ہے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ علیم و قدیر اور حیّ کا تعقل بھی جسمانیت کے بغیر ممکن نہیں۔ مزید براں اگر یہ حادث دائمی نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حوادث کے انواع و اقسام بھی دائم نہ ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس سے حوادث کا صدور بلا سبب لازم آتا ہے جو صریح عقل کے منافی ہے تاہم اصل سعادت ایمان باللہ ایمان بالرسول اور ان کی تصدیق و اطاعت ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (ابراہیم - ۱)

ہم نے اس کتاب (قرآن کریم) کو آپ کی طرف نازل کیا۔ تاکہ آپ بحکم خداوندی لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی اور اللہ تعالےٰ کے راستہ کی جانب لائیں۔

اللہ تعالےٰ اور بندے کی صفات کے مابین فرق و امتیاز

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام

کو مبعوث کر کے ان کے ذریعہ اپنے اسماء وصفات مقدسہ کو تفصیلاً بیان کر دیا۔ اسی طرح نقص وتمثیل کی نفی بطریق اجمال ذکر کی۔ خلاصۂ کلام! ذات باری ان صفات کلام سے موصوف ہے جو لامحدود ہیں اور جن کی کوئی غایت نہیں وہ جمیع نقائص وعیوب سے منزّہ ہے۔ صفات کمال میں کوئی اس کا نظیر و مثیل نہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ نعمتیں موجود ہیں جو انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خالق کا نظیر و مثیل کیونکہ ممکن ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"جنت میں جو نعمتیں موجود ہیں دنیا میں صرف ان کے نام پائے جاتے ہیں"۔

جب دنیا و آخرت کی نعمتوں کے نام مشترک ہیں اور ان کی حقیقت مختلف ہے جس کا اندازہ دنیا میں نہیں کیا جا سکتا تو اس سے عیاں ہے کہ باری تعالیٰ جن صفات کمال سے موصوف ہے وہ بندے کی صفات سے کس قدر جداگانہ نوعیت کی ہوں گی۔

شیخ الاسلام آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"جو بات سالار رسل صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اس پر ایمان لانا واجب ہے اور جو ثابت نہ ہو اس کے بارے میں نہ نفی کا حکم صادر کیا جا سکتا ہے اور نہ اثبات کا۔ جبتک متکلم کا منشا و مقصود معلوم نہ کر لیا جائے اور اس کی نفی کی صحت و اثبات کی تہ تک نہ پہنچا جائے۔ بنابریں نفی و اثبات کے بارے میں بلا تفصیل مجمل الفاظ قیل وقال اور جہل و ضلال کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ یہ مقولہ مشہور ہے کہ عقلاء میں زیادہ تر اختلاف ناموں کے اشتراک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کی نفی اور اثبات کرنے والے اہل سنت اور شیعہ دونوں فرقوں میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے شیعہ متکلمین میں سے ہشام بن حکم نے لفظ "جسم" کا اطلاق کیا۔ محدث ابن حزم اور دیگر علماء نے اسی طرح نقل کیا ہے

امام ابو الحسن اشعری اپنی تصنیف "مقالات الاسلامیین" میں رقمطراز ہیں۔

مسئلہ تجسیم میں شیعہ کے چھ فرقے

تجسیم کے مقالہ میں روافض کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ چھ فرقوں میں منقسم

ہو گئے ہیں۔

پہلا فرقہ:۔ پہلا فرقہ ہشامیہ ہے یہ ہشام بن حکم کے پیرو ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کا معبود مجسم ہے۔ اور اس کی نہایت و حد ہے۔ اس کا طول، عرض و عمق مساوی ہے۔ اس کا نور پگھلے ہوئے سونے کی طرح بلند ہوتا ہے۔ وہ گول موتی کی طرح چمکدار ہے۔ وہ رنگدار۔ بامزہ اور بودار ہے۔ اسے ٹٹولا جا سکتا ہے۔

دوسرا فرقہ:۔ دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت نہیں۔ وہ باقی اجسام کی طرح بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جسم قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ موجود ہے وہ اجزا سے پاک ہے وہ عرش پر ہے مگر اسے چھوا نہیں جا سکتا۔ اور نہ اس کی کیفیت بیان کی جا سکتی ہے۔

تیسرا گروہ:۔ تیسرے فرقہ کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت انسان جیسی ہے مگر وہ جسم سے پاک ہے۔

چوتھا فرقہ:۔ یہ ہشام بن سالم جوالیقی کے پیرو ہیں۔ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ انسانوں جیسی صورت رکھتا ہے تاہم گوشت اور خون سے پاک ہے وہ ایک درخشندہ نور ہے۔ وہ حواس خمسہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ناک منہ اور آنکھیں ہیں اس کے حواس بدلتے رہتے ہیں۔ ابو عیسیٰ الوراق[1] کا بیان ہے کہ ہشام بن سالم کے خیال میں اللہ تعالیٰ کے سیاہ بال ہیں۔ یہ سیاہ نور ہے۔

پانچواں فرقہ:۔ پانچویں فرقہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ چراغ کی طرح روشن ہے۔ اس کے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی صورت نہیں۔ مزید براں اس کے اجزاء اختلاف سے پاک ہیں۔

---

[1] ابو عیسیٰ الوراق کا نام محمد بن ہارون ہے۔ یہ شیعہ متکلمین میں سے ہے۔ معتزلہ اسے ابن الراوندی کی طرح ملحد قرار دیتے ہیں۔ اس کی تاریخ ولادت مذکور نہیں۔ غالباً اس نے ہارون الرشید کا زمانہ پایا تھا۔ امام ابوالحسن اشعری نے ابو عیسیٰ الوراق سے نقل کیا ہے کہ ہشام بن سالم جوالیقی ملحدوں کا فرقہ تھا۔ یہ شیعہ کے خلاف بحث ہے اور انہیں اس سے جرأت انکار نہیں ہو سکتی اس لیے کہ شاہد اور مشہود علیہ دونوں شیعہ ہیں۔ غالباً ابو عیسیٰ الوراق رافضی ہشام بن سالم کی جانب کفر و الحاد کو منسوب کرنے کی بنا پر متہم ہوا۔ بنابریں معتزلہ ابن الراوندی کی طرح اسے ملحد قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔"

چھٹا فرقہ :- شیعہ کا چھٹا فرقہ یہ نظریہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجسم اور باصورت نہیں - نہ وہ متحرک ہے نہ ساکن - اسے چھوا ہی نہیں جا سکتا - توحید باری سے متعلق وہ معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔
امام اشعری مزید فرماتے ہیں کہ یہ متاخرین شیعہ کے افکار و معتقدات ہیں - متقدمین شیعہ تشبیہ (صفات باری کو صفات مخلوق کے مماثل قرار دینا) کا عقیدہ رکھتے تھے۔

امام ابن تیمیہ نے اس ضمن میں بڑی طویل بحث کی اور تقدیر رویت باری تعالیٰ اور کلام ربانی کے مسائل سے احتجاج کیا ہے - آگے چل کر فرماتے ہیں۔

عصمتِ انبیاء میں شیعہ کا اختلاف

شیعہ مناظر کا یہ قول کہ انبیاء عظام خطا و سہو اور صغائر سے از آغاز عمر تا اختتام حیات معصوم و منزہ ہوتے ہیں۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عصمتِ انبیاء کا مسئلہ شیعہ کے یہاں مختلف فیہا ہے۔

امام اشعری "مقالات الاسلامیین" میں فرماتے ہیں۔

شیعہ اس مسئلہ میں مختلف الخیال ہیں کہ آیا رسول سے معصیت کا صدور جائز ہے یا نہیں - ایک فرقہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ جائز ہے جیسا کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے دن قیدیوں کا فدیہ لے کر غلطی کی تھی - البتہ ائمہ سے معصیت صادر نہیں ہو سکتی - کیونکہ رسول جب معصیت کا مرتکب ہوگا تو وحی کے آنے پر اس سے رجوع کر لے گا - مگر ائمہ پر وحی نہیں آتی لہٰذا ان سے سہو اور غلطی کا صدور جائز نہیں[1] - یہ ہشام بن حکم کا قول ہے" (دیکھئے مقالات الاسلامیین ج ۱ - ص ۱۱۵)

---

[1] اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ شیعہ کے یہاں ائمہ کی عصمت انبیاء کرام کی نسبت اتم و اکمل ہے - باقی رہا یہ عقدہ کہ انبیاء مورد وحی ہیں یہ صرف ظاہری ملمع سازی ہے - اکابر شیعہ سے بکثرت ایسے اقوال محفوظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ائمہ کی جانب وحی آنے کے دعویدار ہیں - شیعہ کی مشہور کتاب کافی کلینی میں ہے جو ان کے ہاں صحیح بخاری کا درجہ رکھتی ہے کہ امام غیب دان ہوتے ہیں دور حاضر کے شیعہ اپنے اماموں کی قبروں کو مہبط وحی قرار دیتے ہیں حالانکہ ان قبروں میں بوسیدہ ہڈیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور بعض قبروں میں تو سرے سے کوئی امام مدفون ہی نہیں - جب یہ قبور جن میں ائمہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کی ہڈیاں مدفون ہیں - مہبط وحی ہیں تو ان کی عبادت کرنے والوں سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ وحی کے معاملہ میں دیانتداری برتیں (باقی برصفحہ ۱۲۸)

ہم کہتے ہیں کہ جمہور اہل اسلام کی رائے میں انبیاء شرعی احکام کے پہنچانے میں معصوم ہوتے ہیں اور وہ غلطی پر قائم نہیں رہتے۔ ان کی بعثت کا مقصد بھی یہی ہے۔ نبوت کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انبیاء قبل از نبوت بھی گناہ و خطا سے پاک ہوں۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ہر شخص جو کفر قتل اور گناہوں سے محفوظ ہو، وہ اس شخص سے افضل ہے جو کفر کے بعد مشرف بایمان ہو ضلالت کے بعد ہدایت یاب ہو اور گناہوں کا مرتکب ہونے کے بعد تائب ہو تو ایسا شخص یقیناً دین کے اساسی اصول و نظریات کا مخالف ہے۔

یہ مسلمہ صداقت ہے کہ سابقین اولین صحابہ اپنے بیٹوں سے افضل تھے۔ جنہوں نے دور اسلام میں آنکھ کھولی۔ اس شخص کی حماقت و جہالت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جو مہاجرین و انصار کے بیٹوں کو ان کے برابر تصور کرتا ہو۔ بھلا جو شخص اپنی قوت نظر و استدلال اور صبر و توبہ کے بل بوتے پر کفر سے ایمان اور اعمال بد سے نیک اعمال کی جانب متوجہ ہو اس شخص کے مساوی کیونکر ہو سکتا ہے جو اپنے آباء و اقارب اور ہم وطنوں کو دین اسلام پر لائے اور امن و عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"جس شخص نے جاہلیت کو نہ پہچانا اس نے اسلام کے کڑا کو توڑ دیا"۔

وعدۂ خداوندی ہے کہ جو شخص ہلاکت آفریں اعمال سے تائب ہو گا اور مشرف بایمان ہو کر نیک اعمال انجام دے گا تو اس کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ جمہور انبیاء جو انبیاء سے صغائر کا ارتکاب جائز سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ انبیاء گناہ پر قائم نہیں رہتے۔ توبہ کرنے سے ان کے اعمال میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ نصوص و آثار اور اجماع سے مسلک جمہور کی تائید ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کے منکر قرآن کی تحریف کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

مثلاً قرآن کریم کی یہ آیت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۷) انبیاء اور ائمہ کے مابین کچھ امتیاز قائم کریں گے۔ جو قبر حضرت علی کی جانب منسوب ہے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی قبر ہے۔ مزید برآں شیعہ انبیاء کے لیے از ابتدائے عمر تا انتہا عصمت کے قائل ہیں یعنی وہ بعثت سے قبل بھی انبیاء کو معصوم مانتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت وحی نہیں آتی ۱۲

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتح - ۲)

تاکہ اللہ تعالےٰ آپ کے سابقہ اور اگلے گناہ معاف کر دے۔

تحریف قرآن اور شیعہ

محرّفین کہتے ہیں کہ "مَا تَقَدَّمَ" سے حضرت آدم کا گناہ مراد ہے۔ اسی طرح وہ "مَا تَأَخَّرَ" سے امتِ محمدی کے گناہ مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت آدم بھی ایک معزز نبی تھے گویا وہ جس بات سے بچنا چاہتے تھے اسی کے مرتکب ہو گئے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک گناہ کی نفی کی اور اسی گناہ کو حضرت آدم سے چسپاں کر دیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

مزید براں زمین پر آنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی توبہ قبول کر لی تھی۔ اس وقت حضرت نوح و ابراہیم ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (النجم - ۳۸) (کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)

اس بات کی تائید قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے (۱) سورۃ الانعام - ۱۶۴ (۲) الاسراء - ۱۵ (۳) فاطر - ۱۸ (۴) الزمر - ۷

مقام حیرت ہے کہ آنحضور کے گناہ کو حضرت آدم کی جانب کیونکر منسوب کیا جا سکتا ہے؟ جب مذکورہ صدر آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا حضور! یہ آیت تو خصوصی طور پر آپ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہمارے متعلق کیا ارشاد ہے؟ تب مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ (الفتح - ۴)

(وہ خدا ہی کی ذات ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں سکون و اطمینان کو نازل کیا تاکہ ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو)

ایک کم عقل آدمی بھی یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے پوری امت کے گناہ معاف کر دیئے۔ حالانکہ امت کے بعض افراد اپنے گناہوں کی بنا پر دوزخ میں جائیں گے۔ تو پھر مغفرت کیا ہوئی؟

شیعہ کا یہ قول کہ انبیاء کو گنہگار ٹھہرانے سے وہ قابلِ اعتماد نہیں رہتے اور لوگ اس سے

نفرت کرنے لگتے ہیں"۔

یہ درست نہیں بخلاف ازیں کوئی نبی اپنے گناہ کا معترف ہو کہ جب بارگاہ الٰہی میں تائب ہو گا اور مغفرت و رحمتِ خداوندی طلب کرے گا تو اس سے واضح ہو گا کہ وہ کس قدر صادق منکسر مزاج، عُجب و کبر سے دور اور دروغ گوئی سے پاک ہے۔ وہ شخص اس کے عین برعکس ہے جو کہتا ہے کہ مجھے طلب مغفرت اور توبہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے شخص کے متعلق جب عام چرچا ہو گا تو لوگ اسے متکبر، جاہل اور کذاب کے القاب سے نوازیں گے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت میں داخل نہ ہو گا۔ صحابہ نے عرض کیا حضور! کیا آپ بھی نہیں؟ فرمایا نہیں مگر یہ کہ فضل خداوندی مجھے اپنے دامنِ رحمت میں چھپالے"

سالار رسل یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي هَزْلِي وَجِدِّي وَخَطَائِي وَعَمَدِي وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِي (بخاری مسلم)

آپ نے فرمایا۔

"سب بنی آدم خطاکار ہیں اور خطاکاروں میں سے سب سے بہتر وہ ہیں جو توبہ کرنیوالے ہیں"۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "گناہ کے صدور سے انبیاء قابل اعتماد نہیں رہتے اور لوگ نفرت کرنے لگتے ہیں"۔

میں کہتا ہوں کہ انبیاء قابل نفرت اس حالت میں ہوتے ہیں جب گناہوں کی کثرت کے باوصف ان پر مُصر ہوں۔ شاذونادر گناہ کے صادر ہونے کے بعد جب وہ کثرت سے توبہ و استغفار کریں گے تو ہرگز ایسا نہ ہو گا۔ اس کے عین برخلاف پاک دامنی کا مدعی اور عفت و طہارت کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا کہیں زیادہ رجوع و انابت الی اللہ کا محتاج ہے۔ ہمارے علم کی حد تک بنی اسرائیل یا کسی اور قوم نے صرف توبہ کرنے کے جرم میں کسی نبی کو ہدف ملامت نہیں بنایا تھا۔

عصمت کے مسئلہ میں شیعہ باقی امت سے منفرد ہیں

روافض کہتے ہیں کہ انبیاء سے نبوت کے قبل یا بعد کسی خطا یا گناہ صغیرہ کا صدور ممکن نہیں۔ اسی طرح ائمہ اثنا عشرہ بھی کلیۃً معصوم ہیں

یہ شیعہ کا انفرادی عقیدہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو توبہ کے بعد جو مقام حاصل ہوا وہ توبہ سے پہلے حاصل نہ تھا۔

بعض مشائخ کا قول ہے کہ اگر توبہ اللہ تعالیٰ کو سب چیزوں سے محبوب تر نہ ہوتی تو مخلوقات میں سب سے بزرگ کو گناہوں میں مبتلا نہ کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ سچی توبہ کرنے والے طاعت و عبادت میں زیادہ راسخ اور ان لوگوں کی نسبت گناہوں سے زیادہ بچنے والے ہوتے ہیں جو کبھی گناہ میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔ جو شخص خدا کے برگزیدہ و چیدہ تائب کو ناقص قرار دیتا ہے وہ جاہل ہے۔

روافض کہتے ہیں کہ "ائمہ انبیاء کی طرح گناہوں سے معصوم ہیں"۔

اس مسئلہ میں روافض منفرد ہیں اور صرف وہی لوگ اس ضمن میں ان کے سہیم و شریک ہیں جو ان سے بھی گئے گذرے ہیں مثلاً اسماعیلیہ جو محمد بن اسمٰعیل بن جعفر کی جانب منسوب ہیں بنی عُبَید کو معصوم قرار دیتے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ امامت جعفر کے بعد موسیٰ بن جعفر کی جانب نہیں بلکہ محمد بن اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ اسمٰعیلیہ ملحد اور زندیق ہیں۔

شیعہ کا یہ قول کہ "انبیاء سے سہو کا صدور بھی ممکن نہیں"۔

ہمارے علم کی حد تک کوئی شخص اس کا قائل نہیں۔

شیعہ کہتے ہیں کہ "ائمہ معصومین نے اپنے جدّ امجد سے استفادہ کیا تھا"۔

(۱) اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ شیعہ کے ائمہ معصومین نے اپنے جدّ امجد کا علم علماء سے حاصل کیا تھا۔ ان سے براہ راست استفادہ نہیں کیا۔ یہ بات ایک خبر متواتر کی طرح معروف و مسلّم ہے مثلاً علی بن حسین رضی اللہ عنہ ابان بن عثمان سے اور وہ اسامہ بن زید سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح محمد بن علی رضی اللہ عنہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ معصومین سے صرف حضرت علی اور آپ کے دو صاحبزادوں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے آنحضور کا زمانہ پایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"بخدا آسمان سے زمین پر گر پڑنا میرے لیے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں آنحضور پر جھوٹ باندھوں اور جب میں باہمی امور پر گفتگو کروں گا تو لڑائی میں فریب دہی کی اجازت ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی ایک بات کہہ کر اس سے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ کتب شیعہ

ائمہ سے نقل کردہ مختلف روایات سے لبریز ہیں۔

شیعہ کا یہ قول کہ تم خلفاً عن سلف روایت کرتے چلے جاؤ گے یہاں تک کہ ائمہ معصومین میں سے کسی امام تک پہنچ جائے گی۔

ہم جواباً کہتے ہیں کہ اگر یہ بات درست ہے تو ایک ہی معصوم سے روایت کرنا کافی ہے۔ ہر زمانہ میں معصوم کی کیا ضرورت ہے؟ نیز جب نقل و روایت موجود ہے اور اس پر اکتفاء کیا جا سکتا ہے تو اس امام منتظر کا کیا فائدہ جس سے ایک لفظ بھی منقول نہیں۔ اور اگر نقل ناکافی ہے تو شیعہ چار سو ساٹھ سال سے خسارہ و جہالت میں رہے۔

شیعہ کی دروغگوئی

روافض ائمہ پر دروغ بافی کرنے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ شیعہ کی دروغگوئی کی خصوصی آماجگاہ ہیں۔ دروغ گوئی کی حد یہ ہے کہ انہوں نے مندرجہ ذیل کتب کو امام موصوف کی جانب منسوب کر دیا ہے۔

(۱) کتاب الجفر والبطاقہ

(۲) کتاب اختلاج الاعضاء

(۳) احکام الرعود والبروق

(۴) منافع القرآن

یہ کتب شیعہ فرقہ طُرقیہ کا ذریعہ معاش ہیں۔

یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ صدقِ ناقل اور اتصالِ سند کو معلوم کیے بغیر کثرت سے جھوٹ بولنے والے شیعہ کی روایات پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ شیعہ کی دروغ گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کوفہ اور عراق کے باشندے بھی ان کی دیکھا دیکھی دروغگوئی کے خوگر بن گئے اس کی حد یہ ہے کہ اہل مدینہ ان کی روایات کو قبول کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

"اہل کتاب کی روایات کی طرح اہل عراق کی مرویات کی نہ تصدیق کیجئے اور نہ تکذیب"۔

ایک مرتبہ محدث عبدالرحمن بن مہدی[۱] نے امام مالک سے کہا۔

---

[۱] عبدالرحمن بن مہدی کی کنیت ابو سعید اور نسبت لؤلوی بصری ہے۔ ان کی تاریخ ولادت (باقی بر صفحہ ۱۳۳)

"ابو عبداللہ! (امام مالک کی کنیت) ہم نے آپ کے شہر (مدینہ طیبہ) میں چالیس دن میں چار سو حدیثیں سنی ہیں حالانکہ ہم (عراق میں) ایک دن میں اس قدر احادیث سن لیا کرتے تھے"۔
امام مالک نے فرمایا۔ "ابو عبدالرحمن! آپ کی ٹکسال ہمیں کہاں نصیب! آپ راتوں کو ٹکسال میں حدیثیں گھڑتے اور دن میں ان کو پھیلاتے ہیں"۔

بایں ہمہ کوفہ میں بہت سے قابل اعتماد محدثین بھی موجود تھے۔ شیعہ کی کثرت کذب کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث میں مہارت نہ رکھنے والوں پر احادیث کی چھان پھٹک مشکل ہوگئی اور وہ صحیح وضعیف حدیث میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے کوئی اجنبی شخص ایک ایسے شہر میں داخل ہو جہاں کے باشندوں سے آدھے دروغ پیشہ ہوں تو وہ شخص جب تک کسی صادق اور ثقہ راوی کو پہچان نہ لے گا ان سے روایت نہیں کرے گا۔ یا جس طرح کسی شہر میں کھوٹے سکے زیادہ ہوں تو جو شخص کھرے کھوٹے میں تمیز نہیں کر سکتا معاملہ سے اجتناب کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ناقد کے لیے اہل بدعت کی کتب کا درس و مطالعہ جن میں روایات کاذبہ کی بھرمار ہو مکروہ ہے۔ اسی طرح افسانہ گو اور ان کے نظائر و امثال سے — جو دروغگوئی میں معروف ہوں — علمی استفادہ ناروا ہے۔ اس امر کو علماء اسماء الرجال یک زبان ہیں کہ شیعہ سب فرقوں کی نسبت زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔ "شیعہ رائے و قیاس کی جانب دھیان نہیں دیتے اور قیاس کو حرام قرار دیتے ہیں"۔

جہاں تک قیاس و رائے کا تعلق ہے اس میں اہلسنت اور شیعہ برابر ہیں۔ اہل سنت میں "اہل الرائے" بھی پائے جاتے ہیں اور وہ بھی جو حجیت قیاس کے قائل نہیں۔ بغداد کے معتزلہ قیاس کو حجت قرار نہیں دیتے اسی طرح محدثین بھی قیاس کی مذمت کرتے ہیں۔ تاہم قیاس و رائے کو حجت قرار دینا ایک مشہور جھوٹے اور غیر معصوم کے اقوال غیر مصدقہ کو مستند تصور کرنے سے

(بقیہ حاشیہ ص۱۴۲) وفات (۱۳۵-۱۹۸ھ) ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ ان کے اساتذہ میں شعبہ بن حجاج، سفیان ثوری اور امام مالک کے نام قابل ذکر ہیں۔ عبداللہ بن مبارک اور امام احمد بن حنبل نے آپ سے روایت کی ہے۔ یہ ہر سال حج کو جاتے اور ہر دو رات میں قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے

بہتر ہے۔ یہ حقیقت کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ائمہ کبار کے نزدیک مسائل واحکام کی تنقیح وتخریج کے لیے اجتہاد کرنا شیعہ کے امام حسن عسکری اور ان کے فرضی بیٹے کی روایات کے ساتھ تمسک واحتجاج کرنے سے بہتر ہے۔

ائمہ دین مثلاً مالک۔ لیث۔ اوزاعی۔ ثوری۔ ابوحنیفہ شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ حسن عسکری اور ان کے متعلقین زیادہ علم دین رکھتے تھے۔ اور امام عسکری کے لواحقین پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ ان حضرات سے علمی استفادہ کرتے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ علی بن حسین۔ ابوجعفر اور جعفر بن محمد عالم وفاضل تھے ان کے اخلاف میں کوئی عالم دین پیدا نہیں ہوا۔ بایں ہمہ وہ اپنے معاصر علماء سے علمی استفادہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"شیعہ کے علاوہ دیگر اہل اسلام مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ اشاعرہ ذات خداوندی کے ساتھ کچھ اور چیزوں کو بھی قدیم قرار دیتے ہیں۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ صفات الٰہی موجود فی الخارج ہیں۔ خداوند کریم عالم ہونے میں صفت علم کا محتاج ہے اور قادر ہونے میں صفت قدرت کا وَہَلُمَّ جَرًّا اشاعرہ کی رائے میں اللہ تعالیٰ نہ قادر لذاتہٖ ہے نہ عالم لذاتہٖ اور نہ حیّ لذاتہٖ بخلاف ازیں ان صفات سے متصف ہونے میں وہ ان کا محتاج ہے۔ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

صفات باری میں اشاعرہ پر شیعہ کی بہتان طرازی

نصاری تین اشیاء کو قدیم مان کر کافر ہوگئے اور اشاعرہ نے قدماء کی تعداد نو تک بڑھادی"۔

مذکورہ بالا امور کی تردید کئی طریقہ سے کی جاسکتی ہے۔

وجہ اول:۔ یہ اشاعرہ پر بہتان طرازی ہے۔ اشاعرہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ بذات خود کامل نہیں اور وہ اپنے کمال میں دوسروں کا محتاج ہے۔ امام رازی نے بھی یہ بات کہیں نہیں لکھی۔ بخلاف ازیں امام رازی نے کسی کا یہ قول نقل کرکے اس کی مذمت بیان کی ہے۔ یہ صفات کی نفی کرنے والے جہمیہ کا پرانا اعتراض ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جہمیہ کی تردید کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں۔

"ہم یوں نہیں کہتے کہ باری تعالیٰ ازلی ہے اور اس کا نور وقدرت بھی ازلی ہے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ وہ اپنے نور وقدرت کے ساتھ ازلی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قدرت کی صفت اس میں کب آئی اور کیسے آئی؟ جہمیہ کہتے ہیں تم اس وقت تک موحد نہیں ہو سکتے جب تک یہ نہ کہو کہ اللہ تعالیٰ ازل سے تھا اور دوسری کوئی چیز نہ تھی۔ ہم جواباً کہتے ہیں۔ کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ازل سے تھا اور کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ازل ہی سے اپنی صفات کے ساتھ متصف تھا تو ہم جمیع صفات کے ساتھ ایک ہی معبود کو موصوف قرار دیتے ہیں۔ ہم نے ایک مثال بیان کرکے جہمیہ پر اپنا مقصد واضح کیا ہے۔ دیکھئے یہ کھجور کا درخت ہے یہ متعدد اشیاء سے مل کر بنا ہے اس کے تنے ہیں۔ ٹہنیوں کی موٹی چوڑیاں ہیں۔ اس کی چھال ہے شاخیں ہیں پتے اور گوند ہے۔ ان سب کو بحیثیت مجموعی "نخلہ" (کھجور کا درخت) کہا جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح خداوند تعالیٰ اپنی جملہ صفات سے متصف ہو کر معبود برحق قرار پاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ باری تعالیٰ کسی وقت قدرت وعلم سے عاری تھا بعد ازاں اس نے علم وقدرت کو پیدا کیا۔ اور وہ ان سے متصف ہوا۔ حالانکہ جو علم وقدرت سے بہرہ ور نہ ہو وہ عاجز وجاہل ہوتا ہے بخلاف ازیں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ عالم وقادر اور مالک رہا ہے۔ کب اور کیونکر کا سوال لغو ہے"۔

وجہ ثانی :۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ سب اشاعرہ کا قول نہیں بلکہ صرف وہ اشاعرہ اس کے قائل ہیں جو حال کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں کہ "عالمیت" ایک حال ہے جو معلل بالعلم ہے ان کے نزدیک علم ایک ایسے حال کا موجب ہے جو علم نہیں بلکہ عالم ہوتا ہے۔ امام باقلانی اور قاضی ابو یعلی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ امام ابو المعالی کا بھی ایک قول یہی ہے۔

قائلین صفات کے دلائل

بخلاف ازیں جمہور مثبتین صفات کہتے ہیں۔

"علم سے مراد عالم ہونا ہے۔ عالم وہی شخص ہوتا ہے جو علم سے بہرہ ور ہو اور قادر وہی ہے جو قدرت رکھتا ہو۔ مقصود یہ ہے کہ بلا علم کوئی شخص عالم نہیں کہلا سکتا۔ جو قدرت سے بہرہ ور نہ ہو وہ قادر نہیں اور جو حیات سے محروم ہو وہ حی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اسم فاعل کا وجود مصدر کے بغیر ممتنع ہے۔ مثلاً صلوۃ کے بغیر

کوئی شخص مصلی (نمازی) نہیں کہلا سکتا۔ روزہ کے بغیر صائم نہیں ہو سکتا اور نطق کے بغیر اسے ناطق نہیں کہہ سکتے۔ جب یہ کہا جائے کہ نماز کے بغیر کسی کو نمازی نہیں کہہ سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں دو چیزیں ہیں ایک نماز اور دوسرا حال معتل بالصلوٰۃ۔ بخلاف ازیں نمازی وہی ہوگا جو نماز سے موصوف ہو"۔

منکرین صفات کہتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ حیّ ہے مگر حیات سے بہرہ ور نہیں۔ اسی طرح وہ بلاقدرت قادر اور بلا علم عالم ہے۔ جو شخص باری تعالیٰ کو حیّ اور علیم و قدیر بالذات قرار دیتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات حیات اور علم و قدرت کو مستلزم ہے تو وہ دیگر کسی چیز کا محتاج نہیں۔ جو شخص منکرین صفات کے افکار و آرا پر زحمت غور و فکر گوارا کرتا ہے اس پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اثبات صفات کے لیے مجبور پاتے ہیں اور اپنے اور قائلین صفات کے اقوال و معتقدات میں کوئی نمایاں فرق ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ منکرین صفات بھی اللہ تعالےٰ کو حیّ، قادر اور عالم تسلیم کرتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ صفات عین ذات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے ذات الٰہی پر ان زائد صفات کا اضافہ کر دیا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اہل سنت بہت سی چیزوں کو قدیم مانتے ہیں"۔

یہ ایک مبہم قول ہے جس کا مقصود واضح نہیں۔ اس سے متوہم ہوتا ہے کہ اہل سنت ازل ہی میں ذات باری کے علاوہ متعدد معبود مانتے ہیں۔ یہ اہل سنت پر عظیم بہتان ہے۔ اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صفات قدیمہ سے موصوف ہے۔ جس طرح اس کی ذات قدیم ہے۔ اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں اس کا انکار ایک غلط کار اور ذلیل آدمی ہی کر سکتا ہے۔ لفظ "اللہ" خداوند تعالیٰ کی ذات و صفات ہر دو شامل ہے صرف ذاتِ مجرّد کا نام نہیں ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ کہ "اہل سنت کے نزدیک خدا کا عالم ہونا صفت علم کے اثبات کا محتاج ہے۔"

یہ اعتراض مثبتین حال پر وارد ہوتا ہے۔ جمہور کی رائے میں ذات باری کا عالم ہونا ہی علم ہے اور بس! اگر یوں کہا جائے کہ اس کا عالم ہونا اس علم کا محتاج ہے جو لازم لذاتہ ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کا محتاج ہے۔ اس لیے کہ اس کی ذات علم کو مستلزم ہے اور

علم اس کے عالم ہونے کو مستلزم ہے۔ گویا اس کی ذات اس کی موجب ہے۔ بنابریں علم بھی کمال ہے اور اس کا عالم ہونا بھی کمال۔ جب اس کی ذات ان دونوں کی موجب ہے تو ایسے ہوا جیسے وہ حیات وقدرت کی موجب ہے۔

شیعہ مصنف کی غلط بیانی

بقول شیعہ مصنف اہل سنت اللہ تعالیٰ کو عالم وقادر لذاتہ تسلیم نہیں کرتے۔

اگر شیعہ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت اللہ تعالیٰ کو منکرین صفات کی طرح علم و قدرت سے مجرد نہیں مانتے تو یہ درست ہے اس لیے کہ علم وقدرت سے مجرد ذات کا خارج میں کوئی وجود ہی نہیں اور اگر یہ مراد لیتا ہے کہ اہل سنت خدا کو عالم وقادر لذاتہ نہیں مانتے جو علم و قدرت کو مستلزم ہے تو یہ اہل سنت پر عظیم بہتان ہے کیونکہ اس کی ذات جو موجب علم وقدرت ہے یہی اس کے عالم وقادر ہونے اور اس کے علم وقدرت کو واجب ٹھہراتی ہے اس لیے کہ یہ امور باہم لازم وملزوم ہیں۔

شیعہ مصنف کہتا ہے کہ "اہل سنت خدا کو محتاج، ناقص فی ذاتہ اور کامل بغیرہ مانتے ہیں"۔

شیعہ مصنف کا یہ قول سراسر بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ ذات خداوندی صفات لازمہ سے موصوف ہے اور خارج میں کوئی ذات مجرد عن الصفات موجود ہی نہیں۔ علاوہ ازیں صفات ذات اللہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "نصاریٰ تین قدیم مان کر کافر ٹھہرے۔ مگر اشاعرہ کے نزدیک قدماء کی تعداد نو (۹) ہے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو اس لیے کافر قرار نہیں دیا کہ وہ تین قدماء تسلیم کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں "ثالث ثلاثۃ" کہنے کی بنا پر انھیں کافر ٹھہرایا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ" (المائدہ ۵-۷۳) (اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے)

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ نصاریٰ کا جرم خداوند لایزال کو "ثالث ثلاثۃ" قرار دینا تھا۔ اور اسی جرم کی پاداش میں انھیں کافر کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا۔

وَمَا مِنْ قَدِيمٍ اِلَّا قَدِيمٌ وَّاحِدٌ (صرف ایک ہی قدیم ہے اور کوئی قدیم نہیں)

اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول تھے۔ بہت سے رسول آپ سے پہلے گذر چکے ہیں۔ آپ کی والدہ ایک راستباز خاتون تھیں وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے" (المائدہ - ۷۵)

نیز فرمایا۔

"اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ دونوں کو خدا کے سوا معبود بنالو۔ عیسیٰ نے کہا تو اس سے پاک ہے" (المائدہ - ۱۱۶)

المختصر! کتاب و سنت میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ قدیم بھی اللہ کا نام ہے۔ اگرچہ معنوی اعتبار سے یہ لفظ درست ہے۔ مزید براں نصاریٰ خود اس بات کے معترف ہیں کہ حضرت مریم و عیسیٰ دونوں کائنات ارضی پر پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا حادث تھے۔ پھر وہ ان کو قدیم کیونکر قرار دے سکتے تھے؟

اشاعرہ پر اعتراض اور اس کا جواب

مزید براں صفات الٰہی کا اثبات کرنے والے یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ ۹ قدماء میں سے ایک ہے۔ بخلاف ازیں ان کے نزدیک لفظ "اللہ" ذات و صفات دونوں کا جامع ہے۔ وہ صفات باری کو بھی غیر ذات قرار نہیں دیتے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا"

حدیث صحیح میں عزت و حیات خداوندی کی حلف اٹھانے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خداوندی عزت و حیات کی قسم حلف بغیر اللہ میں شامل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفات خداوندی آٹھ میں معدود و محصور نہیں جیسا کہ بعض اشاعرہ کا قول ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ کسی عدد میں بھی محدود نہیں ہے۔

نصاریٰ تین اقانیم کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تین جواہر ایک جوہر میں جمع ہیں۔ اقانیم ثلاثہ میں سے ہر اقنوم الٰہ ہے جو پیدا کرتا اور رزق عطا کرتا ہے کلمہ اور علم کے اقانیم مسیح کے ساتھ متحد ہیں نصاریٰ کا یہ قول متناقض ہے۔ اس لیے کہ متحد اگر صفت ہو تو صفت نہ پیدا کرتی نہ رزق عطا کرتی ہے ورنہ اپنے موصوف سے الگ ہوتی ہے اور اگر صفت کا نام ہی موصوف ہے تو وہ جوہر واحد ہے

اور وہی باپ ہے۔ اس سے مسیح کا باپ ہونا لازم آئے گا حالانکہ نصاریٰ اس کے قائل نہیں۔ اب نصاریٰ کے عقیدہ کو ذہن میں رکھیے اور اہل سنت کے نقطۂ نظر پر غور کیجئے جو کہتے ہیں کہ

"اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کے اسماءِ حسنیٰ اس کی صفات عالیہ پر دلالت کرتے ہیں اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے اور نہ معبود"۔

ابن کلابؒ[1] نے جب جہمیہ کی تردید میں ایک کتاب تحریر کی تو انہوں نے ان کی بہن کے بارے میں ایک کہانی تصنیف کر ڈالی۔ کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن کلاب کی بہن نصرانی تھی۔ جب ابن کلاب مشرف باسلام ہوا تو بہن نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ ابن کلاب نے کہا کہ میں تو مسلمانوں کے دین میں فساد پیدا کرنے کے لیے مسلمان ہوا ہوں۔ یہ سنکر وہ راضی ہو گئی۔

یہ کہانی گھڑنے والے کا مقصد یہ تھا کہ صفاتِ باری کا اثبات نصاریٰ کا عقیدہ ہے۔ حالانکہ اہلسنت اور نصاریٰ کے نظریات کے مابین اتنا ہی فرق ہے جتنا سر اور چوٹی میں۔

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔

ذاتِ خداوندی کو مخلوقات کے مماثل قرار دینے والے حشویہؒ[2] کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ طول اور

---

[1] ابن کلاب پر حاشیہ قبل ازیں گزر چکا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ منہاج السنۃ جلد اول صفحہ ۸۵ پر ابن کلاب سے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔

"ابو محمد عبد اللہ بن سعید بن کُلاب بصری نے جہمیہ و معتزلہ کی تردید میں متعدد کتب تصنیف کیں اور ان کے معائب کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ شخصیت نہیں جس کا ذکر ابن الندیم نے الفہرست میں کیا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ابن الندیم بھی ابن کلاب پر بلاوجہ افترا پردازی کرنے والوں کی صف میں شامل ہو گیا ہو ابن السبکی نے امام فخر الدین رازی کے والد سے ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن سعید یحییٰ بن سعید القطان کا بھائی ہے مگر یہ بھی تحقیق طلب ہے ۱۲

[2] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ منہاج السنۃ جلد اول صفحہ ۲۴۱ پر ارقام فرماتے ہیں۔

عمرو بن عُبَید معتزلی نے سب سے پہلے "حشویہ" کا لفظ استعمال کیا اور کہا کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حشوی تھے آغاز کار میں حشویہ سے عامۃ الناس مراد لیے جاتے تھے کیونکہ حشو بھرتی کو کہتے ہیں یعنی بھرتی کے لوگ۔ پھر بن میں عقلی ڈھکوسلوں کی پیروی کرنے والے متبعین سنت کو حشوی کا طعن دینے لگے۔ زیادہ تر معتزلہ (باقی بر صفحہ ۱۴۰)

عرض و عمق رکھتا ہے۔ وہ مصافحہ بھی کرتا ہے۔ صلحاء دنیا میں زیارت خداوندی سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ داؤد[1] کے متعلق منقول ہے کہ اس نے کہا "مجھ سے خدا کی شرمگاہ اور داڑھی سے متعلق نہ پوچھو اور جو چاہو دریافت کرو"۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ میرا معبود جسم، گوشت اور خون رکھتا ہے۔ اس کے اعضا بھی ہیں۔ حشویہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کی آنکھیں دکھنے لگیں اور فرشتوں نے اس کی عیادت کی۔ طوفان آنے پر اللہ تعالیٰ اس قدر رویا کہ اس کی آنکھیں دکھنے لگیں"۔

بقول شیعہ مصنف اہل سنت مجسمہ ہیں

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ ہشام بن حکم رافضی بھی تجسیم کا عقیدہ رکھتا تھا۔ متعدد ناقلین نے یہ نظریہ اس سے نقل کیا ہے۔ مثلاً ابو عیسیٰ الوراق[2]۔ زرقان[3]۔

(حاشیہ صفحہ ۱۳۹) ان کے پیرو روافض، شعوبیہ اور اہل الاہواء یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ ان کی رائے میں امام احمد بن حنبل اور ہر شخص جو حدیث صحیح سے استناد کرتا اور قیاس و رائے کو نظر انداز کر دیتا ہو حشوی ہے۔ جب اولین حشوی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حشویہ میں سے اوسط حضرت امام احمد بن حنبل تھے تو ہر سنی کی یہ دلی آرزو ہے کہ ان کا لبسۂ فتراک رہے اور آخرت میں انہی کے ساتھ اٹھایا جائے"۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) [1] یہ داؤد الجوار بی کہلاتا تھا۔ امام ابو الحسن اشعری نے مقالات الاسلامیین ج ۱ ص ۲۵۸ میں اسے قائلین تجسیم میں شمار کیا ہے۔ علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں ہشام بن سالم جوالیقی کے بعد اس کا ذکر کیا ہے اور بعینہ ابن المطہر شیعہ کا ذکر کردہ فقرہ اس سے نقل کیا ہے۔

[2] ابو عیسیٰ الوراق شیعہ ہے۔ اس پر حاشیہ گذر چکا ہے۔ ہشام کے متعلق اس کی شہادت ایک شیعہ کی شہادت دوسرے شیعہ کے حق میں ہے ۱۲

[3] زرقان متعدد اشخاص کا نام و لقب ہے۔ (۱) محمد بن آدم مدائنی شیعہ (۲) محمد بن عبد اللہ بن سفیان زیات بغدادی محدث (۳) حضرت ذو النون مصری کے معاصر کا نام بھی زرقان بن محمد صوفی تھا۔ (۴) اصمعی کے استاد کا نام ابو عمیر بن زرقان تھا اس نے محمد بن سائب کلبی سے روایت کی ہے۔ ممکن ہے یہاں زرقان سے محمد بن آدم شیعہ مراد ہو بشرطیکہ اس نے اسلامی فرقوں سے متعلق کوئی کتاب تصنیف کی ہو۔ تنقیح المقال میں اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے یہ بات ذکر نہیں کی اس نے فرقہ جات پر کوئی کتاب لکھی ہے۔ ابو الحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین میں اہل بدعت کے متعدد اقوال اس سے نقل کیے گئے ہیں۔ کتاب الفرق بین الفرق طبع ۱۳۶۷ھ ص ۴۲ و ۱۲۵ پر زرقان کا ذکر موجود ہے ۱۲

ابن[1] نوبختی۔ ابوالحسن اشعری۔ ابن[2] حزم۔ شہرستانی[3] اور علماء کی ایک جماعت نے یہ عقیدہ اس سے نقل کیا ہے۔

۱؎ ابن نوبختی ایک مجوسی خاندان سے تھا۔ جس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ حسن بن موسیٰ جو تیسری صدی میں ہوا ہے اسی خاندان کی جانب منسوب ہے۔ فرق الشیعہ نامی کتاب اسی کی طرف منسوب ہے۔ یہ کتاب جرمنی مستشرق ریٹر نے ۱۹۳۱ء میں قسطنطنیہ سے شائع کی۔ یہ کتاب ۱۳۵۵ھ میں دوبارہ نجف میں چھپی۔ شیخ الاسلام کا اشارہ اسی کتاب کی طرف ہے ۱۲

۲؎ نام و نسب علی بن احمد بن سعید بن حزم ظاہری اندلسی اور کنیت ابو محمد المتوفی (۳۸۴ - ۴۵۶ھ) ہے۔ یہ بہت بڑے امام حافظ حدیث، فقیہ اور کتاب و سنت سے احکام کا استنباط کرنے والے تھے۔ متعدد علوم میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ابن حزم اور ان کے والد بہت بڑے رئیس اور حکومت و سلطنت سے بہرہ ور تھے۔ تاہم وہ بڑے عابد اور زاہد تھے۔ ان کی تصانیف اتنی زیادہ ہیں کہ ان سے ایک مستقل لائبریری قائم کی جا سکتی ہے۔ ابن بشکوال ان کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں۔

"ابن حزم اندلس بھر میں علوم اسلامیہ کے ممتاز عالم تھے۔ یہ لسانیات، بلاغت و شعر و سیر و اخبار میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چار سو مجلدات موجود تھیں جو اسی ہزار اوراق پر مشتمل تھیں"۔ حافظ محمد بن فتوح الحمیدی لکھتے ہیں۔

ذہانت و فطانت، سرعت حفظ، جود و سخا اور تدین و تشرع میں ہم نے ابن حزم سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں دیکھا۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں کوئی شخص ابن حزم کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ابن حزم پر یہ حرف گیری کی گئی ہے کہ آپ اپنے مخالف علماء کے مقابلہ میں خواہ وہ معاصر ہوں یا متقدم متشدد تھے ۱۲

۳؎ ابوالفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی المتوفی (۴۷۹ - ۵۴۸ھ) مؤلف کتاب الملل والنحل شافعی المذہب تھا وفیات الاعیان طبقات الشافعیہ لابن السبکی اور شذرات الذہب میں اس کے حالات مذکور ہیں۔ حافظ ذہبی تاریخ الاسلام میں شہرستانی کے شاگرد ابن سمعانی سے نقل کرتے ہیں کہ شہرستانی اسمٰعیلیہ کی جانب میلان و رجحان اور ان کے خرافات کی نصرت و حمایت سے متہم تھا۔ "العبر" میں مذکور ہے۔

شہرستانی اسمٰعیلیہ کی جانب میلان رکھتا تھا وہ یہ غالی شیعہ تھا"۔ ابن السبکی الطبقات ج ۴ ص ۷۹ پر اپنے معاصر محمد بن عباس خوارزمی صاحب الکافی کا قول نقل کرتے ہیں

دباقی بر صفحہ ۱۴۲

ان علماء کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے ذات باری پر جسم کا اطلاق کیا وہ ہشام بن حکم شیعہ تھا۔ سابق الذکر علماء نے بیان بن سمعان تمیمی ——— ایک غالی شیعہ ——— سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) "اگر شہرستانی کا عقیدہ خراب نہ ہوتا اور وہ ملاحدہ کی جانب مائل نہ ہوتا۔ تو اسلام میں ایسے ایک عظیم امام کا مرتبہ حاصل ہوتا"۔ صاحب شذرات الذہب ج ۴ ص ۱۴۹ پر کتاب العبر سے نقل کرتے ہیں کہ شہرستانی باطنی مذہب سے متہم تھا"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎ بیان بن سمعان اموی عہد خلافت میں ایک خبیث اور فریب کار شخص ہوا ہے۔ اس دور میں الوصفاء نامی ایک جماعت پیدا ہوئی تھی جس کا سرغنہ مغیرہ بن سعید تھا یہ ان سے سازباز رکھتا تھا۔ یہ اعداء دین شعوبیہ کی ایک جماعت تھی جو بزعم خود اسلام کے استیصال کے لیے عالم وجود میں آئی تھی۔ مالک بن سعید اور چند دیگر شعوبیہ اس کے ممبر تھے۔ ان کی جانب چند عقاید و افکار منسوب ہیں جو انھوں نے جاہل مسلمانوں کو پھنسانے اور دین اسلام سے منحرف کرنے کے لیے گھڑ رکھے تھے دراصل یہ ان عقاید پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ بیان کے مخصوص افکار و معتقدات جن کا وہ داعی تھا وہ یہ تھے (۱) حضرت علی الٰہ ہیں (۲) الوہیت کا ایک جز اس میں حلول کر آیا اور اس کے جسم کے ساتھ متحد ہو گیا ہے (۳) وہ کہا کرتا تھا کہ بعض اوقات میں ذاتِ خداوندی کو دیکھا بھی کرتا ہوں۔ بیان بن سمعان آیت

(هَلْ يَنْظُرُونَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (البقرۃ)

کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ حضرت علی بادل کے سایہ میں آئیں گے۔ بجلی کی کڑک ان کی آواز ہو گی اور اس کی چمک ان کی مسکراہٹ۔ بیان کا قول ہے کہ حضرت علی کے اسرار پہلے ان کے فرزند محمد بن حنفیہ کی جانب منتقل ہوئے اور پھر ان کے پوتے ابوہاشم کی طرف۔ کچھ عرصہ کے بعد بیان نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابوہاشم کی روح اس میں حلول کر آئی ہے اور اس طرح بطریق تناسخ اس میں الوہیت سما گئی ہے۔ اسی اثنا میں بیان نے عمر بن ابی عفیف نامی قاصد کو محمد باقر کی طرف بھیج کر انہیں اپنی پیروی کی دعوت دی۔ محمد باقر نے قاصد کو حکم دیا کہ وہ دعوت نامہ نگل لے۔ چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کر دی۔ خالد بن عبد اللہ قسری ان دنوں خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی جانب کوفہ کے گورنر تھے جب ان کو بیان بن سمعان اور وصفاء کی جماعت کے حالات موصول ہوئے تو ۱۱۹ھ میں ان سب کو کوفہ کی جامع مسجد میں قتل کر دیا۔ وصفاء کی جماعت میں شامل ہونے والے نہ تو وہ کیسانیہ تھے جو محمد بن حنفیہ کے نام سے لوگوں کو دھوکہ دیا کرتے تھے اور نہ حضرت حسین اور ان کی آل کا نام لے کر فریب دینے والے امامیہ بخلاف ازیں یہ لوگ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ و تابعین کے خلاف حقد و عداوت کا داعیہ لے کر اٹھے تھے اور یہی چیز ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کا موجب بنی"۔

نقل کیا ہے کہ اللہ تعالے کی صورت انسان جیسی ہے۔ اس کا صرف چہرہ محفوظ رہے گا باقی جسم فنا ہو جائے گا۔ خالد بن عبداللہ قسری نے اسے قتل کر دیا تھا۔ مغیرہ بن سعید سے منقول ہے کہ اس کا معبود نور سے بنا ہوا ایک شخص ہے۔ اس کے سر پر نور کا تاج رکھا ہے۔ اس کے اعضاء انسانوں جیسے ہیں وہ شکم اور دل بھی رکھتا ہے ابجد کے حروف اس کے اعضاء کی تعداد کے مطابق ہیں۔ وہ مردوں کو زندہ کرنے کا دعوے دار تھا اور لوگوں کو شعبدہ بازی کے کرتب دکھایا کرتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اس کی نبوت کا دعوی کر دیا۔ خالد بن عبداللہ نے (اپنے عہد امارت میں) اسے قتل کر دیا۔ ابو منصور[۱] کے متبعین جن کو منصوریہ کہا جاتا ہے۔ اس سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے کہا۔ "آل محمد آسمان ہیں اور شیعہ زمین ہیں۔ اس کا دعوی تھا کہ مجھے آسمان پر لے جایا گیا۔ میرے معبود نے میرے سر

---

[۱] ابو منصور عجلی کوفہ کا رہنے والا تھا وہاں اس کا ایک مکان بھی تھا کہا جاتا ہے کہ یہ عبدالقیس کے موالی میں سے تھا یہ امام باقر المتوفی (۵۹ - ۱۱۶) کا معاصر تھا۔ اور آپ سے ملا کرتا تھا اس کے خلاف اسلام عقائد سے متنفر ہو کر امام باقر اس سے بیزار ہو گئے تھے۔ امام باقر کی وفات کے بعد ۱۱۶ھ میں اس نے امام باقر کے وصی ہونے کا دعوی کر دیا۔ اور کہنے لگا حضرت علی حسن و حسین۔ علی بن حسین اور محمد باقر سب انبیاء تھے اور وہ بھی نبی و رسول ہے اس کی چھٹی پشت تک نبوت جاری رہے گی ان میں سے آخری شخص "القائم" ہو گا۔ جیسا کہ شیعہ علماء میں سے الکشی نے اعتراف سب سے پہلے ابن سبا نے "الوصی" کا لفظ اختراع کیا۔ اسی طرح شیعہ فضلاء میں سے نوبختی کے بیان کے مطابق "القائم" کا لفظ اختراع کرنے والا ابو منصور تھا۔ گویا شیعہ حضرت علی کو وصی قرار دینے میں ابن سبا کے شاگرد ہیں اور تہ خانے میں چھپ رہنے والے مشکوک الولادت کو القائم کا لقب عطا کرنے میں ابو منصور کے تلمیذ رشید ہیں۔ ابو منصور کہا کرتا تھا کہ مجھے آسمان پر لے جایا گیا اللہ تعالی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سریانی زبان میں میرے ساتھ بات چیت کی پھر مجھے زمین پر اتارا گیا۔ آیت ذیل میں ﴿وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (الطور - ۴۴) جو کسف کا لفظ وارد ہے۔ اس سے میری ذات مراد ہے۔ بعد ازاں کہا کرتا تھا کہ کسف سے ذات خداوندی (یعنی خود ابو منصور) مراد ہے۔ وہ اپنے اتباع کو کہا کرتا تھا کہ مخالفین کا گلا گھونٹ کر انھیں قتل کر دیا کرو۔ جب یوسف بن عمر ثقفی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی جانب سے کوفہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے ابو منصور کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ یہ واقعہ ۱۲۰ھ اور ۱۲۶ھ کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔ ان دنوں یوسف بن عمر عراق پر حکمران تھا ۱۲

"اللھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ولوالدیھم"

ہاتھ پھیرا اور کہا جا کر میرے دین کی تبلیغ کیجئے"۔ منصوریہ ان الفاظ کے ساتھ حلف اٹھایا کرتے تھے "لَا وَالْکَلِمَۃِ" ابو منصور کا قول ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے حضرت عیسٰی کو پیدا کیا۔ پھر حضرت علی کو۔ اس کا قول ہے کہ رسالت بند نہیں ہوئی۔ اس کی رائے میں جنت ایک آدمی کا نام ہے اور جہنم بھی۔

وہ محرمات خون، مردار اور شراب کو حلال قرار دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ قوموں کے نام ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی دوستی کو حرام ٹھہرایا ہے۔ وہ فرائض کو بھی ضروری تصور نہیں کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ آدمیوں کے نام ہیں جن سے دوستی لگانا واجب ہے۔ یوسف بن عمر نے اسے قتل کر دیا تھا۔ فرقہ نصیریہ[۱] والے منصوریہ سے ملتے جلتے تھے۔

---

[۱] نصیریہ محمد بن نصیر کے پیرو ہیں۔ محمد بن نصیر بنی نمیر کے موالی سے تھا اور گیارھویں امام حسن عسکری المتوفی (۲۳۲ — ۲۶۰) کی سکونت گاہ سامرا میں ان کے یہاں جایا کرتا تھا۔ جب ربیع الاول ۲۶۰ھ میں امام عسکری لاولد فوت ہو گئے۔ تو آپ کے عقیدت مند اور ملاقاتی اس حقیقت کا اعتراف کر کے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اور خانہ نشین ہو گئے۔ امام حسن عسکری کے بھائی سید جعفر ان کی تدفین و تکفین میں مشغول ہو گئے۔ اور اس اساس پر اس کا ترکہ الگ کیا کہ آپ کی کوئی اولاد نہیں۔ آپ کا کنبہ اور سب علوی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ امام عسکری بے اولاد ہیں۔ اس وقت ایک افسر بھی وہاں موجود تھا جس کے پاس ایک رجسٹر تھا اس میں علویہ کی تاریخ ولادت مذکور تھی۔ اس وقت یہ ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ امام عسکری لاولد تھے۔

تاہم نام نہاد ائمہ اہلبیت کے اردگرد گھومنے والے غالی شیعہ کو اس سے بڑا دکھ ہوا اور انہوں نے سمجھا کہ جس امر کی بنا پر وہ اہل اسلام کے خلاف جھوٹی روایات وضع کیا کرتے تھے اب وہ باقی نہیں رہا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد انھوں نے اس کا ایک حل تلاش کیا —— اور وہ تھا امام غائب کا نظریہ! ——

انھوں نے یہ نظریہ اختراع کیا کہ امام حسن عسکری کے یہاں ان کی وفات سے پانچ سال پہلے ایک لڑکا تولد ہوا تھا اور وہ بمقام سامرا آپ کے گھر کے تہ خانہ میں پوشیدہ ہے۔ اس نظریہ کا موجد یا مشیر محمد بن نصیر تھا۔ محمد بن نصیر چاہتا تھا کہ وہ بارھویں من گھڑت امام اور ان کے اتباع و انصار کے مابین ایک واسطہ قرار پائے۔ اس واسطہ کو شیعہ اپنی اصطلاح میں "الباب" (دروازہ) کہتے تھے۔ امام حسن عسکری اور ان کے والد کا ایک خادم تھا جو ایک کے گھر کے قریب ایک دوکان میں گھی اور زیت فروخت کیا (باقی بر صفحہ ۱۴۵)

(حاشیہ صفحہ سابق)

کرتا تھا۔ اس کا نام عثمان بن سعید تھا۔ اس کا ایک بیٹا بھی امام کی خدمت میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا اس کا نام محمد بن عثمان تھا۔

محمد بن نصیر کے رفقاء نے محسوس کیا کہ اگر محمد بن نصیر جیسے نو دارد کو "الباب" کے منصب پر فائز کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے رفقاء اس پر رشک کرنے لگیں۔ خصوصاً جبکہ پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ فرضی امام کے لیے ان کے اتباع سے صدقہ فراہم کیا جائے۔ بدیں بنا یہ بہتر ہوگا کہ گھی فروش اور اس کے لڑکے کو یہ منصب تفویض کیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ امانت محمد بن نصیر ایسے با اثر آدمی کی بجائے گھی فروش اور اس کے لڑکے کے پاس رہے۔ شیعہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ گھی فروش امام غائب کے والد اور دادا کی خدمت میں رہ چکا ہے اور اس طرح یہ راز محفوظ رہے گا اور لوگ اسے زائل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اس کے عین برخلاف محمد بن نصیر "الباب" کا منصب اختیار کرنے پر تلا ہوا تھا مگر اس کے شرکاء مشورہ ہر قیمت پر اسے اس منصب سے محروم کرنا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد بن نصیر نے ناراض ہو کر امام غائب ہی سے انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ خود اس عقیدہ کا تصنیف کنندہ تھا۔ چنانچہ اس نے شیعہ کا ایک جدید فرقہ تیار کرنے کی بنا ڈالی جن کے افکار و معتقدات بڑے عجیب وغریب ہیں۔ محمد بن نصیر کی جانب منسوب کر کے اس فرقہ کو نصیریہ کہتے ہیں۔

مشہور شیعہ عالم نوبختی اور دیگر متقدمین شیعہ بہت سی رسوا کن باتوں کو محمد بن نصیر کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ محمد بن نصیر بذات خود اپنے رفقاء و معاصرین سے متعلق ایسی باتوں کی تشہیر کیا کرتا تھا۔ اس کی تفصیلات ان کتب میں موجود ہیں جو اسلامی فرقہ جات اور ان کے عقائد و افکار کے بارے میں تحریر کی گئی ہیں۔

شیعہ کا فرقہ نصیریہ مختلف مراحل و ادوار سے گذرا۔ یہاں تک کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی (۶۶۱ - ۷۲۸) کا زمانہ آیا۔ شیخ الاسلام کا تلمیذ رشید شیخ شہاب الدین احمد بن محمد بن محمود بن لہری شافعی نصیریہ کے بارہ میں لکھتا ہے۔

نصیریہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رب ہیں۔ محمد حجاب اور سلمان فارسی "الباب" (دروازہ) جس اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا وہ حضرت علی ہیں۔ آپ ارض و سما کے امام ہیں۔ اللہ (حضرت علی) کے اس عالم ارضی پر ظاہر ہونے کا مقصد یہ تھا کہ مخلوقات اس سے مانوس ہوں۔ وہ بندوں کو اپنی معرفت (باقی بر صفحہ ۱۴۶)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

وعبادت کا طریقہ بتائے۔ فرقہ نصیریہ کے ہر فرد پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ وہ مختلف انوار وادوار میں ایسے امام اور سب کو پہچانے اور ہر زمانہ میں اس کے اسم ومعنی میں جو تبدیلی ہوتی ہے اسے پہچانتا ہے سب سے پہلے فرد کا نام آدم اور مفہوم شیث تھا۔ بعد ازاں اسم یعقوب اور معنی یوسف پھر اسم موسیٰ اور معنے یوشع پھر نام سلیمان اور مفہوم آصف پھر نام عیسیٰ مسیح اور مفہوم شمعون تھا پھر نام محمد اور مقصود علی تھے۔ ایک شیعہ شاعر کہتا ہے سے

ہابیل۔شیث۔یوسف ویوشع　　　　آصف شمعون الصفا حیدر

نصیریہ قدامت عالم اور تناسخ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ حی اٹھنے کے منکر ہیں۔ اور جنت وجہنم کو ایک دنیوی رمز قرار دیتے ہیں۔ نصیریہ کے نزدیک پانچ نمازوں سے پنجتن یعنی حضرت علی۔ حسن وحسین محسن اور فاطمہ رضی اللہ عنھم مراد ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پنجتن کا نام ذکر کرنے کے بعد غسل جنابت وضو اور نماز کے باقی شروط وواجبات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ان کے نزدیک روزہ سے تیس مرد اور تیس عورتوں کے اسماء مراد ہیں۔

ان کے نزدیک شراب حلال ہے۔ بقول ان کے (نعوذ باللہ من ذلک) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ (خاکش بدہن) سب سے بڑے ابلیس تھے۔ پھر حضرت ابوبکر پھر حضرت عثمان۔ نصیریہ کی اصطلاح ہے پانچ یتیم اور بارہ نقیب۔

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں مصری حکومت کے یہاں نصیریہ سے متعلق سرکاری معلومات موجود تھے جن کو ابو العباس احمد بن علی قلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ نے اپنی کتاب صبح الاعشیٰ ج ۱۳ ص ۲۴۹۔ ۲۵۱ پر جمع کیا تھا۔ نصیریہ کے عقاید سے اخذ کر کے قانون بنایا گیا تھا کہ عدالتوں میں جب حلف دینے کی ضرورت لاحق ہو تو انھیں کس طرح حلف دی جائے نصیریہ سے متعلق سرکاری معلومات کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) حضرت علی کی سکونت گاہ بادل ہے۔

(۲) بادل دیکھ کر نصیریہ کہا کرتے تھے "السلام علیک یا ابا الحسن"

(۳) بادل کی گرج حضرت علی کی آواز ہے اور بجلی کی چمک آپ کی ہنسی ہے۔ اسی بنا پر وہ بادل کی تعظیم بجا لاتے تھے۔

حضرت سلمان فارسی بھی رسول تھے　　(باقی بر صفحہ آیندہ)

ابو الخطاب کے اتباع خطابیہ سے متعلق مذکور ہے کہ ان کی رائے میں ائمہ انبیا و رسل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں دو رسول ہر وقت موجود رہتے ہیں ایک ناطق اور دوسرا ساکت۔ رسول ناطق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور رسول صامت حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ اس فرقہ کے لوگ ابو الخطاب کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ابو الخطاب نے جب خلیفہ منصور کے خلاف خروج کیا تو عیسیٰ بن موسیٰ نے اسے کوفہ میں قتل کر دیا۔ خطابیہ کے نزدیک اپنے اعوان و انصار کے لیے جھوٹی شہادت دینا جائز ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) (۵) نصیریہ حضرت علی کے قاتل ابن ملجم کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ بقول ان کے ابن ملجم نے لاہوت (حضرت علی) کو ناسوت (عالم ارضی) سے چھڑایا ابن ملجم پر لعنت کرنے والوں کو وہ خطا کار قرار دیتے ہیں

(۶) ابن فضل اللہ العمری المتوفی (۷۰۰ - ۷۴۹) اپنی تصنیف "التعریف بالمصطلح الشریف" میں لکھتے ہیں کہ نصیریہ شراب کی تعظیم بجالاتے اور اسے نور تصور فرماتے ہیں۔

(۷) نصیریہ کی رائے میں انگور کی بیل قابل تعظیم ہے اور اس کا اکھاڑنا گناہ ہے۔ کیونکہ اس سے شراب تیار کی جاتی ہے۔

میں نے نصیریہ کے افکار و معتقدات اور سیر و سوانح میں خاصی طوالت سے کام لیا ہے کیونکہ اس فرقہ کے افراد ہنوز دیار شام کے علاقہ لاذقیہ میں پائے جاتے ہیں۔ تازہ ترین مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۲۸۹۰۰۰ (دو لاکھ نواسی ہزار) ہے۔ فرانسیسی استعمار کے زمانہ میں اہل فرانس نے اس فرقہ میں مغرب میں رہنے والے بربر کے سے حالات پیدا کر دیے تھے۔ جنکی تفصیل یہاں خارج از بحث ہے۔ نصیریہ نے سرزمین شام میں بود و باش رکھتے ہوئے تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنا نام تبدیل کر کے "علویہ" رکھ لیا۔ نصیریہ میں سے صالح العلی نے انقلاب فرانس کے زمانہ میں بڑا کام کیا تھا۔ ان میں سے ایک شخص سمان المرشد نامی نے تقیہ کے عقیدہ کے عین برعکس علانیہ رب ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ زمانہ نے نصیریہ میں ایسے ذہین آدمی پیدا کر کے یہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرور زمانہ کے باوصف نصیریہ کے قدیم افسانے تا حال پوری طرح صفحہ ارضی سے محو نہیں ہوئے ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ ابو الخطاب بن ابی زینب سے متعلق دیکھیے ہمارا مقالہ "مَن هُمُ العُبَیدِیُّون" مجلہ الازہر ص ۶۱۶ - ۶۱۸ (م ۲۵ ج ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ)

شیعہ کے فرقے اور ان کے عقائد و افکار

شیعہ کے فرقہ بزیعیہ[۱] سے متعلق منقول ہے کہ ان کی رائے میں جعفر بن محمد خدا تھے۔ نیز یہ کہ ہر مومن پر وحی اتاری جا سکتی ہے۔ امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں (دیکھئے مقالات الاسلامیین ج ۱ ص ۸۰)

بعض لوگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ نیز صوفیہ میں سے بعض زہاد کا خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ لوگوں میں حلول کر آتا ہے وہ جب کوئی اچھی چیز دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس میں ذات خداوندی حلول کر آئی ہے[۲]۔ ان کا خیال ہے کہ بندہ جب اپنے معبود تک رسائی

---

[۱] یہ بزیع بن یونس بافندہ کے پیرو تھے جو امام جعفر صادق المتوفی (۸۳ - ۱۴۸) کا معاصر تھا۔ یہ اکثر امام موصوف کے گھر کے ارد گرد گھوما کرتا تھا جس سے اس کا مقصد اپنے غالی شیعہ کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا تھا۔ چونکہ یہ واشگاف الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیا کرتا تھا۔ اس لیے امام جعفر نے اسے اپنی خصوصی لعنت کی آماج گاہ قرار دیا۔ اس کے رفقاء دین اسلام کی تخریب و تغییر کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مزید برآں وہ امام جعفر کی صحبت و رفاقت اور الفت و مودت کے مدعی تھے۔ وہ امام جعفر اور ان کے آباء کے پرستار بھی تھے بزیع امام جعفر کی الوہیت کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ اپنے اور دوسروں کے لیے نزول وحی کا بھی دعویدار تھا۔ وہ کہا کرتا تھا جب شہد کی مکھی پر وحی نازل ہو سکتی ہے تو ہم پر بالاولی جائز ہوگی۔ جب بزیع کو قتل کیا گیا تو امام جعفر صادق نے فرمایا۔

"الحمد للہ! ان مغیریہ کے حق میں سب سے بہتر چیز قتل ہے اس لیے کہ یہ صرف حب اہلبیت پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ انکی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ لوگ دین اسلام سے منحرف ہو جائیں"۔ مغیریہ مغیرہ بن سعید کے پیرو تھے۔ ان کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔

[۲] صوفیہ کا نظریۂ حلول ایک خطرناک مرض ہے۔ اعداء اسلام نے جس کے جراثیم کو دین اسلام کے جسم میں پھیلا دیا تھا۔ اگر اسلام کے اصول و مبادی دیگر مذاہب و ادیان کے مقابلہ میں اقوی و اکمل نہ ہوتے تو وہ ان عظیم مصائب کے سامنے ٹھہر نہ سکتا اور تشیع و فلسفیانہ تصوف کا سیلاب اسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "جو شخص علی الصبح تصوف کا مسلک اختیار کرے اور چاشت کے وقت تک صوفی رہے اور اس کے احمق ہونے میں شبہ نہیں" (دیکھئے حلیۃ الاولیا ابونعیم نیز مقدمہ

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۴۹)

حاصل کر لیتا ہے تو اس سے واجبات ساقط ہو جاتے ہیں۔ بعض غالی روح القدس کو خدا تصور کرتے ہیں یہ روح پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی پھر حضرت علی اور پھر حضرت حسن میں منتقل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ یہ امام منتظرؒ تک پہنچی۔ یہ سب ائمہ شیعہ کی نگاہ میں عقیدۂ تناسخ کی بنا پر الوہیت کے مقام پر فائز ہیں۔ بعض شیعہ سرور کائنات کو برا بھلا کہتے ہیں اور حضرت علی کو اِلٰہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی الوہیت کی توضیح و اشاعت کے لیے بھیجا تھا مگر آپ رسول بن بیٹھے۔

بعض شیعہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی، حسن و حسین اور فاطمہ میں حلول کر آیا ہے (مقالات الاسلامیین ج ۱ ص ۸۲)۔ مندرجہ ذیل پانچ حضرات ان کی ضد ہیں۔ حضرت ابوبکر۔ عمر۔ عثمان۔ معاویہ اور عمرو بن عاص۔

شیعہ کا ایک فرقہ "السبیئہ" کہلاتا ہے۔ یہ عبداللہ بن سبا کے پیرو ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی فوت نہیں ہوئے وہ دنیا میں لوٹ کر آئیں گے اور کرۂ ارضی کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

السید الحمیری کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ مردے لوٹ کر دنیا میں آئیں گے۔ اس کا شعر ہے ؎

اِلٰى يَوْمٍ يَؤُوْبُ النَّاسُ فِيْهِ ۔۔۔۔ اِلٰى دُنْيَاهُمْ قَبْلَ الْحِسَابِ

اس دن تک جب کہ لوگ حساب سے پہلے دنیا کی طرف لوٹ آئیں گے

بعض شیعہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جملہ امور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تفویض کر دیے تھے چنانچہ آپ نے دنیا کو پیدا کیا اور اس کا نظام قائم کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸) صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی)

صوفیہ فلسفۂ غیب کے مسئلہ میں اس قدر منہمک ہوئے کہ اس ضمن میں وارد شدہ نصوص صریحہ وصحیحہ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے اوہام و ظنون میں ڈوب کر اس دھوئیں کی طرح ضائع ہو گئے جو فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ ان کی حالت اس تنکا جیسی ہے جس سے آدمی لٹک جاتا ہے مگر اس کا انجام کچھ نہیں ہوتا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ یہ شیعہ کا فرضی امام ہے جو ان کے زعم کے مطابق امام حسن عسکری کا بیٹا ہے بقول شیعہ وہ تاہنوز بقید حیات ہے اس کی موت سے قبل حضرت ابوبکر و عمر اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین دوبارہ زندہ کیے جائیں گے وہ ان سے انتقام لے گا۔ ان کے انصار و اعوان کو سخت سزائیں دے کر صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالے گا۔ پھر شیعہ کی دولت عظمیٰ قائم کریگا اور مر جائے گا ۱۲

شیعہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ائمہ شرعی احکام کو منسوخ کہہ سکتے ہیں اور فرشتے وحی لے کر ان پر نازل ہوتے ہیں بعض شیعہ بادل کو سلام کہتے اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان میں حضرت علی قیام پذیر ہیں۔ امام اشعری نے اس کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ذکر کی ہیں۔ اس وقت تک نصیریہ اور اسماعیلیہ عالم وجود میں نہیں آئے تھے[1]

شیعہ نصیریہ کے اشعار ہیں۔

شیعہ کے عجیب و غریب عقائد

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا
حَیْدَرَةُ الْاَنْزَعُ الْبَطِیْنُ
وَلَا حِجَابَ عَلَیْهِ اِلَّا
مُحَمَّدُ الصَّادِقُ الْاَمِیْنُ
وَلَا طَرِیْقَ اِلَیْهِ اِلَّا
سَلْمَانُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ

(۱) میں گواہی دیتا ہوں کہ (حضرت علی) حیدر گنجے اور بڑے پیٹ والے کے سوا کوئی معبود نہیں۔
(۲) نیز یہ کہ صادق و امین محمد کے سوا حضرت علی پر اور کوئی حجاب حائل نہیں ہے۔
(۳) حضرت علی کی طرف جانے کا راستہ صرف حضرت سلمان (فارسی) ہیں جو بڑے طاقتور اور مضبوط تھے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ابھی تک نصیریہ اور اسمٰعیلیہ نے علانیہ اپنی دعوت کا آغاز نہیں کیا تھا۔ ورنہ نصیریہ کا داعی محمد بن نصیر نُمیری امام حسن عسکری کی زندگی میں بڑی مستعدی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ امام ابوالحسن اشعری نے "نمیریہ" کے نام کے تحت مقالات کی ج ۱ ص ۸۴-۸۵ پر نصیریہ کا ذکر کیا ہے مگر ان دنوں اس فرقہ کے پیرو بہت تھے۔ فرقہ اسمٰعیلیہ کا اولین مؤسس امام جعفر صادق کے اصحاب میں سے ابو الخطاب بن ابی زینب تھا۔ یہ وہی شیطان ہے جس نے امام موصوف کے بیٹے اسمٰعیل کو بگاڑ دیا تھا۔ پھر میمون القداح اور اس کا بیٹا علی امام جعفر صادق کے پوتے محمد بن اسمٰعیل بن جعفر پر چھا گئے۔ جب سعید بن احمد بن حسن بن محمد بن عبد اللہ بن میمون القداح کا زمانہ آیا تو اس نے اپنا نام عبید اللہ مہدی رکھ لیا اور یہ دعوی کیا کہ وہ اسمٰعیل کی نسل میں سے ہے۔ حالانکہ وہ آپ کے کسی پوتے کا روحانی متبنی تھا۔ اسمٰعیلیہ کے ہاں یہ بات عام طور سے رائج ہے کہ جو شخص کفر و الحاد میں ان کا ہمنوا ہو اور کفریات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جان تک دینے کے لیے تیار ہو وہ اسے بیٹا قرار دیتے ہیں (مجلۃ الازہر م ۲۵ ج ۵ ص ۶۱۶) اسمٰعیلیہ نے چوتھی صدی ہجری میں شمالی افریقہ میں اپنی سلطنت قائم کی تھی قبل ازیں مختلف دیار و امصار مثلاً عراق، شام، یمن اور شمالی افریقہ میں وہ الحاد کی خفیہ دعوت دیتے تھے (باقی بر ص ۱۵۱)

شیعہ کے نزدیک رمضان کا مقدس مہینہ تمیس آدمیوں کے ناموں سے عبارت ہے
مندرجہ بالا معائب و غلط عقائد کے اولیں بانی و موسس شیعہ ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ شیعہ مصنف کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"جو بات تم نے نقل کی ہے۔ وہ ائمہ سنت، فقہاء حفاظ حدیث اور مشائخ طریقت میں سے کسی نے بھی نہیں کہی۔ ہم کسی شخص کو نہیں جانتے جو خدا کے جسم اور اس کے طول و عمق کا عقیدہ رکھتا ہو۔ اس ضمن میں سب علماء یک زبان ہیں کہ اللہ تعالے کو آخرت میں دیکھا جاسکے گا۔ دنیا میں نہیں۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خوب جان لو کہ تم میں سے کوئی شخص موت سے قبل اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا"۔

شیعہ مصنف کو چاہئے تھا کہ وہ اس قائل کا نام ذکر کرتا ورنہ دروغ گوئی ہر کسی کے لیے ممکن ہے۔ تم نے حشویہ کا ذکر کیا ہے مگر کسی متعین شخص کا نام نہیں لیا۔ نہ جانے وہ کون ہیں؟ اور اگر حشویہ سے تم اہل حدیث مراد لیتے ہو تو وہ خالص سنت کے پیرو ہیں اور ان میں ایک شخص بھی تمہاری ذکر کردہ بات کا معتقد نہیں۔ خلاصۂ کلام! اس بات میں بھی تمہاری کذب بیانی الم نشرح ہوگئی اور دوسرے اقوال میں بھی۔

جہاں تک مشبہہ کے لفظ کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ جمیع اہل سنت ذات باری کو مخلوقات کی مماثلت سے منزہ قرار دینے میں یک زبان ہیں۔ مشبہہ وہ لوگ ہیں جو صفات باری کو صفات مخلوق کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ اہل سنت ذاتِ خداوندی کو ان ہی صفات سے متصف قرار دیتے ہیں جو خود اللہ تعالے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہیں وہ صفاتِ خداوندی کو بلا تحریف و تعطیل اور بدون تکییف و تمثیل تسلیم کرتے ہیں۔ وہ صفات الٰہی کا اثبات کرتے ہیں مگر ان کی مثل

(بقیہ حاشیہ ۱۵۰) یہی وجہ ہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ لکھنے والے قدیم مصنفین مثلاً امام اشعری وغیرہ نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ ۱۲

۲؎ شیخ شہاب الدین احمد بن محمد بن مری نے جو فتوی امام ابن تیمیہ سے فرقہ نصیریہ سے متعلق دریافت کیا تھا اس میں ذکر کیا ہے کہ سنہ ۔۔۔ میں اکابر شیعہ میں سے ایک نے یہ اشعار پڑھ کر سنائے تھے۔ یہ فتوی امام موصوف کے رسائل تسعہ میں بمقام قاہرہ سنہ ۱۳۲۳ھ میں چھپ چکا ہے۔ دیکھیے مذکورہ رسائل ص ۹۴۔ ۹۸۔ غلطی سے اس میں سلمان کی بجائے سلیمان لکھا گیا ہے ۱۲

کسی کو قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح وہ ذاتِ خداوندی کو عیوب و نقائص سے منزہ مانتے ہیں مگر صفات سے معطل قرار نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ - ۱۱) (اس کی مثل کوئی چیز نہیں)

اس آیت سے ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو صفاتِ الٰہی کو صفاتِ مخلوق کی مثل قرار دیتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا

هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (وہ سننے والا دیکھنے والا ہے)

یہ آیت ان لوگوں کی تردید میں وارد ہوئی ہے جو اللہ تعالےٰ کو صفات سے معطل ٹھہراتے ہیں۔

منکرینِ صفات کے اوہام و خیالات

اہل سنت اللہ تعالےٰ کو صفات نقص مثلاً نیند، اونگھ، نسیان اور عجز و جہل سے منزہ مانتے اور ان صفات کمال کے ساتھ موصوف قرار دیتے ہیں جو کتاب و سنت میں وارد ہوئی ہیں۔ بخلاف ازیں منکرین صفات ذات الٰہی کی صفات کا اثبات کرنے والے ہر شخص کو مُشَبِّہَہ ٹھہراتے ہیں۔ باطنیہ یہاں تک کہتے ہیں کہ

"جو شخص اللہ تعالےٰ کو اسماء حسنیٰ سے موسوم کرتا ہے وہ مشبہہ میں سے ہے اور جو ذات باری کو حیؔ اور علیم قرار دیتا ہے وہ اس کو زندہ اور صاحب علم لوگوں کی مثل ٹھہراتا ہے جو اللہ تعالےٰ کو سمیع و بصیر کہتا ہے وہ اسے آدمی کی مانند تصور کرتا ہے اور جو خدا کو رؤفؔ و رحیمؔ تسلیم کرتا ہے وہ اسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مماثل ٹھہراتا ہے۔ ہم ذاتِ خداوندی کو موجود بھی نہیں کہتے اس لیے کہ اس طرح باقی موجودات صفتِ وجود میں اس کی شریک ٹھہریں گی۔ لیکن ہم اسے معدوم ۔ حیؔ اور میت بھی نہیں کہتے۔"

ہم باطنیہ کے ان نظریات کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس سے ذات خداوندی کا ممتنع الوجود ہونا لازم آتا ہے اس لیے کہ جس طرح نقیضین کا اجتماع ممکن نہیں اسی طرح ان کا ارتفاع بھی ممنوع ہے۔ نظر بریں واجب الوجود کی نفی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ممتنع الوجود ہے۔ باطنیہ کا یہ قول کہ ذات باری یہ نہیں اور وہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے حقایق کی نفی نہیں ہوتی بلکہ یہ فریب دہی کی ایک بدترین قسم ہے۔ جو شخص ذاتِ باری کو "لاموجود و لامعدوم" قرار دیتا ہے وہ عدم وثوق پر

یقین رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ مغالطہ بازی کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) حقائق کا انکار کرنا۔

(۲) حقائق میں توقف کرنا اور کوئی فیصلہ صادر نہ کرنا۔

(۳) حقائق کو ظنون و اوہام کے تابع کر دینا۔

بعض علماء کے نزدیک سفسطہ کی ایک چوتھی قسم بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ

(۴) یہ کائنات ارضی جاری و ساری ہے اور اسے کہیں قرار نہیں۔

باطنیہ کی بے راہ روی کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ لفظ تشبیہ میں اجمال و ابہام پایا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر دو اشیاء کے مابین ایک قدر مشترک موجود ہے جس کی بنا پر ذہن میں وہ دونوں چیزیں ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ وہ دونوں اس قدر مشترک میں برابر ہوں۔ بخلاف ازیں اکثر اوقات اشیاء کے درمیان قدر مشترک میں تفاضل پایا جاتا ہے مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں زندہ ہیں اور فلاں فلاں صاحب علم ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ علم و حیات میں ایک دوسرے کی مثل ہوں اور نہ یہ کہ ایک شخص کی حیات و علم بعینہ دوسرے کی حیات و علم ہے۔ مزید برآں اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا کہ وہ دونوں کسی موجود فی الخارج میں باہم سہیم و شریک ہیں۔ جہم بن صفوان اللہ تعالے کو ان اسماء سے موسوم نہیں کیا کرتا تھا جس سے مخلوقات کو موصوف کیا جاتا ہے البتہ وہ ذات باری کو قادر و خالق ضرور کہا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہم جبر کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک بندے میں قدرت نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اللہ تعالے باقی اشیاء کی طرح شے نہیں ہے"۔ اس سے ان کا یہ مقصود ثابت کرنا ہے کہ تشبیہ کی حقیقت اس سے منتفی ہے۔

اللہ تعالے نے کتاب عزیز کے متعدد مقامات پر تمثیل کی نفی کی ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل آیات قابل ملاحظہ ہیں۔

(۱) لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ-۱۱) (اس کی مانند کوئی چیز نہیں)

(۲) هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (مریم-۶۵) (کیا خدا کا کوئی ہم نام تجھے معلوم ہے)

(۳) لَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ (الخلاص-۴) (اس کا کوئی ثانی نہیں)

(۴) فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (البقرۃ - ۲۲) (خدا کے لیے شریک نہ ٹھہراؤ)

(۵) فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (النحل - ۷۴) (خدا کے لیے مثالیں نہ بیان کرو)

جہاں تک جسم و جوہر اور تحیز و جہت کے الفاظ کا تعلق ہے کتاب و سنت میں نفیاً و اثباتاً ان کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ آثار صحابہ و تابعین میں بھی اس کا کوئی نشان موجود نہیں۔ سب سے پہلے ان کی نفی و اثبات کے سلسلہ میں گفتگو کرنے والے جہمیہ، معتزلہ، اہل بدعت اور فلسفہ کے مجسمہ تھے منکرین صفات نے ان امور کی نفی کی، اور اس میں اس حد تک غلو سے کام لیا کہ کتاب و سنت میں ثابت شدہ صفات مثلاً علم و قدرت، مشیت و محبت، رضا و غضب اور علو کی بھی نفی کر ڈالی انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ نہ وہ دیکھتا ہے اور نہ کلام کرتا ہے۔ خواہ قرآن ہو یا کچھ اور

مثبتین صفات کے افکار و آراء

اس کے عین برخلاف صفات الٰہی کا اثبات کرنے والے نے ان صفات کا بھی اقرار کر لیا اللہ و رسول نے جن کی نفی کی تھی۔ مثلاً ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ کو دنیا میں ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ بقول ان کے اللہ تعالیٰ مصافحہ و معانقہ کرتا ہے اور عرفہ کی شام اونٹ پر سوار ہو کر نازل ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ نادم ہوتا، روتا اور اظہار رنج و الم بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ صفات ہیں جو بنی نوع انسان کے ساتھ مختص ہیں۔ ہر ایسی صفت جو انسانوں کا خاصہ ہو وہ صفت نقص ہے اور ذاتِ باری نقص سے منزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ احد و صمد ہے۔ اَحَد سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کوئی اس کا نظیر و مثیل نہیں "صمد" جمیع صفاتِ کمال کو شامل ہے۔

مشہور لغوی اصمعی اور ابوزید کے قول کے مطابق جسم جَسَد یعنی بدن کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ (المنافقون - ۴)

جب تو انھیں دیکھے تو ان کے جسم تجھے پسند آتے ہیں۔

نیز فرمایا۔ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرۃ - ۲۴۷)

اسے علم اور جسم میں فراخی عطا کی۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

عِجلاً جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ (الاعراف - ۱۴۸) (ایک جسم دار بچھڑا تھا جس کی آواز تھی۔

جسم کے لفظ سے بعض اوقات کثافت مراد لی جاتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے ھٰذَا اَجْسَمُ مِنْ ھٰذَا (یہ اس سے زیادہ کثیف ہے) متکلمین کے یہاں لفظِ جسم بعد ازاں عام تر معنی میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ انہوں نے ہوا کو بھی جسم قرار دیا۔ حالانکہ عرب اسے جسم نہیں کہتے۔ متکلمین اس امر میں مختلف الخیال ہیں کہ جسم کسے کہتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کے یہاں حسب ذیل مذاہب پائے جاتے ہیں۔

(۱) جوہر فرد کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک جسم جواہر منفردہ متناہیہ سے مرکب ہے۔ نظام جسم کو جواہر غیر متناہیہ سے مرکب قرار دیتا ہے۔ وہ "طفرہ" کا قائل ہے جو اس کی معروف اصطلاح ہے۔

(۲) بعض فلاسفہ کی رائے میں جسم مادہ و صورت سے مرکب ہے۔

(۳) ہشامیہ، کلابیہ، نجاریہ، ضراریہ اور بہت سے کرامیہ کے نزدیک جسم کسی چیز سے بھی مرکب نہیں۔ اکثر کتب میں یہ تیسرا مذہب مذکور نہیں۔

ان میں صحیح مسلک یہ ہے کہ جسم کسی چیز سے بھی مرکب نہیں۔ اسی بنا پر جوہر فرد کی نفی کرنے والے کہتے ہیں۔ کہ حیوانات، نباتات اور معدنیات سب اعیان مخلوقہ ہیں۔ جوہر فرد کا اثبات کرنے والے کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اعراض و صفات کو پیدا کرتے ہیں۔ جواہر باقی رہتے ہیں اور ان کی ترکیب بدل جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک حقیقت دوسری حقیقت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ جنس بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ بخلاف ازیں جواہر باقی رہتے ہیں اور اللہ تعالےٰ ان کی ترکیب کو تبدیل کر دیتے ہیں۔

اکثر فلاسفہ کے نزدیک ایک جسم دوسرے جسم میں اور ایک جنس دوسری جنس میں تبدیل نہیں ہوتی۔ جس طرح نطفہ پہلے منجمد خون میں تبدیل ہوتا ہے۔ پھر گوشت کے ٹکڑے کی صورت اختیار کرتا ہے اور پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں یہ فقہاء اور اطباء کا قول ہے۔ میرے علم کی حد تک تمام اہل مناظرہ اس بات پر متفق ہیں کہ جسم کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اگرچہ یہ رائے ان کے

یہاں قضا تنقیح یہ ہے کہ آیا جسم اجزائے منفردہ سے مرکب ہے یا مادہ و صورت سے یا کسی سے بھی مرکب نہیں۔

عقلاء کے تین اقوال

عقلاء اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں کہ کیا کوئی ایسی چیز موجود ہو سکتی ہے جو قائم بنفسہ ہو۔ مگر اس کی طرف اشارہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ نہ اسے دیکھا جا سکتا ہو۔ اس میں تین اقوال ہیں۔

پہلا قول:۔ یہ ممکن نہیں بلکہ ممتنع ہے۔

دوسرا قول:۔ یہ ان محدثات ممکنہ میں ممتنع ہے جو وجود و عدم دونوں کو قبول کرتی ہیں۔

تیسرا قول:۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ممکن و واجب دونوں میں ممکن ہے۔ یہ بعض فلاسفہ کا قول ہے۔ اہل مذاہب میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ یہ ایسی چیزوں کو مجردات و مفارقات سے موسوم کرتے ہیں۔

اکثر عقلاء کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ایسا صرف ذہنی اشیاء میں ممکن ہے۔ خارجی موجودات میں نہیں اس کا ثبوت اس روح سے ملتا ہے جو عند الموت بدن انسانی سے الگ ہوتی ہے۔ جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے فلاسفہ ان کو عقول نفوس مجردہ اور جواہر عقلیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اہل اسلام اور دیگر اہل ادیان و مذاہب ملائکہ کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ نور سے مخلوق ہیں۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (الانبیاء۔۲۶)

انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں کو) اولاد بنا لیا ہے۔ وہ (اولاد سے) پاک ہے۔ فرشتے تو اس کے با عزت بندے ہیں۔

ملائکہ کا ذکر کتاب عزیز کے متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ اس کے عین برخلاف فلاسفہ جبریل امین کو عقل فعال یا ان خیالی صورتوں اور کلام الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں جن کا گذر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و دماغ پر ہوا کرتا تھا۔ جیسے سویا ہوا آدمی خواب میں طرح طرح کی چیزیں دیکھتا ہے۔ جو شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ سے کلیۃً آگاہ ہے وہ فلاسفہ کی ضلالت

وجہالت سے آشنا ہے اور بخوبی جانتا ہے کہ وہ مشرکین کی نسبت ایمان سے بعید تر ہیں
جب جسم کی حقیقت کے بارے میں اہل مناظرہ کا اختلاف واضح ہو گیا تو اب اس میں مجال شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ اجزاء منفردہ سے مرکب ہے اور نہ مادہ وصورت سے۔ نہ وہ قابل انقسام ہے اور نہ تفریق و انفصال کو قبول کرتا ہے ایسا بھی نہیں کہ پہلے وہ جدا جدا تھا پھر یکجا ہو گیا۔ بخلاف ازیں وہ احد وصمد ہے اور وہ تمام معانی اس سے منتفی ہیں جن کا ترکیب کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ مگر فلاسفہ اور ان کے ہمنوا اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ جب وہ صفات سے موصوف ہے تو وہ مرکب ہو گا اور جب اس کی حقیقت ایسی ہے جو فقط وجود نہیں تو وہ مرکب ٹھہرے گا۔

اس کے جواب میں صفات کا اثبات کرنے والے مسلمان کہتے ہیں نزاع لفظ "مرکب" میں نہیں اس لفظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ غیر نے اسے ترکیب عطا کی اور کوئی عاقل نہیں کہتا کہ اللہ تعالے اس لحاظ سے مرکب ہے۔ ذات خداوندی کے جامع صفات کمال ہونے مثلاً علم۔ قدرت اور حیات سے موصوف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مرکب ہے۔ لغت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی بخلاف ازیں مرکب وہ ہے جس کے اجزاء الگ الگ ہوں اور پھر اسے اختلاط یا غیر اختلاط کے طریقہ سے یکجا کر دیا جائے جس طرح ماکولات، مشروبات، ادویات، تعمیرات، لباس اور زیور کو ترکیب دے کر بنایا جاتا ہے۔ مزید براں تمام عقلاء ذات باری کے لیے متعدد صفات کا اثبات کرنے میں یک زبان ہیں مثلاً معتزلہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالے حی، عالم اور قادر ہے اس کا حی ہونا اور ہے اور قادر ہونا چیزے دیگر۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالے عقل بھی ہے اور عاقل اور معقول بھی وہ لذت بھی ہے اور لذیذ و ملتذ بھی۔

ذات باری کے مرکب ہونے میں اختلاف آراء

محقق طوسی شرح اشارات میں رقمطراز ہے

"علم عین معلوم ہے"۔

طوسی کا یہ قول صریح عقل کے منافی ہے۔ فلاسفہ صرف ترکیب کے مفہوم سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ترکیب کی نفی کے لیے ان کے یہاں کوئی دلیل موجود نہیں وہ سب سے بڑی

دلیل اس ضمن میں یہ پیش کرتے ہیں کہ مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے اجزاء اس کے غیر ہیں اور جو غیر کا محتاج ہو وہ واجب بنفسہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ معلول ہوگا۔ اس دلیل کے سب الفاظ کمزور ہیں۔ مثلاً واجب بنفسہ وہ ہے جس کا کوئی فاعل نہ ہو اور نہ علت فاعلہ۔ وہ کسی الشی چیز کا محتاج نہ ہو جو اس سے مباین ہو۔ وہ قائم بنفسہ ہو اور کسی مباین چیز کا محتاج نہ ہو۔ پہلی اور دوسری تعریف کی بنا پر صفات کا واجب الوجود ہونا لازم آتا ہے۔ تیسری تعریف کی بنا پر جو ذات ان صفات سے موصوف ہے وہی واجب ٹھہرے گی صرف صفات کو واجب الوجود نہیں کہہ سکتے۔ مگر وہ ذات سے جدا بھی نہیں۔

باقی رہا فلاسفہ کا یہ قول کہ جب خدا کی ذات وصفات ہیں تو وہ مرکب ہوگا۔ اور مرکب اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور اجزاء اس کے غیر ہوتے ہیں"۔ اس میں غیر کا لفظ مبہم اور قابل توضیح ہے۔ اس سے مباین مراد ہے۔ باہم غیر وہ دو چیزیں ہیں جو زمان و مکان یا وجود کے اعتبار سے جدا ہو سکیں اور ایک دوسرے کا عین نہ ہوں یا وہ دو چیزیں کہ ان دونوں میں سے ایک کو جانتے ہوئے دوسری سے لاعلم رہنا جائز ہو یہ اکثر معتزلہ اور ان کے اعوان و انصار کی رائے ہے۔ ائمہ سلف مثلاً امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لفظ غیر کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے اور اس پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم الٰہی کو اس کا غیر نہیں کہتے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر نہیں۔

نظر بریں سلف صالحین یوں نہیں کہتے کہ علم آلہی عین ذات ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ وہ غیر ذات ہے۔

جہمیہ کا یہ قول ہے کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے اس کا پیدا کردہ ہے ماسوی اللہ میں کلام خداوندی بھی داخل ہے لہذا وہ بھی مخلوق ہے۔ بخلاف ازیں احادیث نبویہ سے صفات آلہی مثلاً عزت و عظمت خداوندی کی قسم کھانے کا جواز ثابت ہوتا ہے حالانکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا"۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوئی کہ صفات باری کو علی الاطلاق غیر نہیں کہہ سکتے۔ جب غیر سے مراد یہ ہے کہ وہ بذات خود وہی نہیں تو بلاشبہ علم اور ہے اور عالم اور اسی طرح کلام و متکلم بھی ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ احتیاج سے تلازم مراد ہے یعنی وہ ایک دوسرے کے بغیر پائے نہیں جا سکتے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ ایکدوسرے

میں مؤثر بھی ہوں۔ مثلاً باپ ہونا اور بیٹا ہونا کہ ایک کا تعلق دوسرے کے بغیر ممکن نہیں اس لیے کہ جہاں ابوت (باپ ہونا) ہوگی وہاں بنوت (بیٹا ہونا) بھی ہوگی۔ مرکب میں جو اشتراک پایا جاتا ہے وہ معلوم ہو چکا۔ جب یوں کہا جائے کہ "اگر وہ عالم ہے تو ذات اور علم سے مل کر بنا ہے"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذات اور علم پہلے الگ الگ تھے اور پھر جمع ہو کر مرکب ہو گئے یہ بھی مراد نہیں کہ یہ ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں بخلاف ازیں مقصود یہ ہے کہ عالم ہونے کی صورت میں ایک ذات ہے اور ایک علم جو اس کے ساتھ قائم و وابستہ ہے۔

فلاسفہ کی تردید

فلاسفہ کا یہ قول کہ "مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ مجموع و مرکب کے محتاج اجزاء ہونے کا یہ مطلب نہیں۔ کہ اجزاء نے اسے جنم دیا یا اجزا اس کے بغیر بھی موجود تھے۔ یا یہ کہ اجزاء اس میں مؤثر ہیں بخلاف ازیں مقصود یہ ہے کہ وہ مجموعہ کے بغیر پایا نہیں جاتا۔ جب یہ کہا جائے "ایک چیز اپنے آپ کی محتاج ہے" اور اس کا مطلب بھی لیا جائے جو ہم نے بیان کیا تو یہ ممتنع نہیں بلکہ تقاضائے حق و صواب ہے اس لیے کہ نفس واجب اپنے آپ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جب کہا جائے "اللہ تعالیٰ واجب بنفسہ ہے" تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے نفس نے اس کے وجوب کو جنم دیا۔ بلکہ مقصود و مراد یہ ہے کہ وہ بذات خود موجود ہے اور غیر کا دست نگر نہیں۔ جب کہا جائے "دس دس کے محتاج ہیں" تو اس میں غیر کا ہرگز احتیاج نہیں۔ جب کہا جائے کہ دس ایک کے محتاج ہیں جو ان کا ایک جزو ہے تو اجزاء کی جانب یہ احتیاج و افتقار اس احتیاج سے بڑھ کر نہیں جو اسے مجموعہ کی جانب حاصل ہے۔ نظر بریں خالق و مبدع کا مستلزم صفات ہونا کسی حجت کی نفی نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ اس تلازم کو فقر و احتیاج سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

صفات قائمہ بالموصوف اس کا جزو نہیں

مزید برآں صفات قائمہ بالموصوف کو جزو قرار دینا لغت کے خلاف ہے۔

یہ صرف فلاسفہ کی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ تاہم اگر ہم فلاسفہ کے اس مفروضہ کو تسلیم کر لیں تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں۔ فلاسفہ اور ان کے اتباع کی تخویف و تہویل اس ضمن میں ناقابل التفات

ہے۔ اللہ تعالے کے علم بالاشیاء کی نفی کرنے والے کہتے ہیں کہ اس سے "تکثیر" لازم آتی ہے اس کے پہلو بہ پہلو جو لوگ اللہ تعالے کے عالم جزئیات ہونے کی نفی کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس سے خدا کا تغیر پذیر ہونا لازم آتا ہے۔ گویا وہ تکثیر و تغیر کے بھاری بھرکم الفاظ سے دوسروں کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں الفاظ حد درجہ مبہم ہیں اور ان کا مطلب واضح نہیں۔ اس سے وہ دوسروں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ صفات کا اثبات کرنے سے الہ کا تعدّد و تکثّر لازم آتا ہے نیز یہ کہ اللہ تعالے انسان کی طرح تغیر پذیر ہے اور وہ اس طرح بدلتا رہتا ہے جیسے زرد ہو کر آفتاب کا رنگ بدل جاتا ہے۔ ان اقوال کا مخاطب اس حقیقت سے یکسر ناآشنا ہے کہ اللہ تعالے جب کسی حادث چیز کو پیدا کرتا ہے۔ اپنے بندوں کی دعا سنتا یا اپنی مخلوقات کو دیکھتا ہے تو فلاسفہ اسے تغیر سے موسوم کرتے ہیں ان کی نگاہ میں حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہونا اور اطاعت شعار سے راضی ہونا بھی تغیر ہے۔ مزید براں یہ نفی و انکار کسی دلیل پر مبنی نہیں اور لطف یہ ہے کہ وہ خود ہی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں شرعی و عقلی دلائل و براہین سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ خلاصہ کلام! مدعی کا یہ دعویٰ کہ جس چیز کی طرف اشارہ کیا جائے وہ جسم مرکب ہے قطعی طور سے بے بنیاد ہے۔

جمہور اہل اسلام جو اللہ تعالے کو مجسم قرار نہیں دیتے کہتے ہیں کہ جو شخص خدا کو جسم کہتا ہے اور اس سے یہ مراد لیتا ہے کہ وہ موجود ہے یا قائم بنفسہ ہے یا اسے جوہر کہہ کر یہ مراد لیتا ہے کہ وہ قائم بنفسہ ہے تو وہ الفاظ میں خطا کار ہے معنی میں نہیں۔ جب وہ یہ کہے کہ ذات خداوندی جواہر منفردہ سے مرکب ہے تو اس کے کفر میں شبہ ہے۔

جسم کو جواہر سے مرکب قرار دینے والوں کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ جسم کا مسمّٰی کیا ہے؟

(۱) بعض کی رائے یہ ہے کہ جب جوہر واحد کے ساتھ کسی اور چیز کو ملایا جائے تو اسے جسم کہتے ہیں ابن الباقلانی۔ ابو یعلی اور دیگر علماء کا نقطہ نظر یہی ہے۔

(۲) دوسرا مذہب یہ ہے کہ دو یا زیادہ جوہر جب مل جاتے ہیں تو جسم تشکیل پاتا ہے۔

(۳) تیسرا مذہب یہ ہے کہ چار یا چار سے زیادہ جواہر کے ملنے سے جسم قرار پاتا ہے۔

(۴) چوتھے مذہب کے مطابق چھ یا چھ سے زیادہ جواہر کا ہونا ضروری ہے۔

(۵) جسم کی تشکیل کے لیے آٹھ جواہر کا وجود ناگزیر ہے۔

(۶) چھٹا مذہب یہ ہے کہ جسم کی ساخت کے لیے سولہ جواہر مطلوب ہیں۔

(۷) ساتویں مذہب کے مطابق جسم کم از کم تبیس جواہر سے مرکب ہوتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ لفظ جسم میں بے شمار لغوی۔ اصطلاحی، عقلی اور شرعی تنازعات پائے جاتے ہیں جن کا تقاضا ہے کہ اس ضمن میں باقی مباحث کو چھوڑ کر صرف کتاب و سنت کی پیروی کی جائے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (اٰل عمران - ۱۰۳)

سب کے سب خدا کی رسی کو تھام لو اور فرقے نہ بنو

نیز فرمایا۔

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الاعراف - ۳)

جو (کتاب) تمہاری جانب تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اسکی پیروی کرو

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء - ۶۱)

جب انھیں کہا جاتا ہے کہ رسول کی طرف آؤ اور اس (کتاب) کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے تو تو دیکھتا ہے کہ منافقین تجھ سے روگردانی اختیار کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

جو شخص قرآن کریم پڑھتا اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے اللہ تعالےٰ اس کا ضامن ہے کہ وہ دنیا میں گمراہ نہ ہوگا اور نہ آخرت میں اجر و ثواب سے محروم رہے گا۔ پھر یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ - ۱۲۴)

جو میرے ذکر سے منہ موڑتا ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے

جسم، جوہر اور جہت کے الفاظ سے احتراز

بہر کیف اللہ و رسول نے جس بات کا اثبات کیا ہے ہم اس کا اثبات

کرتے ہیں اور جس کی نفی کی ہے اس کی نفی کرتے ہیں۔ ہم اثبات و نفی میں لفظاً و معناً نصوص کے پیرو ہیں۔ جہاں تک ان الفاظ کا تعلق ہے جو ان کے مخترعین کے یہاں مختلف فیہا ہیں مثلاً جسم، جوہر، تحیز، جہت، ترکّب اور تعین وغیرہا ہم نفیاً و اثباتاً اس وقت تک ان کا اطلاق نہیں کریں گے جبتک یہ معلوم نہ کرلیں کہ ان کے قائل کا مقصود کیا ہے۔ اگر وہ نفی و اثبات میں صحیح اور موافق نصوص معنے مراد لیتا ہو تو ہم اس معنی کو صحیح قرار دیں گے اور اس من گھڑت اور مجمل لفظ کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے تاہم عند الحاجت فریق مقابل کی اصطلاح کے مطابق ہم اس کو استعمال کریں گے بشرطیکہ قرائن کی مدد سے مفہوم صاف سمجھ میں آتا ہو۔

مثلاً مخاطب ایسا شخص ہو جو صرف اسی لفظ سے مفہوم کو سمجھ سکتا ہو۔ تاہم ان الفاظ کو غلط معانی پہنانا صریح قسم کی بے راہ روی ہے۔ اگر مخاطب ایسے الفاظ سے حق و باطل دونوں قسم کے معانی مراد لیتا ہو تو اس کے سامنے حق کو باطل سے نکھار دیا جائے۔ اگر دو شخص ایک معنی میں متحد الخیال ہوں اور دلائل میں اختلاف ہو تو اقرب الی الصواب وہ ہے جس کی تائید لغت سے ہوتی ہو۔

متحیز لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جسے کسی چیز نے گھیر رکھا ہو۔ قرآن کریم میں ہے «اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ» (متحیز لازماً وہ چیز ہے جس پر کسی وجودی چیز نے احاطہ کر رکھا ہو۔ چونکہ مخلوقات میں سے کوئی چیز ذات باری کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ لہذا لغوی اعتبار سے خداوند تعالیٰ کو متحیز نہیں کہہ سکتے۔

متکلمین کی اصطلاح میں متحیز اعم ہے۔ وہ ہر جسم کو متحیز کہتے ہیں اور جسم ان کی اصطلاح وہ ہے جس کی طرف اشارہ کیا جاسکے بنابریں ان کے نزدیک زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ متحیز ہے مگر لغت سے اس کی تائید نہیں ہوتی وہ حیز سے امر معدوم مراد لیتے ہیں اور مکان سے امر موجود جو حیز عدمی کے خلاف ہو لہذا جملہ اجسام جو کسی موجود چیز میں واقع نہیں وہ کسی مکان میں نہیں۔ امام فخر الدین رازی حیز کو کبھی موجود قرار دیتے تھے اور کبھی معدوم۔

کیا اللہ تعالیٰ متحیّز ہے؟

عقل و نقل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے جدا ہے اس لیے کہ وہ مخلوقات سے قبل بھی موجود تھا۔ پیدا کرنے کے بعد یا تو وہ ان مخلوقات میں داخل ہوگیا ہوگا یا مخلوقات اس میں سماگئی ہوگی۔ یہ دونوں باتیں ممتنع ہیں لہذا ثابت ہوا کہ وہ مخلوقات

سے جدا ہے۔ اس کی نفی کرنے والے کہتے ہیں کہ نہ وہ مخلوقات میں داخل ہے نہ ان سے جدا ہے
یہ بات خلاف عقل ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ عقلاً ممتنع نہیں بلکہ اس کو ممنوع قرار دینا قوت وہمیہ
کی کرشمہ سازی ہے۔ بایں ہمہ ان کے افکار و آراء میں تناقض پایا جاتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ اگر اللہ
تعالیٰ عرش پر ہے تو وہ جسم ہوگا کیونکہ اس کا آس پاس سے متحیز ہونا ضروری ہے۔ اس کے جواب
میں کہا جائے گا یہ بات عقل سے ثابت ہے کہ فوق العالم ایک ایسے موجود کا اثبات جو جسم نہیں ہے
اقرب الی العقل ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک ایسے قائم بنفسہ کا اثبات کیا جائے جو نہ اس کائنات
ارضی سے جدا ہے اور نہ اس میں داخل ہے۔

اسی طرح لفظ جہت سے امر موجود بھی مراد ہوتا ہے جیسے فلک اعلیٰ اور امر معدوم بھی جیسے ما
وراء العالم۔ دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر جسم ایک جہت میں ہے۔ جب
پہلے معنی مراد لیے جائیں تو ایک جسم کا دوسرے جسم میں ہونا ممتنع ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ
جہت میں ہے اور اس سے امر موجود مراد لے اس لیے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے اس کی مخلوق ہے
تو ایسا شخص یقیناً غلطی پر ہوگا۔ اور اگر جہت سے امر معدوم یعنی ما فوق العالم مراد لے اور یوں
کہے کہ اللہ تعالیٰ فوق العالم ہے تو یہ قول درست ہوگا۔ چونکہ فوق العالم اس کے سوا دوسری
کوئی چیز موجود نہیں بنا بریں اللہ تعالیٰ موجودات میں سے کسی چیز میں حائل نہ ہوگا۔

مُشبّہہ کون ہیں؟

مذکورہ صدر بیانات اس بات کے شاہد عدل ہیں کہ شیعہ مصنف
اور اس کے ہمنوا اگر مُشبّہہ سے وہ لوگ مراد لیتے ہیں جو خدا کے
لیے ایسے اسماء کا اثبات کرتے ہیں جن سے بندوں کو بھی موسوم کر سکتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ
ہوگا کہ نہ صرف باقی تمام اسلامی فرقے بلکہ خود شیعہ بھی مُشبّہہ ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ اور
اگر مشبہہ سے اس کی مراد وہ لوگ ہیں جو صفات باری کو انسانی صفات کی مثل قرار دیتے ہیں
تو ان کے گمراہ ہونے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ایسے لوگ شیعہ
میں باقی فرقوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی پائے جاتے ہیں۔

شیعہ مصنف کی یہ ستم ظریفی موجب حیرت و استعجاب ہے کہ وہ بعض الفاظ کو استعمال تو
کرتا ہے مگر ان کے معنی اور موارد استعمال سے قطعی نابلد ہوتا ہے۔ وہ خود ہی ایک اساس قائم

کرتا ہے اور پھر اسی مفروضہ اساس پر اپنے مزعومات کی عمارت استوار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

شیعہ مصنف جہاں حشویہ۔ مُشَبِّہَہ کا ذکر کرتا ہے وہاں اس کی مراد عراق و بغداد کے حنابلہ ہوتے ہیں یہ اس کی جہالت کا بیّن ثبوت ہے اس لیے کہ حنابلہ باقی اہل سنت سے کسی قول میں بھی منفرد نہیں ہیں اور وہی عقائد رکھتے ہیں جو باقی اہل سنت کے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے کہ اہلسنت والجماعت کا مذہب قدیم بھی ہے اور معروف و مشہور بھی۔ یہ اس وقت بھی معروف تھا جب امام ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ صحابہ کرام کا مذہب ہے جنھوں نے اسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا۔ جو اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ اہل السنت والجماعت کے نزدیک بدعتی ٹھہرے گا اس لیے کہ اجماع صحابہ کی حجیّت میں سب اہل سنت متحد الخیال ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ البتہ علماء اس امر میں مختلف الخیال ہیں کہ آیا صحابہ کے بعد آنے والے حضرات (تابعین و تبع تابعین) کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟۔

حضرت امام احمدؒ بن حنبل کا دورِ ابتلاء

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو امام اہل سنت اور امام الصابرین قرار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کسی مسئلہ میں باقی ائمہ سے منفرد تھے یا آپ نے بذاتِ خود کوئی قول گھڑ لیا تھا بخلاف ازیں اس کی وجہ یہ تھی کہ سنت آپ سے پہلے موجود بھی تھے اور لوگ اس سے آشنا چلے آتے تھے آپ نے صرف یہ کیا کہ سنت کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ترک سنت پر مجبور کیا گیا تو اس ابتلاء میں صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھا باقی ائمہ دورِ ابتلاء سے قبل وفات پا چکے تھے۔ جب تیسری صدی ہجری کے اوائل اور خلیفہ مامون اس کے بھائی معتصم اور واثق باللہ کے عہد خلافت میں صفات الٰہی کا انکار کرنے والے جہمیہ نے انکار صفات کا بیڑا اٹھایا —— جسے متاخرین شیعہ نے بھی تسلیم کر لیا تھا —— اور بہت سے امراء و حکام بھی اس ضمن میں جہمیہ کے ہمنوا بن گئے تو اہل سنت نے اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب اقتدار نے بعض علماء کو قتل کی دھمکی دی۔ بعض کو قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالا اور طرح طرح سے ڈرایا دھمکایا اور لالچ دلا کر اس

نظریہ سے بار رکھنا چاہا۔ امام احمد بن حنبل اپنے عقیدہ پر ڈٹے رہے جس کے نتیجہ میں انھیں عرصہ دراز تک محبوس رکھا گیا۔

آخر مناظرہ کی ٹھانی اور اس مقصد کے لیے معتزلی علماء کو بلایا مگر سب نے منہ کی کھائی۔ امام اہل سنت کے سامنے لاجواب ہوگئے اور آپ کو دلائل کے ساتھ قائل نہ کرسکے۔ دوسری جانب امام موصوف نے ان کی ایک ایک غلطی کی قلعی کھول کر رکھ دی اور ان کے دلائل کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں۔ مخالفین نے مناظرہ کے لیے بصرہ اور دیگر اسلامی بلاد و امصار کے بڑے بڑے ماہرین علم الکلام کو بلایا تھا۔ جن میں حسین نجار کے تلمیذ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

یہ مناظرہ صرف فرقہ معتزلہ ہی کے خلاف نہ تھا بلکہ جہمیہ کے سب فرقے مثلاً معتزلہ نجاریہ ضراریہ اور اسی طرح مرجئیہ کے سب فرقے امام کے خلاف امنڈ آئے تھے۔ جہمیہ و معتزلہ کے مابین نسبت یہ ہے کہ ہر جہمی کا معتزلی ہونا ضروری نہیں اور ہر معتزلی جہمی ضرور ہوتا ہے۔ البتہ جہم کا قدم نفی صفات میں معتزلہ سے آگے ہے اس لیے کہ وہ اسماء و صفات الٰہی دونوں کی نفی کرتا ہے بخلاف ازیں معتزلہ صرف صفات کے منکر ہیں۔ بشر مریسی کبار جہمیہ میں سے تھا اور مرجیہ کا ہمنوا تھا۔ وہ معتزلی نہ تھا۔ حامی سنت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مبتلائے مصائب ہونے کی وجہ سے مذکورہ صدر مسائل میں بڑے زور کے معرکے برپا ہونے لگے۔ انہی حوادث میں مبتلا ہونے کی بنا پر امام احمد اور ان کے اتباع کیا مام بارگاہ ربانی میں بڑے اونچے مرتبہ پر فائز ہوئے۔
روافض نے اپنی ڈفلی الگ بجانا شروع کی ہر زاویۂ نگاہ کے مسلمانوں کو تنقید شدید کا نشانہ بنایا اور کہنے لگے کہ وہ اصول و فروع دونوں کو ترک کرچکے ہیں اور صرف شیعہ ہی ایک ایسا فرقہ ہے جو جرح و قدح سے بالا ہے۔ حالانکہ کرۂ ارضی کے تمام سلیم العقل مسلمان اس امر میں اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ اہل قبلہ کے تمام فرقوں میں شیعہ کا گروہ جہالت و ضلالت اور کذب و بدعت میں سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ ہر شر سے قریب تر اور ہر خیر سے بعید تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو الحسن اشعری نے جب مختلف فرقوں کے عقاید و افکار پر "مقالات الاسلامیین" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تو سب سے پہلے شیعہ کے عقائد کا ذکر کیا اور اسے اہل السنت والحدیث

کے افکار و آراء پہ ختم کیا اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا کہ وہ خود بھی اہل السنت والحدیث کے عقائد رکھتے ہیں اور اسی مسلک پہ گامزن ہیں۔

مذکورہ صدر بیانات اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ شیعہ مصنف کا اہل الآثارؒ والاثبات کو مشبہہ کے نام سے موسوم کرنا بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے شیعہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کے قائل کو اس لیے ناصبی کہتے ہیں کہ ان کی رائے میں حضرت علی کی خلافت کا عقیدہ اسی صورت میں درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جب خلفاء ثلاثہ سے براءت کا اظہار کیا جائےؒ۔ حالانکہ ناصبی در اصل وہ ہے جو اہل بیت سے بغض و عناد رکھتا ہوؒ۔ اسی طرح مشبہہ وہ ہیں جو صفات الٰہی کو بندوں کی صفات کی طرح خیال کرتے ہیں۔

---

۱ اہل الآثار وہ ہیں جو خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث و آثار کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ نیکی کی تعلیم دینے اور خدا کی طرف سے ہدایت اور دین حق دے کر مبعوث کیے گئے تھے۔ اہل الاثبات وہ ہیں جو اللہ و رسول کے ثابت کردہ غیبی امور کا اثبات کرتے ہیں۔ صفات الٰہی بھی غیبی امور میں سے ہیں اور وہ ان پر "لیس کمثلہ شیئ" کی شرط کے مطابق ایمان رکھتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ صفات کی تاویل کرتے ہیں اور نہ ان میں تبدیلی کا ارتکاب کرتے ہیں اس لیے کہ مخلوقات میں غیبی امور کا علم رکھنے والا اللہ و رسول سے زیادہ اور کوئی نہیں ۱۲

۲ جیسا کہ ہم قبل ازیں علامہ مامقانی شیعہ عالم کی کتاب تنقیح المقال ج ۱ ص ۲۰۷ کے حوالہ سے ذکر کر چکے ہیں ۱۲

۳ اہل بیت کے ساتھ عظیم ترین بغض یہ ہے کہ ان پر جھوٹ کا طوفان باندھا جائے اور دین میں ایک ایسے فرقہ کی طرح ڈالی جائے جو ان کے جد امجد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے ٹکراتا ہو۔ اور پھر اس سے بڑھ کر ظلم و بہتان اور کیا ہوگا کہ امت محمدی کے ان چیدہ و برگزیدہ اصحاب کو مورد طعن بنایا جائے۔ جو حضرت علی کے بھائی اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اہل بیت کے ساتھ یہی وہ بدترین بغض ہے شیعہ جس کا عرصہ دراز سے ارتکاب کرتے چلے آرہے ہیں اور جوں جوں زمانہ گذرتا ہے ان کا یہ بغض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ چنانچہ آپ اس کتاب میں آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نہج البلاغۃ کے اوراق مذمت صحابہ سے پر ہیں اور کوئی شیعہ عالم ایسا نہیں جس نے صحابہ کی مذمت نہ کی ہو اور ان سے براءت کا اظہار نہ کیا ہو ۱۲

اصل حقیقت یہ ہے کہ جو کسی کی مدح یا مذمت کرنا چاہتا ہو۔ اس پر لازم ہے کہ ممدوح و مذموم کا ان اسماء و القاب میں داخل ہونا ثابت کرے جن پر مدح و ذم کا انحصار ہے۔ جب وہ اسم و لقب ہی شرعاً ثابت نہ ہو اور ممدوح و مذموم کا اس میں داخل ہونا بھی متنازع ہو تو مدح و ذم دونوں باطل ٹھہرے۔

یہ امر پیش نظر ہے کہ کتاب و سنت میں ناصبہ جشویہ۔ مشبّہہ اور رافضہ کے الفاظ مذکور نہیں جب ہم رافضہ کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری مراد اس سے شیعہ فرقہ کے لوگ ہوتے ہیں ان کے سب فرقے اس میں داخل ہیں گویا رافضہ کا لفظ ان جہلاء اور محروم صدق و یقین لوگوں کے لیے علم و لقب کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیعہ مصنف کی کم سوادی

شیعہ مصنف کا "داؤد طائی" کہنا جہالت کی کرشمہ سازی ہے۔ صحیح "داؤد جواربی"[1] ہے۔ امام اشعری نے بھی اس کا یہی نام ذکر کیا ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں۔

"داود جواربی اور مقاتل بن سلیمان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ مجسم ہے اور اس کے انسان جیسے اعضاء ہیں۔ وہ گوشت پوست، خون، بال، ہڈیاں اور اعضاء و جوارح بھی رکھتا ہے مگر بایں ہمہ کوئی چیز اس جیسی نہیں"۔

ہشام بن سالم جوالیقی[2] کہتا ہے

اللہ تعالیٰ انسانی تشکل و صورت رکھتا ہے۔ مگر وہ گوشت پوست کا بنا ہوا نہیں۔ وہ ایک درخشندہ نور ہے۔ اس کے حواس خمسہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ بنا بریں اس کی سمع اور ہے اور بصر اور۔ وہ ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ منہ۔ ناک اور سیاہ بال رکھتا ہے"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

---

[1] قبل ازیں امام اشعری کی مقالات الاسلامیین اور الانساب سمعانی کے حوالہ سے جواربی کا ترجمہ مذکور ہو چکا ہے امام ذہبی کے اختصار میں جوابی کا لفظ آیا ہے جو صحیح ہے البتہ منہاج السنۃ کے اصل نسخہ میں غلطی سے یہ لفظ "الجواہری" لکھا گیا تھا۔[۱۲]

[2] جوالیقی شیعہ کا مشہور امام ہے اور ان کے یہاں اسے قطب کا مقام حاصل ہے۔ قبل ازیں اس کا ترجمہ تفصیلاً مذکور ہو چکا ہے۔[۱۲]

"امام اشعری نے یہ اقوال معتزلہ کی تصانیف سے اخذ کیے ہیں۔ اس لیے ان میں مقاتل بن سلیمان کے اصلی نظریات کی ترجمانی نہیں کی گئی۔ بلکہ انھیں بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے ورنہ مقاتل سے ایسے افکار و آراء کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ امام شافعی مقاتل کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "جو شخص علم تفسیر کا طالب ہو وہ مقاتل کا لبتہ فتراک ہو کر رہے اور جو فقہ حاصل کرنا چاہتا ہو وہ امام ابو حنیفہ کا دامن تھام لے"۔ جہاں تک داؤد طائی[۲] کا تعلق ہے وہ ایک فقیہ اور عابد و زاہد شخص تھے انھوں نے کوئی ایسی غلط بات نہیں کہی اور نہ کسی طرح سے اس میں دخل دیا۔"

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"بعض اہل سنت کا خیال ہے کہ اللہ تعالے جمعہ کی رات کو ایک بے ریش لڑکے کی شکل میں ایک گدھے پر سوار ہو کر اترتے ہیں۔ بغداد کے بعض آدمی شب جمعہ اپنے مکان کی چھت پر ایک برتن میں کچھ جو ڈال دیتے اور منتظر رہتے کہ اللہ تعالیٰ اس کی چھت پر نازل ہوں گے اس کا گدھا جو کھانے میں مشغول رہے گا۔ اور اللہ تعالے یہ پکارتے رہیں گے کہ آیا کوئی توبہ کرنے والا ہے؟

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس قسم کی باتیں یا تو سفید جھوٹ ہیں یا جہالت کی کرشمہ سازی۔ کسی عالم یا معروف آدمی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اہل سنت کے علماء تو کجا عوام بلکہ بچے بھی ایسی بیہودہ باتیں نہیں کہہ سکتے۔ اس ضمن میں کوئی جھوٹی اور ضعیف روایت بھی نقل نہیں کی گئی۔ کسی شخص نے یہ بات نہیں کہی کہ اللہ تعالے شب جمعہ ایک بے ریش لڑکے کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ یہ بے بنیاد

---

[۱] امام اشعری کا ماخذ فرقہ جات کے بارے میں ابو عیسیٰ وراق شیعہ عالم کی تحریر کردہ ایک کتاب ہے۔ وراق کا ترجمہ قبل ازیں لکھا جا چکا ہے۔ شیعہ کے یہاں مقاتل بن سلیمان ایسے بزرگوں پر افترا پردازی کچھ بھی محل تعجب نہیں بلکہ وہ اسے عبادت شمار کرتے ہیں ۱۲

[۲] ابو سلیمان داؤد بن نصیر المتوفی ۱۶۰ھ داؤد طائی کے نام سے مشہور تھے یہ بڑے فقیہ اور عابد شب زندہ دار تھے۔ یہ امام ابو حنیفہ۔ ثوری، شریک اور ابن ابی لیلے کے معاصر تھے اور ان سے استفادہ کر چکے تھے داؤد طائی کے بارے میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ "اگر وہ زمانہ ماضی میں ہوتے تو اللہ تعالے قرآن کریم میں ضرور ان کا ذکر فرماتے"۔ شیعہ مصنف کی جہالت کا اندازہ لگائیے کہ داؤد طائی اور داؤد جواربی کے مابین فرق نہ کر سکا۔

باسے "جمل اورق" (خاکستری رنگ کا اونٹ) والی حدیث کی مانند ہے یا اس حدیث کی طرح جس میں مذکور ہے کہ اللہ تعالےٰ عرفہ کی شام نازل ہوتا ہے راہ چلنے والوں سے معانقہ کرتا اور سوار ہونے والوں سے مصافحہ کرتا ہے خدا یہ حدیث گھڑنے والے کو غارت کرے۔

شیعہ مذہب جھوٹ کا پلندہ

یوں تو دنیا میں جھوٹ کی کمی نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ جھوٹ کے نو حصے یا اس سے کم و بیش شیعہ میں پائے جاتے ہیں اور ایک حصہ باقی دنیا میں[1]۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالےٰ کے پہلے آسمان پر نازل ہونے کی احادیث متواتر ہیں۔ عرفہ کی شام قریب آنے کی حدیث صحیح مسلم میں روایت کی گئی ہے مگر ہمیں اس کے نزول یا استواء کی کیفیت معلوم نہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

"فرقہ کرامیہ والے اللہ تعالیٰ کو بالائی جانب قرار دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ جو چیز کسی جہت میں ہو وہ اس جہت کی محتاج ہوگی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حادث بھی ہوگی"۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ صرف کرامیہ کا ہی مذہب نہیں بلکہ متقدمین شیعہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کے ابطال پر تم کوئی دلیل بھی نہیں لا سکتے۔ جملہ مخلوقات کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فوق العالم ہے اگرچہ وہ جہت کا لفظ بولنے سے احتراز کرتے ہیں تاہم اللہ تعالیٰ کو فوق العالم تسلیم کرنا ان کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ جیسا کہ ابوجعفر ہمدانی[2] نے امام ابوالمعالی سے کہا تھا۔

---

[1] جو شخص شیعہ کے ان اکاذیب سے آگاہ ہو جو انہوں نے مختلف ادوار و ازمنہ میں اختراع کیے اور انھیں تاریخ اسلامی میں مناسب جگہ پر فٹ کر دیا یا ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی اور ان کے اہل بیت کرام کی جانب منسوب کیا اور علاوہ ازیں وہ شیعہ کے طرز فکر و نظر سے بھی آشنا ہو مثلاً اکابر شیعہ کا گدھوں سمیت تہ خانے کے دروازہ پر کھڑے ہو کر امام غائب کے نکلنے کا انتظار کرنا وہ اس میں ذرہ بھر شک نہیں کریگا کہ مذکورہ صدر جھوٹ بھی شیعہ کا اختراع کردہ ہے کیونکہ اس کے تمام اجزاء وعن عرشیعہ طرز فکر کے ساتھ میل کھاتے ہیں اور ایسی یگانگت کے پیش نظر شیعہ مصنف ابن المطہر نے اسے اپنی تصنیف میں جگہ دی۔

[2] نام محمد بن حسن بن محمد کنیت ابوجعفر اور نسبت ہمدانی ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ حدیث اور (باقی بر صفحہ)

ابو جعفر ہمدانی کے قول کا خلاصہ یہ ہے۔

"استواء کا علم ہمیں نقلی دلائل سے حاصل ہوا ان کی عدم موجودگی میں ہم اسے معلوم نہ کر سکتے تھے"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹) صادق القول تھے۔ خراسان۔ عراق اور حجاز کے حفاظ حدیث سے علم حدیث حاصل کیا۔ ابن السمعانی کہتے ہیں۔ یہ اپنے عصر و عہد میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ ذی قعدہ ۵۳۱ھ میں وفات پائی۔ امام ذہبی نے جو اختصار کیا ہے اس میں ابو المعالی کا نام مذکور ہے مگر منہاج السنۃ کی اصل عبارت میں نام مذکور نہیں۔ ہمارے خیال میں ابو المعالی سے امام الحرمین الجوینی مراد نہیں لیے جا سکتے اس لیے کہ امام الحرمین اپنی کتاب الرسالۃ النظامیہ میں لکھتے ہیں — جیسا کہ شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۶۰۔ ۳۶۱ پر منقول ہے — امام الحرمین فرماتے ہیں۔

۵۷ "ظواہر نصوص کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علماء کی ایک جماعت آیات و احادیث نبویہ میں تاویل کی قائل ہے۔ ائمہ سلف تاویل نہیں کرتے بلکہ نصوص کو ان کے ظاہری مفہوم پر محمول کرتے ہیں۔ وہ ان کے مفاہیم و معانی کا علم خدا کو تفویض کرتے ہیں ہمارا ذاتی زاویۂ نگاہ اس ضمن میں یہ ہے کہ ہم سلف صالحین کی پیروی کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں قطعی دلیل یہ ہے کہ امت کا اجماع ایک لائق اتباع حجت ہے جس کی تائید شریعت حقہ سے ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اصحاب رسول ﷺ ظواہر نصوص کے فہم و ادراک کے درپے نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوصف کہ وہ اسلام کے چیدہ و برگزیدہ بزرگ تھے اور عظیم ذمہ داریوں کے حامل تھے۔ قواعد ملت، ضبط و حفظ اور ضروریات دین کی تعلیم و تلقین میں وہ جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے اگر ظواہر نصوص کی تاویل مشروع یا حتمی و قطعی ہوتی تو شرعی فروعات سے زیادہ وہ اس کا اہتمام کرتے اور جب وہ اپنے عصر و عہد میں تاویلات سے باز رہے تو یہی طرز فکر قابل اتباع ہوگا مندرجہ دلائل کے پیش نظر ہر دیندار شخص پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کی صفات سے منزہ قرار دے اور متشابہات کی تاویل میں کوشاں نہ رہے۔ بنا بریں مندرجہ ذیل آیات و حدیث کی تاویل نہ کی جائے اور ان کا مطلوب و مفہوم خدا کو تفویض کیا جائے۔

(۱) إِنَّ اللّٰهَ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

(۲) جَاءَ رَبُّكَ ۔

(۳) لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۷۱)

اب اسے چھوڑ دیئے اور ہمیں ایک بدیہی بات کا پتہ تبلائیے۔ جس کا احساس ہمارے دل میں جاگزیں رہتا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی عارف زبان سے "یا اللہ" کہتا ہے تو قبل اس کے کہ اس کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہو علو (بلندی) کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے (یعنی فوراً اس کا ذہن اس طرف مائل ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ فوق العالم ہے) وہ دائیں بائیں متوجہ نہیں ہوتا کیا آپ کسی حیلہ سے اس بدیہی بات کو ہمارے دل سے محو کر سکتے ہیں؟"

مذکورہ صدر عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فوقیت کی نفی کے لیے جو دلیل پیش کی جاتی

(بقیہ حاشیہ منث ۱) (۴) وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

(۵) تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا

(۶) وہ حدیث جس میں اللہ تعالےٰ کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔

امام الحرمین ابو المعالی کا یہ شعر ہے۔

نِهَايَةُ اَقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالٌ　　وَغَايَةُ آرَاءِ الرِّجَالِ ضَلَالٌ

عقلی ترقی کی انتہا عجز و تقصیر ہے اور انسانی آراء کا نتیجہ ضلالت ہے

علامہ المناوی الجامع الصغیر کی شرح میں لکھتے ہیں۔

علامہ سمعانی نے ابوجعفر ہمدانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے امام الحرمین ابو المعالی کو سنا فرماتے تھے "میں نے لاکھوں اوراق کا مطالعہ کیا اور پھر بغور اس بات کا جائزہ لیا کہ مسلمان اسلامی عقائد اور ظاہری علوم پر کہاں تک اعتماد رکھتے ہیں۔ میں بحر مواج میں سوار ہوا اور ان چیزوں میں سوار ہوا جس سے اسلام نے منع کیا ہے (یعنی فلسفہ و علم الکلام کا مطالعہ کیا) یہ سب کچھ حق کی تلاش میں کیا۔ میں اب ان تمام باتوں سے منہ موڑ کر کلمۂ حق کی طرف لوٹ آیا ہوں۔

اور وہ یہ ہے کہ انہی عقائد پر قائم رہو جن پر بڑھیا عورتیں یقین رکھتی ہیں۔ اسی پر میری موت واقع ہوگی اور میرا خاتمہ حق و صداقت اور کلمۂ اخلاص پر ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو تو ابن الجوینی کے لیے تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

شذرات الذہب میں لکھا ہے۔ کہ

یہ امام الحرمین کے اصلی الفاظ ہیں"۔

ہے وہ نظری کسبی ہے اور وہ کسی طرح ایک بدیہی و فطری دلیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی بخصوصاً جبکہ باری تعالےٰ کا فوق العالم ہونا نصوص متواترہ سے ثابت ہے۔ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بدیہیات کا نظری دلائل سے رد کرنا ناممکن ہے۔ اگر بدیہیات کو بھی ہدفِ تنقید بنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اساسی نظریات پر جرح و قدح کا دروازہ کھول دیا جائے اور اس طرح فروعات کی بجائے اصول کو تنقید کے تیروں سے چھلنی کیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بدیہیات و نظریات دونوں ہی باطل ہو کر رہ جائیں۔

تاہم اللہ تعالےٰ کے فوق العالم ہونے کی نفی کرنے والوں نے اپنے زاویۂ نگاہ کو عقلی دلائل کے بل بوتے پر ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے جس طرح وہ یہ کہتے ہیں کہ دو چیزیں جو موجود ہوں گی وہ باہم یا تو متباین ہوں گی یا متداخل۔ ان کے زعم میں یہ ایک بدیہی بات ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے موجود کا اثبات جس کی جانب اشارہ نہ کیا جا سکتا ہو حس و عقل کے منافی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم کے بیشتر مقامات پر اللہ تعالیٰ کا فوق العالم ہونا مذکور ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ قرآن کریم میں ۲۰۰ جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔ احادیث نبویہ اس سے سِوا ہیں۔ علماء سلف بھی اس میں متحد الخیال تھے جو لوگوں پر تنقید کرنا چاہتا ہو اور اس کی انجام دہی میں دلائل قاطعہ کو بھی رد کر دے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے نظریات کو دلائل کی روشنی میں ثابت کرے۔

جہت سے کیا مراد ہے؟

خلیعہ مصنف کا یہ قول کہ "جو چیز کسی جہت میں محدود ہو وہ حادث ہوگی اور اس جہت کی محتاج ہوگی"۔ بہ اسی صورت میں درست ہوگا جب وہ جہت ایک وجودی اور مثبت حیثیت کی حامل ہو اور اس چیز کے لیے لازم ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کو اس طرح قائم بالمحل مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس محل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا وہ ذات خداوندی کو محتاج قرار دیتا ہے۔ حالانکہ کوئی شخص یہ عقیدہ نہیں رکھتا اور نہ ہی ہمارے علم کی حد تک کوئی شخص خدا کو مخلوقات کا محتاج تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے کہ خدا نے عرش کو پیدا کیا۔ عرش کی تخلیق اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ وہ عرش کو پیدا کرنے سے پہلے بھی اس سے بے نیاز تھا اور اس کے بعد بھی بے نیاز رہا۔ اللہ تعالےٰ کے فوق العرش ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عرش کا محتاج ہے۔ دیکھیے اللہ تعالےٰ نے عالم

ارضی کو پیدا کیا اس میں سے بعض حصے بالا ہیں اور بعض پست۔ ظاہر ہے کہ بلند حصے پست کے ہرگز محتاج نہیں۔ مزید غور کیجئے کہ پہلے زمین ہے پھر اس کے اوپر ہوا اور بادل ہیں پھر آسمان پھر عرش تو کیا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔؟

ہم جانتے ہیں کہ قوت و طاقت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حاملین عرش جس قوت سے بہرہ مند ہیں وہ خدا کی پیدا کردہ ہے۔ اگر تمہارے شیعہ اسلاف میں سے کوئی مثلاً علی بن یونس القمی (مشہور شیعہ عالم) یہ کہے کہ عرش نے اللہ تعالٰے کو اٹھا رکھا ہے (جیسا کہ اس کا عقیدہ ہے) تو تم اس کے حق میں کوئی دلیل پیش کرنے سے قاصر رہو گے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو فوق العرش قرار دیتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ عرش کا محتاج ہے۔ بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جب ہم نے ذات خداوندی کو ایک ایسی چیز پیدا کرنے پر قادر تسلیم کر لیا جس نے اسے اٹھا رکھا ہے تو اس سے اس کی قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ عجز و درماندگی کا۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ جہت سے امر موجود بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور امر معدوم بھی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو فوق العالم تسلیم کرتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ وہ ایک ایسی جہت میں ہے جو موجود ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جہت سے عرش مراد لیا جائے اور باری تعالٰے کے اس میں ہونے کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ وہ اس کے اوپر ہے۔ جیسے روایات میں آیا ہے کہ "اِنَّهٗ فِي السَّمَاءِ" (وہ آسمان میں ہے) یعنی وہ آسمان کے اوپر ہے مگر یہ لوگ جہت کو ایک مشترک لفظ قرار دیتے ہیں اور اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ کسی جہت میں ہونے کا مطلب کسی جگہ میں ہونا ہے جیسے آدمی اپنے گھر میں ہوتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا محتاج الی الغیر ہونا لازم آتا ہے۔

یہ سب مقدمات باطل ہیں مثلاً ان کا یہ قول کہ "اللہ تعالیٰ اگر کسی جہت میں ہوگا تو وہ مجسم ٹھہرے گا۔ اور جو چیز جسم دار ہو وہ حادث ہوتی ہے کیونکہ جسم حوادث سے خالی نہیں لہٰذا اس سے اللہ تعالٰے کا حادث ہونا لازم آئے گا۔" یہ سب مقدمات متنازع فیہا ہیں۔ اس لیے کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جہت میں قیام پذیر ہونے والی چیز جسم دار ہو بلکہ غیر مجسم اشیاء کا قیام بھی جہت میں ممکن ہے۔ جب اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ خلاف عقل ہے تو وہ کہتا ہے کہ کسی موجود چیز کے متعلق یہ کہنا کہ "وہ عالم میں داخل ہے نہ خارج" اس سے بھی زیادہ

خلاف عقل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ہر جسم حادث ہوتا ہے مثلاً کرامیہ اور متقدمین شیعہ اسی طرح بعض لوگ اس نظریہ کو نہیں مانتے کہ جسم حوادث سے خالی نہیں ہوتا۔ بعینہ اسی طرح بہت سے اہل الحدیث متکلمین اور فلاسفہ کے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ جو چیز حوادث سے خالی نہ ہو وہ خود بھی حادث ہوتی ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اکثر اہل السنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بذات خود افعال قبیحہ اور کفر کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس کی قضا وقدر کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے بندے کا اس میں کچھ دخل نہیں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ کافر معاصی کا مرتکب ہوتا رہے اور وہ کافر سے اطاعت نہیں چاہتے۔"

ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے ——— اور قبل ازیں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں ——— کہ تقدیر اور عدل وجور کے مسائل کا امامت وخلافت کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر شیعہ مصنف بایں ہمہ وہی مسائل دہرائے جا رہا ہے اس میں شبہ نہیں کہ حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کا اقرار کرنے والے بعض لوگ تقدیر کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض روافض تقدیر کے قائل ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں مسئلے ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ باہم لازم وملزوم نہیں ہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے کہ مسئلہ تقدیر اور صفات الٰہی کے اثبات میں اہل بیت سے ان گنت روایات منقول ہیں۔ مگر متاخرین شیعہ نے تشیع کے عقائد کے ساتھ ساتھ جہمیہ اور قدریہ کے افکار ومعتقدات کا ضمیمہ بھی لگا لیا تھا۔ اور وہ صرف شیعہ عقائد ہی کے حامل نہ تھے۔ یہ شیعہ مصنف بھی اسی زمرہ میں داخل ہے۔

بندوں کے افعال کا فاعل کون ہے؟

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اہل السنت کے نزدیک بندہ کفر ومعاصی کے ارتکاب میں بے قصور ہے" ۔ قطعی طور سے بے بنیاد ہے۔ تقدیر کا عقیدہ رکھنے والے جمہور اہل سنت کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا حقیقی فاعل ہے اور وہ قدرت واستطاعت سے بہرہ ور

ہے۔ وہ طبعی اسباب کی تاثیر کا انکار نہیں کرتے بلکہ عقلی و نقلی دلائل کی بنا پر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہواؤں کے ذریعہ بادل کو پیدا کرتے پھر بادل سے پانی اتارتے اور پانی سے فصلیں پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ سبب اور مسبب دونوں کا خالق ہے، باوجودیکہ باری تعالیٰ خالق اسباب ہیں اس کے باوصف ایک اور سبب کا وجود ناگزیر ہے جو اس کا شریک ہو اور اس کے دوش بدوش ایک معارض کی بھی ضرورت ہے جو اسے روک دے اور خدا کے پیدا کرنے کے باوجود اس کے اثر کو تکمیل پذیر نہ ہونے دے۔ الایہ کہ خداوند تعالےٰ دوسرے سبب کو پیدا کرکے موانع کا ازالہ کردے۔

شیعہ مصنف نے جو قول نقل کیا ہے اس کے قائل امام اشعری اور ان کے ہم نوا ہیں اشاعرہ مخلوقات میں قویٰ و طبائع کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان قویٰ کے ساتھ فعل کو انجام نہیں دیتے البتہ ان قویٰ کے ہوتے ہوئے وہ فعل انجام پذیر ہوتا ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ بندے کی قوت افعال میں مؤثر نہیں ہے۔

امام اشعری اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے فعل کا فاعل نہیں بلکہ اس کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ البتہ بندہ اپنے فعل کا کاسب ہے۔ اہل سنت اور جمہور کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا حقیقی فاعل ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالےٰ کافر سے معاصی کا ارادہ کرتا ہے" اہل سنت کا صرف ایک گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو "ارادہ" کی صرف ایک قسم قرار دیتے ہیں اور محبت و رضا اور غضب کو ارادہ کا مترادف تصور کرتے ہیں۔ امام اشعری کے دونوں اقوال میں سے مشہور تر قول یہی ہے ان کے اکثر اصحاب و اتباع بھی اسی کے قائل ہیں۔

بخلاف ازیں جمہور اہل سنت ارادہ، محبت اور رضا میں فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اللہ تعالےٰ معاصی کا ارادہ تو کرتا ہے مگر انھیں چاہتا نہیں اور ان سے راضی بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ناراض ہوتا ہے۔ محققین کا قول ہے کہ ارادہ کا لفظ قرآن کریم میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) ارادہ قدریہ کونیہ

(۲) ارادہ شرعیہ دینیہ

ارادہ قدریہ جملہ حوادث کا شامل ہے جب کہ ارادہ شرعیہ محبت و رضا پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (الانعام ۱۲۵)

اللہ تعالےٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

ارادہ کی دو قسمیں

اِنْ کَانَ اللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ (ھود۔ ۳۴)

اگر اللہ تعالےٰ تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہو

اس ارادہ کا تعلق اضلال و اغواء کے ساتھ ہے۔ ارادہ شرعیہ کی مثال مندرجہ ذیل آیات ہیں قرآن کریم میں فرمایا۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَیَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (النساء۔ ۲۶)

اللہ تعالےٰ تمہارے لیے واضح کرنا اور ان لوگوں کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں جو تم سے پہلے تھے

نیز فرمایا

مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ حَرَجٍ (المائدہ۔ ۶)

اللہ تعالےٰ تمہیں تنگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ (الاحزاب۔ ۳۳)

اے نبی کے گھر والو! اللہ تعالےٰ تم سے ناپاکی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان آیات میں ارادہ کے وہ معنی نہیں جو سابقہ آیات میں ہیں

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

اہل سنت کا یہ قول چند قبائح پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک قباحت یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا سب ظالموں سے بڑا ظالم ہونا لازم آتا ہے اس لیے کہ وہ کافر کو کفر کے جرم کی سزا دیتا ہے حالانکہ اس نے خود ہی اسے کفر کی قدرت عطا کی اور اسے ایمان کی قدرت سے محروم رکھا جس طرح کسی کو طویل القامت یا قصیر القامت ہونے پر سزا دینا ظلم ہے۔ اسی طرح اس معصیت

کی سزا دینا بھی ظلم ہے جو خود اللہ تعالے نے اس میں پیدا کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ظلم کی تفسیر میں جمہور کے دو قول ہیں۔

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ ظلم ممتنع لذاتہ ہے اور اللہ تعالے ظلم کرنے پر قادر نہیں۔ امام اشعری، قاضی ابوبکر، ابوالمعالی، قاضی ابویعلی اور ابن الزاغونی کی یہی رائے ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ذات باری دروغگوئی، ظلم اور افعال قبیحہ پر قادر نہیں اور نہ اسے ان کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے۔ ذات باری سے ان افعال کا صدور اس لیے محال ہے کہ ظلم و قبیح کا فاعل شرعاً مذموم ہے اور قابل مذمت وہی فاعل ہوتا ہے جو ناروا کام کرے اور ایسے فعل کا مرتکب ہو جس کا حق اسے حاصل نہ ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب فاعل اس چیز میں تصرف کرے جس میں تصرف کرنے کا حق اس کی نسبت کسی اور کو حاصل ہو۔ بنا بریں ظلم کا صدور خدا سے محال ہے کیونکہ اس کے تصرفات کا مالک کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ اس تقریر سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خدا کے حق میں ظلم کا تصور بھی محال ہے۔

مذکورہ بالا قول کی حقیقت یہ ہے کہ قابل مذمت وہ فاعل ہے جو غیر کی مملوکہ چیز میں دراز دستی کا ارتکاب کرتا اور حکم کی نافرمانی کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص خدا کو اپنے احکام کا مامور و مکلف نہیں بنا سکتا اور نہ ہی خداوند تعالے غیر کی ملکیت میں تصرف کرتا ہے اس لیے کہ وہ سب چیزوں کا مالک ہے۔

یہ قول ایاس بن معاویہ سے منقول ہے۔ فرماتے ہیں۔

"میں نے اپنی پوری عقل سے کام لے کر قدریہ فرقہ سے مناظرہ کیا اور دریافت کیا کہ ظلم کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنے کو ظلم کہتے ہیں۔ میں نے کہا جب ہر چیز خدا کی مملوک ہے تو وہ غیر کی ملکیت میں تصرف کیسے کرے گا؟"

مگر یہ لوگ تو کسی جرم کا ارتکاب کیے بغیر بھی سزا دینے کو جائز تصور کرتے ہیں لہذا قصیر القامت کو چھوٹے ہونے اور سیاہ فام کو سیاہ ہونے کی بنا پر سزا دینے سے ان پر معارضہ نہیں کیا جا سکتا ان کا خیال ہے کہ سزا دینا مشیت ایزدی کے تابع ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالے ظلم پر قادر مگر اس سے منزہ ہے:-

تعالےٰ ظلم پر قادر مگر اس سے منزہ ہے جیسے کسی انسان کو کسی دوسرے شخص کے جرم کی سزا دینا
اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (طٰہٰ ۱۱۲)

جو ایمان دار ہونے کے باوصف نیک اعمال انجام دے گا تو وہ کسی ظلم یا کمی سے نہیں ڈرے گا۔

ان لوگوں کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ انسان کو اختیاری یا غیر اختیاری افعال کی بنا پر سزا دینے کا
فرق انسانی فطرت میں جاگزین ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تقدیر سے گناہوں پر استدلال کرنا عقلاً
باطل ہے اس لیے کہ دوسروں پر ظلم وستم ڈھانے والا اگر تقدیر سے استدلال کرے گا (کہ میری تقدیر
میں یوں ہی لکھا تھا) تو جو شخص اس کو ظلم کا نشانہ بناتا ہے وہ بھی یہ دلیل پیش کر سکتا ہے۔ اس
سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ معاصی کے ارتکاب پر تقدیر سے استدلال کرنا باتفاق ادیان
وعقلاء باطل ہے۔ اور اس سے وہی شخص احتجاج کرتا ہے جو اپنی خواہش کا پیرو ہو جیسے یہ مقولہ
مشہور ہے کہ "تم اطاعت کے وقت قدری اور معصیت کے وقت جبری بن جاتے ہو"۔ مقولہ کا
مطلب یہ ہے کہ تم ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہو جو مذہب اپنی خواہش کے موافق ہو اسی
کے ہو رہے۔

اگر قبائح کے مرتکب کے لیے تقدیر حجت ہوتی تو کوئی شخص دوسرے کو ملامت نہ کر سکتا۔
اور نہ اسے سزا دے سکتا (کیونکہ مجرم آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ میری تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا)
حقیقت کے بلند بانگ دعاوی کرنے والوں مثلاً فقراء اور صوفیہ کو اکثر اس سے سابقہ پڑتا ہے
وہ تقدیر کا بہانہ کر کے خداوندی اوامر ونواہی سے انحراف کرتے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے
کہ تقدیر کے بل بوتے پر کوئی شخص اوامر کو ترک کر سکتا ہے نہ محرمات کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ اللہ
تعالےٰ نے اپنے بندوں پر حجت تمام کر دی ہے۔

جو لوگ تقدیر سے معاصی کے ارتکاب کے جواز پر استدلال کرتے ہیں وہ فرقہ قدریہ سے بھی بدتر
ہیں جو سرے سے تقدیر کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کو قدریہ کہا گیا
حالانکہ وہ تقدیر کے منکر نہ تھے۔ قدریہ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ تقدیر سے معاصی
کے جواز پر احتجاج نہیں کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب کہا گیا کہ ابن ابی ذئب

منکر تقدیر تھے تو انھوں نے فرمایا جو شخص بھی معاصی کی بنا پر لوگوں کو تنگ کرتا تو لوگ اسے قدری کہہ کر پکارتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قائلین تقدیر فواحش و منکرات پر تنقید کرنے والے کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور کہتے ہیں یہ بات ان کی تقدیر میں لکھی تھی اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ منکرات پر رد و قدح بھی تقدیر خداوندی کے عین موافق ہے۔ گویا اس نے اپنے قول سے ہی اپنی دلیل کو توڑ دیا۔ بعض جاہل مشائخ کا قول ہے "میں اس رب کو ماننے کے لیے تیار نہیں جس کی نافرمانی کی جاتی ہو۔ اور اگر میں ستر انبیاء کو قتل کر دوں تو میں گنہگار نہ ہوں گا۔"

ایک اور جاہل شیخ کا قول ہے۔

"میں وہی کام کرتا ہوں جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا ہے۔ لہٰذا میرے سب کام عبادت میں داخل ہیں"۔

مسئلہ تقدیر میں احتجاج آدمؑ و موسیٰؑ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت آدم کا حضرت موسیٰ پر تقدیر کی بنا پر احتجاج اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ یہ کھلی ہوئی جہالت ہے اس لیے کہ انبیاء سب لوگوں سے زیادہ خداوندی اوامر و نواہی کی اطاعت کرتے ہیں پھر تقدیر کی بنا پر وہ اس کی نافرمانی کیونکر کر سکتے ہیں۔ مزید براں حضرت آدم نے بارگاہ ایزدی میں اپنے گناہ سے توبہ کر لی تھی اور انکی توبہ قبول کر لی گئی تھی۔ اور اگر تقدیر سے احتجاج کرنا درست ہوتا تو ابلیس، فرعون اور ان کے ہمنوا اس سے ضرور استدلال کرتے۔ حضرت موسیٰ نے حضرت آدم کو جو ملامت کی تھی اس کی وجہ وہ مصیبت تھی جو حضرت آدم کے شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے کی وجہ سے حضرت موسیٰ کو پہنچی اسی لیے حضرت موسیٰ نے حضرت آدم کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"آپ نے ہمیں اور اپنے بیٹوں کو جنت سے کیوں نکالا؟"

حقیقت یہ ہے کہ بندہ عیب و گناہ کی بجائے مصائب و آلام کے وقت تقدیر کی جانب رجوع کرنے کے لیے مامور ہے۔ لہٰذا چاہیئے کہ وہ مصائب و آلام میں صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور گناہوں سے توبہ کرتا رہے۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (غافر - ۵۵)

(صبر کیجیے بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت طلب کیجیے)

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ افعال اختیاریہ کی بنا پر انسان صفات محمودہ اور صفات مذمومہ دونوں حاصل کر سکتا ہے بخلاف ازیں قصیر القامت ہونے یا کالے گورے ہونے کی بنا پر ان کا حصول ممکن نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"نیکی دل کا نور۔ چہرہ کی رونق، وسعتِ رزق، قوت بدن اور مخلوقات کے دل میں محبت کی باعث ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بندوں کے افعال کو ان جملہ امور کا سبب بنایا ہے جس طرح زہر کھانے کو بیماری اور موت کا سبب قرار دیا ہے۔ تاہم تریاق سے اس کا ازالہ ممکن ہے جس طرح برائیوں کو توبہ، اعمال صالحہ اور گناہ کو دور کرنے والے مصائب و آلام کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ فعل کو پیدا کر کے خود ہی اس پر سزا دینا ظلم ہے تو یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے زہر کو پیدا کر کے اسے موجب ہلاکت بنانا ظلم ہے۔ یقینی دلائل کی بنا پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ جو چیز بھی حادث ہے وہ خدا کی پیدا کردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ بندے کے افعال بھی حوادث کے زمرہ میں شامل ہیں۔ لہٰذا وہ بھی خدا تعالےٰ کے پیدا کردہ ہیں، بنا بریں جو خدا نے چاہا ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ فعل بندے کے ارادہ سے حادث ہوا تو ہم کہیں گے کہ ارادہ بھی حادث ہے لہٰذا اس کے لیے بھی کسی سبب کی ضرورت ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فعل ممکن ہے (یعنی اس کا وجود و عدم برابر ہے) لہٰذا اس کے وجود کو عدم پر ترجیح دینے کے لیے کسی مُرجّح کی ضرورت ہے اسی طرح بندے کا فاعل ہونا بھی ممکن ہے لہٰذا اس کے لیے بھی کسی مُحدِث و مرجح کا وجود ناگزیر ہے۔ اس میں سب حوادث مساوی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

بارگاہ ایزدی میں تقدیر کا عذر مسموع نہیں

مخلوقات میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جو بعض لوگوں کے لیے موجب ضرر ہیں جیسے بیماریاں اور مصائب و آلام۔ یہ حکمت ایزدی کا تقاضا ہے جب بندے کو اس کے افعال اختیاری پر سزا دینا ظلم نہیں تو حوادث کو بارگاہ ربانی کی جانب منسوب کرنے

میں بھی ایک ایسی حکمت مضمر ہے جس کی بنا پر وہ حوادث مستحسن ٹھہرتے ہیں۔ جب بندے کی جانب اس کی نسبت کی جائے تو یہ عدل ہے کیونکہ اسے جو سزا ملی ہے وہ اس کے جرم کی بنا پر ملی ہے۔ لہٰذا خدا نے اس پر ظلم نہیں کیا بلکہ اس نے خود ہی اپنی جان پر ستم ڈھایا۔ جب کوئی حاکم چور کو سزا دے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالے اور مسروقہ مال اس کے اصلی مالک کو واپس کر دے تو وہ منصف حاکم کہلائے گا اور اگر چور اسے کہے کہ میری تقدیر میں یونہی لکھا تھا پھر تم مجھے سزا کیوں دیتے ہو؟ تو یہ بات چور کے حق میں مفید نہ ہوگی اور حاکم اسے سزا دیئے بغیر نہیں رہے گا۔ اسی طرح جب روز قیامت اللہ تعالےٰ ظالم سے قصاص لے گا تو اس کا یہ فعل عدل و انصاف کا آئینہ دار ہوگا اور اگر ظالم یوں کہے کہ تو نے میری تقدیر میں اسی طرح لکھا تھا تو یہ بات اس کے حق میں کچھ بھی مفید نہ ہوگی اور تقدیر کا عذر درست نہیں مانا جائے گا چونکہ اللہ تعالےٰ ہر چیز کا خالق ہے لہٰذا اس کی تخلیق خالی از حکمت نہیں اور اسی حکمت و مصلحت کے اعتبار سے تخلیق کا فعل مستحسن ہے۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ جَبَرَ اللّٰہُ الْعِبَادَ (اللہ نے بندوں کو مجبور محض بنایا ہے) ائمہ حدیث مثلاً امام ثوری، اوزاعی، زبیدی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے اس پر بڑی جرح قدح کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ جبر کرنا عاجز کا کام ہے جیسے والد اپنی بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ارادہ اور مراد دونوں کا خالق ہے۔ البتہ حدیث نبوی کے اتباع میں جَبَلَ اللّٰہُ الْعِبَادَ (اللہ نے بندوں کو پیدا کیا) کہہ سکتے ہیں مگر "جَبَلَ" کی بجائے "جَبَرَ" کا لفظ نہیں بولا جا سکتا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبد القیس کے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہاری دو باتیں اللہ تعالےٰ کو پسند ہیں (۱) تحمل و بردباری (۲) سکون و تاخیر۔ اس نے عرض کیا "یہ فرمایئے کہ کیا یہ دونوں باتیں میرے اخلاق و عادات میں داخل ہیں یا میری خلقت ہی ان پر ہوئی ہے"؟ فرمایا یہ دونوں باتیں خِلقۃً تمہیں ودیعت ہوئی ہیں"۔ اس نے عرض کیا۔ خدا کا شکر ہے جس نے دو ایسی باتیں مجھے عطا کیں جو اسے پسند ہیں"؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خلق و تقدیر اور امر و تشریع کی جہتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرعی اوامر و احکام کا مقصد اس چیز کا اظہار و بیان ہے جو بندوں کے لیے نفع یا ضرر کی موجب ہو۔ جس طرح طبیب مریض کو فائدہ مند چیزوں کے استعمال کا حکم دیتا اور ضرر رساں اشیاء سے

پرہیز کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انبیاء کے ذریعہ صلحاء و اشقیاء، دونوں کے انجام سے آگاہ کر دیا ہے۔ سعادت کی موجب اشیاء کا حکم دیا اور شقاوت کے موجبات سے روک دیا۔

باقی رہا خدا کے خلق و تقدیر کا معاملہ تو اس کا تعلق ذات باری اور جملہ مخلوقات کے ساتھ ہے چنانچہ جس چیز میں عام مخلوقات کا فائدہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ وہ کام کرتے ہیں۔ اگرچہ اس سے بعض کو نقصان پہنچنے کا بھی احتمال ہو۔ مثال کے طور پر بارش کو لیجئے کہ اس کا نزول رحمت و حکمت کے پیش نظر ہوتا ہے تاہم بعض اوقات اس سے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً کسی کا مکان گر جاتا ہے کوئی سفر سے رک جاتا ہے اور کسی کا کاروبار معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح رسل و انبیاء کی بعثت بھی عین عنایت ربانی ہے اگرچہ بعض قوموں کو اس سے الم و رنج پہنچتا ہے اور ان کی قیادت و سیادت روبزوال ہو جاتی ہے۔

افعال اللہ و افعال العباد کے مابین فرق و امتیاز

جب کسی شخص کو خدا کے علم میں کافر مقدر کیا جاتا ہے تو یہ گہری مصلحت پر مبنی ہوتا ہے اور کافر کو اس کے افعال اختیاری کی بنا پر سزا دی جاتی ہے۔ یہ سزا بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتی۔

اللہ تعالےٰ کے افعال کو افعال العباد پر قیاس کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس لیے کہ آقا جب غلام کو کسی بات کا حکم دیتا ہے تو وہ غلام کا محتاج ہوتا ہے اور وہ کسی غرض کے تحت ایسا کرتا ہے جب آقا غلام کو اس محنت و کاوش کا بدل عطا کرتا ہے تو یہ اس کا معاوضہ کہلاتا ہے۔ اندریں صورت آقا کو فعل مامور کا خالق نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالےٰ بندوں سے بے نیاز ہے اس نے بندوں کو انہی باتوں کا حکم دیا ہے جو ان کے لیے نفع رساں ہیں اور انہی باتوں سے روکا ہے جو ان کے لیے موجب ضرر ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے یہ احکام ارشاد و تعلیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ مامور کے بجالانے میں انسان کی مدد کرے تو اس کا احسان عظیم ہے اور اگر مدد نہ کرے اور بندے کو تنہا چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو تو یہ کسی اور حکمت پر مبنی ہو گا اور اگر وہ افعال بندے کے لیے موجب الم و رنج ہوں تو وہ ان افعال کی وجہ سے دکھ پائے گا جو آرام و راحت کے موجب ہوتے ہیں اور سبب الم و رنج بھی۔ یہ سب کچھ تقدیر ربانی کے تحت ہو گا۔ اور ان دونوں میں کوئی منافات بھی نہیں

پائی جاتی۔

اب یہ بات باقی رہی کہ آخر وہ کلی حکمت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکمت کی معرفت حاصل کرنا بنی نوع انسان کے لیے ضروری نہیں بلکہ خداوندی حکمت و رحمت کے آگے سر نیاز خم کر دینا ہی کافی ہے۔ بعض علوم ایسے بھی ہیں جن کا حاصل کرنا بہت سے لوگوں کے لیے ضرر رساں ہے عقل انسانی اس کی حکمت و مصلحت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

لَا تَسْئَلُوا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ (المائدہ - ۱۰۱)

ایسے امور کے متعلق مت پوچھو کہ اگر ان کا اظہار کر دیا جائے تو تم پر ناگوار گذرے۔

یہ مسئلہ افعال خداوندی کی غایات و مقاصد کے نام سے موسوم ہے اور غالباً حکمت الٰہیہ کے تمام مسائل سے عظیم تر ہے۔ فرقہ قدریہ کی ضلالت و کجروی کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے اللہ تعالےٰ کو مخلوقات کے عدل و ظلم پر قیاس کیا۔ اسی طرح جبریہ بھی جادۂ مستقیم سے بھٹک گئے کیونکہ وہ افعال خداوندی کو مصالح پر مبنی قرار نہیں دیتے اور نہ اسے ظلم و جور سے منزہ تصور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا دین افراط و تفریط کے بین بین ہے۔

شیعہ مصنف کا اہل سنت کے بارے میں یہ کہنا کہ "اس میں ایمان کی قدرت پیدا نہ کی"۔ یہ اس شخص کا قول ہے جو قدرت مع الفعل کا قائل ہے۔ اس کی رائے میں جو شخص کوئی فعل انجام نہیں دیتا تو وہ اس پر قادر نہیں تاہم اسے عاجز بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ جمہور اہل سنت کا قول نہیں ہے۔ بخلاف ازیں اہل سنت بندے کے لیے اس قدرت کا اثبات کرتے ہیں جس پر امر و نہی کا مدار و انحصار ہے اور وہ قدرت مقارن للفعل نہیں ہوتی بلکہ فعل سے پہلے پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران - ۹۷)

اور اللہ کے لیے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج فرض ہے جو وہاں پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو

اس آیت میں صاحب استطاعت پر حج کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ اگر صرف حج سے فارغ ہونے والے کو صاحب استطاعت تصور کیا جائے تو حج اسی شخص پر فرض سمجھا جائے گا جو فریضۂ حج ادا

کہلے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترک حج کے جرم میں کسی کو بھی سزا نہیں دی جائے گی۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن -۱۶) (جس قدر ہو سکے خدا سے ڈرو)

اس میں حسب استطاعت تقوی کو واجب قرار دیا اگر خدا سے نہ ڈرنے والا تقوی کی استطاعت سے محروم ہوتا تو تقوی اسی شخص پر واجب ہوتا جو تقوی کی صفت سے بہرہ ور ہوتا۔ اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ کفار کو چھوڑ کر ایک اطاعت شعار شخص پر خدا کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اسے اطاعت کی توفیق عطا کی۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ (الحجرات -۷)

اللہ تعالی نے ایمان کو تمہاری نگاہ میں محبوب بنا دیا۔ تمہارے دلوں میں سے مزین کر دیا اور کفر کو ناپسندیدہ بنا دیا

قدریہ کے نزدیک ایمان کا آراستہ پیراستہ ہونا سب مخلوقات کے لیے عام ہے مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف مومنین کی خصوصیت ہے

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (الانعام -۱۲۵)

اللہ تعالے جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں۔

نیز فرمایا۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا (الانعام -۱۲۲)

کیا جو شخص معدوم تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اسے ایک نور عطا کیا۔

مزید فرمایا۔

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ (الحجرات -۱۷)

بلکہ اللہ تعالی تم پر اپنا احسان جتلاتے ہیں کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ بتایا

اللہ تعالی نے مسلمانوں کو یہ دعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (فاتحہ)

دعا سے زمانہ مستقبل میں ایسی چیز کا حصول مقصود ہوتا ہے جو قبل ازیں حاصل نہ ہو۔ اس دعا میں جس ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ سے ایک جداگانہ چیز ہے۔ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا (سورہ نور-۲۱)

اگر فضلِ ربانی تمہارے شاملِ حال نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی پاک نہ ہوتا۔

نیز فرمایا۔

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سورۂ انبیاء-۷۳)

ہم نے ان کو ایسے امام بنایا تھا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (القصص-۴۱)

ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو لوگوں کو جہنم کی جانب دعوت دیتے تھے۔

اس ضمن میں بڑی کثرت سے آیات وارد ہوئی ہیں۔ استطاعت کے بارے میں حسب ذیل آیات قابل ملاحظہ ہیں۔

اللہ تعالٰے فرماتے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (سورہ نساء-۲۵)

جو تم میں سے آزاد اور مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔

ارشاد ہوتا ہے۔

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ (توبة-۴۲)

وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ نکلتے۔

قرآن میں فرمایا۔

فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (مجادلہ-۴)

جو اس کی طاقت نہ رکھے وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"کھڑے ہو کر نماز پڑھئے۔ اگر کھڑا ہونا ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر بیٹھنے پر قادر نہ ہو تو پہلو کے بل"۔

اس حدیث میں آپ نے ایسی استطاعت کی نفی فرمائی جس کے ساتھ فعل نہ پایا جاتا ہو۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ شریعت میں جو استطاعت مشروط ہے وہ اس استطاعت سے خاص تر ہے جو عقل سے معلوم کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ شارع کا مقصد دین میں آسانی پیدا کرنا ہے مثلاً مریض جو کھڑا ہونے پر قادر ہو مگر یہ خطرہ دامنگیر ہو کہ کھڑا ہونے سے وہ بتاخیر صحت یاب ہو گا۔ ایسے شخص کو حصول ضرر کی بنا پر شرعاً غیر مستطیع تصور کیا جائے گا۔ اگرچہ اسے مستطیع کے نام سے موسوم کیا جائے۔

استطاعت کی تعریف

خلاصہ کلام! یہ کہ شارع کی نگاہ شرعی استطاعت میں صرف امکان ہی پہ نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے لوازم کو بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ جب شارع امکان کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے کہ فساد کا غلبہ نہ ہو تو وہ کسی عاجز کو کیونکر مکلف و مامور کر سکتا ہے۔ تاہم یہ استطاعت وجود فعل تک باقی رہنے کے بادصف فعل کے پائے جانے کے لیے کافی نہیں۔ اگر ایسی استطاعت کافی ہوتی تو تارک و فاعل مساوی ہو کر رہ جاتے اور دونوں میں فرق و امتیاز مشکل ہو جاتا۔ بخلاف ازیں مذکورہ استطاعت کے ساتھ ایک دوسری اعانت کا وجود ناگزیر ہے جو اس کے مقارن ہو مثلاً فاعل کا بالارادہ ہونا اس لیے کہ قدرت و ارادہ کے بغیر فعل کا تکمیل پذیر ہونا ممکن نہیں۔ وہ ارادہ جس میں عزم و استقلال پایا جاتا ہو استطاعت مقارنہ للفعل میں داخل ہے۔ البتہ جو استطاعت احکام کا مکلف بنانے کے لیے شرط ہے اس میں ارادہ کا پایا جانا ضروری نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالے ارادہ نہ کرنے والے کو کسی فعل کا مامور و مکلف تو بناتے ہیں البتہ جو شخص کسی فعل کو انجام دینے سے عاجز ہو اس کو مامور نہیں کرتے۔ جیسے آقا اپنے غلام کو ایسے کام کا حکم تو دیتا ہے جس کو انجام دینے کا وہ ارادہ نہیں رکھتا البتہ اسے ایسے کام تفویض نہیں کرتا جس سے وہ عاجز ہو۔ جب عزم راسخ اور قوت تامہ دونوں یکجا ہوتے ہیں تو فعل کا وجود پذیر ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک قدرت کا مع الفعل ہونا ضروری ہے وہ کہتے ہیں کہ ہر کافر و فاسق کو تکلیف مالایطاق دی گئی ہے مگر جمہور اہلسنت اس کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں اللہ تعالے نے

ہر صاحب استطاعت پر حج فرض کیا ہے خواہ وہ یہ فریضہ انجام دے یا اس کی تکمیل سے قاصر رہے اسی طرح کفارہ میں دو ماہ کے روزے فرض کیے خواہ وہ کفارہ دے یا نہ دے۔ بعینہٖ اسی طرح صاحب قدرت پر عبادت کو فرض قرار دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس فریضہ کو انجام دے یا اس کی انجام دہی سے قاصر رہے۔

تکلیف مالا یطاق کی تفسیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔

(۱) کسی شخص کو اس بات کا مکلف کیا جائے جس سے وہ عاجز ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تکلیف کسی کو بھی نہیں دی گئی۔

(۲) کسی شخص کو اس بات کا مکلف کیا جائے جس کو انجام دینے سے وہ اس لیے قاصر ہے کہ وہ اس کی ضد میں مشغول و منہمک ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بندوں کو اس قسم کی تکلیف دی گئی ہے اور وہ باہم ایک دوسرے کو بھی ایسی ہی تکلیف دیتے ہیں۔ آقا سبھی غلاموں کو یکساں تصور نہیں کرتا بلکہ ان میں فرق و امتیاز روا رکھتا ہے۔ مثلاً وہ اندھے غلام کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ قرآن کریم پر نقطے لگائے اور نہ ہی اپاہج غلام کو کھڑا ہونے کے لیے مامور کرتا ہے۔ دونوں کا فرق واضح ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اس سے انبیاء کا لاجواب ہونا اور ان کے دلائل کا انقطاع بھی لازم آتا ہے۔ کوئی نبی جب کافر سے یوں مخاطب ہو گا "مجھ پر ایمان لائیے اور میرے دعوائے نبوت کو تصدیق کیجئے"۔ تو کافر اس کے جواب میں کہے گا۔

"اپنے رب سے التجا کیجئے کہ وہ مجھ میں ایمان اور قوت موثرہ پیدا کرے تاکہ میں ایسا کر سکوں۔ بجز اس کے میرے لیے ایمان لانا کیونکر ممکن ہے جبکہ سرے سے مجھ میں ایمان لانے کی قدرت ہی نہیں پائی جاتی۔ بلکہ مجھ میں کفر کو جاگزین کر دیا ہے اور میں اسے مغلوب نہیں کر سکتا"۔

نبی کافر کی یہ گفتگو سن کر لاجواب ہو جائے گا۔ اور کچھ کہہ نہ سکے گا۔

مسئلہ تقدیر پر شیعہ مصنف کا اعتراض اور اس کا جواب

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس

مسئلہ میں بہت لے دے کی جاتی ہے۔ بہت سے باطل پرستوں کی تو یہ حالت ہے کہ جب انھیں کسی واجب کا مامور ٹھہرایا جاتا ہے تو تقدیر کا بہانہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ ہمارے لیے یہ کام مقدر کرے گا تو ہم اسے انجام دیں گے۔ اسی طرح جب کسی کو بری بات سے روکا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے میری تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ تقدیر سے احتجاج کرنا ایک باطل دلیل ہے جس کی بنا پر بندہ کو معذور قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مشرکین نے کہا۔

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا (انعام - ۱۴۸)

اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباء شرک نہ کرتے۔

تو اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا

ان سے فرما دیں کہ اگر تمہارے پاس (اس کے ثبوت میں) کوئی علم ہے تو اسے ہمارے لیے ظاہر کیجیے مشرکین تک اس بات سے آگاہ تھے کہ تقدیر سے استدلال کرنا بے کار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی کافر کسی کا مال چھینے یا کسی کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو یا کسی کے لڑکے کو موت کے گھاٹ اتار دے یا دوسروں پر لگاتار مظالم ڈھاتا رہے اور لوگ اسے ان افعال قبیحہ سے روکنے کی کوشش کریں اور وہ ان کے جواب میں کہے کہ اگر خدا چاہتا تو میں یہ کام انجام نہ دیتا"۔ تو کوئی شخص اس کا عذر قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اور نہ وہ خود ہی کسی شخص سے ایسا عذر تسلیم کرے گا بلکہ وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ ایسی دلیل وہ شخص پیش کرے گا۔ جو بلاوجہ اپنے سے ملامت کا داغ دھونا چاہتا ہو۔ اگر تقدیر سے استدلال کرنا صحیح ہوتا تو اطاعت کیش اور نافرمان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا۔ اللہ تعالےٰ نے یہ فرما کر ایسے لوگوں پر حجت تمام کردی ہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے لیے حجت بالغہ ہے۔)

پھر یہ کہہ کر تقدیر کا اثبات کیا

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا)

یہ دونوں باتیں اپنی جگہ پر درست ہیں۔

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔

"اہل سنت کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو اطاعت شعاری کے باوصف عذاب دے سکتے ہیں اور ابلیس اپنی معصیت کاری کے باوجود اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی مقصد کے پیش نظر کوئی فعل انجام نہیں دیتا۔

علاوہ ازیں طاعات و عبادات کو انجام دینے والا حد درجہ احمق ہوگا اس لیے کہ وہ یونہی عبادت میں منہمک رہ کر اپنے آپ کو محنت و مشقت میں ڈالتا۔ مسجدیں اور مہمان خانے بنانے کے لیے اپنا مال پانی کی طرح بہاتا ہے مگر اس سے اسے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بایں ہمہ بعض اوقات اسے عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ اس کے عین برعکس اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرے اور لذت گیر ہوتا۔ تاہم اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب عطا کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان نظریات و افکار کا نتیجہ دنیا کی ہلاکت و بربادی اور دین میں ہلچل پیدا ہونے کی صورت میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔"

تعذیب انبیاء کے جواز کا ابطال

اس کا جواب یہ ہے کہ شیعہ مصنف کا یہ قول قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ اہل سنت میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے بخلاف ازیں وہ ان کے اجر و ثواب پانے کے بارے میں ہم نوا ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس بات کا وعدہ کر چکا ہے اور وہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ بعض علماء کے نزدیک انبیاء کا حامل اجر و ثواب ہونا دلیل سمعی اور بعض کے نزدیک عقلی دلیل سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جاثیہ ۲۱)

کیا جن لوگوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انھیں ایمانداروں کی طرح کر دیں گے

یہ استفہام انکاری ہے اور اس سے ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو اس زعم فاسد میں مبتلا تھے۔ اس سے واضح ہوا اہل طاعت اور اہل کفر کی مساوات کا نظریہ ظاہر البطلان ہے اور اللہ تعالیٰ ایسا حکم صادر کرنے سے منزّہ ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ (سورۃ ص - ۲۸)

کیا ہم اہل ایمان اور نیک اعمال انجام دینے والوں کو فساد برپا کرنے والوں کی طرح کر دیں اور اہل تقوی کو فاسق و فاجر لوگوں کی طرح بنا دیں؟

نیز ارشاد فرمایا۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ (قلم - ۳۵) (کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی طرح بنا دیں؟)

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اہل سنت کے نزدیک انبیاء کو عذاب میں مبتلا کرنا جائز ہے"۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ انبیاء کو عذاب دینے پر قادر ہے تو بلاشبہ اس کے قادر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اور شیعہ کو بھی اس سے مفر نہیں اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اہل سنت شک میں مبتلا ہیں کہ آیا اللہ تعالےٰ انبیاء کو عذاب میں گرفتار کر سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ہرگز شک میں مبتلا نہیں بلکہ ہمارے نزدیک سب انبیاء و اولیاء قطعی جنتی اور ابلیس اور اس کے ہنوا قطعی جہنمی ہیں۔ بخلاف ازیں اگر شیعہ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اہل سنت میں سے جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ باری تعالےٰ کے بعض افعال حکمت سے عاری ہوتے ہیں اس سے تعذیب انبیاء کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بعض متکلمین کی رائے ہے اور اکثر اہل سنت یہ عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ وہ اس مسئلہ میں متحد الخیال ہیں کہ اطاعت نفع رساں ہے اور عدم اطاعت موجب ضرر ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اہل سنت کے نظریہ کے مطابق کوئی شخص نبی کی تصدیق نہ کر سکے گا۔ اس کی وجہ ہے کہ نبی کی تصدیق دو مقدمات پر مبنی ہے۔

(۱) پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے نبی کے ہاتھوں پر معجزہ کا اظہار اس لیے کیا کہ اس کی تصدیق کی جا سکے۔

(۲) دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس کی تصدیق کی جاتی ہے وہ صادق ہوتا ہے"۔

اہل سنت کے قول کے مطابق یہ دونوں مقدمات تشنہ تکمیل ہیں۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالےٰ کے افعال اغراض کے تابع نہیں ہوتے تو نبی کی تصدیق کے لیے معجزات کا ظہور پذیر ہونا بھی محال ہو گا۔

بقول اہل سنت جب اللہ تعالے افعال قبیحہ، معاصی، مکذب اور ضلال کا مرتکب ہوسکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالے جھوٹے نبی کی تصدیق کردے (نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات) بنابریں معجزات کے ظہور سے کسی نبی کی صداقت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تقدیر کا اثبات کرنے والے اکثر اہل سنت کے نزدیک افعال خداوندی حکمت و مصلحت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ لہذا یہ قول اور اس کی ضد اہل سنت کے اقوال سے باہر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ نبی کی صداقت صرف معجزات ہی کے ذریعہ ظاہر کی جاسکتی ہے بلکہ اس کی صداقت کا اظہار مختلف طرق و وجوہ سے ممکن ہے جس شخص کے نزدیک صرف معجزات ہی سے نبی کی صداقت کا اظہار ہوسکتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی دلیل پیش کرے اس پر مزید یہ کہ کسی نبی کے صادق ہونے پر معجزات کی دلالت ایک بدیہی امر ہے جو محتاج فکر و نظر نہیں اس لیے کہ دعوی نبوت کے ساتھ معجزہ کا اقتران اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ اللہ تعالے نے وہ معجزہ نبی کی صداقت کے لیے ظاہر کیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص جب بادشاہ سے کہے کہ اگر آپ نے مجھے فلاں جانب ایلچی بنا کر بھیجا ہے تو خلاف معمول تین مرتبہ اٹھیے بیٹھیے اور بادشاہ اس کی تعمیل کردے تو بادشاہ کا یہ فعل اس امر کی دلیل ہوگا کہ قاصد کی تصدیق کے لیے اس نے یہ فعل انجام دیا۔

کیا باری تعالے سے افعال قبیحہ کا صدور ممکن ہے؟

باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ دعوی کہ اہل سنت کے نزدیک جب اللہ تعالی افعال قبیحہ کا مرتکب ہوسکتا ہے تو وہ جھوٹے نبی کی تصدیق بھی کرسکتا ہے"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالے کو قبائح کا مرتکب قرار نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ باری تعالی کو افعال العباد کا خالق مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ افعال قبیحہ کی قباحت کی ذمہ داری بندوں پر عائد ہوتی ہے، خدا پر نہیں۔ اسی طرح ان کا ضرر بھی بندوں کو لاحق ہوتا ہے نہ کہ اللہ تعالے کو۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ فعل خدا کا پیدا کردہ ہے تاہم بندے کا فعل ہے خدا کا نہیں۔ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے یہ بندوں کے افعال نہیں ہوتے کہ ان کو بندوں کے افعال قبیحہ میں شمار کیا جائے۔ باقی رہا کذاب کی تصدیق کرنا تو اس کی

صورت یہ ہے کہ اس کے صادق ہونے کی خبر دی جائے خواہ قول کے ذریعہ ہو یا ایسے فعل سے جو قول کا قائم مقام ہو ظاہر ہے کہ ذات باری سے اس کا صدور محال ہے اس لیے کہ یہ (کذب بیانی) ایک مذموم وصف ہے۔ اور خدا کی ذات اس سے منزّہ ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اہل سنت کے بقول یہ لازم آتا ہے کہ ذات حق کو غفور حلیم اور عفوّ کے صفات سے متصف نہ کیا جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان صفات سے اس صورت میں موصوف ہو سکتا ہے جب وہ فساق و فجار کو سزا دینے کا مستحق ہو اور جب وہ یہ سزا معاف کر دے تو اسے غفور و حلیم کے اسماء حسنیٰ سے ملقب کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ فساق کو سزا دینے کا مستحق جبھی ہو گا کہ گناہ بندے سے سرزد ہو نہ کہ اللہ تعالیٰ سے"۔

اس کا جواب کئی طریق سے ممکن ہے۔

پہلا جواب:۔ بہت سے اہلسنت کہتے ہیں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ غفور و حلیم کے القاب سے اللہ تعالیٰ کو اسی وقت ملقّب کیا جا سکتا ہے جب وہ فساق کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہو بخلاف ازیں استحقاق سے قطع نظر وہ اس صورت میں بھی غفور و حلیم ہے جب وہ سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو اس لیے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو حکم دینا چاہتا ہے دیتا ہے۔

دوسرا جواب:۔ قائل کا یہ قول کہ اگر "اللہ تعالیٰ انسان کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہو"۔ اس سے اس کی مراد یا تو یہ ہے کہ گنہگاروں کو سزا دینا اس کا عدل ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج ہے۔ پہلی بات پر سب کا اتفاق ہے اس سے ظاہر ہوا کہ عفو و مغفرت اس کے فضل و احسان کی آئینہ دار ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق قرار دیتے ہیں ان کا یہی زاویۂ نگاہ ہے جو لوگ افعال العباد کے متعلق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ خدا کے افعال ہیں اور بندہ صرف کاسب ہے، وہ اس بات میں متحد الخیال ہیں کہ سزا اس کے عدل پر مبنی ہے۔

تیسرا جواب:۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے متعلق دو صورتیں ممکن ہیں (۱) پہلی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت کے ساتھ موصوف ہے اور سزا دینا اس کے لیے قبیح ہے (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت سے جبھی موصوف ہو سکتا ہے جب کہ سزا

دینا اس کے لیے جائز ہو۔

پہلی صورت کے مطابق لازم آئے گا کہ وہ اہل ایمان اور نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیے غفار نہیں اس لیے کہ ان کو سزا دینا قبیح ہے اور ان کی مغفرت واجب ہے۔ مزید براں اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ ذات باری انبیاء کے لیے غفور رحیم نہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی رحیم و کریم نہیں جو گناہ کر کے ان سے تائب ہو جائیں اور نیک کام کرنے لگیں۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالے توبہ کرنے والوں کے لیے غفار اور مومنوں پر رحم کرنے والا ہے۔ مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اللہ تعالے علی الاطلاق مغفرت و رحمت سے متصف ہے۔

بندہ معصیت کا فاعل ہے یا کاسب

بندے سے جو معصیت صادر ہوتی ہے اکثر علماء کے نزدیک وہ اس کا فاعل ہے اور بعض کے نزدیک کاسب۔ اس قول کی روشنی میں یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ آدمی ظالم کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ پس اللہ تعالی ظالموں کو سزا دینے کا اس سے بھی زیادہ مستحق ہے۔ جہاں تک اللہ تعالے کے معصیت کو پیدا کرنے کا تعلق ہے وہ اس کی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ یہ جمہور کا نظریہ ہے جو افعالِ خداوندی کو مبنی بر حکمت قرار دیتے ہیں۔ یا معصیت کی تخلیق اس کی مشیت کے تابع ہے یہ ان لوگوں کا نقطۂ نظر ہے جو افعال باری تعالیٰ کو معلل بالحکمت نہیں سمجھتے۔

شیعہ مصنف کا قول ہے۔

اہل سنت کے نزدیک کافر ایمان لانے کے لیے مکلف و مامور ہے حالانکہ بقول ان کے اس میں یہ قدرت ہی موجود نہیں۔ اس سے تکلیف ما لا یطاق لازم آتی ہے جو شرعاً و عقلاً قابل مذمت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ ۲۸۶) (اللہ تعالی کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قائلین تقدیر کے بندہ کی قدرت کے بارے میں دو قول ہیں

پہلا قول:۔ پہلا قول یہ ہے کہ قدرت مع الفعل ہوتی ہے بنا بریں جس کافر کے متعلق علم الٰہی میں

لکھا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا وہ کبھی ایمان لانے پر قادر نہیں ہو گا۔

دوسرا قول:۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو قدرت احکام کے مکلف بنانے میں شرط ہے وہ قبل از فعل اور تا وقوع فعل ہوتی ہے۔ اور جو قدرت فعل کو مستلزم ہوتی ہے وہ لازماً مع الفعل ہوتی ہے۔ ان کے قول کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن پر اپنا فضل خصوصی فرمایا ہے جس کی بنا پر وہ راہ ہدایت اختیار کرتا ہے کافر اس سے محروم ہے۔ نیز یہ کہ عند الفعل بندے کا قادر ہونا ضروری ہے۔ اس کے برخلاف بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بندہ صرف قبل الفعل قدرت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مورد فضل و عنایت ربانی ہونے کے اعتبار سے مومن و کافر مساوی ہیں۔

شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں۔

جمہور اہلسنت کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ کافر ایمان لانے کی قدرت سے بہرہ ور ہے اور ان کے نزدیک سابقہ اعتراض قطعی طور سے بے بنیاد ہے یہ اعتراض صرف دوسرے لوگوں کے اقوال کے پیش نظر وارد ہوتا ہے۔ سابقاً ذکر کردہ دونوں اقوال میں سے جو قول بھی قرین صدق و صواب ہو وہ قول اہلسنت سے خارج نہ ہو گا۔

علاوہ ازیں تکلیف مالا یطاق ـــــ مثلاً معذور کو چلنے کی تکلیف دینا اور آدمی کو اڑنے کا حکم دینا ـــــ جمہور اہل سنت کے نزدیک جو تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں شرعاً نا روا ہے۔ مگر شیعہ مصنف نے جس تکلیف مالا یطاق کا ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے۔ جن کو آدمی اس لیے انجام نہیں دے سکتا کہ وہ ان کی ضد میں مشغول ہوتا ہے مثلاً کافر کا کفر میں منہمک ہونا کی بنا پر ایمان لانے سے قاصر رہنا۔ یا ایک شخص مثال کے طور پر بیٹھا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بعینہ اسی حالت میں کھڑا ہونے پر قادر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک ضد کو انجام دینے کا عزم مصمم کر لیا جائے تو دوسری ضد کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا۔ کافر کو ایمان کا مکلف کرنا اسی قبیل سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقلاً قبیح نہیں۔ بخلاف ازیں سب عقلاء اس ضمن میں متفق الرائے ہیں کہ کسی شخص کو کسی بات کا حکم دینا یا منع کرنا جبکہ وہ حالت امر و نہی میں اس پر عمل پیرا ہونے سے اس لیے قاصر ہو کہ وہ اس کی ضد میں مشغول ہے مگر وہ اس ضد کو چھوڑ کر مامور بہ کو انجام دینے پر قدرت رکھتا ہے بالکل جائز اور روا ہے۔

تکلیف مالایطاق کا پانچواں جواب

جب تکلیف مالایطاق کی تفسیر بایں طور کی جائے کہ وہ ایسا فعل ہے جس کو انجام دینے پر فاعل کو قدرت حاصل نہ ہو تو اس تفسیر کے مطابق امتناع کا دعویٰ مورد نزاع ہوگا اور اس کی نفی محتاج دلیل ہوگی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

اہلسنت کے نقطۂ نگاہ کے مطابق یہ لازم آتا ہے کہ ہمارے وہ افعال اختیاری جو قصد و ارادہ کے تحت ہم سے صادر ہوتے ہیں جیسے دائیں بائیں حرکت کرنا وغیرہ ان اضطراری افعال کی مانند ہو کر رہ جائیں جو بلا ارادہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً نبض کی حرکت یا کسی اونچی جگہ سے گرنے والا جو حرکت کرتا ہے ظاہر ہے کہ افعال اختیاری و اضطراری کے مابین فرق و امتیاز ضروری ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ اس شخص کے نزدیک لازم آتا ہے جس کا قول ہے کہ بندے کو اپنے افعال اختیاری پر قدرت حاصل نہیں یہ کسی معروف امام کا قول نہیں اور تقدیر کے قائلین اہلسنت میں سے کوئی بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ البتہ جہم بن صفوان اور اس کے غالی ہمنوا کہتے ہیں کہ بندہ ہرگز قدرت سے بہرہ ور نہیں۔ وہ کہتے ہیں بندہ اسی طرح حرکت کرتا ہے جیسے درخت ہلانے سے ہلنے لگے۔ اسلامی فرقوں میں سے امام اشعری کا نقطۂ نظر ان سے قریب تر ہے تاہم وہ بندہ کے لیے قدرت محدثہ کا اثبات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فعل بندے کا کسب ہے۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بندے کی قدرت کو ایجاد مقدور سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ بندے میں جس کسب کا اثبات کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔

ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اہل سنت سے بعض اوقات خطا سرزد ہوتی ہے مگر سب اہلسنت خطا کاری کے مرتکب نہیں ہوتے بخلاف ازیں امامیہ خطا کے ارتکاب میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہوتے ہیں اور اجماعی حیثیت سے اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت صداقت ہے کہ جن جن مسائل میں امامیہ نے اہل سنت سے اختلاف کیا ہے۔ ان میں اہل سنت کا مسلک قرین حق و صواب ہے۔ مسئلہ زیر نظر میں جمہور کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ بندہ میں حقیقی قدرت پائی جاتی ہے۔ لہذا وہ فاعل حقیقی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے افعال کا خالق ہے۔

اللہ تعالےٰ نے سورۂ انعام آیت ۱۰۲- سورۂ رعد آیت ۱۶- سورۂ غافر آیت ۶۲ اور سورۂ زمر آیت ۶۲ میں فرمایا۔

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (وہ ہر چیز کا خالق ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ (البقرہ-۱۲۸)

اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لے۔

نیز فرمایا۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي (ابراہیم-۴۰)

اے میرے رب مجھے نماز کا پابند بنالے اور میری اولاد کو بھی

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا (انبیاء-۷۳)

ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

قرآن میں فرمایا۔

وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ (مریم-۳۱)

اور مجھے بابرکت بنایا میں جہاں بھی ہوں

مزید فرمایا۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ (قصص-۴۱)

اور ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو دوزخ کی طرف دعوت دیتے تھے

ارشاد ہوتا ہے

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ (تکویر-۲۹)

اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالےٰ چاہتا ہے۔

اس آیت سے بندے کی مشیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہر کام اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں بتایا گیا ہے کہ بندے

مختلف کام انجام دیتے۔ ایمان لاتے، کفر کرتے، سچ بولتے اور دروغگوئی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ قوت و استطاعت سے بہرہ ور ہیں۔

شیعہ مصنف نے جن اعتراضات کا ذکر کیا ہے یہ اس شخص پر وارد ہوتے ہیں جو رب کے فعل اور مفعول کے مابین فرق و امتیاز نہیں کرتا یا افعال العباد کو افعال خداوندی قرار دیتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ مخلوقات میں قویٰ و طبائع سرے سے موجود ہی نہیں۔ حالانکہ نصوص و معقول دونوں سے ان کی شہادت ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (اعراف ۵۷)

ہم اسے مردہ شہر کی طرف ہانک لے جاتے اس کے ساتھ بارش اتارتے اور بارش سے ہر طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں

نیز فرمایا

فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا (بقرہ-۱۶۴- نحل- ۶۵- جاثیہ- ۵)

اس (بارش) کے ساتھ زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا۔

مسئلہ متنازعہ پر قرآنی آیات سے استشہاد

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔

يَهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ (مائدہ-۱۶)

اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اس شخص کو ہدایت کرتے ہیں جو اسکی رضا مندی کی پیروی کرتا ہے

مزید ارشاد ہوتا ہے

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا وَّيَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا (بقرہ-۲۶)

اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے۔

مزید فرمایا

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً (صافات-۱۵)

کیا ان کو معلوم نہیں کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ طاقتور ہے۔

ارشاد فرمایا۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً (روم-۵۴)

اس نے تمہیں کمزور پیدا کیا اور پھر طاقتور بنا دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبد القیس کے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

"تم میں دو باتیں ہیں جو اللہ تعالےٰ کو پسند ہیں (۱) بردباری (۲) نرم روی و تدریج"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ بندوں کے افعال معدوم ہونے کے بعد عالم وجود میں آتے۔ لہٰذا ان کا حکم بھی وہی ہے جو باقی حوادث کا اور یہ بھی دیگر ممکنات کے زمرہ میں داخل ہیں۔ بنا بریں جس دلیل سے بھی حوادث و ممکنات کے مخلوق ہونے پر استدلال کیا جائے گا اس سے یہ بھی عیاں ہو گا کہ افعال العباد خدا کے پیدا کردہ ہیں۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ ہر مُحدَث (حادث شدہ چیز) اپنے وجود میں مُحدِث (وجود میں لانے والا) کا محتاج ہے۔ یہ مقدمہ جمہور کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ہر ممکن مُرجّح تام کا محتاج ہے۔ جب بندے کے افعال حادث ہیں تو ان کے لیے ایک محدث کا وجود ناگزیر ہے۔ جب بندے کو اپنے افعال کا مُحدِث قرار دیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بندہ آغاز کار میں مُحدِث نہ تھا۔ یہ منصب اسے بعد میں ملا ہے۔ لہٰذا یہ ایک امر حادث ہے اور اسے بھی کسی محدث کی ضرورت ہو گی۔ اس لیے کہ اگر بندہ شروع ہی سے محدث ہوتا تو یہ فعل حادث بھی دائمی ہوتا۔

اور جب بندے کا مُحدِث ہونا حادث ہے تو اس کے لیے کسی اور محدث کی ضرورت ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ بندے کا ارادہ مُحدِث ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ بنا بریں ارادہ حادث ہے اور اس کے لیے کسی اور محدث کا وجود ناگزیر ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ ارادہ بندے کے ارادہ سے عالم وجود میں آیا تو کہا جائے گا کہ اس ارادہ کے لیے بھی محدث کی ضرورت ہے خلاصہ کلام یہ کہ بندے میں جس محدث کو بھی آپ فرض کریں گے تو اس میں اسی قسم کی گفتگو کی جا سکتی ہے جیسے حادث اول میں بیان ہوئی۔ اگر بندہ کے افعال کو قدیم اور ازلی قرار دو گے تو یہ محال ہے اس لیے کہ جو فعل بندہ سے وابستہ ہو وہ قدیم نہیں ہو سکتا اور اگر کہو کہ فعل بندے کا وصف

ہے اور اس کی قدرت اس میں پیدا کی گئی ہے اور اس میں اسی طرح گفتگو کا امکان ہے جس طرح ارادہ میں تو اس صورت میں بھی مرجح تام کا وجود ضروری ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ نے اس مقام پر انتہائی دقت نظر اور ہمہ گیری سے کام لے کر حوادث کا تسلسل ثابت کیا ہے"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

اہلسنت کے نقطۂ نظر کو ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ جو آدمی ساری عمر صالحہ اعمال انجام دینے میں کھپا دے اور جو عمر بھر افعال قبیحہ کا ارتکاب کرتا ہے دونوں مساوی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ نہ ہم اول کی مدح کر سکتے ہیں اور نہ ثانی کی قدح۔ اس لیے کہ ایک کی نیکی اور دوسرے کی برائی دونوں کا فاعل حقیقی اللہ تعالے ہے"۔

صالح و طالح کی عدم مساوات

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات قطعی طور سے بے بنیاد ہے اس لیے کہ نیکی و بدی کے مشترکہ طور پر خدا کے پیدا کردہ ہونے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کا حکم بھی ایک ہے اس میں شبہ نہیں کہ خدا کے سوا ہر چیز اسی کی پیدا کردہ ہے اور اس کی مخلوق ہونے میں سب مشترک ہیں۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (فاطر-۱۹) (اندھا اور بینا برابر نہیں ہوتے)

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالے نے جنت و جہنم، عالم و جاہل، شہد و زہر، راحت و رنج اور آدم و ابلیس سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ جب شرع و عقل دونوں اس امر میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں کہ جس چیز میں منفعت و مصلحت پائی جاتی ہو وہ واجب المدح ہے اگرچہ جمادات ہی سے کیوں نہ ہو تو جس شخص کو اللہ تعالے نے مخلوقات سے انتہائی احسان کرنے والا بنایا ہو وہ کیونکر مدح کیے جانے کا زیادہ مستحق نہ ہو گا۔ برائی کے بارے میں بھی یونہی کہا جا سکتا ہے۔

بخلاف ازیں منکرین تقدیر کہتے ہیں کہ احسان کی بنا پر کوئی شخص قابل مدح ہو سکتا ہے اور نہ ایذا رسانی کے باعث قابل قدح۔ وہ مدح و ستائش کا مستحق اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اللہ نے اسے محسن نہ بنایا ہو۔ اس نے نیک کام کر کے ہم پر احسان نہیں کیا اور نہ برائی کر کے ہمیں

آزمائش میں ڈالا۔ ان کے قول کی حقیقت یہ ہے کہ جہاں بندے کا شکر ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں خدا کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا اور جہاں شکر خداوندی مطلوب ہوتا ہے وہاں بندے کا شکریہ ادا کرنا بے سود ہے وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے رسول علیہ السلام کے ذریعہ ہمیں جو تعلیم و تبلیغ بہم پہنچائی ہے یہ اس کا احسان نہیں ہے۔

اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا (آل عمران - ۱۶۴)

اللہ تعالےٰ نے مومنوں میں اپنا رسول بھیج کر ان پر بڑا احسان کیا ہے۔

منکرین تقدیر کہتے ہیں۔

فرشتوں کا بندوں کے لیے طلب مغفرت کرنا۔ علماء کا لوگوں کو علم و فضل سے بہرہ ور کرنا اور حکام کا عدل و انصاف کے ساتھ معاملات طے کرنا خداوندی انعامات میں شامل نہیں ہے ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ ملوک و سلاطین کو عادل یا ظالم بنانے پر قادر نہیں ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی کو نفع رساں بنا سکتا ہے۔ نہ ضرر رساں"۔

منکرین تقدیر کے مذکورہ بالا اقوال کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حال میں بھی مدح و ستائش کا مستحق نہیں۔ اس لیے کہ شکر اخروی انعامات پر ادا کیا جا سکتا ہے یا دنیوی پر۔ جہاں تک دنیوی انعامات کا تعلق ہے وہ منکرین تقدیر کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے واجب ہیں۔ باقی رہا اخروی فضل و احسان تو بقول منکرین تقدیر خدا نے وہ بندوں پر کیا ہی نہیں تاکہ اس کا شکر ادا کیا جائے بلکہ ان کی رائے میں اللہ تعالےٰ کسی کو مومن متقی اور صالح نہیں بنا سکتا اور نہ ہدایت عطا کر سکتا ہے جہاں تک اخروی انعامات کا تعلق ہے ان کی جزا واجب ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قائلین تقدیر محسن کی تعریف کرتے اور نقصان پہنچانے والے کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اس امر میں متحد الخیال ہیں کہ دونوں فعل خدا کے پیدا کردہ ہیں اس سے واضح ہوا کہ منکر تقدیر کا یہ دعویٰ کہ تقدیر کا عقیدہ رکھنے والے اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں کر سکتے قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ مزید براں یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نیکی کرنے والا مدح و ثواب کا مستحق ہے اور برائی کا ارتکاب کرنے والا ذم و عقاب کا سزاوار ہے۔

روافض کی امام ابو حنیفہ رح پر دروغگوئی

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔
"امام موسیٰ کاظم رح صغیر السن تھے کہ امام ابو حنیفہ رح نے ان سے دریافت کیا معصیت کس سے صادر ہوتی ہے؟ امام موسیٰ نے جواباً فرمایا (۱) بندے سے (۲) اللہ تعالےٰ سے (۳) یا دونوں سے۔
اگر معصیت کا مصدر و منبع ذات خداوندی ہے تو اللہ تعالےٰ بندے پر کیونکر ظلم کر سکتا اور اسے ناکردہ گناہ کی سزا دے سکتا ہے؟ اور اگر دونوں سے صادر ہوتی ہے تو اللہ تعالےٰ اور بندہ گناہ کے ارتکاب میں برابر کے شریک ہوئے اللہ تعالیٰ قوی ہے اور اس لائق ہے کہ اپنے ضعیف بندے سے منصفانہ برتاؤ کرے گا۔
اور اگر بندہ گناہ کا مرتکب ہونے میں منفرد ہے تو مذمت و ملامت کا سزاوار بھی وہی ہوگا۔ امام ابو حنیفہ رح نے یہ سن کر فرمایا۔ "یہ ایسی نسل ہے کہ اس کے بعض افراد کا دوسرے سے گہرا رابطہ ہے"۔
اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جو بات سنداً مذکور ہو ہم اس کی صحت سے آگاہ ہیں۔ جو بات شیعہ مصنف نے بیان کی ہے وہ قطعی طور پر جھوٹ ہے اس لیے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تقدیر کے قائل ہیں اور انہوں نے فقہ اکبر میں منکرین تقدیر کی تردید کی ہے۔ لہٰذا وہ اس شخص کی تائید نہیں کر سکتے جو یہ کہتا ہو کہ اللہ تعالےٰ نے بندوں کے افعال کو پیدا نہیں کیا۔ مزید براں امام موسیٰ بن جعفر، متقدمین شیعہ اور دیگر علماء اہل بیت تقدیر کے قائل تھے۔ انکار تقدیر شیعہ میں اس وقت ہوا جب وہ بنو بُویہ[1] کے دور حکومت میں معتزلہ سے مل جل گئے۔ شیعہ مصنف نے امام موسیٰ بن جعفر سے جو قول نقل کیا ہے اس کے بیان کرنے والے زیادہ تر منکرین تقدیر کے کم سن لوگ اور بچے ہیں۔ یہ نظریہ قدریہ کے آغاز ظہور اور امام موسیٰ کی ولادت سے بھی

---

[1] بنو بُویہ نے ایران اور بلاد مشرق کو تشیع کے جہنم میں جھونک دیا۔ یہ شیعہ کا پہلا دور تھا۔ دوسرے دور کا آغاز خدا بندہ نامی سلطان کے عہد حکومت سے ہوتا ہے۔ اسی بادشاہ کے لیے اس شیعہ مصنف نے یہ کتاب تصنیف کی جس کی تردید کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو قلم اٹھانا پڑا۔ شیعہ کا تیسرا دور ایران کے سلاطین صفویہ سے شروع ہوتا ہے ۱۲

پہلے لوگوں میں معروف تھا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ قدریہ نے اموی دور میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت میں پر پرزے نکالنے شروع کیے۔

قائل کا یہ قول کہ "اَلْمَعْصِیَۃُ مِنْہُ" ایک مجمل ومبہم لفظ ہے جو محتاج تشریح ہے ظاہر ہے کہ معصیت ہو یا طاعت وعبادت ایک عرض (وہ چیز جو اپنے وجود میں کسی دوسری چیز کی محتاج ہوا ہے جو قائم بالغیر ہے اور اپنے قیام میں کسی محل کی محتاج ہے۔ یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ اس کا قیام بندے کے ساتھ ہے اللہ کے ساتھ نہیں اور جو چیز بھی خدا کی پیدا کردہ ہے اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے بایں معنی کہ وہ اس کی پیدا کردہ ہے۔ مگر اس سے الگ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ قائم ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ موصوف ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (جاثیہ۔۱۳)

جو چیز بھی آسمان وزمین میں ہے اللہ نے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ (سورۃ النحل۔۵۳)

تمہارے جو بھی نعمت ہے وہ خدا کی طرف سے ہے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اہلسنت کے افکار وآراء سے لازم آتا ہے کہ کافر اپنے کفر کے باوصف اطاعت شعار ہو۔ اس لیے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ خداوندی ارادہ کے مطابق کیا ہے"۔

شیعہ مصنف کا یہ خیال اس امر پر مبنی ہے کہ آیا طاعت خداوندی امر کے مطابق ہے یا ارادہ کے؟ نیز یہ کہ کیا امر ارادہ کو مستلزم ہے یا نہیں؟ ہم قبل ازیں یہ حقیقت الم نشرح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال کو اپنے ارادہ سے پیدا کیا۔ بعض اوقات وہ ایسی چیز کو پیدا کرتا ہے جس کا وہ حکم نہیں دیتا۔ اس بات پر سب علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ اگر کوئی

شخص حلف اٹھا کر یہ کہے کہ کل وہ اس کا حق ادا کر دے گا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ۔ کل کا روز گذر جائے اور وہ قدرت کے باوجود اس کی تعمیل سے قاصر رہے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ اور اگر اِنْ شَاءَ اللّٰہُ کے الفاظ میں مشیت کا لفظ امر کے معنی میں ہوتا تو وہ حانث ٹھہرتا کیونکہ وہ اس کا مامور ہوتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس جب کسی فعل مامور پر حلف اٹھا کر اسے مشیت باری تعالیٰ سے معلق کر دیا جائے تو قسم کھانے والا اس میں حانث نہیں ہوتا۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (یونس-۹۹)

اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کرۂ ارضی پر بسنے والے سب ایمان لے آتے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ امر اور مشیت میں فرق ہے

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا (الانعام-۱۲۵)

اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے مگر ضلالت کا حکم نہیں دیتا۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ لفظ ارادہ کا اطلاق دو معنوں پر کیا جاتا ہے۔ (۱) ارادہ قدریہ (۲) ارادہ شرعیہ۔ یہ دوسرا مفہوم محبت و رضا کو شامل ہے پہلا نہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اہلسنت کے نظریہ کو تسلیم کرنے سے اللہ تعالےٰ کا سفیہ (کم عقل) ہونا لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کافر کو ایمان لانے کا حکم دیتا ہے مگر اس کا ارادہ نہیں کرتا"

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں (۱) ارادۃ الخلق (۲) ارادۃ الامر۔

شیعہ مضمون نگار مزید لکھتا ہے۔

اہل سنت کے بقول یہ لازم آتا ہے کہ ہم خدا کی گرفت سے ڈر کر ابلیس لعین کی پناہ میں آئیں۔ جب کہ یہ آیت قرآنی "فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ" کے صریح منافی ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت کفار و ابلیس کو گناہوں سے منزّہ قرار دے کر انھیں خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بنابریں اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کے حق میں ابلیس سے بھی بدتر ہے۔ تعالی اللہ عن ذالک"۔

ابلیس سے پناہ جوئی

جواباً عرض ہے کہ یہ کلام ساقط عن الاحتجاج ہے۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ (۱) پہلی صورت یہ ہے کہ ابلیس نے کچھ افعال انجام دئے ہوں گے (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ بصورت ثانی اس کی پناہ حاصل نہیں کی جاسکتی اس لیے کہ جب ابلیس سرے سے کوئی کام ہی انجام نہیں دیتا تو وہ کسی کو پناہ بھی نہیں دے سکتا اور اگر بصورت اول وہ بعض افعال کا مرتکب ہوچکا ہے تو وہ گناہوں سے منزّہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اعتراض دونوں صورتوں میں باطل ہے خواہ تقدیر کا اثبات کیا جائے یا نفی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ابلیس سے پناہ جوئی اس صورت میں مستحسن ہے جب وہ پناہ دینے پر قادر ہو۔ خواہ اللہ تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق قرار دیا جائے یا نہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ شیعہ مصنف اور اس کے ہمنوا منکرین تقدیر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ابلیس وہ کام انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں نہیں لکھے۔ نیز یہ کہ ابلیس بلا ارادہ خداوند بھی بعض افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کسی شخص کو نیک عمل سے ہٹا کر برے کام پر نہیں لگا سکتا اور نہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ افعالِ قبیحہ سے ہٹا کر نیک اعمال پر لگا دے۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

"اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَبِكَ مِنْكَ"

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے بعض صفات و افعال کے ساتھ اس کے بعض افعال سے پناہ طلب کیا کرتے تھے گویا اللہ تعالےٰ کے عقاب و عتاب سے خود اسی کی پناہ طلب کرتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ممتنع ہوا کہ اس کی بعض مخلوقات کی ایذا سے اس کی پناہ طلب کی جائے۔ اہل سنت کے یہاں اس بات میں کوئی قباحت نہیں پائی

جاتی کہ بندہ اپنے رب کی پناہ طلب کرے اور اسے پکار کر اپنی حاجات و ضروریات کا ازالہ کرے چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی کہ والدہ اپنی اولاد پر ہوتی ہے۔ لہذا اسباب شر سے اس کی پناہ طلب کرنا عین قرین عقل و دانش ہے۔

ارباب علت و حکمت کا قول ہے کہ

"اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اسی طرح پیدا کیا جس طرح سانپوں، بچھوؤں اور آگ جیسی موذی اشیاء کو کیونکہ ان کی تخلیق گہری مصلحت پر مبنی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو اس نے حکم دیا ہے کہ ہم امکانی حد تک اپنے سے ضرر و ایذا کو دور کریں جس کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے دامن حکمت و رحمت میں پناہ لی جائے۔"

جو لوگ علت و حکمت کے قائل نہیں ان کا قول ہے کہ

"اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو خلق فرمایا باوجودیکہ وہ بنی نوع انسان کے لیے ضرر رساں ہے۔ اس کے ضرر کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ ہم باری تعالیٰ کے دامنِ عافیت میں پناہ لیں جس طرح آگ کے ضرر سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے بجھا دیا جائے اور زہر کے ضرر سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تریاق استعمال کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے نافع و ضار دونوں قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں اور ہمیں ان باتوں کا مامور فرمایا جو ہمارے لیے سود مند ہیں۔ اگر وہ ہماری امداد فرمائے تو یہ اس کا احسان ہے وہ ورنہ جیسے چاہے کرے۔"

اہل سنت پر شیعہ مصنف کا افتراء

شیعہ مضمون نگار کا یہ قول کہ اہلسنت کے یہاں کافر و ابلیس گناہوں سے پاک ہیں۔ صریح قسم کا بہتان ہے۔ بخلاف ازیں اہل سنت بالاتفاق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معصیت کا ارتکاب کرنے والا عاصی اور قابل مذمت ہے۔ نیز یہ کہ افعال کے ساتھ اس شخص کو موصوف کر سکتے ہیں جو ان کو انجام دیتا ہو پیدا کرنے والے کو نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صفت کا انتساب اس موصوف کی جانب جس کے ساتھ اس کا قیام ہے اضافۃ المخلوق الی الخالق کے قبیل سے ہے۔

منکر تقدیر شیعہ انتہائی طوالت سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اہل سنت کے نقطۂ نظر کے مطابق اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلسنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جانب دروغگوئی کی نسبت درست ہے بنابریں اس کی دی ہوئی خبریں بھی جھوٹ ہوں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء کی بعثت عبث ہوگی اور کسی فائدہ کی موجب نہیں ہوگی"

اس کا جواب یہ ہے کہ خالق و فاعل کے مابین فرق واقتیاز سب عقلاء کے نزدیک مسلم ہے مثلاً اللہ تعالیٰ جب کسی چیز میں حرکت پیدا کرے گا تو ذات باری کو متحرک قرار نہیں دے سکیں گے جب وہ بادل میں گرج پیدا کرتا ہے تو گرج کو اس کی آواز نہیں کہہ سکتے۔ بعینہٖ اسی طرح جب وہ حیوانات و نباتات میں مختلف قسم کے رنگ پیدا کرتا ہے تو اسے ان رنگوں سے موصوف قرار نہیں دے سکتے جب وہ کسی چیز میں علم اور حیات وقدرت کی صفات پیدا کرتا ہے تو یہ اس کی صفات نہیں کہلا سکتیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جب وہ کسی چیز میں اندھا پن اور بہرہ پن پیدا کرتا ہے تو یہ اس کی صفت نہیں کہلاتی جب اللہ تعالیٰ کسی میں روزہ، طواف اور خشوع وخضوع پیدا کرتا ہے تو اسے روزہ دار، طواف کنندہ اور خاشع کے ناموں سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ باقی رہی قرآن حکیم کی مذکورہ ذیل آیت کریمہ

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (انفال۔۱۷)

جب آپ نے تیر پھینکا تو وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکا ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ وہ تیر آپ نے پھینکا ہے مگر اسے نشانہ پہ لگانا آپ کا فعل نہیں بلکہ فضل خداوندی کے فضل وکرم کی کرشمہ سازی ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ تیراندازی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے اور اسے دشمنوں تک پہنچانا خدا کا کام۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ تیرانداز اور تیراندازی دونوں خدا کے پیدا کردہ ہیں لہٰذا حقیقی تیرانداز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یہ خیال قطعی طور سے بے بنیاد ہے۔ اگر کسی چیز کے پیدا کرنے کی بنا پر اس کی نسبت ذات باری کی جانب کی جا سکتی تو ہر فعل کو خدا کی جانب منسوب کر دیا جاتا۔ حالانکہ یہ بداہۃً غلط ہے۔ روایات میں مذکور ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محصور ہوئے تو بلوائی آپ پر پتھر پھینکنے لگے۔ حضرت عثمان نے پوچھا تم پتھر کیوں پھینکتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم پتھر نہیں پھینک رہے

بلکہ اللہ تعالےٰ پھینکتا ہے۔ آپ نے فرمایا تم جھوٹ کہتے ہو اگر اللہ تعالےٰ پتھر پھینکتا تو اس کا نشانہ ہرگز نہ چوکتا مگر تمہارے سب نشانے بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں اللہ تعالےٰ یہ جانتے ہوئے دروغگوئی کی قدرت پیدا کرتا ہے کہ وہ شخص جھوٹ بولے گا اسی طرح وہ اس علم کے باوصف ظلم وفحش کی قدرت عطا کرتا ہے کہ یہ آدمی ظلم وفحش کا مرتکب ہوگا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہم میں سے جو شخص افعالِ قبیحہ کے انجام دینے میں کسی کی مدد کرتا ہے وہ گویا بذاتِ خود ان افعال کا ارتکاب کرتا ہے بنا بریں ظلم وکذب کی مدد کرنے والے کو ظالم وکاذب قرار دیا جائے گا۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ ۵-۲)

ظلم وتعدّی میں کسی کی مدد نہ کرو

صفاتِ خداوندی کا اثبات

اگر سوال کیا جائے کہ اللہ تعالےٰ نے بندے کو قدرت اطاعت کے لیے عطا کی ہے۔ نافرمانی کے لیے نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اسے معلوم تھا کہ قدرت ملنے پر نافرمانی کریگا تو یہ اسی طرح ہوا جیسے کسی کو کفار سے جہاد کرنے کے لیے تلوار دی جائے جبکہ یہ معلوم ہو کہ وہ اسی تلوار سے کسی نبی کو قتل کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ باتیں بندوں کے بھی مناسب حال نہیں ہے تو خدا کی ذات اس سے کہیں بلند ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو چیز ممکن الوقوع ہو اور اللہ تعالےٰ اس پر قادر ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز وقوع پذیر بھی ہو جائے بخلاف ازیں ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ قدرت کے باوصف وہ بہت سے کام انجام نہیں دیتا مثلاً وہ سمندر کو پارے میں تبدیل نہیں کرتا۔ پہاڑوں کو یاقوت کی شکل میں متشکل نہیں کرتا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ کذب سے منزہ ہے اور کذب کا صدور اس سے محال ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ صفاتِ کمال سے موصوف ہے۔ موجوداتِ عالم میں

جو کمال بھی پایا جاتا ہے اللہ تعالےٰ اس کا زیادہ حقدار ہے وہ ہر نقص و عیب سے منزہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حیات اور علم و قدرت صفات کمال ہیں لہذا وہ ان کا زیادہ مستحق ہے۔ راستبازی و صداقت بھی اس کا خاص وصف ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (نسا۔ ۸۷) (اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کہنے والا اور کون ہے)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اَصْدَقَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ (سب سے سچا کلام اللہ کا ہے)

پانچویں بات یہ ہے کہ اہل سنت کی رائے میں خدا کا کلام قائم بذاتہ اور غیر مخلوق ہے اس میں شبہ نہیں کہ کلام ایک صفت کمال ہے۔ لہذا خداوند تعالےٰ کا اس سے متصف ہونا ناگزیر ہے خواہ کلام کی کوئی صورت بھی ہو۔ اس ضمن میں ان کے متعدد اقوال ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ صفتِ کلام خدا کی قدرت و مشیت سے وابستہ نہیں یہ ایک صفت ہے جو قائم بالنفس ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ کلام حروف یا اصواتِ قدیمہ کا نام ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ کلام مشیت ایزدی سے متعلق ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ پہلے متکلم نہ تھا یہ صفت بعد ازاں اس میں پیدا ہوئی۔

پانچواں قول یہ ہے کہ وہ ازل ہی سے متکلم تھا۔

دروغگوئی بہرہ پن اور گونگے پن کی طرح ایک عیب ہے۔ اللہ تعالےٰ بلا شبہ گونگے اور بہرے لوگوں کو پیدا تو کرتا ہے مگر بذاتِ خود اس میں یہ عیب نہیں پایا جاتا۔ بعینہٖ اسی طرح وہ کاذب میں کذب کو جنم تو دیتا ہے مگر خود دروغگوئی کا ارتکاب نہیں کرتا۔

چھٹی بات یہ ہے کہ یہ سوال شیعہ پردارد ہوتا ہے۔ شیعہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ دوسروں میں کلام پیدا کرتا ہے۔ اندریں صورت کلام کا قیام اگرچہ دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے مگر اسے خدا کا پیدا کردہ قرار دیں گے اس کے ساتھ ساتھ شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو کلام بندوں سے صادر ہوتا ہے وہ خدا کا کلام نہیں اور اس کا پیدا کردہ بھی نہیں۔ جب ان کے نزدیک یہ دونوں باتیں درست ہیں تو اس بات کا اعتراف کرنا ان کے لیے ناگزیر ہے کہ یہ اس کا کلام ہے اور وہ اس کا کلام نہیں۔

شیعہ مصنف کہتا ہے

"اہل سنت کے قول کے مطابق یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالے جھوٹے نبی بھیجتا ہے"۔

ہم جواباً کہیں گے کہ بلاشبہ اللہ تعالے جھوٹے نبی بھیجتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیَاطِیْنَ عَلَی الْکَافِرِیْنَ (مریم - ۸۳)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم شیطانوں کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں

دوسری جگہ ارشاد فرمایا

بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَا (اسراء - ۵) (ہم نے اپنے بندے تمہارے پاس بھیجے)

مگر اللہ تعالے ان کے جھوٹ کو فوری طور پر آشکار کر دیتے ہیں۔ مثلاً مسیلمہ اور اسود عنسی جھوٹے نبی تھے اللہ تعالے نے انکا کاذب ہونا آنحضور کے ذریعہ واضح کر دیا تھا۔ بنا بریں ان کا صدق و کذب کسی پر مخفی نہیں رہا۔ اگر وہ کہیں کہ جب اللہ تعالے جھوٹے انبیاء کو پیدا کر سکتا ہے تو ان پر صدق کے علامات ظاہر کرنا بھی اس سے کچھ بعید نہیں تو یہ سراسر باطل ہے اور اگر کہیں کہ صدق کے علامات کا اظہار محال ہے تو ظاہر ہے کہ علامات صدق کے بغیر ادعائے نبوت بے سود ہے جیسے کوئی شخص طبیب ہونے کا مدعی ہو مگر اس کے پاس اپنے دعوی کے اثبات میں کوئی دلیل نہ ہو۔

جھوٹے نبیوں کے ہاتھوں معجزات کا ظہور

اگر یہ کہا جائے کہ جب اللہ تعالے کاذب کی ذات میں کذب کو پیدا کر سکتا ہو تو اس کے ہاتھوں ایسے معجزات کیوں ظاہر نہیں کر سکتا جو اس کی صداقت کی دلیل ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں، اس لیے کہ صدق کے دلائل صداقت کو مستلزم ہیں کیونکہ دلیل مدلول کو مستلزم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کذاب پر علائم صدق کا اظہار ممتنع لذاتہ ہے۔ اگر وہ کہیں کہ کذاب کے ہاتھوں خوارق کا ظہور جائز ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ مدعی الوہیت مثلاً دجال کے حق میں یہ جائز ہے۔ مدعی نبوت سے خوارق کا ظہور صرف اس صورت میں ممکن ہے۔ جب ان خوارق سے کسی کی صداقت واضح نہ ہوتی ہو جس طرح ساحر و کاہن سے ایسے خوارق کا ظہور جائز نہیں جو اس کے صدق کی دلیل ہوں۔

ساتویں بات یہ ہے کہ نبوت کے دلائل و براہین کا دائرہ صرف خوارق ہی میں نہیں بلکہ ان کی کئی قسمیں ہیں جس طرح جھوٹ کی پہچان حاصل کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔

شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے۔

"اگر اہل سنت کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس سے شرعی حدود کا بے کار ہونا لازم آتا ہے مثلاً زنا اور سرقہ جیسے جرائم کا صدور جب اللہ تعالےٰ کے ارادہ کے مطابق ہو اور اس کا ارادہ ان افعال کی انجام دہی میں مؤثر ہو تو کسی بادشاہ کو اس پر گرفت کرنے کا حق حاصل نہ ہو گا۔ اس لیے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ سارق وزانی کے خدا کے ارادہ سے باز رکھنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ہمیں اپنے ارادہ کی تکمیل سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو ہمیں اس سے کوفت ہو گی تو پھر خدا کو یہ بات کیونکر پسند ہو گی؟ اس سے یہ بھی لازم آئیگا کہ اللہ تعالےٰ لیقینین کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ ایک طرف تو وہ معصیت کا ارادہ کرتا ہے اور پھر اس سے روکتا بھی ہے"۔

ہم جواباً کہیں گے کہ اللہ تعالےٰ نے صرف ان امور کو مقدر کیا تھا جو ظہور پذیر ہو چکے۔ جو امور تاہنوز عالم وجود میں نہیں آئے وہ خدا کے علم میں مقدر بھی نہیں ہیں۔ جو امور وقوع پذیر ہو چکے ہیں کوئی شخص ان کے روکنے پر قادر نہ تھا۔ شرعی حدود وزواجر سے ان امور کو روکا جاتا ہے جو ابھی وقوع میں نہیں آئے۔ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "وہ شخص سارق کو اللہ کے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے"۔ صریح جھوٹ ہے اس لیے کہ وہ شخص تو سارق کو اس کام سے روکنا چاہتا ہے جو اس نے ابھی سرانجام نہیں دیا۔ اور جو کام ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا اس کا خدا نے ارادہ بھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلف اٹھا کر کہے کہ ان شاء اللہ وہ اس مال کو چرائے گا اور پھر اسے نہ چرائے تو وہ اجماعاً حانث نہیں ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں چاہا کہ وہ سرقہ کا مرتکب ہو۔

ارادہ اور امر میں فرق و امتیاز

بخلاف ازیں قدریہ (منکرین تقدیر) ارادہ کو امر کے معنی میں لیتے ہیں بنا بریں وہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ سرقہ جب اللہ تعالےٰ کے ارادہ سے وقوع میں آتا ہے تو وہ مراد کے ساتھ

ساتھ مامور بھی ہے حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالے نے سرقہ کا حکم نہیں دیا۔ جو شخص اس کا قائل ہے اس کا کفر کسی شک وشبہ سے بالا ہے۔ علاوہ ازیں بالاتفاق بندہ کی تقدیر میں بعض باتیں ایسی مقدر ہوتی ہیں جن کا دور کرنا ایک امر مستحسن ہوتا ہے مثال کے طور پر بیماری انسان کی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے مگر علاج معالجہ اور اس کے اسباب سے پرہیز کر کے اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بھی اللہ کے ارادہ کو دور کرنا ہوا۔ اسی طرح آگ کا بجھانا اور گرنے والی دیوار کی مرمت کرنا لحاف اوڑھ کر سردی کا مداوا کرنا حرارت سے بچنے کے لیے سایہ میں آنا یہ سب اسی قبیل سے ہیں۔ ان میں خدا کی مراد و مقدر تکلیف کا ازالہ اسی کے پیدا کردہ راحت و آرام سے کیا جاتا ہے یہ سب امور خدا کے پیدا کردہ اور بندہ کی تقدیر میں لکھے ہوتے ہیں۔

سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا کہ ادویہ سے علاج کرنے۔ دم جھاڑے اور دوران مرض مضر اشیاء سے پرہیز کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور کیا یہ چیزیں خدا کی تقدیر کو ٹال سکتی ہیں؟ حضور نے فرمایا یہ بھی تقدیر میں شامل ہیں۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ (رعد-۱۱)

اس کے سامنے اور پیچھے باری باری آنے والے فرشتے ہیں جو اسے امر الٰہی سے محفوظ رکھتے ہیں

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اس سے اللہ تعالے کے بارے میں یہ لازم آتا ہے کہ وہ نقیضین کا ارادہ کرنے والا ہے"۔ ساقط عن الاعتبار ہے۔ اس لیے کہ ان دو چیزوں کو باہم نقیض قرار دیتے ہیں جن کا اجتماع اور ارتفاع محال ہو یا وہ دو چیزیں جن کا باہم جمع ہونا ممکن نہ ہو ان کو ایک دوسرے کی ضد بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زجر و عتاب اس امر کے بارے میں نہیں ہوتا جو وقوع پذیر ہو چکا ہو اور اس کا ارادہ بھی کر لیا گیا ہو۔ بخلاف ازیں زجر کی حیثیت ماضی کے اعتبار سے سزا کی ہوتی ہے اور مستقبل کے لحاظ سے زجر و توبیخ کی۔ جو زجر اس کے حسب ارادہ ہوتا ہے اگر اس سے امر مقصود حاصل ہو جائے تو اس سے صرف زجر مراد ہوتا ہے اور اگر مقصود حاصل نہ ہو تو یہ زجر کا اہل نہیں جس طرح کسی کو تلوار مارنے کا ارادہ کیا جاتا ہے اور کسی کو زندہ رکھنے کا اور جس طرح اس مہلک مرض کا ارادہ کیا جاتا ہے جو بعض اوقات موت کا باعث بنتا ہے اور اس سے

زندگی کا ارادہ بھی کیا جاتا ہے۔

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔

"یہ بات قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ ہمارے افعال ہماری جانب منسوب کیے جاتے اور ہمارے ارادہ کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں چنانچہ جب ہم دائیں جانب کرنا چاہتے ہیں تو وہ بائیں جانب واقع نہیں ہوتی اور اگر بائیں جانب حرکت کرنا مقصود ہو تو دائیں طرف حرکت نہیں کرتے۔ یہ ایسی مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس میں کسی شک وریب کی گنجائش نہیں"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ جمہور اہل سنت یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہمارے افعال کی نسبت ہماری طرف کی جاتی ہے اور ہم ہی ان کو عالم وجود میں لاتے ہیں قرآن کی نصوص کثیرہ سے یہ حقیقت الم نشرح ہوتی ہے اس ضمن میں یہ امر محتاج غور وفکر ہے کہ بندہ پہلے فاعل اور ارادہ کنندہ نہ تھا بعد میں اس وصف سے بہرہ ور ہوا۔ بنا بریں اس کا ایک امر حادث ہونا اظہر من الشمس ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں (۱) اس کا کوئی مُحدِث ہوگا (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی اس کا محدث نہیں۔

بصورت ثانی حوادث کا ظہور بلا کسی محدث کے لازم آتا ہے۔ بصورت اول وہ مُحدِث یا تو بندہ خود ہوگا یا ذات باری تعالے۔ اگر بندہ کو مُحدِث قرار دیا جائے تو پھر اس کا اور بھی کوئی مُحدِث ہوگا جس کا نتیجہ تسلسل کی صورت میں رونما ہوگا جو کہ باطل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ نیست سے ہست ہوا ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایسے حوادث کا قیام ممکن نہیں جن کا نقطہ آغاز معلوم نہ ہو۔ مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ بندے کا مُرید و فاعل ہونا ذاتِ باری تعالیٰ کا رہین منت ہے۔ اسی لیے اہل سنت کہتے ہیں کہ بندہ فاعل ہے اور خدا نے اسے فاعل بنایا ہے۔ بندہ صاحب ارادہ ہے اور خدا نے اسے صاحب ارادہ بنایا۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (تکویر - ۲۹)

اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

نیز ارشاد فرمایا۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ (ابراہیم - ۴۰) (اے میرے رب مجھے نماز کا پابند بنا دے)

بندے کا ارادہ مشیت ایزدی کے تابع ہے

سابق الذکر بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ بندے کا ارادہ اپنی جگہ پر درست ہے مگر مشیت ایزدی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ جو شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ بندے کا ارادہ کسی علت کا محتاج نہیں اس کا قول بے حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارادہ ایک حادث چیز ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایک مُحدِث کا وجود از بس ناگزیر ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا سبب اور کسی محل کے بغیر ارادہ کو عالم وجود میں لاتا ہے وہ تین محالات کا ارتکاب کرتے ہیں۔

(۱) حادث کا خداوندی ارادہ کے بغیر وجود میں آنا۔

(۲) کسی سبب کے بغیر حادثہ کا ظہور پذیر ہونا۔

(۳) صفت کا قیام بلا محل

اگر سوال کیا جائے کہ جب بندہ اپنے ارادہ کی تکمیل خود کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کا مُحدِث کیونکر ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ارادہ کو جنم دیا بدیں وجہ وہ اس کا مُحدِث ہے بندہ ارادے کا فاعل ہے کیونکہ اس نے خدا کی ودیعت کردہ قدرت و مشیت سے اس رادہ کی تکمیل کی۔ یہ دونوں احداث ایک دوسرے کو متلزم ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا بندے کے فعل کو پیدا کرنا وجود فعل کو متلزم ہے اور بندے کا فاعل ہونا اس امر کو متلزم ہے کہ رب تعالےٰ اس کا خالق ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

قرآن کریم میں اکثر افعال انسانی کو بنی نوع انسان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (النحل - ۳۲)

جنت میں داخل ہو کیونکہ تم نیک کام کیا کرتے تھے

نیز ارشاد فرمایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْھَا (جاثیہ - ۱۵)

جو شخص نیک کام کرے گا وہ اپنے لیے کریگا اور جو برائی کریگا اس کا وبال اسی پر ہوگا۔

اس ضمن میں شلیعہ مصنف نے متعدد آیات نقل کی ہیں۔

انسانی افعال اور مشیت ایزدی

ہم جواباً کہیں گے کہ قرآن حکیم میں یہ ٹھیک ہے کہ انسانی افعال کی نسبت بنی نوع آدم کی طرف کی گئی ہیں مگر قرآن میں ایسی آیات کی بھی کمی نہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسانی افعال مشیت ایزدی سے وجود میں آتے ہیں۔ حسب ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلُوْا (بقرہ - ۲۵۳) (اگر اللہ تعالےٰ چاہتا تو وہ نہ لڑتے)

(۲) وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکُوْا (اگر اللہ تعالےٰ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے)

(سورۃ الانعام - ۱۰۷)

(۳) فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ (انعام - ۱۲۵)

اللہ تعالےٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو کھول دیتے ہیں۔

(۴) یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّ یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا (بقرہ - ۲۶)

وہ اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے

(۵) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ (انفال ۲۴)

خوب جان لو کہ اللہ تعالےٰ آدمی اور اس کے دل میں حائل ہو جاتا ہے

شلیعہ مضمون نگار لکھتا ہے

"ہمارے مخالفین کا قول ہے کہ صاحب قدرت کے ہر دو مقدورین سے بلا مرجح کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی - ظاہر ہے کہ ترجیح دینے کی صورت میں فعل واجب ہو جاتا ہے اور قدرت باقی نہیں رہتی - علاوہ ازیں اس سے لازم آتا ہے کہ بندہ خدا کا شریک ہو"۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ خدائے قادر سے مقابلہ کرنے والی بات ہے۔ اگر قدرت مرجح کی محتاج ہو اور مرجح سے نتیجہ کا ظہور و وقوع واجب ہو جاتا ہو تو اس سے اللہ تعالےٰ کا مختا

نہیں بلکہ موجب ہونا لازم آتا ہے جس کا نتیجہ کفر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ بندے کو مقہور و معدوم کرنے پر قادر ہے تو اس کے شریک ہونے کا احتمال کیونکر پیدا ہو گیا؟

آیت قرآنی "وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ" کا جواب یہ ہے کہ اس میں ان بتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن کو وہ خود ہی گھڑا کرتے تھے۔ ان بتوں کی مذمت میں فرمایا۔

اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (صافات ۹۵-۹۶)

کیا تم ان کو پوجتے ہو جن کو خود ہی گھڑ لیتے ہو۔ حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

شیعہ مصنف نے قائلین تقدیر کے صرف چند دلائل بیان کیے ہیں۔ بایں ہمہ تین دلائل کا شیعہ کے پاس کوئی صحیح جواب نہیں۔

پہلی دلیل کے معقول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص یہ دلیل پیش کرتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ جب فعل واجب ہو جاتا ہے تو قدرت باقی نہیں رہتی۔ اس کے برخلاف عام اہلسنت کا قول ہے کہ بندے میں قدرت پائی جاتی ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ جبریہ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ جبریہ کہتے ہیں کہ یہ قدرت موثر نہیں ہوتی۔ ہم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں کہ قدرت اسی طرح مؤثر ہوتی ہے جیسے اسباب اپنے مسببات پر اثر انداز ہوتے ہیں البتہ قدرت میں خلق وابداع کی تاثیر نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں اس امر سے بھی مذکورہ بالا دلیل کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب قدرت کا مقدور کسی مرجح کے بغیر ترجیح نہیں پا سکتا۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ مرجح بندے میں نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اس کا من جانب اللہ ہونا متعین ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرجح تام کے موجود ہونے کی صورت میں فعل کا پایا جانا ضروری اور اس کا عدم وجود ممتنع ہوتا ہے اس لیے کہ اگر مرجح کے پائے جانے کے بعد بھی فعل کا وجود و عدم مساوی ہو جیسے کہ وجود مرجح سے قبل تھا تو وہ فعل ممکن ٹھہرے گا اور ممکن کا وجود اسی صورت میں عدم کے مقابلہ میں راجح

ہوتا ہے جب کوئی مرجح تام پایا جاتا ہو۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اس سے فعل خداوندی کے ساتھ معارضہ لازم آتا ہے"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عقلی و یقینی دلیل ہے اور یقینیات کا معارضہ ممکن نہیں۔ مزید براں قدرتِ ربانی مرجح کی محتاج ہے۔ ظاہر ہے کہ مرجح صرف خدا کا ارادہ ہی ہو سکتا ہے۔ یہ امر بھی مسلّم ہے کہ ارادۂ الٰہی کا صدور غیر سے ممکن نہیں بخلاف بندے کے ارادہ کے کہ وہ غیر سے صادر ہو سکتا ہے۔ جب ارادہ الٰہی مرجح ہوا تو فاعل بالاختیار ہو گا۔ نہ کہ موجب بالذات بلا اختیار۔ اندریں صورت کفر بھی لازم نہیں آئے گا۔

کیا اللہ تعالیٰ موجب بذاتہٖ ہے؟

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا موجب بالذات ہونا لازم آتا ہے"۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا قدرت و ارادہ تاثیر پیدا کر دیتا ہے؟ یا تمہارا مقصد یہ ہے کہ مرجح یعنی ارادہ مع القدرت کے ساتھ تاثیر کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بصورت اول ہم تلازم کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے کہ ہم فرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صاحب قدرت اور ترجیح دینے والا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں دو چیزیں ہیں (۱) قدرت (۲) دوسری چیز کو ہم ارادہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر یہ کہنا کیونکر درست ہے کہ اللہ تعالیٰ قدرت و ارادہ کے بغیر ترجیح دینے والا ہے؟

اور اگر شیعہ مضمون نگار کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ارادہ مع القدرت کے پائے جانے کی صورت میں نتیجہ کا ظہور ایک لابدی امر ہے تو یہ ایک حق بات ہے اور سب اہل اسلام اس کے قائل ہیں اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو عالم وجود میں لانا چاہتے ہیں وہ اس کی قدرت و مشیت کے مطابق ظہور پذیر ہو جاتی ہے بعینہٖ اسی طرح جس چیز کا وجود ذاتِ باری کو پسند نہیں ہوتا وہ اس کی مشیت و قدرت کے نہ ہونے کی بنا پر عالم وجود میں نہیں آتی پہلی قسم مشیتِ ایزدی کے باعث واجب اور دوسری عدمِ مشیت کی وجہ سے ممتنع ہوتی ہے۔

قدریہ (منکرین تقدیر) کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ بعض اشیاء کو چاہتے ہیں مگر وہ وجود پذیر نہیں ہوتیں اور بعض اشیاء اس کی مشیت کے بغیر ظہور میں آجاتی ہیں۔ صریح ضلالت کا آئینہ دار ہے۔ اللہ تعالےٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ دو حال سے خالی نہیں (۱) اس کا وجود میں آنا واجب ہو (۲) دوسرا یہ کہ اس کا ظہور پذیر ہونا ضروری نہ ہو۔

بصورت اول مطلوب حاصل ہو گیا اور مرجح کے ہوتے ہوئے اثر دنتیجہ بھی رونما ہو گیا۔ خواہ اس کا نام موجب بالذات رکھا جائے یا کچھ اور۔ بصورت ثانی اس چیز کا وجود واجب نہیں لہذا وہ ممکن ہوئی جس کا وجود و عدم مساوی ہے اور جس کے لیے کسی مرجح کا ہونا از بس ضروری ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

مزید براں ہم شیعہ قلمکار سے کہیں گے کہ تم نے جو عقلی دلیل بایں طور پیش کی ہے کہ بندہ کے اختیاری افعال اسی کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں اور اسی کے حسب اختیار وقوع میں آتے ہیں ان افعال سے چکنا چور ہو جاتی ہے جن کو بندہ انجام نہیں دیتا۔ مثلاً انسان اپنی صوابدید کے مطابق اپنے کپڑے کو رنگتا ہے اور اس کو انسان کی صنعت شمار کیا جاتا ہے حالانکہ رنگ اس کا پیدا کردہ نہیں اسی طرح کھیتی باڑی اور درخت بعض اوقات انسان اپنی مرضی سے بوتا ہے اور اس فعل کو انسان کی جانب منسوب بھی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگانا اس کا کام نہیں ہے۔ اس بیان سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ جو چیز انسان کی طرف منسوب ہو اور اس کے حسب مرضی وقوع پذیر ہو یہ ضروری نہیں کہ اس کی پیدا کردہ ہو۔ یہ عقلی معارضہ ہے۔

باقی رہا شیعہ مضمون نگار کا یہ قول کہ "اس میں شرک کیسے پیدا ہو گیا"۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حوادث کا بلا قدرت خداوندی پیدا ہو جانا ہی بہت بڑا شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین تقدیر کو مجوس کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ جو خیر و شر کے دو الگ الگ خالق تسلیم کر کے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"توحید کی شیرازہ بندی عقیدۂ تقدیر سے ہوتی ہے"۔

قدریہ کا نقطہ نگاہ نہ صرف شرک بلکہ صفات الٰہی کے انکار کو بھی مستلزم ہے۔ اس عقیدہ

کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بعض حوادث کسی خالق کے بغیر از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ خدا کے سوا کوئی اور فاعل مستقل بھی موجود ہے۔ یہ دونوں کفر کی شاخیں ہیں اس لیے کہ ہر کفر کی جڑ تعطیل و شرک کے تخم سے جنم لیتی ہے۔ فلاسفہ بھی اسی زعم فاسد میں مبتلا ہیں۔ کہ افلاک فاعل مستقل ہیں اور وہ حوادث ارضی کو جنم دیتے ہیں مگر تعجب ہے کہ وہ قدریہ کے اس قول کو تسلیم نہیں کرتے کہ "اللہ تعالے اس عالم ارضی کو پیدا کرنے سے قبل بیکار تھا"۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالے پہلے بھی افعال سے معطل رہا ہے اور بدستور اسی حالت پر قائم ہے جو چیزیں لوازم ذات میں داخل ہیں مثلاً عقل و فلک یہ اس کا فعل نہیں۔ کیونکہ فعل کا ظہور تدریجی طور پر ہوتا ہے جو چیز ذات کے لوازم میں سے ہو وہ صفات کے قبیل سے ہوتی ہے۔ مثلاً انسان کا رنگ اور درازی قد ظاہر ہے کہ یہ اس کا فعل نہیں بخلاف ازیں اس کی حرکات کو اس کا فعل قرار دے سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ حرکات بھی اس کے لیے مقدر تھیں۔

نفس انسانی کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ دل میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں وہ ہنڈیا کی اس حالت سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں جب وہ جوش و خروش کا پیکر بنی ہوئی ہوتی ہے۔

فاعل کی تعریف

خلاصۂ کلام! فاعل دراصل وہ ہے جس کے ساتھ کوئی فعل وابستہ ہو اور اس فعل کا ظہور اس سے تدریجاً ہو۔ بخلاف ازیں جس کے ساتھ کوئی وصف ازل ہی سے مقارن چلا آرہا ہو وہ وصف اس کا فعل نہیں۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ فلاسفہ اصلاً خدا کے لیے کسی فعل کا اثبات کرتے ہی نہیں اور بایں طور وہ اصلی معطلہ ہیں۔ ارسطو اور اس کے اتباع صرف علتِ اولیٰ کے قائل ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ وہ حرکت افلاک کی علتِ غائی ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ حرکتِ فلک انسانی حرکت کی طرح اختیاری ہے۔ لہٰذا اس کے لیے کسی مراد و مطلوب کا وجود ناگزیر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افلاک کی حرکت علتِ اولیٰ کے ساتھ تماثل و تشابہ کی رہین احسان ہے۔ ان کے استدلال کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالے وجود عالم کی شرط ہے اور وہ عالم کو اسی طرح متحرک رکھتا ہے جیسے معشوق عاشق کو۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ ذہن نشین کر سکتے ہیں

مثلاً ایک شخص لذیذ کھانے کو دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے یا محب محبوب کو دیکھ کر اس کی طرف حرکت کرے۔ ظاہر ہے کہ دونوں مثالوں میں حرکت کی علت لذیذ کھانا اور محبوب کا وجود ہے۔

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک حرکتِ افلاک کا محدث و خالق فلک کے سوا اور کوئی نہیں۔ جس طرح قدریہ کے نزدیک حیوان کے افعال کا خالق بھی حیوان ہی ہے۔ بنا بریں فلاسفہ کے نزدیک فلک ایک بڑے حیوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ فلاسفہ جملہ حوادث عالم کے بارے میں قدریہ کے ہم نوا ہیں اور بنا بریں شر و فساد کی جڑ ہیں۔ فلاسفہ قدریہ کی طرح حوادث کو جسمانی طبائع کی جانب منسوب کرتے ہیں اور ان کے خالق و موجد کو تسلیم نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ خلاق کائنات کو وجود عالم کی شرط قرار دیتے ہیں۔

فلاسفہ کی جہالت و ضلالت

بعض فلاسفہ فلک کو واجب الوجود ٹھہراتے مگر اس کے لیے ایک علت غائی یا علت فاعلی کا اثبات کرتے ہیں جس کی عند التحقیق کوئی حقیقت نہیں اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کہ فلاسفہ ذات باری کے متعلق جاہل مطلق ہیں اور انھیں خدا کی ہستی کا کچھ علم نہیں۔ فلاسفہ میں سے کچھ لوگ بعض مذاہب کی طرف منسوب ہیں مثلاً فارابی، ابن سینا، موسیٰ بن میمون یہودی اور یحییٰ بن عدی عیسائی یہ الحاد و دہریت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست سے بیگانہ اور ارسطو کے اتباع سے بھی گئے گذرے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بعض متکلمین ان کے زمرہ میں شامل ہو کر توحید باری اور اسماء و صفات الٰہی۔ کے اثبات ایسے اسلامی عقائد کو چھوڑ بیٹھے یہ لوگ صرف توحید ربوبیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ توحید ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و رب ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرکین بھی اس توحید کے قائل تھے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (زخرف۔ ۸۷)

اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے

ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (یوسف - ۱۰۶)

ان میں سے اکثر بحالت شرک اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔

جو توحید بندوں سے مطلوب ہے دراصل وہ توحید الوہیت ہے جس میں توحید ربوبیت بھی داخل ہے۔ توحید خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے۔ اسی سے ڈرا جائے اور اسی کو پکارا جائے۔ عبادت کے معنی ہیں انتہائی عجز دنیاز۔ ذات ربانی کے لیے صفات کمال کا اثبات اور اس کے لیے اخلاص نیت توحید میں داخل ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (بینہ - ۵)

انھیں تو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خلوص نیت سے اس کی عبادت بجالائیں۔

دو چیزیں شرک کی اصل واساس ہیں (۱) تعطیل (باری تعالےٰ کو صفات کمال سے عاری قرار دینا) فرعون اور نمرود تعطیل کا عقیدہ رکھتے تھے۔

(۲) صفات باری میں دوسروں کو شریک قرار دینا۔ یہ عقیدہ امم واقوام میں تعطیل کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اہل شرک ہمیشہ انبیاء کے خلاف برسرپیکار رہے ہیں حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالفین میں دونوں فریق پائے جاتے تھے معطلہ بھی اور مشرکین بھی۔ تعطیل ذات کا عقیدہ تعطیل صفات کی نسبت کم رائج ہوا۔ تعطیل صفات کا نظریہ تعطیل ذات کو مستلزم ہے۔ تعطیل صفات کے قائل واجب الوجود کو ان صفات سے متصف کرتے ہیں جو ممتنع الوجود کا خاصہ ہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ سلف صالحین میں سے جو شخص آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم، صحابہ وتابعین کرام سے جتنا بھی زیادہ قریب تھا۔ وہ اسی قدر توحید وایمان اور عقل وعرفان سے قریب تر تھا اور جو شخص ان سے جتنا بھی زیادہ دور تھا وہ اسی قدر ان اوصاف سے بعید تر تھا۔ بنابریں متکلمین میں سے جو لوگ متاخر تھے ـــــ اور جنھوں نے علم الکلام کو فلسفہ سے گڈمڈ کردیا ـــــ مثلاً امام رازی، علامہ آمدی اور ان کے نظائر وامثال یہ لوگ اثبات توحید و

صفاتِ کمال میں امام جوینی سے کم درجہ کے تھے۔ علیٰ ہذا القیاس اس ضمن میں امام جوینی، قاضی ابوبکر ابن الطیب اور ان کے معاصرین سے فروتر درجہ کے تھے۔ اور یہ لوگ کسی طرح بھی امام ابوالحسن اشعری کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے۔[1] جب کہ امام اشعری کا درجہ ابو محمد بن کُلّاب سے نیچے ہے اور ابن کلّاب اس ضمن میں ائمہ سلف کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ متکلمین میں سے جو لوگ تقدیر کے قائل ہیں وہ منکرین تقدیر معتزلہ و شیعہ کی نسبت اثباتِ توحید و صفاتِ کمال میں ان سے کہیں بہتر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قائلین تقدیر باری تعالیٰ کے لیے کمال قدرت کمال مشیّت کمال خلق اور اس کے منفرد ہونے کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ تنہا تمام اعیان و اعراض کا خالق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے میں قوتِ اختراع اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرتِ اختراع اللہ تعالیٰ کے جملہ خصائص میں سے ایک ہے اور صرف یہی صفت اس کی خصوصی صفت نہیں بخلاف ازیں

---

[1] متکلمین کے احوال و کوائف سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص دو حقیقتوں سے کلیۃً آگاہ ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ متکلمین اسلامی حقائق کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے والوں کے مقابلہ میں کلامی فلسفہ کے اسالیب کو ایک شرعی ضرورت تصور کیا کرتے تھے۔ البتہ عرصۂ دراز تک اسے جاری رکھنے کی بنا پر وہ ان اسالیب و اطوار کے خوگر ہو گئے تھے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ آگے چل کر جب ان میں پختگی کے آثار پیدا ہوئے تو نورِ الٰہی کی بدولت ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ ان کلامی مباحث سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ لاحق ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ان اسالیب کو ترک کرنے کا میلان پیدا ہوا۔ اور وہ عقائد میں سلف صالحین کی پیروی کرنے لگے۔

ہم قبل ازیں امام جوینی کی کتاب "الرسالۃ النظامیہ" کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ جب ابوجعفر ہمدانی نے علو کے موضوع پر آپ سے تبادلہ افکار کیا تو امام جوینی طریق سلف کی جانب لوٹ آئے تھے۔ اس سے بھی عمدہ ترین واقعہ یہ ہے جو امام اشعری کو ان کی زندگی کے دور ثالث میں پیش آیا اور اسی پر ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ان کی تصنیف "کتاب الابانۃ" میں مذکور ہے جو ان کی آخری کتاب ہے (شذرات الذہب ج ۲ ص ۳۰۳ نیز مجلۃ الازہر ۲۶ ص ۳۱-۳۳)

تقدیر کا انکار کرنے والے شیعہ و معتزلہ حیوان کے احوال کو خدا کی مخلوق قرار نہیں دیتے۔ دراصل ان کے نزدیک ان حوادث کا کوئی بھی خالق نہیں بلکہ ان کو انجام دینے والے خدا کے شریک ہیں۔ متاخرین قدریہ میں سے بہت سے لوگ بندوں کو ان کا خالق قرار دیتے ہیں۔ البتہ متقدمین قدریہ اس سے احتراز کرتے تھے۔

شیخ الاسلام نے اس مقام پر بڑی طویل بحث کی ہے اور منطقیانہ انداز میں بڑے دقیق مباحث چھیڑ دیے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

لَوْ کَانَ فِیْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (انبیاء۔۲۲)

اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو ان میں فساد پیدا ہو جاتا۔

برہان تمانع

شیخ الاسلام نے یہ آیت نقل کر کے اس میں برہان تمانع کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس عالم ارضی کے دو صانع ہوتے تو اور ان میں سے ایک کسی بات کا ارادہ کرتا تو دوسرا اس کی مخالفت کرتا۔ مثلاً ایک چاہتا کہ آفتاب مشرق سے طلوع ہو اور دوسرا چاہتا کہ مغرب سے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا ارادہ پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ جمع بین الضدین ہے۔ بنا بریں جس کی بات پوری نہ ہوگی وہ رب نہیں ہو سکتا۔ بعینہٖ اسی طرح دونوں خداؤں میں سے ایک جب کسی چیز کو حرکت دینا چاہے اور دوسرا اسی چیز کو ساکن کرنا چاہے تو بھی یہی صورت ہوگی۔

اگر سوال کیا جائے کہ دونوں خداؤں کے ارادے باہم متحد بھی ہو سکتے ہیں تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ دو رب فرض کرنے کی صورت میں یا تو ان میں سے ہر ایک بذات خود قادر ہوگا یا دوسرے کے ساتھ ملے بغیر قدرت سے بہرہ ور نہ ہوگا۔ بصورت ثانی وہ ممتنع لذاتہ ہوگا نیز اس سے علت و فاعل دونوں میں دور لازم آئے گا۔ اس کی وجہ اس امر کا امکان ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو قادر بنایا ہو۔ یہ بات مُسلّم ہے کہ دونوں خداؤں میں سے ہر ایک اسی صورت فاعل ہو سکتا ہے جب وہ قدرت سے بہرہ ور ہو۔ جب دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو قادر بنایا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک نے دوسرے کو فاعل بھی بنایا یعنی رب ہونے میں اس کی مدد کی۔ ظاہر ہے کہ جب دونوں رب واجب و قدیم

تھے تو وہ ایک دوسرے کے محتاج کیونکہ ہوتے۔ یہ بداہتہً ممتنع ہے۔

کیا رُویتِ باری تعالےٰ ممکن ہے؟

شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے۔
"اشاعرہ کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرد عن الجہات ہونے کے باوصف آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے حالاں کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (انعام۔۱۰۳) (آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں)

اشاعرہ اس بدیہی بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ آنکھ سے صرف اس چیز کا ادراک کرنا ممکن ہوتا ہے جو بالکل سامنے ہو یا اس کے حکم میں ہو۔

اشاعرہ کہتے ہیں ممکن ہے کہ ہمارے سامنے رنگا رنگ کے بلند پہاڑ کھڑے ہوں اور ہم انہیں دیکھ نہ سکیں۔ ہر طرف سے ہیبت آوازیں آرہی ہوں اور ہم انہیں سن نہ سکیں یا کثیر التعداد عساکر برسر پیکار ہوں مگر ہم ان کی صور و حرکات کو دیکھنے سے قاصر رہیں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دور افتادہ مغرب میں اقامت پذیر ہونے کے باوصف مشرق کے ایک ذرّہ تک کو ملاحظہ کر سکیں۔ یہ ایک زبردست مغالطہ ہے۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ ائمہ سلف آخرت میں رویت خداوندی کے قائل ہیں۔ احادیث متواترہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جمہور قائلین رویت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کو بروز قیامت اسی طرح دیکھیں گے جیسے آمنے سامنے کسی چیز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور جس طرح دیکھنا عقلاً معروف ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"تم بروز قیامت اسی طرح دیدار الٰہی سے مشرف ہوگے جس طرح تم آفتاب کو دیکھتے ہو اور لوگوں کی بھیڑ دیکھنے سے مانع نہیں ہوتی۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جیسے تم مطلع صاف ہونے کی صورت میں شمس و قمر کو دیکھتے ہو"

دوسری روایت میں فرمایا۔
جب مطلع صاف ہو تو آفتاب و ماہتاب کے دیکھتے وقت کیا لوگوں کی بھیڑ مانع ہوتی ہے؟

لوگوں نے کہا "نہیں" فرمایا "تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح شمس و قمر کو دیکھتے ہو"۔

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ روبرو ہونے کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتے ہیں ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ذات باری فوق العالم نہیں چونکہ وہ ذات باری کے لیے رویت کا اثبات اور علو کی نفی کرتے ہیں۔ بنا بریں اس امر کی ضرورت لاحق ہوئی کہ دونوں مسئلوں میں تطبیق دے کر یہ ثابت کریں کہ ان میں تضاد نہیں ہے۔ اشاعرہ کی ایک جماعت بھی یہی نظریہ رکھتی ہے۔ اشاعرہ کے ائمہ اللہ تعالیٰ کو فوق العرش تسلیم کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں معتزلہ فوقیت و رویت کسی کو بھی نہیں مانتے۔ جب ہم ذات باری کا تذکرہ کرتے ہوئے معتزلہ سے یہ کہتے ہیں کہ نہ اس کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے نہ اس کی طرف کوئی چیز چڑھتی اور نہ اس کی جانب سے کوئی چیز اترتی ہے۔ نہ وہ عالم ارضی کے اندر داخل ہے اور نہ اس سے خارج۔ اس کی طرف ہاتھ بھی نہیں اٹھائے جا سکتے تو معتزلہ ان سب باتوں سے انکار کر دیتے ہیں اس کے عین برخلاف اشاعرہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے ایسے اجسام و اصوات پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے جن کو دیکھنے سے ہم قاصر ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں دور افتادہ ذرات دکھانے پر بھی قادر ہے۔ اشاعرہ یہ نہیں کہتے کہ ایسا وقوع پذیر بھی ہوتا ہے یا نہیں صرف قدرت باری کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی چیز کے وقوع کا جواز اس کے ظہور پذیر ہونے میں شکوک و شبہات کا اظہار کرنے سے ایک جداگانہ چیز ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

اشاعرہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ازل سے وابستہ ہیں۔ یہ احکام اس نے جب صادر فرمائے تو مخلوقات میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ "یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ" نیز "یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ" وغیرہ سب احکام اسی زمانہ کے دئے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص تنہا بیٹھا ہو۔ کوئی غلام اس کے پاس نہ ہو اور وہ یوں کہے کہ "اے فلاں اٹھ"۔ یا "اے فلاں کھاؤ"۔ تو جو شخص یہ الفاظ سنے گا۔ حیرانی کے عالم میں اس سے پوچھے گا کہ تم کس سے مخاطب ہو اور اگر وہ اس کے جواب میں کہے کہ میں یہ حکم ان خادموں کو دے رہا ہوں جو ایک سال کے بعد خرید دوں گا۔ تو ہر شخص اسے احمق تصور کرے گا"

فرقۂ کلّابیہ کا زاویۂ نگاہ

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ فرقۂ کلّابیہ کا نظریہ ہے جو معتزلہ کی طرح قرآن کو مخلوق قرار دیتے ہیں جو لوگ قرآن کو غیر مخلوق قرار دیتے ہیں مثلاً کرامیہ، سالمیۂ ائمہ سلف اور مذاہب اربعہ کے اہل الحدیث وہ اس نظریہ کے قائل نہیں جس کا تذکرہ شیعہ مضمون نگار نے کیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اکثر شیعہ اور ائمہ اہلبیت بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں فرقۂ کلّابیہ اور اشاعرہ نے یہ نظریہ اس لیے اختیار کیا کہ اس مسئلہ کی اصل و اساس میں وہ معتزلہ کے ہمنوا ہیں یہ سبب حدوث اجسام کی دلیل کو صحیح تسلیم کرنے میں یک زبان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اس چیز کو بھی حادث قرار دیتے ہیں جو حوادث سے خالی نہ ہو وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس چیز کے ساتھ حوادث کا قیام ہو وہ حوادث سے خالی نہ ہوگی۔ جب کہا جاتا ہے کہ جسم حرکت و سکون سے خالی نہیں ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ازلی سکون ممتنع الزوال ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ازل سے موجود ہے اور جو چیز ازل سے موجود ہو اس کا زوال محال ہوتا ہے۔ علی ہذا القیاس جو چیز حرکت کو قبول کر سکتی ہو اور وہ ازلی بھی ہو تو اس کی حرکت بھی ازلی اور ممتنع الزوال ہوگی۔ ازلی حرکت کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آئے گا کہ کچھ ایسے حوادث بھی ہوں جو ازلی ہوں اور ان کا نقطۂ آغاز معلوم نہ ہو۔ حالانکہ یہ ممتنع ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ ذات باری کے ساتھ حوادث کا قیام ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں انھیں بخوبی معلوم ہے کہ کلام متکلم کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہوتا ہے جس طرح صفت علم کا قیام عالم کے ساتھ ہوتا ہے اور حرکت کا متحرک کے ساتھ۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ جو کلام اللہ تعالےٰ کسی دوسری چیز میں پیدا کر دیتے ہیں وہ اس کا کلام نہیں ہوتا بلکہ وہ اس چیز کا کلام کہلائے گا جس کے ساتھ وہ قائم ہے۔ جب ان کے نزدیک یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کلام کا قیام صرف متکلم کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ معتزلہ کی ہمنوائی میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حوادث ذات قدیم کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتے۔ تو ان ہر دو قواعد سے کلام کا قدیم ہونا ثابت ہو گیا۔

کیا اصوات قدیم ہیں؟

اشاعرہ کے نزدیک اصوات کی قدامت ممتنع ہے وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صوت چونکہ

عرض ہے اس لیے وہ) وہ زمانوں تک باقی نہیں رہ سکتی۔ بنا بریں یہ بات متعین ہو گئی کہ کلام قدیم ایک معنوی چیز ہے اور حرف و صوت سے عبارت نہیں۔ اندریں صورت وہ ایک ہی صفت سے متصف ہو گا اگر وہ ایک سے بڑھ جائے تو اسے غیر محدود ماننا پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ غیر متناہی معانی کا وجود ممتنع ہوتا ہے وہ کہتے ہیں ہم اس بات میں تمہارے ہم خیال ہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی مراد و مقدور ہو وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتی۔ تاہم ہم یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کلام خداوندی اس کی پیدا کردہ مگر اس سے منفصل ہے۔ اس سے تناقض لازم آیا۔ اگر کسی طرح جمع و تطبیق ممکن ہو تو تناقض رفع ہو جائے گا۔ تطبیق ممکن نہ ہونے کی صورت میں دونوں مسئلوں میں سے ایک کو مبنی بر خطا تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ وہی مسئلہ غلط ہو جس میں ہم نے تمہاری مخالفت کی ہے بلکہ ازیں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ جس مسئلہ میں ہم متحد الخیال ہیں وہی درست نہ ہو وہ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت و قدرت کے مطابق وہ کلام نہیں کرتا جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حالانکہ جمہور اہل الحدیث، متکلمین کرامیہ اور شیعہ سب یہی عقیدہ رکھتے ہیں بالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہیئے کہ اکثر اسلامی فرقے اس کے قائل ہیں۔ جب مجبوراً ہمیں دونوں فرقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہم آہنگ ہونا پڑا تو ہم اس فرقہ کی موافقت کو پسند کرینگے جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو بولتا ہے جو فرقہ یہ کہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی اور چیز میں اپنا کلام پیدا کر دیتا ہے۔ ہم اس کے ہم نوا بننا پسند نہیں کریں گے اسلیے کہ یہ نظریہ شرعاً و عقلاً فاسد ہے۔

ایک اور طریقہ سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک کسی معدوم چیز کو خطاب کا اہل نہیں سمجھا گیا اور کسی چیز سے بشرط وجود مخاطب ہونا اس متکلم کے وجود کو تسلیم کرنے کی نسبت اقرب الی العقل ہے جس کا کلام اس کے ساتھ قائم نہ ہو اور رب ہونے کے باوصف جس سے صفات کمال مسلوب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جس عرض کو بھی کسی جسم میں پیدا کیا ہے وہ اس جسم کی صفت ہے خالق کی نہیں۔ باقی رہا اس چیز سے مخاطب ہونا جو سر دست اگرچہ معدوم ہے تاہم اس کا وجود متوقع ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ وصیت کنندہ بعض اوقات کہتا ہے

کہ میری موت کے بعد ایسا کریں ویسا کریں اور جب میرا فلاں بچہ بالغ ہو جائے تو میرا یہ حکم اسے پہنچا دیا جائے۔ بعض اوقات وہ اپنی جائداد وقف کرنے کی وصیت کرتا ہے جو عرصۂ دراز تک باقی رہتی ہے اور اس نگران کے نام وصیت کر جاتا ہے جو وصیت کے وقت پیدا بھی نہیں ہوا ہوتا۔

شئیہ مصنف کا یہ قول کہ "غیر موجود غلام کا نام لے کر پکارنا حماقت کی دلیل ہے" اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مالک اسے موجود سمجھ کر پکارے تو اس کی قباحت میں کلام نہیں اور اگر اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اس غلام کو پکار رہا ہے جس کا وجود متوقع ہے۔ مثلاً وہ یوں کہے کہ مجھے ایک صادق القول شخص نے بتایا ہے کہ میری لونڈی غانم نامی ایک بچہ جنے گی جب وہ بچہ پیدا ہو تو وہ آزاد ہے میں اپنی اولاد کو بھی اس بات کی وصیت کر جاتا ہوں اور اس پیدا ہونے والے بچے کو فلاں فلاں بات کی وصیت کرتا ہوں۔ یہ وصیت بالکل درست ہے اس لیے کہ یہ خطاب ایک ایسے بچہ سے ہے جو حاضر فی العلم مگر مشاہدہ کے اعتبار سے غائب ہے۔

انسان لبسا اوقات ان لوگوں سے خطاب کرنے کا خوگر ہے جو اس کے حاشیۂ خیال میں موجود ہوں اور خارج میں موجود نہ ہوں۔ تخیل کے اسی عالم میں وہ ذہنی اشخاص سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: "اے فلاں کیا میں نے تجھ سے فلاں بات نہیں کہی تھی؟"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپ کا گذر صحرائے کربلا میں ہوا تو آپ نے فرمایا "اے ابو عبداللہ (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) صبر کیجئے"۔

اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ "اللہ کے بندو ثابت قدم رہو"۔ حالانکہ وہ لوگ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ قرآن کریم میں بھی ایسی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اپنی ذات اور ملائکہ کے بارے میں بعض باتیں بصیغۂ ماضی بیان کی ہیں حالانکہ وہ ظہور قیامت کے بعد وقوع پذیر ہوں گی۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَنَادٰى اَصْحَابُ الْجَنَّةِ اَصْحَابَ النَّارِ (اعراف - ۴۴)

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر-۳۴)

اور وہ کہیں گے خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔

نیز فرمایا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ (غافر-۴۹)

دوزخ والے جہنم کے خازنوں سے کہیں گے۔

مسئلہ عصمتِ انبیاء

رافضی مضمون نگار لکھتا ہے۔

امامیہ و اسماعیلیہ کے علاوہ دیگر اسلامی فرقوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انبیاء و ائمہ غیر معصوم ہیں۔ بنا بریں ان کے خیال میں ایک نبی کاذب و سارق اور سہو و نسیان کا مرتکب ہو سکتا ہے (نعوذ باللہ من ذلک)

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ مسلکِ جمہور پر عظیم افترا ہے۔ خوارج کے سوا مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء خداوندی احکام کے پہنچانے میں معصوم تھے اور ان کی اطاعت واجب ہے۔ جمہور کے نزدیک انبیاء سے صغائر کا صدور ممکن ہے تاہم وہ صغائر پر قائم نہیں رہتے۔

البتہ عصمتِ ائمہؒ کے بارے میں شیعہ مضمون نگار کا بیان درست ہے۔ ہم اس کے قائل نہیں۔ امامیہ و اسمٰعیلیہ کے سوا مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی ائمہ کو معصوم قرار نہیں دیتا۔ اس لیے کہ یہ دعوی بلا دلیل ہے۔ روافض کا یہ قول کہ "یہ عالم ارضی ائمہ کے وجود سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ کیونکہ کائنات ارضی کی بھلائی اسی میں مضمر ہے"۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ شیعہ جس امام منتظر کے لیے زحمت کشِ انتظار ہیں ان کے وجود سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچا؟ خواہ ہماری طرح انھیں مردہ تصور کیا جائے یا شیعہ کی طرح انھیں زندہ قرار دیں۔ اسی طرح امام غائب کے اجداد کے وجود سے بھی دنیا کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ جس طرح یہ خاکدان ارضی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مسعود سے نفع اندوز ہوا تھا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت عہد کے بعد بارہ ائمہ میں سے حکومت وسلطنت کی باگ ڈور صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو سکون و آرام نصیب ہوا حضرت علی کے پر آشوب دور خلافت کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ جب تنازع پیدا ہو تو اللہ ورسول کی طرف رجوع کیا جائے اگر مسلمانوں میں رسول علیہ السلام کے سوا کوئی اور بھی معصوم ہوتا تو اس کی طرف مراجعت کرنے کا حکم صادر کیا جانا ضروری تھا۔

بخاری ومسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے میرے محب مکرم آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ "امیر کی اطاعت کرتے رہو اگرچہ وہ مقطوع الاعضاء حبشی غلام ہو"۔ صحیح مسلم میں ام الحصین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اطاعت کرتے رہو اگرچہ تم پر ایک سیاہ فام کان کٹے حبشی غلام کو امیر کیوں نہ مقرر کر دیا جائے بشرطیکہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں تمہاری قیادت کر رہا ہو۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔

امام کے نائب غیر معصوم ہو سکتے ہیں

امامیہ اور دیگر شیعہ فرقوں کے نزدیک امام کے نائب غیر معصوم ہو سکتے ہیں۔ ان کی رائے میں یہ بھی جائز ہے کہ امام ان کی عصمت سے ناآشنا ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو حاکم مقرر کیا تھا پھر آپ کو پتہ چلا کہ جن لوگوں کی طرف آپ نے انھیں بھیجا تھا وہ ان کے خلاف نبرد آزما ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اکثر نائبین خیانت کار تھے اور بعض آپ سے بھاگ بھی گئے تھے یہ بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ ائمہ میں عصمت کی شرط شریعت سے ثابت نہیں اور مزید براں بے فائدہ بھی ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

اہل سنت نے رائے وقیاس کو اختیار کرکے اس چیز کو دین کا جزو قرار دیا ہے جو اس میں سے نہیں۔ علاوہ ازیں احکام شریعت کی تحریف کا ارتکاب کیا۔ مذاہب اربعہ ایجاد کیے جو آنحضور کے زمانہ میں موجود نہ تھے اور اقوال صحابہ کو ترک کیا۔

ہم جواباً شیعہ سے کہیں گے ؎ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ خود شیعہ قیاس کے قائل ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ قیاس ان لوگوں کی تقلید کرنے سے کہیں بہتر ہے جن کا پایہ امام مالک، ثوری، شافعی، احمد اور ابو عبید ایسے عظیم القدر مجتہدین سے کہیں فروتر تھا اور وہ امام حسن عسکری کے اتباع اور ان کے نظائر و امثال ہیں۔

باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اہلسنت نے دین میں وہ باتیں داخل کردیں جو اس میں شامل نہ تھیں اور تحریف کا ارتکاب کیا"۔ تو یہ بات شیعہ میں سب فرقوں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ شیعہ نے رسول علیہ السلام تک کو جھوٹ کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا جب کہ دوسرا کوئی اسلامی فرقہ یہ جسارت نہ کر سکا۔ لاتعداد صداقتوں کو تسلیم نہ کیا۔ شیعہ کی تحریف کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل تفسیری اقوال سے لگائیے۔

۱۔ "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ" اس سے بقول شیعہ حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما ہیں

۲۔ "يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ":۔ لؤلؤ و مرجان سے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔

۳۔ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ:۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

۴۔ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ:۔ آل عمران سے آل ابی طالب مراد ہے، ابو طالب کو عمران سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۔ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ:۔ یعنی بنو امیہ۔

۶۔ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً:۔ بقرہ (گائے) سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔

۷۔ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ:۔ یعنی اگر تو نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو شریک کیا۔

شیعہ مذہب کی کتابوں میں ایسی لاتعداد تحریفات پائی جاتی ہیں۔ شیعہ کے فرقہ اسماعیلیہ والوں نے واجبات و محرمات تک میں تحریف کرنے سے اجتناب نہ کیا۔ بنا بریں اگر ان کو ائمہ تحریف کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

شیعہ مضمون نویس کا یہ قول کہ "اہل سنت نے مذاہب اربعہ ایجاد کیے اور اقوال صحابہ کو ترک کر دیا" ہم رافضی مصنف سے پوچھتے ہیں، کہ تمھارے یہاں صحابہ کی مخالفت کب سے مذموم قرار پائی ؟ کیا ہم اجماع صحابہ کے مخالف ہیں یا تم ؟ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ کی تکفیر و تضلیل کون کرتا ہے ؟ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اہل سنت اجماع صحابہ کے خلاف متفق ہو جائیں۔

یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ شیعہ امامیہ عترت نبوی اور حضرات صحابہ دونوں کے متفقہ اجماع کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد سعادت عہد میں بنی ہاشم کا کوئی فرد اس بات کا مدعی نہ تھا۔ کہ بارہ امام معصوم ہوں گے یا یہ کہ سالار رسل کے بعد کوئی شخص معصوم بھی ہو سکتا ہے۔ بخلاف ازیں کوئی شخص نہ خلفائے ثلاثہ کے کفر کا قائل تھا نہ ان کی امامت پر طعن و تشنیع کرتا تھا نہ صفات خداوندی کا کوئی منکر تھا۔ اور نہ تقدیر کا۔ اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امامیہ اہلبیت و صحابہ دونوں کی مخالفت کرتے ہیں متحد الخیال ہیں۔ پھر انھیں لوگوں پر معترض ہونے کا کیا حق ہے۔ جو اہل بیت و صحابہ دونوں کے اجماع کو حجت مانتے ہیں اور اس کی مخالفت سے اجتناب کرتے ہیں۔[۲]

---

[۱] ائمہ اہل بیت سے فرداً فرداً ایسی ادعیہ ماثورہ منقول ہیں جن میں وہ کمال عجز و انکسار سے درگاہ ربانی میں اپنی تقصیرات اور لغزشوں کی معافی طلب کیا کرتے تھے۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ اپنی ذات کو گناہوں سے معصوم تصور نہیں کرتے تھے اور اس بات کے معترف تھے کہ گناہ ان سے سرزد ہو سکتے ہیں اب کیا ہم ان کی تکذیب کر کے شیعہ کی بات مانیں جو ہر بات سے محروم ہیں ۱۲۔

[۲] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس صحیح اور قیاس فاسد سے متعلق ایک قیمتی رسالہ تصنیف کیا ہے امام کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات اس باب میں قابل تحسین ہیں۔ دور حاضر کے مشہور محدث اور سلفی محب الدین الخطیب نے استاذ و تلمیذ دونوں کے ارشادات کو "القیاس فی الشرع الاسلامی" کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے ۱۲۔

مذاہب اربعہ پر شیعہ مصنف کے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کے خیال میں اہلسنت نے حضرات صحابہ کے عین برخلاف جمع ہو کر باتفاق رائے یہ مذاہب ایجاد کر لیے تھے تو یہ عظیم افتراء ہے اس لیے کہ یہ چاروں مذاہب ایک ہی زمانہ میں نہ تھے مزید براں ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی تقلید نہیں کرتا تھا اور نہ دوسروں کو اپنی پیروی کا حکم دیتا تھا۔ بخلاف ازیں یہ سب ائمہ اتباع کتاب وسنت کی دعوت دیتے اور دوسروں پر تنقید کیا کرتے تھے، باقی رہا یہ امر کہ لوگ ائمہ اربعہ کی اطاعت کرتے تھے تو یہ ایک اتفاقی بات تھی۔

مذاہب اربعہ پر شیعہ کا اعتراض

جہاں تک شیعہ کا تعلق ہے انہوں نے جن جن مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے ان سب میں وہ خطا کار ہیں۔ یہ بات غلط ہے کہ ائمہ اربعہ نے کوئی علم اختراع کیا تھا بخلاف ازیں انھوں نے علم کی جمع وتدوین کا اہتمام کیا بعد میں وہ علم انھیں کی جانب منسوب ہوا جس طرح کتب حدیث کو ان کے جامعین مثلاً امام بخاری ومسلم اور ابوداؤد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح مختلف قراءتوں کو ان ائمہ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے جنھوں نے وہ اختیار کی تھیں۔

اس پر مزید یہ کہ اہل سنت نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ائمہ اربعہ کا اجماع ایک بے خطا دلیل ہے اور حق ان کے اقوال کے دائرہ میں محدود ومحصور ہو کر رہ گیا ہے جو بات ان سے خارج ہے وہ باطل ہے۔ مجتہدین کے یہاں جو نزاع واختلاف پایا جاتا ہے وہ صرف کلام رسول کے فہم وادراک کے بارے میں ہے اور بس! صحابہ سے قیاس ورائے کے موافق ومخالف دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں۔ قیاس مذموم وہ ہے جو نص کا معارض ہو اور جس میں فرع مدار حکم میں اصل کی شریک نہ ہو۔ ایسے قیاس کا فاسد ہونا کسی شک وشبہ سے بالا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ قیاس کوئی بھی ہو فاسد ہوتا ہے جس طرح موضوع احادیث کے پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام احادیث نبویہ کو تسلیم نہ کیا جائے۔

رافضی مضمون نگار رقمطراز ہے۔

قیاس کی وجہ سے اہل سنت لاتعداد امور قبیحہ میں گرفتار ہو گئے۔ چنانچہ حسب ذیل مسائل

قیاس کی پیداوار ہیں۔

(۱) جو لڑکی زنا سے پیدا ہوئی ہو وہ زانی کے لیے حلال ہے۔

(۲) جو شخص اپنی ماں اور بہن سے یہ جانتے ہوئے نکاح کرلے کہ وہ محرمات میں سے ہیں اس پر حدِ شرعی نہیں۔

(۳) اگر کسی شخص کی بیٹی مشرق میں سکونت پذیر ہو اور خود مغرب میں رہتا ہو۔ پھر وہ مغرب ہی میں غائبانہ طور پر کسی آدمی سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دے۔ چھ ماہ کے بعد اس لڑکی کے یہاں بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ اسی خاوند کا قرار دیا جائے گا۔

(۴) لواطت کا ارتکاب کرنے والے پر حدِ شرعی نہیں۔

(۵) نبیذ مباح ہے۔

(۶) نبیذ اگرچہ نشہ آور ہو اس کے ساتھ وضو جائز ہے

(۷) کتے کی کھال پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

(۸) گندگی جب خشک ہو جائے تو اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

(۹) غصب مباح ہے۔

(۱۰) اگر چور کسی چکی پر پہنچ کر آٹا پیس لے تو وہ آٹے کا مالک قرار پائے گا۔ اگر مالک آ کر اس سے جھگڑنے لگے تو وہ ظالم ہو گا۔ اگر وہ دونوں لڑنے لگیں اور چور مارا جائے تو وہ شہید تصور کیا جائے گا۔ اگر چور مالک کو مار ڈالے تو چور پر قصاص یا دیت نہیں آئے گی۔

(۱۱) اگر زانی گواہوں کو جھٹلا دے تو اس پر حد لگائی جائے گی اور اگر ان کی تصدیق کر دے تو حد ساقط ہو جائے گی۔ گویا مجرم کے اقرارِ جرم اور گواہی کی گواہی کے باوجود اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔

(۱۲) کتے کا گوشت کھانا مباح ہے۔

(۱۳) غلام کے ساتھ لواطت مباح ہے۔

(۱۴) باجے گاجے اور ساز وغیرہ مباح ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جمہور اہلِ سنت ان مسائل کے خلاف ہیں اور کسی کو بھی درست

تسلیم نہیں کرتے[۱]

ہم اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ خود رافضی فقہ میں بھی ایسے مسائل کی کمی نہیں ان میں سے بعض مسائل شیعہ کے یہاں متفق علیہا ہیں اور بعض متنازع فیہا ہیں۔

ان میں سے چند مسائل ملاحظہ ہوں

رافضی فقہ کے مسائل عجیبہ

(۱) شیعہ جمعہ و جماعت کے تارک ہوتے ہیں۔

(۲) روافض مساجد کو ویران رکھتے اور مقبروں کو رونق بخشتے ہیں[۲]۔

اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ رافضی عالم شیخ مفید نے "مناسک حج المشاہد (حج قبور کے احکام) کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو کذب و شرک کا پلندہ ہے۔

(۳) شیعہ مغرب کی نماز میں تاخیر کرتے ہیں۔

(۴) اہل کتاب کا ذبیحہ روافض کے نزدیک حلال نہیں۔

(۵) شیعہ کے نزدیک ایک مخصوص مچھلی حرام ہے۔

۱ء جاہل شیعہ — جو روافض کے مشہور علماء میں شمار ہوتا ہے — اور اس کے نظائر و امثال کی افترا پردازیوں نے علامہ ہند حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ دہلوی کو مجبور کیا کہ آپ شیعی فقہ کے رسوائے عالم مسائل و احکام کا راز طشت از بام کریں۔ چنانچہ آپ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف تحفہ اثناعشریہ کے ساتویں باب میں از صفحہ ۲۰۸ تا ۲۳۷ (طبع سلفیہ) اس قسم کے سب مسائل جمع کر دیئے ہیں ان سطور کے قاری سے گذارش کی جاتی ہے کہ امام ابن تیمیہ کی تنقیدات کا مطالعہ کرنے کے بعد تحفہ اثنا عشریہ میں شیعی فقہ کے اعجوبۂ روزگار اور حیران کن مسائل ملاحظہ کرے اور پھر شیخ الاسلام کے بیان کردہ حقائق سے ان کا موازنہ کرے

۲ء عجیب بات یہ ہے کہ بعض قبروں میں وہ لوگ سرے سے مدفون ہی نہیں جن کے نام سے وہ مشہور ہیں مثلاً نجف میں حضرت علی کی قبر اور کربلا میں حضرت حسین کا مزار صرف اسی امکان کی بنا پر بنا دیا گیا کہ یہ دونوں حضرات وہاں مدفون ہیں۔ یہ تاریخی حقائق ہیں شیعہ کا ان سے انکار ایک جداگانہ امر ہے۔ لطف یہ ہے کہ مقبرے تعمیر کرتے وقت شیعہ اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ تھے کہ وہ حضرات یقیناً ان میں مدفون نہیں اس کے باوجود مزار تعمیر کرنے اور انھیں ان کے نام سے مشہور کرنے پر مُصر تھے ۱۲

(۶) بعض شیعہ کے نزدیک اونٹ کا گوشت حرام ہے۔

(۷) شیعہ کے نزدیک سب ورثہ بیٹی کو ملے گا۔ اور میت کے چچا کو کچھ نہیں ملیگا۔

(۸) بعض شیعہ کے نزدیک روزوں کا انحصار دنوں کی تعداد پر ہے چاند پر نہیں۔

(۹) روافض کے نزدیک متعہ حلال ہے۔

(۱۰) طلاق معلق بالشرط قصد و ارادہ کے باوجود واقع نہیں ہوتی۔

(۱۱) جو طلاق لکھ کر دی جائے وہ واقع نہیں ہوتی اور اس میں گواہ بنانا شرط ہے۔

شیعی اعتراضات کے جوابات

زنا سے پیدا شدہ بیٹی کی حلت میں امام شافعی منفرد ہیں امام احمد بالاتفاق اس کو حرام قرار دیتے اور اس کے مرتکب کو واجب القتل تصور کرتے ہیں۔

محرّمات سے نکاح کرنے کی صورت میں امام ابوحنیفہ حد شرعی کے قائل نہ تھے ان کی رائے میں شبہ کی بنا پر حد ساقط ہو جاتی ہے۔

اکثر ائمہ لواطت کنندہ کے قتل کے قائل ہیں۔ بعض کے نزدیک اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے امام مالک کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام احمد و شافعی سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق منقول ہے امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ لواطت کی حد وہی ہے جو زنا کی ہے۔ امام ابو یوسف و محمد کا قول بھی یہی ہے۔

حد شرعی کے اسقاط میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ منفرد ہیں اور اس مسئلہ میں دوسرا کوئی امام آپ کا ہم خیال نہیں۔

اسی طرح مشرق میں سکونت رکھنے والی عورت کے بچے کا مغربی آدمی کے ساتھ الحاق بھی امام موصوف کا مسلک ہے اور دوسرے ائمہ اس کی تائید نہیں کرتے۔ دراصل امام صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نسب کا اثبات صرف میراث حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کا صلبی بچہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ فقہی مسائل غلط ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ جمہور ائمہ ان کے خلاف ہیں اور اگر درست ہیں تو اقوال اہلسنت سے خارج نہ ہوں گے۔

شیعہ مضمون نگار کی بوالعجبی ملاحظہ کیجئے کہ ابھی وہ قیاس سے انکار کر رہا تھا اور ابھی قیاس

کی مدد سے نبیذ کے بارے میں امام ابو حنیفہ رح کے خلاف احتجاج کرنے لگا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ تم نے حدیث "کُلُّ مُسْکِرٍ خَمْرٌ وَکُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ" سے کیوں نہ استدلال کیا۔

کیا کُتّے کا چمڑا دباغت سے پاک ہو جاتا ہے؟

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ حدیث نبوی اَیُّمَا اِھَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَھُرَ (جو چمڑا بھی رنگا جائے وہ پاک ہو جاتا ہے) کے عموم کے پیش نظر کتے کا چمڑا بھی دباغت سے پاک ہو جاتا ہے اگر شیعہ سے اس کی حرمت کی دلیل طلب کی جائے تو وہ بتا نہ سکے گا۔ غاصب و مالک کے بارے میں شیعہ مصنف نے جو کچھ کہا ہے وہ دروغ بے فروغ ہے بلکہ تنازع کی صورت میں ان کا معاملہ حاکم کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

گواہوں کے ہوتے ہوئے حد شرعی لگانے میں امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ جب مجرم اقرار کرے گا تو شہادت کا حکم ساقط ہو جائے گا بشرطیکہ وہ چار مرتبہ اقرار کرلے۔ بخلاف ازیں جمہور کہتے ہیں کہ مجرم کے اقرار سے شہادت میں مزید پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ غلاموں سے لواطت کے جواز کے بارے میں شیعہ کا بیان صریح جھوٹ ہے یہ کسی امام کا قول نہیں۔ البتہ بعض جہلا نے امام مالک سے ایک ایسی روایت بیان کی ہے۔ حالانکہ امام مالک اور دیگر ائمہ بالاتفاق کہتے ہیں کہ غلاموں سے لواطت کو حلال قرار دینے والا کافر ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

شیعہ امامیہ کے مذہب کے واجب الاتباع ہونے کی دوسری وجہ ہمارے استاد محترم خواجہ نصیر الدین طوسی[۱] کا وہ قول ہے جو انہوں نے مذاہب کے بارے میں سوال کرنے پر ارشاد فرمایا

---

[۱] یہ وہی خواجہ نصیر الدین طوسی ہے جو اعداء اسلام ابن العلقمی اور ابن ابی الحدید کے ساتھ اس عدیم المثال مسلم کشی و خونریزی میں برابر کا شریک ہے جو ہلاکو نے ۶۵۵ھ میں دار الاسلام بغداد کے عظیم شہر میں بپا کی طوسی کے الحاد و فساد اور اسلام اور مسلمانوں سے اس کی خیانت کاری سے متعلق قبل ازیں حاشیہ تحریر کیا جا چکا ہے۔ امام ابن تیمیہ جس کتاب کی تردید کر رہے ہیں اس کا مصنف ابن المطہر اور اس کے ہمنوا اعداء صحابہ میں طوسی اور اس کے نظائر و امثال ہی کے مقلد اور زلہ ربا ہیں ۱۲

کہ ہم نے اس حدیث پر غور کیا ہے کہ "میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی"۔ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ امامیہ کا فرقہ ہی ناجی ہے کیونکہ یہ باقی سب فرقوں سے الگ تھلگ ہے"۔

ہم اس کے جواب میں رافضی سے کہیں گے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کو موجب بالذات تسلیم کرتا ہے تم اس کی تکفیر کر چکے ہو۔ تمہارا استاد طوسی قدامت عالم کا قائل ہے اور اپنی شرح اشارات میں اللہ تعالیٰ کو موجب بالذات تسلیم کرتا ہے طوسی الموت کے قلعہ میں ملحد اسمٰعیلیہ کا وزیر تھا پھر ہلاکو کا نجومی بن گیا۔ ہلاکو نے اسے خلیفۂ وقت اور علماء کو قتل کرنے کا اشارہ کیا بہرکیف خواجہ طوسی اور اس کے اتباع کا معاملہ کچھ ڈھکا چھپا نہیں سب مسلمان اس کی بدکرداریوں سے آگاہ ہیں۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ نصیر الدین طوسی اپنی زندگی کے آخری دور میں بہت بدل گیا تھا وہ پابندی سے نماز پڑھنے لگا تھا وہ مشہور محدث و فقیہ امام بغوی کی تفسیر قرآن اور فقہ کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔

طوسی کا یہ قول کہ "شیعہ باقی فرقوں سے الگ تھلگ ہیں"۔ محض ژاژ خائی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح خوارج و معتزلہ بھی باقی فرقوں سے منفرد ہیں اس میں شیعہ کی کیا خصوصیت ہے اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ شیعہ اپنے افکار و آراء میں منفرد ہیں تو یہ غلط ہے اس لیے کہ وہ مسئلہ تقدیر و توحید میں معتزلہ اور جہمیہ کے ہم نوا ہیں۔ پھر شیعہ کا باہمی جدل و نزاع سب اسلامی فرقوں پر سبقت لے گیا ہے اور ہم اس کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

مقام حیرت | ابن المطہر رافضی کی رائے میں نصیر الدین طوسی کافر ہے

واستعجاب ہے کہ یہ کذاب رافضی (ابن المطہر) جب سابقین اولین خلفاء راشدین تابعین

۱؎ اگر طوسی کی زندگی میں انقلاب و اصلاح کی یہ خبر درست ہے تو اسے چاہئے تھا کہ وہ ان کفریات سے علانیہ توبہ کرتا جن سے اسکی کتاب زندگی لبریز ہے اس نے ان زلیست علانیہ جس کفر اور اللہ و رسول نیز مسلمانوں کے خلاف جس خیانت کاری کا ارتکاب کیا اس سے خاموشی کے ساتھ تائب ہو جانا کمال توبہ کی دلیل نہیں اور اگر اس کے سوا اس کا اور کوئی گناہ نہ ہوتا کہ اس نے ابن المطہر جیسے غالی شیعہ کے دلوں کو عداوت و بغض صحابہ سے بھر دیا تو لازم تھا کہ وہ علانیہ اپنی توبہ کا اس طرح اظہار کرتا جو ابن المطہر ایسے لوگوں پر ایک واضح حجت ہوتا۔

کرام اور دیگر ائمہ مسلمین کا ذکر کرتا ہے تو ان کے خلاف کذب و دروغ کا طوفان کھڑا کر دیتا ہے اور جب اللہ و رسول کے خلاف اعلان جنگ کرنے والے طوسی کا تذکرہ چھیڑتا ہے تو اسے شَیْخُنَا الْاَعْظَمُ اور قَدَّسَ اللّٰہُ رُوْحَہٗ کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ پھر اسی شیخ الاعظم پر کفر کا فتویٰ بھی لگاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل مذکورہ ذیل آیت قرآنی کے مصداق ہیں

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (النساء-۵۱)

(منافق) کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی نسبت ہدایت یافتہ ہیں۔

شیعہ کی دیگر اسلامی فرقوں سے علیحدگی ان کے عقائد کی صحت کی بجائے ان کے افکار و معتقدات کے فساد و بطلان پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ دیگر فرق و طوائف سے کسی فرقہ کی انفرادیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ راہ حق پر گامزن ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"فرقہ امامیہ کے ناجی ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ انھیں اپنی اور اپنے ائمہ کی نجات کا قطعی یقین ہے۔ لہٰذا ان کی اطاعت اولیٰ ہے بخلاف ازیں اہل سنت میں یہ بات نہیں پائی جاتی"۔

ہم جواباً کہیں گے کہ اگر ان ائمہ کی پیروی حق و صواب ہے جن کی اطاعت کا دم تم بھرتے اور اس کو موجب نجات تصور کرتے ہو تو پھر اموی خلفاء کے اتباع جو اپنے ائمہ کی اطاعت کو واجب اور موجب نجات سمجھتے تھے حامل صدق و صواب تھے۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ہر بات میں ائمہ کی اطاعت واجب ہے نیز یہ کہ ائمہ خداوندی احتساب سے بالا ہیں اور جو کام وہ اطاعتِ امام کے لیے انجام دیں اس میں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ دلیل کے اعتبار سے ان کا مسلک شیعہ کی نسبت قوی تر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان ائمہ کی پیروی کرتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے منفرد و مؤید کیا اور حکومت و سلطنت سے نواز اتھا۔ جب کہ منکرین تقدیر (جن میں شیعہ بھی شامل ہیں) کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہی کام کرتے ہیں جن میں بندوں کی کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے تو ان کو سلطنت و حکومت تفویض کرنے میں بھی بندوں کی مصلحت ملحوظ رکھی ہوگی۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اموی خلفاء سے امت کو جو فوائد حاصل ہوئے وہ

ان مصالح کی نسبت عظیم تر تھے جو ایک عاجز و معدوم امام (یعنی شیعہ کا امام غائب) کے ذریعہ معرض ظہور میں آئے۔ بنا بریں اموی خلفاء کے متبعین کو جو دینی و دنیوی فوائد حاصل ہوئے امام منتظر کے اتباع کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہوا۔

شیعہ کا کوئی امام ایسا نہ تھا جو انھیں نیکی کا حکم دیتا۔ منکرات سے باز رکھتا اور دینی و دنیوی مصالح میں ان کی مدد کرتا اس کے عین برخلاف اموی خلفاء کے اتباع نے ان سے لاتعداد دینی و دنیوی فوائد و منافع حاصل کیے۔ خلاصۂ کلام! یہ کہ اگر حضرت علی کے ان نام نہاد معاونین کی دلیل قرین صحت و صواب ہے تو حضرت عثمان کے انصار و اعوان کی دلیل اقرب الی الصواب ہو گی۔ اور اگر پہلی دلیل باطل ہے تو دوسری اس سے باطل تر ہے۔ جب شیعہ اس بات میں اہلسنت کے ہمنوا ہیں کہ اموی خلفاء کی نجات پر یقین کامل رکھنا خطا و ضلال ہے تو ائمہ معصومین اور ان کے نائبین کی یقینی نجات اور ان کی اطاعت مطلقہ کا عقیدہ سابق الذکر ضلالت سے بھی عظیم تر گمراہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ کا سرے سے کوئی امام ہے ہی نہیں ماسوا ان شیوخ کے جو ناجائز ذرائع سے ان کا مال بٹورتے اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ شیعہ اپنے ائمہ کے ناجی ہونے پر یقین رکھتے ہیں جب کہ اہلسنت میں یہ بات نہیں پائی جاتی"

اگر شیعہ مصنف کی مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا اعتقاد رکھنے والا ضرور جنت میں جائے گا خواہ وہ شرعی اوامر کا تارک ہو اور منہیات سے کنارہ کش نہ رہتا ہو تو بلاشبہ یہ امامیہ کا قول نہیں بلکہ کوئی ذی عقل اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ حُبِّ علیؓ ایک عظیم نیکی ہے جس کی موجودگی کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایسے شخص کو نمازوں کے ترک کرنے۔ زنا کاری کا ارتکاب کرنے اور بنی ہاشم کا خون بہانے سے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بشرطیکہ وہ حب علی رضی اللہ عنہ کا دعویدار ہو۔

اگر شیعہ یہ کہیں کہ سچی محبت تبھی ہو سکتی ہے۔ جب محب دیگر اعمال میں بھی حضرت علی کے نقش قدم

پر چلتا ہو تو انہوں نے از خود ادائے واجبات اور ترک منکرات کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔

اگر شیعہ مصنف یہ کہنے کے درپے ہے کہ جو شخص عقائد صحیحہ رکھتا واجبات کو ادا کرتا اور منکرات سے باز رہتا ہو وہ جنت میں جائے گا تو بلاشبہ اہل سنت بھی یہی کہتے ہیں۔ قرآن کریم کے تتبع میں اہلسنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ہر متقی کے لیے نجات یقینی ہے۔ البتہ وہ کسی متعین شخص کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہتے کہ وہ جنت میں جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا زمرۂ متقین میں شامل ہونا قطعیت کے ساتھ تو معلوم نہیں۔ جب کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی موت تقوی پر ہوئی ہے تو اس کا جنتی ہونا بھی معلوم ہو جائے گا۔ بنابریں اہل سنت ان لوگوں کو جنتی قرار دیتے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے[1]۔

جو شخص لوگوں میں اپنے اوصاف حمیدہ کی بنا پر معروف ہو اور لوگ اسکی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے ہوں تو اس کے بارے میں اہل سنت کے دو قول ہیں۔

مذکورہ صدر بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ شیعہ کے یہاں کوئی ایسا جزم و وثوق نہیں پایا جاتا جو اہل سنت میں موجود نہ ہوں۔ اگر شیعہ کہیں کہ ہم جس آدمی کو بھی شرعی واجبات پر عمل پیرا اور منہیات سے باز رہنے والا دیکھتے ہیں اسے قطعی جنتی قرار دیتے ہیں خواہ اس کے باطن کا حال ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس مسئلہ کا امامیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس کی جانب کوئی صحیح راستہ جاتا ہے تو وہ بالاتفاق اہلسنت کا راستہ ہے اور کوئی راستہ موجود نہیں تو یہ قول بلا علم ہے جو کسی فضیلت کا موجب نہیں۔ بلکہ اس کا نہ ہونا فضیلت کا باعث ہے۔

بہر حال شیعہ جس علم صحیح کے بھی دعوی دار ہوں اہل سنت ان کی نسبت اس کے زیادہ

---

[1] مثلاً صحابہ کرام میں سے دس حضرات کے بارے میں سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کا مژدہ سنایا۔ مگر شیعہ آنحضور کی بشارت سے صرف نظر کر کے حضرت علی کے سوا ان سب اصحاب کو جہنمی قرار دیتے ہیں۔ ان کی دریدہ دہنی کا یہ عالم ہے کہ اس سے بڑھ کر وہ افضل الصحابہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو "جبت و طاغوت" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۱۲

حقدار ہوں گے۔ اور اگر وہ جہالت کے مدعی ہوں تو جہالت ایک نقص ہے اور اہل سنت اس سے بعید تر ہیں۔ کسی مخصوص آدمی کے جنتی ہونے کی گارنٹی یا تو معصوم[1] (نبی صلے اللہ علیہ وسلم) کے قول کی بنا پر دی جاسکتی ہے یا مومنین کے متفق علیہ قول کی وجہ سے۔ اس لیے کہ اہل ایمان اس خطۂ ارضی پر خدا کے گواہ ہیں۔ حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سے ایک جنازہ گذرا۔ لوگوں نے مرنے والے کی مدح وستائش کی۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا "وَجَبَتْ" (واجب ہوگئی) پھر ایک اور جنازہ گذرا اور لوگوں نے اس کی مذمت کی تو آپ نے وہی الفاظ دہرائے۔ صحابہ نے جب ارشاد حضور کا مفہوم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا جس جنازہ کی تم نے تعریف کی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی اور جس کی مذمت کی اس کے لیے جہنم تم زمین پر خدا کے گواہ ہو[2]

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل سنت اپنے ائمہ کی فلاح ونجات پر جس پختگی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں شیعہ اس سے محروم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اہل سنت کے ائمہ سابقین اولین مہاجرین والفار ہیں جو ان کے نزدیک قطعی جنتی ہیں۔ اہل سنت کے یہاں یہ امر مسلم ہے کہ عشرہ مبشرہ یقیناً جنتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدری صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ (تم جو چاہو کرو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے)

---

[1] معصوم سے مراد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے ان کے سوا اس امت میں دوسرا کوئی معصوم نہیں۔ آپ نے دس صحابہ کے متعلق جنت کا مژدہ سنایا ہے مگر شیعہ اس بشارت کو تسلیم نہیں کرتے ۱۲

[2] صحابہ کرام کی شان میں آنحضور کا یہ ارشاد کہ "تم کائنات ارضی پر خدا کے گواہ ہو" صحابہ کی عظیم مدح ومنقبت پر مشتمل ہے۔ بنی اسرائیل کے کسی نبی نے اگر ان کی مدح میں اگر ایسا کوئی جملہ کہا ہوتا تو اسرائیلی اس دن کو ایک بڑا مذہبی تہوار بنا لیتے۔ اور ایسے کلمات کو بڑی اہمیت کا حامل سمجھتے۔ مگر شیعہ صحابہ کی شان میں وارد شدہ مدحیہ کلمات کو چنداں وقعت نہیں دیتے۔ آنحضور کا ارشاد گرامی "انتم شہداء اللہ فی الارض" دراصل سورہ بقرہ کی آیت "لتکونوا شہداء علی الناس" کی جانب مشیر ہے۔ ظاہر ہے کہ آنحضور کے ارشاد مبارک سے صریح انکار غضب خداوندی کو دعوت دینے کے سوا اور کیا ہے؟

اہل سنت اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ جن صحابہ نے درخت کے نیچے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ بیعت الشجرہ میں شرکت کرنے والے ۱۴۰۰ سو سے زائد صحابہ اہل سنت کے امام ہیں اور یہ قطعی جنتی ہیں اور یہ دعوے کتاب وسنت پر مبنی ہے۔

اہل سنت جن لوگوں کے حق میں جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں خواہ مطلقاً ہو یا معیناً ان کی شہادت علم و دلیل پر مبنی ہے۔ اس کے عین برخلاف روافض کی شہادت جھوٹ کا پلندہ ہے اسی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو کہنا پڑا۔

"مَا رَأَیْتُ قَوْمًا اَشْهَدَ بِالزُّوْرِ مِنَ الرَّافِضَةِ"

میں نے شیعہ سے زیادہ جھوٹی شہادت دینے والا کسی قوم کو نہیں دیکھا

یہ امر قابل غور ہے کہ شیعہ جس امام کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں یا تو وہ ہر چیز میں واجب الاطاعت ہوگا یہ الگ بات ہے کہ دوسرے لوگ اس ضمن میں اس سے جھگڑتے ہیں یا اس کی اطاعت صرف انہی امور میں کی جائے گی جو اللہ و رسول کے بیان کردہ یا اس کے اجتہاد پر مبنی ہوں۔ بصورت اول اہلسنت کے یہاں ایسا کوئی امام ہی نہیں جس کی ہر بات میں اطاعت کی جاتی ہو سوائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے۔

امام مالک، مجاہد اور حَکَم فرمایا کرتے تھے۔

"ہر شخص کی بات کو (بشرط صحت) تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے اور (غلط ہونے کی صورت میں) رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات قابل تسلیم ہے"۔

اہل سنت اپنے امام (سالار رسل صلے اللہ علیہ وسلم) کو خیر الخلائق قرار دیتے اور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کی پیروی کرنے والا ہر شخص جنت میں جائے گا۔ یہ شہادت شیعہ کی اس یقین دہانی سے اتم واکمل ہے کہ امام عسکری کے متبعین جنتی ہیں اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اہل سنت کا امام اور ان کی شہادت دونوں شیعہ کی شہادت کی نسبت زیادہ مکمل اور قابل اعتماد ہیں۔

اور اگر شیعہ کی مراد امام سے محدود امام ہے تو اہل سنت کے نزدیک ایسا امام اس وقت تک واجب الاطاعت نہیں جبتک اس کے اوامر امام مطلق یعنی سرور کائنات کے ارشادات سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ اہل سنت جب شرعی حکم کے مطابق خداوندی احکام میں ایسے امام کی اطاعت کرتے ہیں تو انھیں اس بات کی مطلقاً پرواہ نہیں ہوتی کہ آیا وہ جنت میں جائے گا یا نہیں۔ اس لیے کہ وہ دراصل اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں جس طرح امام معصوم کے اتباع بعض اوقات اس کے نائبین کی اطاعت کرتے ہیں حالانکہ وہ دوزخی ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض اوقات امام کے نائب یہ بھی نہیں جانتے کہ امام نے کیا حکم دیا ہے۔ بخلاف ازیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں اور یہ بات فوراً معلوم ہو جاتی ہے کہ کون ان کے موافق حکم دے رہا ہے اور کون مخالف اختلافی ارشادات کا فیصلہ اجتہاد سے کر لیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ حدیث نبوی پر عمل پیرا ہونا امام کے نائبوں کی اطاعت کرنے سے بدرجہا افضل ہے۔

خصوصاً جبکہ یہ پتہ بھی نہ ہو کہ امام غائب نے کیا حکم دیا۔ اور نہ اس کی کچھ خبر ہو کہ نائب آیا امام کے موافق ہے یا مخالف۔ اگر شیعہ یہ دعوی کریں کہ نائبین اپنے پیش کردہ علماء کے اقوال پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اہلسنت کے علماء کو حدیث نبوی کے بارے میں جو علم حاصل ہے وہ ان کے علم سے بدرجہا اتم و اکمل ہے۔ اگر کسی شیعہ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی روایت صحیح بتلائے تو وہ ایسا کرنے پر ہرگز قادر نہ ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ کا درجہ احادیث کی اسناد اور اسماء الرجال کے فن میں اہل سنت کے علماء کی نسبت فروتر ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"شیعہ مذہب کی صداقت کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے یہ مذہب ائمہ معصومین سے اخذ کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کثرت عبادت کا یہ عالم تھا کہ آپ جنگوں میں مشغول رہنے کے باوجود شب و روز میں ایک ہزار رکعات نوافل پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح امام زین العابدین اور امام باقر بھی بڑے عابد شب زندہ دار تھے۔ یہاں شیعہ مصنف نے ائمہ کی مدح سرائی میں

بعض جھوٹے مناقب بھی درج کر دیے ہیں"۔

ہم شیعہ کے اس دعوی کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہ انہوں نے یہ مذہب اہل بیت سے اخذ کیا۔ اس لیے کہ شیعہ اصول و فروع میں حضرت علیؓ اور ائمہ اہل بیت کی مخالفت کرتے ہیں۔ ائمہ اہلبیت صفات الٰہی اور تقدیر کا اثبات کرتے اور خلفاء ثلاثہ کی خلافت و فضیلت کے قائل ہیں اس پر مزید یہ کہ شیعہ کے یہاں اسانید متصلہ نہیں ہیں جن کو تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر کسا جا سکے۔ البتہ شیعہ کے یہاں دروغگوئی کی فراوانی ہے۔ اگر وہ ان نصوص کے تواتر کا دعوی کریں تو کوئی چیز مخالفین کو بھی ایسے دعوی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جب دوسرے لوگ بھی اسی قسم کا دعوی کھڑا کر دیں گے۔ تو فریقین کے دعاوی میں کچھ فرق و امتیاز باقی نہیں رہے

شیعہ اپنے مذہب کی صداقت کے اثبات میں دو باتوں کے محتاج ہیں۔

(۱) ائمہ کی عصمت کا دعوی جن کی طرف ان کا مذہب منسوب ہے۔

(۲) دلائل و براہین سے اس نقل کو ثابت کرنا۔

شیعہ کے پاس مذکورہ بالا دونوں امور کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔ حضرت علی اور ان کے ابناء و احفاد کے حق میں جو مناقب ثابت ہیں۔ شیعہ مصنف نے

---

[۱] مناقب کاذبہ میں امام زین العابدین کی مدح میں ایک قصیدہ بھی شامل ہے جو فرزدق شاعر کی جانب منسوب ہے۔ صحیح یہ ہے کہ فرزدق کے اس قصیدہ میں صرف چھ اشعار ہیں۔ قصیدہ کا باقی حصہ حزین کنانی کے اشعار پر مشتمل ہے جو اس نے عبد اللہ بن عبد الملک بن مروان کی مدح میں کہے۔ یہ قصیدہ دیوان حماسہ ابو تمام اور اس کا کچھ حصہ قدامہ بن جعفر کی نقد الشعر ص ۱۹ و ۲۷ پر موجود ہے۔ اس قصیدہ کے کچھ حصہ میں بنی مروان کی مدح و ستائش کی گئی ہے۔ مشہور ادیب جاحظ نے کتاب الحیوان ج ۳ ص ۱۵۲ - البیان والتبیین کی تیسری جلد کے شروع میں یہ قصیدہ نقل کیا ہے۔ کتاب الآغانی ج ۱۴ ص ۷۶ - ۷۹ طبع بولاق میں بھی یہ قصیدہ نقل کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام زین العابدین اور دیگر ائمہ اہلبیت کا پایہ اس سے کہیں بلند ہے کہ ان کی شان میں جھوٹے مناقب بیان کیے جائیں۔ مگر شیعہ کی تاریخ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ دروغگوئی سے کنارہ کش ہو کر کوئی شیعہ شیعہ رہ ہی نہیں سکتا ۱۲۔ اللہم اغفر لکاتبہ ولوالدیہ ولمن سعی فیہ والناس اجمعین۔

ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ البتہ کچھ جھوٹے مناقب تحریر کر دیے ہیں جو اس کی جہالت کی کرشمہ سازی ہے۔

شیعہ مصنف کے ذکر کردہ حسب ذیل مناقب و فضائل قابل ملاحظہ ہیں۔

(۱) شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ آیت "ہَلْ اَتٰی"۔ اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی۔ حالانکہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا غزوہ بدر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہجرت کے دوسرے سال اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ چوتھے سال پیدا ہوئے۔ یہ سورت اس سے کئی سال پہلے نازل ہو چکی تھی۔ بنظر بریں شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ سورہ مذکور اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی صریح کذب ہے اور اس سے ہر وہ شخص آشنا ہے جو علم نزول قرآن اور اہل بیت کے کوائف و احوال سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے۔

(۲) جہاں تک آیت قرآنی "وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" (سورہ احزاب - ۳۳) کا تعلق ہے اس میں نجاست کو دور کرنے کی خبر نہیں دی گئی۔ بلکہ پاکیزگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے درج ذیل آیت ہیں۔

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (مائدہ ۶)

اللہ تعالیٰ تمہیں تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ پاک کرنا چاہتا ہے۔

نیز فرمایا۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ (نساء - ۲۶)

اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بیان کرنا اور تمہیں ہدایت دینا چاہتے ہیں

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ (نساء - ۳۱)

اللہ تعالیٰ تمہارے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔

مذکورہ صدر آیات میں ارادہ کا لفظ حکم دینے اور محبت و رضا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس بات کا ارادہ کیا تھا اسے عملی جامہ پہنا دیا۔ اگر ایسا ہوتا

تو اللہ تعالےٰ جس کی تطہیر کا ارادہ کرتے وہ پاک وصاف ہو جاتا - ہمارے معاصر شیعہ کے قول کے مطابق آیت کا مطلب بالکل واضح ہے ہمارے زمانہ کے شیعہ معتزلہ کے ہم خیال ہیں اور ان کی ہمنوائی میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ایسی باتوں کا ارادہ بھی کرتا ہے جو عالم وجود میں نہیں آئیں - ان کے خیال میں آیت قرآنی۔

یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ (سورہ احزاب ۳۳)

آیت تطہیر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل بیت شرعی اوامر و احکام پر عمل پیرا ہوں گے اور محرمات سے باز رہیں گے تو ان کو پاک کر دیا جائے گا

گویا ان کی تطہیر ان کے اپنے ارادوں اور افعال سے وابستہ ہے۔ وہ دلیل جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت امر ہے خبر نہیں ہے۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے حضرت علی، فاطمہ اور حسن وحسین رضی اللہ عنہم کو چادر میں چھپا لیا - اور فرمایا "اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں تو ان سے نجاست کو دور کر کے ان کو پاک کر دے"۔

مسلم نے یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔ ترمذی، ابوداؤد نسائی اور ابن ماجہ نے یہ روایت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نجاست کو دور کرنے اور پاک وصاف کرنے پر قادر ہے۔ نیز معتزلہ کے عین برخلاف یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ افعال العباد کا خالق ہے۔ مندرجہ ذیل آیت سے بھی یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ مذکورہ صدر آیت میں حکم دیا گیا ہے خبر نہیں بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیۡنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ (احزاب)

اور نماز کی پابندی کرو اور زکوۃ ادا کرو اور اللہ ورسول کی فرمانبرداری کرتی رہو۔

سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں امر ونہی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضورؐ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل ہے کیونکہ یہ خطاب ان سے ہو رہا ہے۔ "عنکم" کی ضمیر مذکر سے معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات کے علاوہ اس میں حضرت

علیؓ و فاطمہؓ اور ان کے ابنا و احفاد بھی شامل ہیں جس طرح مسجد نبوی اور مسجد قبا دونوں کی اساس خلوص و تقویٰ پر رکھی گئی تھی بلکہ مسجد نبوی اس وصف میں افضل و اکمل تھی۔ جب آیت قرآنی

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (سورہ توبہ - ۱۰۸)

نازل ہوئی تو مسجد کے لفظ سے مذکورہ دونوں مساجد کو مراد لیا جانے لگا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بروایت صحیح تر منقول ہے کہ ازواج مطہرات ازواج میں شامل ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّاتِهٖ (بخاری مسلم)

جہاں تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب کی محبت کا تعلق ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا قریش کے ہر قبیلہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دارانہ تعلقات تھے بنا بریں اللہ تعالے نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ (اے نبی) آپ فرمائیں کہ میں اس کے سوا تم سے کچھ اجر طلب نہیں کرتا کہ ان قرابت دارانہ تعلقات کی بنا پر جو میرے اور تمہارے درمیان پائے جاتے ہیں تو مجھ سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھو۔ قابل غور بات یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں "اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذِی الْقُرْبٰى" کے الفاظ نہیں فرمائے بلکہ یوں فرمایا فِی الْقُرْبٰى حالانکہ جہاں اقارب مراد لینا مقصود ہوتا ہے وہاں "لِذِی الْقُرْبٰى" کی تصریح ہوتی ہے۔ جیسے آیت کریمہ

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى (انفال - ۴۱)

میں صراحۃً یہ الفاظ موجود ہیں۔

اہل بیت کے ساتھ ہماری دوستی آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجر میں داخل نہیں اس لیے کہ آپ اجر سے بے نیاز تھے اور صرف خداوند تعالے سے اجر طلب کیا کرتے تھے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ مَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (سورہ فرقان - ۵۷)

فرما دیں کہ اس پر میں آپ سے کچھ اجر طلب نہیں کرتا۔

یہ مضمون قرآن کریم کی حسب ذیل آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ الشعراء کی آیات ۱۲۷ - ۱۴۵ - ۱۶۴ - ۱۸۰

سورہ انعام کی آیت ۹۰

سورہ ہود آیت ۵۱

مزید براں آیتِ کریمہ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی مکی ہے اور اس وقت حضرت علی رضی کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اولاد پیدا ہوئی تھی۔

حضرت علی ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے

شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ حضرت علی شب و روز میں ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے درست نہیں۔ اس کے عین برخلاف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر میں ۱۳ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ ساری رات کے قیام کو ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے یوں مخاطب ہوئے۔ "اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا" (تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے) آپ شب و روز میں تقریباً چالیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی رض آنحضور کے طریق کار سے بخوبی آگاہ تھے۔ پھر اس حد تک وہ آپ کی مخالفت کیونکر کر سکتے تھے بشرطیکہ ایک ہزار رکعات ادا کرنا ممکن بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ایک ہزار رکعات پڑھنا ممکن ہی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مختلف قسم کے مشاغل میں گھرا رہتا ہے۔ جسم کا راحت و آرام سونا، کھانا، پینا، وضو کرنا، وظیفۂ زوجیت ادا کرنا۔ اہل و عیال کی دیکھ بھال کرنا۔ رعیت کے امور سے عہدہ برآ ہونا۔ غرض یہ کہ دسیوں قسم کے لوازمات ہیں جن پر بلا مبالغہ انسان کا نصف وقت صرف ہو جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ میں اسّی رکعات ادا نہیں کی جا سکتیں۔ بجز اس کے کہ صرف سورۂ فاتحہ پڑھی جائے اور وہ بھی بلا سکون و اطمینان۔ ہمارے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ آپ نماز میں منافقوں کی طرح ٹھونگے مارنے لگیں اور خدا کو بہت کم یاد کریں جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں مذکور ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ آنحضور نے حضرت علی کو بھائی بنا لیا۔ سند کے اعتبار سے موضوع

ہے۔ اس لیے کہ آپ نے کسی کو بھائی نہیں بنایا تھا۔ مزید براں مواخات کا رابطہ آپ نے مہاجرین کے درمیان استوار نہیں کیا تھا بلکہ مہاجرین و انصار کے درمیان[۵]

شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ سورۂ آل عمران کی آیت "وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ۔ (آل عمران ۶۱) میں حضرت علیؓ کو نفس رسول قرار دیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ اس آیت میں اَنْفُس کا لفظ اسی طرح استعمال کیا گیا ہے جس طرح مندرجہ ذیل آیات میں

قرآن میں فرمایا۔

(۱) لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِہِمْ خَیْرًا (سورۂ نور۔ ۱۲)

(۲) فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ (سورۂ بقرہ۔ ۵۴)

(۳) وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ (بقرہ۔ ۸۴)

انفس سے کیا مراد ہے؟

ان آیات میں اَنْفُس سے نسبی یا دینی بھائی مراد ہیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی غزوہ کے دوران جب قبیلہ اشعر کے لوگوں کا توشہ ختم ہو جاتا ہے تو اپنے باقی ماندہ توشہ کو ایک چادر میں جمع کر کے اسے برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں اس لیے یہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں"

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جُلَیبیبؓ[۲] کے بارے میں فرمایا ھٰذَا مِنِّیْ

---

[۱] سیرت صحابہ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ حضرت عثمان و علی باہم جس قدر قریب تھے یہ تعلق خاطر حضرت ابوبکر و عمر کو ان سے نہ تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ صحابہ میں سے کسی کے ساتھ بھی ان کے اس قدر گہرے روابطہ تھے جتنے آپس میں ان دونوں اکابر کے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق بنی عبد مناف سے تھا۔ بنا بریں اگر حضرت علی کے اگر کسی سے برادرانہ تعلقات تھے بھی تو حضرت عثمان کے ساتھ تھے۔ جو بات بھی اس حقیقت ثابتہ کے خلاف ہوگی خود ساختہ اور بے دلیل ہوگی۔

[۲] حضور کے ارشاد گرامی کی وجہ یہ تھی کہ صحابی موصوف ایک غزوہ میں گم ہو گئے اور آپ نے (باقی برصفحہ ۲۵۰)

وَاَنَا مِنْہُ" یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں۔
اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی کا نکاح حضرت فاطمہ کے ساتھ ان کی عظمت و فضیلت کا موجب ہے۔ جس طرح حضرت عثمان کی شادی حضرت فاطمہ کی دونوں بہنوں کے ساتھ (یکے بعد دیگرے) حضرت عثمان کے لیے باعث فضیلت ہے اور نبی کا عقد مبارک حضرت ابوبکر و عمر کی بیٹیوں کے ساتھ ان دونوں کی عزت افزائی کا موجب ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم آنحضور کے ساتھ رشتۂ مصاہرت میں جکڑے ہوئے تھے۔
شیعہ مصنف لکھتا ہے۔
"حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت سے معجزات صادر ہوئے"۔
اگر معجزات کے لفظ سے شیعہ مصنف کرامات مراد لیتا ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی بہت سے صاحبِ کرامات اولیاء سے افضل تھے۔ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "بہت سے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ربوبیت کا دعوی کیا اور آپ نے انہیں قتل کروا دیا"۔
ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بہرحال اکثر و اعظم تھے اور خدا کا شکر ہے کہ کسی نے آپ کو رب قرار نہ دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ربوبیت علی کے مدعی بہت تھوڑے لوگ تھے اور آپ نے انہیں نذرِ آتش کر دیا۔ مگر آپ کو کافر قرار دینے والے ہزاروں خوارج تھے۔ پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ آپ کی تکفیر کرنے والے خوارج پابند اسلام اور عبادت گذار تھے۔ بخلاف ازیں آپ کے پرستار زنادقہ تھے۔
رافضی مضمون نگار رقمطراز ہے۔
ایک روز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین کا ہاتھ تھامے تھے آپ کا لخت جگر ابراہیم گود میں تھا۔ اسی اثناء میں حضرت جبریل تشریف لائے اور کہا کہ اللہ تعالے حسینؓ و ابراہیم کو جمع نہیں ہونے دیگا اس لیے آپ جس کو چاہیں پسند فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ حسینؓ کی موت

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۹) ان کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ تلاش کرنے پر آپ کی نعش ملی سات مشرکین آپ کے ارد گرد مقتول پڑے تھے۔ ان کو ٹھکانے لگانے کے بعد آپ نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ منظر دیکھ کر آپ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی۔ نیز فرمایا ھٰذَا اِمِنّی وَاَنَا مِنْہُ" ۱۲

کی صورت میں علی و فاطمہ اور میں تینوں روئیں گے اور اگر ابراہیم موت سے ہمکنار ہوا تو میں اکیلا آہ و بکا میں مبتلا ہوں گا اس لیے میں ابراہیم کی موت کو ترجیح دیتا ہوں"۔ چنانچہ تین دن کے بعد ابراہیم فوت ہو گئے"۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ ایک بے سند بات اور بہت گھٹیا قسم کا جھوٹ ہے۔ اس قسم کی باتیں جاہل لوگ کیا کرتے ہیں۔ بھلا ابراہیم و حسین کو جمع کرنے میں کونسا نقصان ہے۔ جو حسن و حسین کو جمع کرنے میں نہیں۔

شیعہ مضمون نگار یہ بھی کہتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن حسین کا نام "زین العابدین" تجویز کیا۔ یہ بے اصل بات ہے اور کسی عالم نے ایسی روایت بیان نہیں کی۔

شیعہ مذکور کا یہ قول کہ "امام ابو جعفر اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے"۔ دعوے بلا دلیل ہے۔ امام زہری اسی زمانہ میں بقید حیات تھے اور وہ لوگوں کے نزدیک ابو جعفر کی نسبت بڑے عالم تھے۔ یہ صریح جھوٹ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو جعفر کا نام باقر تجویز کیا تھا۔

جعفر بن محمد کی مدح و ستائش

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"جعفر بن محمد نے امامیہ کی فقہ اور عقائد و معارف کو خوب پھیلایا"۔

اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ جعفر بن محمد نے وہ مسائل اختراع کیے جو متقدمین کو معلوم نہ تھے یا یہ کہ اس کے پیشرو کوتاہی کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جعفرؒ سے متعلق جھوٹ کا طومار باندھنے والے اس آفت کے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے جھوٹ موٹ کتاب البطاقۃ۔ کتاب الجفر۔ کتاب الہفت۔ اختلاج الاعضاء اور دیگر کتب کو ان کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ دروغ بافی کی حد یہ ہے کہ رسائل اخوان الصفا بعض لوگوں کے نزدیک امام جعفر سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ یہ رسائل ان کے دو صد سال بعد اس زمانہ میں تصنیف کیے گئے تھے۔ جب باطنیہ نے مصر کی حکومت پر قبضہ جمایا اور یہ دعوی کیا کہ وہ شریعت کے پیرو ہیں اور شریعت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ دراصل وہ فلسفہ زدہ لوگ تھے اور اسی

اساس پر انہوں نے وہ رسائل تصنیف کیے تھے۔ نصاریٰ نے ملک شام کے جس علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اس کا ذکر ان رسائل میں ملتا ہے۔

محدث ابو حاتم موسیٰ بن جعفر کے متعلق لکھتا ہے۔

"وہ ثقہ ہے اور مسلمان اماموں میں سے ایک امام ہے"۔

ابن سعد نے لکھا ہے۔

"موسیٰ بن جعفر کثیر الروایت نہیں ہے"۔

جہاں تک موسیٰ بن جعفر کے بعد میں آنے والے ائمہ کا تعلق ہے ان سے علوم وفنون اور فتاویٰ کے اخذ و استفادہ کے بارے میں شیعہ نے جو روایات ذکر کی ہیں ان میں سے ایک بھی درست نہیں۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ وہ فضائل ومحاسن کے حامل ضرور تھے۔ شیعہ کی یہ روایت کہ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن جعفر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی صاف جھوٹ ہے۔ اور وہی شخص اس کو تسلیم کر سکتا ہے جو تاریخی حقائق سے نابلد ہو۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ہارون الرشید عباسی نے موسیٰ بن جعفر کو عراق بلا کر قید کر دیا تھا اور بس!

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"علی بن موسیٰ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے عالم وزاہد تھے"۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے متعلقین مصائب وآلام میں مبتلا ہوئے شیعہ نے ان کی مدح وستائش میں حد درجہ مبالغہ آمیزی سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہ درست ہے کہ علی بن موسیٰ عظیم المرتبت بزرگ تھے مگر ان کے زمانہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے جو ان کی نسبت بہت بڑے عالم تھے اور معروف کرخی و ابو سلیمان دارانی بھی تھے جو علی بن موسیٰ سے کہیں زیادہ زہد وتقویٰ رکھتے تھے۔ شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ "جمہور فقہاء نے علی بن موسیٰ سے بہت کچھ اخذ کیا" بہتان عظیم ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ چند افراد مثلاً ابو الصلت ہروی وغیرہ نے ان سے استفادہ کیا تھا۔

حضرت فاطمہ کی شان میں مبالغہ آمیزی

رافضی مضمون نویس کا یہ قول کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عفت وعصمت کی وجہ سے اللہ تعالے نے ان کی اولاد پر دوزخ کو حرام کر دیا" - یہ جھوٹ ہے - معصوم وعفیف عورتیں لاتعداد ہیں اور ان کی اولاد میں اچھے اور برے سبھی قسم کے لوگ ہیں بنابریں حضرت فاطمہ کو صرف عفت وعصمت کی وجہ سے یہ فضیلت نہیں حاصل ہو سکتی - پھر اس پر طرہ یہ کہ خود شیعہ حضرت فاطمہ رض کی اہلسنت اولاد پر کفر وفسق کا فتویٰ لگاتے ہیں مثلاً حضرت زید بن علی کو وہ صرف اسی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں کہ آپ شیعہ مذہب نہیں رکھتے تھے -

آگے چل کر شیعہ مضمون نگار نے مہدی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہی مہدی منتظر ہے - ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ مفسر ابن جریر نیز ابن قانع[1] اور دیگر علماء نے ذکر کیا ہے کہ امام حسن بن علی عسکری کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی -

امامیہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ حسن عسکری کا نوعمر بیٹا دو یا تین یا پانچ سال کی عمر میں سامرا کے تہ خانہ میں داخل ہو گیا تھا - اگر اسے درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو ایسے نوخیز بچے کا اپنی والدہ[2]

---

[1] ابن قانع کا نام ونسب عبد الباقی بن قانع بن مرزوق کنیت ابو الحسن نسبت بغدادی اور لقب الحافظ ہے - یہ ماہ شوال ۳۵۱ھ میں بعمر ۸۶ سال فوت ہوا - اس نے حارث بن ابی اسامہ اور ابراہیم بن الہیثم بلدی اور ان کے طبقہ کے دیگر علماء سے حدیث روایت کی - اس نے متعدد کتب تصنیف کیں - حسن عسکری کی وفات ابن قانع کی ولادت کے قریب زمانہ میں ہوئی - ابن قانع کے اقارب واساتذہ امام حسن عسکری کے زمانہ کے چشم دید گواہ تھے -

[2] اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ حسن عسکری کا نوزائیدہ فرزند اس وقت پانچ برس کا تھا جیسا کہ امامیہ کا دعویٰ ہے تو اسے اپنے چچا جعفر کے زیر تربیت ہونا چاہیئے تھا - علاوہ ازیں یہ بھی ضروری تھا کہ حسن عسکری کا جو ورثہ ان کے بھائی جعفر کی زیر سرپرستی تقسیم کیا گیا تھا اس میں سے ان کے نوعمر فرزند کا حصہ بھی الگ کیا جاتا - جیسا کہ احتیاط کا تقاضا ہے - جعفر نے اپنے بھائی کی بیویوں اور لونڈیوں کو آدمیوں کے ساتھ اتصال واختلاط سے بدیں وجہ روکے رکھا کہ مبادا ان میں سے کوئی حاملہ ہو مگر کسی کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہوا اور کسی لونڈی نے بھی ——— اہ وہ نرگس نامی باندی ہو یا کوئی اور ——— یہ دعویٰ نہ کیا کہ حسن عسکری سے اس کے یہاں کوئی بچہ ہے - علاوہ ازیں کوئی سیاسی دباؤ (باقی بر ص ۲۵۴)

یا کسی اور قریبی رشتہ دار کے زیرِ تربیت ہونا ضرور تھا۔ نیز یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کے مال و متاع کی دیکھ بھال کرتا۔ مقامِ حیرت ہے کہ ایسا بچہ جو تصرفات کے اختیار سے محروم اور دوسروں کے زیرِ تربیت ہو پوری امتِ مسلمہ کا امام ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) امر بھی اس بات کا متقاضی نہ تھا کہ نو مولود کو اس حد تک مخفی رکھا جائے کہ علویہ کے نقیب کو جو بڑے اہتمام کے ساتھ ایک مخصوص رجسٹر میں اس کنبہ کے افراد کی تاریخ ولادت تحریر کیا کرتا تھا پتہ نہ چل سکا۔ اس پر مزید یہ کہ اس مزعوم نو مولود کے والد حسن عسکری اپنے زمانہ میں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور کوئی حاکم یا غیر حاکم ان کی حریت ذکر امت میں دخل انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ایسے بچے کو پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت تھی جو نہ تو حکامِ وقت کا اقتدار غصب کرنا چاہتا تھا۔ نہ انقلاب بپا کرنے کا خواہاں تھا اور نہ کسی کے خلاف نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

روافض کا عقیدہ ہے کہ حسن عسکری کا یہ کمسن لڑکا اس وقت تک موت سے ہمکنار نہیں ہو گا جب تک شیعہ کو چھوڑ کر سب مخالفین کو تہِ تیغ نہ کر لے۔ اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب اسے موت کا اندیشہ لاحق نہ تھا تو پوشیدہ رہنے کا کیا مطلب؟ تہ خانہ جس کے متعلق شیعہ کا گمان ہے کہ وہ لڑکا وہاں پوشیدہ ہے ایک سراب ہے جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ جس گھر میں بقول شیعہ یہ تہ خانہ موجود تھا حسن عسکری کے بھائی جعفر کی ملکیت میں آچکا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھر کا مالک اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ گھر میں کیا کچھ پوشیدہ ہے۔ جن لوگوں نے یہ گپ ہانکی تھی کہ اس گھر کے تہ خانہ میں حسن عسکری کا بیٹا پوشیدہ ہے ان کا رابطہ اس گھر سے کٹ گیا تھا اور وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ تیل فروش یا گھی فروش کا بیٹا ابن الزیات او السمان اجس کی دوکان مذکورہ گھر کے قریب تھی حسن عسکری کی وفات کے بعد ان کے بھائی جعفر سے نہ کبھی اور نہ اسے کبھی اس گھر میں داخل ہونے کا اتفاق ہوا جس میں وہ سرد خانہ تھا واقعہ یہ تھا کہ گھی فروش کے بیٹے کی دوکان کے قریب ایک درخت تھا۔ شیعہ عوام جن کو کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہوتا تھا شام کے وقت آتے اور اپنے استفتا اس درخت کے سوراخ میں رکھ جایا کرتے تھے ان کے چلے جانے کے بعد گھی فروش کا بیٹا آ کر یہ کاغذ نکال لیتا اور کسی رافضی فقیہ سے ان کا جواب لکھوا کر پھر اسی سوراخ میں رکھ دیتا۔ نادان شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا تھے کہ ان کا بارہواں امام جو ہنوز پیدا نہ ہوا اور نہ اس نے کسی سے تعلیم پائی — یہ جوابات لکھ دیتا ہے شیعہ اور ابن الزیات (زیت فروش کا بیٹا) کا رابطہ اس تہ خانہ یا درخت کے ساتھ بس اتنا ہی تھا دگر ہیچ۔"

مزید براں اگر ایسے امام کے وجود کو فرض بھی کر لیا جائے تو اس سے کوئی دینی یا دنیوی مصلحت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اگر سوال کیا جائے کہ وہ لوگوں کے ظلم کے خوف سے چھپ گیا تھا۔ تو ہم جواباً کہیں گے کہ ظلم تو اس کے آباؤ اجداد کے زمانہ میں بھی ہو رہا تھا مگر انھوں نے چھپنے کو مناسب خیال نہ کیا[1] مزید براں اس کے عقیدت مند ہر جگہ کرۂ ارضی پر موجود ہیں تو وہ ایسی جگہ ظہور پذیر کیوں نہ ہو گیا۔ جہاں اس کے ارادت مند بکثرت ہوں۔ اب بتائیے اس معدوم وموہوم امام سے انتظار طویل اور حسرت والم کے سوا کیا فائدہ پہنچا؟ یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ شیعہ ساڑھے چار سو سال سے اس کے خروج وظہور کی دعائیں کرتے چلے آ رہے ہیں مگر ان کی دعائیں قبولیت سے ہم کنار

---

[1] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اکابر شیعہ نے جن کے سرغنہ نصیر الدین طوسی، ابن العلقمی، اور ابن ابی الحدید تھے ــــ مسلمانوں کے خلاف سازش کر کے ان کو موت کے گھاٹ اتارا۔ یاجوج ماجوج (تاتار) کی تلوار ول سے اسلامی سلطنت کا چراغ گل کر دیا اور علوم اسلامیہ کی لاکھوں کتب دریائے دجلہ میں پھینک دیں جن کی وجہ سے اس کا پانی کئی دن تک سیاہ رہا تو ایسے آڑے وقت میں بقول شیعہ تہ خانہ کا یہ مکین کس لیے تہ خانہ سے باہر نہ نکلا نہ ان کے سامنے اپنی موجودگی کا اعلان کیا؟ حالانکہ شیعہ مذہب کے مطابق وہ اس وقت بقید حیات تھا اور اب بھی زندہ ہے اور شیعہ اس کے عاجلانہ ظہور کے لیے دست بدعا بھی رہتے تھے۔ اس وقت سے موزوں تر وقت اور کون ہو سکتا تھا؟۔

علاوہ ازیں یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ آج کل اطراف عالم میں شیعہ کی کثرت ہے۔ دجلہ وفرات کے دونوں کنارے اور ایران شیعہ سے بھرپور ہیں۔ پھر دور حاضر میں کونسا ظلم امام غائب کے خروج سے مانع ہے؟ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالے نے امام غائب کی حفاظت اور اس کے تحفظ وبقا کی ذمہ داری اپنی ذات پر عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ تحفظ وبقا کی اس گارنٹی کی موجودگی میں ان کی زندگی کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟

آخر تہ خانہ کی تاریکیوں میں دفن رہنے اور دریائے دجلہ وفرات کے جاذب نظر مناظر سے متمتع نہ ہونے میں کیا مصلحت پائی جاتی ہے۔ خداوند کریم ہمیں اصلاح عقائد کی توفیق عطا فرمائیں آمین برحمتک یا ارحم الراحمین ۱۲

نہیں ہوتیں۔[1]

آگے چل کر شیعہ مصنف نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ آخری زمانہ میں میری اولاد میں سے ایک شخص نکلے گا۔ پھر پوری حدیث نقل کی"۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ حدیث شیعہ پر حجت ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "اس کا نام میرا نام اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام کے مطابق ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا نہ کہ محمد بن حسن۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ حضرت حسن کی اولاد میں سے ہوگا حضرت حسین کی اولاد میں سے نہیں۔[2]

---

[1] یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کی بات ہے اور اب تو مزید ۶۶۴ برس گذر چکے ہیں۔ اور اس طرح امام کی غیوبت پر بقول شیعہ گیارہ صدیاں بیت چکی ہیں۔ شیعہ ابھی تک بعجز و انکسار مصروف دعا ہیں۔ کیا اتنی طویل مدت میں ایک بھی مستجاب الدعوات شیعہ نہ تھا جس کی دعا قبولیت سے آراستہ ہوتی۔ اور امام غائب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتے؟

[2] اموی خلافت کے آخری دور میں بنی ہاشم قبیلہ قریش کے محمد نفس زکیہ بن عبداللہ بن حسن المثنیٰ بن حسن السبط کو مہدی خیال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مکہ کو جاتے ہوئے اَبْوا کے مقام پر یہ واقعہ پیش آیا کہ وہاں حضرت حسنؓ و حسینؓ کی نسل کے چند لوگ جمع ہو گئے۔ عباسی خاندان کے ابراہیم و سفاح، منصور اور صالح بن علی بھی موجود تھے۔ عبداللہ بن حسن المثنیٰ اور ان کے دونوں بیٹے محمد اور ابراہیم ان سب کے سردار تھے۔ ابوجعفر منصور کے ایما پر ان سب لوگوں نے محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن کی بیعت کر لی منصور نے سب سے پہلے بیعت کی۔ جب عباسی خاندان برسر اقتدار آیا اور منصور خلیفہ قرار پایا۔ تو اس کی سب سے پہلی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اپنے مرشد و ہادی محمد بن عبداللہ کی بیعت سے آزاد ہو اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ابراہیم کو بھی تہ تیغ کر دے۔ اس ضمن میں خاص بات یہ ہے کہ بنی ہاشم کے عقیدہ کے مطابق مہدی امام حسین کی اولاد سے نہیں بلکہ حضرت حسن کی نسل سے ہوگا۔ چونکہ محمد بن عبداللہ بن حسن حدیث نبوی میں مندرج شرائط کے مطابق تھے اور حضرت علی کی روایت کے مطابق آپ حضرت حسن کی اولاد سے تھے۔ بنابریں بنی ہاشم نے مہدی سمجھ کر ان کی بیعت کر لی خواہ ان کا (باقی بر صفحہ ۲۵۷)

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"یہ تھے معصوم ائمہ جو فضل و کمال کی آخری حد تک پہنچ گئے اور دوسرے اماموں کی طرح حکومت و سلطنت، فواحش و منکرات، لغویات اور شراب نوشی میں منہمک نہ ہوئے۔ اسی بنا پر امامیہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

(۱) إِذَا شِئْتَ أَنْ تَرْضَىٰ لِنَفْسِكَ مَذْهَبًا ... وَتَعْلَمَ أَنَّ النَّاسَ فِي نَقْلِ أَخْبَارِ

(۲) فَدَعْ عَنْكَ قَوْلَ الشَّافِعِيِّ وَمَالِكٍ ... وَأَحْمَدَ وَكَمْ رُوِيَ عَنْ كَعْبِ أَحْبَارِ

(۳) وَوَالِ أُنَاسًا قَوْلُهُمْ وَحَدِيثُهُمْ ... رَوَى جَدُّنَا عَنْ جِبْرِيلَ عَنِ الْبَارِي

(۱) جب تو اپنے لیے کوئی مذہب پسند کرنا چاہے اور یہ معلوم کرنا چاہے کہ روایات کے نقل کرنے میں لوگوں کی کیا حالت ہے۔

(۲) تو شافعی، مالک اور احمد کے اقوال اور کعب احبار کی روایات ترک کر دو۔

(۳) اور ان لوگوں سے دوستانہ مراسم استوار کر جن کا قول اور حدیث یہ ہے کہ ہمارے نانا نے جبریل سے اور جبریل نے باری تعالیٰ سے روایت کی"۔

شیعہ مصنف کی ذکر کردہ دلیل کا جواب کئی طرح پر ہے:

اہل سنت کے جوابات

پہلا جواب: اماموں کے معصوم ہونے کی شیعہ کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ ہر زمانہ میں امام معصوم کا وجود لوگوں کے لیے لطف و مصلحت کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے امام کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ ہم قبل ازیں اس دلیل کا بطلان و فساد واضح کر چکے ہیں کہ یہ لطف و مصلحت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) یہ اقدام صحیح ہو یا غلط۔ اس لیے کہ حدیث سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کا نام آنحضور کا نام اور ان کے والد کا نام آنحضور کے والد کا نام ہوگا۔ چونکہ شیعہ اس بات کے مدعی تھے کہ حسن عسکری کا ایک بیٹا موجود ہے مگر وہ حسن کے نام کو عبداللہ کی صورت میں تبدیل کرنے پر قادر نہ تھے لہٰذا انہوں نے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ بارہویں امام کا نام محمد ہوگا مگر حدیث نبوی نے انہیں رسوا کر دیا کیونکہ ان کے والد کا نام عبداللہ نہیں بلکہ حسن ہے) بہرکیف مہدی سے متعلق احادیث کی چھان بین اور ان کا دقیق و عمیق مطالعہ ضروری ہے۔

موجود نہیں مفقود ہے۔ اس لیے کہ یہ امام ہنوز مفقود ہے اور شیعہ بے تابی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں ایسے امام کی نفی کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ امام کا وجود صریح عقل کے منافی ہے اور کسی شخص نے امام منتظر سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ کسی مکلف کو کوئی مصلحت حاصل ہوئی۔ تاہم اس کے علاوہ دیگر دلائل و براہین بھی موجود ہیں۔

دوسرا جواب:۔ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "ہر امام فضل و کمال کی انتہا کو پہنچ گیا"۔ دعوے بلا دلیل ہے اور ہر شخص ایسا دعوی کر سکتا ہے خصوصاً جبکہ یہ دعوی صحابہ و تابعین کے بارے میں کیا جائے جو علم و فضل اور تدین و تشرع میں امام عسکری اور ان کے اتباع سے افضل و اشہر تھے تو یہ دعوی اولیٰ بالقبول ہوگا۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ائمہ دین علمی و دینی فضائل میں امام عسکری اور ان کے متعلقین کی نسبت بہت آگے تھے۔

تیسرا جواب:۔ اگر شیعہ مصنف کا مقصود یہ ہے کہ ان کے ائمہ معصومین قوت و شوکت اور سیف و سنان سے بہرہ ور تھے تو یہ صریح کذب ہے خصوصاً جبکہ وہ خود بھی اس کے مدعی نہیں بلکہ حضرت علی کے سوا سب امام اپنے آپ کو عاجز و مغلوب قرار دیتے تھے۔ حضرت علی اگرچہ خلافت و سلطنت سے بہرہ ور تھے۔ تاہم متعدد امور میں آپ کو سخت تکالیف کا سامنا ہوا[1]۔ اس پر مزید یہ کہ آدھی امت مسلمہ یا اس سے کم و بیش نے سرے سے آپ کی بیعت ہی نہیں کی۔ بلکہ آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے نہ

---

[1] حضرت علی کی مشکلات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ کے رفقاء کما حقہ آپ کی اطاعت نہیں کرتے تھے جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آپ صدق دل سے قاتلین حضرت عثمان سے قصاص لینا چاہتے تھے۔ مگر آپ کے شیعہ اس میں روڑے اٹکاتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں ابن سبا کی دسیسہ کاریوں سے متاثر ہو کر آپ کے ارادتمندوں میں کفر و الحاد کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے ان میں سے ایک فریق کو نذر آتش کر دیا۔ اور دوسرے کو جلا وطن کیا۔ نیز آپ کے شیعہ میں سے کچھ لوگ آپ کے مخالف بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی تکالیف تھیں جن کا شکوہ حضرت علی خود فرمایا کرتے تھے۔

آپ کی مخالفت کی اور نہ معاونت بلکہ غیر جانبدار رہے اور ان میں ایسے اصحاب علم وفضل بھی تھے جو حضرت علی کے ساتھ نہ تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے حرب وپیکار میں حضرت علی کا ساتھ نہ دیا وہ آپ کے اصحاب والضار کی نسبت افضل تھے۔

اور اگر شیعہ قلمکار کی مراد یہ ہے کہ شیعہ کے اکابر علم و دین کے بل بوتے پر امام قرار دیئے جانے کا استحقاق رکھتے تھے تو اس دعوی سے ان کا واجب الاطاعت امام ہونا لازم نہیں آتا جس طرح کسی شخص کے مستحق امامت یا قاضی بننے کی صلاحیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فی الواقع امام یا قاضی ہو بھی یا امارت حرب کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درحقیقت اس منصب پر فائز ہو۔

نماز اس شخص کی اقتداء میں جائز ہے جو بالفعل امام ہو نہ کہ مستحق امامت کے پیچھے۔ بعینہٖ اسی طرح لوگوں کے متنازع امور میں فیصلہ وہی شخص صادر کرے گا جو صاحب سلطنت وقدرت ہو نہ کہ وہ شخص جو قضا کا استحقاق رکھتا ہو۔ لشکر اس شخص کے زیر فرمان لڑے گا جو ان کا امیر حرب ہو نہ کہ مستحق امارت کے زیر اثر۔ خلاصۂ کلام ! ہر فعل قدرت کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ لہٰذا قدرت وسلطنت سے محروم شخص ولایت و امارت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ استحقاق ایک جداگانہ شے ہے اور اس منصب پر بہرہ ور ہونے کے ہم پلہ ہرگز نہیں۔ خلیفہ و امام دراصل وہ ہوتا ہے جو شوکت وقدرت کی صفات سے موصوف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ کے ائمہ میں سے حضرت علی کے سوا ایک امام بھی ایسا نہیں جو ان صفات سے بہرہ ور ہو۔

چوتھا جواب :۔ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ استحقاق سے تمہاری مراد کیا ہے ؟ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ قریش کو چھوڑ کر ائمہ شیعہ میں سے کسی ایک کا خلیفہ ہونا ضروری تھا یا یہ مطلب کہ ائمہ میں سے ہر ایک ان لوگوں میں سے ہے جو خلافت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پہلی بات اس لیے غلط ہے کہ احادیث نبویہ سے صراحۃً امامت قریش کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اگر دوسری بات تسلیم کی جائے تو اس میں قریش کے دوسرے لوگ مساوی طور پر شریک ہیں۔

پانچواں جواب :۔ امام وہ ہے جس کی اقتداء کی جائے اس کے دو طریقے ہیں۔

(۱) پہلا یہ کہ علم و دین میں اس کی طرف رجوع کیا جائے اور اطاعت کنندہ اس بنا پر اس کی اطاعت اختیار کرے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے اوامر و احکام اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے تاہم اس میں ایسی کوئی قوت نہیں ہوتی کہ کسی کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ وہ صاحب قوت و شوکت اور مالک سیف و سنان ہو۔ اور لوگوں کو طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کرنی پڑے۔ آیت کریمہ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں "اولی الامر" سے اصحاب قدرت مثلاً امراء حرب اور علماء دونوں مراد لیے گئے ہیں۔ یہ اوصاف یوں تو چاروں خلفائے راشدین میں مکمل طور پر پائے جاتے ہیں وہ علم و عدل اور سیف و سنان دونوں کے دھنی تھے۔ تاہم ان میں بھی تفاوتِ درجات موجود ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ و علیؓ کی نسبت اکمل و افضل تھے۔ ان کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسرا کوئی خلیفہ ان اوصاف کا جامع نہ تھا۔ بعض اشخاص خلفاء و سلاطین کی نسبت علم و فضل اور دینداری میں آگے تھے۔ بعض حکومت و سلطنت میں کامل تھے مگر علم و فضل اور تدین میں ان کو وہ مقام حاصل نہ تھا۔

اگر شیعہ کے ائمہ کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ با اقتدار بھی تھے تو یہ غلط ہے اور وہ خود بھی اس کے مدعی نہیں تھے۔ اور اگر اقتدار سے محرومی کے باوصف علم و دین میں ان کی امامت کو تسلیم کیا جائے تو دوسرے علماء بھی اس وصف میں ان کے شریک تھے بلکہ ان کے معاصرین میں سے بہت سے علماء علم و تقویٰ میں ان سے بہت آگے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے معاصرین سے جو علمی آثار نقل ہو کر ہم تک پہنچے وہ ائمہ شیعہ کی علمی خدمات سے بہت زیادہ ہیں۔ شیعہ کے متقدمین ائمہ مثلاً علی بن حسین ان کے بیٹے ابو جعفر اور ان کے بیٹے جعفر بن محمد سے کچھ علمی آثار نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان کے معاصرین کی علمی خدمات ان پر بدرجہا فائق ہیں۔

متاخرین ائمہ شیعہ کی علمی خدمات کا دائرہ بے حد محدود ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس دور کے مشاہیر اصحاب علم و حدیث و فتوی کے زمرہ میں شمار ہی نہیں کیے جاتے۔ ان کی شان میں جو مناقب و محاسن ذکر کیے جاتے ہیں اس سے زیادہ فضائل ان کے ہم عصر علماء

کے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کو علم و دین میں افضل الامت قرار دینا خلاف واقع ہے۔

دونوں صورتوں میں ائمہ شیعہ کی امامت اہل سنت کے نزدیک مسلّم ہے اس کی وجہ اہلسنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص بھی اللہ و رسول کی اطاعت کی دعوت دیتا اور اعمال صالحہ کی تلقین کرتا ہو تو اس کی بات مان لینا چاہیئے۔ بنا بریں اہل سنت اعمال صالحہ کی جانب دعوت و تبلیغ میں ائمہ شیعہ کی اطاعت کرنے سے گریز نہیں کرینگے۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سجدہ۔۲۴)

ہم نے ان میں ایسے امام مقرر کیے تھے جو ہمارے حکم کے مطابق انکو ہدایت کرتے تھے

اللہ تعالے نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ ۱۲۴)

میں تجھے لوگوں کا امام بناؤں گا۔

حضرت ابراہیم کی امامت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ شمشیر بکف لوگوں سے لڑیں گے بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ واجب الاطاعت ہوں گے یہ دوسری بات ہے کہ لوگ آپ کی اطاعت کریں یا اس سے منحرف ہو جائیں۔

شیعہ کے امام اہل سنت ائمہ کی طرح عزو شرف کے حامل ہیں اور اہل سنت ان باتوں میں ان کی اطاعت کرتے ہیں جن امور میں شرعاً ان کی فرمانبرداری روا ہے۔ شیعہ کے ائمہ کا اجلال و اکرام اہل سنت کے یہاں اسی طرح ضروری ہے جس طرح ان کے مسلّم ائمہ کی عزت افزائی مثلاً ابوبکرؓ و عمرؓ۔ ابن مسعود۔ ابی بن کعب۔ معاذ۔ ابو الدرداء اور تابعین و تبع تابعین میں سے سلیمان بن یسار۔ عبید اللہ بن عبد اللہ۔ عروہ بن زبیر۔ قاسم بن محمد۔ ابوبکر بن عبد الرحمن خارجہ بن زید۔ علقمہ۔ اسود بن زید۔ اسامہ بن زید۔ محمد بن سیرین۔ حسن بصری۔ سالم بن عبد اللہ ہشام بن عروہ۔ عبد الرحمن بن قاسم۔ زہری۔ یحییٰ بن سعید انصاری۔ ابو الزناد۔

علاوہ ازیں امام مالک، اوزاعی۔ لیث بن سعد۔ ابو حنیفہ۔ شافعی۔ احمد بن حنبل۔ اسحٰق

بن ابراہیم وغیرہم۔

مذکورہ بالا اصحاب کی علمی حیثیت ہرگز مساوی نہیں بلکہ ان میں بعض اکابر کا علمی پایہ دوسروں کی نسبت بلند تر ہے۔ اور ان کی شہرت کثرت علم۔ قوت دلیل یا دوسرے اوصاف کی رہین منت ہے۔ بنا بریں اہل سنت یہ نہیں کہتے کہ یحییٰ بن سعید۔ ہشام بن عروہ اور ابوالزناد جعفر بن محمد کی نسبت اولی بالاتباع ہیں۔

علی ہذا القیاس وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ امام زہری۔ یحییٰ بن ابی کثیر۔ حماد بن ابی سلمہ۔ سلیمان بن یسار اور منصور بن معتمر کی اطاعت جعفر بن محمد کے والد ابوجعفر الباقر کی نسبت واجب تر ہے۔ نہ یہ کہ قاسم بن محمد۔ عروہ بن زبیر اور سالم بن عبداللہ کی فرمانبرداری علی بن حسین کی اطاعت سے زیادہ ضروری ہے۔

اس کے عین برخلاف اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر امام کی مرویات و منقولات وثوق و اعتماد کے قابل ہیں اور کتاب وسنت کی روشنی میں ان کا ہر ارشاد واجب الاتباع ہے۔ جب کوئی امام ایسا فتویٰ دے جو دوسرے علماء و ائمہ کے خلاف ہو تو امر متنازع کو

---

[۱] بشرطیکہ امام سے روایت کرنے والے صادق الروایت و ثقہ ہوں۔ بعض شیعہ نے امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں اس دعویٰ کے ساتھ سوء ادبی کی جسارت کی ہے کہ آپ نے اہل بیت کی روایات نقل کرنے میں بخل سے کام لیا ہے یہ ایک عظیم جسارت وسفاہت ہے واقعہ یہ ہے کہ امام موصوف نے اس ضمن میں تساہل سے کام نہیں لیا۔ بخلاف ازیں ان کے یہاں روایت حدیث کے شرائط ان راویوں میں سرے سے مفقود ہیں جو اہل بیت سے روایات نقل کرتے ہیں بلکہ ایسی روایات جھوٹ کا طومار ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب کو روایات کاذبہ سے پاک رکھنے کے التزام کو قائم رکھا ہے مقدمہ کتاب میں ہم امام مالک، شافعی، یزید بن ہارون، اور اعمش کے اقوال درج کر چکے ہیں کہ شیعہ وضاع و کذاب ہوتے ہیں۔ بیشک صدق شعار بدعی کی روایت اس شرط کے ساتھ مقبول ہے کہ وہ اپنی بدعت کا داعی نہ ہو۔ مگر شیعہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ شیعہ کی روایت اہل بیت وغیر اہل بیت کسی سے بھی مقبول نہیں اس لیے کہ وہ احادیث کو وضع کر کے ان کو دین و مذہب کا درجہ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے شیعہ کی جھوٹی روایات اور ان کا تاریخی اختلاف ہی کافی ہے کیا امام بخاری سے یہ نہیں اس بات کی توقع تھی کہ وہ انکی دروغگوئی کے دھوکہ میں آجائیں گے؟

بفحوائے قرآن کریم اللہ و رسول کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یہ حکم سب ائمہ کے لیے عام ہے۔ کوئی امام استثنائی حیثیت کا حامل نہیں عہد رسالت اور خلفاء راشدین کے زرین دور میں بھی مسلمان اسی پر عمل پیرا تھے۔

چھٹا جواب :۔ شیعہ مصنف کی یہ بات غلط ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک سلاطین و ملوک کی ہر جائز و ناجائز بات قابل اطاعت ہے تو یہ ان پر صریح بہتان ہے اہل سنت کے معروف بالعلم علماء کا قول ہے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہ کی جائے اور نہ ایسے شخص کو امام مقرر کیا جائے اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ طاعات و عبادات کے انجام دینے میں اہل سنت سلاطین سے طلب امداد کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انہیں اس اعتبار سے امام بنانا ناروا ہے تو خود روافض بھی اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ کفار و فجار سے طالب امداد ہوتے اور بہت سی باتوں میں خود بھی ان کی امداد کرتے ہیں[۱]۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہر زمان و مکان میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود شیعہ مصنف اور اس کے ہمنوا بھی اس الزام سے بچ نہیں سکتے اس لیے کہ تاتاری کافر اور دیگر فساق و جہال ان کے اماموں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ساتواں جواب :۔ شیعہ مصنف نے اپنی کتاب میں جن ائمہ کا ذکر کر کے ان کے معصوم ہونے

---

[۱] شیعہ مصنف ابن المطہر کا استاد نصیر الدین طوسی اس امر کی بہترین مثال ہے کہ شیعہ علماء کس حد تک کفار و فجار سے طلب امداد کرتے اور ان کی خدمت و خوشامد کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار خیال کیا کرتے تھے۔ ہم قبل ازیں شیعہ کی معتبر کتاب "روضات الجنات" ص ۵۷۸ طبع ثانی سے نقل کر چکے ہیں کہ طوسی نے جس عظیم خیانت کا ارتکاب کیا تھا شیعہ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ہلاکو خاں تاتاری سے لے کر سلطان خدا بندہ ــــ جس کے لیے ابن المطہر رافضی نے یہ رسوائے عالم کتاب لکھی ــــ تک جتنے بت پرست بادشاہ ہوئے ہیں شیعہ علماء ان کی خدمت و استعانت کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار تصور فرمایا کرتے تھے بسلطان خدا بندہ شیعہ مذہب اختیار کرنے سے قبل بت پرست تھا۔ موجب حیرت ہے کہ ابن المطہر رافضی کے نزدیک اس مشرک بادشاہ کا پایہ حضرت ابوبکر و عمر ــــ جن سے بلند تر حاکم انبیاء کے بعد اس کرۂ ارضی پر پیدا ہی نہیں ہوا ــــ سے بڑھ کر تھا۔ ۱۲

کا دعوی کیا ہے وہ اس قوت و شوکت سے بہرہ ور نہ تھے جس کے ساتھ امامت و خلافت کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی اقتدا ء عبادت خداوندی اور اس کے ضروری معاونات کے حصول میں کافی تھی۔ ملک و سلطنت سے محروم ہونے کی بنا پر نہ ہم ان کے پیچھے نماز ادا کر سکتے ہیں نہ حج و جہاد میں ان کو امیر مقرر کر سکتے ہیں نہ وہ شرعی حدود قائم کرنے پر قادر ہیں اور نہ فصل خصومات کی قدرت سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی مدد سے کوئی شخص لوگوں سے یا بیت المال سے اپنے حقوق وصول نہیں کر سکتا نہ ان کی بدولت راستے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ جملہ امور ایک صاحب اقتدار خلیفہ کے محتاج ہیں اور صاحب اقتدار وہی ہو گا جو احباب و اعوان رکھتا ہو شیعہ کے یہ ائمہ ان سب اوصاف سے محروم تھے۔ بخلاف ازیں ان کے مخالفین اس قدرت سے بہرہ ور تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایک عاجز امام سے یہ جملہ امور طلب کرے گا وہ عدد رجہ جاہل و ظالم شخص ہے اور جو صاحب قدرت سے کرے گا وہ راہ حق و صواب پہ گامزن ہو گا اور دین و دنیا کی مصلحتوں کو حاصل کر لے گا۔ اس کے عین برخلاف پہلا شخص دونوں قسم کے مصالح سے محروم رہے گا۔

آٹھواں جواب :۔ آٹھواں جواب یہ ہے کہ جملہ خلفاء سے متعلق یہ دعوی جھوٹ ہے کہ وہ خمور و فجور میں محو رہا کرتے تھے اس ضمن میں جو حکایات بیان کی جاتی ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں[1] یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ان میں حضرت عمر بن عبد العزیز اور خلیفہ مہتدی باللہ[2] جیسے عادل و زاہد

---

[1] یزید بن معاویہ کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بھی اس بہتان طرازی میں شامل ہے حالانکہ محمد بن علی بن ابی طالب کے ۔ جن کو ابن الحنفیہ کہا جاتا ہے ۔ کے نزدیک یزید کا دامن ان معائب و نقائص سے پاک تھا (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۸ ص ۲۳۳) محب الدین الخطیب نے العواصم من القواصم ص ۲۲۷۔ ۲۲۸ کے حاشیہ پر اس کی تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ یزید نے اپنے ننہیال کے قبیلہ قضاعہ میں پرورش پائی تھی اور اس کی والدہ میسون بنت بجدل نے یزید کو مردانہ کمالات و اوصاف سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ بٹایا تھا۔ شیعہ مذہب کی کتب یزید کی قباحت و مذمت سے پر ہیں یہ سب کذب و بہتان اور ظلم کے مترادف ہے اور شیعہ اس کے لیے خدا کے حضور جوابدہ ہوں گے ۱۲

[2] خلیفہ مہتدی باللہ عباسی (۲۲۲۔ ۲۵۶) کی تاریخ فضائل و نوافل سے لبریز ہے۔ یہ نے دور حاضر کے (باقی بر ص ۲۶۵)

بھی تھے۔ مزید براں بنو امیہ و بنو عباس کے اکثر خلفاء کا دامن فواحش و منکرات سے پاک تھا۔ بعض خلفائے اگر کسی گناہ میں ملوث ہو بھی جاتے تو فوراً اس سے تائب ہو جاتے، بعض اوقات اس کی نیکیوں سے اس کی برائیاں مٹ جاتیں یا مصائب و آلام میں مبتلا ہو کر اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے۔

خلاصہ کلام! سلاطین و ملوک اعمال صالحہ انجام دیتے اور برائیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی لاتعداد برائیوں کا ارتکاب کرتا جس کی حد یہ ہے کہ امت کا کوئی فرد اس ضمن میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا تو بلاشبہ اس کی نیکیاں بھی اتنی زیادہ ہوا کرتی تھیں کہ کوئی شخص ان کا حریف نہ ہو سکتا۔ ان کے اعمال صالحہ کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ مثلاً امر بالمعروف،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۴) جس مورخ و ادیب سے بھی خلیفہ مذکور کے محاسن و مناقب کا ذکر کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حالانکہ تاریخ اسلام کا حق یہ تھا کہ ایسے پاکباز خلیفہ کے سیرت و سوانح سے متعلق لوگوں کے ہاتھوں میں دسیوں تصانیف ہوتیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎۱ بنو امیہ و بنو عباس کی تاریخ قلمبند کرنے اور ان کی روایات و اخبار کی تشہیر کرنے والے مصنفین شیعہ یا شعوبیہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے امت مسلمہ کی تاریخ کو بگاڑ کر اس کے محاسن کو معائب میں بدل دیا۔ ذہین طبقہ اگر اسلامی تاریخ کے درس و مطالعہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو تو تھوڑی سی مدت میں ان کثیر تحریفات کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

؎۲ میں مسلم فضلاء و مصنفین کی توجہات سامیہ کو اس حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ شیعہ بشر کو بشر نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے میں یا تو انسان فرشتوں کی طرح معصوم ہوتا ہے بلکہ ان سے بھی بالاتر یا ابلیس کی طرح ملعون بلکہ اس سے بھی گیا گذرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض انسانوں کو جو نبی بھی نہ تھے معصوم قرار دیا اور مسلمانوں کے خلفاء و حکام اور داعیان حق کے خلاف ازرہ بغض و عداوت کذب و دروغ کا طومار جمع کر دیا۔ ان اصحاب خیر و برکت کا سلسلہ حضرت ابوبکر و عمر سے شروع ہو کر راقم السطور محب الدین الخطیب تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ شیعہ نہ ہوتے اور اس لقب کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے۔ اس لیے کہ تشیع نام ہے تحزب و تعصب کا اور بس! ونعوذ باللہ من التعصب ۱۲ آمین یا رب العالمین ۱۲۔

نہی عن المنکر، اقامتِ حدود، جہاد فی سبیل اللہ، ادا حقوق، دفع ظلم اور اقامت عدل وغیرہ۔

ہم خلفاء کو گناہوں سے مبرا قرار نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہتے ہیں کہ خلفاء یا عوام سے ظلم و معاصی کے صدور کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا دامن نیکیوں سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ اہلسنت یہ بھی نہیں کہتے کہ جملہ امور میں خلفاء کی موافقت ضروری ہے بلکہ اطاعت صرف نیک اعمال میں ضروری ہے معصیت میں نہیں۔ جو شخص طاعات و عبادات میں کسی دوسرے کے ساتھ شریک ہو اور اعمال قبیحہ میں اس سے کنارہ کش رہے تو اسے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص لوگوں کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے جائے اور ان کے ساتھ وقوف و طواف انجام دے تو کسی حاجی کے گنہگار ہونے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بعینہٖ اسی طرح اگر کوئی شخص جمعہ و جماعت یا کسی علمی مجلس یا غزوہ میں شریک ہو اور اس کے رفقاء میں سے کوئی شخص متعدد گناہ کر چکا ہو تو اسے اس کے گناہوں کی وجہ سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ خلفاء اس ضمن میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مساوی ہیں کہ طاعات میں ان کی موافقت کی جائے۔ اور معصیت میں ان کے ساتھ اشتراک کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ اہل بیت کا برتاؤ بھی دوسروں کے ساتھ اسی قسم کا تھا۔ جو نیک کاموں میں ان کی اطاعت کرے گا وہ ان کا پیرو کہلائے گا۔ اور جو سابقین اولین و جمہور اہل علم سے اظہار براءت کر کے کفار و منافقین کا ساتھ دے گا۔ جیسا کہ شیعہ کا طرز عمل ہے ـــــ تو وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

نواں جواب: خلیفہ وامام ایسا ہونا چاہیئے جو قدرت و شوکت سے بہرہ ور ہو اور جس سے لوگوں کی بہبود و مصلحت کی شیرازہ بندی ہو جائے۔ مزید براں خلیفہ میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا بے حد ناگزیر ہے۔

(۱) خلیفہ کی وجہ سے راستوں میں امن و امان کا دور دورہ ہو

(۲) شرعی حدود قائم کرنے پر قادر ہو۔

(۳) ظلم کا ازالہ کر سکے۔

(۴) دشمن کے خلاف جہاد کر سکتا ہو

(۵) دوسروں کے حقوق حاصل کرنے پر قادر ہو۔

مقام حیرت و استعجاب ہے کہ شیعہ جس امام معصوم کے دعوے دار ہیں وہ سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔ گویا شیعہ باطن میں جس امام کے دعویدار ہیں وہ معدوم ہے اور بظاہر جن کو امام مانتے ہیں وہ کافر ظالم ہیں (مثلاً تاتاری کافر) اس کے عین برخلاف اہل سنت کے امام ظلم و گناہ کے مرتکب ہونے کے باوصف شیعہ کے ان ظاہری ائمہ سے بدرجہا بہتر ہیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں اور اس امام سے بھی بڑھ کر ہیں جو بے حقیقت اور معدوم ہے۔ جہاں تک باقی ائمہ کا تعلق ہے وہ فریقین میں موجود ہیں اور وہ اپنے اپنے اکابر کی اطاعت کرتے ہیں ظاہر ہے کہ فریقین کے ائمہ کی اطاعت کرنے والا اس شخص سے بہتر ہے جو صرف ایک ہی فریق کے اماموں کا اطاعت گذار ہو۔ اس لیے کہ روایت و درایت کا نام علم ہے اور اس میں جس قدر بھی علما ہوں گے اور ان میں باہم اتفاق و اتحاد پایا جائے گا تو وہ اولیٰ بالاتباع ہو گا۔ شیعہ کے یہاں جو خیر بھی موجود ہے اہل سنت اس میں برابر کے شریک ہیں مگر جو خیر اہل سنت کے یہاں پائی جاتی ہو شیعہ اسے حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

دسواں جواب :۔ دسواں جواب یہ ہے کہ رافضی مصنف نے جو دلیل پیش کی ہے اہل سنت اس پر شدید معارضہ کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ سعید بن مسیب، علقمہ، اسود، حسن بصری، عطاء بن ابی رباح، محمد بن سیرین، مطرف، مکحول، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، سالم بن عبد اللہ اور دیگر تابعین و تبع تابعین سب ائمہ دین میں شمار ہوتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ علی بن حسین اور ان کا فرزند نیز جعفر بن محمد وغیرہم بھی یکساں طور پر اہل سنت کے اماموں میں شامل ہیں۔ قصہ مختصر! شیعہ علم و زہد سے بہرہ ور جس امام کی بھی اطاعت کرتے ہیں اہلسنت اس میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں اور اس کے پہلو بہ پہلو اپنے ائمہ کے بھی تابع فرمان ہیں جو علم و زہد میں شیعہ کے اماموں سے بڑھ کر تھے۔ بفرض محال اگر اہل سنت نے معاصی کا ارتکاب کرنے والے کسی شخص کو امام بنانے کی غلطی کا ارتکاب کیا تو شیعہ نے اس سے بھی بدتر شخص کو امام مقرر کر لیا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو ئی کہ اہل سنت نے ظالم خلفاء کی اطاعت صرف ان باتوں میں کی تھی جو ظلم و معصیت نہ تھیں۔ بنا بریں اہل سنت بہر کیف روافض سے افضل ہوئے۔

گیارہواں جواب :۔ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور اہل سنت کے درمیان

نیصلہ فرمائے گا:"

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ دلائل و براہین کی بنا پر اللہ تعالے نے یہ نیصلہ دنیا ہی میں کر دیا ہے۔ مزید براں اہل سنت قوت و شوکت کے اعتبار سے بھی ہمیشہ شیعہ پر غالب رہتے ہیں گویا اہل سنت کا یہ غلبہ دوگونہ ہے (۱) حجت و برہان کے اعتبار سے (۲) سیف و سناں کے بل بوتے پر جس طرح آنحضور کا دین باقی ادیان کے مقابلہ میں غالب ہوا تھا۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (سورہ توبہ-۳۳- صف ۹- فتح-۲۸)

وہ خدا کی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر مبعوث کیا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔

یہ ناقابل انکار صداقت ہے کہ اہل سنت کے عقاید و افکار کا حامل شخص دلیل و برہان کی بنا پر شیعہ پر غالب آئے گا جس طرح دین اسلام باقی ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں غالب رہا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ دیگر ادیان و مذاہب پر دین اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا وہ اہل سنت کی وجہ سے ہوا۔ دین اسلام کو جو غلبۂ کامل خلفاء ثلاثہ کے عہد سعادت مہد میں حاصل ہوا۔ وہ دوسرے کسی دین کو نصیب نہ ہو سکا[۱]۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگرچہ خلفائے راشدین میں شامل ہیں اور سابقین اوّلین میں شمار ہوتے ہیں مگر آپ کے عہد خلافت میں اسلام کو یہ غلبہ حاصل نہ ہو سکا[۲]۔ بخلاف ازیں فتنہ پردازی کی وجہ سے اہل اسلام کا شیرازہ بکھر گیا، ور اعداء دین مثلاً کفار

---

۱ یہ حقیقت ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے بعد اموی خلافت کے زمانہ میں شرق و غرب اور یورپ میں اسلامی دعوت کو جو فروغ حاصل ہوا وہ اموی خلفاء کی مساعی جمیلہ کا رہین منت ہے ۱۲

۲ حضرت علی کی خلافت میں اسلامی دعوت کے ناکام ہونے کے ذمہ دار وہ شیعہ تھے جو آخر کار کئی حصوں میں بٹ گئے ان میں سے بعض آپ کے موافق اور بعض مخالف ہو گئے۔ آپ کے معاصر شیعہ بہ مقابلۂ متاخرین شیعہ کی نسبت کم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ متاخرین شیعہ نے اسلام کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی مذموم سعی کی تھی اور اس کی ظاہری صورت کو اس طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا کہ وہ اسلام کے سوا کچھ اور معلوم دیتا تھا

نصاریٰ و مجوس مختلف دیار و امصار میں اسلامی ممالک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگ گئے حضرت علی کے بعد اہل سنت کے سوا نہ کوئی اہل علم باقی رہا اور نہ غازی و مجاہد جن کی بدولت اسلام کو غلبہ نصیب ہوتا۔ روافض کا یہ حال تھا کہ یا تو اعداء اسلام کا ساتھ دیتے[1] یا غیر جانبدار رہتے[2]

اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت سابقین اولین مہاجرین و انصار اور ان کے اعداء کے درمیان اسی طرح فیصلہ فرمائے گا جس طرح اہل اسلام اور کفار کے مابین فیصلہ صادر کرے گا۔

بارھواں جواب:۔ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ آخر کس کے ظلم سے تم آہ و فریاد کر رہے ہو؟ اگر شیعہ کہیں کہ ابوبکر رض و عمر رض نے حضرت علی رض پر مظالم ڈھائے تھے اور ہم ان کے ظلم سے فریاد کے خواہاں ہیں۔ تو ہم جواباً کہیں گے کہ اس دعویٰ کا حق حضرت علی رض کو پہنچا تھا۔ اور آپ حضرت ابوبکر و عمر کی طرح وفات پا چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اہل سنت و شیعہ سے متعلق نہیں سوائے اس کے کہ حق کی وضاحت کر کے اہل حق کی امداد کی جائے۔

ہم دلائل قاہرہ کی روشنی میں یہ صداقت واضح کر سکتے ہیں کہ اس امت میں حضرت ابوبکر و عمر سے بڑھ کر نہ کوئی عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل کر سکا اور نہ ظلم سے کنارہ کش رہا۔[3] ہم آگے

---

[1] چنانچہ جب ہلاکو خاں نے یاجوج ماجوج (تاتاری فوج) کی مدد سے بغداد پر حملہ کیا تو شیعہ نے نصیر الدین طوسی اور ابن العلقمی کی قیادت میں کفار کا ساتھ دیا ۱۲

[2] اس کی دلیل یہ ہے کہ تاتاریوں نے جب بلاد اسلامیہ پر حملہ کیا تو شیعہ اس میں غیر جانبدار رہے۔ پھر صلیبی جنگوں کے زمانہ میں بھی روافض نے یہی پارٹ ادا کیا اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ان واقعات کے عینی شاہد تھے ۱۲

[3] بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تاہنوز اور تا قیام قیامت ایسا شخص پیدا ہی نہیں ہوگا۔ مزید یہ کہ سب سے بڑا ظالم تو وہ ہے جو ابوبکر رض و عمر رض کے ظلم و تعدی کا شاکی ہے۔ بلکہ بالفاظ صحیح تر وہ حد درجہ کوتاہ فہم اور انسانیت کے اوصاف کمال سے بیگانہ ہے۔ ابوبکر و عمر کے خلاف بغض و عداوت رکھنے والا ان کی ذات میں اس دین کے سوا اور کوئی نقص و عیب نہیں پائے گا جس نے انھیں انسانی کمالات کی آخری منزل تک پہنچا دیا ایسا شخص دراصل اس دین کا دشمن ہے جس کی پیروی کا فخر ابوبکر و عمر کو حاصل تھا اور جس (باقی برصفحہ ۲۷۰)

چل کر یہ حقیقت واضح کریں گے کہ حضرت علی کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ صرف آپ ہی امامت و خلافت کے منصب پر فائز ہیں اور حضرت ابوبکر و عمر کو یہ مرتبہ حاصل نہ تھا۔

اگر شیعہ کہیں کہ ہم ان ملوک و سلاطین کے ظلم سے دادرسی چاہتے ہیں جنھوں نے ائمہ شیعہ کو امامت و خلافت کے حقوق سے محروم رکھا تو ہم ان سے دریافت کریں گے کہ کیا ائمہ شیعہ نے خلافت کا مطالبہ کیا تھا؟ یا وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ معصوم امام ہیں؟ یہ ایک صریح بہتان ہے۔ بہرکیف! سچ ہو یا جھوٹ اللہ تعالٰے بروز قیامت اس کا فیصلہ فرمائینگے قرآن کریم میں فرمایا۔

اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (زمر-۴۶)

تو اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں

اور اگر وہ ان ملوک و سلاطین کے ظلم سے دادرسی چاہتے ہیں۔ جن کے ساتھ وہ کسی ولایت یا مال کے بارے میں برسر جدل و نزاع تھے تو اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالٰے بروز قیامت سب متنازع فریقین کے مابین فیصلہ فرمائے گا۔ ان میں شیعہ کی کیا خصوصیت ہے۔

خود شیعہ کے مختلف فرقوں میں جو تنازعات پائے جاتے ہیں وہ اہل سنت کے باہمی اختلافات سے کہیں زیادہ ہیں۔ بنو ہاشم بھی باہم برسرپیکار رہ چکے ہیں۔ بنو حسن و بنو حسین کے مابین اسی قسم کی لڑائیاں ہو چکی ہیں جو آج کل ان جیسے دوسرے لوگوں میں بپا ہیں۔ پچھلے زمانوں میں بعض بنی ہاشم اور دوسرے لوگوں کے درمیان جو معرکے بپا ہوئے وہ ان لڑائیوں کی نسبت بہت زیادہ تھے جو ابتدائی ایام میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کے مابین ہوئیں۔

(بقیہ حاشیہ سابقہ) کی امانتوں کے وہ اس کرۂ ارضی پر سب سے بڑے امین تھے۔ تاہم ہم ان کو معصوم قرار نہیں دیتے۔ معصوم ہونا خاصۂ انبیاء ہے۔ البتہ یہ کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ ابوبکر و عمر رض آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خدا کی مخلوقات میں افضل و اکمل تھے۔ حضرت علی نے جو کلمات کوفہ کے منبر پر ارشاد فرمائے تھے تاریخ اسلام انہیں فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ نے فرمایا تھا۔ "نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر اور پھر عمر فاروق ہیں"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جو شخص مجھے ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں افضل قرار دیگا میں اس پر مفتری کی حد لگاؤں گا"۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کی وجہ نسبی شرافت نہیں بلکہ اس لیے کہ سب سے بہتر زمانہ وہ تھا جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

(حاشیہ صفحہ سابق) ؎ بنو امیہ و بنو ہاشم کے مابین جس طرح اختلافات پائے جاتے تھے بعینہ اسی طرح محبت و مودّت اور قرابت داری کے روابط بھی موجود تھے۔ اگر کوئی مورخ ایسے تاریخی حقائق جمع کرنے کی زحمت گوارا کرے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں کس حد تک الفت و محبت کے علائق موجود تھے اور ان سے کیا ثمرات ظہور میں آئے اور پھر ان واقعات کو اسانید سمیت کسی کتاب میں جمع کرنے کا التزام کرے تو یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگی کہ فریقین میں محبت کے جذبات و احساسات اصلی و پائیدار تھے اور اختلافات ہنگامی و عارضی۔

خالد بن یزید بن معاویہ نے ایک مرتبہ حجاج بن یوسف کی ایک غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے لکھا تھا "قریش باہم لڑتے جھگڑتے ہیں جب اللہ تعالیٰ صاحب حق کو حق عطا کردیں گے تو ان کے تعلقات اور لاتعلقی عقل و دانش اور شرافت و فضیلت کی بنا پر ہوگی"۔

خالد بن یزید کا مطلب یہ ہے کہ قریش میں سے جو لوگ باہم خاندانی علائق و روابط کو قائم رکھیں گے وہ ان مراسم کو توڑنے والوں کی نسبت فہم و فراست اور فضل و شرف میں بڑھ کر ہوں گے بنو ہاشم و بنو امیہ دونوں اس حقیقت سے آگاہ تھے اور اس کے قدر شناس تھے۔ بخلاف ازیں شیعہ اس سے نابلد محض ہیں اور ان کی راہ بنو ہاشم و بنو امیہ دونوں سے الگ ہے۔

شیعہ کا مقصد وحید فتنہ پروری اور اسلامی حقائق کے خلاف بغض و عناد کی آگ کو ہوا دینا ہے اور بس۔

راقم السطور نے جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ میں مجلۃ الفتح کے شمارہ ۸۳۴ ص ۶-۷ میں قریش کی اس قدیم عادت کا ذکر کیا تھا کہ بعض اوقات وہ عداوت کے باوجود بھی الفت و محبت کا اظہار کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس مضمون کا محرک یہ ہوا کہ جب امام صنعانی فوت ہوگئے تو یمن کے امام یحییٰ بن حمید الدین نے ان کی وفات پر ایک دلدوز مرثیہ لکھا۔ حالانکہ عثمانی حکومت کے عہد میں یہ دونوں مدعی امامت ہونے کی بنا پر عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہے تھے۔ قریش کے علماء میں بھی اظہار مودت کی یہ رسم جاری رہی۔ جب تک کرۂ ارضی پر قریش کے ایسے علماء بقید حیات ہیں جو اسلامی اخلاق و آداب سے بہرہ ور ہیں الفت و محبت کے یہ مراسم باقی رہیں گے۔ اگرچہ فتنہ پرور لوگ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے ۱۲

مبعوث کیے گئے تھے۔ پھر صحابہ کا زمانہ پھر تابعین کا۔[1] بہرکیف آپ کے زمانہ میں خیر کا دور دورہ تھا۔ اس کے برعکس آئندہ زمانوں میں شر کا غلبہ ہوگیا۔

اگر شیعہ ان دیندار اور بے ضرر علماء دین کے ہاتھوں فریاد کناں ہیں جنھوں نے نہ کسی پر ظلم کیا نہ ظالم کی امداد کے مرتکب ہوئے۔ بجز اس کے کہ وہ حق بات کو بدلائل قاہرہ واضح کردیتے ہیں تو یہ بڑی غلط بات ہے۔ کوئی احمق شخص ہی اس بات میں شک و شبہ کا اظہار کرے گا کہ امام مالک، اوزاعی۔ ثوری۔ ابوحنیفہ۔ لیث بن سعد۔ شافعی۔ احمد۔ اسحق اور دیگر محدثین کو ہشام بن حکم و ہشام بن سالم اور ان کے ہمنوا روافض کے ہم پلہ ہیں یہ انتہائی ظلم ہے۔ اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ مسئلہ تقدیر کا انکار کرنے والے شیعہ مثلاً النعمی، کراجکی اور ان کے نظائر و امثال معتزلی علماء مثلاً ابوعلی۔ ابوہاشم۔ قاضی عبدالجبار اور ابوحسین بصری کے ہم رتبہ ہیں اس کا ظالم ہونا کسی شک و شبہ سے بالا ہے۔ یہ معتزلہ کے اکابر علماء ہیں۔ اس ضمن میں اہلسنت علماء کا تو نام لینا ہی مناسب نہیں۔ مثلاً متکلمین اہل اثبات میں سے محمد بن ہیضم اور قاضی ابوبکر بن الطیب اور حدیث و فقہ اور تصوف کے علماء مثلاً ابوحامد اسفرائنی۔ ابوزید مروزی۔ ابوعبداللہ بن بطہ، ابوبکر۔ عبدالعزیز، ابوبکر رازی، ابوالحسین قزوینی، ابومحمد بن ابوزید، ابوبکر ابہری، ابوالحسن دارقطنی ابوعبداللہ بن مندہ۔ ابوالحسین بن میمون۔ ابوطالب مکی۔ ابوعبدالرحمن السلمی وغیرہم۔

---

[1] بخاری میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے بہتر زمانہ میرا ہے (جس میں صحابہ تھے) پھر وہ زمانہ جو اس کے قریب ہے (عہد تابعین) پھر وہ زمانہ جو اس کے قریب ہے (تبع تابعین کا عہد مبارک) آخری زمانہ اموی خلافت کے آخری دور پر ختم ہوتا ہے۔ عباسی خلافت کا ابتدائی زمانہ بھی اس میں شامل ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔

"اس بات پر محدثین کا اتفاق ہے کہ تبع تابعین میں سے آخری مقبول القول شخص وہ ہے جو ۲۲۰ھ تک بقید حیات رہا۔ اسی زمانہ میں بدعات نے بر پرزے نکالنے شروع کیے معتزلہ نے اپنی زبانیں کھول دیں فلاسفہ نے سر اٹھایا۔ اور خلق قرآن کے مسئلہ میں علماء کو شدید امتحان میں ڈالا گیا اس دور میں حالات یکسر بدل گئے اور آئندہ زمانوں میں تنزل و انحطاط کی یہ رو حافظ ابن حجر کے زمانہ یعنی (۷۷۳-۸۵۲) ہجری تک جاری رہی آنحضور کے ارشاد مبارک کے مطابق اقوال و افعال سے لے کر افکار و معتقدات تک جھوٹ سے ملوث ہوگئے۔ (فتح الباری ج ۷، ص ۴)

تحقیق کرنے پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اہل سنت کے مختلف و متعدد فرقوں میں سے ہر فرقہ شیعہ کی نسبت علم و عدل سے قریب تر اور ظلم و جہل سے بعید تر ہے۔ بالفرض محال اگر اہل سنت کے کسی فرقہ نے ظالم کی اعانت کا ارتکاب کیا ہے تو شیعہ اس جرم کے ارتکاب میں ان سے دو قدم آگے ہی ہوں گے اور اگر شیعہ نے کبھی ظلم و تعدی سے اجتناب کیا ہے تو اہل سنت اس میدان میں بھی کئی قدم آگے ہوں گے۔ یہ بات تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے اور اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی فرقوں میں شیعہ سے زیادہ جھوٹا اور زیادہ

لے پہلی جنگ عظیم سے قبل ایک شیعہ عالم شیخ محمد حسین کاشف الغطاء نامی قاہرہ وارد ہوئے۔ وہ ان دنوں میری طرح بالکل نوجوان تھے۔ ہمارا المکتب ان دنوں عبد العزیز روڈ پر واقع تھا۔ شیخ موصوف روزانہ ہمارے مکتب میں آتے اور عثمانی ترکوں کی مذمت میں جو اشعار کہتے وہ مجھے سنایا کرتے تھے۔ اس ضمن میں شیخ موصوف نے ایک طویل قصیدہ نظم کیا تھا اسی دوران وہ ہمارے اساتذہ شیخ طاہر الجزائری اور احمد تیمور پاشا سے بھی متعارف ہوگئے۔ استاذ محترم شیخ احمد پاشا نے ہمیں ایک روز اپنے گھر بلایا۔ دوران گفتگو شیخ کاشف الغطاء نے شیعہ ادباء، شعراء اور مورخین کی مدح و توصیف پر کھل کر بات چیت کی اور اس پر فخر کا اظہار کیا کہ شیعہ ادباء کی تعداد اہل سنت کے علماء و ادباء کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

اس کے جواب میں شیخ طاہر نے فرمایا۔

"فخر کا انحصار مورخین و ادباء کی اکثریت پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ کون کس حد تک خلوص دل سے حق کا ساتھ دیتا ہے اور اس صورت میں بھی حق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا جب وہ اس کے اپنے فرقہ کے خلاف ہو۔ ہم نے مختلف فرقوں کے علماء کی سیرت و سوانح کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بنا بر تعصب حق کی مخالفت کرنے والے زیادہ تر شیعہ فرقہ کے لوگ ہیں۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر میں نے محسوس کیا ہے کہ ہر شیعہ ادیب و مورخ کے لیے یہ بات ایک فریضہ کی حد تک ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی موضوع حدیث یا مصنوعی واقعہ اختراع کرے جو اس کے پیشرو علماء میں سے کسی نے بھی وضع نہ کیا ہو۔ جب ہم متقدمین کی تصانیف دیکھتے ہیں تو اس واقعہ کا کوئی نشان ان میں نہیں پاتے سابقین اولین اور سلف صالحین سے متعلق ایسے واقعات گھڑنا جن سے ان کی پاکیزہ زندگی داغدار ہوتی ہو اور ایسے واقعات گھڑنے والے کی موت کے بعد بھی جہلاء ان کو صحیح سمجھ کر نقل و بیان کرتے رہا تی بر صفحہ ۲۸۴)

ظالم و جاہل دوسرا کوئی فرقہ نہیں۔ لطف یہ ہے کہ شیعہ کے شیوخ و علماء نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"اے گروہ اہل سنت! تم میں جوانمردی کے آثار پائے جاتے ہیں تم پر قابو پانے کی صورت میں ہم تم سے ہرگز وہ سلوک نہیں کر سکتے جو تم عند القدرت ہم سے روا رکھتے ہو۔

تیرھواں جواب:۔ شیعہ نے جس شعر کو پسند کیا اور اس سے استشہاد کیا ہے وہ اس کے ناظم کی جہالت کا مظہر ہے۔ اہل سنت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں "دَوٰی جَدُّھم عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِی"۔ اس سے بڑھ کر اہل سنت اقوال رسول پر بلا توقف عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور یہ دریافت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں سمجھتے کہ آنحضور نے وہ قول کہاں سے اخذ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلسنت آنحضور کو معصوم سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (سورۃ النجم۔۳۔۴)

وہ اپنی مرضی سے نہیں بولتا بلکہ وہ تو وحی ہے جو آپ کی جانب بھیجی جاتی ہے

اہل سنت کو اہل سنت کہا ہی اس لیے جاتا ہے کہ وہ سنت کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ سنت کے اثبات کے لیے ثقہ راویوں کی ضرورت ہے قطع نظر اس سے کہ روایت کرنے والا حضرت علی کی اولاد میں سے ہو یا کوئی اور شخص صرف اتنی بات ہرگز کافی نہیں کہ کوئی روایت محض عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِی کے بل بوتے پر بلا تحقیق مان لی جائے۔

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی بات صرف اس لیے حجت مانی جاتی ہے کہ وہ اپنے اقوال کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرتے ہیں ورنہ ان کے اپنے اقوال کسی درجہ میں بھی حجت نہیں۔ حالانکہ یہ ائمہ احادیث نبویہ سے بخوبی آگاہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۳) ہیں۔ روافض کے نزدیک یہ شیعہ مذہب اختیار کرنے کی زکوٰۃ ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں انبیاء و حکماء اور مصلحین صرف اسی بات کی دعوت دیتے رہے کہ فضیلت کا انحصار حق کی طلب و تحقیق اور تنازعات میں اس کی طرف رجوع کرنے میں ہے اور بس! مقام افسوس ہے کہ شیعہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ان اوصاف سے موصوف ہو۔ (محب الدین الخطیب)

تھے۔ اور ان کی معرفت و اتباع میں ان کا اجتہاد حق و صواب پر مبنی ہے۔ ورنہ ائمہ کی اتباع کی کوئی ضرورت نہ تھی جس طرح مذکورہ ائمہ احادیث کی روایت کرتے ہیں اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس ضمن میں ان سے پیچھے نہیں اور اگر ائمہ مسائل کا جواب دیتے ہیں تو دوسروں کو بھی یہ شرف حاصل ہے۔ بایں ہمہ اہل سنت کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں اور کسی کا قول بھی واجب الاتباع نہیں۔

بخلاف ازیں ائمہ کے مابین جب بھی کسی بات میں تنازع بپا ہوگا تو اہل سنت اسے اللہ و رسول کے احکام کی جانب لوٹائیں گے۔ اگر بچشم خود اس کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو اپنے زمانہ کے محدثین و فقہاء کو دیکھ لیں۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ شیعہ علماء کی اکثریت حافظ قرآن نہیں ہوتی۔ اور حدیث نبوی سے بھی انہیں بے حد معمولی لگاؤ ہوتا ہے کتاب و سنت کے مفہوم و معنی سے وہ بالکل بیگانہ ہوتے ہیں[1]۔

---

[1] مجھے دور حاضر کے سب سے بڑے ہاشمی بادشاہ کی معیت و رفاقت میں کچھ عرصہ بسر کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ چنانچہ میں شوال ۱۳۳۲ھ سے تا شعبان ۱۳۳۶ھ اس کی صحبت میں رہا اور مجلۃ الزہراء مورخہ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ (۱: ۱۹۰ — ۲۰۰) میں سلطان مذکور کے فضائل و نقائص سے متعلق ایک بھرپور مضمون لکھا رسالہ مذکور کے صفحہ ۱۹۹ پر لکھا ہے۔

"ہاشمی بادشاہ نے ایک مرتبہ وہابیہ کی مذمت کرتے ہوئے ان پر یہ اتہام لگایا کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اس کی قباحت واضح کرنے کے لیے اس نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ"

سلطان نے "عزیز" کے لفظ پر وقف کیا اور بتایا کہ "علیہ" کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ عزیز کے معنی یہ بیان کیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک عالی مرتبت ہیں۔ کتاب و سنت کے فہم و ادراک سے متعلق ہاشمی بادشاہ کا مبلغ علم صرف اس حد تک تھا۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بیان کا مؤید ہے۔

تاہم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر ہاشمی فہم قرآن و سنت سے بیگانہ ہوتا ہے وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محض ہاشمی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن و حدیث کا علم اس (باقی بر صفحہ ۲۷۶)

باقی رہا شیعہ شاعر کا یہ قول کہ "دَوٰی جَدُّنَا عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِیْ"
ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ تمہارے نانا کی روایات کو شیعہ سے بہتر جانتے ہیں۔ اور شیعہ بھی احادیث کے بارے میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جب متقدمین و متاخرین بنی ہاشم۔ احادیث رسول بنی ہاشم کے علاوہ دوسرے لوگوں سے حاصل کرتے ہیں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ بنی ہاشم دوسروں سے زیادہ علم نہیں رکھتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ کس کی اقتدا کریں اور کس سے استفادہ کریں؟ آیا ان لوگوں سے اخذ و استفادہ کریں جو علم سے آگاہ ہیں یا ان لوگوں سے جو اس سے قطعی نابلد ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے درہم و دینار کا ورثہ نہیں چھوڑا بلکہ اپنے پیچھے علم کا ورثہ باقی رکھا ہے۔ جس نے یہ ورثہ حاصل کر لیا۔ اس نے بہت بڑا حصہ پایا۔

اور اگر شیعہ مصنف کہے کہ "میری مراد اس سے بارہ امام ہیں"۔ تو ہم کہیں گے کہ علی بن حسین، ابو جعفر اور دیگر اہل بیت اپنے جد امجد (نبی اکرمؐ) سے جو روایات نقل کرتے ہیں۔ وہ اسی طرح قابل قبول ہیں جس طرح دیگر راویانِ حدیث کی مرویات اور اگر لوگ امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل کے نزدیک موسیٰ بن جعفر علی بن موسیٰ اور محمد بن علی کی نسبت زیادہ روایات نہ پاتے تو اہل بیت کے علماء کو چھوڑ کر کبھی ان ائمہ دین کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کی ذات یا اس کے اقارب میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا اسکی خاطر ائمہ اربعہ کے اقوال کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ جیسا کہ جاہل رافضی شاعر نے کہا ہے اس کے عین برخلاف علم و تحقیق کا دروازہ ہر اس شخص کے لیے کھلا ہے جو اس کا طلبگار ہے۔ بروز قیامت انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے علم و فضل اور اعمال سے کیا جائے گا نہ کہ حسب و نسب سے۔ اس لیے کہ آنحضورؐ کی بعثت کرۂ ارضی پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے عمل میں آئی تھی اور سب اقوام و قبائل کے علماء و ائمہ نے یکساں طور پر آپ سے کسب فیض کیا تھا۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض پرداز ہوں کہ احقر ایک معروف حسنی و علوی خاندان سے وابستہ ہے۔ تحریری شجرۂ نسب اس صداقت کا ہر زمانہ میں شاہد عدل رہا ہے جو شخص اہلبیت کے نام سے حق پر ظلم ڈھانے کا ارتکاب کرتا ہے اس پر واجب ہے کہ اس ظلم کا ازالہ اور داعیان ستم کار پر اسکی مذمت واضح کرے ۱۲ (محب الدین الخطیب)

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ آخر لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ موسیٰ بن جعفر سے ہٹ کر امام مالک بن انس کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ حالانکہ یہ دونوں اکابر بہ یک وقت ایک ہی شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ بشرطیکہ موسیٰ بن جعفر کے ہاں سے بھی انھیں علمی تشنگی کو دور کرنے کا وہی سامان میسر آتا جو امام مالک کے ہاں دستیاب تھا۔ خصوصاً جبکہ اس زمانہ کے لوگ حدیث رسول کے شیدائی تھے۔ اس پر مزید یہ کہ خود بنی ہاشم اپنے چچازاد موسیٰ بن جعفر کی بجائے امام مالک سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔

امام مالک کے بعد امام شافعی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے آپ نے بہت سے مسائل میں اپنے استاد محترم امام مالک سے اختلاف کر کے ان کی تردید کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام مالک کے اصحاب و تلامذہ اور امام شافعی کے مابین شدید تنازعات بپا ہو گئے۔ امام شافعی امام مالک کی نسبت بلحاظ نسب بنی ہاشم سے قریب تر تھے۔ آپ احادیث نبویہ کے سچے عاشق تھے اور جہاں سے بھی حصول علم کی توقع ہوتی اس میں ذرہ بھر تغافل و تکاسل کو راہ نہ دیتے۔ خواہ یہ علم بنی ہاشم کے یہاں سے حاصل ہو رہا ہو یا کسی اور جگہ سے اگر آپ امام مالک کی نسبت کسی ہاشمی کے یہاں علم پاتے تو آستانۂ مالک کی بجائے بنی ہاشم کی بارگاہ علم پر دستک دیتے۔ امام شافعی خود اس امر کے معترف ہیں کہ انھوں نے کسی ایسے شخص سے استفادہ نہیں کیا جو امام مالک اور سفیان بن عُیینہ سے بڑا عالم ہو۔ مزید براں امام شافعی کی تصانیف ان دونوں اکابر سے ماخوذ معلومات سے لبریز ہیں اور ان میں کوئی بات بھی موسیٰ بن جعفر اور دیگر بنی ہاشم سے مستفاد نہیں۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ جو علم حاصل کرنے کے درپے تھے بنی ہاشم کی نسبت امام مالک کے یہاں اس کی فراوانی تھی۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا عشق رسول حدیث نبوی کے ساتھ والہانہ شغف آنحضور کے اقوال و افعال سے ماہرانہ واقفیت و آگاہی آنحضور کے احباب و انصار کے ساتھ گہری محبت و مودّت اور اعداء رسول کے ساتھ شدید عداوت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ بنی ہاشم کے ساتھ آپ کی عقیدت و ارادت کا یہ عالم تھا کہ فضائل صحابہ کے ساتھ ساتھ حضرت علی اور حسن و حسین کے فضائل و مناقب پر کتابیں تصنیف کیں، بایں ہمہ

آپ کی تصانیف امام مالک ثوری۔ اوزاعی۔ لیث بن سعد، وکیع بن جراح یحییٰ بن سعید القطان، ہشیم بن بشیر۔ عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہم کی روایات سے لبریز ہیں اور ان میں کوئی روایت موسیٰ بن جعفر، علی بن موسیٰ اور محمد بن علی کے نظائر و امثال سے ماخوذ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر امام احمد بن حنبل ان علماء بنی ہاشم کے یہاں اپنا علمی مطلوب پا سکتے تو اس میں انتہائی دلچسپی لیتے۔

اور اگر کوئی شخص یہ کہے ہاشمی علماء گنجینۂ معلومات تھے۔ ان کے مقابلہ میں دیگر علما ان علوم سے بے بہرہ تھے۔ البتہ وہ اپنے علم کا اظہار نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ پوشیدہ علم سے فائدہ؟ جس علم کا اظہار نہ کیا جائے وہ اس خزانہ کی مانند ہے جسے خرچ نہ کیا جائے۔ جو شخص اپنے علم کا اظہار نہیں کرتا لوگ اس کی پیروی کیونکر کریں گے؟ پوشیدہ علم (شیعہ کے) امام معدوم کی طرح بے کار ہے اور دونوں سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اگر شیعہ کہیں کہ ہاشمی علماء اپنے علوم کا کشف و اظہار صرف خواص پر کرتے تھے تو ہم کہیں گے کہ یہ ان پر بہتان ہے۔ جعفر بن محمد بے نظیر عالم تھے اور ان کے بعد ایسا شخص پیدا نہیں ہوا۔ تاہم وہ تحصیل علم میں امام مالک۔ ابن عیینہ۔ شعبہ۔ ثوری۔ ابن جریج۔ یحییٰ بن سعید وغیرہ علماء و مشاہیر کے مرہون احسان تھے۔ جو شخص اس زعم باطل میں مبتلا ہے کہ ہاشمی علماء مذکورہ ائمہ سے علم کو پوشیدہ رکھتے اور مجہول الحال لوگوں پر اس کا اظہار کرتے تھے وہ ان اکابر کے بارے میں بدظنی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ ائمہ مذکورین میں اللہ و رسول کی محبت، جذبۂ تبلیغ دین، احباب رسول سے محبت اور اعداء رسول سے بغض و عداوت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے شیعہ کے شیوخ میں اس کا عشر عشیر بھی موجود نہیں۔ جو شخص ائمہ اہل سنت اور شیعہ کے ائمہ و شیوخ دونوں سے آشنا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ہر زمانہ کے شیوخِ اہل سنت و روافض میں تقابل کر کے اس حقیقت کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے[1]

---

[1] الفاظ کے لغوی و اصطلاحی مفہوم میں اہل سنت اور شیعہ کے یہاں جو مین اختلاف پایا جاتا ہے اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ فریقین کے مابین اختلافات کی ایک زبردست (باقی بر صفحہ ۲۷۹)

مثال کے طور پر اسی شیعہ مصنف (ابن المطہر جس کی تردید میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۸) خلیج حائل ہے۔ شیعہ جب حب الٰہی کا دعویٰ کرتے ہیں تو یہ محبت وجوب علی اللہ کے عقیدہ سے مقید ہوتی ہے۔ جب شیعہ حب رسول کا دعویٰ لے کر اٹھتے ہیں تو اس کے پہلو بہ پہلو وہ عصمت ائمہ کا دعویٰ کر کے شریعت کا مصدر و ماخذ ہونے میں ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ٹھہراتے ہیں جس سے حب رسول میں بلاشبہ خلل اندازی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ اکابر شیعہ کے اس فعل پر اس لیے رضامند نہیں کہ مصدر شریعت ہونے کے اعتبار سے آنحضور کا شریک ہونا ایک غیر شرعی بات ہے وہ اس سے اظہار براءت کرتے اور اسے ایک افتراء قرار دیتے ہیں۔

تحفظ دین سے متعلق بھی شیعہ کا دعویٰ ایک انوکھی چیز ہے۔ دین کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے وہ کتاب و سنت سے بالکل الگ ایک جداگانہ نوعیت کی چیز ہے اس کا انحصار ان روایات کاذبہ کی تشہیر و ترویج پر ہے جو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت سے منقول ہیں اس طرح حب و بغض کا مفہوم بھی اہل سنت اور شیعہ کے یہاں یکساں نہیں تاکہ دونوں میں تقابل کر کے اہل سنت کی موالات کو درست اور شیعہ کی موالات کو ناروا قرار دیا جا سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اہل سنت امت محمدی کے تمام صالحین سے یکساں طور پر محبت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آل محمد کے صالحین اسی طرح ان میں شامل ہیں جس طرح آنحضور کے اصحاب اور آپ کی ازواج مطہرات۔ بخلاف ازیں شیعہ عصمت کے دعویٰ کی اساس پر بعض اہلبیت سے محبت رکھتے ہیں حالانکہ خود اہل بیت عصمت کے دعویٰ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ شیعہ سرور کائنات علی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر رقیہ اور ام کلثوم کے وجود تک میں صرف اس لیے شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ان کے دشمن ہیں۔ چند افراد کو چھوڑ کر شیعہ اصحاب رسول کے جانی دشمن ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اہل سنت اور شیعہ کا اختلاف مقدار محبت میں نہیں بلکہ محبت کے لغوی اصطلاحی اور دینی مدلول و مفہوم میں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس فہم قرآن، راویان حدیث کی روایات صحیحہ کا قبول و عدم قبول اور جھوٹے راویوں کی بیان کردہ روایات کاذبہ سے عدم احتجاج۔ یہ جملہ مسائل فریقین کے مابین متنازع فیہا ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اہل سنت و شیعہ کے مابین فرق و امتیاز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہل سنت کے نزدیک دینی حقائق تبدیل نہیں ہوتے بلکہ ہر دور میں یکساں رہتے ہیں۔ وہ حدیث صحیح جو عہد صحابہ (باقی بر صفحہ ۲۸۰)

منہاج السنۃ تصنیف فرمائی) کو لیجئے۔ شیعہ کے نزدیک یہ یگانہ روزگار عالم تھا۔ بعض شیعہ کا قول ہے کہ علوم اسلامیہ کے اعتبار سے بلاد مشرق میں یہ عدیم المثال فاضل تھا۔ بایں ہمہ اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) وتابعین میں آنحضور سے روایت کی گئی ہو۔ وہ اہل سنت اور ان کے ائمہ کے نزدیک ایک ابدی حجت اور واجب الاتباع دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے عین برخلاف شیعہ کی رائے میں دین کا تصور ہر عصر وعہد میں بدلتا رہتا ہے۔ ہم کئی دفعہ بیان کرچکے ہیں کہ شیعہ عالم الماممقانی نے اپنی کتاب "تنقیح المقال" میں جہاں غالی شیعہ علماء کی سیرت وسوانح پر روشنی ڈالی ہے ـــــ جن کی روایات شیعہ علماء کے نزدیک ان کے غلو کی وجہ سے ناقابل قبول تصور کی جاتی تھیں ـــــ وہاں یہ بھی بیان کیا ہے کہ ازمنہ سابقہ میں جو باتیں مبالغہ پر محمول کی جاتی تھیں اب وہ ضروریات مذہب میں شمار ہوتی ہیں یہ بات شیعہ مذکور نے رافضی جرح وتعدیل کی ایک بہت بڑی اور جدید ترین کتاب میں تحریر کی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اب شیعہ مذہب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا چنانچہ قدیم زمانہ میں جو بات غلو ہونے کی بنا پر ناقابل قبول تھی اب ضروریات مذہب میں تصور کی جانے لگی ہے۔ خلاصۂ کلام! شیعہ کا موجودہ مذہب وہ نہیں جو ایران کے سلاطین صفویہ سے پہلے تھا۔ اسی طرح صفویہ سے پہلے جو مذہب تھا وہ شیعہ مصنف ابن المطہر سے پہلے نہ تھا اور ابن المطہر سے پہلے کا مذہب خاندان بنی بُویہ سے قبل موجود نہ تھا۔ علی ہذا القیاس بنی بویہ سے پہلے کا شیعہ مذہب وہ نہ تھا جو شیطان الطاق سے پہلے تھا اور شیطان الطاق سے پہلے کا مذہب حضرت علی حسن وحسین اور علی بن حسین رضی اللہ عنہم کے زمانہ کے مذہب سے قطعی مختلف تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎۱ چنانچہ شیعہ جب "علامہ" کا لفظ علی الاطلاق بولتے ہیں تو اس سے مراد ابن المطہر لیتے ہیں۔ شیعہ ابن المطہر کو آیت اللہ فی العالمین، نور اللہ، استاذ الخلائق، مرکز اسلام وغیرہ القاب سے یاد کرتے اور عجمی طرز وانداز کی یہ مبالغہ آمیزی کرتے ہوئے خدا سے نہیں ڈرتے کتاب ہذا کا قاری اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ ابن المطہر حد درجہ جاہل اور فریب کار شخص ہے اور اس کا دل آنحضور کے اقوال واعمال کے حامل صحابہ وتابعین کی عداوت سے لبریز ہے بمقام حیرت ہے کہ کرۂ ارضی میں خدا کے آخری پیغام کو پھیلانے والے صحابہ کے بارے میں شیعہ جس دریدہ دہنی کا ارتکاب کرتے ہیں شاید کوئی غیر مسلم مستشرق بلکہ عیسائی مشنری بھی ایسا نہ کرسکتے ۱۲

کے رشحات قلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال و اعمال میں اس کرۂ ارضی پر شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اس سے زیادہ جاہل ہو۔ وہ ایسی جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے جن کا جھوٹا ہونا مختلف وجوہ و اسباب سے ظاہر ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں (۱) اگر وہ دانستہ جھوٹی روایات بیان کرتا ہے تو اس کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جو میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹی ہے تو وہ جھوٹوں میں سے ہے (۲) اور اگر اس کے جھوٹا ہونے سے آگاہ نہیں تو وہ آنحضور کے بارے میں اجہل الناس ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے ؎

فَاِنْ کُنْتَ لَا تَدْرِیْ فَتِلْکَ مُصِیْبَۃٌ　　وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ

اگر تو جانتا نہیں تو یہ مصیبت کا باعث ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ اس سے بھی بڑی آفت ہے۔

شیعہ ناظم کے جو اشعار قبل ازیں تحریر کیے جا چکے ہیں ان کے جواب میں مندرجہ ذیل اشعار کہے گئے ہیں۔

(۱) اِذَا شِئْتَ اَنْ تَرْضٰی لِنَفْسِكَ مَذْهَبًا　　تَنَالُ بِهِ الزُّلْفٰی وَتَنْجُوْ مِنَ النَّارِ

(۲) فَدِنْ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَالسُّنَّةِ الَّتِیْ　　اَتَتْ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مِنْ نَقْلِ اَخْيَارِ

(۳) وَدَعْ عَنْكَ دَاعِی الرَّفْضِ وَالْبِدَعِ الَّتِیْ　　يَقُوْدُكَ دَاعِيْهَا اِلَی النَّارِ وَالْعَارِ

(۴) وَسِرْ خَلْفَ اَصْحَابِ الرَّسُوْلِ فَاِنَّهُمْ　　نُجُوْمُ هُدًی فِیْ ضَوْئِهَا يَهْتَدِی السَّارِیْ

(۵) وَعُجْ عَنْ طَرِيْقِ الرَّفْضِ فَهُوَ مُؤَسَّسٌ　　عَلَی الْكُفْرِ تَاْسِيْسًا عَلٰی جُرُفٍ هَارِ

(۶) هُمَا خُطَّتَانِ اِمَّا هُدًی وَسَعَادَةٌ　　وَاِمَّا شَقَاءٌ مَعَ ضَلَالَةِ كُفَّارِ

(۷) فَاَیُّ فَرِيْقَيْنَا اَحَقُّ بِاَمْنِهِ　　وَاَهْدٰی سَبِيْلًا عِنْدَ مَا يَحْكُمُ الْبَارِیْ

(۸) اَمَنْ سَبَّ اَصْحَابَ الرَّسُوْلِ وَخَالَفَ　　الْكِتَابَ وَلَمْ يَعْبَاْ بِثَابِتِ اَخْبَارِ

(۹) اَمِ الْمُقْتَدِیْ بِالْوَحْیِ يَسْلُكُ مَنْهَجَ الصَّحَابَةِ مَعَ حُبِّ الْقَرَابَةِ الْاَطْهَارِ

(۱) جب تو اپنے لیے ایسا مذہب پسند کرنا چاہے جس سے خدا کا قرب حاصل کر سکے اور دوزخ سے نجات پائے۔

(۲) تو کتاب خداوندی اور ان احادیث نبویہ کی اطاعت کیجئے جو نیک لوگوں کی روایت سے ہم تک پہنچیں۔

(۳) رفض و بدعات کے داعی کو چھوڑ دیجیے کہ یہ شخص نار و عار کی جانب لے جاتا ہے۔

(۴) اصحاب رسول کے نقش قدم پر چل اس لیے کہ وہ ہدایت کے ستارے ہیں جن کی روشنی میں چل کر سالک راہ ہدایت پا سکتا ہے۔

(۵) رفض اور تشیع کی راہ سے منحرف ہو جا۔ اس لیے کہ اس کی اساس کفر اور ایک گرپڑنے والے گڑھے پر رکھی گئی ہے۔

(۶) (دنیا میں) دو ہی باتیں ہیں یا تو ہدایت و سعادت ہے اور یا ضلالت کفار کے ساتھ ملی ہوئی بدبختی ہے۔

(۷) ذرا غور فرمائیے اہل سنت و شیعہ کے) دونوں فریقوں میں سے کونسا فریق اس وقت امن کا زیادہ حقدار اور راہ راست پر ہوگا۔ جب اللہ تعالے اپنا فیصلہ صادر فرمائینگے

(۸) کیا وہ شخص (حق پر ہوگا) جو اصحاب رسول کو گالیاں بکے، کتاب خداوندی کی خلاف ورزی کرے اور احادیث صحیحہ کی پرواہ نہ کرے۔

(۹) یا وہ شخص (راہ حق کا سالک ہے) جو وحی کی پیروی کرتا، راہ صحابہ پر گامزن ہے اور اسکے ساتھ ساتھ اہل بیت اطہار کے ساتھ بھی محبت رکھتا ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"ابوبکرؓ نے حضرت فاطمہؓ کو آنحضور کا ورثہ دینے سے انکار کر دیا اور ایک منفرد روایت

ؔ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ترکہ چھوڑا تھا تو حضرت فاطمہ اس کی تنہا وارث نہ تھیں بلکہ آپ کی ازواج مطہرات اس میں برابر کی شریک تھیں۔ مزید یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر اس ضمن میں سرفہرست تھیں جن کے گھر میں آپ نے وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ حضرت حفصہ بنت عمرؓ بھی برابر کی وارث تھیں اگر حضرت فاطمہ ورثہ نہ پا سکیں تو آپ کی ازواج مطہرات اور آپ کے چچا عباس بھی ورثہ سے محروم رہے۔ مگر شیعہ حضرت فاطمہ کے سوا دیگر اقارب کا ذکر تک نہیں کرتے، علاوہ ازیں باغ فدک اور خیبر کا خمس اہلبیت کے لیے مباح تھا اور وہ ان سے اپنی ضروریات اسی طرح پوری کرتے تھے جس طرح آپ کی زندگی میں۔ جو بچ جاتا وہ ان مصارف میں صرف کیا جاتا جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔"

سے احتجاج کیا"۔

جواباً گذارش ہے کہ شیعہ مصنف کا اس کو منفرد روایت قرار دینا صاف جھوٹ ہے یہ حدیث خلفاء اربعہ، حضرت طلحہ، زبیر، سعید، عبدالرحمن بن عوف، عباس، ابوہریرہ اور آپ کی ازواج مطہرات نے روایت کی ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کے مقروض تھے صریح کذب ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر آنحضور کے ترکہ کے دعوی دار نہ تھے۔ بلکہ آپ کا ترک کردہ مال صدقہ ہے اور وہ ان کو ملنا چاہیئے جو اس کے مستحق ہیں۔ نیز یہ کہ صحابہ اس بات پر یقین رکھتے تھے ــــ اور حضرت علی رض اس ضمن میں پیش پیش تھے ــــ کہ سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی جب منصب خلافت پر فائز ہوئے تو نہ انہوں نے آپ کے ترکہ کو تقسیم کیا نہ اس کے مصرف میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔

آیت میراث کے عموم سے آپ کی وراثت پر استدلال کرنا اس لیے صحیح نہیں کہ انبیاء کی وراثت اس سے مستثنی ہے۔ جس طرح یہ مسائل استثنائی حیثیت رکھتے ہیں کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا اور قتل عمد کا مرتکب ورثہ سے محروم رہتا ہے نیز یہ کہ غلام وارث نہیں ہوتا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر نے حضرت علی اور ان کے متعلقین کو آنحضور کے ترکہ سے کئی گنا زائد مال دے دیا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو یہ بات بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ حضرت عمرؓ نے آنحضور کا متروکہ مال حضرت علیؓ و عباسؓ کو اس مقصد کے پیش نظر دیدیا تھا کہ وہ اسے انہی مصارف میں خرچ کریں جن میں آنحضور کیا کرتے تھے۔ اس سے اس تہمت کا ازالہ ہو جاتا ہے جو ان دونوں اکابر پر عائد کی جاتی ہے۔

اگر شیعہ کا یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت ابوبکر و عمر ظالم و غاصب تھے اور انھوں نے جبراً خلافت پر قبضہ جما لیا تھا تو اس کا تقاضا تھا تو وہ ان ورثاء سے مزاحم نہ ہوتے جو خلافت و امامت کا استحقاق رکھتے تھے بلکہ خلافت کے دعوی سے دور رکھنے کے لیے انہیں من مانی دولت عطا کر دیتے۔

انبیاء کی میراث:۔ شیعہ قرآن کریم کی آیت "وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ" سے انبیاء

کی وراثت پر استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا دعویٰ اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا اس لیے کہ "ورثہ" اسم جنس ہے اور اس کے تحت متعدد انواع ہیں اور ایک عام چیز کا ذکر کرنے سے کسی خاص چیز کا ذکر لازم نہیں آتا۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ یہاں حیوان موجود ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں انسان یا گھوڑا موجود ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ورثہ کا لفظ علمی میراث اور مادی وراثت دونوں پر بولا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا (فاطر - ۳۲)

پھر ہم نے برگزیدہ لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا۔

(۲) وَتِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْهَا (سورہ زخرف - ۷۲)

یہ وہ جنت ہے جس کے وارث تمہیں بنایا گیا ہے۔

(۳) وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَهُمْ (احزاب - ۲۷) (اور تمہیں ان کی زمینوں کا وارث بنایا)

(۴) اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ (اعراف ۱۲۸)

بے شک زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے۔

(۵) وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ (اعراف - ۱۳۷)

ہم نے اس قوم کو وارث بنایا جس کو ضعیف سمجھا جاتا تھا۔

محدث ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انبیاء کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ علمی ورثہ عطا کرتے ہیں"۔

ہم ان نصوص صریحہ کی روشنی میں کہتے ہیں کہ زیر تبصرہ آیت میں مالی ورثہ مراد نہیں بلکہ علم و نبوت کی میراث مقصود ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت سلیمان کے سوا حضرت داؤد کے متعدد بیٹے اور بھی تھے اگر مالی ورثہ مراد ہوتا تو وہ تنہا حضرت سلیمان کو نہ ملتا۔ علاوہ ازیں حضرت سلیمان کے مالی ورثہ پانے میں کسی کی مدح و ستائش نہیں کی جا رہی نہ حضرت سلیمان کی اور نہ حضرت داؤد کی۔ اس لیے کہ نیک و بد سبھی اپنے والد کا مالی ورثہ پاتے ہیں اس میں حضرت سلیمان کی کیا خصوصیت ہے۔ حالانکہ آیت کا سیاق حضرت سلیمان کی مدح اور ان کی خصوصیات کا متقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ مالی میراث ایک عام چیز ہے اور سب لوگوں کے یہاں مشترک ہے

لہذا اس کا ذکر و بیان عبث اور کسی فائدہ سے خالی ہے۔

اسی طرح آیت قرآنی "یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ" (سورۂ مریم۔۶) میں بھی مالی ورثہ مراد نہیں۔ اس لیے کہ حضرت یحییٰ نے آل یعقوب سے مالی میراث حاصل نہیں کی تھی۔ بلکہ یہ میراث ان کی اولاد نے پائی تھی اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت زکریا مالدار نہ تھے جن کا ورثہ حاصل کیا جاتا۔ بخلاف ازیں وہ بڑھئی کا کام کرتے تھے اور حضرت یحییٰ دنیوی مال و متاع سے بے نیاز تھے۔ لہذا حضرت یحییٰ کا مالی میراث حاصل کرنا خارج از بحث ہے۔

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔

فدک کا معاملہ

جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "میرے والد محترم نے مجھے فدک[۱] کی جاگیر عطا کی تھی"۔

[۱] فدک حجاز میں ایک بستی کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ بستی ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد مصالحت کے طور سے کسی جنگ و قتال کے بغیر آنحضور کے قبضہ میں آئی تھی اس میں پانی کا چشمہ اور کچھ کھجوروں کے درخت تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکی آمدنی صدقات و خیرات اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف فرمایا کرتے تھے۔ حضرت صدیق بھی اپنی خلافت کے زمانہ میں اسوۂ نبوی پر گامزن رہے حضرت فاروق جب منصب خلافت پر فائز ہوئے تو آپ نے حضرت علی و عباس کے ذمہ یہ خدمت تفویض فرمائی کہ آنحضور کی طرح اس بستی کی آمدنی کو رفاہ عام کے کاموں میں صرف کرتے رہیں۔ بعض اوقات حضرت علی و عباس کے مابین اختلاف رونما ہوتا اور وہ عقدہ کشائی کے لیے بارگاہ فاروقی پر حاضر ہوتے۔ حضرت عمر ان کے مابین فیصلہ صادر کرنے سے گریز فرمایا کرتے تھے۔ جب اموی خلافت کا زمانہ آیا تو فدک کی بستی پہلے مروان پھر اس کے بیٹوں اور پھر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تحویل میں آئی۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز فدک کا مال اپنے پیشرو خلفاء اربعہ کے مطابق رفاہ عام کے کاموں پر صرف کیا کرتے تھے۔ ۲۱۰ھ میں خلیفہ مامون کے حکم سے یہ بستی اولاد فاطمہ کے زیر تصرف آئی۔ چنانچہ محمد بن یحییٰ بن حسین بن زید اور محمد بن عبد اللہ بن حسین بن علی اس کے متولی قرار پائے۔ خلیفہ متوکل عباسی کے عہد خلافت میں جب فدک کے بارے میں اولاد فاطمہ کے مابین نزاع بپا ہوا تو اس نے حکم دیا کہ فدک کی آمدنی حسب سابق رفاہی کاموں پر خرچ کی جائے جیسا کہ خلافت صدیقی سے لیکر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ تک ہوتا رہا تھا۔ یہ طے پایا کہ حکومت اسکی آمدنی اصلاحی کاموں پر صرف کرے گی اور دوسرا کوئی شخص خواہ وہ اولاد فاطمہ میں سے ہو یا کوئی اور اس کا متولی نہیں ہوگا ۱۲

تو حضرت ابوبکرؓ نے جواباً کہا کہ کوئی گواہ پیش کیجئے۔

حضرت فاطمہؓ نے ام ایمن کو گواہ کے طور پر پیش کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا کہ "یہ عورت ہے لہٰذا اس کی شہادت مقبول نہیں"۔ حالانکہ روایات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ "ام ایمن ایک جنتی عورت ہے"۔ پھر حضرت علی نے حضرت فاطمہؓ کے حق میں شہادت دی تو حضرت ابوبکر نے کہا کہ "یہ آپ کے خاوند ہیں لہٰذا ان کی شہادت بھی مقبول نہیں"۔ روایات میں منقول ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علی حق پر ہے اور علی اور حق لازم و ملزوم ہیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے یہاں تک کہ بروز قیامت میرے حضور حوض کوثر پر وارد ہوں"۔ حضرت فاطمہ یہ سنکر ناراض ہو گئیں اور حلف اٹھایا کہ حضرت ابوبکرؓ سے بات چیت نہیں کریں گی اور جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر ہوں گی (بعد از وفات) تو حضرت ابوبکر کا شکوہ کریں گی"۔ سب روایات میں مذکور ہے کہ آنحضور نے فرمایا فاطمہ! تیری رضاء رضائے الٰہی کی موجب ہے اور تیری ناراضگی اللہ تعالےٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ "فاطمہ میرا جگر پارہ ہے"۔ اگر حدیث نبوی لَا نُوْرِثُ صحیح ہوتی تو حضرت ابوبکر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، عمامہ اور خچر حضرت علی کو نہ دیتے اور حضرت عباس کے دعوی کے مقابلہ میں حضرت علی کا مطالبہ قابل ترجیح نہ ہوتا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر کے پاس بحرین کا مال آیا تو حضرت جابرؓ کے یہ کہنے پر کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ مال دینے کا وعدہ کیا تھا وہ مال ان کو دے دیا اور گواہ بھی طلب نہ کیا"۔

شیعہ مصنف کے اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ صدر واقعہ روافض کا پہلا بہتان نہیں ہے بلکہ وہ ایسے لاتعداد جھوٹ تصنیف کر چکے ہیں۔ یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔ (۱) اگر حضرت فاطمہ فدک کی جاگیر ورثہ کی بنا پر طلب کرتی تھیں تو یہ ہبہ نہیں ہو سکتا (۲) اور اگر یہ جاگیر آپ نے حضرت فاطمہ کو ہبہ کر دی تھی تو ورثہ باطل ہوا۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ رسول اللہ نے مرض الموت میں یہ جاگیر حضرت فاطمہ کو ہبہ کر دی تھی اور اس کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ دوسروں کی طرح آپ کا ترکہ بھی ورثاء کے مابین تقسیم کیا گیا تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ آپ نے حضرت فاطمہ کے حق میں وصیت کی حالانکہ آپ وارث

تھیں (اور وارث کے حق میں وصیت کرنا ناروا ہے) یا حالت مرض میں حضرت فاطمہ کو ان کے حق سے زیادہ مال عطا کیا۔

اور اگر حالت صحت میں آپ نے فدک کی جاگیر حضرت فاطمہ کو عطا کی تھی تو وہ ہبہ باقبضہ ہونا چاہئے تھا۔ اس لیے کہ واہب اگر کوئی چیز ہبہ کرے اور جس کو ہبہ کیا گیا ہے وہ اس پر قابض نہ ہو۔ یہاں تک کہ واہب کی موت واقع ہو جائے تو ایسا ہبہ جمہور علماء کے نزدیک باطل ہے یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ آپ نے فدک کی جاگیر حضرت فاطمہ کو عطا کی اور ام ایمن اور حضرت علی کے سوا جملہ صحابہ میں سے کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا۔ یہ حضرت فاطمہ پہ بہتان ہے۔ کہ انہوں نے ایسا دعوی کیا تھا۔ اگر اس مفروضہ کی صحت تسلیم کر لی جائے کہ دوسروں کی طرح انبیا کا ترکہ بھی تقسیم کیا جاتا ہے تو حضرت فاطمہ کے دعوی کے خلاف آنحضور کی ازواج مطہرات اور آپ کے چچا حضرت عباس آپ کے حریف ہوتے اور ظاہر ہے کہ ان کے خلاف صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد اور ایک عورت کی شہادت جمہور مسلمین کے نزدیک قابل قبول نہیں البتہ ایسے واقعات میں فقہاء حجاز اور محدثین کے نزدیک مدعی کے حق میں ایک گواہ کے ساتھ اس کی حلف کو شامل کر کے فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے۔

بیوی کے حق میں خاوند کی شہادت کے بارے میں علماء کے دو مشہور اقوال ہیں۔ امام احمد سے بھی اس ضمن میں دو روایتیں منقول ہیں۔

(۱) پہلی روایت یہ ہے کہ مقبول نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک، لیث بن سعد، اوزاعی، اسحٰق اور دیگر ائمہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

(۲) امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ خاوند کی شہادت بیوی کے حق میں مقبول ہے۔ امام شافعی، ابوثور اور ابن المنذر کی بھی یہی رائے ہے۔

بنا بریں اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ کی صحت کو تسلیم بھی کیا جائے تو حاکم وقت ایک مرد یا ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جبکہ اکثر علماء کے نزدیک خاوند کی شہادت بیوی کے حق میں مقبول ہی نہیں،

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "سب محدثین نے روایت کیا ہے کہ ام ایمن ایک جنتی خاتون ہیں"۔

ایک جاہلانہ بات ہے۔ جو اس کے حق میں مفید ہونے کی بجائے مضر ہے۔ حضرت ابوبکر کا یہ فرمان کہ "اس کی بات مقبول نہیں" ایک ایسی بات ہے کہ اگر حجاج بن یوسف یا مختار بن ابی عُبَید جیسے ظالم لوگوں کے منہ سے بھی نکلتی تو اس کی صداقت میں ذرہ بھر بھی شبہ نہ ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ مالی معاملات میں ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جبکہ مدعی ایک ایسی چیز کی ملکیت کا دعوی کر رہا ہو جو کسی اور کے زیر تصرف ہو مگر یہاں تو اس کے قائل حضرت ابوبکر جیسے صادق القول بزرگ ہیں۔

شیعہ مضمون نگار نے کہا ہے کہ حدیث "ام ایمن ایک جنتی عورت ہے"۔ سب محدثین نے روایت کی ہے"۔ یہ صریح کذب ہے یہ روایت کتب حدیث میں مذکور نہیں اور نہ ہی کسی محدث نے اسے روایت کیا ہے۔ ام ایمن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی والدہ اور آنحضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی انّا رہ چکی تھیں۔ یہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچیں تھیں اور صحابیات میں بڑی احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ بایں ہمہ روایت حدیث میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل علم پر افترا پردازی کر کے کوئی روایت بیان نہیں کی جا سکتی۔

باقی رہی یہ بات کہ بقول شیعہ مصنف "یہ روایت سب نے ذکر کی ہے"۔ بالکل غلط ہے۔ ایسا دعوی صرف حدیث متواترہ کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ جو شخص اکابر صحابہ کی بیان کردہ حدیث "لَا نُورِثُ" کا منکر ہو اور ام ایمن کے بارے میں ذکر کردہ حدیث کو متواترہ قرار دیتا ہو اس کے اجہل الناس اور منکر حق و صداقت ہونے کے بارے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بشرطِ صحت ام ایمن کے بارے میں جنت کی بشارت دی ہے تو ایسا مژدہ آپ نے دیگر صحابہ کے بارے میں بھی سنایا ہے۔ آپ نے دس صحابہ کے بارے میں جنت کی بشارت سنائی ہے نیز یہ بھی فرمایا کہ بیعت الشجرہ میں شمولیت کرنے والوں میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ یہ حدیث سنداً صحیح اور محدثین کرام کے نزدیک مسلم ہے۔ وہ حدیث جس میں آپ نے صحابہ کے بارے میں جنت کی شہادت دی ہے اہل سنن نے متعدد طرق سے بروایت عبدالرحمن بن عوف سعید بن زید نقل کی ہے۔ یہ روایات محدثین کے

نزدیک عام طور سے معروف ہیں۔

جن احادیث میں صحابہ کے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے شیعہ ان کی تکذیب کرتے ہیں اور صحابہ پر یہ کہہ کر معترض ہوتے ہیں کہ وہ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے جس میں ام ایمن کے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ کیا اس سے بڑا جہل و عناد بھی ہو سکتا ہے؟

علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ جو شخص جنتی ہو وہ مقبول الشہادت بھی ہو۔ بخلاف ازیں اس امر کا احتمال ہے کہ وہ شہادت دینے میں غلطی کا ارتکاب کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر حضرت خدیجہ، فاطمہ و عائشہ رضی اللہ عنہن جیسی جنتی عورتیں شہادت دیں تو قرآن کے مطابق ان کی شہادت کو مرد کی شہادت کے مقابلہ میں نصف شہادت قرار دیا جائے گا، جس طرح عورت آدمی کے مقابلہ میں نصف میراث حاصل کرتی ہے اور اس کی دیت بھی مرد سے آدھی ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف مذکور نہیں۔ بنابریں کسی عورت کے جنتی ہونے سے اس کا مقبول الشہادت ہونا لازم نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ غلط شہادت دے رہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جھوٹا شخص دروغگوئی سے تائب ہو کر جنت میں جا سکے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت علی کی شہادت اس لیے قبول نہ کی کہ وہ حضرت فاطمہؓ کے خاوند تھے"۔ یہ صریح کذب ہے۔ اگر اس کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی ہمارے حق میں مضر نہیں۔ اس لیے کہ بیوی کے حق میں خاوند کی شہادت اکثر علماء کے نزدیک ناقابل قبول ہے جو علماء اس کی قبولیت کے قائل ہیں وہ اس شرط کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ شہادت کا نصاب پورا ہو جائے۔ مثلاً خاوند کے ساتھ ایک مرد گواہ اور بھی ہو یا دو عورتیں ہوں۔ ایک آدمی اور ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر کرنا جب کہ مدعی سے حلف بھی نہ لیں ناروا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ کہنا: یہ روایت کہ "علی حق پر ہیں اور حق آپ کے ساتھ لگا لپٹا رہتا ہے"۔ سب علماء نے بیان کی ہے"۔ کذب و جہل کی انتہا ہے۔ یہ روایت بسند صحیح یا ضعیف کسی نے بھی نقل نہیں کی۔ پھر یہ کہنا کس حد تک صحیح ہے کہ "یہ روایت سب محدثین نے بیان کی ہے"۔ اس شخص سے زیادہ جھوٹا اور کون ہو سکتا ہے جو کسی روایت سے متعلق کہے کہ صحابہ و علماء نے یہ روایت بیان کی ہے حالانکہ وہ حدیث اصلاً کسی سے بھی منقول نہ ہو یہ کھلا ہوا کذب و افترا ہے

البتہ اگر یوں کہا جائے کہ بعض علماء نے یہ روایت بیان کی ہے تو بھی یہ بات کسی حد تک دائرہ امکان کے اندر ہے۔

مذکورہ صدر حدیث درج ذیل وجوہ و اسباب کی بنا پر معنوی اعتبار سے بھی ناقابل قبول ہے۔

(۱) اس حدیث میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ "حق حوض کوثر پر آکر مجھ سے ملے گا" یہ غلط ہے اس لیے کہ ملاقات کرنا اشخاص کی صفت ہے ظاہر ہے کہ حق کوئی مجسم چیز نہیں جو حوض پر وارد ہونے کے قابل ہو۔

(۲) اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ "حق حضرت علی کے ساتھ گھومتا ہے"۔ حالانکہ حق صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گردش کرتا ہے اور دوسرا کوئی انسان اس خصوصیت کا حامل نہیں۔ اگر حضرت علی میں یہ وصف تسلیم کیا جائے تو اس سے حضرت علی کا آنحضور کی طرح معصوم ہونا لازم آتا ہے۔ شیعہ جہالت کی بنا پر عصمتِ علی کا دعوٰے کرتے ہیں۔ جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ حضرت علی رض ابوبکر رض و عمر رض و عثمان رض کی نسبت معصوم تو نہ تھے بلکہ یوں کہیے کہ ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں۔ وہ شیعہ کی دروغگوئی سے بخوبی واقف ہے۔ حضرت علی کے مسائل و فتاوٰی بالکل اسی طرح ہیں جس طرح ابوبکر و عمر اور عثمان کے فتاوٰی۔ ایسا ہرگز نہیں کہ حضرت علی کے فتاوٰی خلفاء ثلاثہ کے فتاوٰی کی نسبت اولی بالصواب ہوں۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے اقوال حضرت علی کے ارشادات کی نسبت ضعیف و مرجوح ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ آپ دیگر خلفاء کی نسبت حضرت علی سے زیادہ خوش اور ان کے زیادہ ثنا خواں تھے بخلاف ازیں اگر کوئی شخص کہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم عمر بھر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کبھی ناراض نہیں ہوئے اور حضرت علی کو متعدد مرتبہ زجر و عتاب فرمایا تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بارگاہ نبوی میں یہ شکوہ پہنچا اور کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی حمایت نہیں فرماتے" تو آپ نے مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اپنی بیٹی کو حضرت علی کے نکاح میں دینے کی اجازت طلب کی ہے"۔

واضح رہے کہ میں ان کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ البتہ علی اگر میری بیٹی کو طلاق دے دیں تو ان کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں۔ فاطمہ امیرا جگر پارہ ہے جو اس کو شک میں ڈالتا ہے وہ مجھے شک میں مبتلا کرتا ہے اور جو چیز اس کو ایذا دیتی ہے وہ مجھے ایذا دیتی ہے پھر آپ نے اپنے ایک داماد[۱] کا ذکر کیا جو بنی عبد شمس کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

---

[۱] ان کا نام ابو العاص بن ربیع بن عبد العزی بن عبد شمس بن عبد مناف ہے۔ یہ آنحضور کے سب سے پہلے داماد اور آپ کی سب سے بڑی دختر فرخندہ اختر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے۔ ان کی بیٹی کا نام اُمامہ تھا جن کو حالت نماز میں آپ کندھے پر اٹھایا کرتے تھے۔ جب سجدہ کو جاتے تو زمین پر رکھ دیتے اور جب کھڑے ہونے اٹھالیا کرتے تھے۔ یہ وہی امامہ بنت ابو العاص ہیں کہ جب ان کی خالہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا تو حضرت علی نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ ابو العاص متاخر الاسلام ہیں غزوۂ بدر میں یہ قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے گئے تھے اور قید کر لیے گئے۔ جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے فدیہ بھیجا تو حضرت زینب نے وہ ہار مدینہ روانہ فرمایا جو رخصتانہ کے وقت ان کی والدہ حضرت خدیجہ نے ان کو پہنایا تھا۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ہار پہچان لیا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

"اگر تم مصلحت دیکھو تو زینب کے قیدی کو رہا کر دو اور ہار اسے واپس دے دو"۔

صحابہ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ بعد ازاں حضرت زینب نے ابو العاص سے ہجرت کی اجازت طلب کی جو اس نے دیدی۔ ابو العاص ایک تجارتی قافلہ کو لے کر ملک شام گئے۔ ساحل سمندر پر مسلمانوں کی ایک جماعت آباد تھی جس میں ابو جندل اور ابو بصیر بھی شامل تھے انہوں نے آگے بڑھ کر ابو العاص کو قید کر لیا اور مدینہ پہنچے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ زینب نے ابو العاص کو مال و متاع سمیت پناہ دی ہے۔ قید کرنے والوں نے ابو العاص کو اسلام لانے کی ترغیب دلائی اور ابو العاص کو مخاطب کر کے کہا۔ "ابو العاص! آپ اشراف قریش میں شمار ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ آپ آنحضور کے چچا زاد اور داماد بھی ہیں اگر آپ مشرف باسلام ہو جائیں تو اہل مکہ کا سب مال آپ کو غنیمت میں مل جائے گا"۔

(باقی بر صفحہ ۲۹۲)

آپ نے فرمایا۔ اس (آپ کے داماد ابو العاص) نے جب بات کی تو سچ بولا اور جب وعدہ کیا تو اسے پورا کیا۔" یہ حدیث بخاری و مسلم میں بسند صحیح منقول ہے۔

ایک مرتبہ سرور کائنات صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی کے دروازہ پر دستک دے کر دریافت فرمایا۔

"کیا تم نماز نہیں پڑھ رہے"؟

حضرت علی نے عرض کیا ہماری جانیں خدا کے قبضہ میں ہیں جب چاہتا ہے جگا دیتا ہے۔ آنحضور یہ سنکر افسوس کے عالم میں اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے چل دیئے۔ زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے۔

وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْئٍ جَدَلًا (انسان جھگڑا کرنے میں سب چیزوں سے بڑھا ہوا ہے)

جہاں تک حضرت علی کے مسائل و فتاوٰی کا تعلق ہے۔ آپ نے فتوی دیا تھا کہ جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت اَبْعَدُ الْاَجَلَیْن (عدت وفات اور وضع حمل

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) ابو العاص نے جواباً کہا۔ "تم نے یہ بہت بری بات کہی ہے کہ میں مکر و فریب کے ساتھ اپنے مذہب کو چھوڑ دوں"۔ جب آپ نے ابو العاص کو رہا کیا تو پہلے مکہ گئے اور حقداروں کی ایک ایک پائی ادا کی۔ پھر کھڑے ہو کر اہل مکہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "مکہ والو! بتاؤ کیا میں نے واجب الادا حقوق ادا کیے یا نہیں"؟ انہوں نے کہا "بخدا ضرور"

تب ابو العاص نے کلمۂ شہادت پڑھا اور عازم مدینہ ہوئے۔ سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو ابو العاص کے یہاں بھیج دیا۔ اور نکاح جدید کی ضرورت نہ سمجھی۔

ابو العاص اموی اور ان کے اشباہ و امثال جن بلند اخلاق اور اوصاف کے حامل تھے ان کا ذکر بیان یہاں ممکن نہیں۔

ظہور اسلام سے قبل وہ جس طرح عرب بھر میں ممتاز تھے۔ اسلام لانے کے بعد تاریخ اسلام میں بھی انھیں بلند مقام حاصل ہوا۔ وہ عربوں کے اخلاق جلیلہ اور ان کی بلند پایہ عربی فطرت ہی ہے جس کی بنا پر اللہ تعالے نے اس عظیم قوم کو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔ اللھم اغفر لکاتبہ ولوالدیہ اجمعین ۱۲

ہر دو میں سے جو بعید تر ہوا ہے۔ عہد نبوت میں جب ابوسنابل بن بعکک نے یہی فتویٰ دیا۔ تو آنحضور نے فرمایا ابوسنابل جھوٹ کہتا ہے۔ اس کے نظائر و امثال بہت ہیں۔

بہر کیف حضرت علی کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شیعہ مضمون نگار نے حضرت فاطمہ کا جو واقعہ ذکر کیا ہے وہ ان کے شایان شان نہیں۔ شیعہ مصنف اس زعم باطل میں مبتلا ہے کہ اس سے حضرت فاطمہ کی مدح و ستائش ہو رہی ہے حالانکہ یہی واقعہ ان کے حق میں تنقیص شان کا موجب ہے۔ بشرط صحت اس واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر نے جب حضرت فاطمہ کے حق میں فیصلہ صادر نہ کیا تو آپ کس لیے ناراض ہو گئیں؟ اس لیے کہ حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ حق و صداقت پر مبنی تھا جس کی خلاف ورزی کسی کے لیے بھی درست نہیں۔ لہٰذا اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اللہ و رسول کے حکم کے برخلاف اس کے حق میں فیصلہ صادر کیا جائے اور جب حاکم ایسا نہ کر سکے تو وہ اس سے ناراض ہو جائے اور بات چیت ترک کرنے کی قسم کھا لے تو یہ بات اس شخص کے لیے نہ موجب مدح ہے اور نہ حاکم کے حق میں سبب جرح و قدح۔ بخلاف ازیں یہ بات ایسا تقاضا کرنے والے کے لیے جرح و قدح سے قریب تر ہے۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ حضرت فاطمہ و دیگر صحابہ سے اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں ان میں سے اکثر صریح کذب اور بعض تاویل پر مبنی ہیں اور اگر ان میں سے بعض گناہ کے موجب بھی ہوں تو ہمیں کب اس سے انکار ہے کیونکہ ہم صحابہ کو معصوم نہیں مانتے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ اولیاء اور اہل جنت میں سے ہونے کے باوصف گناہوں سے بری نہ تھے ہم پر امید ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا۔

رافضی مصنف نے جو ذکر کیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حضرت صدیق سے گفتگو نہ کرنے کی قسم کھا لی۔ اور کہا کہ اپنے والد محترم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل کر اس کا شکوہ کریں گی۔ یہ بات شان فاطمہؓ کے منافی ہے۔ شکوہ صرف بارگاہ ربانی میں کیا جا سکتا ہے اور بس!

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (یوسف - ۸۶)

میں بارگاہ ایزدی میں اپنے حزن و ملال کا شکوہ کرتا ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام دعا فرمایا کرتے تھے۔

"بارخدایا! مدح و ستائش صرف تیرے لیے ہے۔ تیرے حضور ہی میں شکایت کی جاتی ہے تجھی سے مدد چاہی جاتی ہے اور تجھی سے فریاد رسی کی جاتی ہے۔ ہمارا تکیہ صرف تیری ہی ذات پر ہے"۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عباس کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

"سوال کرنا ہو تو صرف خدا سے کیجئے اور اگر مدد طلب کرنا ہو تو خدا سے کیجئے"۔

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھ سے سوال کیجئے یا مجھ سے طلب امداد کیجئے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ (سورہ الشرح ۷-۸)

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی شخص حاکم سے مال طلب کرے اور غیر مستحق ہونے کی بنا پر حاکم اس کا مطالبہ پورا نہ کرے اس پر مزید یہ کہ حاکم اس مال کو اپنے عزیز و اقارب پر صرف نہ کر رہا ہو بلکہ حسب موقع و مقام سب مستحق مسلمانوں کو دیتا ہو۔ پھر کہا جائے کہ وہ طالب حاکم سے بگڑ گیا تو ظاہر ہے کہ اس کی ناراضگی کا موجب صرف یہ امر ہے کہ حاکم نے اس کو مال نہ دیا اور یہ کہہ دیا کہ دوسرے لوگ اس کی نسبت اس مال کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس ناراضگی میں طالب کے لیے مدح و ستائش کا کوئی پہلو بھی باقی نہیں رہتا اور اگر طالب مظلوم بھی ہو تاہم اس کی ناراضگی صرف

ل اگر حدیث نبوی "لا نورث" سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عائشہ بنت ابی بکر اور حفصہ بنت عمر دونوں ورثاء میں شامل تھیں۔ حضرت صدیق نے مذکورہ صدر حدیث کی تعمیل میں دونوں کو ورثہ سے محروم کر کے آپ کے صدقہ کو عام صدقات میں جمع کر دیا تھا۔ تاہم آپ نے آنحضور کی پیروی کرتے ہوئے اہل بیت کو بیت المال سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ حضرت ابو بکر نے جملہ امور میں آنحضور کے نقش قدم پر چلنے کے التزام کو قائم رکھا اور ہر صورت میں اسے نباہنے کی کوشش کی۔ آپ نے بدعات سے کنارہ کش رہنے کی قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی بدعت اور کیا ہوتی کہ آپ حدیث "لا نورث" کی خلاف ورزی کرتے۔ حالانکہ یہ روایت کثیر صحابہ سے مروی ہے اور خود حضرت علی نے بھی یہ روایت بیان کی ہے ۱۲

دنیوی مال کی خاطر ہے۔ اس صورت میں طالب کو متہم کرنا حاکم کو ملعون قرار دینے کی نسبت اقرب الی الصحت ہے۔ خصوصاً جبکہ حاکم یہ مال خود نہیں لے رہا اور طالب اسے خود ہڑپ کرنے کے درپے ہے۔ حاکم واشگاف الفاظ میں کہہ سکتا ہے کہ حکم خداوندی مجھے مال دینے سے مانع ہے۔ میرے لیے یہ کیونکر روا ہے کہ مستحق سے مال لے کر غیر مستحق کو دیدوں۔ طالب اس کے سوا آخر کیا کہہ سکتا ہے کہ میری ناراضگی کا باعث صرف قلیل مال ہے۔ دگر ہیچ۔

جو شخص حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے متعلق ایسا واقعہ بیان کر کے اسے ان کی مدح پر محمول کرتا ہے اس کا جاہل ہونا کسی شک و شبہ سے بالا ہے۔ اللہ تعالے منافقین کی مذمت ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

بعض منافق صدقات کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں اگر صدقات مل گئے تو خوش ورنہ ناخوش۔ اور اگر وہ خدا کے عطا کردہ مال پر رضامندی کا اظہار کرتے اور یوں کہتے کہ اللہ تعالے ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمیں اپنے فضل و کرم سے دیتا رہے گا ہماری رغبت صرف بارگاہ ربانی کی جانب ہے اور بس تو یہ بات ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی (توبہ ۵۸-۵۹)

اس آیت میں منافقین کی یہ خصوصیت بیان کی کہ وہ دیے جانے کی صورت میں خوش ہوتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ منافقین کی زندگی کا یہی پہلو ان کی مذمت کا موجب ہوا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ جو شخص اسی خصوصیت کی بنا پر حضرت فاطمہ کی مدح سرائی کرتا ہے جس کی مذمت بیان کی گئی ہے تو وہ بلاشبہ حضرت فاطمہ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ روافض نے اہل بیت کی شان میں جو گستاخیاں کی ہیں اور جس طرح ان کی زندگیوں کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے اہل بیت کی جانب سے اللہ تعالی ہی اس کا انتقام لے گا۔

اگر کوئی شخص یہ ... ضرت فاطمہ اپنا حق طلب کرنے آئی تھیں اور حق کا مطالبہ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہ ... کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر تو یہود و نصاریٰ تک کے حقوق ادا کرنے میں تامل نہیں کر ... نے بھلا آپ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ کا حق ادا کرنے سے کیونکر

انکار کر سکتے تھے۔ مزید براں اللہ در سول نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کیا کرتے تھے۔ پھر آپ لوگوں کے حقوق ادا کرنے سے کیونکر باز رہ سکتے تھے[۱]؟

حضرت فاطمہ بعض اوقات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مال کا مطالبہ کیا اور آپ اسے پورا نہ کر سکے۔ بخاری و مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ بارگاہ نبوت میں خادم طلب کرنے آئیں اور آپ نے خادم عطا کرنے کی بجائے ان کو چند کلمات پڑھتے رہنے کی تلقین فرمائی۔ جب یہ روا ہے کہ حضرت فاطمہ آنحضور سے کوئی چیز طلب کریں اور آپ یہ مطالبہ پورا نہ کریں اور اس کا پورا کرنا آپ پر واجب بھی نہ ہو تو اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ وہ خلیفۂ رسول سے کوئی چیز طلب کریں اور آپ اس مطالبہ کی تکمیل سے قاصر رہیں۔ خصوصاً جبکہ ہم اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ حضرت فاطمہ معصوم نہیں اور ممکن ہے آپ ایسا مطالبہ کریں جس کی تکمیل ضروری نہ ہو۔ جب مطالبہ کا پورا کرنا حضرت ابوبکر پر واجب نہ ہوا تو ایک غیر واجب امر کے ترک کرنے پر آپ ہرگز قابل مذمت نہیں یہ امر مباح ہی کیوں نہ ہو۔ جب ہم یہ فرض کر لیں کہ اس مطالبہ کا پورا کرنا حضرت ابوبکر کے لیے مباح بھی نہ تھا تو اس کی عدم تکمیل پر آپ مدح کے قابل ہوئے نہ کہ مذمت کے مستحق۔ حضرت ابوبکر نے آنحضور کی زندگی میں اور آپ کے بعد کسی کا حق ادا کرنے سے کبھی انکار نہ کیا۔

---

[۱] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ایک عزیز مسطح بن اثاثہ کی مالی امداد فرمایا کرتے تھے۔ اس ضمن میں سورۂ نور کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

(النور - ۲۲) اگر یہ آیت کریمہ کسی انسان کے بارے میں انبیاء میں سے کسی نبی پر نازل ہوتی تو اس نبی کی امت کا سخت بے شرم آدمی بھی اس شخص کی شان میں گستاخی کرنے سے شرم محسوس کرتا جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی مگر حضرت صدیق کی شان میں گستاخی کرنے والے جذبۂ حیا سے عاری ہیں اس لیے کہ حیاء ایمان کا جزء ہے اور انھیں ایمان سے کوئی سروکار نہیں۔

(محب الدین الخطیب)

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت فاطمہؓ نے وصیت فرمائی تھی کہ انھیں رات کو دفن کیا جائے اور ان کا جنازہ نہ پڑھا جائے"۔ صرف وہی شخص اس کو حضرت فاطمہ سے روایت کرتا اور اس سے احتجاج کرتا ہے جو علم حدیث سے قطعی نابلد ہو اور آپ کی شان میں ایسے کلمات کہے جو آپ کی عزت وعظمت کے منافی ہوں۔ لبشرط صحت یہ بات چنداں مفید نہیں۔ اس لیے کہ جنازہ پڑھنے سے میت کو فائدہ ہی پہنچتا ہے کسی ضرر کا اندیشہ نہیں۔ نیز یہ کہ اگر ایک کم درجہ کا شخص افضل الخلق کا جنازہ پڑھے تو اسے کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی لیجئے کہ سب ابرار و اشرار اور منافقین آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں لبفرض محال اگر اس سے آپ کو نفع نہیں پہنچتا تو ضرر بھی لاحق نہیں ہوتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ کہ آپ کی امت میں منافقین بھی ہیں اس کے باوصف آپ نے کسی کو بھی درود وسلام سے نہ روکا بلکہ مومن ومنافق سب کو درود وسلام کا حکم دیا۔

مذکورہ صدر حقائق اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ قبل ازیں ذکر کردہ واقعہ صرف فاطمہ کی مدح وستائش پر دلالت نہیں کرتا اور اس سے حضرت فاطمہ کی فضیلت پر وہی شخص استناد کرتا ہے جو جاہل مطلق ہو۔ مزید براں یہ مسئلہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ مسلمان اس کا جنازہ نہ پڑھیں تو اس کی وصیت نافذ نہیں کی جائے گی اس لیے کہ نماز جنازہ اُس کے لیے ہر حال میں مفید ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کسی انسان پر کسی نے ظلم کیا ہو اور مظلوم وصیت کر جائے کہ ظالم اس کے جنازہ میں شریک نہ ہو تو اس کا یہ فعل ایسی نیکی نہیں ہے جو اس کے لیے قابل ستائش ہو۔ اللہ و رسول نے بھی اس کا حکم نہیں دیا۔ مقام تعجب ہے کہ حضرت فاطمہ کی تعریف وتوصیف کرنے والے ایسے واقعات کس لیے بیان کرتے ہیں جو ان کے لیے موجب مدح ہونے کی بجائے ان کی شان میں قدح وارد کرتے ہیں جیساکہ کتاب وسنت

---

[۱] امام ابن عبد البر نے الاستیعاب میں حضرت فاطمہ کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی اس وصیت کا ذکر کیا ہے۔ کہ حضرت ابوبکر کی بیوی اسماء بنت عمیس اور حضرت علی آپ کو غسل دیں۔ حضرت ابوبکر کی بیوی ہی نے آپ کے لیے نعش کا انتخاب کیا تھا جیسا کہ وہ ملک حبشہ بچشم خود ملاحظہ کر چکی تھیں۔ دیکھئے حلیۃ الاولیاء ابو نعیم ج ۲ ص ۴۲ نیز السنن الکبریٰ امام بیہقی ج ۴ ص ۳۴ نیز ج ۳ ص ۳۹۶۔

اور اجماع سے مستفاد ہوتا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول سب لوگوں نے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا "اے فاطمہ! تیرے ناراض ہونے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور تیرے راضی ہونے سے وہ راضی ہوتا ہے" یہ صریح کذب ہے۔ یہ روایت آپ سے منقول نہیں اور کتب حدیث میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں اس کی کوئی سند صحیح یا حسن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی۔ اس پر مزید یہ کہ جنتی ہونے کی شہادت اگر حضرت فاطمہ کی شان میں ملتی ہے تو یہی شہادت صحابہ کبار حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، سعید اور عبدالرحمن بن عوف کے بارے میں بھی موجود ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام سے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (سورۃ توبہ - ۱۰۰)

سابقین اولین مہاجرین و انصار اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گئے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح - ۱۸)

جب مومن درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔

احادیث نبویہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضور نے جب وفات پائی تو آپ صحابہ سے رضامند تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ و رسول جس سے راضی ہوں۔ دنیا میں سے کسی شخص کی ناراضگی بھی اسے ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ نیز اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص سے راضی ہو گا وہ بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گا اور جانبین کی رضامندی و خوشنودی میں کامل یگانگت و مطابقت ہو گی۔ گویا ایسا شخص حکم خداوندی پر راضی ہو گا۔ اور حکم خداوندی اس کی رضا کے موافق ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص حکم خداوندی پر راضی ہے وہ اس کے ناراض ہونے سے ناراض بھی ہو گا۔ اس لیے کہ جو شخص کسی دوسرے کے ناراض ہونے پر راضی ہوتا ہے وہ اس کے

غضب آلود ہونے پر غضب آلود بھی ہو گا۔

شیعہ کی پیش کردہ حدیث پر تنقید

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "فاطمہ میرا جگرپارہ ہے"۔ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں کی گئی۔ احادیث میں جو الفاظ مذکور ہیں وہ اس سے مختلف ہیں جس حدیث میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے علی کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ میں ہرگز اس کی اجازت نہ دوں گا۔ یہ الفاظ آپ نے تین مرتبہ دہرائے۔ پھر فرمایا فاطمہ میرا جگرپارہ ہے۔ جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے بھی دکھ پہنچتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ علی میری بیٹی کو طلاق دے کر ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرلے"۔ ایک روایت میں یوں ہے "مجھے ڈر ہے کہ فاطمہ کہیں دینی ابتلا میں نہ پڑ جائے۔ پھر آپ نے اپنے ایک داماد (ابوالعاص) کا ذکر کر کے اس کی تعریف فرمائی اور کہا اس نے جب بھی بات کی سچ بولا۔ اور جب وعدہ کیا تو اسے پورا کر دکھایا۔ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال تو نہیں کرتا۔ مگر بخدا جگر گوشۂ رسول اور دشمن خدا کی بیٹی ایک شخص کے گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں"۔

یہ حدیث بخاری و مسلم میں حضرت زین العابدین علی بن حسین اور مسور بن مخرمہ کی روایت سے مذکور ہے۔ حدیث بیان کرنے کا سبب خود روایت میں موجود ہے کہ حضرت علی ابوجہل کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لانا چاہتے تھے۔ بنابریں بیان کردہ سبب کو حدیث سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث کے الفاظ واضح ہیں۔

"جو چیز فاطمہ کو شک میں مبتلا کرتی ہے وہ مجھے بھی شبہ میں ڈالتی ہے اور جس بات سے فاطمہ کو دکھ پہنچے وہ میرے لیے بھی رنج والم کی موجب ہے"۔

یہ بات قطعی طور سے معلوم ہے کہ آنحضور کو یہ تکلیف محض اس لیے پہنچی کہ حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اگر یہ وعید ایذا دینے والے کو لاحق ہو سکتی ہے تو حضرت علی کا اس وعید کی لپیٹ میں آنا ضروری ہے۔ اور اگر اس کا احتمال نہیں

ہے تو حضرت ابوبکر حضرت علی کی نسبت اس وعید سے بعید تر ہوں گے۔

اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اس سے توبہ کر لی تھی۔ تو ہم کہیں گے کہ اس سے حضرت علی کا غیر معصوم ہونا لازم آتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر حضرت فاطمہؓ کی ایذاء کا ازالہ توبہ سے ہو سکتا ہے تو اس کے علاوہ دیگر اعمال بھی یقیناً اس کو محو کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اعمال صالحہ مصائب و آلام اور توبہ سے تو اس سے بھی بڑے گناہ دور ہو سکتے ہیں۔ مزید براں یہ گناہ کفر نہیں ہے کہ بلا توبہ معاف نہ ہو سکتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت علیؓ آنحضور کی زندگی ہی میں مرتد ہو چکے ہوتے (العیاذ باللہ) حالانکہ آپ کا مومن و مسلم ہونا ایک یقینی امر ہے۔ خوارج جنہوں نے آپ کے مرتد ہونے کا دعویٰ کیا تھا وہ بھی یہی کہتے تھے کہ حضرت علی آنحضور کی وفات کے بعد اسلام سے منحرف ہو گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں مرتد ہونے والے کو یا قتل کر دیا جاتا تھا یا وہ پھر دین اسلام کی طرف لوٹ آتا تھا۔ مگر حضرت علی کا دامن اس سے پاک رہا۔ شرک کے ماسوا دوسرے گناہوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

(سورۃ النساء - ۱۱۶)

اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے سوا جس کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

حضرت ابوبکر کا کفر ثابت کرنے کے لیے اگر شیعہ حضرت فاطمہ کی ایذاء کو کفر قرار دیں تو اس سے حضرت علی کا بھی کافر ہونا لازم آئے گا۔ اور جب لازم باطل ہے تو ملزوم کے بطلان میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ شیعہ کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی عیب چینی کرتے اور ایسے امور کی بنا پر ان کی تکفیر کرتے ہیں جن کی مثل بلکہ اس سے بھی قبیح تر افعال حضرت علی سے صادر ہو چکے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان افعال میں اگر حضرت علی ماجور یا معذور ہیں تو خلفاء ثلاثہ بالاولیٰ اجر یا عذر کے مستحق ہوں گے اور اگر کسی معمولی امر کی بنا پر خلفاء ثلاثہ فاسق یا کافر قرار پائیں گے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت علی اس سے شنیع تر فعل کے مرتکب ہونے

یہ بھی کفر و فسق سے بچ جائیں؟

حضرت فاطمہ کو ستانا اس لیے بڑا گناہ ہے کہ اس سے ان کے والد محترم کو دکھ پہنچتا ہے کسی معاملہ میں جب یہ سوال پیدا ہو جائے کہ آیا حضرت فاطمہ کو ایذا دینے سے احتراز کیا جائے۔ یا آنحضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ستم رانی کرنے سے۔ تو ظاہر ہے کہ اندریں صورت آنحضور کی ایذاء سے دست کشی حضرت فاطمہ کی اذیت کی نسبت واجب تر ہوگی۔ حضرت ابوبکر و عمر کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے (انبیاء کی عدم توریث) ایک حکم دیا تھا اور یہ دونوں اصحاب اس کی خلاف ورزی کر کے آپ کو ایذا پہنچانے سے امکانی حد تک کنارہ کش رہنا چاہتے تھے۔ ہر سلیم العقل آدمی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کا حکم دیں اور حضرت فاطمہ اس کے برخلاف مطالبہ کریں تو حکم رسول کی مراعات اولیٰ ہوگی۔ اس لیے کہ آپ کی اطاعت واجب اور معصیت حرام ہے۔ اگر آپ کی اطاعت کرنے سے کسی کو دکھ پہنچتا ہے تو وہ غلطی پر ہے اور آپ کی اطاعت کرنے والا مصیب ہے۔ یہ اس صورت سے مختلف ہے جب کوئی شخص اللہ و رسول کی اطاعت کے لیے بلکہ کسی اور مقصد کے لیے حضرت فاطمہ کو ستائے۔

جو شخص اس بات پر غور کرے گا کہ مذکورہ واقعہ میں حضرت ابوبکر کا مقصد صرف آنحضور کی اطاعت تھی اور اس کے سوا کوئی بات آپ کے پیش نظر نہ تھی تو وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ حضرت ابوبکر کا یہ فعل حضرت علی کے اقدام کے مقابلہ میں اکمل و افضل ہے۔ تاہم دونوں کی عظمت و فضیلت میں کلام نہیں آپ دونوں اکابر اولیاء اللہ سابقین اولین اور خدا کے مقربین میں سے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

"بخدا آنحضور کی قرابت ذاتی قرابت کی نسبت مجھے عزیز تر ہے"۔

آپ کا قول ہے۔

"آنحضور کے اہل بیت کا خیال رکھیئے"۔ (بخاری)

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت فاطمہ کو رنج و الم پہنچایا تھا تو یہ ماننا

پڑے گا کہ آپ نے کسی ذاتی غرض کے تحت ایسا نہیں کیا تھا اس کی اصل وجہ اللہ و رسول کی اطاعت نیز یہ جذبہ اس کا محرک تھا کہ حقدار کو حق مل کر رہے[1]۔ حضرت علی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ شادی کر کے آپ کو دکھ پہنچانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی کا یہ اقدام ذاتی غرض پر مبنی تھا۔

حضرت ابوبکر کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ مذکورہ بالا واقعات اس بات کے زندہ

---

[1] یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق یہ آمدنی رفاہ عام کے کاموں پر صرف کی جائے ۱۲۔

[2] اہل سنت کی بلند اخلاقی مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے جب میں اس بات پر غور کرتا ہوں کہ وہ ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ حضرت علی کے عزم نکاح اور اس سے آنحضور و حضرت فاطمہ کی شدید ناراضگی کا واقعہ شاذ و نادر ہی ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں آنحضور نے مسجد نبوی کے منبر پر جو شہرۂ آفاق خطبہ دیا وہ قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتب حدیث کے اوراق میں محفوظ ہے۔ دوسری جانب شیعہ کا یہ حال ہے کہ تمام تاریخی ادوار میں انھوں نے حضرت ابوبکر کے خلاف شور و شغب بپا کیے رکھا۔ حضرت ابوبکر کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے آنحضور کے ایک ایسے حکم کو نافذ کرنے کی غلطی کی جو انہوں نے بذات خود آنحضور سے سنا تھا۔ علاوہ ازیں کثیر صحابہ اور خود حضرت علی بھی براہ راست اسے آنحضور سے سن چکے تھے۔ حضرت ابوبکر نے نہایت موزوں طریقہ سے امر نبوی کی تکمیل فرمائی۔ حضرت فاطمہ اور دیگر اہل بیت کو اس جاگیر سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور جو باقی رہ جاتا تھا اس کو اسوۂ نبوی کے مطابق رفاہ عام کے کاموں پر صرف کرنے کی ہدایت کی۔ شیعہ کے شور و شغب اور دروغگوئی کا نتیجہ ہے کہ لوگ مسئلہ فدک کی تفصیلات سے آگاہ ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں کہ حضرت علی کے عزم نکاح سے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمہ کس حد تک برہم ہوئے تھے یہ دونوں واقعات (مسئلہ فدک اور ابو جہل کی بیٹی سے حضرت علی کا عزم نکاح) جملہ اختلافی مسائل میں اہل سنت و شیعہ کے مابین ایک عمدہ معیار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سے عیاں ہوتا ہے کہ صحابہ و اہل بیت کے بارے میں فریقین کا موقف کیا ہے۔ یہ دونوں واقعات اس بات کے شاہد عدل ہیں کہ اہل سنت صحابہ و اہل بیت دونوں کو دراتی پر

گواہ ہیں کہ حضرت فاطمہ کی ایذا سے متعلق حضرت ابوبکر کی نسبت حضرت علی کا فعل مذمت کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر نے اللہ و رسول کی اطاعت کے لیے ایسا کیا تھا اور حضرت علی نے ذاتی غرض کی بنا پر۔ ابوبکر صدیق کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اللہ و رسول کے لیے ہجرت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہجرت کرنے والا ان کا ہم پلہ کیسے ہو سکتا ہے۔

بے شک حضرت فاطمہ کی ایذا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث رنج و ملال ہے بشرطیکہ وہ بات حکم خداوندی کے خلاف نہ ہو۔ جب کسی بات میں حکم خداوندی موجود ہو تو اس کی انجام دہی ضروری ہے قطع نظر اس سے کہ یہ امر کسی کے لیے موجب اذیت ہو۔ خدا کی اطاعت کرتے ہوئے باعث اذیت وہ بات ہو گی جو اللہ و رسول کے حکم کے منافی ہو۔ اس کی مثال مندرجہ ذیل حدیث نبوی ہے۔

"جس شخص نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی حکم عدولی کی اور جس نے میرے امیر کے حکم سے سرتابی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔

پھر آپ نے ان الفاظ میں اس حدیث کی توضیح فرمائی۔

"کسی کی اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۱) عز و وقار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بخلاف ازیں شیعہ کے دل بغض صحابہ سے لبریز ہیں اور اہل بیت کی محبت کے بارے میں ان کے سب دعاوی بے بنیاد ہیں۔ اہل بیت کی محبت شیعہ میں صرف اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ان کی قبروں کو بت بنا کر ان کی پرستش کرتے رہیں اور اس طرح صنم پرستی کے دور کی یاد تازہ کر دیں۔

دیگر اخوات کو چھوڑ کر صرف حضرت فاطمہ سے اظہار محبت کذب و دروغ پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں شیعہ بعض بنی فاطمہ سے محبت کرتے ہیں اور بعض سے بغض و عناد رکھتے ہیں۔ مگر حق و صداقت کسی کے چھپائے چھپتی نہیں اور اس کا نور ظاہر ہو کر رہتا ہے وَاللّٰہُ یُحِقُّ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ ۱۲

آنحضورؐ کا یہ ارشاد کہ جس نے فاطمہ کو ایذا دی اس نے مجھے تکلیف دی"۔ بالاولیٰ اذی فی المعروف پر محمول ہوگا۔ اس لیے کہ آنحضورؐ کے امراء کی اطاعت فرض ہے اور ان کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے۔ مگر حضرت فاطمہ کو ایذا پہنچانے کا فعل آنحضورؐ کی نافرمانی کے مساوی نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت علی نے اللہ و رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا۔ کیونکہ آنحضور کے امراء کی نافرمانی آپ کی نافرمانی ہے اور آپ کے حکم سے سرتابی معصیت خداوندی ہے

شیعہ مصنف کا قول" اگر حدیث "لانورث" صحیح ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آنحضورؐ کی تلوار، خچر اور عمامہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دعوی کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو تفویض نہ فرماتے"۔

ہم پوچھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ نے یہ فیصلہ کب فرمایا تھا اور کس نے یہ واقعہ نقل کیا ہے! یہ ان پر صریح بہتان ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اشیاء جہاں تھیں۔ وہاں پڑی رہتیں اور کوئی ان کا مالک قرار نہ پاتا جس طرح ان دونوں حضرات نے آنحضور کے صدقہ کو حضرت علیؓ و عباسؓ کی تحویل میں دے دیا تھا کہ وہ اسے شرعی مصارف میں صرف کر دیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ورنہ اہل بیت جن کو اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں پاکیزہ قرار دیا ہے ناروا امور کے مرتکب ٹھہریں گے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سب اہل بیت کو پاک و صاف نہیں کیا اور ایسا دعوی کرنا خداوند تعالےٰ پر افتراء پردازی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ادعا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض بنی ہاشم گناہ و نجاست سے پاکیزہ نہیں ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ خود روافض کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بنی ہاشم میں سے جو شخص ابوبکر و عمر سے محبت رکھتا ہے وہ پاک نہیں ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ (احزاب:۳۳)

"اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ تم سے نجاست کو دور کرنا چاہتے ہیں"۔

مندرجہ بالا آیت سورہ مائدہ کی حسب ذیل آیت کی مانند ہے

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (مائدہ-۶)

اللہ تعالیٰ تمہیں تنگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ پاک کرنا چاہتا ہے۔

سورہ نساء کی حسب ذیل آیت بھی اسی قبیل سے ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ (سورہ نساء-۲۶)

اللہ تعالیٰ تم پر واضح کرنا اور تمہیں ہدایت دینا چاہتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس نوع کی وہ آیات جن میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے فلاں چیز کو پسند کرتے اور اس کا حکم دیتے ہیں جو شخص یہ کام کرے گا وہ مقصود کو پالے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے مقصد سے دور رہے گا۔ دوسرے موقع پر اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ بات منکرین تقدیر روافض پر چسپاں ہوتی ہے۔ شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ ارادہ خداوندی سے اس کا حکم مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ وہی کام کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔

بنا بریں یہ ثابت ہوا کہ تطہیر کا ارادہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شخص فی الواقع پاک بھی ہو جائے۔ شیعہ کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ کوئی کسی کو پاک کرے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو پاک کرنا چاہتے ہیں اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو پاک کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کسی کی تطہیر پر قادر نہیں ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول "بنی ہاشم پر صدقہ حرام ہے"۔ ہم کہتے ہیں کہ صرف فرض صدقات بنی ہاشم پر حرام ہیں۔ نفلی صدقات مباح ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بنی ہاشم وہ خیراتی پانی پی لیا کرتے تھے۔ جو مکہ و مدینہ کے مابین تقسیم کیا جاتا تھا اور کہا کرتے تھے کہ فرضی صدقات ہم پر حرام ہیں نفلی صدقات نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بنی ہاشم اجنبی لوگوں کے نفلی صدقات سے متمتع ہو سکتے تھے تو آنحضور کے صدقات سے نفع اندوز ہونا ان کے لیے بالاولیٰ روا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ مال زکوٰۃ نہ تھا۔ جسے لوگوں کی میل کچیل کہا گیا ہے اور جو بنی ہاشم پر حرام ہے بلکہ یہ وہ مال تھا جو کسی جہاد و قتال کے بغیر صلحاً آنحضور کو ملا تھا۔ یہ بنی ہاشم کے لیے حلال تھا اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم یہ سب مال صدقہ کردیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آپ کی ملکیت تھا اور آپ صدقہ کے طور سے اسے مسلمانوں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے اقارب صدقہ کے زیادہ مستحق تھے کیونکہ صدقہ مسلمانوں کے حق میں صرف صدقہ ہے اور اقارب کے حق میں صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی

شیعہ قلمکار نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت پر جو معارضہ کیا ہے ہم اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ حضرت جابر نے کسی غیر کے حق کا دعوی نہیں کیا تھا جو اس سے چھین کر ان کو دیا جائے۔ ان کا مطالبہ بیت المال سے تھا جو حاکم بآسانی آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کے بغیر بھی پورا کر سکتا ہے۔ آنحضور کے وعدہ کرنے کی صورت میں حاکم کے لیے اس مطالبہ کی تکمیل اولے یا لجوازہ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس میں گواہ کی ضرورت محسوس نہ کی اور اسی لیے حضرت ابوبکر و عمر حضرت علی و عباس اور دیگر بنی ہاشم کو بیت المال سے دیدیا کرتے تھے جیسے حضرت جابر کو دیا۔

رافضی مضمون نگار لکھتا ہے۔

اہل سنت ابوبکر کو خلیفہ رسول کہتے ہیں حالانکہ آپ نے اپنی زندگی میں اور بعد از وفات آپ کو اپنا خلیفہ (نائب و قائم مقام) مقرر نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اہل سنت علیؓ کو خلیفہ رسول نہیں کہتے حالانکہ آپ نے ان کو اپنی عدم موجودگی میں مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا اور فرمایا "میرے اور آپ کے سوا کوئی شخص حاکم مدینہ بننے کا اہل نہیں ہے"۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہؓ کو سالار لشکر مقرر فرمایا۔ اس لشکر میں ابوبکر و عمر بھی تھے۔ تاہم اہل سنت اسامہؓ کو خلیفہ کے لقب سے یاد نہیں کرتے۔ جب ابوبکر مسند خلافت پر فائز ہوئے تو اسامہؓ نے بگڑ کر کہا۔ مجھے آپ پر امیر بنایا گیا تھا۔ بتائیے آپ کو کس نے میرا حاکم بنایا؟ ابوبکر و عمر دونوں پاپیادہ اسامہ کے یہاں پہنچے اور ان کو راضی کیا۔

خلیفہ کی تعریف:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خلیفہ کا لفظ دو معنوں پر بولا جاتا ہے۔

(۱) جو کسی کا قائم مقام ہو اس کو خلیفہ کہتے ہیں جیسا کہ لغت میں معروف ہے۔
(۲) خلیفہ وہ ہے جس کو کوئی شخص اپنا نائب مقرر کرے۔ یہ روافض اور بعض ظاہریہ کا مسلک و مذہب ہے[1]

پہلے معنی کی بنا پر حضرت ابوبکر خلیفہ رسول تھے کیونکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ ان کے قائم مقام ہوئے اور آپ دوسروں کی نسبت اس منصب کے لیے موزوں تر تھے۔ لہٰذا آپ خلیفہ قرار پائے اور دوسرا کوئی شخص یہ مقام حاصل نہ کر سکا۔ شیعہ اور دیگر فرقوں میں سے کوئی بھی اس مسلّمہ صداقت کا منکر نہیں ہے کہ آنحضور کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ قرار پائے تھے۔ آپ نماز پڑھاتے[2]۔ شرعی حدود قائم کرتے اور صلح کی بنا پر حاصل کردہ مال مسلمانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کفار سے جہاد کرتے۔ عمال و امراء مقرر کرتے اور دیگر سیاسی امور انجام دیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بالاتفاق حضرت ابوبکر یہ جملہ امور انجام دیا کرتے تھے۔ لہٰذا بلانزاع آپ خلیفہ رسول تھے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

بعض اہل سنت دوسرے معنی کی بنا پر کہتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نص جلی یا خفی کے مطابق حضرت ابوبکر کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں نص جلی یا خفی کا یہ دعویٰ شیعہ کے اس دعویٰ سے اقویٰ واظہر ہے جو وہ خلافت علی سے متعلق نصوص کے بارے میں کرتے ہیں اس لیے کہ حضرت ابوبکر کے خلافت کے بارے میں کثیر التعداد نصوص وارد ہوئی ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت علی کی خلافت کے بارے میں وارد شدہ نصوص یا تو جھوٹی ہیں یا ان

---

[1] محدث ابن حزم اپنی کتاب "الامامۃ والمفاضلۃ" میں جو ان کی شہرہ آفاق تصنیف کتاب الفصل کی جلد چہارم میں شامل ہے صفحہ ۱۰۷ پر رقمطراز ہیں "اللہ تعالےٰ نے جن لوگوں کے صادق القول ہونے کی شہادت دی ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے انصاری بھائی اس امر میں متفق اللسان ہیں کہ حضرت ابوبکر خلیفہ رسول تھے۔ اور کسی شخص کا خلیفہ (قائم مقام) وہ ہوتا ہے جس کو وہ خود اپنا نائب مقرر کرے نہ وہ جو کہ از خود کسی کا قائم مقام بن جائے ۱۲

[2] حضرت علی دیگر لوگوں کی طرح حضرت ابوبکر کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے ۱۲

سے یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ بنا بریں یہ مسلمہ صداقت ہے کہ آنحضور نے اپنی موت کے بعد صرف حضرت ابوبکرؓ ہی کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ لہٰذا آنحضور کی وفات کے بعد صرف آپ ہی خلیفۂ برحق تھے۔ خلیفۂ مطلق وہ ہے جو آپ کی وفات کے بعد خلیفہ بنے یا آپ اپنی موت کے بعد اس کو خلیفہ مقرر کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں وصف حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ کسی اور میں موجود نہ تھے اور اسی بنا پر آپ خلیفہ برحق تھے۔

جہاں تک حضرت علی کو حاکم مدینہ مقرر کرنے کا تعلق ہے وہ اس بات میں منفرد نہ تھے۔ بلکہ مختلف اوقات میں دیگر صحابہ بھی اس منصب پر فائز ہوتے رہتے تھے۔ یہ واقعات ملاحظہ ہوں۔

(۱) جب آنحضورؐ بنی نضیر سے لڑنے کے لیے مدینہ سے باہر نکلے تو عبداللہ بن ام مکتوم کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔

لہ خلافت صدیقی میں جو مال بنا بر مصالحت بلا قتال و جدال بیت المال میں آتا تھا اس میں سے بنی حنیفہ کے قبیلہ کی ایک لونڈی بھی تھی۔ حضرت علی نے شرعی حکم کے مطابق حق ملکیت حاصل کر کے اسے اپنی لونڈی بنا لیا اور اس کے بطن سے ایک عالم باعمل اور صالح بیٹا محمد بن علی بن ابی طالب تولد ہوا جو بعد میں محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اگر حضرت علی کی رائے میں حضرت ابوبکر کی خلافت غیر شرعی ہوتی تو وہ لونڈی کو اپنے لیے حلال نہ سمجھتے۔ حرام و حلال عورتوں کے مابین فرق و امتیاز ایک طے شدہ بات ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ ایک مشہور ترین شیعہ عالم سید عبداللہ بن حسن سویدی نے ماہ شوال ۱۱۵۶ھ میں جب اکابر علماء شیعہ کی موجودگی میں اس سے احتجاج کیا تھا تو سب خاموش ہو گئے اور کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔ (دیکھیے رسالہ مؤتمر النجف ص ۳۱-۳۲) اگر شیعہ حق کے طالب ہوتے اور فتنہ پردازی ان کا مقصد نہ ہوتا تو مذکورہ دلیل اور دیگر سینکڑوں دلائل و براہین ان کے لیے وجہ اطمینان ہوتے۔ مگر شیعہ کا مقصد وحید مسلم معاشرہ میں شور و شر پیدا کرنا افکار باطلہ کی تشہیر دین حنیف کی تحریف و تغییر اور شریعت کے مآخذ و مصادر کی تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کا وجود انسانیت کے لیے ایک عظیم آفت سے کم نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ باطل کے پرستار ہیں اور باطل فنا پذیر ہوتا ہے بلکہ جو چیز بھی کذب و افترا پر مبنی ہو وہ بیکار اور عبث ہے۔۱۲

(۲) غزوہ ذات الرقاع کے لیے جاتے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاکمِ مدینہ قرار پائے۔

(۳) غزوہ بدر کے لیے تشریف لے گئے تو ابولبابہ بن عبد المنذر کو حاکم مدینہ مقرر کیا ظاہر ہے کہ یہ استخلاف مطلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصحاب میں سے کسی کو بھی خلیفہ نہیں کہا گیا۔ حضرت علی کو ہارونؑ سے تشبیہ صرف اصل استخلاف میں دی گئی ہے۔ کمال استخلاف میں نہیں۔ ورنہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے حاکم بنائے گئے تھے اس کے برخلاف حضرت علی جب مدینہ میں آنحضور کے قائم مقام قرار پائے تو اکثر لوگ وہاں سے آنحضور کی رفاقت میں جا چکے تھے اور حضرت علی کی خلافت محض عورتوں بچوں اور ضعیف

لہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد حضرت یوشع آپ کے قائم مقام قرار پائے تھے نہ کہ حضرت ہارون مزید براں یہ امر قابل غور ہے کہ ہارون نبی تھے اور علی نبی نہ تھے۔ ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے اور علی ان کے بھائی نہ تھے۔ مذکورہ فرق و امتیاز کے علاوہ اب یہ بات باقی رہی کہ غزوہ تبوک پر جاتے وقت آپ نے حضرت علی کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا جس طرح حضرت موسیٰ نے کوہ طور کو جاتے وقت حضرت ہارون کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اصل وجہ مشابہت و مماثلت صرف یہی امر ہے خاص مدینہ پر استخلاف کا شرف دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوا مگر کسی نے بھی ان کو آنحضور کا خلیفہ عام تصور نہ کیا۔ لطف یہ ہے کہ حضرت علی بھی اس غلطی میں کبھی مبتلا نہ ہوئے۔ علاوہ ازیں حدیث نبوی "اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ" محدثین کے نزدیک متنازع فیہ ہے بعض اسے صحیح کہتے ہیں اور بعض ضعیف (۱) امام ابوالفرج ابن الجوزی اس کو موضوع قرار دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ آنحضور نے جب حضرت علی کو حاکم مدینہ مقرر کیا تو آپ نے اس پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا "کیا آپ مجھے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں"۔ یہ سنکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مطمئن کرنے کیلئے فرمایا اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ اگر حضرت علی کا یہ استخلاف ان کے لیے موجب مدح و منقبت ہوتا تو جیسے کہ شیعہ کا خیال ہے تو اس بات پر اظہار ناراضگی کرنے کی بجائے ان کو خوش ہونا چاہئے تھا حالانکہ یہ بات حضرت علی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اہل سنت و شیعہ کے مابین جملہ اختلافی مسائل میں شیعہ کا طرز فکر ہمیشہ حضرت علی اور ابناء علی سے مختلف ہوتا ہے اگر کوئی شخص سعی کامل کو کام میں لا کر ایسے مسائل تلاش کرنا چاہے جن میں شیعہ نے علماء اہل بیت کی مخالفت کی ہے تو ان سے ایک بڑی کتاب مرتب کی جا سکتی ہے ۱۲

لوگوں کے لیے باقی رہ گئی تھی۔

شیعہ مصنف کا قول "اِنَّ الْمَدِیْنَۃَ لَا تَصْلُحُ اِلَّا بِیْ اَوْ بِکَ" صریح کذب اور موضوع روایت ہے۔ حضرت علی آنحضور کے ساتھ بدر و خیبر اور حنین کے غزوات میں شریک رہ چکے تھے اور ان دنوں آپ کی عدم موجودگی میں دیگر صحابہ مدینہ میں آپ کے قائم مقام تھے۔

---

[1] شیعہ نے سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم اور مشاہیر اسلام پر افترا پردازی کے جو طریقے رائج کر رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی معروف حدیث کے اصل الفاظ میں بقدر ضرورت اضافہ کر لیتے ہیں اس کی مثال مذکورہ صدر حدیث ہے۔ بعض اوقات شیعہ یوں کرتے ہیں کہ حدیث کا جو حصہ مفید مطلب ہوتا ہے لے لیتے ہیں اور جو جزو ان کے خلاف پڑتا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں اس کی مثال قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ جب حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا۔

"فاطمہ میرا جگر پارہ ہے جو اسے ایذا دیتا ہے وہ مجھے دکھ پہنچاتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ علی میری بیٹی کو طلاق دے کر ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کر لے" (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے حضرت علی کے غیر معصوم ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے اور یہ بات شیعہ کے خلاف ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت علی سے ایسی خطا سرزد ہو سکتی ہے جس پر آنحضور اس پر اظہار ناراضگی فرمائیں شیعہ تجاہل عارفانہ سے کام لے کر حدیث کے اس ٹکڑا کو چھپانے کی کوشش کرتے اور اس حدیث کے دوسرے حصہ "اِنَّمَا فَاطِمَۃُ بُضْعَۃٌ مِّنِّیْ" کو امکانی حد تک اچھالنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ شیعہ حدیث کے اس ٹکڑا کو باقی حدیث سے الگ کر کے بیان کرتے اور بے محل و مقام اس کو بڑھا چڑھا کر ذکر کرتے رہتے ہیں۔ شیعہ کی دروغگوئی و تحریف کی مثالیں کوئی کہاں تک گنے یہ ایک جداگانہ تصنیف کی متقاضی ہیں اسلامی تاریخ اور مشاہیر اسلام پر شیعہ نے جو مظالم ڈھائے ہیں اس کا دائرہ اس سے بھی وسیع تر ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ ہمارا تاریخی ذخیرہ بھی اس وبا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس سے امت مسلمہ کو بڑا نقصان پہنچا۔

حال ہی میں مسلم نوجوانوں نے اس جانب توجہ مبذول کر کے ایسے واقعات کو چھانٹ کر الگ کر دیا ہے۔ و للہ الحمد ۱۲۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں شامل ہی نہ تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز مرض ہی سے ان کو امامت نماز کا منصب تفویض فرمایا تھا۔ مزید براں امراء لشکر مثلاً حضرت اسامہ وغیرہ کو خلیفہ[1] کے لقب سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ اس لیے کہ وہ نہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کے نائب قرار پاتے اور نہ آپ کی زندگی ہی میں ہر چیز میں آپ کے قائم مقام تھے۔

شیعہ کا ایک اور جھوٹ

حضرت اسامہ کے ناراض ہونے کا واقعہ بھی صریح کذب ہے اس لیے کہ اسامہ تفرق و اختلاف کے خوگر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی و معاویہ کی لڑائی میں وہ غیر جانب دار رہے[2]۔ علاوہ ازیں آپ قریشی نہ تھے اور کسی اور وجہ سے بھی خلافت کے لیے موزوں نہ تھے۔ بفرض محال اگر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ کو حضرت ابوبکر پر حاکم بنایا تھا پھر آپ نے وفات پائی اور ابوبکر خلیفہ بنائے گئے۔ تو اب لشکر کو بھیجنا نہ بھیجنا اور امراء کا عزل ونصب خلیفہ کے ہاتھ میں[3] تھا۔ یہ ایسی بات ہے کہ ایک جاہل شخص ہی اس سے منکر ہو سکتا ہے۔

افتراء پردازوں کا یہ قول موجب حیرت واستعجاب ہے کہ

'ابوبکر و عمر چل کر گئے اور اسامہ کو راضی کیا'۔

دوسری جانب شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ابوبکر و عمر نے حضرت علی و عباس بنی ہاشم و بنی عبد مناف کو مغلوب کر لیا تھا اور ان کو راضی نہ کیا۔ مقام حیرت ہے کہ جب ابوبکر و عمر اشراف قریش کو راضی

---

[1] ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ اس لیے کہ وہ آنحضور کی جانب سے سریۃ ذات السلاسل میں امیر لشکر مقرر ہوئے تھے اور بڑے بڑے صحابہ مثلاً ابوبکر و عمر و ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم آپ کے تابع فرمان تھے ۱۲

[2] صحابہ میں سے حضرت عبد اللہ بن عمر، محمد بن مسلمہ، ابو موسیٰ اشعری اور ابوبکرہ رضی اللہ عنہم بھی غیر جانبدار رہے تھے ۱۲

[3] اس لیے کہ عالم اسلامی مصالح حالات کے بدل جانے سے تبدیل ہو جاتے ہیں اگر اسلام کو حضرت اسامہ یا ان کے لشکر کی کسی اور سلسلہ میں ضرورت لاحق ہوتی تو اسلامی مصلحت کو ہر چیز پر مقدم رکھا جاتا ۱۲

کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو انھیں کیا پڑی تھی کہ ایک انیس سالہ مفلس وقلاش اور بے یار ومددگار نوجوان کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کرتے۔ اگر شیعہ کہیں کہ اسامہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے محبت تھے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ تم دوسری جانب یہ بھی تو کہتے ہو کہ ابوبکرو عمر نے آنحضور کے عہد ووصیت کو بدل ڈالا تھا۔ بھلا جو شخص آپ کے عہد وپیمان کو خاطر میں نہیں لاتا وہ آپ کی دوستی کی کیا پرواہ کرے گا۔

شیعہ قلمکار لکھتا ہے۔

"اہل سنت عمر کو فاروق کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر حضرت علی کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے۔ حالانکہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کی شان میں فرمایا تھا۔ "ھٰذَا فَارُوْقُ اُمَّتِی"۔"

ہم جواباً کہتے ہیں کہ یہ شیعہ کی پہلی جھوٹی حدیث نہیں بلکہ وہ متعدد جھوٹی حدیثیں وضع کر چکے ہیں۔ ہمیں اس حدیث کی کوئی سند معلوم نہیں۔ حضرت علی کے ساتھ شیعہ کی محبت اسی نوع کی ہے جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام سے نصاریٰ کی محبت جس طرح نصاریٰ حضرت عیسٰی کے خدادادمرتبہ پر راضی نہ تھے اور انھوں نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا اسی طرح شیعہ بھی حضرت علی کی شان میں اغراق وغلو سے کام لیتے ہیں مذکورہ بالا بیان سے اس حدیث کی وضاحت ہو جاتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا کہ صرف مومن ہی تجھ سے محبت کرے گا اور صرف منافق ہی تجھ سے بغض وعداوت رکھے گا (صحیح مسلم)

روافض صحیح معنی میں حضرت علی سے دوستی نہیں رکھتے بلکہ ایک اعتبار سے وہ ان سے بغض وعداوت رکھتے ہیں جس طرح یہود ونصاریٰ آنحضور پر ایمان لانے والوں کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے حالانکہ موسیٰ وعیسٰی علیہما السلام آپ کی رسالت ونبوت کے معترف تھے۔ اسی طرح حضرت علی حضرت ابوبکر وعمر کے ساتھ الفت ومحبت رکھتے تھے مگر شیعہ اس کے باوصف ان سے عداوت رکھتے ہیں بنا بریں وہ آنحضور کے اس قول میں داخل ہیں۔ کہ "صرف منافق ہی آپ سے بغض رکھے گا"۔ علی ہذا القیاس جو شخص بھی کسی بزرگ سے ایسی صفت

کی بناپر محبت رکھتا ہے جو فی الواقع اس میں نہیں پائی جاتی تو گویا وہ اس سے عداوت رکھتا ہے
مثلاً کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا مرشد اپنے تمام مریدوں کی سفارش کرے گا۔ اسے رزق
پہنچائے گا۔ اس کی مدد کرے گا۔ اس کی مشکلات کو دور کرے گا یا اس کی حاجات و ضروریات
پوری کرے گا۔

یا وہ یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا شیخ عالم الغیب ہے۔

سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"جو شخص اللہ تعالے اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ انصار کا دشمن نہیں ہو سکتا"
آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ کے لیے یہ
دعا فرمائی تھی کہ "اللہ تعالے مومنین کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دے"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ منافق کو صرف بغض علی کی بنا پر پہچانا
کرتے تھے۔

علامات نفاق

ہر عالم جانتا ہے کہ یہ صریح کذب ہے۔ نفاق کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انصار سے عداوت رکھنا علامت نفاق ہے"۔

آپ نے یہ بھی فرمایا۔ "منافق کی تین نشانیاں ہیں"۔ یہ طویل حدیث کتب حدیث میں مذکور
ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا (سورۃ
توبہ - ۵۸)

(ان (منافقین) میں سے وہ بھی ہیں جو صدقات کے بارے میں آپ کو طعن دیتے ہیں اگر ان کو صدقات
دے جائیں تو وہ راضی ہو جاتے ہیں)

نیز فرمایا۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ (توبہ - ۵۸) (منافقین میں سے وہ بھی ہیں جو نبیؐ کو ایذا دیتے ہیں)

ارشاد ہوتا ہے

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي (توبہ - ۴۹)

منافقین میں سے بعض کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجئے

دوسری جگہ فرمایا

أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا (توبہ - ۱۲۴)

اس آیت نے کس کے ایمان میں اضافہ کیا

خداوند کریم نے سورۂ توبہ اور دیگر مقامات پر منافقین کے جو علامات بیان کیے ہیں انھیں یہاں تفصیلاً بیان نہیں کیا جا سکتا۔ شیعہ نے جو جھوٹی روایت ذکر کی ہے اگر اس کے الفاظ یہ ہوتے کہ ہم منافقین کو بغض علی کی بنا پر پہچان لیا کرتے تھے۔ تو بھی ایک بات تھی۔ جس طرح بغض انصار کو علامت نفاق قرار دیا بلکہ حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر صحابہ کے بغض کو بھی نفاق کی علامت ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو شخص دانستہ اس چیز کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے ساتھ آپ محبت رکھا کرتے تھے اس کا بغض و عناد بلاشبہ علامات نفاق میں سے ایک علامات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر سے بغض رکھنے والے سب سے بڑے منافق سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ صحابہ میں کوئی شخص بھی آنحضور کو حضرت ابوبکر سے عزیز تر نہ تھا اور نہ ہی صحابہ میں کوئی شخص آنحضور کو حضرت ابوبکر سے زیادہ چاہنے والا تھا اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بغض و عناد رکھنا نفاق کی عظیم ترین علامت ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکر سے عناد رکھنے والے نصیریہ اور اسمٰعیلیہ سب سے بڑے منافق ہوتے ہیں۔

شیعہ مصنف کا یہ قول۔ "اہل سنت حضرت عائشہ کی عظمت و فضیلت کے قائل ہیں حالانکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اکثر حضرت خدیجہ کو یاد فرمایا کرتے تھے"۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اہلسنت حضرت عائشہ کے سب ازواج سے افضل ہونے کے بارے میں متحد الخیال نہیں ہیں۔ جو لوگ حضرت عائشہ کی افضلیت کے قائل ہیں وہ یہ حدیث نبوی پیش کرتے ہیں۔

"عائشہ باقی عورتوں پر اسی طرح فضیلت رکھتی ہیں جیسے ثرید (گوشت میں بھگوئی ہوئی روٹی) باقی کھانوں سے افضل ہے"۔ (بخاری مسلم)

حضرت عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا حضور! ازواج مطہرات میں سے آپ کو کون عزیز تر ہے؟ آپ نے جواباً فرمایا۔ "عائشہ"۔ میں نے عرض کیا اور مردوں میں سے آپ کس کے ساتھ زیادہ محبت رکھتے ہیں؟ فرمایا "ابوبکر کے ساتھ"۔ میں نے عرض کیا ان کے بعد اور کس سے؟ فرمایا عمر کے ساتھ۔ اس کے بعد عمرو بن العاص دریافت کرتے چلے گئے اور آنحضور نے درجہ بدرجہ متعدد صحابہ کا ذکر کیا۔

حضرت خدیجہ کی شان میں جو وارد ہے کہ

"مَا اَبْدَلَنِیَ اللّٰہُ خَیْرًا مِنْھَا" (اللہ تعالیٰ نے خدیجہ کے عوض مجھے ان سے بہتر بیوی عطا نہیں کی)

حضرت عائشہ کی افضلیت کا عقیدہ رکھنے والے بشرط صحت اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہ کے ذریعہ آپ کو جو فائدہ پہنچا تھا وہ نفع کسی اور سے حاصل نہیں ہوا۔ حضرت خدیجہ کے افضل ہونے کا پہلو گویا یہ امر ہے کہ آپ نے آڑے وقت میں آنحضور کی مدد کی۔ اس کے عین برخلاف حضرت عائشہ کو رفاقت نبوی کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی جب نبوت پایۂ نبوت کو پہنچ چکی تھی اور دین حق تکمیل کے آخری مدارج طے کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو علم و ایمان کی وہ دولت نصیب ہوئی جو آغاز اسلام والوں کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔ اس اعتبار سے حضرت عائشہ حضرت خدیجہ سے افضل ٹھہریں۔

امت محمدی بڑی حد تک حضرت عائشہ کے علم و فضل سے متمتع ہوئی اور آپ نے علم و عمر دونوں سے حظ وافر پایا۔ گویا حضرت خدیجہ کی افضلیت صرف آنحضور تک محدود ہے۔ نہ آپ کو تبلیغ احکام کا شرف حاصل ہوا اور نہ امت آپ سے نفع اندوز ہو سکی جبکہ حضرت عائشہ سے امت کو بڑا فائدہ پہنچا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دین اسلام اس وقت تکمیل کو نہیں پہنچا تھا اور ابھی ان کمالات کی تحصیل کا وقت نہیں آیا تھا جو بعد میں آپ نے

والے لوگوں نے حاصل کیے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ جو شخص اپنی توجہات کو ایک ہی بات پر مرکوز کر دے وہ اس کی نسبت بہتر ہوگا جس نے مختلف امور و اعمال کو اپنی نظر و فکر کی آماجگاہ بنا رکھا ہو۔ یہ ہے حضرت خدیجہ کی افضلیت کی وجہ وجیہ! مگر معاملہ یہ ہے کہ نیکی کے جملہ اقسام افضلیت کے اس پہلو میں محصور و محدود نہیں ہیں۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ صحابہ کرام میں سے جو لوگ ایمان و جہاد میں پیش پیش تھے مثلاً حضرت حمزہ، علی، سعد بن مُعاذ، اُسیدؓ بن حُضَیر رضوان اللہ علیہم وہ ان لوگوں کی نسبت افضل تھے جو آنحضور کی خدمت و نفع رسانی میں ان سے سبقت لے گئے تھے۔ مثلاً ابو رافع اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما۔

بہرکیف یہاں حضرت عائشہ و خدیجہ کی افضلیت کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں اصلی مقصد یہ بتانا ہے کہ اہل سنت حضرت عائشہ کی تعظیم و تکریم کے بارے میں متفق اللسان ہیں۔ نیز یہ کہ جملہ ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کو عزیز تر تھیں اور مسلمان بھی جملہ امہات المؤمنین میں سے ان کا زیادہ اکرام و احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔

روایات صحیحہ میں موجود ہے کہ صحابہ دانستہ حضرت عائشہ کی باری کے دن آنحضور کی خدمت میں تحائف بھیجا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ دیگر ازواج آپ کو رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور

سلہ یہ انصار کے قبیلہ بنی عبدالاشہل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد قبیلہ اوس کے مشہور شہسوار اور جنگ بُعاث میں سالار لشکر تھے۔ اسید سابقین اولین میں سے تھے۔ یہ حضرت مصعب بن عمیر کے ہاتھ پر حضرت سعد بن معاذ سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے یہ لیلۃ العقبہ کے نقبا میں سے ایک تھے۔ یہ زندگی بھر شرافت کا مجسمہ رہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسید کو زید بن حارثہ کا بھائی قرار دیا تھا۔ یہ غزوہ احد میں ثابت قدم رہے اور ان کے جسد اقدس پر سترہ زخم آئے۔ یہ خلافت فاروقی تک بقید حیات رہے اور حضرت عمر کے ساتھ بیت المقدس کی فتح کے وقت وہاں موجود تھے۔ سرور کائنات نے ان کی مدح میں فرمایا "اسید بہت اچھے آدمی ہیں"۔ جس طرح عمرو بن العاص کی مدح میں فرمایا تھا "عبد اللہ کے سب گھر والے اچھے ہیں۔ عبد اللہ۔ ابو عبد اللہ اور ام عبد اللہ سب نیک لوگ ہیں"۔ اسید فوت ہوئے تو حضرت عمر نے نعش اٹھانے میں حصہ لیا اور بقیع میں مدفون ہوئے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بارگاہ نبوی میں بھیجا۔ حضرت فاطمہ نے عرض کیا۔ آپ کی بیویاں ابوبکرؓ کی بیٹی کے بارے میں عدل و انصاف کا تقاضا کرتی ہیں"۔

آپ نے حضرت فاطمہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"پیاری بیٹی! جس سے مجھے محبت ہے کیا تو اسے محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی؟"

حضرت فاطمہ نے عرض کیا "کیوں نہیں"۔ آپ نے حضرت عائشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "تو اس سے محبت رکھیے"۔ (بخاری و مسلم)

حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "عائشہ جبریل آپ کو سلام کہتے ہیں"۔ حضرت عائشہ نے کہا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں ہم کو نظر نہیں آتا (بخاری و مسلم)

سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت سودہ[1] بنت زمعہ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا

---

[1] ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ قریش کے قبیلہ بنی عامر سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ اولین بیوی ہیں جن کو حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد آپ اپنے نکاح میں لائے۔ حضرت عائشہ و سودہ کے ساتھ ایک ہی وقت میں عقد باندھا گیا تھا۔ حضرت عائشہ اس وقت کم سن تھیں اس لیے حضرت سودہ ان سے پہلے آپ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو عرض کیا۔ مجھے خاوند کی حاجت نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میں بروز قیامت آپ کی بیوی کی حیثیت سے اٹھائی جاؤں"۔ جب انھوں نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ کو دیدیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

"فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ"

حضرت عائشہ حضرت سودہ کے بارہ میں فرماتی ہیں۔

"سودہ کے سوا دوسری کوئی عورت نہیں جس کے بارے میں میری یہ خواہش ہو کہ میں اس کی کھال میں داخل ہو جاؤں (اپنے آپ کو اس سے تبدیل کر لوں)

خلافت فاروقی میں جب بلا جنگ و قتال بہت سامال آیا تو حضرت عمر نے حضرت سودہ کی خدمت میں ایک تھیلا درہموں سے بھر کر بھیجا۔ حضرت سودہ نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ جواب ملا "درہم"۔ آپ نے فرمایا "یہ تو کھجوروں کے تھیلے کی طرح بھرا ہوا ہے"۔ یہ کہہ کر آپ نے وہ سب درہم تقسیم کر دیے ۱۲

تو انھوں نے آپ کی اجازت سے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ کو دے دیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں مبتلا تھے تو حضرت عائشہ کے باری کے دن کا بےتابانہ انتظار کرتے اور فرمایا کرتے تھے "میں آج کا دن کہاں گذاروں گا"۔ پھر سب ازواج مطہرات نے حضرت عائشہ رض کے گھر میں قیام کی اجازت دیدی۔ آپ آخر دم تک وہاں مقیم رہے۔

آپ نے اپنے اور حضرت عائشہ کے لعاب دہن کو یکجا کیا اسی دوران حضرت عائشہ کی آغوش میں عالم آخرت کو سدھارے۔ حضرت عائشہ کا وجود مسعود امت کے لیے لاتعداد فوائد و برکات کا موجب ہوا۔ جب حضرت عائشہ کی وجہ سے آیت تیمم نازل ہوئی تو حضرت اُسَید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا

"آل ابی بکر! یہ تمہاری اولیں برکت نہیں ہے اے عائشہ! تم پر جو مصیبت بھی نازل ہوتی اسے اللہ تعالے نے خیر و برکت کا موجب بنایا"۔

قبل ازیں آیت براءت نازل ہو چکی تھی۔ جب منافقین نے آپ پر تہمت لگا کر آپ کی زندگی کو داغدار کرنا چاہا تو آسمان سے آپ کی براءت نازل ہوئی اور آپ کو پاک دامن قرار دیا

رافضی مصنف لکھتا ہے۔

"عائشہ نے آنحضور کا وہ راز افشا کر دیا جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے" وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا۔ (سورۂ تحریم۔۳) صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ راز افشا کرنے والی حضرت عائشہ و حفصہ تھیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عائشہ سے کہا تھا کہ تو علی سے لڑے گی اور تو ظالم ہوگی۔

اللہ تعالے نے ازواج النبی کو حکم دیا تھا

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (احزاب۔۲۳) (اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو)

عائشہ نے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی اور ایک جماعت کی رفاقت میں حضرت علی سے لڑنے کے لیے نکلیں۔ اس لیے کہ سب مسلمانوں نے عثمان کے قتل پر اتفاق کر لیا تھا۔ عائشہ ہمیشہ حضرت علی کو قتل کرانے کی سازش کرتی رہتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ "بوڑھے احمق کو تہ تیغ کر دو"۔ طلحہ، زبیر اور دس ہزار مسلمانوں کو کیونکر زیب دیتا تھا کہ وہ ان کے زیر اثر حضرت علی کے خلاف

نبرد آزما ہوتے۔ بروز قیامت یہ لوگ آنحضور کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی کے ساتھ بات چیت کرے۔ اور سفر میں اسے اپنے ہمراہ لے جائے تو اس عورت کا خاوند اس کا انتہائی دشمن بن جائے گا۔ موجب حیرت تو یہ امر ہے کہ یہ سب لوگ حضرت علی کے خلاف عائشہ کے ساتھ متحد ہو گئے مگر جب حضرت فاطمہ ابوبکر کے پاس اپنا حق طلب کرنے گئیں تو کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کا زاویۂ نگاہ مبنی بر عدل و انصاف اور تناقض سے پاک ہے۔ اس کے برخلاف روافض و مبتدعین کے افکار و آراء میں تناقض پایا جاتا ہے۔

جنتی ہونے کے لیے معصومیت شرط نہیں

اہل سنت کے نزدیک بدری صحابہ اور سب امہات المومنین قطعی جنتی ہیں۔ اہل سنت کا زاویۂ فکر یہ ہے کہ جنتی ہونے کے لیے گناہ و خطا سے پاکیزہ ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ کوئی شخص صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر کے توبہ کر لے۔ یہ مسئلہ اہل سنت کے یہاں متفق علیہا ہے۔ اگر توبہ نہ بھی کرے تو صغیرہ گناہ کبائر سے اجتناب کرنے کی بنا پر بھی معاف کر دئے جاتے ہیں۔ یہ جمہور کا مذہب ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک کبائر اعمال صالحہ بلکہ حوادث و آلام میں گرفتار ہونے کی بنا پر بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔

بنا بریں اہل سنت کہتے ہیں کہ صحابہ کی جو برائیاں بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر جھوٹ ہیں اور اکثر ان کے اجتہاد پر مبنی ہیں۔ مگر ہمیں وجہ اجتہاد معلوم نہیں۔ صحابہ کے مفروضہ گناہوں میں سے بعض توبہ کی بنا پر اور بعض اعمال صالحہ اور حوادث روزگار یا کسی اور وجہ سے معاف کیے جا چکے ہیں۔ اس کی دلیل وہ احادیث ہیں جن سے ان کا جنتی ہونا ثابت ہوتا ہے لہٰذا وہ ایسے افعال کا ارتکاب نہیں کر سکتے جو دوزخ میں جانے کے موجب ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب انھوں نے موجبات نار سے اپنا دامن بچائے رکھا تو وہ یقیناً جنتی ٹھہرے گے

وثوق و یقین سے یہ جاننے کے باوجود کہ صحابہ قطعی جنتی ہیں ہمیں کسی متعین صحابی کے جنتی ہونے کا علم حاصل نہیں۔ تاہم ہم غیر یقینی امور کی بنا پر صحابہ کے جنتی ہونے کی نفی نہیں

کر سکتے۔ بلکہ عام مومنین کے جنتی ہونے کی نفی کرنا بھی جائز نہیں۔ اسی طرح صرف احتمال کے بل بوتے پر کسی کو دوزخی قرار دینا بھی ناروا ہے۔ خصوصاً صلحاء کے بارے میں ایسی بات کہنا بڑی مذموم حرکت ہے۔ کسی فرد واحد کے ظاہر و باطن اور اعمال صالحہ و سیّئہ کی تفصیلات معلوم کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ اس لیے اس ضمن میں کوئی فیصلہ صادر کرنا بلا علم و دلیل ہے اور کلام بلا علم حرام ہے۔ اسی بنا پر مشاجرات صحابہ سے زبان کو روکنا اس ضمن میں اظہار خیال سے افضل ہے اس لیے کہ یہ کلام بلا علم ہے جو کہ حرام ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ ساتھ ہوائے نفس اور دفع حق بھی شامل ہو۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

قاضی تین ہیں ان میں سے دو قاضی جہنمی اور ایک جنتی ہے

(۱) جو قاضی حق کو معلوم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرے وہ جنتی ہے۔

(۲) وہ قاضی جو حق سے آگاہ ہو اور دانستہ اس کے خلاف فیصلہ کرے وہ دوزخی ہے۔

(۳) جو شخص جہالت کی بنا پر فیصلہ کرے وہ جہنمی ہے۔

جب قلیل و کثیر مالی معاملات میں فیصلہ صادر کرنا اس قدر اہم ہوا تو مشاجرات صحابہ میں زبان کھولنا کس قدر نازک کام ہوگا۔

نظر بریں جو شخص جہالت کی بنا پر اپنے علم کے خلاف اس موضوع پر زبان سخن دراز کرتا ہے تو وہ سخت وعید کا مستوجب ہے۔ اور اگر کوئی شخص ہوائے نفس یا معارضۂ حق کے لیے یہی بات کہتا ہے وہ بھی ذم و عقاب کا مستحق ہے۔

جو شخص کتاب و سنت کی روشنی میں صحابہ کے فضائل و مناقب ان کے جنتی ہونے نیز اس بات سے آگاہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام سے رضامندی کا اظہار کیا اور ان کو خیر الامۃ قرار دیا ہے۔ وہ ان یقینی امور کو ترک کر کے درج ذیل مشتبہ امور کو خاطر میں نہیں لائے گا یہ مشتبہ امور حسب ذیل کیفیت کے حامل ہیں۔

(۱) صحابہ سے متعلق بعض شبہات کی صحت معلوم نہیں۔

(۲) بعض شبہات صریح کذب ہیں۔

(۳) بعض کا وقوع پذیر ہونا سب سے معلوم ہی نہیں۔
(۴) بعض شبہات کا عذر سب کے نزدیک مسلّم ہے۔
(۵) بعض امور ایسے ہیں کہ صحابہ کا ان سے تائب ہونا سب کو معلوم ہے۔
(۶) صحابہ کی بعض برائیوں کو ان کی نیکیوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ جو شخص اہل سنت کی راہ پر گامزن ہوگا۔ وہ مسلک استقامت و اعتدال کا سالک ہوگا ورنہ شیعہ کی طرح قعر جہالت و ضلالت میں جا گرے گا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت عائشہ نے آنحضور کا راز منکشف کر دیا تھا"۔

پہلا جواب:۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جن نصوص قرآنیہ میں صحابہ کی بعض لغزشوں کا ذکر ہے۔ شیعہ ان کی تاویلات کر کے ان کو نمایاں کرنا چاہتے تھے۔ اہل سنت ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ صحابہ نے ان سے توبہ کر لی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کے درجات بلند کر دیئے۔ شیعہ نے افشائے راز کے بارے میں جو آیت ذکر کی ہے وہ اس نوع کی پہلی آیت نہیں ہے اور دیگر آیات کی طرح اس کی تاویل بھی ممکن ہے۔

دوسرا جواب:۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بفرض محال اگر حضرت عائشہ و حفصہ نے کوئی گناہ کیا بھی تھا تو حسب ذیل آیت کریمہ کے مطابق اس سے تائب ہو گئی تھیں۔ قرآن میں فرمایا۔

اِنْ تَتُوْبَا اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تحریم۔۴)

مذکورہ صدر آیت میں ان کو توبہ کی دعوت دی گئی ہے۔ حضرت عائشہ و حفصہ کی عظمت شان کے پیش نظر یہ بدگمانی درست نہیں کہ انہوں نے توبہ نہیں کی ہوگی۔ مزید برآں ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آپ جنت میں بھی آپ کی زوجیت سے مشرف ہوں گی۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دیا تھا کہ دنیا کی زیب و زینت یا اللہ و رسول اور دار آخرت میں سے جس کو چاہیں منتخب کریں۔ انہوں نے اللہ و رسول اور دار آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دی۔ انہی خصوصیات کا تقاضا تھا کہ ان کے عوض دوسری ازواج سے نکاح کرنے کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ اور ان کے علاوہ دیگر مستورات کو نکاح میں لانے کی بھی ممانعت کر دی

گئی تھی۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کی ازواج بنص قرآنی امہات المومنین کا درجہ رکھتی تھیں۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ توبہ نیز اعمال صالحہ اور مصائب مکفرہ سے بھی گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا جواب :۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے بارے میں جن گناہوں کی نشاندہی کی جاتی ہے وہ اسی طرح ہیں جیسے اہل بیت و صحابہ میں سے مشہود لہم بالجنۃ کی جانب بعض گناہوں کی نسبت کی جاتی ہے۔ حضرت علی نے جب ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تو آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے علی کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ واضح ہو کہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے البتہ اگر علی چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح باندھ لے۔ فاطمہ میرا جگر پارہ ہے جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے دکھ پہنچتا ہے"۔

یہ سوء ظن بے بنیاد ہے کہ حضرت علی نے ظاہری طور پر بنت ابی جہل سے نکاح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ حق یہ ہے کہ آپ نے خلوص دل سے توبہ کی تھی۔ اسی طرح جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں کفار کے ساتھ مصالحت کی تو صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اونٹوں کو نحر کیجئے اور سر منڈائیے"

یہ حکم سن کر جب کوئی صحابی نہ اٹھا اور آپ ناراض ہو کر ام سلمہ کے پاس گئے۔ تو انھوں نے کہا "جس نے آپ کو ناراض کیا خدا اسے ناراض کرے۔ آپ نے فرمایا۔

میں کیونکر ناراض نہ ہوں میں ایک حکم صادر کرتا ہوں اور کوئی شخص اس کی اطاعت نہیں کرتا"۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا حضور اپنی قربانی منگوا کر نحر کیجئے اور حجام کو طلب کر کے سر منڈوائیے"۔

اسی دوران آپ نے حضرت علی کو دستاویز سے اپنا نام محو کرنے کا حکم دیا تو حضرت

علی رضؓ نے کہا۔

"بخدا میں آپ کا نام نہیں مٹاؤں گا"۔

چنانچہ آنحضورؐ نے دستاویز لے کر اپنا نام مٹا دیا۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ واقعات میں ارشاد حضورؐ کی تعمیل سے حضرت علی اور دیگر صحابہ کا اس حد تک پس وپیش کرنا کہ آنحضورؐ ناراض ہو گئے اگر کسی کے نزدیک گناہ ہو تو جو جواب اس کا ہے وہی حضرت عائشہ کے واقعہ کا جواب ہے۔ بعض لوگ تاویل کی پناہ لے کر کہتے ہیں کہ صحابہ نے تعمیل ارشاد میں اس لیے دیر لگائی کہ ان کو مکہ میں داخل ہونے کی امید تھی۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہوتی تو آپ کے برہم ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بخلاف ازیں صحابہ نے بارگاہ ایزدی سے اس تاخیر کی معافی طلب کی تھی۔ حالانکہ بلا توبہ اعمال صالحہ سے بھی ایسے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خود حضرت علی بھی تاخیر کرنے والوں میں شامل تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

شیعہ مصنف کا قول "عائشہ حضرت علی سے لڑنے گئی تھیں"۔ صریح کذب ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کے مابین صلح کرانے کے جذبہ سے باہر نکلی تھیں[1]۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی بہبود و مصلحت

---

[1] مورخہ ۲۵ ذو الحجہ ۳۵ھ بروز جمعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہونے اسی وقت سے اہالیان مدینہ متوقع تھے کہ حضرت علی سابقہ خلفاء ثلاثہ کی طرح مدینہ طیبہ کو اپنا دار الخلافہ قرار دیکر قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر حد شرعی قائم کریں گے۔ کامل تین ماہ گذرنے کے بعد ربیع الاول ۳۶ھ میں حضرت علی عازم عراق ہوئے تا کہ ملک شام سے زیادہ دور نہ رہیں۔ حضرت حسن بن علی رضؓ کی دلی تمنا یہ تھی کہ ان کے والد ان کے پیشرو خلفاء ثلاثہ کی طرح مدینہ ہی کو اپنا مستقر قرار دیں (دیکھئے تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۷۱) قاتلین عثمان زیادہ تر کوفہ و بصرہ کے رہنے والے تھے اور وہ آپ کے لشکر میں شامل تھے کوفہ و بصرہ پہنچ کر ان کی قوت اور بڑھ گئی اور ان کے قبائل ان کی امداد کے لیے تیار ہو گئے۔ تاریخ اسلام کے اوراق اس امر کے زندہ گواہ ہیں کہ حضرت علی قاتلین حضرت عثمان سے براءت کا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ اور ان کے رفقاء قاتلین عثمان سے قصاص لینے کی اساس پر حضرت علیؓ (باقی بر صفحہ ۳۲۴)

کا تقاضا یہی ہے۔ لبعد ازاں معلوم ہوا کہ مدینہ سے نکلنا ان کے لیے موزوں نہ تھا۔ چنانچہ ان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) سے مفاہمت کے خواہاں تھے۔ حضرت علی اور حضرت عائشہ کے رفقاء کے مابین مشہور صحابی قعقاع بن عمرو تمیمی صلح کی سعی کر رہے تھے۔ مصالحت سے متعلق مساعی بار آور ہو رہی تھیں۔ اندریں اثناء حضرت علی نے حضرت طلحہ و زبیر کے نام پیغام بھیجا جس میں کہا

"قعقاع بن عمرو کے ساتھ آپ نے جو گفتگو کی تھی اگر اس پر قائم ہو تو ذرا انتظار کیجئے تاکہ ہم اتر کر اس معاملہ پر غور کر لیں"۔

اس کے جواب میں ہر دو اصحاب نے یہ پیغام بھیجا۔

"ہم نے قعقاع بن عمرو کے ساتھ مصالحت کی جو گفتگو کی تھی ہنوز اس کے پابند ہیں"۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

حضرت علی و عائشہ کے رفقاء ہر طرح مطمئن اور پرسکون تھے۔ جب رات ہوئی تو حضرت علی نے عبد اللہ بن عباس کو حضرت عائشہ کے رفقاء سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا۔ ادھر حضرت عائشہ نے محمد بن طلحہ سجاد کو قاصد بنا کر حضرت علی کی خدمت میں روانہ کیا۔ فریقین صلح کی امید لگائے بیٹھے تھے یہ رات سب راتوں کی نسبت زیادہ اطمینان و عافیت سے گذری۔

دوسری جانب قاتلین عثمان رات بھر جاگتے اور لڑائی کی تدبیریں کرتے رہے آخر یہ طے کیا کہ

منہ اندھیرے لڑائی چھیڑ دی جائے۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں نکلے اور چپکے سے حضرت علی اور ان کے برادران طلحہ و زبیر کے مابین جنگ چھیڑ دی۔ حضرت عائشہ کے رفقاء اس زعم میں مبتلا تھے کہ حضرت علی نے دھوکہ دیا۔ دوسری جانب حضرت علی بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ فریقین میں سے ہر ایک کا دامن اس سے پاک تھا کہ وہ ظہور اسلام سے قبل بھی ایسی بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ قرآنی اخلاق سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے بعد بھی وہ ایسے افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے اللہ و رسول اور دین حق کے ساتھ یہ خیانت کرنے والے قاتلین عثمان تھے جو شیعہ کے اسلاف میں سے ہیں۔ شیعہ ان کی امداد کا دم بھرتے اور ان کی پشت پناہی کرتے تھے دوسری جانب حضرت عثمان سے وہ بغض و عداوت رکھتے تھے اور اس بات کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتے تھے کہ حضرت عثمان کی ازواج مطہرات حضرت رقیہ و ام کلثوم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر تھیں خلاصہ یہ کہ امت محمدی کے صلحاء اسطرح منافقین و اشرار کی بھینٹ چڑھے سب انکے درمیان اللہ تعالیٰ ہی اپنا فیصلہ صادر فرمائیگا (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۳۹)

یہ حالت تھی کہ جب بھی مدینہ سے نکلنے کا واقعہ یاد آتا تو اس قدر روتیں کہ دوپٹہ تر ہو جاتا سابقین اولین صحابہ مثلاً حضرت طلحہؓ، زبیر اور علی نے بھی اس پر اظہار افسوس کیا تھا۔ جمل کا واقعہ قصداً نہیں بلکہ غیر اختیاری طور پر پیش آیا تھا۔

شیعہ مصنف کا قول کہ عائشہ نے حکم خداوندی وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ کی مخالفت کی تھی اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مصلحت کے لیے گھر سے نکلنا استقرار فی البیوت کے منافی نہیں مثلاً حج و عمرہ کے لیے جانا یا اپنے خاوند کی معیت میں سفر پر روانہ ہونا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سالار رسل کی زندگی میں یہ آیت نازل ہوئی اور آپ اس کے نزول کے بعد ازواج کے ساتھ حجۃ الوداع کے سفر پر روانہ ہوئے اس سفر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر امہات المومنین بھی شریک تھیں۔ حضرت عائشہ کے ساتھ آنحضور نے ان کے بھائی عبدالرحمن کو بھیجا تھا۔ آپ ان کے پیچھے ایک ہی اونٹ پر سوار تھیں۔ عبدالرحمن نے مقام تنعیم سے آپ کو عمرہ کرایا۔ حجۃ الوداع کا واقعہ اس آیت کے نزول کے بعد اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات

لہ حافظ ابن عساکر نے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں امام شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت علی نے ایک وادی میں حضرت طلحہ کو پڑے ہوئے دیکھا تو ان کے چہرہ سے مٹی پونچھی اور کہا "اے ابو محمد اس بے کسی کی حالت میں آپ کا مردہ پڑا ہوا ہونا مجھ پر بڑا شاق گذرا ہے میں خدا کے حضور ہی میں اس کا شکوہ عرض کرتا ہوں" نیز کہا "اے کاش! میں آج سے بیس سال پہلے فوت ہو جاتا"۔ واقعہ جمل کے بعد حضرت طلحہ کا بیٹا عمران حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے خوش آمدید کہا اور اپنے قریب بٹھا کر فرمایا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالے مجھے اور آپ کے والد کو ان لوگوں میں شامل کرے گا جن کا ذکر اس آیت میں کیا ہے وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ۔ حارث بن عبد اللہ اعور حضرت علی کے زبردست حامیوں میں سے تھا۔ وہ ایک کونہ میں بیٹھا تھا۔ حارث کہنے لگا۔ یہ بات عدل خداوندی کے منافی ہے کہ ہم عائشہ کے رفقاء کو قتل کریں اور وہ جنت میں ہمارے رفیق بھی ہوں۔ حضرت علی نے فرمایا۔ "دفع ہو جاؤ اگر میں اور طلحہ جنت میں نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا؟ یہ کہہ کر آپ نے ایک دوات اعور پر کھینچ ماری مگر وہ ادھر گیا اور وہ دوات اسے نہ لگی۔ (اللھم اغفر لکاتبہ و لمن سعی فیہ ولوالدیہم اجمعین)

سے تین ماہ سے بھی کم عرصہ پہلے وقوع پذیر ہوا۔ اسی بنا پر خلافتِ فاروقی میں بھی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لیے جایا کرتی تھیں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ حضرت عثمان یا عبدالرحمن بن عوف کو بھیجا کرتے تھے۔ جب امہات المومنین کو کسی مصلحت کی بنا پر سفر کی اجازت تھی تو حضرت عائشہ واقعہ جمل کے لیے اپنے خروج کو بھی مصلحت عامہ پر محمول کرتی تھیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ مندرجہ ذیل آیات و احادیث میں باہمی جنگ و جدال سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا معترض کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی ان میں وارد شدہ وعید کے مستحق ہیں کیونکہ آپ مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ نے ان کو مباح الدم قرار دیا۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (نساء۔ ۲۹)

ایمان والو! اپنا مال ناروا طریقہ سے نہ کھاؤ

وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (نساء۔ ۲۹) (ایک دوسرے کو قتل نہ کرو)

وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ (الحجرات۔ ۱۱) (مسلمانوں کو طعن نہ دو)

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا (نور۔ ۱۲)

جب تم نے یہ (واقعہ) سنا تو مومن مرد اور عورتوں نے کیوں نہ نیک گمان کیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبرو تم پر اسی طرح حرام ہے جیسے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں اور اس شہر میں۔

آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

"جب قاتل و مقتول تلواریں لے کر لڑنے لگیں تو وہ دونوں جہنمی ہیں۔ دریافت کیا گیا کہ حضور! قاتل تو جہنمی ہوا۔ مقتول کیونکر دوزخ میں جائے گا؟ فرمایا وہ بھی تو اپنے حریف کو قتل کرنا چاہتا تھا"۔

ان آیات و احادیث کی روشنی میں ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی ان میں بیان شدہ

وعید کے مصداق ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تاویل کرنے والا مجتہد اس وعید کا مصداق نہیں ٹھہرے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے اجتہاد میں غلطی پر ہو۔ اللہ تعالٰی مومنوں کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (سورہ بقرہ۔ ۲۸۶)

اے ہمارے رب اگر ہم سے بھول یا چوک ہو جائے تو ہم پر مواخذہ نہ کر۔

اللہ تعالٰی نے مومنین کے نسیان و خطا کو معاف کر دیا ہے۔ خطا کار مجتہد کی خطا بھی معاف ہے۔ جب مومنین سے برسرپیکار ہونے کے بارے میں ان کی خطا معاف ہے تو اجتہاد کی بنا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مدینہ سے خروج بالاولٰی مغفرت کا مستحق ہوگا۔

اگر معترض مذکورہ ذیل احادیث کو پیش کر کے کہے کہ چونکہ حضرت علی نے ان کی خلاف ورزی کی تھی اس لیے آپ کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع قائم نہ ہو سکا تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ جب دوسرا مجتہد حدیث میں ذکر کردہ وعید کا مصداق نہیں ہو سکتا تو حضرت علی بالاولٰی اس کا مصداق نہیں ہو سکتے وہ احادیث نبویہ یہ ہیں۔

(۱) "مدینہ طیبہ پاک و ناپاک کو چھانٹ دیتا ہے"۔

(۲) جو شخص بے اعتنائی سے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اللہ تعالٰی اس کے عوض اس سے بہتر آدمی کو مدینہ میں آباد ہونے کی سعادت عطا کرتے ہیں"۔ (موطا امام مالک)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خروج کا بھی یہی جواب ہے کہ وہ مبنی بر اجتہاد ہے اور اجتہادی غلطی از روئے کتاب و سنت معاف ہے۔

شیعہ مضمون نگار کا یہ کہنا کہ "حضرت عائشہ حضرت علی سے لڑنے کے لیے نکلی تھیں حالانکہ آپ بے قصور تھے"۔

یہ حضرت عائشہ پر عظیم افترا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دونوں گروہ لڑنے کے لیے نکلے تھے تو یہ وہی قتال تھا جس کا ذکر مذکورہ ذیل آیت میں کیا گیا ہے اور اس خطا کو معاف کر دیا گیا ہے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (حجرات-۹)

اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیجئے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ مومن باہم لڑنے جھگڑنے کے باوصف مومن ہی رہتے ہیں۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "قتل عثمان پر سب لوگوں کا اجماع قائم ہو گیا تھا"۔ بڑا گھناؤنا جھوٹ ہے اس لیے کہ جمہور نے نہ قتل کا حکم دیا نہ وہ اس پر راضی تھے علاوہ ازیں اکثر مسلمان مدینہ میں اقامت گزین نہ تھے بلکہ مختلف دیار و امصار میں بلاد مغرب سے لے کر خراسان تک آباد تھے۔ مزید برآں چند شریر آدمی اس فعل شنیع کے مرتکب ہوئے تھے صلحائے امت اس میں شریک نہ تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔

"اے اللہ تو قاتلین عثمان پر بحر و بر اور کوہ و میدان میں لعنت بھیج"۔

اسؔ باب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ معاملہ آپ

۱ؔ حضرت علی نے متعدد مواقع پر قاتلین عثمان سے براءت کا اعلان کیا اور ان پر لعنت بھیجی حافظ ابن عساکر (ج، ص ۸۵) کی روایت کے مطابق آپ نے آخری اعلان واقعہ جمل کے موقع پر کیا۔ مورخ مذکور لکھتے ہیں۔

جب حضرت عائشہ جنگ جمل کے لیے تشریف لے گئیں تو کعب بن سُور ازدی اونٹ کی مُہار پکڑے آگے آگے چل رہا تھا۔ حضرت عائشہ نے کعب کو مخاطب کر کے کہا۔ "مہار کو چھوڑیے اور آگے بڑھ کر لوگوں کو قرآن کی طرف بلائیے"۔ یہ کہہ کر آپ نے کعب کو قرآن کریم کا ایک نسخہ دیا۔ دوسری جانب حضرت علی کے لشکر میں سبائی پیش پیش تھے۔ انھیں خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں فریقین میں صلح نہ ہو جائے۔ کعب قرآن لے کر آگے بڑھے۔ حضرت علی اپنی فوج کو پیچھے دھکیل رہے تھے مگر وہ بزور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ سبائیوں نے آگے بڑھ کر کعب پر یک وقت اتنے تیر چلائے کہ وہ موقع ہی پر جاں بحق ہو گئے۔ سبائی پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف بڑھے تو آپ نے پہلی مرتبہ ان الفاظ میں ان کو خطاب فرمایا۔

کے قتل تک نہیں پہنچے گا۔ اس لیے انھوں نے آپ کی عملی مدد کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۸) "اے لوگو! قاتلین عثمان اور ان کے انصار و اعوان پر لعنت بھیجئے"۔
حضرت عائشہ نے پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ بصرہ والے چیخ چیخ کر دعا کرنے لگے۔ حضرت علی نے پوچھا یہ آہ و بکا کیسی ہے؟ جواب ملا کہ حضرت عائشہ قاتلین عثمان کے حق میں بد دعا کر رہی ہیں حضرت علی بھی دعا کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا۔
"اے اللہ قاتلین عثمان اور ان کے ہمنواؤں پر لعنت بھیج"۔

جب باغیوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا تھا تو حضرت علی نے حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو آپ کی حفاظت کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کرنا تمہاری جان کیوں نہ چلی جائے۔ مگر حضرت عثمان برابر ان کو مدافعت سے منع کرتے رہے۔ حضرت حسن آخری شخص تھے جو سانحۂ شہادت کے دن آپ کے گھر سے نکلے۔ حضرت حسن وحسین کے علاوہ عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن زبیر اور مروان بن حکم بھی آپ کی حفاظت کے سلسلہ میں حاضر ہوئے تھے۔ مگر حضرت عثمان نے بتاکید ان سے کہا کہ ہتھیار رکھ کر اپنے گھروں کو چلے جائیں (دیکھئے العواصم من القواصم ص ۱۳۴)
مورخ بلاذری اپنی کتاب "انساب الاشراف" ج ۵، ص ۱۰۳ پر حضرت حسن سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت علی اپنے گھر آئے تو دیکھا کہ آپ کی بیٹیاں رو رہی ہیں۔ آپ نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ ہم عثمان کے غم میں رو رہی ہیں یہ دیکھ کر حضرت علی رو پڑے اور فرمایا کہ "روتی رہو"۔
مقام افسوس ہے کہ حب علی کا دعوی کرنے والے آپ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو شیعہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت علی اور اہل بیت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ حضرت علی اور ان کے اہلبیت رحمٰن کی دنیا میں بستے ہیں اور تشیع کے دعوی دار شیطان کی دنیا میں بود و باش رکھتے ہیں"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] حافظ ابن عساکر صدر اول کے مورخ موسی بن عقبہ اسدی ـــــ جن کے بارے میں امام مالک نے فرمایا "ابن عقبہ سے مغازی سیکھو اس لیے کہ وہ ثقہ راوی ہیں" ـــــ سے نقل کرتے ہیں کہ ابو حبیبہ طائی ـــــ جن سے ابو داؤد، نسائی اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے ـــــ نے کہا کہ جب حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تو بنو عمرو بن عوف نے حضرت زبیر کی خدمت (باقی بر صفحہ ۳۳۰)

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اجماع حضرت عثمان کے قتل پر نہیں بلکہ آپ کی بیعت خلافت پر منعقد ہوا تھا۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ ایسا اجماع حضرت علی کی بیعت خلافت پر کیوں نہ ہوا؟ مزید برآں حضرت ابوبکر کی خلافت پر جو اجماع منعقد ہوا ایسا اتفاق حضرت علی کی بیعتِ خلافت اور قتل عثمان پر نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر کی بیعتِ خلافت سے صرف چند اشخاص پیچھے رہے تھے۔ جن میں سے ایک سعد بن عبادہ بھی تھے (واللہ یغفرلہ) ہم قبل ازیں بیان کہہ چکے ہیں کہ جس

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) میں حاضر ہو کر کہا "ابو عبداللہ! ہم آپ کی خدمت میں حضرت عثمان کی مدافعت کے لیے حاضر ہوئے ہیں"۔

ابو حبیبہ کہتے ہیں۔ حضرت زبیر نے یہ پیغام دے کر مجھے حضرت عثمان کے پاس بھیجا۔ "بعد از سلام ان سے عرض کیجئے کہ تمہارا بھائی زبیر عرض کرتا ہے کہ بنو عمرو بن عوف نے آپ کی مدافعت کے لیے اپنی خدمات کی پیشکش کی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے یہاں چلا آؤں تاکہ جو تکلیف آپ کو پہنچے وہ مجھے بھی پہنچے۔ یا بنو عمرو بن عوف کے ذریعہ آپ کی مدافعت کروں جیسے آپ کا ارشاد ہو"۔ ابو حبیبہ کا بیان ہے کہ میں حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا جس کے پیچھے ایک تکیہ لگا تھا۔ فرش پر چادریں بچھی تھیں۔ ایک طرف پانی کے ٹب رکھے تھے۔ آپ کے یہاں حضرت حسن بن علی، عبداللہ بن عمر، ابوہریرہ، سعید بن العاص، مروان بن حکم اور عبداللہ بن زبیر بھی موجود تھے۔ میں نے حضرت زبیر کا پیغام پہنچایا تو فرمانے لگے اللہ اکبر! خدا کا شکر ہے جس نے میرے بھائی زبیر کو محفوظ رکھا۔ میری جانب سے انہیں کہئے۔ کہ اگر آپ میرے گھر میں تشریف لائیں گے تو آپ کی وہی حیثیت ہوگی جو ایک مہاجر کی ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مدافعت کے لیے بنو عمرو بن عوف کا انتظار کریں"۔ ابو حبیبہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت ابوہریرہ اٹھے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

میرے ان دو کانوں نے آنحضور کو یہ فرماتے سنا تھا کہ "میرے بعد فتن و حوادث ظہور پذیر ہوں گے" میں نے عرض کیا حضور! ان سے نجات کی کیا صورت ہوگی؟ آپ نے حضرت عثمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "امیر (عثمان) اور اس کی جماعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیے"۔ لوگوں نے عرض کیا ہمیں لڑنے کی اجازت دیجئے حضرت عثمان نے فرمایا۔ میں اپنے اطاعت شعاروں کو تاکید لڑائی سے روکتا ہوں" (باقی بر ص ۳۴۱)

آدمی کے لیے جنت کی شہادت دی گئی ہو وہ بعض اوقات گناہ کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ معصوم نہیں۔

شیعہ مصنف کا یہ قول اس کی جہالت کا آئینہ دار ہے کہ حضرت عثمان کے قتل پر اجماع منعقد ہوا تھا۔ یہ تو بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے ناصبی کہتے ہیں کہ حضرت حسین مسلمانوں کے اجماع کے مطابق قتل کیے گئے تھے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ لڑنے والوں اور آپ کو قتل کرنے والوں میں سے کسی نے بھی آپ کی مدافعت نہیں کی تھی[1]۔ اس قول میں ناصبی اتنے ہی جھوٹے ہیں جیسے شیعہ اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) الوجبیہ کا بیان ہے کہ بنو عمرو بن عوف کے آنے سے پہلے ہی فتنہ پردازوں نے حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔ بنو عمرو بن عوف قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے جو انصار کے دو مشہور قبائل (اوس و خزرج) میں سے ایک ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی تو پہلے تین دن بنو عمرو بن عوف کے یہاں ٹھہرے تھے پھر بنی نجار کی طرف منتقل ہو گئے۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) [1] حالانکہ آپ کو شیعی ماحول (عراق) میں قتل کیا گیا تھا۔ وہ شیعہ جو کرۂ ارضی کے دور افتادہ گوشوں سے چل کر آپ کے مقتل پر جمع ہوتے ہیں یہی آپ کو دھوکہ دینے والے تھے۔ پہلے بڑے زور شور سے خط لکھ کر بلایا، جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کا ساتھ چھوڑ کر صفِ اعداء میں شریک ہو گئے۔ استاد موسیٰ یعقوبی نجفی ایک معاصر شیعہ ادیب لکھتا ہے

(۱) قَدْ كَاتَبَتْهُ أُولُو الْخِيَانَةِ أَنَّهَا ۔۔۔ جُنْدٌ وَلَيْسَ لَهَا سِوَاهُ إِمَامُ

خیانت کار لوگوں نے آپ (حضرت حسین) کو لکھا تھا کہ ہم آپ کے مددگار ہیں اور آپ کے سوا ہمارا کوئی امام نہیں۔

(۲) لٰكِنَّهُمْ خَانُوا الذِّمَامَ وَلَمْ يَفُوا ۔۔۔ أَنَّى وَمَا لِلْخَائِنِينَ ذِمَامُ

مگر انہوں نے اپنے عہد میں خیانت کی اور اسے پورا نہ کیا اور خیانت پیشہ لوگ عہد کے پابند ہی کب ہوتے ہیں۔

اگر شیعہ خود فریبی کا شکار نہ ہوتے اپنے گھروں میں مقیم رہتے اور خط لکھ کر حضرت امام حسین کو دعوت نہ دیتے تو لوگوں کا خون ضائع ہونے سے بچ جاتا اور امت اس عظیم فتنہ میں مبتلا نہ ہوتی۔ اپنی قدر نہ جاننے کا یہ ثمرہ برآمد ہوا کہ شیعہ تاقیامِ قیامت یہ داغ دور نہ کر سکیں گے۔ حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہما (باقی برصفحہ ۳۴۲)

اس دعویٰ میں کہ قتل عثمان پر اجماع منعقد ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ قتل عثمان کی مذمت قتل حسین سے زیادہ کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عثمان کی تائید و نصرت اور ان کے قصاص کا مطالبہ[1] کرنے والے لوگوں کی تعداد حامیان حسین سے بہت زیادہ تھی[2]۔ قتل عثمان سے امت میں جو

(حاشیہ صفحہ سابق) جب عاشوراء کے بعد کوفہ میں داخل ہوئی اور اہالیان کوفہ حضرت زینب اور ان کے بھائی کو خوشامدانہ الفاظ میں استقبال کرنے نکلے تو آپ نے اس وقت یہی الفاظ کہے تھے۔ مزید براں حضرت حسین سے خیانت کرنے والے شیعہ بعد میں آنے والے شیعہ سے بہر حال بہتر تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] حضرت عائشہ کی فوج میں طلحہ و زبیر جیسے گرامی قدر صحابہ شامل تھے جو عشرہ مبشرہ میں شمار ہوتے ہیں اور جن کا مقصد وحید قاتلین عثمان سے قصاص لینا اور حضرت علی کے ساتھ معاملت کرنا تھا۔ جنگ صفین انہی مقاصد کی تکمیل کے لیے وقوع میں آئی تھی ۱۲

[2] قاتلین عثمان سے سب سے پہلے ذات باری تعالیٰ نے انتقام لیا۔ تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) جہجاہ بن سعید غفاری:۔ یہ وہ بدبخت ہے کہ جب حضرت عثمان مسجد نبوی کے منبر پر خطبہ دے رہے تھے تو اس نے عصائے نبوی آپ کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس زور سے آپ کے دائیں گھٹنے پر مارا کہ عصا ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد اس سے انتقام لیا۔ عصائے نبوی کا ایک ٹکڑا اس کے زانو میں گڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے پھر پتہ نہ چل سکا کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ ظن غالب ہے کہ وہ اسی تکلیف سے جہنم رسید ہوا۔

(۲) حرقوص بن زہیر سعدی:۔ حضرت عثمان کی مخالفت کے بعد اس نے جب حضرت علی پر خروج کیا تو آپ نے یوم النہروان ۳۹ھ میں اسے مروا ڈالا۔

(۳) حکیم بن جبلہ عبدی۔ جنگ جمل میں اس کا ایک پاؤں کٹ گیا تھا۔ قریب الموت تھا کہ کسی نے ان الفاظ میں پکارا "امام مظلوم پر مظالم ڈھانے کی بنا پر جب خدا کی گرفت میں آئے ہو تو اے خبیث! اب چلا رہے ہو تم نے مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کیا اور ناحق ان کے خون بہائے۔ اب انتقام خداوندی کا مزہ چکھو۔"

(۴) ذریح بن عباد عبدی:۔ یہ حکیم بن جبلہ عبدی کا رفیق کار تھا جنگ جمل میں مارا گیا۔

بصرہ کے قاتلین عثمان میں سے جو جنگ جمل میں زندہ بچ گئے تھے ان کے قبیلہ والے پکڑ کر ان کو

(باقی بر صفحہ ۳۳۳)

شر و فساد پھیلا۔ قتل حسین کے فتنہ کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں اس پر مزید یہ کہ قتل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۲) کتوں کی طرح طلحہ و زبیر کی خدمت میں لائے اور وہ سب تہ تیغ کر دیے گئے۔
بصرہ والوں میں سے صرف حرقوس بن زہیر بچا تھا۔ حضرت علی نے اسے یوم النہروان میں قتل کیا۔

(۵) جندب بن زہیر غامدی:۔ یہ جنگ صفین تک بقید حیات رہا۔ معرکۂ صفین میں اس نے قبیلہ ازد کے ایک شہسوار کو للکارا تو ازدی نے اسے قتل کر دیا۔ اس کا خالہ زاد بھائی مخنف بن سُلیم کہا کرتا تھا کہ جندب بچپن میں بھی اور بڑا ہو کر بھی دونوں حالتوں میں منحوس تھا۔ جاہلیت و اسلام دونوں اَدوار میں جندب ہمیشہ بری چیز کو انتخاب کیا کرتا تھا۔

(۶) ابو زینب بن عوف:۔ یہ ۳۷ھ میں معرکۂ صفین میں مارا گیا۔

(۷) شریح بن اوفی عَبسی:۔ اس نے حضرت علی کے خلاف خروج کیا تھا۔ پہلے اس کا پاؤں کاٹا گیا اور پھر اسے قتل کیا گیا۔ حالت قتل میں اس نے یہ اشعار پڑھے ؎

(۱) اَضْرِبُهُمْ وَلَوْ اَرٰی اَبَا حَسَنٍ   ضَرَبْتُهٗ بِالسَّيْفِ حَتّٰی يَطْمَئِنَّ

(۲) اَضْرِبُهُمْ وَلَوْ اَرٰی عَلِيًّا   اَلْبَسْتُهٗ اَبْيَضَ مُشْرِقِيًّا

(۱) میں ان کو مارتا رہوں گا اور اگر کہیں علی کو دیکھ پایا تو اس کو ضرور تلوار ماروں گا۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے۔

(۲) میں ان کو مارتا جاؤں گا اور اگر علی کو دیکھ لیا تو میں اس کو صیقل شدہ مشرقی تلوار کا لباس پہناؤں گا۔

(۸) عَلْباء بن ہَیْثَم سدوسی:۔ عمرو بن یثربی قاضی بصرہ نے اسے جنگ جمل میں قتل کیا۔

(۹) عمرو بن حُمق خزاعی:۔ ۵۱ھ تک زندہ رہا پھر موصل میں اسے نیزے کی اتنی ہی ضربیں لگیں جتنی اس نے حضرت عثمان کو لگائی تھیں۔

(۱۰) عُمیر بن ضابی:۔ یہ وہ بدبخت ہے جس نے حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ان کی پسلی توڑ دی تھی۔ جب حجاج عراق کا حاکم قرار پایا تو یہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر رحم و کرم کا طالب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ حجاج اس سے واقف نہیں۔ حجاج نے کہا کیا تو وہی شخص نہیں جس نے یہ شعر کہا تھا ؎

عثمان قباحت وشناعت کے اعتبار سے اللہ، رسول اور مومنین کے نزدیک قتل حسین سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس لیے کہ حضرت عثمان سابقین اولین اور حضرت علی۔ طلحہ اور زبیر کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے

آپ خلیفۂ برحق تھے اور آپ کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع منعقد ہوا تھا۔ آپ نے نہ کسی مسلمان پر تلوار اٹھائی اور نہ کسی کو موت کے گھاٹ اتارا آپ کی ساری عمر جہاد کفار میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۳) سے

هَمَمْتُ وَلَمْ أَفْعَلْ وَكِدْتُ وَلَيْتَنِي ... تَرَكْتُ عَلَى عُثْمَانَ تَبْكِي حَلَائِلُهُ

ترجمہ:- میں نے (قتل عثمان کا) ارادہ کیا تھا مگر یہ کام نہ کر سکا اے کاش! مجھے اس معاملہ میں کھلی چھٹی ملتی تو عثمان کی بیویاں ان پر رونے لگتیں۔

پھر حجاج کے حکم سے اس کو قتل کر دیا گیا۔

(۱۱) کعب بن ذی الحبکہ نہدی:- بسر بن ابی ارطاۃ نے اس کو قتل کیا۔

(۱۲) کنانہ بن بشر تجیبی۔ حضرت عمرو بن عاص نے مصر میں اسے قتل کیا۔ یہ حضرت عثمان کا شدید مخالف تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے حضرت عثمان کو قتل کیا تھا۔ حضرت عثمان کے گھر میں جو لوگ قتل کیے گئے تھے۔ یہ ان کو دفن کرنے سے روکتا تھا۔

(۱۳) ابن الکوّاء یشکری:- اس نے حضرت عثمان کے علاوہ حضرت علی کے خلاف بھی خروج کیا تھا اور قتل ہوا۔

(۱۴) محمد بن ابی حذیفہ:- اس نے حضرت عثمان کے احسانات کی ناشکری کی۔ سزا کے طور سے یہ ۳۶ھ میں بمقام عریش مقتول ہوا۔

علی ہذا القیاس قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آخرت سے پہلے دنیا میں ہی اپنے کیے کی سزا پالی تھی۔ قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو لوگ پیش پیش تھے ان کے انجام سے نیچے تک آگاہ ہیں۔

بسر ہوئی۔ خلافت صدیقی و فاروقی کی طرح خلافت عثمانی میں بھی مسلمانوں کی تلوار اہل قبلہ سے الگ تھلگ اور کفار کے سر پر آویزاں رہی۔ حالت خلافت میں شرپسندوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ نے صبر ؎۶ سے کام لیا۔ اور مزاحمت نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے

؎۵ جب باغیوں نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا تو اس وقت عساکر اسلامی مختلف بلاد شرق و غرب میں کفار کے خلاف مصروف جہاد تھے۔ اسلامی لشکر زیادہ تر ان ممالک میں بر سر پیکار تھے جو آجکل روس کے زیر تسلط ہیں۔

؎۶ محب الدین الخطیب العواصم من القواصم ص۱۳۲ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ :۔

"اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں کی مدافعت کرنے یا تقدیر ربانی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وارضاہ کا موقف یہ تھا کہ آپ فتنہ پردازی اور خونریزی سے ڈرتے تھے۔ آخرکار آپ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اگر آپ ایسی قوت سے بہرہ ور ہوں جس کے سامنے باغیوں کو لامحالہ جھکنا پڑے اور جدال و قتال کی نوبت نہ آئے تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملک شام سے ایک ایسی فوج بھیجنے کی پیشکش کی تھی جو آپ کے اشارہ کی منتظر رہے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ پیش کش ٹھکرا دی تھی کہ میں مدینہ میں ایسی فوج نہیں رکھنا چاہتا جو یہاں مقیم رہے (تاریخ طبری جلد ۵ ص۱۰۱)

حضرت عثمان اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ مسلمان اس حد تک جرأت نہیں کر سکتے کہ دین اسلام کے اولین مہاجر (حضرت عثمانؓ) کا خون تک بہانے سے گریز نہ کریں۔ جب باغی اکٹھے ہو کر آ گئے اور آپ نے سمجھا کہ مدافعت کرنے میں ناحق خونریزی ہوگی تو آپ نے اپنے حامیوں کو بہ تاکید تشدد سے روک دیا۔ اہل سنت و شیعہ سب کی تصانیف ایسے اخبار و آثار سے پُر ہیں تاہم اگر ایسی منظم قوت و شوکت بروئے کار آتی جو باغیوں کی شرارت و جہالت کو بزور روک دیتی تو یہ بات حضرت عثمان کے لیے راحت و مسرت کی موجب ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ آپ شہادت کے متمنی تھے اور اس کے سوا کوئی چیز آپ کے لیے موجب سکون و اطمینان نہ تھی۔"

جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عثمان حضرت حسین کی نسبت زیادہ اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔ اسی نسبت سے قاتلین حضرت عثمانؓ حضرت حسینؓ کو قتل کرانے والوں کی نسبت بڑے مجرم ہیں۔ اور ان کا گناہ زیادہ گھناؤنا ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ آپ اقتدار سے محروم تھے اور طلب اقتدار کی خاطر گھر سے نکلے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ برسرِ اقتدار تھے ان کے اعوان و انصار آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ نے ان کی مدافعت کرتے ہوئے شہادت پائی۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جو شخص اپنی خلافت و ولایت کا دفاع کرنا چاہتا ہے وہ اس شخص کی نسبت لڑنے کا زیادہ حقدار ہے جو دوسروں سے اقتدار کو چھیننے کا خواہاں ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عثمان نے اپنی خلافت سے دفاع بھی نہیں کیا تھا بنا بریں آپ حضرت حسین سے ہر حال میں افضل ہیں اور آپ کا قتل قتلِ حسین سے شنیع تر ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اقتدار کے لیے جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ جدال و قتال سے کنارہ کش رہ کر امت میں صلح کرائی تھی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح جوئی کے اس اقدام پر حضرت حسن کی مدح وستائش کرتے ہوئے فرمایا

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا"!

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی حضرت معاویہ اور اہلِ شام تھے اور حضرت حسین کے

۱؎ حضرت طلحہ و زبیر کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت دی تھی یہ آپ کی محبوب ترین بیوی حضرت عائشہ حضرت عثمان کے معاونین میں شامل تھے۔ مورخ طبری نے سنہ ۱۹۳ھ کے واقعات میں اپنی تاریخ کی جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۷ پر مصعب بن عبداللہ زبیری سے نقل کیا ہے کہ اس کے والد عبداللہ بن مصعب نے اسے بتایا کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید نے اس سے دریافت کیا کہ "تم حضرت عثمان کو مقتول کرنے والوں کے بارے میں کیا کہتے ہو" عبداللہ بن مصعب نے جواباً کہا۔

"امیر المومنین! کچھ لوگ حضرت عثمان پر طعن کرتے تھے اور کچھ ان کی حمایت کرتے تھے۔

(باقی بر صفحہ ۳۳۷)

قاتلوں سے قصاص لینے والے مختار بن ابی عبید ثقفی اور اس کے اعوان و انصار تھے۔ کوئی سلیم العقل آدمی یہ بات کہنے میں تامل نہیں کرے گا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مختار ثقفی سے افضل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۶) ان پر طعن کرنے والے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ شیعہ۔ خوارج اور اہل بدعت سب مخالفین عثمان میں سے ہیں۔ جو لوگ آپ کے طرفدار تھے وہ موجودہ اہل السنت وہی ہیں جو آج بھی ان سے تعلق رکھتے ہیں"۔

یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا۔ "اس کے بعد مجھے یہ مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیعہ کے جواب میں یہ بات الزاماً کہی گئی ہے ورنہ مختار کو حضرت معاویہ سے کیا نسبت؟ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلفاء راشدین کے بعد پہلے قابل فخر خلیفہ تھے۔ حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۳۳ پر مصر کے مشہور امام اور عالم لیث بن سعد المتوفی ۱۷۵ھ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا "میں نے حضرت عثمان کے بعد اس گھر والے (حضرت معاویہ) سے زیادہ کسی کو حقوق کا پورا کرنے والا نہیں دیکھا"

حافظ ابن کثیر کتاب مذکور ج ۸ ص ۱۳۵ پر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی سے جو بڑے عالم و حافظ تھے روایت کرتے ہیں انہوں نے معمر بن راشد سے اور معمر نے ہمام بن منبہ صنعانی سے جو ثقات تابعین میں سے تھا سنا انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

"میں نے حضرت معاویہ سے بڑھ کر کسی شخص کو حکومت و سلطنت کا اہل نہیں دیکھا"۔

ظاہر ہے کہ سلطنت کی اہلیت و صلاحیت اسی شخص میں ہوتی ہے جو حکیم و حلیم اور عادل ہو۔ ملک کا دفاع کرتا اور دین اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے کوشاں رہتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ جو امانت خدا نے اس کو تفویض کی ہے اس میں خیانت کو راہ نہ دیتا ہو۔

امام ترمذی ابو ادریس خولانی سے روایت کرتے ہیں جو کبار علمائے تابعین اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے بعد شام کے سب سے بڑے عالم تھے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمیر بن سعد انصاری کو حمص کی ولایت سے معزول کر کے ان کی جگہ حضرت معاویہ کو مقرر کیا تو لوگوں نے ازراہِ تعجب یہ کہنا شروع کیا۔ "عمیر جیسے آدمی کو معزول کر کے معاویہ کو مقرر کیا"۔

تھے مختار کذاب تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ ص۳۳۷) بغوی معجم الصحابہ میں لکھتے ہیں کہ عُمیر کو لوگ "نسیج وحدہٖ" (اپنی مثال آپ) کہا کرتے تھے۔ ابن سیرین کا قول ہے کہ حضرت عمر نے کثرت زہد کی وجہ سے عمیر کو یہ نام دیا تھا —— عُمیر نے لوگوں کی یہ گفتگو سن کر کہا۔ "معاویہ کا ذکر اچھے انداز میں کیجئے میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اے اللہ معاویہ کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت عطا فرما"۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت معاویہ کے حق میں یہ شہادت خود حضرت عمر نے دی تھی۔ بشرط صحت حضرت فاروق کی شہادت سے حضرت معاویہ کی عظمت و فضیلت ثابت ہوتی ہے تاہم اگر یہ شہادت دینے والے عُمیر ہوں —— اس کے باوصف کہ آپ کو معزول کرکے حضرت معاویہ کو ان کا قائم مقام بنایا گیا تھا —— تو بھی اس شہادت کا درجہ حضرت عمر کی گواہی سے کم نہیں ہے اس لیے کہ عمیر اصحاب رسول اور زہاد انصار میں سے تھے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب مناقب الصحابہ میں ابن ابی ملیکہ تمیمی سے روایت کی ہے کہ کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ "امیر المومنین معاویہ ایک وتر پڑھتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا "معاویہ فقیہ ہیں" (بخاری)

جامع ترمذی کی کتاب المناقب میں عبد الرحمن بن ابی عمیرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت معاویہ کے بارے میں یہ دعا فرمائی "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ ھَادِیًا مَّھْدِیًّا وَّاھْدِ بِہٖ" (ترمذی)

محدث طبرانی سعید بن عبد العزیز تنوخی سے روایت کرتے ہیں جو ملک شام کے امام مالک کہلاتے تھے کہ انہوں نے ربیعہ بن یزید ایادی سے سنا انہوں نے عبد الرحمن بن ابی عمیرہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کے حق میں یہ دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ وَالْحِسَابَ وَقِہِ الْعَذَابَ (طبرانی)

مذکورہ بالا روایت امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ابو مسہر سے نقل کی ہے۔ امام احمد یہی روایت عرباض بن ساریہ سے روایت کرتے ہیں۔ مفسر ابن جریر اسے ابن مہدی سے روایت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل محدثین نے یہ روایت اپنی تصانیف میں نقل کی ہے (باقی برص۳۴۹)

(بقیہ حاشیہ ۳۴۸) (۱) اسد بن موسیٰ المتوفی ۱۳۲-۲۱۲ سنہ جن کو اسد السنہ کہا جاتا تھا۔

(۲) بشر بن السری الافوہ البصری (۱۳۲۔۔۔۔ ۱۹۵) یہ امام احمد کے استاد تھے ان کی روایت میں اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ کے لفظ بھی ہیں۔

(۳) عبد اللہ بن صالح مصری یہ امام لیث بن سعد کے کاتب تھے۔

(۴) ابن عدی وغیرہ نے یہ روایت ابن عباس سے نقل کی ہے۔

(۵) محمد بن سعد۔ صاحب الطبقات یہ روایت مسلمہ بن مخلد فاتح و امام مصر سے بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہ کے بارے میں مذکورہ دعائے نبوی کے ناقل لاتعداد صحابہ ہیں دیکھئے البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۰۔۔۔۔ ۱۲۱۔ نیز ترجمہ معاویہ حرف المیم تاریخ دمشق حافظ ابن عساکر۔

مذکورہ صدر روایات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہ ہدایت یافتہ اور لاتعداد فضائل و مناقب کے حامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں شیعہ کے مفروض مہدی کی کیا حقیقت جو نہ ابھی پیدا ہوا اور نہ اس سے کوئی اس سے مستفید ہو سکا۔ جو شخص دانستہ ان احادیث کو تسلیم نہ کرے وہ حدیث نبوی کا منکر ہے مقام حیرت ہے کہ بعض شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجنے اور ان سے بغض و عداوت رکھنے کے باوصف اپنے آپ کو مسلمان قرار دیتے ہیں۔ ان کو در اصل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنا چاہئے کہ آپ نے حضرت معاویہ کے حق میں ایسی دعا کیوں فرمائی؟

بے حیا باش ہر چہ خواہی کن

حافظ ابن عساکر امام ابوزرعہ رازی سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے کہا "میں معاویہ سے بغض رکھتا ہوں"۔ ابوزرعہ نے کہا۔ "معاویہ کا رب بڑا رحیم و کریم ہے اور آپ کے حریف (حضرت علی) بھی بڑے شریف آدمی تھے تم دونوں کے درمیان مداخلت کرنے والے کون ہو؟"

امام بخاری اپنی بخاری میں جو قرآن کریم کے بعد اس کرۂ ارضی پر صحیح ترین کتاب ہے نیز امام مسلم اپنی صحیح کی کتاب الامارۃ میں آنحضور کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے

(بقیہ بر ص ۳۵۰)

کے قبیلہ میں ایک کذاب اور ایک قاتل ہو گا۔ کذاب سے مختار مراد ہے اور قاتل سے مراد

(البدایہ ج۹ ص۳۳۹) ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مقام قبا میں تشریف لے گئے اور انس کی خالہ امّ حرام بنت ملحان کے یہاں قیلولہ فرمایا تو آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی امت کے کچھ لوگ تاج و تخت سے آراستہ اعداء دین سے بحری جنگ لڑ رہے ہیں آپ پھر سو گئے اور وہی خواب دیکھا ام حرام نے کہا حضور دعا فرمائیے کہ اللہ تعالے مجھے ان مجاہدین میں شامل کر دے۔ آپ نے فرمایا تو پہلے مجاہدین میں شامل ہے۔" حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۲۹ پر لکھتے ہیں۔ "حدیث میں جس غزوہ کی پیشگوئی کی گئی ہے اس سے مراد وہ بحری لڑائی ہے جو ۲۷ھ میں حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں حضرت معاویہ کے زیر قیادت لڑائی لڑی گئی اور جس میں آپ نے جزیرہ قبرص کو فتح کیا۔ امیر معاویہ کے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ آپ اولین اسلامی بحری بیڑے کے بانی تھے۔ یہ بات آنحضور کے معجزات میں شامل ہے کہ ام حرام جس نے مجاہدین کے زمرہ میں شریک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور آپ نے اس کو پہلے مجاہدین میں شمولیت کی بشارت دی تھی امیر معاویہ کے بحری بیڑہ میں شریک تھیں ان کے خاوند حضرت عبادہ بن صامت اور دیگر صحابہ میں سے ابو درداء اور ابوذر رضی اللہ عنہم بھی رفیق لشکر تھے۔ ام حرام نے اسی جگہ وفات پائی اور آج تک آپ کی قبر قبرص میں موجود ہے۔ حافظ ابن کثیر مزید فرماتے ہیں۔

"غزوہ قسطنطنیہ کے موقع پر دوسرے لشکر کی قیادت کا شرف یزید بن معاویہ کے حصہ میں آیا جس سے آنحضور کے دوسرے خواب کی تعبیر بروئے کار آئی۔ یہ آپ کی رسالت کی صداقت کے عظیم دلائل میں سے ایک ہے۔"

عباسی خلافت میں تملق و خوشامد کا دور دورہ تھا اور لوگ بنو امیہ کے محاسن کو معائب کا رنگ دے کر عباسی خلفاء کی خوشنودی حاصل کرتے تھے اسی دوران میں چند طالب علم امام الائمہ سلیمان بن مہران الاعمش کوفی کے یہاں جمع ہو کر حضرت عمر بن عبد العزیز کے عدل و انصاف کا ذکر کرنے لگے یہ سن کر امام اعمش بولے "اگر تم امیر معاویہ کا عہد خلافت دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا"۔ طلبہ نے عرض کیا "کیا آپ کی مراد حضرت معاویہ کے حلم اور بردباری سے ہے"۔ فرمایا بخدا نہیں بلکہ آپ عدل و انصاف میں یکتا تھے۔"

حجاج بن یوسف۔ مختار کا والد ابو عبید ثقفی بڑا نیک آدمی تھا اس نے مجوس سے لڑتے ہوئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) امام اعمش مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا

"اگر تم حضرت معاویہ کو دیکھ لیتے تو کہتے کہ یہی مہدی ہیں"۔

یونس بن عبید قتادہ بن دعامہ سدوسی سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا

"اگر تم حضرت معاویہ جیسے کام کرنے لگو تو اکثر لوگ کہنے لگیں کہ تم ہی مہدی ہو"۔

ابو اسحاق السُّبَیعی نے ایک دن حضرت معاویہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم ان کا زمانہ پا لیتے تو کہتے کہ یہی مہدی ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الزہد طبع مکہ میں حضرت معاویہ کا نام زہد میں ضرب المثل کے طور پر بیان کیا ہے۔ میں نے کتاب العواصم من القواصم کے حواشی پر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ایک طرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ اصلی تصویر ہے جو صلحائے امت محمدی سے منقول ہے۔ دوسری جانب شیعہ کی پیش کردہ جعلی تصویر ہے جو فساق و فجار نے اپنی پرواز ضلالت کتب میں امت محمدی کے لاتعداد لوگوں کو مبتلائے فریب کرنے کے لیے وضع کی ہے فَاللّٰہُ حَسِیْبُھُمْ وَ ھُوَ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

شہادت پائی۔ مختار کی بہن صفیہ بنت ابی عُبَید عبداللہ بن عمر کے نکاح میں تھیں۔ یہ بڑی نیک دل خاتون تھی۔ مختار بدترین شخص تھا۔

شیعہ کا یہ قول کہ عائشہ عثمان کو قتل کرانا چاہتی تھی اور اسی سازش میں شریک رہا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی "بوڑھے احمق کو قتل[1] کر دو"

جب عائشہ کو قتل عثمان کی خبر پہنچی تو بہت خوش ہوئی"۔

(۱) اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اس کی دلیل پیش کیجئے۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ سے جو روایات منقول ہیں یہ اس کے خلاف ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قتل عثمان کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتیں اور اس میں شرکت کرنے والوں ـــــ خواہ ان کا بھائی محمد بن ابوبکر ہو یا کوئی اور مذموم قرار دیتی تھیں۔

(۳) فرض کیجئے صحابہ میں سے کوئی ـــــ حضرت عائشہ ہوں یا کوئی اور ـــــ غصہ کی حالت

---

[1] یہ شیعہ کا وضع کردہ جھوٹ ہے۔ نعثل کا لفظ صرف قاتلین عثمان کی زبان پر جاری ہوا۔ قاتلین عثمان میں سے اولیں شخص جس نے نعثل کا لفظ بولا وہ جبلہ بن عمرو ساعدی تھا۔ اس نے کہا "اے نعثل میں آپ کو قتل کر کے ایک خارشی اونٹ پر سوار کروں گا اور اسے شہر سے باہر پتھریلی زمین کی طرف ہانک دوں گا (دیکھئے تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۱۴ مطبع حسینیہ) بعد ازاں یہ لفظ جنگ جمل کے موقع پر ہانی بن خطاب ارحبی کی زبان پر جاری ہوا وہ کہتا ہے ؎

اَبَتْ شُیُوْخُ مُذْحِجٍ وَّ ھَمْدَانَ ‏ ‏ ‏ ‏ اَنْ لَّا یَرُدُّوْا نَعْثَلًا کَمَا کَانَ

تیسری مرتبہ یہ لفظ عبدالرحمن بن حنبل جمحی نے جنگ صفین کے موقع پر بولا۔ وہ کہتا ہے ؎

اِنْ تَقْتُلُوْنِیْ فَاَنَا ابْنُ حَنْبَلٍ ‏ ‏ ‏ ‏ اَنَا الَّذِیْ قَتَلْتُ فِیْکُمْ نَعْثَلًا

جب جبلہ بن عمرو ساعدی نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کرتے ہوئے پہلی مرتبہ نعثل کا لفظ بولا حضرت عائشہ اس وقت مکہ مکرمہ میں محو عبادت تھیں۔ جب حج سے واپس لوٹیں تو یہ لفظ آپ کے کانوں تک پہنچا۔ ۱۲

میں کوئی بات کہے تو اس کی بات کیونکر حجت ہو سکتی ہے[۱]

اس سے نہ کہنے والے کی شان میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ اس کی شان میں جس کے بارے میں وہ لفظ کہا گیا۔ باین ہمہ وہ دونوں جنتی بھی ہو سکتے ہیں اور خدا کے ولی بھی۔ حالانکہ ان میں سے ایک دوسرے کو واجب القتل اور کافر تصور کرتا ہے مگر وہ اس ظن میں خطا کار ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت علی اور دیگر صحابہ سے حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ مذکور ہے جو بدر اور حدیبیہ میں شرکت کر چکے تھے۔ حضرت علی بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کا ارادہ کیا تو حاطب نے مشرکین مکہ کے نام ایک خط لکھا اور اس میں آنحضور کے تمام راز منکشف کر دیئے۔ وحی کے ذریعہ آپ ان تمام حالات سے باخبر ہوئے حضرت علی و زبیر کو بلا کر کہا مکہ کی جانب چلتے جاؤ اور جب باغ خاخ آ جائے تو وہاں تمہیں ایک شتر سوار عورت ملے گی اس کے پاس ایک خط ہوگا۔ وہ خط اس سے لے لیجئے۔ جب علی و زبیر وہ خط لیکر واپس لوٹے تو آنحضور نے حاطب کو بلا کر خط لکھنے کا سبب دریافت کیا۔ حاطب نے کہا "یا رسول اللہ بخدا میں نے یہ فعل اس لیے انجام نہیں دیا کہ میں مرتد ہو گیا یا کفر پر راضی ہو گیا تھا۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ میں نسباً قریشی نہیں ہوں بلکہ باہر سے آکر مکہ میں آباد ہو اتھا۔ مدینہ میں جو لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں مکہ میں ان کے عزیز و اقارب ہیں جو ہر طرح ان کے گھر بار کی حفاظت کرتے ہیں میں نے چاہا کہ اس طرح قریش کو ممنون کر دوں تا کہ وہ میرے کنبہ کی حفاظت کرتے رہیں"۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ حضور! اجازت دیجئے کہ اس منافق

---

[۱] اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے اور رسولوں کے سوا کوئی بشر معصوم نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کرام اور خاص طور پر خلفاء راشدین انسانیت کی اعلیٰ ترین صفات سے بہرہ ور ہیں تاہم وہ خطا کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی خطا کو درست بھی کرتے ہیں وہ خطا کا ارتکاب کرنے کے باوصف قلبی طہارت، صفاء نیت، صدق جہاد اور سلامت مقاصد کی بنا پر باقی مسلمانوں سے بلند ترین مقام و مرتبہ پر فائز ہیں ۱۲

کی گردن اڑا دوں؟ آپ نے فرمایا حاطب بدر میں شرکت کر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے متعلق فرمایا ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ (جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمہیں بخش دیا) اسی دوران میں سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت نازل ہوئی۔

"ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کے ساتھ دوستی لگانا چاہتے ہو حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے وہ اس کے منکر ہیں وہ رسول کو اور تمہیں صرف اس جرم میں تمہارے وطن عزیز سے نکالتے ہیں کہ تم اللہ پر جو تمہارا رب ہے ایمان رکھتے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میری راہ میں جہاد کرتے ہو تم چھپکے چھپکے ان سے دوستانہ مراسم استوار کرتے ہو حالانکہ جو کام تم پوشیدہ یا ظاہر کر دیں اس سے آگاہ ہوں تم میں سے جو ایسا کرے گا وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا (سورہ ممتحنہ)

حاطب بن ابی بلتعہ

اہل علم حاطب کے واقعہ کی صحت پر متفق ہیں۔ یہ واقعہ مفسرین، فقہاء اور علماء سیر و تواریخ کے یہاں خبر متواتر کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں جب فتنہ پروری کا دور دورہ تھا یہ واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس کا راوی حضرت علی کا کاتب عبداللہ بن ابی رافع ہے۔ واقعہ بیان کرنے سے آپ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ سابقین اولین صحابہ باہمی مشاجرات و تنازعات کے باوصف خدا تعالیٰ کے نزدیک مغفور ہیں۔

اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حضرت عثمان و طلحہ و زبیر حاطب سے بہر حال افضل ہیں۔ نیز یہ کہ مشرکین مکہ کو خط لکھ کر حاطب نے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا وہ ان لغزشوں کی نسبت عظیم تر تھا جو سابقین اولین صحابہ کی جانب منسوب ہیں۔ بایں ہمہ آپ نے اس کو قتل کرنے سے رد کا اور اس کے جہنمی ہونے کی تردید کی جس کی وجہ یہ تھی کہ حاطب بدر و حدیبیہ میں شرکت کر چکا تھا۔ تاہم حضرت عمر نے فرمایا تھا۔ "اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں" آپ نے اسے منافق کہا اور مباح الدم قرار دیا۔ اس کے باوجود نہ کسی کے ایمان میں فرق آیا اور نہ جنتی

ہو سکتے ہیں۔

بخاری و مسلم میں واقعۂ افک کی تفصیلات مذکور ہیں۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

مجھے ایسے شخص کی ایذا سے کون نجات دیگا جس نے میرے اہل کے بارے میں مجھے بڑی تکلیف دی ہے۔ بخدا مجھے اپنے اہل کے بارے میں خیر ہی کی امید ہے اور جس شخص کے ساتھ ان کو متہم کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں بھی میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔"

یہ سن کر قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ اٹھے —— یہ وہی سعد بن معاذ ہیں جن کی موت پر عرش خداوندی پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ احکام خداوندی میں انھیں کسی ملامت گر کی پرواہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے اپنے حلیف بنی قریظہ کے بارے میں فیصلہ صادر کیا تھا کہ لڑنے والوں کو قتل کیا جائے۔ بچوں کو قیدی بنایا جائے اور ان کے مال کو مال غنیمت تصور کیا جائے۔ یہ سن کر آنحضور نے فرمایا تھا کہ تو نے ان کے بارے میں خدا کا وہ فیصلہ صادر کیا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر سے نازل ہوا تھا —— اور کہا یا رسول اللہ! ہم اس خدمت کے لیے حاضر ہیں اگر وہ اوس کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو گا تو ہم اسے موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور اگر خزرج کا آدمی ہوا تو اس کے بارے میں ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے"۔

یہ سن کر سعد بن عبادہ اٹھے اور کہا آپ نے جھوٹ بولا بخدا آپ اسے قتل نہیں کر سکتے۔ اسید بن حضیر نے کھڑے ہو کر کہا۔

آپ جھوٹ بولتے ہیں بخدا ہم اسے قتل کر کے رہیں گے۔ آپ منافق ہیں اور اسی لیے منافقین کی وکالت کر رہے ہیں"۔

اوس و خزرج آپس میں گتھم گتھا ہونے والے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر سے اتر کر انھیں خاموش کیا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ تینوں اصحاب سابقین اولین میں سے تھے اور اس کے باوصف

اُسید نے سعد کو منافق کہا حالانکہ دونوں کا ولی اللہ اور جنتی ہونا کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک شخص بنابر تاویل دوسرے شخص کو کافر قرار دیتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی کافر نہیں ہوتا۔

باقی رہا مالک بن دخشم کے بارے میں بعض صحابہ کا یہ قول "لوگوں کا خیال تھا کہ آنحضور مالک بن دخشم کے بارے میں بددعا کرتے اور وہ ہلاک ہو جاتا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی یہ بات سن کر فرمایا کیا وہ اس بات کی شہادت نہیں دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

بڑے آدمی کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں

بڑے آدمی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ معصوم ہو اور اجتہادی غلطی سے بھی پاک ہو۔ اس سے بڑھ کر ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی معصوم قرار نہیں دیتے۔ البتہ لوگوں کے بارے میں جو گفتگو ہو وہ ظلم و جہل کی بجائے علم و عدل پر مبنی ہونی چاہئے۔ بخلاف ازیں روافض کا یہ حال ہے کہ وہ دو قریب الفضیلت اشخاص میں تقابل کرتے ہوئے ایک کو معصوم قرار دیتے اور دوسرے کو ظلم و گناہ کا مجسمہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے جہل و تناقض کی آئینہ دار ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی یہودی یا نصرانی جب حضرت موسیٰ یا عیسیٰ کی نبوت کا اثبات کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر تنقید کرے گا تو اس کے عجز و جہل اور تناقض کا اظہار ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ یا عیسیٰ کی رسالت کے اثبات میں وہ جو دلیل پیش کرے گا اسی دلیل کو بلکہ اس سے بھی قوی تر دلیل و برہان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص بھی دو مماثل چیزوں میں تفریق پیدا کرے گا یا ایک چیز کی مدح کرے اور بعینہ اس جیسی چیز کی مذمت کرے یا بالعکس وہ اسی قسم کے عجز و جہل اور

تناقض کا شکار ہو گا۔ علماء و مشائخ کے اتباع کا بھی یہی حال ہے۔ جب کوئی شخص اپنے ہادی و پیشوا کی مدح میں رطب اللسان ہو اور اس جیسے دوسرے بزرگ کی مذمت کا مرتکب ہو تو وہ بھی تناقض کے مرض میں مبتلا ہو گا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "عائشہ نے پوچھا خلافت کے منصب پہ کون فائز ہوا ہے" لوگوں نے جواب دیا حضرت علی خلیفہ قرار پائے ہیں۔ عائشہ عثمان کا قصاص لینے کے دعویٰ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہ تھا"۔

ہم کہتے ہیں شیعہ مصنف کا یہ قول کہ عائشہ، طلحہ اور زبیر نے حضرت علی کو حضرت عثمان کا قاتل قرار دیا تھا۔ اس لیے وہ حضرت علی کے خلاف صف آرا ہوئے۔ صریح بہتان ہے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ حضرت علی قاتلین عثمان کو ان کی تحویل میں دے دیں۔ وہ اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ تھے کہ حضرت علی کا دامن قتل عثمان سے اتنا ہی پاک تھا جتنا کہ خود ان کا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جن قاتلوں نے حضرت علی کے یہاں پناہ لی ہے وہ ان کو تفویض کر دیے جائیں۔ مگر حضرت علی اور حضرت عائشہ دونوں اس پر قادر نہ تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ قاتلین عثمان کے قبائل ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ فتنہ کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ بپا ہو جاتا ہے تو عقلاء اس کو فرو کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً" (سورہ انفال)

(اس فتنہ سے بچ جاؤ جو صرف ظالموں کو ہی اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا)

جب فتنہ کا ظہور ہوتا ہے تو وہی شخص اس میں آلودہ ہونے سے محفوظ رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچا لے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "قتل عثمان کی بنا پر حضرت علی پر کیا جرم عائد ہوتا ہے" اس کے تناقض کا آئینہ دار ہے۔ رافضی مصنف اس زعم میں مبتلا ہے کہ حضرت علی

قتلِ عثمان کو مباح تصور کرتے تھے۔ اور یہ قتل آپ کی مساعی کا رہین منت تھا۔

۱ قبل ازیں شیعہ مصنف کا یہ قول بیان کیا جاچکا ہے کہ سب لوگ حضرت عثمان کو قتل کرنے کے حق میں تھے" ۔ ہم نے وہاں بیان کیا تھا کہ حضرت علی دیگر صحابہ کرام کی طرح حضرت عثمان کی حفاظت کرنا چاہتے تھے اسی بنا پر آپ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو ان کی حفاظت ونگرانی کے لیے مامور فرمایا تھا۔ ہم نے یہ واقعہ بھی ذکر کیا تھا کہ ایک مرتبہ جب حضرت علی اپنے گھر میں داخل ہوئے تو اپنی بیٹیوں کو روتا ہوا پایا اور جب انھوں نے یہ بتایا کہ وہ قتل عثمان پر آنسو بہا رہی ہیں تو آپ نے فرمایا "روتی رہو"

جنگ جمل میں جب حضرت علی نے سنا کہ حضرت عائشہ قاتلین عثمان پر لعنت بھیج رہی ہیں۔ اور فوج کے لوگ آپ کی دعا کو دہرا رہے ہیں تو آپ نے یہ دعا فرمائی۔

اَللّٰهُمَّ الْعَنْ قَتَلَةَ عُثْمَانَ (اے اللہ قاتلین عثمان پر لعنت بھیج)

یہ دلائل و براہین ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت علی حضرت عثمان کے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے جو اہل سنت کی ہے اور وہ بھی قاتلین عثمان پر لعنت بھیجتے تھے۔ نیز یہ کہ آپ روافض کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ حضرت عثمان سے بغض وعناد رکھنا قاتلین عثمان کی مدد کرنا اور ان کے فعل شنیع کو سراہنا ایک مستحسن امر ہے۔

ہم شیعہ مصنف کے اس دعوی کا ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت علی حضرت عثمان کو مباح الدم تصور کرتے تھے۔ اب وہ اس کے عین برعکس یہ دعوی کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ اور ان کے رفقاء نے حضرت علی پر یہ اتہام لگایا تھا کہ آپ عثمان کو جائز القتل تصور کرتے ہیں اور اسی بنا پر آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ حالانکہ جن وانس اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت علی عثمان کے بارے میں شیعہ کے ہم خیال ہرگز نہ تھے۔ بخلاف ازیں وہ آغاز اسلام سے تادم واپسیں حضرت عثمان کو اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت عائشہ اور ان کے اعوان و انصار کا مقصد وحید قاتلین عثمان (لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ) سے قصاص لینے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون اور امداد کرنا تھا اور بس! ۱۲

اکثر شیعان علی و عثمان حضرت علی کو قاتلِ عثمان قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ تعصب کے مریض ہیں ایک فریق حضرت علی کی بے جا طرفداری کا ارتکاب کرتا ہے اور دوسرا حضرت عثمان کا حامی اور حضرت علی کا دشمن ہے۔ جمہور اہل اسلام ان دونوں فرقوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ روافض کا قول ہے کہ حضرت علی قتل عثمان بلکہ حضرت ابوبکر و عمر کے قتل کو مباح سمجھتے اور ان کو قتل کرنے والے کی تائید و نصرت کو اجر و ثواب کا موجب قرار دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ یہ بات کیونکر کہہ سکتا ہے کہ قتل عثمان میں حضرت علی کا کیا گناہ ہے؟ البتہ اہل سنت کے قول کے مطابق حضرت علی کو منزّہ قرار دے سکتے ہیں یہ امر اس بات کا آئینہ دار ہے کہ روافض کے یہاں کس قدر تناقض پایا جاتا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ اعتراض کہ "طلحہ و زبیر کے لیے حضرت عائشہ کی اعانت و رفاقت کیونکر جائز ہوئی"؟

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ شیعہ کے جہل و تناقض کا بین ثبوت ہے اس موقع پر طلحہ و زبیر کو ہدف ملامت بنانے کے لیے وہ حضرت عائشہ کی مدح و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں مگر اتنا نہیں سوچتے کہ ان کے اعتراض کی اصل آماجگاہ حضرت علی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت طلحہ و زبیر حضرت عائشہ کا بے حد اکرام و احترام کرتے تھے اور ان کے یا حضرت عائشہ کے بارے میں کسی غلط کاری کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شیعہ مصنف طلحہ و زبیر کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہے کہ "وہ آنحضور کو کیا منہ دکھائیں گے" تو ایک ناصبی (حضرت علی کا مخالف) بہ کہنے کا مجاز ہے کہ حضرت علی آنحضور کو کیا منہ دکھائیں گے جبکہ وہ آپ کی بیوی (حضرت عائشہ) کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ کو اس حد تک تکلیف پہنچائی کہ ان کے اعوان و انصار نے اس اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں جس پر حضرت عائشہ سوار تھیں نتیجتاً حضرت عائشہ محمل سے گر پڑیں اور ان کے اعداء ایک قیدی عورت کی طرح آپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ کی تذلیل یہ ہے نہ یہ کہ حضرت

طلحہ و زبیر مدینہ سے ایک باعزت ملکہ کی طرح بحفاظت تمام آپ کو لائے کسی کو آپ کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ طلحہ و زبیر بھی آپ کے لیے اجنبی نہ تھے۔ علاوہ ازیں فوج میں بہت سے لوگ آپ کے محرم تھے۔ مثلاً عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہ آپ کے بھانجے تھے اور ان کی خلوت آپ کے ساتھ کتاب و سنت اور اجماع کی رو سے جائز ہے۔ اسی طرح شرعاً محرم کے ساتھ سفر کرنے کی بھی اجازت ہے۔

جہاں تک اس لشکر کا تعلق ہے جو حضرت عائشہ کے برخلاف برسرپیکار تھا اگر اس میں حضرت عائشہ کا بھائی محمد بن ابی بکر ــــ جس نے حضرت عائشہ کی جانب دست تعدی دراز کیا تھا ــــ نہ ہوتا تو اجنبی لوگ آپ پر زیادتی کرنے سے نہ چوکتے۔ حضرت عائشہ نے دست درازی کرنے والے کے بارے میں دریافت فرمایا "یہ کس کا ہاتھ ہے خدا اسے آگ میں جلائے"؟ محمد بن ابی بکر نے کہا "ہمشیرہ! کیا آخرت سے پہلے دنیا میں جلائے"؟ حضرت عائشہ نے فرمایا "ہاں دنیا میں آخرت سے پہلے"۔ چنانچہ محمد بن ابوبکر کو مصر میں جلا دیا گیا تھا۔

اگر ناصبی شیعہ کو مخاطب کر کے کہے۔ جب حسین قتل کیے گئے تھے تو تمہارے قول کے مطابق آل حسین کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ حالانکہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو سلوک حضرت عائشہ سے روا رکھا گیا تھا۔ حضرت عائشہ کو واپس مدینہ بھیج دیا گیا اور حسب ضرورت نان و نفقہ بھی دیا گیا تھا۔ اسی طرح قابو پا کر آل حسین کو ان کے گھروں میں پہنچا دیا گیا اور نان و نفقہ بھی دیا گیا تھا۔ اگر اس کا نام قیدی بنانا ہے اور یہ حرمت نبوی کے منافی ہے تو بے شک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی قیدی بنایا گیا اور حرمت رسول کو پیش خاطر نہیں رکھا گیا تھا۔

شیعہ اہل سنت پر زبان طعن دراز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ایک شامی نے فاطمہ بنت حسین کو قیدی بنانا چاہا تو حضرت عائشہ نے اس سے رد کرتے ہوئے کہا "بخدا ہم اسی صورت میں ایسا کر سکتے ہیں جب کہ ہم اپنا دین چھوڑ کر پورے کافر ہو جائیں"۔

بفرضِ محال اگر ایسا ہوا بھی تھا تو جو لوگ حضرت علی سے اس بات کی اجازت طلب کرتے تھے کہ جنگ جمل و صفین میں جو لوگ ان کے حریف ہیں ان کو قیدی بنا یا جائے اور ان کے مال کو مالِ غنیمت تصور کیا جائے وہ رفقائے عائشہ کی نسبت بڑے مجرم تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کو قیدی بنانا پیش نظر تھا ان میں حضرت عائشہ اور دیگر خواتین بھی تھیں۔ علاوہ ازیں جو لوگ حضرت علی سے یہ مطالبہ کر رہے تھے وہ دینی اعتبار سے اسے جائز سمجھتے اور اس پر اصرار کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت علی ان کے افکار و آراء سے متفق نہ ہوئے تو انہوں نے حضرت علی کے خلاف خروج کیا اور آپ ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

اس کے عین برخلاف جس شامی نے فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہا کو قیدی بنانا چاہا تھا وہ ایک محروم اقتدار غیر معروف آدمی تھا۔ نیز یہ کہ وہ شخص دینی حیثیت سے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ جب حاکم با اختیار نے اس سے روکا تو وہ اس سے باز رہا۔ خلاصہ کلام یہ کہ مسلمانوں کے خون ناموس و آبرو اور حرمت رسول کو حلال قرار دینے والوں کی تعداد اموی فوج کی نسبت حضرت علی کی فوج میں زیادہ تھی۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس پر سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ خوارج ہی کو دیکھئے جو حضرت علی کی فوج سے الگ ہو گئے تھے۔ یہ عسکر معاویہ کے شریر ترین لوگوں سے بھی شریر تر تھے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف جنگ لڑنے کا حکم دیا اور سب صحابہ نے ان کے خلاف صف آراء ہونے پر اجماع منعقد کر لیا تھا۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روافض خوارج سے بھی زیادہ جھوٹے ان سے بڑے ظالم اور کفر و نفاق اور جہالت میں بھی ان سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں روافض خوارج کی نسبت عجز و ذلت میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں فریق حضرت علی ہی کی فوج سے وابستہ تھے۔ یہی لوگ تھے جو حضرت علی کی کمزوری کا سبب قرار پائے اور آپ اپنے حریفوں کے مقابلہ سے عاجز رہے۔

ہمارا مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ شیعہ حضرت طلحہ و زبیر کو جن اعتراضات کا نشانہ بناتے

ہیں۔ حضرت علی پر ان سے بھی زیادہ اہم اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ اگر شیعہ یہ جواب دیں کہ حضرت علی مجتہد تھے بنا بریں وہ طلحہ و زبیر کی نسبت اقرب الی الحق تھے تو ہم کہیں گے کہ طلحہ و زبیر بھی مجتہد تھے۔ اگرچہ حضرت علی طلحہ و زبیر سے افضل تھے تاہم اگر حضرت عائشہ کی امداد کے لیے ان کا مدینہ سے نکلنا گناہ کا کام تھا تو حضرت علی کا اقدام اس سے بھی بڑا جرم ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ طلحہ و زبیر چونکہ حضرت عائشہ کو لے کر لڑنے کے لیے آ گئے تھے اس لیے حضرت علی کے فعل کی ذمہ داری ان دونوں پر عاید ہوتی ہے۔ تو اہل سنت اس کے جواب میں یہ مثال پیش کر سکتے ہیں کہ جب حضرت معاویہ سے کہا گیا کہ آپ نے حضرت عمار بن یاسر کو قتل کرایا حالانکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "اے عمار تجھے باغی گروہ قتل کرے گا"۔ یہ سن کر حضرت معاویہ نے کہا "کیا ہم نے عمار کو قتل کیا؟ ان کے قتل کے ذمہ دار تو وہ لوگ ہیں جو ان کو ہماری تلواروں کے نیچے لے آئے تھے"۔

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ دلیل قابل تسلیم نہیں تو ان لوگوں کی دلیل و برہان بھی ناقابل قبول ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی توہین و تذلیل کے ذمہ دار طلحہ و زبیر ہیں۔ اور اگر یہ دلیل قابل احتجاج ہے تو حضرت معاویہ کے استدلال سے بھی انحراف کی گنجائش نہیں۔ روافض دیگر ظالم و جاہل لوگوں کی طرح ہمیشہ اسی قسم کے دلائل کا سہارا لینے کے عادی ہیں جن سے ان کے اپنے اقوال کا فساد و تناقض ثابت ہوتا ہے۔ یہ دلائل ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے نظائر و امثال سے شیعہ کے خلاف احتجاج کیا جائے تو ان کے اقوال کا تانا بانا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے اور اگر ان کے نظائر ناقابل احتجاج ہوں تو اس سے ان دلائل کا بطلان لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ متماثلین کے مابین مساوات ضروری ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ کا منتہائے مقصود صرف خواہش نفس ہے جس کے لیے علم کی چنداں ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (سورۃ القصص - ۵۰)

شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے۔

"یہ کیونکر ممکن ہے کہ جب حضرت عائشہ حضرت علی کے خلاف صف آرا ہوئیں تو دس ہزار مسلمان آپ کی تائید و نصرت کے لیے تیار ہو گئے اور جب حضرت فاطمہ ابوبکر سے اپنا حق طلب کرنے کے لیے گئیں تو کسی نے بھی آپ کے حق میں ایک لفظ تک نہ کہا"۔

واضح رہے کہ یہ دلیل شیعہ کے حق میں مفید ہونے کی بجائے ان کے سخت خلاف ہے۔ کوئی سلیم العقل آدمی اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں سمجھتا کہ مسلمان آنحضور اور آپ کے اقارب خصوصاً آپ کی دختر نیک اختر کا ابوبکر و عمر سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ یہ امر بھی شک وشبہ سے بالا ہے کہ عرب جاہلیت و اسلام میں آنحضور کے قبیلہ بنی عبد مناف کے حضرت ابوبکر کے قبیلہ بنی تیم اور حضرت عمر کے قبیلہ بنی عدی سے زیادہ مطیع فرمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت صدیق منصب خلافت پر فائز ہوئے تو ان کے والد ابوقحافہ نے پوچھا۔ کیا بنو مخزوم اور بنو عبد شمس رضامند ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں! ابوقحافہ نے کہا "یہ خاص عنایتِ ایزدی ہے" یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب حضرت ابوبکر کی بیعت خلافت ہوئی تو ابوسفیان حضرت علی کے یہاں آئے اور کہا "تمہیں یہ بات پسند ہے کہ خلافت بنو تیم میں ہو؟" تو حضرت علی نے جواباً فرمایا "ابوسفیان! اسلام کا معاملہ جاہلیت سے مختلف ہے"۔

حضرت فاطمہ کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی مسلمان نے بھی حضرت فاطمہ کو مظلوم نہیں سمجھا اور نہ ہی ابوبکر کو ظالم تصور کیا تھا۔ بفرض محال اگر مسلمان حضرت فاطمہ کی امداد سے قاصر تھے تو آخر بات کرنے میں کیا حرج تھا؟

حضرت فاطمہؓ مظلوم نہ تھیں

جب کسی شخص نے نہ حضرت فاطمہ کی امداد کی نہ آپ کے حق میں ایک لفظ کہا تو یہ اس

بات کا روشن ثبوت ہے کہ آپ پر ظلم نہیں ڈھایا گیا تھا۔

اس پر مزید یہ کہ حضرت ابوبکر اس ضمن میں کسی کی گفتگو پر کان دھرنے سے منکر نہ تھے وہ طبعاً جابر بھی نہ تھے۔ نظر بریں یہ کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ الفت و مودّت کے اسباب کی موجودگی میں سب مسلمان رسول اکرم کی دختر نیک اختر کے دشمن بن گئے تھے۔ حضرت علی کا بھی یہی حال ہے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دور جاہلیت و اسلام میں جمہور قریش و انصار کو خصوصاً اور اہل عرب کو عموماً حضرت علی سے کوئی شکایت نہ تھی البتہ حضرت عمر فاروق بدو عربوں کے حق میں بڑے سخت تھے۔ یوں بھی آپ کی شدت و حدّت ضرب المثل کی حد تک معروف تھی۔ مگر بایں ہمہ آپ خلیفہ منتخب ہوئے اور اس قدر مقبول ہوئے کہ جب شہید ہوئے تو کوئی شخص آپ سے ناراض نہ تھا۔ بلکہ سب لوگوں کو آپ کی شہادت کا صدمہ ہوا۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ حضرت عمر کے بارے میں شیعہ کے دعاوی بے بنیاد ہیں نیز یہ کہ مسلمان حضرت فاطمہ کو قطعی طور پر مظلوم تصور نہیں کرتے تھے۔

پھر یہ بات کس قدر حیرت آفریں ہے کہ مسلمان حضرت عثمان کا قصاص لینے کے لیے تو اپنی جانیں تک قربان کر دیں مگر آپ کے اہل بیت کا کوئی یار و مددگار نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ صفین میں بنو عبد مناف کی مخالفت کے باوجود حضرت معاویہ کی نصرت و اعانت کے لیے گردنیں تک کٹوا دیں مگر حضرت ابوبکر کی بیعت کے بعد ان کو منصب خلافت سے الگ کرنے کے لیے کوئی مسلمان حضرت علی کا ساتھ نہ دے حالانکہ بنو عبد مناف ان کے ساتھ تھے۔ مثلاً عباس بن عبد المطلب بنی ہاشم میں سب سے بڑے تھے اور ابو سفیان بن حرب بنو امیہ میں سب سے بڑے تھے اور یہ دونوں اکابر حضرت علی کی طرف مائل تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے نازک مرحلہ پر لوگوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر حضرت ابوبکر کے خلاف صف آرائی کیوں نہ کی؟ حالانکہ صدیقی خلافت کا ابھی آغاز تھا اور حضرت علی کی نصرت و حمایت کے لیے لڑنا اولیٰ و افضل تھا۔ تاریخ اسلام کے ایسے نازک موڑ پر اگر کچھ لوگ سامنے آ کر یہ کہہ دیتے کہ علی وصی ہیں لہذا ہم کسی اور کی

بیعت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ نیز یہ کیونکر ممکن ہے کہ بنو ہاشم حضرت علی کو چھوڑ کر بنو تیم کے ظالموں اور منافقوں کا ساتھ دیں؟

اگر ایسا ہوتا تو عوام الناس ان کی حمایت کے لیے کھڑے ہو جاتے خصوصاً جبکہ حضرت ابوبکر کے پاس ترغیب و تخویف کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ فرض کیجیے حضرت ابوبکر کی امداد کے لیے حضرت عمر اور لوگوں کی ایک جماعت موجود تھی تو یہ لوگ کسی صورت میں بھی تعداد کے اعتبار سے ان لوگوں سے زیادہ نہیں ہو سکتے جو واقعۂ جمل میں طلحہ و زبیر اور واقعہ صفین میں حضرت معاویہ کے ساتھ تھے اور اس کے باوصف حضرت علی نے ان سے جنگ کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت علی کو ابوبکر صدیق کے خلاف نبرد آزما ہونے سے کیا چیز مانع تھی؟ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر حضرت علی حق پر ہوتے تو ابوبکر و عمر اور سابقین اولین صحابہ دنیا کے بدترین لوگوں میں سے ہوتے اور ان کا ظالم و جاہل ہونا کسی شک و شبہ سے بالا ہوتا۔ حالانکہ یہ بات ظاہر البطلان ہے۔

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ شیعہ مذہب کا بانی ملحد و زندیق اور دین اسلام و اہل اسلام کا دشمن تھا اور وہ تاویل کرنے والے مبتدعین مثلاً خوارج و قدریہ کی طرح نہ تھا۔ اہل ایمان میں شیعہ کے اقوال اس لیے رائج ہو گئے کہ وہ جہالت کی بنا پر کھرے اور کھوٹے میں امتیاز قائم نہ کر سکے۔[1]

---

[1] شیعہ کے یہاں یہ اصطلاح عام طور سے رائج ہے کہ وہ خواص اہل سنت کو "غافلین" اور عوام کو "مغفلین" کہہ کر پکارتے ہیں۔ جب کاظمی مصنف نے ان سطور کے راقم کو پریشان کرنے کے لیے اپنی کتاب "نجات المسلمین" تصنیف کی اور اس کتاب کے صفحہ ۲۰۰ پر احقر کے بارے میں یہ الفاظ تحریر کیے: "یہ شخص (محب الدین الخطیب) نہ غافل ہے نہ مغفل"۔ یہ تاثر اس نے تب ظاہر کیا جب دیکھا کہ ان سطور کا راقم حقائق سے بخوبی آگاہ ہے اور مجرمین کے جرائم کی نشاندہی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی یاوہ گوئی کو خاطر میں نہیں لاتا اس لیے کہ اس سے اپنا اور قارئین کرام کا وقت بے مقصد رائگاں جاتا ہے (محب الدین الخطیب) اللھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ۔

یہ بڑا اہم سوال ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کے تحت صحابہ نے جنگ جمل میں حضرت علی کے خلاف حضرت عائشہ کا ساتھ دیا مگر جب حضرت فاطمہ حضرت ابوبکر سے اپنا حق طلب کرنے کے لیے آئیں تو کوئی مدد کے لیے تیار نہ ہوا؟ اگر صحابہ دنیوی مال و متاع اور سیاسی اقتدار کے بھوکے تھے تو انھیں بنو ہاشم (حضرت علی) کا ساتھ دینا چاہیئے تھا جو عرب بھر میں ممتاز تھے۔ اسی بنا پر صفوان بن امیہ جمحی نے غزوۂ حنین کے موقع پر یہ کہا تھا۔ "بخدا اگر کوئی قریشی مجھے اپنا غلام بنالے تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ ثقیف کا کوئی آدمی میرا آقا ہو[1]۔"

جو لوگ فتح مکہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے صفوان ان میں سرکردہ آدمی تھا وہ سابقہ مقولہ کی طرح یہ بات کہنے کا حق رکھتا تھا۔ "اگر بنی عبد مناف کا کوئی شخص مجھے اپنا غلام بنالے تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ ثقیف کا کوئی آدمی میرا آقا ہو"۔ پھر یہ سوال بھی بے جا نہیں کہ جب صحابہ دنیوی اقتدار کے حریص تھے تو اس مقصد کے لیے عباس ابوبکر کی نسبت موزوں تر تھے پھر ان کو خلیفہ کیوں نہ بنالیا؟ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحابہ نے حق پر عمل کیا تھا اور وہ حق و صداقت کا دامن کسی صورت میں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔

ازواج النبی سب امہات المومنین تھیں

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "عائشہ کو ام المومنین کہہ کر پکارتے ہیں جبکہ دیگر امہات المومنین کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے اور ہر کس و ناکس اس سے آگاہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ شیعہ قلم کار کی واضح جہالت کا ثبوت ہے۔ کسی شخص سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ازواج النبی کو آیت قرآنی کے اتباع میں امہات المومنین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ البتہ شیعہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو حقائق کا منکر

---

[1] ایک روایت میں ثقیف کی بجائے "ہوازن" کا لفظ ہے۔ ہوازن و ثقیف دونوں بھائی بھائی تھے اور بنی منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان بن مضر کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ہو اور یہاں تک کہہ دے کہ حضرت حسین حضرت فاطمہ کے بیٹے نہ تھے جیسا کہ شیعہ کا فرقہ نصیریہ کہتا ہے۔ کہ حسن و حسین حضرت علی کے بیٹے نہ تھے بلکہ ان کے والد سلمان فارسی تھے۔ بعض شیعہ کا قول ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر آنحضور کے پہلو میں مدفون نہیں نیز یہ کہ حضرت رقیہؓ و ام کلثوم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں نہیں بلکہ کسی دوسرے خاوند سے حضرت خدیجہ کی بیٹیاں ہیں[۵]۔

شیعہ مصنف کا قول ہے

"عائشہ کے بھائی محمد بن ابی بکر کو "خال المومنین" (مومنوں کا ماموں) نہیں کہتے اور معاویہ کو اس لقب سے نوازتے ہیں"

ہم کہتے ہیں کہ یہ جاہل اہلسنت کا قول ہے اور وہ شیعہ کو چڑانے کے لیے اس طرح کہتے ہیں۔ ورنہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

علماء کے یہاں یہ امر متنازع فیہ ہے کہ آیا ازواج النبی کے بھائیوں کو "ماموں" کہا جائے یا نہیں؟ بعض نے اسے جائز ٹھہرایا ہے[۶]۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مومنوں کے

---

[۵] آخری شخص جس نے حضرت رقیہ و ام کلثوم کے دختر رسول ہونے سے انکار کیا ہے دشمن خدا محمد مہدی کاظمی قزوینی ہے۔ موصوف شیعہ مصنف نے اپنی کتاب منہاج ج ۲ ص ۲۹۱ نہ صرف دونوں کے دختر رسول ہونے سے انکار کیا ہے بلکہ وہ ان کی فضیلت و عظمت کا بھی منکر ہے ۱۲

[۶] چونکہ شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت کے منکر تھے اور اس میں وہ حد درجہ تجاوز کر گئے تھے اس کا ردعمل یہ ہوا کہ لوگوں نے حضرت معاویہ کو اس لقب (خال المومنین) سے نوازا۔ قاضی ابوبکر بن العربی المتوفی (۴۶۸ھ --- ۵۴۳ھ) لکھتے ہیں کہ انہوں نے عباسی خلافت کے زمانہ یعنی پانچویں صدی کے نصف ثانی اور چھٹی صدی کے نصف اول میں بغداد کی مساجد کے دروازوں پر یہ الفاظ لکھے ہوئے بچشم خود مشاہدہ کیے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگوں سے بہتر ابوبکر ہیں پھر عمر پھر عثمان پھر علی اور پھر مومنوں کے ماموں معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین (العواصم من القواصم ص ۲۱۳)

بہت سے ماموں اور خالہ ہوں گی۔ پھر اسی رشتہ سے ابوبکر و عمر نانا ٹھہریں گے۔ نیز یہ کہ جتنی خالہ ہوں گی ان سے نکاح حرام ہوگا حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ازواج النبی کے لیے نسب کے احکام ثابت نہیں ہیں البتہ حرمت کے پیش نظر ان کو امہات المومنین کہا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ نکاح حرام ہے البتہ وہ کسی کی محرم نہیں ہیں۔

جب روافض نے حضرت معاویہ کی تکفیر اور ان پر لعنت بھیجنے کی اجازت دیدی تو بعض اہل سنت نے آپ کو "خال المومنین" کے لقب سے ملقّب کیا۔ ہم شیعہ مضمون نگار سے پوچھتے ہیں کہ اس نے عبداللہ بن عمر کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ جو معاویہ اور محمد بن ابوبکر دونوں سے افضل تھے؟ محمد بن ابی بکر کے حضرت علی کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ یہ تھی کہ محمد آپ کے پروردہ اور آپ کی بیوی کے بیٹے تھے۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت علی نے آپ کی بیوی اور محمد کی ماں اسماء بنت عمیس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ عثمانی خلافت کے زمانہ میں حضرت عثمان نے محمد بن ابی بکر پر شرعی حد لگائی تھی جس سے ناراض ہو کر محمد نے آپ کے خلاف خروج کیا۔ حضرت علی کے عہد خلافت میں محمد بن ابی بکر آپ کی جانب سے والیٔ مصر قرار پایا۔ پھر لڑائی میں مارا گیا اور نعش جلا دی گئی اور اس طرح اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا اور قتل اس کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

روافض کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ حضرت علی کے معاونین کی مدح و ستائش میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ اسی عادت کے مطابق وہ محمد بن ابوبکر کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں جس کی حد یہ ہے کہ وہ محمد کو ان کے والد حضرت ابوبکر کے مقابلہ میں افضل قرار دیتے ہیں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ سرور کائنات کے بعد افضل امت پر تو لعنت بھیجی جائے اور ان کے اس بیٹے کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں۔ جس کو صحبت نبوی حاصل ہے اور نہ کوئی اور فضیلت۔ اس سے تعظیم فی الانساب میں تناقض لازم آتا ہے۔ اگر کسی شخص کے والد کے کافر یا فاسق ہونے سے اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا تو ہمارے نبی کریم حضرت ابراہیم اور حضرت علی کو ان کے

آباء کے کافر ہونے کی بنا پر کچھ ضرر لاحق نہیں ہوگا اور اگر ضرر پہنچتا ہے تو حضرت ابوبکر کے کفر و فسق (والعیاذ باللہ) سے یقیناً محمد بن ابی بکر کی ذات میں بھی قدح وارد ہوگی شیعہ محمد بن ابی بکر کے مداح ہیں اور ادھر جمہور اہل اسلام محمد کے بیٹے قاسم[1] اور اس کے پوتے عبدالرحمن بن قاسم کو اس سے افضل قرار دیتے ہیں۔ شیعہ محمد کے بیٹے قاسم اور پوتے عبدالرحمن کو صرف اس لیے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ شرارت پسند نہ تھے۔

باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "محمد بن ابی بکر عظیم المرتبت تھا"۔ تو اگر عظمت سے مراد عظمت نسب ہے تو یہ بیکار ہے اس لیے کہ شیعہ اس کے والد اور بہن کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے ہیں، اہل سنت کا معاملہ اس سے یکسر جداگانہ نوعیت کا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں عظمت و فضیلت کا مدار و انحصار نسب پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (سورۃ حجرات - ۱۳)

(تم میں سب سے زیادہ باعزت خدا کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو)

اگر شیعہ مصنف کے نزدیک محمد بن ابی بکر کی عظمت شان اس کی سبقت اسلام اور ہجرت و نصرت کی رہین منت ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمد صحابہ میں شمار نہیں ہوتا اور مہاجرین و انصار صحابہ کسی میں بھی وہ شامل نہیں اور اگر رافضی قلمکار محمد بن ابی بکر کو بہت بڑا دیندار تصور کرتا ہے تو وہ غلطی کا شکار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد علماء و فضلاء اور اپنے طبقہ کے صلحاء میں شمار نہیں ہوتا اور اگر جاہ و منزلت کی بنا پر رافضی مضمون نگار اسے عظیم

---

[1] قاسم بن محمد فقہائے سبعہ اور ان فضلاء میں سے تھے جو شریعت و سنت کی عمارت کے لیے ایک عظیم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان جو امام مالک و لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہما کے استاد تھے فرماتے ہیں کہ:۔

"میں نے قاسم سے بڑھ کر عالم حدیث نہیں دیکھا"[12]

قرار دیتا ہے تو یہ فضیلت حضرت معاویہ ہیں محمد بن ابی بکر کے مقابلہ میں زیادہ دیندار اور زیادہ حلیم و کریم تھے۔

حضرت معاویہ کے لیے یہ فضیلت کیا کم ہے کہ آپ حدیثیں روایت کرتے اور فقہی مسائل پر تنقید و تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ محدثین نے آپ کی روایات اپنی کتب میں مندرج کی ہیں۔ بعض علماء نے آپ کے فیصلہ جات اور فتاوی جمع کیے اس کے عین برخلاف حدیث و فقہ کی قابل اعتماد کتب میں محمد بن ابی بکر کا ذکر تک نہیں پایا جاتا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"محمد بن ابی بکر کا باپ اور اس کی بہن معاویہ کے باپ اور اس کی بہن سے افضل تھے"

ہم کہتے ہیں کہ یہ دلیل سابقاً ذکر کردہ دونوں قاعدوں کی بنا پر باطل ہے۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ اہل سنت کے یہاں کسی شخص کی فضیلت کا معیار حسب و نسب نہیں بلکہ اس کی اپنی ذات ہے۔ نظر بریں محمد کے لیے یہ امر ذرہ بھر مفید نہیں کہ وہ حضرت ابوبکر و عائشہ سے قریبی تعلق رکھتا ہے دوسری طرف یہ نسبی فضیلت حضرت معاویہ کے حق میں کچھ بھی قدح وارد نہیں کرتی۔ اہل سنت کے یہاں یہ معروف اصل ہے۔

اس قاعدہ کو ایک مثال کے ذریعہ یوں واضح کر سکتے ہیں کہ حضرت بلال و صہیب و خباب اور ان کے نظائر و امثال وہ لوگ ہیں جو سابقین اولین صحابہ میں شامل ہیں اور فتح مکہ سے قبل انفاق و جہاد کے ذریعہ عظیم انسانی و اسلامی خدمات انجام دے چکے تھے۔ دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے۔ مثلاً ابوسفیان بن حرب اور آپ کے دونوں بیٹے معاویہ و یزید۔ نیز ابوسفیان بن حارث۔ ربیعہ بن حارث اور عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔ یہ حسب و نسب کے اعتبار سے پہلے لوگوں کے مقابلہ میں افضل ہیں جب کہ وہ شرافت نسبی سے بہرہ ور نہیں۔ مگر جو فضیلت پہلے لوگوں کے حصہ میں آئی۔ دوسرے اس میں شریک نہیں ہیں اگر فضیلت و شرافت کا مدار حسب و نسب پر ہوتا تو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والے یہ قریش سب سے زیادہ افضل و اکرم ہوتے۔

اگر روافض حسب ونسب کو فضیلت کا معیار قرار دیں تو محمد ان کے اس معیار پر بھی پورے نہیں اترتے بلکہ وہ ان کے وضع کردہ قاعدہ کی بنا پر شر الناس ٹھہریں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ محمد کے والد حضرت ابوبکر اور ان کی ہمشیرہ حضرت عائشہ صدیقہ کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اپنے قاعدہ کے مطابق محمد بن ابی بکر عظیم المرتبت نہیں ہو سکتے اور اگر شیعہ اہل سنت کو قائل کرنے کے لیے الزامی جواب کے طور پر محمد بن ابی بکر کے حق میں یہ بات کہتے ہیں تو اہل سنت تو صرف تقویٰ کو معیار عظمت وشرافت قرار دیتے ہیں اور بس! جس کی دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلیق بن طلیق (جو لوگ فتح مکہ کے دن اسلام لائے ان کو طلیق کہتے ہیں اسکی جمع طلقاء ہے) معاویہ پر لعنت کی اور فرمایا کہ جب اسے میرے منبر پر دیکھو تو قتل کر دو۔ معاویہ کو کاتب وحی کہا جاتا ہے حالانکہ اس نے وحی کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا وہ صرف خطوط لکھا کرتا تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے

ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث کسی اسلامی کتاب میں نہیں ہے۔ حفاظ حدیث اسے جھوٹ تصور کرتے ہیں محدث ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ مزید یہ کہ معاویہ سے بھی بدتر لوگ آپ کے منبر پر چڑھے اور انہیں قتل نہ کیا جا سکا۔ باقی رہا رافضی کا قول "طلیق بن طلیق" تو اس میں مذمت کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ فتح مکہ کے روز جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے انہوں نے خلوص دل سے دین کو قبول کیا تھا مثلاً حارث بن ہشام اور ان کا بھتیجا حضرت عکرمہ، سہیل بن عمروؓ، صفوان بن امیہ، یزید بن ابی سفیان، حکیم بن حزام اور ان کے

لے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے حضرت معاویہ کو منبر رسول پر دیکھا تھا اور آپ کی اقتداء میں نماز بھی پڑھی اس لیے کہ آپ شرعی امام اور نائب رسول تھے ۱۲

(باقی بر صفحہ ۳۶۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۱) ۵۲ سہیل بن عمرو خطیب قریش تھا اور بنی عامر بن لوئیؓ کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ قریش کا سفیر بن کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ فتح مکہ کے دن جب آپ نے اہل مکہ کو خطاب کر کے کہا تھا کہ "تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟" تو وہ سہیل ہی تھا جس نے یہ جواب دیا "ہم بھلائی کی توقع رکھتے ہیں کیونکہ آپ اچھے بھائی اور اچھے بھتیجے ہیں"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا۔ میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہی تھی "آج تم پر کچھ عتاب نہیں"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلب کے طور پر سہیل کو سو اونٹ عطا کیے۔

خلافت فاروقی میں مہاجرین و انصار حضرت عمر کے دروازہ پر کھڑے تھے اور آپ انہیں مقام و مرتبہ کے مطابق باری باری اندر بلاتے جاتے تھے اس موقع پر فتح مکہ کے دن مسلمان ہونے والے چند صحابہ بھی موجود تھے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے سہیل بن عمرو نے یہ دیکھ کر کہا تم خود قصور وار ہو۔ جب آنحضور نے دعوت اسلام دی تو انہوں نے جلدی اس دعوت پر لبیک کہا اور تم نے دیر لگا دی اب اسی تاخیر کا خمیازہ بھگت رہے ہو جب جنت کے دروازوں کی جانب دعوت دی جائے گی تو اس وقت کیا کیفیت ہوگی"۔ یہ کہہ کر سہیل جہاد کے لیے روانہ ہوئے اور کہا "بخدا میں نے جتنی لڑائیاں کفار کے ساتھ ہو کر لڑی ہیں اب اسی قدر مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لیے لڑوں گا اور جتنا مال میں نے کفر کی حمایت میں صرف کیا تھا اتنا ہی مسلمانوں پر خرچ کروں گا"۔

علی ہذا القیاس جب ہم ایک ایک کر کے صحابہ کرام کے سیر و سوانح کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زندگی سے ہمیں ایسے زریں سبق ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کو خیر الامت قرار دینا ہی قرین مصلحت تھا۔ امام شافعی سہیل بن عمرو کے بارے میں فرماتے ہیں "یہ جب سے اسلام لائے تھے اسی وقت سے خالص الاسلام تھے"۔

جن لوگوں کو شیعہ اور ان کے اتباع طنزاً "طلقاء" کہہ کر پکارتے ہیں ان کے بارے میں انھیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ اولیاء اللہ و اصحاب رسول ہیں سے تھے ان میں بعض لوگ سہیل بن عمرو سے بھی افضل اور جہاد میں پیش پیش تھے۔ ان کے سرخیل حضرت معاویہ اور ان کے بھائی

(باقی بر صفحہ ۳۶۳)

نظائر و امثال یہ سب لوگ خالص الاسلام تھے۔ حضرت معاویہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو دل کی سچائی سے اسلام لائے۔ حضرت عمر فاروق نے حضرت معاویہ کے بھائی یزید کے بعد ان کو والیٔ شام مقرر کیا تھا۔ حضرت عمر بے جا طرفداری کرنے والے نہ تھے اور نہ انھیں کسی کی ملامت کی پرواہ تھی۔ مزید برآں معاویہ کے والد ابوسفیان کے ساتھ آپ کے دوستانہ مراسم بھی نہ تھے بلکہ فتح مکہ سے پہلے جب حضرت عباس ابوسفیان کو بارگاہ نبوی میں لائے تھے تو آپ اسے قتل کرنا چاہتے تھے اگر حضرت عمر نار وا حمایت کرنے والے ہوتے تو قبیلہ بنی ساعدی میں سے اپنے اقارب کو کلیدی آسامیوں پہ متعین فرماتے۔

حضرت معاویہ دمشق اور دیگر بلاد شام میں بیس سال تک امیر اور بیس سال تک خلیفہ رہے۔ آپ کی رعایا آپ کے حسن سلوک، تالیف قلب اور خوبیٔ انتظام و انصرام کی مداح تھی اور آپ پہ جان چھڑکتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ صفین میں انھوں نے حضرت علی کا ساتھ نہ دیا۔ حالانکہ حضرت علی حضرت معاویہ کے نظائر و امثال سے افضل و اولی بالحق تھے۔ حضرت معاویہ کے فوجی حضرت علی کی فضیلت کے معترف تھے تاہم انہوں نے جنگ میں حضرت معاویہ کا ساتھ دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت علی کی فوج میں قاتلین عثمان شامل ہیں۔ جنھوں نے سراسر ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ لڑائی کا آغاز کرنے والے بھی حضرت علی کے ساتھی تھے اور حملہ آور سے لڑنا روا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کے سرگرم معاون اشتر نخعی نے کہا تھا "لوگ ہمارے مخالفین کی مدد کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے لڑائی کا آغاز کیا ہے"۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت علی قاتلین عثمان کی سرکوبی سے قاصر تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے امراء و اعوان آپ کی اطاعت نہیں کرتے تھے اسکے برعکس حضرت معاویہ کے رفقاء آپ کے مطیع فرمان تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۲) تھے جن کے اسلام پہ شبہ کے اشارات ہیں۔ حضرت معاویہ کی چھوٹی سے چھوٹی فضیلت یہ ہے کہ آپ اولیں اسلامی بحری بیڑے کے بانی اور پہلے شخص تھے جس نے سمندر میں بحری جنگ کا آغاز کیا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام قبا میں جو خواب دیکھا تھا اس میں آپ نے اس پیشگوئی کا اظہار فرمایا۔[۲]

شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے۔

"معاویہ حضرت علی کے خلاف صف آرا ہوئے حالانکہ حضرت علی اہل سنت کے نزدیک چوتھے خلیفہ برحق تھے اور جو شخص خلیفۂ برحق سے لڑتا ہے وہ باغی اور ظالم ہوتا ہے"۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ باغی بعض اوقات بنا بر تاویل اپنے آپ کو حق پر تصور کرتا ہے۔ بعض دفعہ اس کی بغاوت کی محرک اس کی تاویل بازی شہوت نفس یا کوئی شک وشبہ ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ اعتراض سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہم حضرت معاویہ بلکہ ان سے افضل لوگوں کو بھی منزہ عن الخطاء تصور نہیں کرتے۔

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی تھے

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ تاریخ میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مسور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلوت نشین تھے۔ معاویہ نے پوچھا آپ مجھ میں کیا عیب دیکھتے ہیں؟ مسور نے چند امور کا ذکر کیا حضرت معاویہ نے کہا "اے مسور! کیا آپ سے کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں"؟ کہا "ہاں" حضرت معاویہ نے پوچھا "کیا تمہیں مغفرت کی امید ہے"؟ مسور نے کہا "کیوں نہیں" حضرت معاویہ نے کہا "تم مجھ سے زیادہ رحمتِ خداوندی کے امیدوار کیونکر ہوئے"؟ بخدا مجھے جب بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے سوا کسی دوسری چیز میں اختیار دیا گیا تو میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ترجیح دی۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ جہاد، اقامت حدود، امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں میرے اعمال کا پلڑا آپ سے بھاری ہے۔ علاوہ ازیں میں ایسے دین پر عمل پیرا ہوں جس کا خدا حسنات کو قبول کرتا اور سیئات سے درگذر کرتا ہے۔

اگر خوارج و نواصب شیعہ حضرات سے پوچھیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مومن ہونے کی کیا دلیل ہے؟

تو شیعہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا مشرف باسلام ہونا اور آپ کی کثرت عبادت تواتر سے ثابت ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہہ سکتے ہیں کہ تواتر سے تو ابوبکر و

عمر کا اسلام و تقوی بھی ثابت ہوتا ہے مگر تم اُسے تسلیم نہیں کرتے پھر ہمارے اور تمہارے مابین کیا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے؟ اگر شیعہ ظواہر قرآنیہ سے احتجاج کریں تو یہ حضرت علی اور ابوبکر و عمر فریقین کو شامل ہیں اگر روافض پوری جماعت کو اس فضیلت سے مستثنیٰ کریں گے تو ہم حضرت علی کو اس سے الگ کر دیں گے۔

اگر شیعہ صحابہ کے بارے میں وارد شدہ فضائل و مناقب سے احتجاج کریں تو یہ فضائل حضرت ابوبکر و عمر کی شان میں بھی وارد ہیں لہذا ان کو بھی قبول کرنا چاہیے اور اگر شیعہ صحابہ کو مطعون کریں گے تو حضرت علی بھی اس سے بچ نہیں سکتے اگر شیعہ اس بات سے احتجاج کریں کہ لوگوں نے حضرت علی کی بیعت کی تھی تو خوارج و نواصب کہہ سکتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ کی بیعت اس سے کہیں بڑھ کر تھی اس لیے کہ اہل شام اور اکثر اہل مصر نے حضرت علی کی بیعت نہیں کی تھی۔

نواصب کہتے ہیں کہ حضرت علی باغی تھے آپ نے امن عامہ میں خلل ڈالا اور لڑائی کا آغاز کر کے بلا وجہ امت کا خون بہایا۔ حضرت علی کی خلافت میں شمشیر کفار سے دور اور مسلمانوں کے سر پر آویزاں رہی۔

خوارج حضرت عثمان و علی دونوں کو مورد طعن بناتے ہیں۔ عمرو بن عبید اور معتزلہ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ علی و عثمان دونوں میں سے ایک فاسق تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے؟ امام ذہبی کہتے ہیں معتزلہ کا یہ قول جنگ جمل کے بارے میں ہے یوم صفین سے متعلق عمرو بن عُبَید، واصل ابن عطا اور ابوہذیل علّاف کہتے ہیں کہ حضرت علی حضرت معاویہ کے خلاف برسر پیکار ہونے میں حق بجانب تھے یہ روایت امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ خوارج کی ایک جماعت کہتی ہے کہ حضرت علی حق پر تھے مگر تحکیم کے بعد کافر ہو گئے۔

حدیث عمار کا جواب

اگر کہا جائے کہ حضرت معاویہ کے ساتھی باغی تھے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "تجھے باغی جماعت قتل کرے گی"۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے[۱]۔

بعض محدثین نے اس حدیث پر جرح کی ہے۔ بعض نے اس کی تاویل کی ہے اور باغی سے طالب مراد لیا ہے مگر یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ امام ابو حنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہ کے رفقاء میں باغی لشکر کے شرائط نہیں پائے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ آغاز کار میں ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا[۲]۔ بلکہ ارشاد ہوا کہ جب دو فریق لڑ

۱۔ یہ الفاظ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت ارشاد فرمائے۔ باقی صحابہ ایک ایک اینٹ لاتے تھے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دو دو یہ دیکھ کر آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے یہ روایت ابو سعید خدری نے عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور علی بن عبداللہ بن عباس کو سنائی ۱۲

۲۔ محب الدین الخطیب العواصم من القواصم ص ۱۷۰ میں حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جنگ صفین میں آپ کی حیثیت ایک باغی کی نہ تھی کیونکہ آپ نے اس کا آغاز نہیں کیا تھا۔ بخلاف ازیں معاویہ لڑائی کے لیے اس وقت نکلے جب حضرت علی نے کوفہ سے نکل کر شام پر حملہ کرنے کے لیے نخیلہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمار مارے گئے تو حضرت معاویہ نے فرمایا۔ "عمار کے قتل کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو ان کو یہاں لائے"۔

الخطیب فرماتے ہیں۔ "میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں جو مسلمان حضرت عثمان کے بعد مارے گئے ان کے قتل کے ذمہ دار حضرت عثمان کے قاتل ہیں اس لیے کہ انہوں نے فتنہ کے دروازوں کو کھولا اور عرصہ مدید تک اس کو ہوا دیتے رہے اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مابین جذبات حقد و عناد کے بھڑکانے کا موجب ہوئے۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا سانحہ فاجعہ پیش نہ آتا تو جنگ جمل و صفین وقوع پذیر نہ ہوتے جس طرح یہ فتنہ پرداز احمق قتل عثمان کے مرتکب ہوئے اسی طرح اس واقعہ کے بعد تہ تیغ ہونے والے مسلمانوں کے قاتل بھی یہی لوگ ہیں۔ مقتولین میں نہ صرف حضرت عمار بن یاسر بلکہ ان سے افضل لوگ بھی شامل ہیں مثلاً طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اس فتنہ پردازی کا انجام یہ ہوا کہ ان لوگوں نے حضرت علی کو شہید کر کے دم لیا۔ حالانکہ یہ آپ کے لشکر میں شامل تھے۔

(باقی بر ص ۳۶۷)

پڑیں۔ تو ان میں صلح کرادی جائے۔ پھر جو جماعت ظلم و تعدی کی مرتکب ہو اس سے لڑا جائے اسی بنا پر امام احمد اور امام مالک اسے "جنگ فتنہ" قرار دیتے ہیں امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ "باغیوں سے اس وقت لڑنا جائز ہے جب وہ حاکم وقت کے خلاف نبرد آزما ہوں"۔ مگر حضرت معاویہ نے جنگ کا آغاز نہیں کیا تھا۔

اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ امام حق کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر اس شخص سے لڑا جائے جو اس کی اطاعت کے دائرہ سے خارج ہو یہ بھی ضروری نہیں کہ معصیت میں بھی اس کی اطاعت کی جائے اس حالت میں اس کا ساتھ چھوڑ دینا افضل ہے اسی بنا پر صحابہ کی ایک جماعت نے اہل شام کے خلاف حضرت علی کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

جو لوگ حضرت علی کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے وہ تین حال سے خالی نہیں

(۱) وہ عاصی ہوں گے

(۲) خطا کار مجتہد ہوں گے

(۳) یا اپنے اجتہاد میں صحت و صواب کے حامل ہوں گے

بہر کیف کوئی صورت بھی ہو اس سے ان کے ایمان میں اور جنتی ہونے میں قدح وارد نہیں ہوتی۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۶) مذکورہ صدر بیان سے عیاں ہے کہ ذکر کردہ حدیث نبوی اعلام نبوت میں سے ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ صفین میں لڑنے والے دونوں فریق زمرۂ مومنین میں شامل تھے۔ حضرت علی بلاشبہ حضرت معاویہ سے افضل تھے تاہم دونوں صحابۂ رسول اور دین اسلام کے رکن رکین تھے اس دور میں جس قدر فتنے بپا ہوئے اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اس آگ کو ہوا دی۔ آنے والے ادوار میں تا قیام قیامت جو لوگ ان کے فعل کو سراہتے ہیں وہ ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ قاتلین عثمان ہی وہ باغی ہیں جو لعد میں قتل ہونے والے سب مسلمانوں کے ذمہ دار ہیں۔ اسی طرح لعد ازاں جو فتنے بپا ہوئے اس کا اصل سرچشمہ وہی فتنہ پرداز لوگ ہیں۔ اللھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ

"اگر مومنوں کی دو جماعتیں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ اگر ایک فریق دوسرے پر ظلم و تعدی کا مرتکب ہو تو اس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ حکم خداوندی کی جانب واپس آجائے اندریں صورت بہ تقاضائے عدل ان میں صلح کرادو کیونکہ اللہ تعالےٰ با انصاف لوگوں کو چاہتا ہے۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں لہذا بھائیوں کے درمیان صلح کرادیجئے (سورۃ الحجرات ۹-۱۰)

اس آیت میں متحارب فریقین کو "اِخوۃ" فرمایا ہے۔

شیعہ مصنف کا حضرت معاویہ کے بارے میں یہ کہنا کہ "اس نے وحی کا ایک لفظ بھی تحریر نہیں کیا" اس کے دیگر دعاوی کی طرح کذب صریح ہے۔[ل]

حضرت معاویہ پر اعتراضات

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"جب مکہ فتح ہوا تو معاویہ یمن میں آنحضور کو مورد طعن بنانے میں مشغول تھے۔ جب ان کے والد ابوسفیان حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو معاویہ نے ان کو عار دلانے کے لیے چند اشعار لکھے اور یہ بھی کہا کہ تم دین محمد اختیار کرکے صابی ہو گئے ہو۔ آنحضور نے معاویہ کو مباح الدم قرار دیا تھا۔ جب کوئی جائے پناہ نہ ملی تو مجبوراً بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر آنحضور کی وفات سے صرف پانچ ماہ قبل اپنے اسلام کا اظہار کیا اور معافی طلب کرنے کے لیے حضرت عباس پر گر پڑے۔ ابن عمر نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "ابھی یہاں ایک شخص آئے گا جس کی موت تارک سنت ہونے کی حالت میں ہوگی" اتنے میں معاویہ نمودار ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خطبہ دینے کے لیے

ل رافضی قلمکار نے خود تسلیم کیا ہے کہ حضرت معاویہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط لکھا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے خطوط میں بھی وہی بات ہوتی ہوگی جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوئی ہو قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (سورۃ النجم)

علاوہ ازیں آپ لکھواتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھتے تھے کہ یہ وحی ہے یا غیر وحی۔ جو صحابہ بھی آپ کی خدمت میں کتابت کا کام کرتے تھے وہ ہر ایسی چیز لکھتے جس کی ضرورت ہوتی تھی ۱۲

ملتے۔ اسی دوران معاویہ اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ تھامے باہر چل دیے تو آپ نے فرمایا۔ اللہ قیادت کرنے والے اور جس کی قیادت کی گئی ہے دونوں پر لعنت کرے"۔

معاویہ نے حضرت علی کے خلاف جنگ میں پورا زور لگایا اور بہترین صحابہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔ خلافت معاویہ میں بر سر منبر حضرت علی پر لعنت بھیجی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ اسی سال تک جاری رہا اور عمر بن عبدالعزیز نے اسے بند کیا۔ معاویہ نے حضرت حسن کو زہر کھلایا اور اس کے بیٹے یزید نے حضرت حسین کو شہید کیا اور ان کا مال و متاع لوٹا۔ معاویہ کے والد ابو سفیان نے غزوۂ احد میں آنحضور کے اگلے دانت توڑے اور اس کی ماں نے حضرت حمزہ کا جگر چبایا تھا"۔

ہم تردیداً کہتے ہیں کہ خدا کی ذات پاک ہے جس نے کذب و دروغ کو روافض کا خاصہ بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابو سفیان آنحضور کے مکہ وارد ہونے سے پہلے اس وقت اسلام لائے تھے جس رات آپ مرّ الظہران نامی مقام پر اترے تھے۔ حضرت عباس نے بارگاہ نبوی میں عرض کیا "یا رسول اللہ! ابو سفیان عزت و وقار کے خواہاں ہیں"۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا "جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو اسے امن دیا جائے۔ اور جو مسجد میں داخل ہو وہ بھی امن کا مستحق ہے اور جو ہتھیار ڈال دے وہ بھی مامون ہے"۔

ابو سفیان دلائل نبوت سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے اسلام لانے سے چند ماہ قبل خود ہرقل کی زبان سے آنحضور کی رسالت کے براہین و دلائل سنے تھے[1]

---

[1] ظہران چند مقامات کا نام ہے۔ اس سے مراد یہاں وہ وادی ہے جو مدینہ سے مکہ آتے ہوئے راستہ میں پڑتی ہے۔ اس وادی کے قریب ایک گاؤں مرّ نامی آباد تھا اس وادی کی مناسبت سے اسے مرّ الظہران کہنے لگے۔ اسی وادی میں ابو سفیان رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے حدیث میں ابو سفیان کے جس گھر کا ذکر کیا گیا ہے یہ وہی جگہ ہے جہاں مکہ میں دولت عثمانیہ کے آخری دور میں ایک شفاخانہ "مستشفی القبان" نامی تعمیر کیا گیا تھا (باقی بر صفحہ ۳۷۰)

علاوہ ازیں اس نے امیہ بن ابی الصلت سے بھی استفادہ کیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۹) یادگار کے طور پر اس گھر کے ایک حصہ میں مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ میں نے بچشم خود خوبصورت عثمانی خط میں یہ الفاظ دیکھے "مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِیْ سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ"۔ گھر کے اندر مسجد کے قریب ایک حوض تھا جس میں پانی بہ رہا تھا۔ شاید مکہ میں صرف یہی ایک حوض ہے جس میں ہمیشہ پانی بہتا رہتا ہے۔ ابوسفیان کے گھر کو یہ عظیم خصوصیت اس لیے عطا ہوئی کہ مکہ کے لوگ جب آنحضور کو ایذا دیا کرتے تھے تو آپ ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزین ہوتے (دیکھئے الاصابہ لابن حجر ج ۲ ص ۱۷۹ بروایت طبقات ابن سعد)

بدیں وجہ ابوسفیان پہلا شخص تھا جو قرابت داری کی بنا پر آپ سے وابستہ تھا اور اس لیے محبت کیے جانے کا مستحق تھا اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى (سورہ شوریٰ)

(آپ فرمادیں کہ میں اپنے اقارب کے ساتھ محبت رکھنے کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا)

ابوسفیان کے حلقہ بگوش اسلام ہونے سے پہلے بھی آنحضور اور ابوسفیان کے مابین قرابت دارانہ الفت و مودت کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ کے ہاتھ ابوسفیان کو بہترین قسم کی کھجوریں ہدیہ کی تھیں۔ ابوسفیان نے یہ ہدیہ قبول کیا اور آپ کی خدمت میں چمڑے کا تحفہ بھیجا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے یہ ہدیہ خود طلب فرمایا تھا۔ ابوسفیان کے مسلمان ہونے سے پیشتر آنحضور نے ان کی بیٹی ام حبیبہ سے نکاح کیا تھا ام حبیبہ کا نام پہلے رملہ تھا۔ یہ مسلمان ہو کر اپنے خاوند عُبَید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ چلی گئی تھیں۔ عبید اللہ وہاں نصرانی ہو گیا اور اسی جگہ اس کی موت واقع ہوئی۔ ام حبیبہ نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص انھیں "ام المومنین" کہہ کر پکار رہا ہے۔ جونہی ان کی عدت گذری نجاشی شاہ حبشہ کی ایک لونڈی حاضر ہوئی اور کہا "شاہ حبشہ نے پیغام بھیجا ہے کہ نکاح کے لیے آپ اپنا وکیل مقرر کر لیں"۔

چنانچہ آپ نے خالد بن سعید بن عاص کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ جعفر بن ابی طالب (باقی بر صفحہ ۳۷۱)

تاہم حسد کا جذبہ اسے ایمان سے مانع رہا یہاں تک کہ بحالت کراہت اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۰) نے نجاشی کے حکم سے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ نجاشی نے آنحضور کی جانب سے چار صد دینار مہر ادا کیا۔ ام حبیبہ نے نجاشی کی لونڈی کو چاندی کے دو کنگن ہدیہ کیے۔ ام حبیبہ سے نکاح کا مطالبہ کرنے میں نجاشی کی جانب آنحضور نے عمرو بن امیہ کو قاصد بنا کر بھیجا۔ یہ وہی عمرو ہے جو کھجوروں کا ہدیہ لے کر ابوسفیان کے ہاں گیا تھا اور پھر ابوسفیان کا ہدیہ آپ کو پہنچایا۔ حضرت ام حبیبہ آنحضور کے قاصد شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ حبشہ سے مدینہ پہنچیں ابوسفیان تاہنوز مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جب ام حبیبہ کے آنحضور کے نکاح میں آنے کی خبر پہنچی تو آپ کی مدح کرتے ہوئے کہا۔ "یہ نر مجھے رسوا نہیں کرے گا"۔ ابوسفیان جب مشرف باسلام ہوئے تو آنحضور نے آپ کو قریش کے مشہور بت "منات" کو منہدم کرنے کے لیے مامور فرمایا۔ چنانچہ آپ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ غزوہ حنین و طائف کے موقع پر ابوسفیان آنحضور کے ہم رکاب تھے۔ غزوہ طائف میں ابوسفیان کی آنکھ میں تیر لگا۔ شدید درد ہو رہا تھا۔ اسی اثنا میں سرور کائنات نے فرمایا۔ اگر آپ چاہیں تو بارگاہ ایزدی میں آنکھ کی واپسی کے لیے دعا کروں اور آپ کو دوبارہ آنکھ عطا ہو اور اگر آپ چاہیں تو اس کے عوض جنت خرید لیں۔ ابوسفیان نے کہا میں جنت کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ وعدہ سرکار دو عالم نے جہاد کے موقع پر فرمایا۔ جو اکمل العبادات ہے اس سے ابوسفیان کا جنتی ہونا واضح ہوتا ہے۔ خواہ اس کو ناپسند کرنے والا کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو۔ یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ آنحضور کی وفات کے بعد ابوسفیان راہ خدا میں مسلسل جہاد کرتے رہے۔

ابن سعد بسند صحیح سعید بن مسیب سے روایت کرتے ہیں وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ یرموک کے دن سب آوازیں خاموش ہوگئی تھیں صرف ایک آواز آ رہی تھی "یا نَصْرَ اللهِ اقْتَرِبْ"۔

سعید بن مسیب کے والد ان لوگوں میں سے تھے جو بیعت الشجرہ میں شامل تھے۔ یہ کہتے ہیں میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پکارنے والا ابوسفیان تھا جو اپنے بیٹے یزید کے جھنڈے تلے مصروف پیکار تھا۔ (باقی بر صفحہ ۳۷۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۱) یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ کذب و دروغ کے خوگر روافض کے نزدیک ان مجاہدین ابرار کی شان میں گستاخی کرنا اور ان کے بارے میں غلط سلط روایات بیان کرنا گویا کوئی جرم ہی نہیں۔ دوسری جانب اہل سنت کا یہ حال ہے کہ یہ سب بدگوئی سنکر اس لیے ان سنی کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کا شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔ یہ اچھی شیرازہ بندی ہے کہ خلفائے ثلاثہ اور ان مجاہدین صحابہ کی شان میں گستاخی کی جاتی ہے جنہوں نے اقصائے عالم میں دین حق کے جھنڈے گاڑے تھے اور ان کے سیر و سوانح کا حلیہ بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور ادھر اہل سنت ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یاد رہے کہ اسلام کی شیرازہ بندی کثرت تعداد سے نہیں بلکہ اکابر اولیاء اللہ مثلاً ابو بکر و عمر اور ان کے متبعین سے ہوتی ہے۔ جب تک لوگ ان مجاہدین ابرار کی محبت سے سرشار رہے اور اپنے آپ کو ان کے اخلاق و عادات سے آراستہ کیے رکھا دین حق ترقی پذیر رہا۔ دین کی تفریق دراصل یہ ہے کہ روافض کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ صحابہ کے محاسن کو معائب بنا کر پیش کریں اور نہایت مذموم انداز میں ان کی تصویر کھینچیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ حسد کے لفظ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی جانب اشارہ کیا ہے جسے ابن سعد نے ابو السفر سعید بن یحمد ہمدانی ثوری المتوفی ۱۱۲ھ سے روایت کیا ہے کہ ابوسفیان نے جب مر الظہران کے مقام پر یہ دیکھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور ہر شخص آپ کے بہت قریب آنا چاہتا ہے تو آتش حسد سے جل اٹھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے اس کے سینہ پر دے مارے اور کہا "تب اللہ آپ کو رسوا کرے گا"۔ ابوسفیان نے کہا "میں توبہ کرتا اور خدا سے اپنے گناہ کی مغفرت چاہتا ہوں۔ بخدا میرے جی میں یہ خیال ضرور آیا تھا۔ البتہ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا"۔

ابو اسحاق السبیعی نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے مگر یہ الفاظ زائد ہیں کہ ابوسفیان نے کہا "مجھے اسی وقت یقین آیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں"۔ (باقی بر ص ۳۸۳)

نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ اس کے ذکر کردہ اشعار بھی جھوٹے ہیں۔
جو لوگ متاخر الاسلام ہیں مثلاً صفوانؓ بن امیہ اور حارثؓ بن ہشامؓ ان پر طعن و تشنیع کرنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۲) یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ابوسفیان حضرت عباس کی معیت میں مشرف باسلام ہونے کے لیے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے یہ چند لمحات ابوسفیان پر اس وقت گذرے جب وہ اپنا پرانا دین چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو رہے تھے اس کو حسد کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ابوسفیان جاہ و ریاست کی گود میں پلے تھے ایسے وقت میں ان کا کفر و ایمان کے مابین تردد و تذبذب حب سیادت و قیادت کی دلیل ہے اس پر مزید یہ کہ ابھی تک ان کی ملاقات آنحضور سے نہیں ہوئی تھی اور وہ کلام الٰہی سے بھی ناآشنا تھے۔ بنا بریں راہ ایمان پر مخلصانہ گامزن ہونے کے لیے ابوسفیان ایسے معجزہ کے محتاج تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوسفیان بارگاہ ایزدی میں تائب ہوئے اور دین اسلام آپ میں رچ بس گیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ صفوان کا شمار ان دس آدمیوں میں ہوتا ہے جو دور جاہلیت میں بڑے معزز سمجھے جاتے تھے۔ یہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ آنحضور نے ان کو امان دی تھی اور ان کے چچازاد بھائی عمیر بن وہب جمحی ان کو لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ صفوان نے غزوۂ حنین میں آنحضور کے ساتھ شرکت کی حالانکہ وہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین میں ان سے جنگی ہتھیار مستعار لیے تھے قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ صفوان نے غزوۂ حنین میں یہ مشہور فقرہ کہا تھا۔ "اگر قریش کا کوئی شخص مجھے غلام بنا لے تو اس سے بہتر ہے کہ بنی ثقیف کا کوئی شخص میرا آقا ہو"۔ جب سرور کائنات نے غزوۂ حنین میں صفوان کو بہت سا مال عطا کیا تو اس نے کہا "میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے نبی کے سوا کوئی شخص اتنا مال دینا گوارا نہیں کرتا۔"
جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں مدینہ پہنچے تو صفوان حضرت عباس کے یہاں مہمان ٹھہرے پھر آپ نے صفوان کو واپس مکہ جانے کی اجازت دیدی۔ صفوان دور جاہلیت میں بڑے مخیر تھے اور فقراء و مساکین کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ یہ بڑے فصیح اللسان تھے ان کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ کو یہ اوصاف ورثہ میں ملے۔ مکہ کا (باقی برصفحہ ۳۷۴)

روا نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۳) ایک شخص حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا۔ آجکل لوگوں کو مکہ میں کھانا کون کھلاتا ہے؟ اس نے کہا "عبد اللہ بن صفوان"۔ حضرت معاویہ نے فرمایا "یہ آگ بڑی پرانی ہے"۔

ایک سال حضرت معاویہ حج کو گئے تو عبد اللہ بن صفوان آپ کے پہلو میں چلتے تھے۔ اہل شام نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ جب لشکر مکہ میں داخل ہوا تو ایک قریبی پہاڑ بکریوں سے سفید تھا۔ عبد اللہ بن صفوان نے کہا۔ "امیر المومنین! یہ دو ہزار بکریاں میں نے آپ کے رفقاء کی مہمانی کے لیے رکھی ہیں"۔ یہ سن کر اہل شام کہنے لگے۔ ہم نے اس سے زیادہ سخی آدمی آج تک کبھی نہیں دیکھا ۱۲

سلہ حارث بن ہشام مخزومی ابوجہل کے بھائی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ابن العم تھے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ان سے بڑی اہم روایات نقل کی ہیں۔ یہ شرفاء مکہ میں شمار ہوتے تھے اور کفار قریش کے ساتھ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت مشہور صحابی شاعر نے جب بدر سے بھاگ جانے کی عار دلائی اور انہوں نے اشعار میں اس کا جو جواب دیا کہا جاتا ہے کہ وہ اعتذار من الفرار میں عمدہ ترین اشعار ہیں۔ یہ فتح مکہ کے دن اسلام لائے اور بڑے مخلصانہ انداز میں اسے قبول کیا۔ حارث ثقیفہ بنی ساعدہ میں حاضر ہوئے تھے ان دنوں بنو مخزوم کا کوئی شخص ان کا ہمسر نہ تھا۔ حارث نے کہا۔

"بخدا اگر آنحضور کا یہ ارشاد گرامی نہ ہوتا کہ اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ تو ہم انصار کو خلافت سے محروم نہ رکھتے اور وہ اس کے اہل ثابت ہوتے۔

مگر یہ ایک ایسا قول ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں خدا کی قسم اگر سارے قریش میں سے ایک شخص بھی زندہ ہوتا تو اللہ تعالے اسے امارت و خلافت کا منصب تفویض فرماتے"۔ حضرت عمر کے زمانہ میں جب ملک شام فتح ہوا۔ تو حارث اہل و مال سمیت مکہ سے شام منتقل ہو گئے۔ اہل مکہ بھی ساتھ ہوئے تو حارث نے ان کو مخاطب کر کے کہا۔

"اگر میں تمہارے گھر کے عوض دوسرا گھر تبدیل کرنا چاہتا تو میرے لیے یہ ممکن نہ تھا (باقی بر ۳۷۵)

رافضی مصنف کے پیش کردہ اشعار خود اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ من گھڑت ہیں اور حضرت معاویہ جیسے صحابی کی شان سے صادر شدہ نہیں۔ اس لیے کہ صحابہ کے ساتھ ان اشعار کی کوئی مناسبت ہی نہیں۔ یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت معاویہ اس سال مشرف باسلام ہوئے جس سال مکہ فتح ہوا تھا۔

شیعہ مصنف ابن المطہر کا یہ قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت معاویہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی آنحضور نے تالیف قلب فرمائی تھی۔ ظاہر ہے کہ مولفۃ القلوب کو آپ نے جنگ حنین کے مال غنیمت میں سے مال عطا کیا تھا۔ غزوہ حنین فتح مکہ کے چند روز بعد وقوع پذیر ہوا۔ اگر معاویہ یمن بھاگ گئے ہوتے جیسا کہ شیعہ مصنف نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۴) "مگر یہ تو اللہ کی طرف نقل مکانی کرنے والی بات ہے۔" حارث جنگ کفار میں یہ رجز پڑھا کرتے تھے ؎

إِنِّي بِرَبِّي وَالنَّبِيِّ مُؤْمِنٌ　　وَالْبَعْثِ مِنْ بَعْدِ الْمَمَاتِ مُوْقِنٌ
أُقَبِّحُ لِشَخْصٍ لِلْحَيَاةِ مَوْطِنٌ

حارث ملک شام میں مصروف جہاد رہے یہاں تک کہ غزوہ یرموک یا طاعون عمواس میں شہادت پائی۔ جہاد شام میں حارث کے کنبہ میں سے صرف عبدالرحمن بن حارث بچ رہے اسی طرح فاختہ بنت عتبہ بن سہیل بن عمرو قرشی عامری کے کنبہ میں سے بھی کوئی نہ بچا تھا۔

جب عبدالرحمن اور فاختہ دونوں کو بارگاہ فاروقی میں پیش کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا دونوں کا نکاح کر دو کچھ بعید نہیں کہ ان کی نسل خوب پھیلے"۔ چنانچہ تعمیل ارشاد کر دی گئی اور ان کے یہاں بہت سی اولاد پیدا ہوئی۔

حضرت حارث بن ہشام سیادت و قیادت میں ضرب المثل تھے۔ ایک شاعر اپنے حریف کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

أَظَنَنْتَ أَنَّ أَبَاكَ حِيْنَ تَسُبُّنِيْ　　فِي الْمَجْدِ كَانَ الْحَارِثُ بْنُ هِشَامٍ
أَوْلَى قُرَيْشٍ بِالْمَكَارِمِ وَالنَّدَى　　فِي الْجَاهِلِيَّةِ كَانَ وَالْإِسْلَامِ

جب تو مجھے برا بھلا کہتا ہے تو یوں سمجھتا ہے کہ تیرا باپ حارث بن ہشام کی طرح شریف النسب تھا حارث جاہلیت و اسلام میں اخلاق عالیہ اور سخاوت کے اعتبار سے رئیس قریش تھا۔

لکھا ہے تو آپ مؤلفۃ القلوب میں سے نہیں ہو سکتے۔ حضرت معاویہ فرماتے ہیں۔
"میں نے مروہ پہاڑی پر تیر کے بھالے سے آنحضور کے بال کاٹے" (المنتقٰی من اخبار احادیث الاحکام حدیث نمبر ۲۵۷۹ - نیز نیل الاوطار شوکانی ج ۵ ص ۵۸ طبع البابی الحلبی مصر)
غالباً یہ واقعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرہ جعرانہ میں پیش آیا جو ذیقعد ۸ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا[1]۔
باقی رہی شیعہ مصنف کی ذکر کردہ یہ حدیث کہ "ابھی ایک شخص (حضرت معاویہ) نمودار ہو گا اس کی موت تارک سنت ہونے کی حالت میں ہو گی"۔

پہلا جواب: - اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ حدیث کی صحت ثابت کیجئے۔ اس لیے کہ اثبات صحت سے پہلے کوئی حدیث قابل احتجاج نہیں ہو سکتی۔

دوسرا جواب: - یہ ہے کہ یہ حدیث باتفاق محدثین موضوع ہے اور کسی قابل اعتماد کتاب میں مندرج نہیں۔ علاوہ ازیں یہ حدیث بلا سند ہے اور اس سے احتجاج کرنے

---

[1] امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نیل الاوطار میں امام نووی کے حوالہ سے یہی لکھا ہے۔ جعرانہ طائف و مکہ کے درمیان ایک چشمہ کا نام ہے۔ یہ طائف کی نسبت مکہ سے قریب تر ہے جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ حنین سے لوٹے تھے تو آپ نے جعرانہ کے چشمہ پر اترنے کہ مجاہدین میں مال تقسیم کیا۔ فتح مکہ، غزوہ حنین اور تقسیم غنائم کے تینوں مواقع پر حضرت معاویہ نے کھلم کھلا اپنے مشرف باسلام ہونے کا اظہار کیا۔
حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق ترجمہ معاویہ بن ابی سفیان میں تصریحاً لکھا ہے کہ حضرت معاویہ صلح حدیبیہ اور عمرۃ القضا کے درمیان اسلام قبول کر چکے تھے البتہ قریش کے ڈر سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے"۔
واقعہ یہ ہے کہ دین اسلام قریش کے ذہین نوجوانوں کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا صرف اتنا فرق ہے کہ جو لوگ ہجرت مکہ کی قدرت سے بہرہ ور تھے وہ مدینہ کا رخ کرتے اور مسلمانوں میں جا ملتے تھے حضرت خالد بن ولید و عمرو بن العاص اور کعبہ کے کنجی بردار عثمان بن طلحہ عبدری رضی اللہ عنہم نے یونہی کیا تھا۔ جو نوجوان مکہ سے ہجرت نہیں کر سکتے تھے وہ مکہ میں اقامت گزین رہ کر دعوت اسلامی کی کامیابی کے منتظر رہتے تھے۔ حضرت معاویہ اور ان کے ہمنوا انہی لوگوں میں شامل تھے ۱۲

والے شیعہ مصنف نے بھی اس کی سند بیان نہیں کی۔ شیعہ مصنف کی جہالت کا بین ثبوت ہے کہ اس حدیث کا راوی عبداللہ بن عمر کو ٹھہرایا ہے بھلا حضرت عبداللہ ایسی حدیث کے راوی کیونکر ہو سکتے ہیں جس میں صحابہ کے معائب و مثالب بیان کیے گئے ہیں۔ جبکہ آپ نے بہت سی احادیث روایت کی ہیں جن میں صحابہ کے مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا یہ قول صرف معاویہ کی مدح و ستائش میں معروف ہے آپ فرماتے ہیں۔

"میں نے رسول کریم کے بعد معاویہ سے بڑھ کر کوئی رئیس اور بردبار نہیں دیکھا" ان سے دریافت کیا گیا کیا ابوبکر و عمر بھی آپ سے بڑھ کر نہ تھے؟ حضرت عبداللہ نے جواباً فرمایا۔ "ابوبکر و عمر ان سے افضل تھے"۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "حضرت معاویہ بڑے کریم و حلیم تھے"۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ معاویہ اپنے بیٹے یزید کو لے کر چل دیئے اور آنحضور کا خطبہ نہ سنا"۔

اس ضمن میں واضح ہو کہ آنحضور کے خطبات مختلف قسم کے ہوا کرتے تھے۔ آپ جمعہ۔ عیدین اور حج کے موقع پر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے حضرت معاویہ اور ان کے والد ابوسفیان دیگر مسلمانوں کی طرح بالالتزام آپ کے خطبات میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا معاویہ ہر خطبہ سے اٹھ جایا کرتے تھے اور سنتے نہ تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات آنحضور اور سب صحابہ کے لیے موجب اہانت ہے کہ ہمیشہ دو شخص آپ کے خطبہ کے دوران اٹھ کر چلے جایا کریں نیز یہ کہ اگر وہ دونوں ہر خطبہ میں حاضر ہوا کرتے تھے تو اس سے اٹھ کر چلے جانے کا کیا معنی؟ اس پر مزید یہ کہ حضرت معاویہ بڑے حلیم و بردبار اور صابر تھے جیسا کہ آپ کے سیر و سوانح میں معروف ہے۔ مقام حیرت ہے کہ وہ اس صبر و حلم کے باوصف آنحضور سے نفرت کرتے تھے حالانکہ آپ دین و دنیا میں سب لوگوں کے سردار تھے اور امیر معاویہ ہر بات میں آپ کے محتاج بھی تھے۔

یہ امر موجب حیرت ہے کہ وہ اس وقت آنحضور کی گفتگو سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے حالانکہ جب تاج و تخت سے بہرہ ور ہوئے تو لوگ روبرو ان کو برا بھلا کہتے اور وہ خاموشی سے سنا کرتے تھے اور پھر حیرت بالائے حیرت اس بات پر ہے کہ ایسے شخص کو آپ کاتب وحی بھی مقرر فرماتے ہیں۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ پکڑا اور باہر چل دیا" صریح کذب ہے۔ کیونکہ حضرت معاویہ کا بیٹا یزید جو آپ کے بعد تاج و تخت کا وارث بنا اور جس کے عہد میں سانحۂ کربلا پیش آیا اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی ولادت عثمانی خلافت میں ہوئی۔ عہد رسالت میں معاویہ کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

حافظ ابوالفضل ابن ناصر لکھتے ہیں۔

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت میں رشتہ طلب کیا تھا مگر مفلس ہونے کی بنا پر ان کی یہ آرزو بر نہ آئی۔ آپ کی شادی خلافت فاروقی میں ہوئی اور یزید حضرت عثمان کی خلافت میں ۲۷ھ میں پیدا ہوا۔"

تیسرا جواب:۔ مذکورہ حدیث کا تیسرا جواب یہ ہے کہ معارضہ کے طور پر ہم اس حدیث جیسی موضوعات بیان کر سکتے ہیں جن سے حضرت معاویہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ مشہور محدث ابوالفرج ابن الجوزی اپنی کتاب الموضوعات میں لکھتے ہیں۔ "بعض مدعیان سنت نے شیعہ کو چڑانے کے لیے حضرت معاویہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے حدیثیں وضع کی ہیں۔ دوسری طرف روافض نے ان کی مذمت میں حدیثیں وضع کیں۔ فریقین نے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے[1]"

---

[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت و سوانح میں متوسط راستہ وہ ہے جو قبل ازیں آپ کے حالات میں روشنی ڈالتے ہوئے ہم نے اختیار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے مقام پر جو خواب دیکھا اور جس کا ذکر قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتب یعنی بخاری و مسلم میں موجود ہے وہ بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔ اس خواب کی تعبیر عملی طور پر اس وقت ظہور پذیر ہوئی (باقی بر صفحہ ۳۷۹)

حضرت علی کے خلاف جنگ آزمائی کے باوجود معاویہ خارج از اسلام نہیں ہو سکتے

حضرت علی کے خلاف حضرت معاویہ کی جنگ آزمائی ایسے امور کی بنا پر تھی جن کی وجہ سے معاویہ خارج از اسلام نہیں ہو سکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بخاری و مسلم کی روایت کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اقرب الی الحق تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"جب مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ظہور ہو گا تو ایک فریق خروج کرے گا اور دوسرا فریق اس سے جنگ آزما ہو گا۔ یہ جماعت اقرب الی الحق ہو گی"۔ خروج کرنے والے وہی لوگ تھے جو جنگ نہروان میں حضرت علی کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اس حدیث سے عیاں ہوتا ہے کہ حضرت علی کی جماعت حضرت معاویہ کے گروہ کی نسبت اقرب الی الحق تھی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۸) ہوئی جب حضرت انس کی خالہ فتح قبرص کے موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بحری بیڑا میں شامل ہو کر جہاد کے لیے گئیں اور ان کی موت اسی جگہ واقع ہوئی۔ یہ امیر معاویہ جیسے ولی صالح اور مجاہد فی سبیل اللہ کا اولیں وصف ہے۔ آخری تعریف وہ ہے جو امام احمد نے اپنی تصنیف "کتاب الزہد" میں اس امام مظلوم (حضرت معاویہ) کے زہد و تقوی کے واقعات بیان کرتے ہوئے فرمائی۔ ہم نے اس ضمن میں مشہور و معتبر مصادر و مآخذ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد مسلم سلاطین و خلفاء میں حضرت معاویہ کا کوئی ہمسر پیدا نہیں ہوا۔ بنا بریں ان کی شان میں ایسی موضوعات گھڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں جن کی جانب محدث شہیر ابن الجوزی نے اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح متعصب روافض کی من گھڑت روایات سے بھی ان کی شان میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی۔ مثلاً زیر تبصرہ حدیث جس کو روافض نے حضرت عبد اللہ بن عمر کی طرف منسوب کیا ہے اور جس کو دیکھ کر با انصاف شیعہ بھی پانی پانی ہو جاتے ہیں ۱۲۔

صحیح بخاری میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا۔

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اللہ تعالےٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین مصالحت کرائے گا۔"

مذکورہ صدر حدیث میں آنحضور نے مصالحت کرانے کی بناپر حضرت حسن کی مدح فرمائی اور دونوں جماعتوں کو مومن قرار دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قابلِ ستائش فعل صلح کرانا ہے نہ کہ جنگ آزما ہونا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک فتنہ بپا ہوگا اس میں بیٹھ رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہوگا"

آپ نے مزید فرمایا۔

"عنقریب مومن کا سب سے بہتر مال بکریاں ہوگا جن کو لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش والی جگہوں پر چلا جائے گا اور اس طرح اپنے دین کو فتنوں کی زد سے بچا لے گا۔"

جن صحابہ نے فتنہ سے احتراز واجتناب کی حدیث روایت کی ہے مثلاً سعد بن ابی وقاص و محمد بن مسلمہ اور اسامہ رضی اللہ عنہم انہوں نے جنگ میں حضرت علی و معاویہ میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا تھا۔ مزید براں جن لوگوں نے محاصرہ کرکے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا ان لوگوں کی نسبت ظالم تر ہیں جو حضرت علیؓ کے خلاف

---

[۱] قاتلین عثمان جنگ جمل میں حضرت علی کے لشکر میں تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے رفقاء جب قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیج رہے تھے تو یہ لوگ بذاتِ خود سب کچھ سن رہے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا ساتھ ساتھ آمین کہتے جاتے تھے۔ کوفہ کے بعض قاتلین عثمان جنگ صفین تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود تھے جب بھی ان کا ذکر آتا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر لعنت فرماتے ۱۲۔

نبرد آزما ہوئے۔ حالانکہ شیعہ قاتلین عثمانؓ کی مدح کرتے اور ان کے فعل شنیع پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر شیعہ کہیں کہ حضرت عثمانؓ سے چند ایسے فعل سرزد ہوئے جو کہ آپ کے شایان شان نہ تھے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ حضرت علی سے بھی ایسے نازیبا افعال صادر ہوئے تھے جن کی وجہ سے بعض صحابہ ان کی بیعت میں دیر سے شریک ہوئے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان و علی دونوں سے اظہار خوشنودی فرمایا۔

مزید براں حضرت علی نے حضرت معاویہ کو معزول کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا۔ حالانکہ آپ کو والی مقرر کرنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ رعایا بھی آپ کو چاہتی تھی۔ نیز یہ کہ حضرت علی نے ایسے لوگوں کو حاکم مقرر کیا۔ جو حضرت معاویہ سے مرتبہ میں فروتر تھے مثلاً زیاد بن ابیہ۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی سے افضل تھے تاہم آپ نے نجران کے علاقہ پر ابوسفیان کو عامل بنا کر بھیجا۔

جب آپ نے وفات پائی ابوسفیان اس وقت بھی امیر نجران تھے۔ آپ کے بہت سے امراء اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً آپ نے عتاب بن اسید کو مکہ کا حاکم مقرر کیا۔ اسی طرح خالد بن سعید بن عاص اور ابان بن سعید بن عاص کو بھی عامل مقرر کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے والی قرار پائے۔ آپ کی زندگی دینداری وسیاست رانی دونوں اعتبار سے بے داغ تھی۔ احادیث صحیحہ میں وارد

لے روافض قاتلین عثمان کے مداح ہیں اور ان سے اظہار خوشنودی کرتے ہیں حالانکہ حضرت علی ان پر لعنت بھیجتے اور ان کے فعل پر راضی ہونے والے کو بھی ملعون قرار دیتے تھے۔ جن لوگوں پر حضرت علی لعنت بھیجتے ہوں کیا وہ آپ کے شیعہ ہو سکتے ہیں؟ دراصل یہ لوگ فتنہ پردازی میں پیش پیش ہیں ۱۲

۲ے قاتلین عثمان کے اعتراضات اور ان کے جوابات کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ص ۶۱ تا ۱۴۱ یہ صفحات نادر تحقیقات پر مشتمل ہیں ۱۲ (اس کا اردو ترجمہ عنقریب شائع ہو رہا ہے)

ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے بہترین خلفاء وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور جو تم سے محبت کرتے ہوں۔ تم ان کا جنازہ پڑھو اور وہ تمہارا جنازہ پڑھیں۔ بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں۔ تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں"۔

صحابہ کا قول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کا مصداق تھے اس لیے کہ رعیت آپ کو چاہتی تھی اور آپ رعیت کو چاہتے تھے آپ ان کا جنازہ پڑھا کرتے تھے اور انھوں نے آپ کے جنازہ میں شرکت کی۔

حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا اور کوئی مخالف ان کو نہ ضرر پہنچا سکے اور نہ رسوا کر سکے گا"۔

مالک بن یخامر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اس سے اہل شام مراد ہیں"۔

صحابہ کا خیال ہے کہ اس سے شامی لوگ مراد ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں تھے۔

صحیح مسلم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"اہل مغرب ہمیشہ غالب رہیں گے یہاں تک کہ قیامت بپا ہو جائے گی"۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

"اہل مغرب سے اہل شام مراد ہیں"۔

ہم نے دوسری جگہ اس پر مکمل گفتگو کی ہے یہ نص عسکر معاویہ کو شامل ہے۔

صحابہ کا قول ہے کہ حضرت معاویہ حضرت علی کے بہت سے مقرر کردہ امراء سے افضل تھے۔ لہٰذا ان کو معزول کر کے ان سے فروتر درجہ کے لوگوں کو حاکم مقرر کرنے میں کوئی مصلحت مضمر نہ تھی۔ اگر حضرت علی امیر معاویہ کو بدستور والی شام رہنے دیتے تو امت فتنہ پردازی

اور خونریزی سے محفوظ رہتی۔ اگر اس کا عذر یہ بیان کیا جائے کہ حضرت علی نے اجتہاد کی بنا پر ایسا کیا تھا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عثمان سے بھی جو امور صادر ہوئے وہ ان کے اجتہاد پر مبنی ہے۔

مزید براں یہ کیا اجتہاد ہے کہ بعض لوگوں کو ولایت و امارت پر فائز کیا جائے اور بعض کو محروم رکھا جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو امت میں خونریزی کا باب اس حد تک مفتوح ہو جائے کہ مسلمان ذلیل و خوار ہو جائیں اور کفار کو نیچا دکھلانے کے قابل نہ رہیں بلکہ کفار میں مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی جسارت پیدا ہو جائے۔

اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر علی و معاویہ کے مابین جنگ صفین پیش نہ آتی[1] اور دونوں حضرات اپنے اپنے علاقہ پر قابض رہتے تو امت لڑائی کے فتنہ سے بچ جاتی اس لیے کہ لڑائی سے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے اور امت تفرقہ بازی کی بنا پر ایک امام پر جمع نہ ہو سکی۔ خونریزی کا سلسلہ تادیر جاری رہا اور بعض و عداوت کے جذبات زور پکڑ گئے اور حضرت علی کا گروہ جو اقرب الی الحق تھا کمزور ہو کر صلح کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس فعل کی مصلحت اس کے فساد پر غالب ہو اس کا وجود پذیر ہونا اس کے نہ ہونے کی نسبت زیادہ خیر و برکت کا موجب ہوتا ہے۔ موضوع زیر بحث میں بھی لڑائی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ لڑائی نہ ہونے کے فوائد و مصالح

---

[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دین اسلام کے تحفظ و بقا اور اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت و نگہداشت میں جس حد تک اہتمام کیا تھا اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب آپ میدان صفین میں حضرت علی کے خلاف صف آرا تھے اور آپ کو معلوم ہوا کہ قیصر روم ایک عظیم لشکر کے ساتھ اسلامی سلطنت پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو آپ نے اس کو ان الفاظ پر مشتمل ایک خط لکھا۔ "بخدا اگر تو اس حرکت سے باز آ کر واپس اپنے وطن نہ لوٹا تو میں اپنے چچازاد بھائی (حضرت علی) سے صلح کر لوں گا اور ہم دونوں تجھے تیرے ملک سے نکال کر دم لیں گے اور خدا کی زمین کو تجھ پر تنگ کر دیں گے"۔ شاہ روم یہ خط پڑھ کر ڈر گیا اور اپنے ارادہ سے باز رہا۔ ۱۲ اللھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ۱۲

کہیں بڑھ کر تھے۔ حضرت علی کی فوج کثرتِ تعداد اور قوت و شوکت کے لحاظ سے برتر تھی اور حضرت معاویہ ان سے مصالحت کرنے کے لیے تیار تھے۔ جس اجتہاد سے اس قدر تباہ کن نتائج ظہور پذیر ہوں اگر حضرت علی کو اس میں بے گناہ تصور کیا جائے تو حضرت عثمان اپنے اجتہاد میں بالاولیٰ عفو و درگذر کے مستحق ہوں گے۔

حضرت معاویہ کے اعوان و انصار کہتے تھے۔

"لڑائی کا آغاز کرنے والے حضرت علی ہیں ہم صرف مدافعت کر رہے ہیں اور ہم نے حضرت علی پر ظلم و تعدی کا ارتکاب نہیں کیا"۔

اگر حضرت معاویہ کے رفقاء سے یوں کہا جاتا۔

"حضرت علی واجب الاطاعت امام ہیں اور ان کی بیعت آپ کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ بیعت نہ کرنے سے مسلمانوں میں تفرقہ بازی پیدا ہوتی ہے"۔ تو وہ اس کے جواب میں کہہ سکتے تھے۔

"ہمیں حضرت علی کا واجب الاطاعت امام ہونا کسی دلیل سے معلوم نہیں اور ہمیں آنحضور سے ایسی کوئی نص موصول نہیں ہوئی"۔

ظاہر ہے کہ اصحاب معاویہ کا یہ عذر معقول ہے اس لیے کہ شیعہ امامیہ جس نص جلی کا دعویٰ کرتے ہیں اگر اسے حق بھی فرض کر لیا جائے[۱] (حالانکہ وہ باطل ہے) تو وہ قابل تسلیم نہیں اس لیے کہ یہ نص خلفاء ثلاثہ کے عہد خلافت میں پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ بنا بریں اصحاب معاویہ اس سے کیونکر آگاہ ہو سکتے تھے۔ یہ مفروضہ اس صورت میں ہے جب نص مذکور حق ہو مگر وہ حق نہیں بلکہ باطل ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت معاویہ نے صحابہ کی ایک کثیر جماعت کو موت کے گھاٹ اتار دیا"

---

[۱] اہل سنت کے نزدیک وہ نص باطل ہے، اس لیے کہ اگر ایسی کوئی نص موجود ہوتی تو اصحاب ثلاثہ کی دینداری، اخلاق و مروت اور حکومت و سلطنت سے بیزاری کی بنا پر توقع کی جاتی تھی کہ سب سے پہلے وہ اس نص پر عمل کرتے ۱۲

اس کا جواب یہ ہے کہ مقتولین کسی ایک جماعت میں محدود نہ تھے بلکہ ہر فریق نے فریق مخالف کے اعوان و انصار کو قتل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فریقین میں سے جو جنگ آزما لوگ تھے وہ حضرت علی و معاویہ میں سے کسی کے بھی اطاعت کیش نہ تھے علی و معاویہ دونوں مصالحت چاہتے تھے اور خونریزی سے بیزار تھے مگر دونوں کے رفقاء یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ فتنہ کی آگ جب ایک مرتبہ مشتعل ہو جاتی ہے کہ دانشمندوں کے بجھائے بھی فرو نہیں ہوتی۔ فریق علی میں اشتر نخعی۔ ہاشم[1] بن عتبہ المرقال، عبد[2] الرحمن بن خالد بن ولید۔ اور ابو الاعور[3] السلمی جیسے

---

[1] ہاشم بن عتبہ المرقال حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھتیجا تھا۔ اس نے اپنے چچا کے ساتھ جنگ قادسیہ میں حاضر ہو کر بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ حضرت سعد نے جو لشکر جلولاء کے مقام پر یزدگرد شاہ ایران سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ ہاشم اس کے سپہ سالار تھے جنگ صفین میں ہاشم نے حضرت علی کا ساتھ دیا۔ یہ آپ کی فوج کے علم بردار تھے۔ یہ جنگ صفین میں مارے گئے ۱۲

[2] ایک قدیم مورخ سیف بن عمر تمیمی جس سے مورخ طبری بھی استفادہ کر چکے ہیں لکھتا ہے۔ عبد الرحمن بن خالد بن ولید اپنے والد کے ساتھ فتوحات شام میں شریک تھے۔ یہ اس وقت بالکل نوعمر تھے۔ ابن سعد نے ان کو تابعین مدینہ کے طبقۂ اول میں شمار کیا ہے۔ حضرت معاویہ کی امارت کے زمانہ میں مسلمانوں نے رومیوں سے جو جنگیں لڑیں یہ ان میں سپہ سالار ہوا کرتے تھے یہاں تک کہ ابو ایوب انصاری جیسے مقتدر صحابہ آپ کے زیر قیادت شریک جہاد ہوئے۔ عبد الرحمن اس وقت عنفوان شباب میں تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمن نے چار عجمی کافر قید کیے اور حکم دیا کہ انھیں تیر دل سے قتل کیا جائے جب حضرت ابو ایوب کو پتہ چلا تو انھوں نے اس سے منع فرمایا اور کہا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ عبد الرحمن نے اس گناہ کی یاداش میں چار غلام آزاد کیے

خلافت عثمانی میں حضرت معاویہ نے عبد الرحمن کو ملک شام کی شمالی جانب (باقی بر صفحہ ۳۸۶)

(بقیہ حاشیہ ص۳۸۵) حمص سے لے کر جزیرہ ابن عمر تک کا حاکم مقرر کیا تھا۔ آپ نے ایک بیدار مغز اور جرأت مند حاکم کی طرح اپنے فرائض منصبی ادا کیے۔ خلافت عثمانی میں جب فتنہ پردازوں نے کوفہ میں شر انگیزی کا آغاز کیا تو حضرت عثمان نے ان کو معاویہ کی خدمت میں بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت معاویہ نے اپنے حلم و ادب کے ذریعہ ان کی اصلاح کرنا چاہی مگر وہ حلم و ادب کی لغت سے واقف ہی نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت معاویہ نے ان کو عبدالرحمن بن خالد کے پاس بھیجا۔ عبدالرحمن نے ان کو متنبہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے۔

"اے شیطان کے آلہ کار! میں تمہیں خوش آمدید نہیں کہنا چاہتا۔ اب شیطان تھک کر عاجز آ گیا ہے مگر تمہاری پھرتی و چالاکی میں کمی نہیں آئی۔ خدا عبدالرحمن کو ناکارہ کر دے اگر ادب سکھا کر وہ تمہیں فرمانبردار نہ بنائے۔ اے ان لوگوں کے گروہ جن کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ عرب ہیں یا عجم۔ تمہیں واضح ہو کہ میں اس خالد بن ولید کا بیٹا ہوں جو بڑی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ جنہوں نے فتنۂ ارتداد کی آگ کو فرو کیا۔ اے صعصعہ بن ذل اگر مجھے پتہ چلا کہ میرے رفقاء میں سے کسی نے تیری ناک توڑی اور پھر تجھے دودھ پلایا تو میں تجھے عبرتناک سزا دوں گا" (تاریخ طبری ج ۵ ص ۸۷)

عبدالرحمن بن خالد کہا کرتے تھے۔ "جس کی خیر سے اصلاح ممکن نہ ہو اسے شر کے ذریعہ ٹھیک کر سکتے ہیں"۔

یہ سن کر سب شریر عبدالرحمن سے کہنے لگے۔

"ہم بارگاہ ایزدی میں توبہ کرتے ہیں ہمیں معاف فرمائیے اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے" (طبری ج ۵ ص ۸۷-۸۸)

مگر ان کی یہ توبہ مخلصانہ نہ تھی۔ رہا ہو کہ انہوں نے حج کرنے کے بہانہ سے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ عبدالرحمن بن خالد جنگ صفین میں حضرت معاویہ کے ہمراہ تھے جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے ۱۲

۵۳ ابو الاعور کا اصلی نام عمر بن صفوان ذکوانی ہے۔ ذکوان بنی سلیم کے ایک (باقی بر ص۳۸۷)

لوگ تھے جو جنگ کی آگ کو فرو نہیں ہونے دیتے تھے۔
کچھ لوگ حضرت عثمان کی شدید حمایت کرتے تھے اور کچھ ان کے خلاف تھے۔
دوسری طرف حامیان علی تھے اور کچھ لوگ ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں جو
لوگ حضرت معاویہ کے حامی تھے وہ ذات معاویہ کے علاوہ دیگر اسباب و محرکات
کی بنا پر شریک جنگ ہوئے تھے۔ جنگ فتنہ قتال جاہلیت کی طرح ایک ہی قسم
کے مقاصد و اعتقادات کے تحت وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقاصد مختلف ہوا
کرتے ہیں امام زہری فرماتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۶) قبیلہ کا نام ہے۔ یہ صحابی ہے۔ غزوہ حنین کے بعد اسلام لائے۔

محمد بن حبیب لکھتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف دیار و امصار کے امراء کو لکھا تھا کہ ہر علاقہ میں سے
ایک صالح ترین شخص آپ کی خدمت میں بھیجا جائے۔ چنانچہ بصرہ۔ کوفہ۔ اور شام و مصر سے
چار آدمی آپ کے یہاں بھیجے گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ چاروں قبیلہ بنی سلیم سے
تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے ایک ابو اعور سُلمی تھے۔ امام مصر حضرت لیث بن سعد
فرماتے ہیں۔

"جب سنہ ۲۳ھ میں عموریہ کی جنگ ہوئی تو اس میں مصری فوج کے امیر وہب بن عمیر جُمحی
تھے اور شامی لشکر کے سپہ سالار ابو اعور سلمی تھے"

ابو زرعہ اپنی تاریخ دمشق میں لکھتے ہیں

"سنہ ۲۶ میں ابو اعور سلمی نے قبرص کی جنگ میں شرکت کی تھی"۔

جنگ صفین میں ابو اعور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور بہت
بڑے قائد خیال کیے جاتے تھے۔ ان کی شجاعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا
ہے کہ ابو اعور نے یہ سمجھ کر اشتر نخعی کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ان کا حریف
نہیں ہو سکتا ۱۲

اللہم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ولوالدیہم اجمعین

جب فتنہ بپا ہوا تو اصحاب رسول کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ جمیع صحابہ نے اس بات پہ اجماع کر لیا تھا کہ جس خون، مال یا عفت و عصمت کو بنا بر تاویل حلال کیا گیا ہو وہ ہدر (جس پہ شرعی سزا نہ دی جائے) ہے۔

جہاں تک لعنت کا تعلق ہے فریقین دعا میں ایک دوسرے پہ لعنت کرتے تھے کسی کے خلاف جنگ آزما ہونا اس پہ لعنت بھیجنے سے بھی عظیم تر ہے۔ لعنت بھیجنے کا فعل خواہ گناہ ہو یا صحیح و غلط اجتہاد پر مبنی ہو خدا کی مغفرت کا حصول بنا بریں تو یہ گناہوں کا ازالہ کرنے والے اعمال صالحہ اور گناہوں کا کفارہ بننے والے حوادث و آلام کی وجہ سے ممکن ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ روافض سبّ علی کو ناپسند کرتے ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی تکفیر کرنے اور ان کو برا بھلا کہنے سے نہیں شرماتے۔ بخلاف ازیں حضرت معاویہ کے احباب و انصار حضرت علی کی تکفیر نہیں کرتے آپ کی تکفیر صرف خوارج کرتے ہیں جو دین اسلام سے نکل چکے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے صحابہ کو گالی نہ دو مجھے اس ذات کی قسم جس کے زیر تصرف میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی شخص احد کے پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے تو ان کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا"[۱]۔

کیا حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو زہر کھلایا تھا

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"معاویہ نے حسن کو زہر کھلایا تھا"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات کہی جاتی ہے[۲] مگر دلیل و برہان سے ثابت نہیں ہوتی۔

---

[۱] یہ حدیث ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے (دیکھئے العواصم من القواصم ص ۳۲ تا ۳۳ فصل "اصحاب رسول اللہ عدول") ۔ ۱۲

[۲] یہ شیعہ کا قول ہے جو بلا دلیل و ثبوت حضرت معاویہ پر اتہام طرازی کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ اس کے قائل ہیں جو شیعہ کے دام فریب میں آ کر ان کے جھوٹے اقوال سے متاثر ہو جاتے ہیں ۱۲

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت حسن کی بیوی نے آپ کو زہر کھلایا تھا۔ چونکہ حضرت حسن کثرت سے طلاق دیا کرتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ ان کی بیوی نے کسی مقصد کے لیے آپ کو زہر کھلایا ہو۔ واللہ اعلم۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس عورت کے والد اشعث بن قیس نے حضرت حسن کو زہر کھلانے کا حکم دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اندرونی طور پر حضرت علی و حسن سے منحرف ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس کے والد کو اس بات پر مامور کیا تھا۔ یہ ظن محض ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ

(بدگمانی سے بچو کیونکہ یہ بڑی جھوٹی بات ہے)

خلاصہ یہ کہ باتفاق مسلمین شرعاً ایسی بلا دلیل بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر کسی کی مدح یا مذمت کا ترتب درست ہے۔ مزید برآں اشعث کی وفات ۴۰ھ یا ۴۱ھ میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عام الجماعۃ یعنی ۴۱ھ میں حضرت علی و حسن کے مابین جو مصالحت ہوئی تھی اس میں اشعث کا نام ذکر نہیں کیا جاتا۔ اگر اشعث زندہ ہوتا تو اس کا ذکر ناگزیر تھا۔ جب اشعث کی وفات حضرت حسن کی وفات سے دس سال پہلے ہو گئی تھی تو وہ اپنی بیٹی کو زہر خورانی کا حکم کیونکر دے سکتا تھا؟

جہاں تک یزید کا تعلق ہے باتفاق اہل نقل اس نے حضرت حسین کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا البتہ اس نے ابن زیاد کو لکھا تھا کہ حضرت حسین کو عراق میں داخل ہونے

۱؎ یہ ایک فطری بات ہے کہ جو شخص کسی تاج و تخت سے اس کی حکومت چھیننے کی کوشش کرے گا تو وہ اس کی مدافعت کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وُلاۃ و حُکّام کے خلاف نبرد آزما ہو کر ان کی حکومت چھیننا شرعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کوفہ کے رہنے والے شیعان حسین نے آپ کو جو خطوط تحریر کیے تھے ان کی بنا پر آپ کا خیال تھا کہ کسی شور و ہنگامہ کے بغیر عراق میں آپ کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ البتہ آپ کے احباب و اعوان صاحب عقل و دانش اقارب اور جو لوگ ایسے مواقع پر اسلام کے طریق کار (باقی برصفحہ ۳۹۰)

سے روکے۔ حضرت حسین کا خیال تھا کہ اہل عراق آپ کی مدد کریں گے اور اپنے وعدہ کو پورا کرینگے[۱]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۹) سے آگاہ تھے بخوبی جانتے تھے کہ کوفہ کے شیعان حسین جھوٹے ہیں۔ وہ آپ کو بروقت دھوکہ دیں گے اور سب حوادث و آلام آپ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ جن لوگوں نے آپ کو کوفہ جانے سے روکا آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ ان میں پیش پیش تھے (تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۹۰ ۱۹۱) اسی طرح حضرت علی کے چچازاد بھائی حبرالامت عبداللہ بن عباس (طبری ج ۶ ص ۲۱۶ ۲۱۷) اور حضرت حسین کے ابن العم عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب (طبری ج ۶ ص ۲۱۹) نے بھی آپ کو عازم کوفہ ہونے سے روکا تھا۔ اس ضمن میں عبداللہ بن جعفر نے اس حد تک کوشش کی کہ یزید کی جانب سے مکہ کے والی عمرو بن سعید بن العاص سے حضرت حسین کے نام ایک خط لکھوایا۔ اس خط میں والی مکہ نے لکھا کہ مکہ میں آپ ہر طرح محفوظ و مامون ہوں گے اور آپ سے لطف و مروت کا سلوک کیا جائے گا لہذا آپ واپس مکہ آجائیں۔ عبداللہ بن جعفر نے یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھا۔ والی نے اس پر مہر لگا دی اور اپنے بھائی یحیٰی بن سعید بن العاص کے ہاتھ اسے حضرت حسین کی طرف روانہ کیا۔ عبداللہ بن جعفر بھی یحیٰی کے ساتھ گئے اور حضرت حسین کو واپس لانے کی انتہائی کوشش کی مگر آپ رضامند نہ ہوئے۔ (تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۱۹ - ۲۲۰ میں والی مکہ کا یہ خط محفوظ ہے) کوئی شخص علم و عقل، مقام و مرتبہ اور اخلاص میں ان ناصحین سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے داعی عبداللہ بن مطیع نے بھی عقل و اخلاص کی حد تک آپ کو روکنے کی کوشش کی (تاریخ طبری جلد ۶ ص ۱۹۶) عمر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام مخزومی اور حارث بن خالد بن عاص بن ہشام بھی ناصحین کے زمرہ میں شامل تھے (طبری ج ۶ ص ۲۱۵ - ۲۱۶)

اموی دور کے مشہور شاعر فرزدق نے حضرت حسین سے کہا تھا۔

"لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنو امیہ کے ساتھ"۔ (طبری ۱ جلد ص ۲۱۸)

مگر یہ تمام مساعی جمیلہ حضرت حسین کو اس سفر سے باز نہ رکھ سکیں جو نہ صرف آپ کے حق میں بلکہ دین اسلام اور آج تک پوری ملت اسلامیہ کے حق میں منحوس ثابت ہوا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری کوفہ کے شیعان حسین پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے فریب دہی و فتنہ پردازی (باقی بر ص ۳۹۱)

چنانچہ آپ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا۔ جب انھوں نے دھوکہ سے مسلم کو قتل کر کے ابن زیاد کی بیعت کر لی تو حضرت حسین نے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ مگر ابن زیاد کی ظالم فوجوں نے آپ کو واپس جانے سے روکا آپ نے یہ بھی کہا کہ میں یزید کے پاس چلا جاؤں گا یا ملکی سرحد کی راہ لوں گا یا اپنے شہر کو واپس چلا جاؤں گا مگر انھوں نے آپ کو قیدی بنانے کے سوا دوسری سب تجویزیں مسترد کر دیں۔ آپ نے قیدی ہونے اور عبد اللہ بن زیاد کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف لڑتے ہوئے بحالت مظلومی شہادت پائی۔

جب یزید کو شہادت حسین کی خبر پہنچی تو اس نے بڑے درد و کرب کا اظہار کیا اور اس کے اہل خانہ نے آہ و بکا کا آغاز کیا۔ یزید نے اہل بیت کی خواتین میں سے کسی کو قید نہیں کیا تھا[۱]۔ بلکہ انھیں عطیہ جات دیئے اور عزت و احترام سے انہیں مدینہ رخصت کر دیا۔ حضرت

(بقیہ صفحہ ۳۹۰) کے ارادہ سے آپ کو دعوت دی پھر انتہائی کمینہ پن، خیانت کاری اور بزدلی سے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ متاخرین شیعہ نے اپنے اسلاف کی کارکردگی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تاریخی حقائق کو مسخ کرنے اور ان کی تحریف و تغییر کا بیڑا اٹھایا ۱۲

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۳۹۰) [۱] ہمارے معاصر مشہور شیعہ شاعر محمد جواد خضر نے ان تاریخی حقائق کو تسلیم کیا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حق و انصاف کو اس کی زبان پر جاری کر دیا حضرت علی بن حسین بال بچوں سمیت جب کربلا سے کوفہ پہنچے اور خیانت کار شیعہ مستورات سمیت روتے دھوتے اور دامن پھاڑتے آپ کے استقبال کے لیے نکلے (جیسے شیعہ آجکل عاشوراء کے موقع پر کرتے ہیں) تو آپ نے اہل کوفہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "اہل کوفہ اب تم رو رہے ہو بتلائیے تمہارے سوا ہمیں اور کس نے قتل کیا ہے؟" ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اس فقرہ سے شیعہ کی تردید مقصود ہے ورنہ یزید اور اسکے اہل بیت آجکل کے جھوٹے مدعیان حب اہل بیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر بنی ہاشم کا اعزاز و احترام بجا لاتے تھے موجودہ شیعہ حب اہل البیت کے بہانہ سے ان کے دین میں مسخ و تحریف کرنا چاہتے ہیں ایک مرتبہ حجاج ثقفی نے بنی ہاشم کے قبیلہ میں رشتہ کرنا چاہا تو بنو امیہ نے اسے ناپسند کیا کیونکہ وہ حجاج کو بنو عبد مناف کا کفو (ہمسر) تصور نہیں کرتے تھے ۱۲

معاویہ نے یزید کو وصیت کی تھی کہ ہر قیمت پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اکرام و احترام ملحوظ رکھے۔

رافضی مضمون نگار کا یہ قول کہ "ابو سفیان نے آنحضور کے اگلے دانت توڑے تھے" صریح کذب ہے یہ دانت توڑنے والا عتبہ بن ابی وقاص[۱] تھا۔ یہ درست ہے کہ ہند زوجۂ ابو سفیان نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبا کر تھوک دیا تھا پھر عنایت ایزدی سے وہ مشرف بہ اسلام ہوئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہند کی اس بنا پر تکریم فرمایا کرتے تھے کہ رشتہ سے وہ آپ کی ساس ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔

قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (سورہ انفال ۳۸)

(جو لوگ کافر ہیں ان سے فرمائیں کہ اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے)

حضرت عمرو بن العاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

---

[۱] دیکھئے تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۷ طبع حسینیہ نیز ج ۱ ص ۱۴۰۳ طبع یورپ۔ عتبہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھائی تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت سعد جنتی ہیں اور عتبہ جہنمی۔ محمد بن اسحاق حضرت سعد سے روایت کرتے کہ وہ کہا کرتے تھے "بخدا میں عتبہ سے بڑھ کر کسی شخص کو قتل کرنے کا حریص نہ تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اپنی قوم میں بدخلق مشہور تھا اور سب لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میرے لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کافی ہے کہ: "اس شخص پر خدا کا شدید غضب ہوگا جس نے رسول اللہ کے چہرے کو خون آلود کیا (طبری ج ۳ ص ۲۰)

حضرت ابن عباس کے شاگرد مقسم روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ کے حق میں بد دعا کی تھی کہ "سال گذرنے سے پیشتر وہ بہ حالت کفر مر جائے"۔ چنانچہ عتبہ ایک سال کے اندر اندر کافر ہونے کی حالت میں مر گیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ جنگ بدر کے بعد حاطب بن ابی بلتعہ نے عتبہ پر قابو پا کر اس کا سر اڑا دیا تھا (رواہ الحاکم فی المستدرک) ۱۲

"اسلام سابقہ گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے" (صحیح مسلم)

جب حضرت معاویہ کی والدہ ہند حلقہ بگوش اسلام ہوئیں تو اس نے کہا "بخدا کرۂ ارضی پہ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کے اہل خانہ کا رسوا ہونا مجھے آپ کے اہل خانہ کے رسوا ہونے سے عزیز تر ہو اور آج یہ عالم ہے کہ اس کائنات ارضی پہ کسی اہل خانہ کا معزز ہونا مجھے آپ کے اہل خانہ کے اعزاز و اکرام سے زیادہ محبوب نہیں" (بخاری)

رافضی قلمکار رقمطراز ہے۔

"اہل سنت چونکہ حضرت علی سے عناد رکھتے ہیں اس لیے ان کی بجائے خالد بن ولید کو سیف اللہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ "علی خدا کی تلوار اور اس کا تیر ہیں"۔

حضرت علی نے برسر منبر فرمایا تھا۔ "میں اعدائے دین کے لیے خدا کی تلوار ہوں"۔

خالد بن ولید ہمیشہ دشمن رسول رہے اور آپ کی تکذیب کرتے رہے۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے شہید ہونے کی ذمہ داری بھی خالد پہ عائد ہوتی ہے۔ جب خالد نے اظہار اسلام کیا تو آنحضور نے اسے بنی جَذِیمہ کی طرف بھیجا۔ خالد نے اس دوران میں خیانت کی۔ امر رسول کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو قتل کرایا۔ یہ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں"۔

سیف اللہ کون تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی کو "سیف اللہ" قرار دینا کسی کتاب میں مذکور نہیں۔ البتہ بلاریب حضرت خالد کو "سیف من سیوف اللہ" سے ملقب کرنا آنحضور سے ثابت ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضور کو حضرت زید و جعفر و ابن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر ملی تو آبدیدہ ہو گئے پھر فرمایا اس کے بعد خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار (حضرت خالد) نے جھنڈے کو تھاما تو اللہ تعالے نے فتح مرحمت فرمائی"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت خالد کے علاوہ اور کوئی شخص سیف اللہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "سیوف اللہ" اور بھی ہیں

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت خالد نے دیگر صحابہ کی نسبت زیادہ کفار کو جہنم واصل کیا۔ آپ غزوات میں ہمیشہ نیک فال رہے۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے اور ہجرت کی سعادت حاصل کی[1] یہ جب سے اسلام لائے اسی وقت سے آپ نے ان کو سپہ سالار مقرر کرنا شروع کیا۔ جنگ موتہ میں آپ کے ہاتھ میں نو (۹) تلواریں ٹوٹی تھیں (صحیح بخاری)

یہ حقیقت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جذیمہ کے ساتھ حضرت خالد کے فعل سے اظہار براءت کیا۔ البتہ انھیں معزول نہ کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ حضرت علی بھی "سیوف اللہ" میں سے ایک تھے اس میں تنازع کی گنجائش ہی کیا ہے؟ نیز یہ کہ آپ علم و فضل و فصاحت و بلاغت اور سبقت اسلام کی بنا پر حضرت خالد سے افضل تھے۔ تلوار کا کام صرف لڑنا ہے حالانکہ حضرت علی میں جہاد و قتال کے سوا اور بھی بہت سے فضائل تھے۔ جب کہ حضرت خالد کا خصوصی وصف قتال تھا۔ یہی ان کی وجہ فوقیت ہے اور اسی بنا پر آپ کو سیف اللہ کا لقب ملا۔

براء بن مالک ہی کو لیجئے اس نے میدان مبارزت میں سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ یہ تعداد ان لوگوں کے علاوہ ہے جو اس کے قتل میں شریک ہوئے۔ آنحضور صلی اللہ

---

[1] حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے اپنی مرضی سے ہجرت کی تھی حالانکہ حضرت خالد ابھی فتح احد کے نشہ سے سرشار تھے آپ کے والد مکہ کے عظیم رئیس تھے اور آپ وہاں فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے حضرت خالد عیش و مسرت کی زندگی کو لات مار کر اقامت حق کی خاطر عازم مدینہ ہوئے تو آنحضور نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "مکہ نے اپنے جگر کے پارے تمہارے یہاں پھینک دیے ہیں"۔

اگر حضرت خالد اپنی عظیم فتوحات کی بنا پر جنت اور تاریخ اسلام کے اوراق میں بقاء دوام سے بہرہ ور ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ جن احوال و ظروف میں اسلام لائے اور آنحضور نے ان پر مدح وستائش کے پھول نچھاور کیے ان کی بنا پر دینی و دنیوی مجد و شرافت میں وہ اس سے زیادہ خلود و دوام سے بہرہ ور ہیں۔ ۱۲

علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابو طلحہ کی آواز لشکر میں ایک جماعت سے بہتر ہے"۔

روافض کے یہاں تناقض کی بھرمار ہے وہ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضا معاون رسول تھے اور اگر وہ نہ ہوتے تو دین کی اشاعت نہ ہوتی اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی تقیہ کرتے تھے جو ضعف و عجز کی دلیل ہے۔

فتح مکہ کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنی جذیمہ سے لڑنے کے لیے مامور فرمایا۔ انہوں نے اَسْلَمْنَا (ہم اسلام لائے) کی بجائے صَبَأْنَا (ہم صابی ہو گئے) کہنا شروع کیا حضرت خالد نے اسے اسلام پر محمول نہ کیا اور ان کو قتل کر دیا۔ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ پھر آنحضور نے کچھ مال دے کر حضرت علی کو روانہ کیا اور انھوں نے نصف دیت ادا کر دی۔ جو مالی نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کی۔ یہاں تک کہ کتا جس برتن سے پانی پیتا ہے اس کی قیمت بھی ادا کی حضرت خالد نے آنحضور کی حکم عدولی نہیں کی تھی بلکہ وہ آپ کے حد درجہ اطاعت کیش تھے۔ البتہ اس موقع پر ان سے اجتہادی غلطی صادر ہوئی جس طرح حضرت اسامہ رضہ نے اس شخص کے بارے میں غلطی کی تھی جس نے "لا الہ الا اللہ" کہا اور اس کے باوجود حضرت اسامہ نے اسے قتل کر دیا اور جس طرح اس لشکر سے غلطی سرزد ہوئی تھی جس نے بکریوں والے اس شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا۔ یہ آیت کریمہ اسی موقع پر نازل ہوئی۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا" (سورۃ نسا - ۹۴)

اے ایمان والو! جب تم خدا کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو سلام کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔

حضرت خالد کی اجتہادی غلطی

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"جب اہل یمامہ سے لڑنے کے لیے گئے۔ تو اظہار اسلام کے باوجود ۱۲۰۰ آدمیوں کو قتل کر دیا۔ مالک بن نُوَیرہ کو قتل کر کے اس کی

بیوی سے نکاح کر لیا حالانکہ وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ زکوٰۃ نہ ادا کرنے کی بنا پر بنو حنیفہ کو مرتد قرار دیا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے ابو بکرؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا اس کے برعکس جو لوگ حضرت علی کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور جنہوں نے مسلمانو کے خون کو مباح قرار دیا تھا ان کو مرتد قرار نہ دیا حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "اے علی تجھ سے لڑائی کرنا میرے خلاف جنگ آزما ہونا ہے"۔ ظاہر ہے کہ رسول کے خلاف صف آرائی کرنے والا اجماعاً کافر ہے"۔

شیعہ مصنف کا یہ بیان اس بات کی آئینہ داری کرتا ہے کہ بنو حنیفہ اور شیعہ مرتدین میں سرے سے کوئی فرق و امتیاز پایا ہی نہیں جاتا۔ یہ لوگ کھلم کھلا اللہ و رسول اور اس کی کتاب اور دین کے دشمن ہیں۔ ان لوگوں نے دین حق سے تجاوز کر کے اسے پس پشت پھینک دیا ہے یہ اللہ و رسول اور نیک بندوں کی مخالفت کرتے اور اہل ارتداد و شقاق سے الفت و محبت رکھتے ہیں۔ روافض کے ایسے بیانات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابو بکر کے خلاف روافض کا بغض و عناد کسی طرح ان مرتدین سے کم نہیں جن کے خلاف حضرت صدیق صف آرا ہوئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل یمامہ مشہور مدعی نبوت مسیلمہ کذاب پر ایمان لا چکے تھے۔ مسیلمہ نے اپنا الگ قرآن تصنیف کیا تھا اور اس کے علاوہ بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب

لہ ۱۳۷۳ھ میں بمقام کیمبرج مستشرقین کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں روس کے مستشرقین نے اپنی تقاریر و مقالات میں مسیلمہ کذاب اور اس کی قوم بنی حنیفہ کی مدافعت کی تھی جن کے خلاف حضرت صدیق یمامہ کے علاقہ میں نبرد آزما ہوئے تھے۔ جملہ عالم اسلامی میں روسی مستشرقین کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور مجلہ "الازہر" نے اپنی اشاعت ۱۳۷۴ھ ص ۲۵۴ پر اس سے استشراق کے معیار کی پستی پر استدلال کیا تھا۔ روافض بنو حنیفہ کی جو پشت پناہی کرتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ روس کے مستشرقین شیعہ کی اس حرکت سے متاثر ہوئے ہیں جو انہوں نے حضرت صدیق اور مسلمانوں کے اس لشکر کے خلاف انجام دی جس میں انہوں نے عدیم المثال جرأت و شجاعت کا ثبوت دیا تھا ۱۲

کر چکا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق کے نامہ اعمال میں سب سے افضل عمل یہ لکھا جا چکا ہے کہ آپ نے ان مرتدین سے لڑنے کے لیے بہترین صحابہ کا ایک لشکر بھیجا اور اس کی سپہ سالاری حضرت خالد سیف اللہ کو تفویض کی۔ یہ لشکر پہلے طُلَیحہ اسدی کے خلاف صف آرا ہوا۔ جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اہل نجد اس پر ایمان لا چکے تھے۔ طلیحہ بعد ازاں مشرف با سلام ہوا مسیلمہ کی لڑائی میں زید بن خطاب و ثابت بن قیس، اسید بن حضیر و سالم و ابو حذیفہ و ابو دجانہ جیسے جلیل القدر صحابہ شہید ہوئے۔

مسیلمہ نے جو قرآن مرتب کیا تھا وہ حد درجہ مضحکہ انگیز اور اس کی حماقت و سفاہت کا آئینہ دار ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) یَا ضِفْدَعُ بِنْتُ ضِفْدَعَیْنِ، نَقِّیْ کَمْ تَنَقِّیْنَ، لَا الْمَاءَ تُکَدِّرِیْنَ وَ لَا الشَّارِبَ تَمْنَعِیْنَ، رَأْسُکِ فِی الْمَاءِ وَذَنَبُکِ فِی الطِّیْنِ۔

(۲) "اِنَّ الْاَرْضَ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قُرَیْشٍ وَلٰکِنَّ قُرَیْشًا قَوْمٌ لَا یَعْدِلُوْنَ"

(۳) اَلْفِیْلُ، مَا الْفِیْلُ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْفِیْلُ، لَہٗ ذَنُوْمٌ طَوِیْلٌ، اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ خَلْقِ رَبِّنَا الْجَلِیْلِ۔

جب حضرت ابوبکر نے یہ کلام سنا تو فرمایا۔

"مسیلمہ تمہیں کہاں لیے جا رہا ہے یہ کلام خدا کا نازل کردہ نہیں"۔

بہر کیف مسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت، بنو حنیفہ کا اس پر ایمان لانا اور حضرت صدیق کا ان کے خلاف نبرد آزما ہونا تاریخ اسلام کے مشہور واقعات ہیں اور متواتر کی حد تک معروف ہیں۔ عام و خاص سب ان سے آشنا ہیں۔ اور ان کا علم صرف طبقۂ خواص ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ لوگ ان واقعات کو جنگ جمل و صفین سے بھی بڑھ کر جانتے ہیں۔

بعض متکلمین نے جنگ جمل و صفین سے انکار کیا ہے۔ اگرچہ یہ باطل ہے مگر اہل یمامہ کی لڑائی اور مسیلمہ کے دعوی نبوت سے کسی شخص کو مجال انکار نہیں ہوئی۔ البتہ روافض بنا بر جہالت ان واقعات سے اسی طرح انکار کرتے ہیں جیسے دیگر تاریخی حقائق سے شیعہ مندرجہ

ذیل مشہور واقعات کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۱) حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا آنحضور کے پہلو میں مدفون ہونا

(۲) شیعہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر و عمر کے ساتھ آنحضور کو والہانہ محبت تھی۔

(۳) شیعہ کا دعوی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریحاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔

(۴) شیعہ کے نزدیک حضرت زینب، رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہن کو آنحضور کی بیٹیاں نہیں تھیں۔[۱]

(۵) بعض شیعہ کا قول ہے کہ صحابہ نے حضرت فاطمہ کا پیٹ چاک کر دیا جس سے آپ کا حمل ساقط ہو گیا۔

(۶) بقول روافض صحابہ نے حضرت فاطمہ کا مکان منہدم کر دیا اور اہل خانہ اس کے نیچے دب گئے۔

خلاصہ کلام! شیعہ ثابت شدہ تاریخی حقائق کا انکار کرتے اور ان امور کا اثبات کرتے ہیں جو معدوم یا لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔ گویا وہ اس آیت کے مصداق ہیں۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ

(سورۃ العنکبوت (۶۸)

اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا جب حق آئے تو وہ اس کی تکذیب کرنے لگے)

روافض صحیح معنی میں مذکورہ صدر آیت کے مصداق ہیں وہ حق کی تکذیب کرتے اور کذب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرتدین کا بھی یہی حال تھا ان کا دعوی ہے کہ ابوبکر و عمر اور ان

---

[۱] شیعہ آج تک اسی نظریہ پر مصر ہیں چنانچہ انہوں نے حال ہی میں ایک کتاب میں جو نجف کے مطبع علویہ میں ۱۳۴۸ھ میں چھپی ہے اس نظریہ کا اثبات کیا ہے (دیکھئے کتاب مذکور جلد ۲۔ صفحہ ۲۹۱)

کے اتباع اسلام سے منحرف ہو چکے تھے۔ حالانکہ عام و خاص اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وہ ابوبکر ہی تھے جنہوں نے مرتدین کے خلاف جہاد کیا۔ مقام افسوس ہے کہ شیعہ اہل یمامہ کو مظلوم مسلمان قرار دیتے ہیں ایسے لوگوں سے خطاب کیونکر ممکن ہے؟

بقول روافض اہل یمامہ مرتد نہ تھے

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "بنو حنیفہ نے چونکہ ابوبکر کو زکوٰۃ نہ دی تھی۔ اس لیے انھیں مرتدین کا نام دیا"۔ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ حضرت ابوبکر بنو حنیفہ کے خلاف اس لیے صف آرا ہوئے تھے کہ انہوں نے مسیلمہ کذاب کو نبی تسلیم کیا تھا۔ باقی رہے مانعین زکوٰۃ تو وہ بنو حنیفہ نہ تھے بلکہ دیگر قبائل تھے۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ لڑنے میں بعض صحابہ کو شبہ لاحق ہوا تھا۔ البتہ بنو حنیفہ کے خلاف جنگ آزما ہونے میں سب صحابہ یک زبان تھے اور کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا

شیعہ مصنف رقمطراز ہے

"جن لوگوں نے مسلمانوں کو مباح الدم قرار دیا اور حضرت علی کے خلاف نبرد آزما ہوئے اہل سنت ان کو مرتد نہیں کہتے حالانکہ آنحضور کا ارشاد ہے

یَا عَلِیُّ حَرْبِیْ حَرْبُکَ وَسِلْمِیْ سِلْمُکَ

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث کذب محض ہے اور حدیث کی کتب معروفہ میں موجود نہیں اس کی کوئی سند معروف نہیں اور یہ جھوٹی اور موضوع حدیث ہے۔ علاوہ

لہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں مکابرہ و مجادلہ کی کوئی گنجائش نہیں نہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر بلکہ جمیع صحابہ شیعہ کے مخصوص دین سے منحرف تھے اور شیعہ ——— جیسا کہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں ——— حضرت ابوبکر و عمر اور صحابہ کے دین سے مرتد ہو چکے ہیں۔ جو شخص کلمۂ توحید کی یگانگت سے دھوکہ کھا کر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا وہ یا تو شیعہ و شیخین کے مذہب و دین کے باہمی فرق و امتیاز سے ناآشنا ہے یا شیعہ کے ساتھ تقیہ کے طریقہ پہ عمل پیرا ہے جس نے لوگوں کے دین و اخلاق کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اللھم اغفر لکاتبہ و لمن سعی فیہ ۱۲

ازیں حضرت علی نے جنگ جمل وصفین سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بنا پر نہیں لڑی تھیں بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر ان میں شرکت کی تھی۔

قیس[1] بن عباد حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی سے دریافت کیا۔ کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے یہ جنگ لڑنے کا عہد لیا تھا یا آپ اپنی مرضی سے جنگ کر رہے ہیں؟ حضرت علی نے فرمایا یہ آنحضور کا حکم نہیں بلکہ میری رائے پر مبنی ہے۔

اگر حضرت علی کے خلاف لڑنے والا محارب رسول اور دین اسلام سے مرتد ہوتا تو آپ ان جنگ آزماؤں سے مرتدین ایسا سلوک کرتے۔ بلکہ بروایات متواترہ آپ سے منقول ہے کہ آپ نے جنگ جمل میں نہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا نہ کسی زخمی کو قتل کیا نہ ان کے مال کو مال غنیمت قرار دیا نہ ان کے بچوں کو قیدی بنایا۔ خوارج نے حضرت علی کے خلاف یہی اعتراض اٹھایا تھا۔ خوارج نے کہا۔

اگر آپ کے مخالفین مومن ہیں تو آپ ان کے خلاف جنگ آزما کیوں ہوئے؟ اور اگر کافر ہیں تو ان کی عورتیں اور مال کیونکر حرام ٹھہرا"۔ حضرت علی نے خوارج سے مناظرہ کرنے کے لیے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بھیجا حضرت عبداللہ نے خوارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مخالفین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں اگر تم کہو کہ وہ تمہاری ماں نہیں تو تم نے قرآن کو جھٹلایا اور اگر یہ کہو کہ وہ ہماری ماں ہیں اور تم ان کو قید کرنے اور ان سے مجامعت کرنے کو حلال قرار دو تو تم کافر ٹھہرے"۔

حضرت علی اصحاب جمل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

"وہ ہمارے بھائی ہیں مگر انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کردی اور تلوار نے ان کو گناہوں سے پاک کر دیا"۔

---

[1] قیس بن عباد اصحاب علی سے ہیں ان سے روایت کردہ احادیث بخاری، مسلم، ابو داؤد نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں یہ حضرت حسن بصری کے استاد تھے ۱۲

حضرت علی سے منقول ہے کہ انہوں نے فریقین کے مقتولوں کا جنازہ پڑھا تھا۔ علاوہ ازیں اگر اہل صفین مرتد تھے تو بقول شیعہ امام حسن جیسے امام معصوم کے لیے خلافت سے دستبرداری اور اسے ایک مرتد کو تفویض کرنا کیونکر جائز ہوا؟

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ ذیل آیت میں فریقین کو مومن قرار دیا ہے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا[1] (سورہ حجرات۔ ۹)

(اگر مومنوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیجئے)

---

[1] اہل ایمان سے خطاب کر کے فرمایا کہ ان کا موقف یہ ہونا چاہئے کہ فریقین جب بھی برسرپیکار ہوں وہ ان کے مابین صلح کرانے کے لیے سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ کسی شخص میں اصلاح بین المومنین کا جذبہ جس حد تک بھی موجزن ہوگا۔ وہ اسی قدر صادق الایمان ہوگا اور وہ اتنا ہی زیادہ روح اسلام اور اس کے غایات و مقاصد سے قریب تر ہوگا۔ اور وہ جس قدر متنازع فریقین کے مابین شقاق و نفاق کا آرزومند ہوگا اسی قدر ضعیف الایمان اور روح ایمان سے بعید تر ہوگا۔ مختلف مذاہب و ادیان کے لوگ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے۔ غیر مسلم قاری جب جملہ اختلافی مباحث کے بارہ میں اہل سنت و شیعہ کے رجحانات و میلانات کا موازنہ کرے گا۔ تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگا کہ حضرت علی اور آپ کے اخوان کرام صحابہ کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں شیعہ کی ہر ممکن کوشش ہو گی کہ وہ شدت و حدت اور الحاح و اصرار سے ان کو بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جائے گا۔ اس کے عین برعکس اہل سنت اس امر میں کوشاں ہوں گے کہ حکمت و دانش اور رفق و انصاف میں کام میں لا کر فریقین کے درمیان کوئی عذر شرعی تلاش کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ دونوں فریق حق سے دور نہیں نیز یہ کہ یہ واقعات خارجی عوامل و اسباب کے تحت وقوع پذیر ہوئے۔ جن میں سب سے بڑا موثر اہل فتنہ کا وجود نامسعود ہے۔ اہل سنت ہمیشہ اتحاد و یگانگت اور موافقت و مطابقت کا پہلو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مومن خالص اور زیر تبصرہ آیت کا اصلی مخاطب تصور کرتے ہیں۔ جب کہ شیعہ اپنے آپ کو اس آیت کا مخاطب تسلیم نہیں کرتے اس لیے کہ وہ حضرت ابوبکر و عمر اور ان صحابہ (باقی برصفحہ ۴۰۲)

لڑنے والے دونوں فریق مومن ہیں

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرا یہ بیٹا (حضرت حسن) سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین صلح کرائے گا"۔

اس حدیث میں فریقین کو مسلم قرار دیا گیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نواصب (خدا ان کو رسوا کرے) شیعہ سے کہیں کہ

"حضرت علی نے مسلمانوں کو مباح الدم قرار دیا اور حصول اقتدار کے لیے جنگ لڑی حالانکہ حضور کا ارشاد ہے کہ "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے"۔

آنحضور نے یہ بھی فرمایا

"میرے بعد کافر نہ ہو جائیں اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرتے پھریں"۔

تو شیعہ اس کے جواب میں نواصب کو کیا کہیں گے؟

واضح رہے کہ فقہائے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی ایک جماعت نے مانعین زکوۃ اور خوارج سے لڑنے کو باغیوں کے خلاف جہاد و قتال قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جمل و صفین کی لڑائیاں

(بقیہ حاشیہ ص۴۰۱) کی راہ پر گامزن نہیں جو مسلک محمدی کے سالک تھے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اہل سنت صالحین کے وارث ہیں اور شیعہ ان اہل فتنہ کی یادگار ہیں جو حضرت علیؓ کی فوج میں شریک تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ شیعہ آج تک اسی ڈگر پر گامزن ہیں اور فتنہ پردازی کے پرانے طریق کار کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو عبد اللہ بن مصعب بن زبیر نے خلیفہ ہارون الرشید کو حضرت عثمان کے بارے میں کہی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن مصعب نے کہا تھا

"حضرت عثمان پر جن لوگوں نے اعتراضات کیے تھے وہ شیعہ، خارجی اور اہل بدعت تھے اور جن لوگوں نے آپ کی حمایت کی تھی وہ وہی لوگ تھے جن کو آج کل اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے"۔

خلیفہ ہارون الرشید نے غور و فکر کے بعد اس بات کو درست پایا اور کہا۔

"اس کے بعد مجھے یہ مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی"۔

بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ قول مبنی بر خطا اور امام ابو حنیفہ، مالک، احمد اور دیگر اسلاف کی تصریحات نیز سنت نبوی کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ حضور نے خوارج سے لڑنے کا حکم دیا تھا اور سب صحابہ اس میں یک زبان تھے۔ البتہ جمل و صفین کی لڑائی قتال فتنہ ہے اور باغیوں کے خلاف جنگ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں نہ آپ نے کوئی حکم دیا۔ نہ اس پر اجماع صحابہ قائم ہوا۔[1] علاوہ ازیں اہل صفین نے حضرت علی کے خلاف لڑائی کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔

امام ابو حنیفہ اور بعض دیگر علماء باغیوں سے اس وقت لڑنے کی اجازت دیتے ہیں جب وہ حاکم وقت کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیں۔ امام ابو حنیفہ مالک اور احمد بن حنبل کے نزدیک خلیفہ ان لوگوں سے لڑنے کا مجاز نہیں جو شرعی واجبات ادا کرتے ہوں مگر یہ کہیں کہ ہم فلاں شخص کو زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بنابریں قتال مرتدین اور خوارج کے خلاف جہاد و قتال کے مابین فرق و امتیاز ضروری ہے۔ البتہ مانعین زکوٰۃ جب زکوٰۃ بالکل ادا نہ کریں اور اس کی فرضیت کے بھی قائل نہ ہوں تو ان کے خلاف صف آرا ہونا خوارج کے مقابلہ میں لڑنے سے زیادہ ضروری ہے۔

مزید براں قرآن کریم میں باغیوں کی جس لڑائی کا ذکر کیا گیا ہے وہ سابقاً ذکر کردہ دونوں لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور وہ قتال کی تیسری جداگانہ قسم ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے باغیوں سے ابتداءً لڑنے کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کی اصلاح کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ مرتدین اور خوارج کے بارے میں شرعی حکم اس سے مختلف ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جنگ جمل و صفین باغیوں کے خلاف لڑی گئیں یا ان کو قتال فتنہ قرار دیا جائے۔ جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے[2]

---

[1] اس ضمن میں حضرات صحابہ تین فرقوں میں بٹ گئے تھے اس لیے اجماع منعقد نہ ہو سکا۔ ایک فریق تو حضرت علی کا معاون تھا اور دوسرا حضرت معاویہ کا۔ تیسرا فرقہ جس کے سرخیل عبد اللہ بن عمر بن خطاب تھے اسے فتنہ قرار دیتے اور اس سے کنارہ کش تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تحکیم کے واقعہ میں عبد اللہ بن عمر کو خلافت کی پیشکش کی گئی تو آپ نے معذرت فرمائی۔ ان امور میں صحابہ کا اجماع منعقد نہیں ہوا تھا۔"

[2] یہ حدیث صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔"

صحابہ میں سے جو لوگ ان میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ اور جمہور اہلحدیث ان کو قتال فتنہ ٹھہراتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اگر اصحاب معاویہ حضرت علی کی بیعت نہ کرنے کی بنا پر باغی ہو گئے تھے تو مذکورہ آیت میں ان کے جنگ آزما ہونے کا حکم موجود نہیں اور اگر فرض کیا جائے کہ وہ جنگ کے بعد باغی ہو گئے تھے تو صلح کرانے والا کوئی نہ تھا امام ذہبی کہتے ہیں کہ آنحضور حضرت عمار والی حدیث میں کہ "تجھے باغی جماعت قتل کرے گی" ان کو باغی قرار دیا ہے۔ یہ ایسے مباحث ہیں جن کی بنا پر اصحاب معاویہ کی تکفیر ہرگز درست نہیں۔

جنگ جمل و صفین کی شرعی حیثیت

شیعہ مصنف کی پیش کردہ حدیث "اے علی تجھ سے لڑائی مجھ سے جنگ آزما ہونے کے مترادف ہے"۔ کا کذب اس بات سے ظاہر ہے کہ اگر حرب علی حرب رسول ہوتی تو جنگوں میں حضرت علی کی کامیابی ناگزیر تھی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل کی نصرت و تائید کا کفیل ہے۔

---

[۱] حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جب حضرت علی کی جانب سے کوفہ کے والی مقرر ہوئے تھے تو انہوں نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا۔ جنگ جمل سے پہلے کوفہ کے سب دانشمند آدمی یہی نظریہ رکھتے تھے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس بات سے خائف تھے کہ امت میں خونریزی کا دروازہ نہ کھل جائے۔ وہ کوفہ کے منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو آنحضور کی یہ حدیث یاد دلایا کرتے تھے کہ "القاعد فیہا خیر من القائم"۔ ایک مرتبہ ابو موسیٰ منبر پر لوگوں کو یہ حدیث سنا رہے تھے اسی دوران اشتر نخعی نے چند آدمیوں سمیت دار الامارۃ پر قبضہ کر لیا۔ جب ابو موسیٰ دار الامارۃ کی طرف لوٹے تو اشتر نے یہ کہہ کر داخل ہونے سے روک دیا کہ "ہماری امارت کو چھوڑ دو"۔ ابو موسیٰ فتنہ بازی کی یہ زندگی چھوڑ کر عرض نامی گاؤں میں عزلت گزین ہو گئے۔ جب لوگ خونریزی سے سیر ہو گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ ابو موسیٰ جنگ سے روکنے میں حق بجانب تھے تو انہوں نے حضرت علی سے مطالبہ کیا کہ ابو موسیٰ تحکیم کے معاملہ میں اہل عراق کے نمائندہ ہوں۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ کو گوشۂ عافیت سے اٹھا کر لایا گیا اور آپ نے ایک ناصح کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا۔

اللہ تعالٰے فرماتے ہیں۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (غافر-۵۱)

ہم اپنے رسولوں اور اہل ایمان کی مدد کرتے ہیں

نیز فرمایا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝

(سورۃ الصافات (۱۷۱-۱۷۲)

ہماری جانب سے رسولوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ ان کی مدد کی جائیگی۔
اس آیت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ حدیث صحیح ہوتی تو حضرت علی کے اعداء ہمیشہ مغلوب ہوتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ خوارج کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ یقیناً اللہ و رسول کے خلاف جنگ لڑنے والے ہیں اللہ تعالٰے فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

ان لوگوں کی سزا جو اللہ و رسول کے خلاف جنگ لڑتے ہیں

اس کے باوصف ہم خوارج کی تکفیر نہیں کرتے اس لیے کہ تکفیر کی صورت میں ان کے خلاف نبرد آزما ہونا ضروری ہے۔

شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے۔

"بعض فضلاء نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ معاویہ رض شیطان سے بدتر تھے۔ کیونکہ شیطان نے تو کچھ نیکیاں بھی انجام دی تھیں اس کے برخلاف معاویہ اعمال صالحہ سے محروم تھے۔ البتہ میدان معصیت میں شیطان سے پیچھے۔ علماء کے یہاں مسلّم ہے کہ ابلیس سب فرشتوں سے زیادہ عبادت کرتا تھا اور اس نے چھ ہزار سال تک تنہا عرش معلی کو اٹھائے رکھا پھر تکبر کر کے ملعون ٹھہرا۔ مگر معاویہ اسلام لانے تک مشرک اور صنم پرست رہا۔ پھر حضرت علی کو بامر کبر خلیفہ نہ مانا لہذا وہ ابلیس سے بدتر ٹھہرا۔"

ہم کہتے ہیں کہ یہ کلام جہل و ضلال کا آئینہ دار بلکہ عقل سلیم کے بھی منافی ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ ابلیس لعین سب کفار سے بڑھ کر ہے بلکہ سب کافر اس کے

اتباع اور کشتۂ ضلالت ہیں ۔ لہٰذا اس سے بہتر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ میدان معصیت میں کوئی بشر ابلیس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس نے علانیہ حکم خداوندی سے عدول کیا اور پھر ہمہ تن اس کے بندوں کو گمراہ کرنے میں لگ گیا۔ بنا بریں اگر اس نے کچھ عبادت انجام دی تھی تو وہ اس کے کفر کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔

ابلیس فرشتوں سے زیادہ عبادت گذار نہ تھا

کون کہتا ہے کہ ابلیس فرشتوں سے زیادہ عبادت گذار تھا؟

اس نے تنہا عرش کو اٹھائے رکھا نیز یہ کہ وہ "طاؤس الملائکہ" (فرشتوں کا مور) تھا اور اس نے زمین و آسمان پر کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں سجدہ نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کی اساس نقل پر ہے۔ حالانکہ یہ کسی آیت و حدیث میں مذکور نہیں۔

شیعہ مصنف کی افترا پردازی کا یہ عالم ہے کہ اس جھوٹ کو علماء کے یہاں مسلم قرار دیتا ہے ۔ اگر یہ بات کسی وعظ گو ملا نے کہی ہو یا ترغیب و ترہیب[1] کی کسی کتاب میں درج ہو۔ یا کسی ایسی بے اصل تفسیر میں منقول ہو جو اسرائیلیات سے لبریز ہو تو اس سے کسی معمولی بات پر احتجاج کرنا بھی درست نہیں چہ جائیکہ اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے کہ ابلیس گنہگار بنی آدم سے افضل تھا اور صحابہ میں ان لوگوں کو شامل کیا جائے جن سے ابلیس بہتر تھا۔

اللہ و رسول نے کہیں بھی ابلیس لعین کا ذکر مدح و ستائش کے انداز میں نہیں کیا ۔ وہ

---

[1] یہ وہ کتب ہیں جو عوام کو وعظ سنانے کے لیے ترتیب دی گئی ہیں ان میں ترغیب و ترہیب پر مشتمل مبالغہ آمیز حکایات ہوتی ہیں جو تاریخ و تراجم کی کسی کتاب میں مذکور نہیں یہ مبالغہ سنت الٰہی کے منافی ہو یا نہ ہو البتہ کتاب و سنت کی تصریحات کے ضرور خلاف ہوتا ہے ان کتب کے مصنفین بالسند یا بے سند ادر مصادر کا نام لیے کر یا نام لیے بغیر جو احادیث بیان کرتے ہیں ان کی صحت کے اثبات میں بایں دلیل چشم پوشی سے کام لیتے ہیں کہ یہ احادیث عوام کو وعظ سنانے کے لیے ذکر کی جاتی ہیں استنباط احکام کے لیے نہیں حالانکہ ان لوگوں کو احادیث سنانے کی بجائے ان کے سامنے اپنا عملی نمونہ پیش کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے اگر آنحضور یہ احادیث سنتے تو ان میں سے اکثر کو رد فرما دیتے ۱۲

حاملین عرش میں بھی شامل نہ تھا۔ تنہا حامل عرش ہونا تو ایک جداگانہ بات ہے۔ یہ سب یاوہ گوئی ہے۔ اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ابلیس کے جملہ اعمال صالحہ اگر تھے بھی تو وہ ضائع ہو گئے۔

اس کے عین برخلاف حضرت معاویہ کے ایمان نے دیگر صحابہ کی طرح ان کے کفر کو مٹا دیا۔ شیعہ حضرت عثمان و معاویہ اور دیگر صحابہ کو مرتد قرار دیتے ہیں اسی طرح غلطی پر ہیں جیسے خوارج حضرت علی کو کافر تصور کرتے ہیں۔ شیعہ صحابہ کو مرتد قرار دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت علی ہمیشہ مرتدین کے مقابلہ میں مغلوب رہے۔ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت حسن نے خلافت سے دستبردار ہو کر اسے ایک مرتد کو تفویض کر دیا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوگا کہ نصرت خداوندی حضرت علی کی بجائے ہمیشہ حضرت خالد بن ولید کے شامل حال رہی۔ یہ بات غلط ہے کہ خدا کی نافرمانی کرنے والا ہر شخص اس کی طاعت و عبادت سے منحرف ہوتا ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"بعض اہل سنت نے اس حد تک غلو سے کام لیا کہ یزید کو امام تصور کرنے لگے حالانکہ اس نے حضرت حسین کو قتل کیا اور اہل بیت خواتین کو ننگے اونٹوں پر سوار کر کے مختلف شہروں سے گزرنے پر مجبور کیا جب کہ زین العابدین کے گلے میں طوق پڑا تھا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جاہل گرد لوگوں کی طرح یہ نہیں کہتے کہ یزید خلفائے راشدین

ا۔ شیخ عدی بن مسافر المتوفی (۴۶۷ — ۵۵۷) ایک عابد و زاہد شخص تھے انہوں نے دیکھا کہ شیعہ یزید پر طرح طرح کے بہتان باندھتے اور اس کے دین و اخلاق پر حملے کرتے ہیں۔ روافض کے اس رویہ سے تنگ آکر شیخ عدی نے اعلان کر دیا کہ یزید امام تھا اور شیعہ کے سب اتہامات اس کے خلاف کذب ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "العدویہ" میں لکھا ہے کہ شیخ عدی کا مسلک افراط و تفریط سے پاک تھا۔ شیخ عدی کے ایک نائب حسن کے زمانہ میں روافض اتباع عدی کی ایک جماعت پر حملہ آور ہوئے۔ اور عدی کے خلیفہ شیخ حسن کو قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا (باقی بر صفحہ ۴۰۸)

یں سے تھا۔ یا وہ نبی تھا۔ یزید کی مدح میں مبالغہ کرنے والے ان شلعیہ کی طرح ہیں جنھوں نے حضرت علی کی نبوت بلکہ الوہیت کا عقیدہ گھڑ لیا تھا۔

بنوامیہ کے بعض اتباع سے نقل کیا گیا ہے کہ خلیفہ کے نیک اعمال قبول کیے جاتے اور بُرے اعمال سے درگذر کی جاتی ہے۔ یہ لوگ بلاشبہ گمراہ ہیں۔ مگر ان کی گمراہی ان لوگوں کے مقابلہ میں کم ہے جو امام منتظر کی عفت و عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ

(بقیہ حاشیہ ص۴۰۷) کہ شیخ عدی کے مریدوں نے اسی طرح غلو سے کام لینا شروع کیا جس طرح شلعیہ حضرت علی اور اہل بیت کے بارے میں مبالغہ آمیزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کرد جو شیخ عدی کے مرید تھے یزید کو نبی قرار دینے لگے۔ امام ابن تیمیہؒ کے زمانہ میں کُرد یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ شیخ الاسلام نے ان کو راہ راست پر لانے کے لیے "الرسالۃ العدویہ" تصنیف کیا اور اس میں واضح کیا کہ شیخ عدی نیک آدمی تھے۔ اگر اس وقت زندہ ہوتے تو ارادت مندوں کے اس اغراق و مبالغہ کو ناپسند کرتے۔

الرسالۃ العدویہ کا ایک قدیم ناقص الآخر نسخہ دار الکتب المصریہ میں تاہنوز محفوظ ہے۔ علامہ محقق احمد تیمور پاشا نے الرسالۃ العدویہ کے چند فقرے اپنے رسالہ "الیزیدیت" میں درج کیے ہیں ہم رسالہ مذکورہ کو دو مرتبہ طبع کرا چکے ہیں۔ آخری مرتبہ یہ ۱۳۵۲ھ میں چھپا۔ رسالہ مذکور سے واضح ہوتا ہے کہ کرد یزید کو نبی قرار دیتے ہیں پھر اس سے بڑھ کر منصب الوہیت پر فائز کر دیا اس فرقے کا نام "یزیدیہ" ہے۔ قبیلہ کرد کی یہ جماعت شمالی عراق کے علاقہ سنجار میں بود و باش رکھتی ہے۔ کچھ لوگ روس کے صوبہ ارواق اور دمشق و بغداد و حلب کے نواح میں بھی سکونت گزین ہیں۔ شیخ عدی کردوں کے یہاں جبال ہکار میں جانے سے پیشتر لبنان و شام کے ایک گاؤں میں رہ کر مصروف عبادت رہا کرتے تھے۔ یہ بعلبک کے قریب بیت فار نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ تصوف میں شیخ عبد القادر جیلانی اور عبد القاہر سہروردی، عقیل منبجی۔ حماد دباس اور ابو الوفا حلوانی کے شاگرد تھے۔ اگر شیخ عدی کے اتباع ان کے طریقہ پر گامزن رہتے تو نہایت ہی صالح مسلمان ہوتے مگر انہوں نے کفر کی حد تک غلو سے کام لیا۔ دراصل ان کا غلو روافض کے غلو سے پیدا شدہ اور اس کا توڑ ہے ۱۲

اللهم اغفر لكاتبه ولمن سعى فيه ولوالديهم اجمعين

وہ ساڑھے چار سو سال سے تہ خانہ میں اقامت گزین ہے۔ حالانکہ وہ معدوم محض ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔

یزید کے حق میں ابن الحنفیہ کی شہادت

فرقہ مرجیہ جو بڑا کثیر التعداد ہے۔ یہ نظریہ رکھتا ہے کہ توحید کی موجودگی میں دوسری کسی چیز سے نقصان نہیں پہنچتا۔ ہم کہتے ہیں کہ حدیث نبوی کے مطابق خلافت نبوت تیس[۳۰] سال تک تھی۔ پھر ملوکیت کا آغاز ہوا۔ اگر یزید کی امامت و خلافت سے مراد یہ ہے کہ وہ دیگر اموی و عباسی خلفاء کی طرح سلطان وقت اور صاحب السیف تھا تو یہ ایک یقینی بات ہے۔ یزید مکہ کے سوا تمام بلاد اسلامیہ کا حاکم تھا۔ مکہ پر ان دنوں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ قابض تھے۔ حضرت ابن زبیر نے اس وقت دعوتِ خلافت کا آغاز کیا جب آپ کو معاویہ کے مرنے کی خبر پہنچی[۲]

---

[۱] ہم قبل ازیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ذکر کر چکے ہیں کہ شیعہ کا یہ فرضی امام بقول شیعہ ساڑھے چار سو سال قبل تہ خانہ میں داخل ہوا۔ چونکہ روافض کے نزدیک یہ واقعہ ۲۶۰ھ میں پیش آیا۔ اس لیے میں نے اس سے استدلال کیا کہ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ ۷۱۰ھ کے بعد تصنیف کی۔ منہاج السنۃ کے ملخص امام ذہبی نے مخطوطہ مختصر صفحہ ۷ کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ شیعہ کا یہ فرضی امام چار سو ساٹھ سال ہوئے تہ خانہ میں داخل ہو چکا ہے۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ امام ذہبی نے یہ ملخص ۷۲۰ھ میں یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کی وفات سے آٹھ سال پہلے تیار کیا۔

[۲] خلافت یزید کے سلسلہ میں دو باتیں محل فکر و نظر ہیں (۱) آیا یزید منصب خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟ (۲) یزید کی نامزدگی۔

جہاں تک پہلے مبحث کا تعلق ہے ہم اس پر قبل ازیں اظہار خیال کر چکے ہیں کہ یزید اپنے ننھیال قبیلہ قضاعہ کے بدویانہ خیموں میں جرأت و شہامت اور تکلف و تصنع سے پاک و سادہ ماحول میں پروان چڑھا۔ شیعہ نے اپنی کتابوں میں یزید کی سیرت و سوانح سے متعلق جھوٹ کا جو طومار باندھا ہے یہ یزید پر عظیم ظلم ہے۔ یزید کی سیرت کردار کے بارے میں (باقی برصفحہ ۴۱۰)

(بقیہ حاشیہ ص۴۰۹) حضرت محمد بن حنفیہ کی شہادت کے بعد مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں جب حضرت ابن زبیر کا داعی عبداللہ بن مطیع لوگوں کو یزید کے خلاف بغاوت پہ آمادہ کر رہا تھا اور یزید کی جانب ان باتوں کو منسوب کر رہا تھا جو اس میں نہ تھیں مثلاً یہ کہ یزید شراب پیتا ہے۔ نماز نہیں پڑھتا اور احکام قرآنی سے تجاوز کرتا ہے۔ یہ سن کر محمد بن علی بن ابی طالب المعروف بہ ابن الحنفیہ نے فرمایا۔

"تم یزید کے بارے میں جن باتوں کا ذکر کرتے ہو وہ میں نے اس میں نہیں دیکھیں۔ حالانکہ میں نے اس کے یہاں قیام کیا تھا۔ دوران قیام میں نے دیکھا کہ یزید پابندی سے ہمیشہ نماز ادا کرتا۔ نیک اعمال میں پوری دلچسپی لیتا اور فقہی مسائل کا جواب دیتا ہے اس کے ساتھ وہ سنت نبوی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا"۔ لوگوں نے کہا "یزید آپ کو دکھانے کے لیے یہ اعمال انجام دیتا تھا"۔ یہ سن کر امام ابن الحنفیہ نے فرمایا۔

"یزید کو مجھ سے کس بات کا خوف یا لالچ تھا کہ اس نے تصنع سے عجز و انکسار کا اظہار کیا؟ کیا تم نے خود اسے شراب پیتے دیکھا ہے؟ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو تم شراب پینے میں اس کے شریک ٹھہرے اور اگر نہیں دیکھا تو علم کے بغیر شہادت دینا تمہارے لیے کیونکر روا ہے"؟۔

لوگوں نے کہا "اگرچہ ہم نے یزید کو شراب پیتے نہیں دیکھا تاہم یہ بات درست ہے"۔

اس کے جواب میں حضرت ابن الحنفیہ نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ اہل شہادت کے بارے میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتے قرآن میں فرمایا۔

إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (سورہ زخرف۔ ۸۶)

اس معاملہ میں میں تم سے بری ہوں"۔ لوگوں نے کہا۔ "آپ خلیفہ بننا چاہتے ہیں تو چلیے ہم آپ کو اپنا حاکم تسلیم کرتے ہیں"۔ امام ابن الحنفیہ نے فرمایا۔ میں حاکم یا محکوم کسی صورت میں بھی لڑائی کو حلال نہیں سمجھتا"۔

لوگوں نے کہا "آپ اپنے والد کی حمایت میں لڑ چکے ہیں"

ابن الحنفیہ نے فرمایا۔ میرے والد جیسا کوئی شخص لے آؤ میں اس کی حمایت میں لڑنے سے گریز نہیں کروں گا"۔ (باقی برص ۴۱۱)

(بقیہ حاشیہ صنٓ۴۱۰)

لوگوں نے کہا "تو اپنے دونوں بیٹوں قاسم اور ابو القاسم سے کہیے کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے لڑیں"۔

ابن الحنفیہ نے کہا۔ "اگر میں نے بیٹوں کو لڑائی کا حکم دے دیا تو گویا خود لڑائی میں شریک ہوا"۔

لوگوں نے کہا۔ "تمہارے ساتھ کسی جگہ چل کر لوگوں کو جنگ کی رغبت دلائیں"۔

ابن الحنفیہ نے کہا۔ "سبحان اللہ میں لوگوں کو ایسی بات کہوں جس پر خود عمل پیرا نہیں اور اسے پسند بھی نہیں کرتا"۔

لوگوں نے کہا۔ "تو ہم آپ کو اس بات پر مجبور کریں گے"۔

ابن الحنفیہ نے فرمایا۔ "میں تو لوگوں کو خدا سے ڈرنے اور اس بات کا حکم دوں گا کہ وہ مخلوق کو راضی کرنے کے لیے خدا کی ناراضگی مول نہ لیں"۔

اس کے بعد ابن الحنفیہ عازم مکہ ہوئے۔ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۸ ص ۲۳۳)

یزید کے حق میں یہ ایک عینی شاہد کی بیان کردہ تاریخی نقل ہے۔ ابن الحنفیہ ایک ایسے معتبر راوی ہیں کہ اگر ان سے کوئی بھی نص شرعی منقول ہوتی تو سب ائمہ اسلام اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے۔ اس سے بڑھ کر اور کونسا وصف مطلوب ہے کہ ابن الحنفیہ حضرت علی کے جگر گوشہ ہیں صحیح مسلم کی کتاب الامارۃ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اس ضمن میں عبد اللہ بن مطیع کے یہاں گئے تو اس نے کہا ابو عبد الرحمن کے لیے مسند رکھیے۔ حضرت عبد اللہ نے کہا۔ میں آپ کے یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا بلکہ ایک حدیث سنانے آیا ہوں جو میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے آپ نے فرمایا۔

جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہو گی اور جو شخص بیعت کے بغیر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا (صحیح مسلم)

صحیح بخاری کتاب الفتن میں ہے کہ جب اہل مدینہ نے یزید کی بیعت ترک کر دی تو حضرت عبد اللہ بن عمر نے اپنے خدم وحشم اور بچوں کو جمع کیا اور کہا کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سنا ہے۔ (باقی بر صنٓ۴۱۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۱) ہر دھوکہ باز کے لیے بروز قیامت جھنڈا نصب کیا جائے گا"۔

"ہم اللہ و رسول کے حکم کے مطابق یزید کی بیعت کر چکے ہیں اور میرے نزدیک اس سے بڑا دھوکہ اور کچھ نہیں کہ حکم خداوندی کے مطابق ایک شخص کی بیعت کی جائے پھر اس کے خلاف جنگ کا آغاز کیا جائے۔ مجھے جس شخص کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے یزید کی بیعت ترک کر کے کسی اور کی بیعت کر لی ہے میں اس سے باز پرس کروں گا" (بخاری)

حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۲۸ میں امام مدائنی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت حسن بن علی کی وفات کے بعد امیر معاویہ کے یہاں تشریف لائے اسی دوران یزید تعزیت کے لیے حضرت ابن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب یزید چلا گیا تو ابن عباس نے کہا۔ جب بنو امیہ رخصت ہو جائیں گے تو اہل علم کا بھی خاتمہ ہو جائے گا (البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۲۲۸)

یہ وہ امور ہیں جو یزید کی صلاحیت امامت، صحابہ کے اس کو تسلیم کرنے اور ابن الحنفیہ کی یزید کے حق میں تائید و شہادت سے متعلق ہیں۔ ابن الحنفیہ نے تصریحاً کہہ دیا کہ یزید کے بارے میں دھوکہ بازوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صاف جھوٹ ہے۔

یہ بات ہنوز محتاج غور و فکر ہے کہ حضرت معاویہ نے یزید کو خلیفہ کیوں مقرر کیا جبکہ قریش کے متعدد نوجوان جو یزید کے معاصر تھے اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اپنے آپ کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ مثلاً سعید بن عثمان بن عفان بلکہ ان سے فروتر درجہ کے لوگ بھی اس منصب کو سنبھالنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب ولی عہد نامزد کرنے سے بلاشبہ اولیٰ و افضل ہے۔ مگر حضرت معاویہ جانتے تھے کہ اگر اس وقت شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ منتخب کرنے کا سوال اٹھایا گیا تو امت میں خونریزی کا ایسا دروازہ کھلے گا جو اسی وقت بند ہوگا جب قریش میں ولایت و خلافت کی اہلیت رکھنے والے سب لوگ صفحۂ ارضی سے نابود ہو جائیں۔ حضرت معاویہ پر یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ فضائل و مناقب اور خصوصیات ان مدعیان خلافت کے مابین تقسیم شدہ ہیں۔ اگر ایک شخص ایک خصوصیت رکھتا ہے تو دوسرا کسی اور وصف کا حامل ہے جو اس میں موجود نہیں۔ (باقی صفحہ ۴۱۳ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۲) جہاں تک یزید کا تعلق ہے وہ اپنے معاصر مدعیان امارت و ولایت کے اوصاف و خصوصیات میں برابر کا سہیم و شریک تھا۔ البتہ حکومت و سلطنت کی ایک لابدی خصوصیت یزید میں ایسی تھی جس سے دوسرے یکسر محروم تھے اور وہ یہ ہے کہ یزید عسکری قوت سے بہرہ ور تھا جو بوقت ضرورت اسلام کی ایک عظیم قوت ثابت ہو سکتی تھی اور اگر یزید خلافت میں مزاحمت کرنے والوں کے خلاف برسرپیکار ہوتا تو یہ قوت وہاں بھی اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اگر یزید کے ننہال قبیلہ قضاعہ اور اس کے حلیف یمنی قبائل کے سوا اس کا کوئی مددگار بھی نہ ہوتا تو وہ اپنے سب مخالفین کو زیر کر سکتا تھا۔ اس موقع پر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں حضرت حسین کے سفر عراق کا حال بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ ابن خلدون مقدمہ تاریخ کی فصل "ولایۃ العہد" میں لکھتا ہے۔

"قوت و شوکت کا اندازہ لگانے میں حضرت حسین سے غلطی سرزد ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مضر کی عصبیت ان دنوں قبیلہ قریش میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ قریش کی عصبیت عبد مناف میں اور عبد مناف کی حمایت و طرفداری بنو امیہ میں آکر گھر گئی تھی۔ سب قریش اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے اور کسی کو اس سے مجال انکار نہ تھی۔ آغاز اسلام میں جب لوگ معجزات اور وحی الٰہی میں منہمک ہو گئے تو یہ جاہلی عصبیت فراموش ہو گئی تھی۔ نبوت اور خوارق و معجزات کا انقطاع ہونے کے ساتھ ہی یہ عصبیت لوٹ کر آگئی اور قبیلہ مضر کے لوگ باقی لوگوں کو چھوڑ کر بنو امیہ کا ساتھ دینے لگے۔ (مقدمہ ابن خلدون)

یزید کی نامزدگی میں حضرت معاویہ نے اسلامی شہنشاہیت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا تھا جس کا ان دنوں بڑا چرچا تھا اور جس کے پھلنے پھولنے اور وسعت پذیر ہونے میں دعوت اسلامی کی توسیع کا راز مضمر تھا۔ یہ توسیع زیادہ تر حضرت معاویہ و عثمان اور ان کے خلفاء کے عہد میں ہوئی نظر بریں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عرب کے دونوں بازو یعنی یمن و مضر یا قحطان و عدنان میں کامل اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے۔ یزید کو ولیعہد نامزد کرنے سے بیشتر حضرت معاویہ یزید کو امور سلطنت سکھایا کرتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے ۴۹ھ میں یزید کو رومی سلطنت کے استیصال کے لیے روم بھیجا اور اس کے جھنڈے قسطنطنیہ کی دیواروں پر لہرانے لگے۔ یہ وہ بابرکت (باقی بر صفحہ ۴۱۴)

ان لوگوں کے امام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکومت وسلطنت اور سیف وسنان سے بہرہ ور تھے کسی کو حاکم مقرر کرتے اور کسی کو معزول کرتے۔ کسی کو دیتے اور کسی کو نہ دیتے۔ ان کے احکام حدود سلطنت میں نافذ ہوتے تھے۔ وہ شرعی سزائیں دیتے کفار سے جہاد کرتے اور لوگوں میں مال تقسیم کیا کرتے تھے۔

یہ سب باتیں متواتر کی حد تک معروف ہیں اور ان سے مجال انکار نہیں۔ ان کے امام خلیفہ یا سلطان ہونے کا یہی مطلب ہے۔ جیسے امام صلوٰۃ وہ ہے جو لوگوں کو نماز پڑھاتا ہو جب ہم دیکھیں کہ کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہے تو اس کا امام ہونا ایک مشہود و محسوس امر ہے جس میں جدل و بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ باقی رہا اس کا نیک یا بد ہونا تو یہ ایک الگ بات ہے۔ اہل سنت سلاطین و خلفاء مثلاً یزید یا عبدالملک یا منصور میں سے جب کسی کو

(بقیہ حاشیہ ص۴۱۳) لشکر تھا جس میں حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، ابو ایوب انصاری اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ شریک تھے۔ اس عظیم اسلامی جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور کے دوسرے خواب کی تعبیر ظاہر کی جو آپ نے بمقام قباء حضرت انس کی خالہ کے یہاں دیکھا تھا۔

اگر ان تاریخی حقائق پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لخت جگر ابن الحنفیہ کی شہادت کا بھی اضافہ کر لیا جائے جس میں انہوں نے یزید پر عائد کردہ اتہامات کو بے بنیاد قرار دیا تھا تو اس مظلوم قریشی نوجوان (یزید) کی اصلی صورت سامنے آجاتی ہے جو اس پر از خیر و برکت زمانہ سے بالکل ہم آہنگ تھی جس کے ائمہ میں سے یزید بھی ایک امام تھا۔ علاوہ ازیں اس سے تاریخ اسلام کے وہ داغ دھبے دور ہو جائیں گے جن سے شریر لوگ اس کو داغدار کرنا چاہتے ہیں۔

اگر اس کتاب کے دامن میں مزید وسعت ہوتی تو ہم بہت سے تاریخی حقائق بیان کرتے۔ (بعض حقائق کیلئے دیکھئے ہمارے حواشی بر العواصم من القواصم) اگر زندگی نے مہلت دی تو میں اسلام کے اس قرض کو جس سے میری گردن زیر بار ہے صدر اسلام کی ایک ایسی تاریخ پیش کر کے ادا کروں گا جس کو دیکھ کر مسلم نوجوان عش عش کر اٹھیں اور مسلمانوں پر یہ راز آشکار ہو جائے کہ اموی دور میں اسلام یورپ اور افریقہ میں کیونکر اشاعت پذیر ہوا تھا۔ ایسی تاریخ امت مسلمہ کی ایک اہم ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ایسے شخص کو اس خدمت کی توفیق ارزانی کرے جو بہمہ وجوہ اس کا حق ادا کر سکے۔ (محب الدین الخطیب)

امام تصور کریں گے تو اس کی یہی حیثیت ہو گی۔ جو شخص اس میں جدل یا بحث سے کام لیتا ہے وہ اسی طرح ہے جیسے کوئی حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کی ولایت یا قیصر و کسریٰ اور نجاشی کی بادشاہت کو تسلیم نہ کرے اور اس میں جھگڑنے لگے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ ائمہ و خلفاء معصوم تھے؟ یا سب باتوں میں عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل پیرا تھے۔ اور سب افعال و امور میں اللہ تعالیٰ کے اطاعت کیش تھے تو کوئی مسلمان یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ تاہم اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ طاعات و عبادات میں ان کے ساتھ شرکت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم ان کی اقتدا میں جمعہ و عیدین اور دیگر نمازیں پڑھ سکتے ہیں اس لیے کہ اگر ان کی اقتداء میں نماز نہ پڑھی جائے تو نمازیں معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ ہم ان کے ساتھ مل کر کفار کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں۔ بیت اللہ کا حج کر سکتے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامت حدود میں ان کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان حج کرنے جائے یا کسی لڑائی میں شریک ہو یا کوئی اور نیک عمل انجام دے اور اس عمل میں اس کے ساتھ کوئی فاسق و فاجر آدمی بھی شریک ہو تو اس کی شرکت کی وجہ سے اسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ اسی طرح عدل و انصاف اور تقسیم مال وغیرہ میں بھی ان سے اعانت طلب کی جا سکتی ہے اس لیے کہ بسا اوقات ان کے احکام اور ان کی تقسیم عدل و انصاف پر مبنی ہوتی ہے وہ نیک کاموں میں اعانت کرتے ہیں[1] اور اثم و عدوان میں تعاون کرنے میں احتراز کرتے ہیں۔

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ امت محمدی تا ہنوز بخیر و عافیت ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ امت کے اولیں ولاۃ و حکام غیر معصوم ہونے کے باوجود صلاح و استقامت کے انتہائی بلند معیار پر فائز تھے اقوام عالم میں جو لوگ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے فروتر ہیں وہ ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ ان کی لغزشوں کا ذکر نہایت نرم الفاظ میں کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے مناسب عذر تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دور حاضر کے بعض شر پسند ہمارے بعض نیک نہاد سلاطین و ملوک کی سیرت و سوانح کو بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں ان کے کارہائے نمایاں کو چھپاتے اور ان کی تاویلیں (باقی بر صفحہ ۴۱۶)

جب کوئی خلیفہ اقتدار پر قابض ہو جائے مثلاً یزید و عبد الملک اور منصور پھر یا تو اس سے لڑ کر اسے اقتدار سے محروم کیا جائے گا۔ یہ رائے فاسد ہے اور اس کا نتیجہ خونریزی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے خواہ خروج کرنے والا دیندار ہی کیوں نہ ہو۔ تاریخ اس بات کی

(بقیہ حاشیہ ص۴۱۵) کرتے اور ان سے صادر شدہ لغزشوں کو رائی کا پہاڑ بنا کر دکھا رہے ہیں وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ ان ولاۃ و حکام کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں حالانکہ اس کا سب سے بڑا نقصان ملت اسلامیہ کو پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے ملت کے اذہان و قلوب میں مایوسی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ اپنے ماضی سے بددل ہو جاتی ہے۔

حق کے پرستار و یادگار اہل سنت مثلاً امام بخاری، مسلم اور دیگر حفاظ حدیث کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے صداقت شعار راویان حدیث کی جمع و تدوین میں انہوں نے حد درجہ اعتدال سے کام لیا۔ خلفائے راشدین کے بعد آنے والے ولاۃ و حکام کے اخبار و واقعات جمع کرنے میں مورخین غالباً یہ نظریہ رکھتے تھے کہ تقابل کے نقطۂ نظر سے وہ حکام خلفائے راشدین کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے اس لیے انہوں نے ان کے بعض ایسے حقوق ادا کرنے میں فیاضی سے کام نہ لیا جو بذات خود عظیم مگر خلفائے راشدین کے مقابلہ میں فروتر درجہ کے تھے۔

بہرکیف اہل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کسی کو معصوم قرار نہیں دیتے اور ہر مستحق کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں۔ دور حاضر میں جب ہم از سر نو تاریخ اسلام کا جائزہ لے کر اسے کذب و دروغ سے پاک و صاف کرنے کا بیڑا اٹھائیں گے تو ہمیں ان اسباب نصرت و توفیق تک رسائی حاصل ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے مقدر کر رکھے تھے جنہوں نے عالم اسلام کی بنیاد رکھی اور خدا کی دعوت کو اکناف ارضی تک پہنچایا اس وقت یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئے گی کہ باطل پرستوں نے جن لوگوں کی زندگی کو داغدار کرنے کی سعی کی ہے وہ تاریخ اسلام کے عظیم ہیرو اور اپنے عصر و عہد کے چشم و چراغ تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) ؎۱ سفاح و منصور نے جب مروان بن محمد کے خلاف خروج کیا تھا تو وہ اسی دعویٰ پر مبنی تھا کہ وہ اس سے زیادہ دیندار اور اس منصب کے لیے موزوں تر ہیں جب برسر اقتدار ہوئے تو ان سے بہتر ثابت نہ ہو سکے جن کے خلاف انہوں نے خروج کیا تھا۔ امام اوزاعی نے (باقی بر ص۴۱۷)

گواہ ہے کہ جب بھی کسی شخص نے کسی صاحب اقتدار کے خلاف بغاوت کی ہے تو اس سے جو نقصان برآمد ہوا ہے وہ اس کے فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اس کی مثال وہ لوگ ہیں جنہوں نے مدینہ میں یزید کے خلاف خروج کیا۔ یا ابن اشعث جس نے عراق میں عبدالملک کے خلاف خروج کیا تھا یا ابن مہلب جس نے مروان کے خلاف بغاوت کی۔ نیز ابومسلم خراسانی یا مدینہ و بصرہ کے وہ لوگ جنہوں نے منصور کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ایسے لوگوں کا مقصد تخت یا تختہ ہوتا ہے آخرکار ان کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور اقتدار سے محروم ہو جاتے ہیں

اس ضمن میں عبداللہ بن علی عباسی اور ابومسلم خراسانی کی مثال پیش کی جا سکتی ہے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے عباسی دعوت کو فروغ دینے کے لیے لاکھوں بے گناہ لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ ان دونوں کو ابوجعفر منصور نے قتل کرا دیا تھا۔ جہاں تک اہل حرّہ ابن الاشعث اور ابن مہلب کا تعلق ہے انہوں نے اپنے اصحاب سمیت شکست کھائی۔ اور دین و دنیا دونوں میں ناکام رہے۔ اللہ تعالیٰ ایسا حکم نہیں دیتے جس سے دینی یا دنیوی

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۱) ان کو اس فعل شنیع پر اس حد تک متنبہ کیا کہ امام اوزاعی کے احباب و اعوان اس بات سے ڈرنے لگے کہ امام اوزاعی جب عباسی تلوار سے گھائل ہوں تو آس پاس والوں کے کپڑے خون آلودہ ہو جائیں۔ امام اوزاعی نے صراحۃً بتا دیا تھا کہ انہوں نے جس قدر خونریزی کی ہے وہ ان کے لیے روا نہ تھی۔ امام اوزاعی نے یہ فیصلہ اس وقت صادر کیا تھا جب تاریخ بنو امیہ و بنو عباس کے باہمی موازنہ کرنے کے قابل نہ تھی۔ اب خدا ہی فیصلہ کرے گا کہ بنو امیہ و بنو عباس میں سے بہتر کون تھا

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) ۱؎ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اہل مدینہ کو یزید کی مخالفت سے روکتے تھے۔ البدایہ والنہایہ کے بیان کے مطابق حضرت محمد بن الحنفیہ بھی یزید کے مخالفین کو نقض بیعت سے منع کرتے تھے یہ بیان پہلے گذر چکا ہے عن قریب آگے آ رہا ہے کہ سعید بن المسیب اور حضرت علی بن حسین رحمہما اللہ کہ جن کو امام زین العابدین بھی کہا جاتا ہے اہل مدینہ کو یزید کی مخالفت سے روکتے تھے۔

صلاح و فلاح وابستہ نہ ہو اگر کوئی متقی و جنتی شخص بھی بغاوت کا فعل انجام دیتا ہے۔ تاہم یہ فعل قباحت سے خالی نہیں ہوگا۔ غور فرمائیے۔ حضرت علی و طلحہ و زبیر و عائشہ وغیرہم جلیل القدر صحابہ سے بہتر اور کون ہوگا۔ اس کے باوصف انہوں نے قتال وغیرہ کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اس کی مدح و ستائش نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ یہ سب صحابہ خدا کے یہاں بڑے عظیم المرتبت ہیں اور ان کی نیت بھی دوسرے لوگوں کی نسبت اچھی ہے۔

اسی طرح اہل حرہ میں متعدد اہل علم اور دیندار لوگ بھی تھے۔ اصحاب ابن الاشعث بھی دیندار اور اہل علم سے خالی نہ تھے۔ امام شعبی سے ابن الاشعث کے زمانہ میں کہا گیا تھا۔

"عامر! (امام شعبی) اندریں مدت آپ کہاں رہے"؟

امام شعبی نے جواباً کہا: میں اس جگہ تھا جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے

عَوَی الذِّئْبُ فَاسْتَأْنَسْتُ بِالذِّئْبِ اِذْ عَوٰی — وَصَوَّتَ اِنْسَانٌ فَکِدْتُ اَطِیْرُ

(بھیڑیا چلایا تو میں اس کی آواز سے مانوس ہو گیا اور انسان نے آواز دی تو میں نے اڑ جانا چاہا۔)

امام شعبی نے مزید فرمایا۔

"ہم ایسے فتنہ سے دوچار تھے جس میں نہ تو ہم متقی اور پاکباز تھے اور نہ ہی ایسے گنہگار تھے جو طاقت سے بھی بہرہ ور ہو"۔

حضرت حسن بصری فرمایا کرتے تھے۔

حجاج ثقفی کا وجود عذاب الٰہی سے کم نہیں لہٰذا عذاب خداوندی کو اپنے ہاتھوں سے مت دھکیلو۔ بلکہ بارگاہ ایزدی میں عجز و نیاز کا اظہار کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَلَقَدْ اَخَذْنٰھُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَکَانُوْا لِرَبِّھِمْ وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ

(سورۃ المومنون۔ ۷۶)

(ہم نے ان کو عذاب میں گرفتار کیا مگر نہ وہ رب کے سامنے جھکے اور نہ ہی اظہار عجز و نیاز کیا)

طلق بن حبیب فرمایا کرتے تھے

"تقویٰ کی بدولت فتنہ سے بچتے رہو"۔

ان سے دریافت کیا گیا کہ تقویٰ کی وضاحت فرمایئے تو جواباً فرمایا۔
"تقویٰ یہ ہے کہ نور خداوندی کی روشنی میں خدا کی طاعت و عبادت پر عمل پیرا ہوں۔ اور رحمتِ خداوندی کے امیدوار رہیں۔ نیز نور خداوندی کی روشنی میں اس کی نافرمانی کو ترک کر دیں اور عذاب الٰہی سے خائف رہیں۔ (احمد و ابن ابی الدنیا)

مسلم اکابر و افاضل ہمیشہ فتنہ پردازی کے دور میں لوگوں کو جنگ و جدال سے منع کرتے رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر، سعید بن مسیّب اور علی[1] بن حسین عام الحرۃ میں یزید کے خلاف بغاوت سے روکتے تھے۔ اسی طرح حضرت حسن بصری و مجاہد و دیگر بزرگ فتنہ ابن الاشعث میں شرکت کرنے سے باز رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث صحیحہ کی روشنی میں اہل سنت کے یہاں یہ طے شدہ بات تھی کہ فتنہ کے دور میں شریک جنگ و جدل ہونے سے احتراز کیا جائے۔ یہ بات ایک دینی عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اہل سنت وُلاۃ و حکام کے ظلم و جَور پر صبر کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ یہاں اس کی تفصیلات بیان نہیں کی جا سکتیں۔

جو شخص اس ضمن میں وارد شدہ احادیث صحیحہ اور بزرگان سلف کے اقوال و آثار پر زحمتِ غور و فکر گوارا کرے گا۔ اس پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے گی کہ اچھی بات وہی ہے جو نصوصِ نبویہ میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اہل کوفہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھ لکھ کر بلایا اور آپ نے عراق جانے کا ارادہ کیا تو حضرت ابن عمر و ابن عباس و ابوبکر بن عبدالرحمن وغیرہ اصحاب العلم والدین نے آپ کو روکنا چاہا وہ اس بات پر یقین

---

[1] حضرت علی بن حسین زین العابدین کے نام سے معروف تھے۔ شیعہ ان کو امام چہارم تصور کرتے ہیں۔ بایں ہمہ شیعہ زین العابدین کے اس موقف کی خلاف ورزی کرتے ہیں جو انہوں نے اہل مدینہ کو یزید کی مخالفت سے روکتے وقت اختیار کیا تھا۔ حضرت زین العابدین اور ان کے والد محترم جن مصائب سے دوچار ہوئے تھے ان کی بنا پر وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ فتنہ پر آمادہ کرنے والے اور اس پر رضامندی کا اظہار کرنے والے شر پر، اسلام سے برگشتہ اور شیطان کے بہکائے لوگ ہیں ۱۲

رکھتے تھے کہ آپ قتل سے نہیں بچ سکتے۔ ان میں سے بعض نے کہا "اے قتل کیے جانے والے میں تجھے خدا کو سونپتا ہوں"۔ بعض نے کہا "اگر یہ بات معیوب نہ ہوتی تو میں آپ کو عراق جانے سے روک دیتا"۔

حضرت حسین کے احباب داعوان کی یہ سب مساعی آپ اور مسلمانوں کی مصلحت و عافیت کے نقطۂ خیال سے تھیں۔ اس لیے کہ اللہ و رسول اصلاح کا حکم دیتے ہیں فساد کا نہیں البتہ رائے بعض اوقات صائب ہوتی اور بعض اوقات مبنی بر خطاء

چنانچہ جن واقعات سے حضرت حسین دوچار ہوئے۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ مانعین خروج کی رائے درست تھی اس لیے کہ حضرت حسین کے خروج میں کوئی دینی و دنیوی مصلحت مضمر نہ تھی۔ بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظالم کوفیوں نے نبیرۂ رسول کو بحالت مظلومی شہید کر دیا۔ اور آپ کے خروج و قتل سے امت میں وہ فساد رونما ہوا جو اس صورت میں ہرگز رونما نہ ہوتا اگر آپ مدینہ میں اقامت گزیں رہتے حضرت حسین کا مقصد جو کہ تحصیل خیر اور دفع شر تھا۔ حاصل نہ ہوا بخلاف ازیں آپ کے خروج و قتل سے شر میں اضافہ ہوا اور وہ ایک عظیم شر کا پیش خیمہ بن گئی۔

قتل عثمان کی طرح حضرت حسین کے قتل سے امت میں فتن و شرور کا دروازہ کھل گیا۔ اور اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ولاۃ و حکام کے ظلم و جور پر صبر اور ترک قتال کا حکم دیا تھا وہ بندوں کے لیے دنیا و عقبیٰ دونوں میں فائدہ مند تھا۔ نیز یہ کہ جس نے بھی دانستہ یا نادانستہ اس کی خلاف ورزی کی اس کے فعل سے بجائے صلاح کے فساد رونما ہوا۔

یہی وجہ تھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدح فرمائی۔

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا"۔

اس کے برعکس آپ نے کبھی ایسے شخص کی مدح نہ فرمائی جو فتنہ بازی کے دور میں کسی سے

لڑتا یا خروج کرتا ہو یا کسی کی بیعت کر کے اسے توڑ دیتا اور جماعت مسلمین سے الگ ہو جاتا ہو
صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہو گا مغفور و مرحوم ہے"۔
اہل روم سے نبرد آزما ہونے کے لیے پہلا لشکر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھیجا تھا۔ یزید اس کا سپہ سالار تھا اور اس میں ابو ایوب انصاری[1] جیسے جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے۔ اس لشکر نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تھا۔ بعد ازاں جنگ جمل و صفین واقعہ حرّہ و شہادت حسین نیز واقعہ مرج راہط عین الورد کے مقام پر توابین کا قتل اور فتنہ ابن الاشعث جیسے عظیم واقعات پیش آئے۔ شہادت عثمان کا واقعہ ان سب واقعات سے زیادہ الم انگیز تھا۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس شخص نے تین باتوں سے نجات پائی وہ فلاح و نجات سے ہمکنار ہوا۔ وہ تین باتیں یہ ہیں (۱) میری موت (۲) خلیفہ مظلوم کا ناحق قتل (۳) خروج دجّال
باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اہل بیت خواتین کو قیدی بنایا اور انھیں بلا پالان اونٹوں پر سوار کیا گیا"۔ تو یہ صریح کذب ہے۔ امت محمدی نے کبھی بھی کسی ہاشمی خاتون کو قیدی بنانے کی جسارت نہیں کی۔ بنو امیہ کو حضرت حسین سے خطرہ لاحق تھا کہ وہ ان کے تاج و تخت پر قابض ہو جائیں گے اس لیے وہ آپ کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔ جب آپ نے شہادت پائی تو معاملہ ختم ہو گیا اور آپ کے اہل بیت کو مدینہ رخصت کر دیا گیا تھا۔ مگر شیعہ کی جہالت کا علاج کیا؟ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ قتل حسین جرم عظیم ہے اس کا ارتکاب کرنے والا اور اس پر رضامندی کا اظہار کرنے والا دونوں عذاب کے مستحق ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت حسین کا قتل ان کے

---

[1] اسی غزوہ میں حضرت ابو ایوب انصاری نے وفات پائی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے نزدیک مدفون ہوئے۔ آپ کی قبر آج تک زیارتگاہ خلائق ہے اور آپ ہی کے نام سے مشہور ہے۔

بہنوئی حضرت عمر اور آپ کے خالو حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے قتل سے بڑا جرم ہرگز نہیں ہے۔

آیت اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى حسن وحسین کے بارے میں نازل نہیں ہوئی

:۔ رافضی قلمکار لکھتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (شوریٰ ۔۳۰)

حضرت حسن وحسین کے بارے میں نازل ہوئی تھی"۔

یہ صاف جھوٹ ہے اس لیے کہ یہ آیت بلاریب مکی ہے جب یہ آیت اتری تو اس وقت حضرت علی وفاطمہ کا نکاح بھی نہیں ہوا تھا۔ حضرت حسن وحسین کی ولادت کا تو اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت علی نے ہجرت کے دوسرے سال حضرت فاطمہ سے نکاح کیا اور غزوہ بدر کے بعد ماہ رمضان میں آپ حضرت علی کے گھر میں آباد ہوئیں۔ قبل ازیں اس آیت پر گفتگو کی جا چکی ہے اور حضرت ابن عباس کا یہ قول بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام قبائل قریش کے آنحضور کے ساتھ قرابت دارانہ مراسم وروابط تھے بنا بریں آیت میں ارشاد ہوا کہ قرابتداری کے ان حقوق کی وجہ سے تم مجھ سے الفت ومحبت کا سلوک کرو۔ (بخاری)[1]

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔

اہل سنت کی ایک جماعت یزید کو ظالم تصور کرنے کے باوصف اس پر لعنت نہیں

---

[1] قبیلہ قریش کے ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری کی روشن مثال حضرت ابوسفیان کے ساتھ آنحضور کے عزیزانہ مراسم ہیں۔ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب کفار مکہ آنحضور کو ستاتے تو آپ ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیتے تھے۔ اسی لیے آپ نے فتح مکہ کے دن اعلان فرمایا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا وہ امن پائے گا۔ اس کی تفصیلات کے لیے وہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے جس میں آنحضور اور ابوسفیان کے باہمی روابط وعلائق کی تفصیل مندرج ہے ۱۲۔

بھیجی۔ حالانکہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (سورۃ ہود۔ ۱۱)

ایک شخص مُہنّا نامی نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب یزید کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "یزید نے جو کرنا تھا کیا"۔

امام موصوف کے بیٹے صالح نے آپ سے دریافت کیا کہ بعض لوگ ہمیں یزید کی دوستی سے متہم کرتے ہیں"۔

امام احمد نے جواباً فرمایا۔

"بیٹا جو شخص خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ یزید کا دوست کب ہو سکتا ہے"؟

صالح نے کہا "تو پھر آپ یزید پر لعنت کیوں نہیں کرتے"؟

امام احمد نے فرمایا۔

"جس پر خدا نے لعنت کی ہے میں اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں"؟

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

بہت ممکن ہے اگر تم برسر اقتدار ہوئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور باہمی تعلقات توڑ دو گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت بھیجی اور انھیں اندھا اور بہرا کر دیا (سورۃ محمد۔ ۲۲-۲۳)

اس سے بڑا فساد اور کیا ہو گا کہ یزید نے مدینہ کے شہر کو لوٹا۔ وہاں کے رہنے والوں کو قید کیا۔ سات سو قریش و انصار کو موت کے گھاٹ اتارا اور دس ہزار ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ آزاد تھے یا غلام۔ یہاں تک کہ روضۂ رسول خون سے بھر گیا۔ پھر کعبہ پر پتھر پھینک کر اسے منہدم کیا اور آگ لگا دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "حضرت حسین کا قاتل آگ کے ایک صندوق میں ہو گا اور اسے تمام اہل جہنم سے آدھا عذاب ہو رہا ہو گا"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا "میرا اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہو گا جس نے میرے اہل کا خون بہایا اور میرے اہل بیت میں مجھے ستایا"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یزید پر لعنت بھیجنے کے بارے میں شرعی حکم وہی ہے جو اس کے نظائر و امثال خلفاء و ملوک کے بارے میں ہے۔ بلکہ یزید مقابلتًا ان سے بہتر ہے مثلاً یزید مختار سے افضل ہے جس نے قاتلین حسین سے انتقام لیا تھا۔ مختار کا دعوی تھا کہ اس پر جبریئل نازل ہوتا ہے۔ اسی طرح یزید حجاج کے مقابلہ میں بھی بہتر ہے۔

تاہم یزید اور اس کے امثال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فاسق تھے اور کسی مخصوص فاسق پر لعنت کرنا شرعًا مامور نہیں ہے۔ البتہ سنت نبوی میں مختلف گروہوں پر لعنت کرنے کی اجازت ملتی ہے مثلاً چوروں پر لعنت کرنا یا سود لینے اور دینے والے نیز حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے اور شراب پینے اور پلانے والے پر شرعًا لعنت کی اجازت ہے۔

فقہاء کی ایک جماعت کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ کسی متعین شخص پر لعنت کرنا شرعًا جائز ہے مگر دوسری جماعت اسے ناروا قرار دیتی ہے۔ امام احمد بن حنبل کسی معین شخص پر لعنت بھیجنے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ البتہ یوں کہنا ان کے نزدیک جائز ہے کہ لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰالِمِیْنَ۔

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ ایک شخص حمار نامی کو شراب نوشی کے جرم میں اکثر آنحضور کی خدمت میں لایا جاتا تھا اور آپ اسے پٹیا کرتے تھے ایک شخص نے حمار کا ذکر کرتے ہوئے کہا "خدا اس پر لعنت کرے اسے اکثر آپ کے یہاں لایا جاتا ہے" یہ سن کر آپ نے اسے لعنت کرنے سے روکا اور فرمایا کہ یہ شخص اللہ و رسول کو چاہتا ہے۔ (بخاری)

اس حدیث میں آپ نے ایک معین شخص پر لعنت بھیجنے سے منع فرمایا حالانکہ آپ نے شراب پینے والوں پر خود لعنت بھیجی ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہر مسلمان اللہ و رسول کو چاہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ منافق ہو جس کے ملعون ہونے میں شبہ نہیں۔ جو علما کسی کے فسق کی بنا پر اس پر لعنت بھیجنے کو جائز قرار دیتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم لعنت بھیجنے کے ساتھ ساتھ ایسے شخص کی نماز جنازہ بھی پڑھ لیتے ہیں کیونکہ اس کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وجہ سے وہ مستحق عقاب اور مورد لعنت ہے اور

بنا بر اسلام ہم اس کا جنازہ پڑھیں گے۔

کیا یزید پر لعنت بھیجنا جائز ہے؟

حضرات صحابہ۔ جمیع اہل سنت نیز کرامیہ اور مرجیہ اسی کے قائل ہیں۔ بہت سے شیعہ جن کے نزدیک فاسق دائمی جہنمی نہیں ہوتا۔ یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ خوارج، معتزلہ اور بعض شیعہ فاسق کو دائمی جہنمی قرار دیتے ہیں۔ البتہ توبہ کرنے کی صورت میں دائمی جہنمی نہیں ہوگا۔ جو لوگ یزید پر لعنت بھیجنے کو جائز قرار دیتے ہیں انہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ یزید ظالم و فاسق تھا اور وہ بلا توبہ مرگیا اور نیز یہ کہ کسی مخصوص ظالم و فاسق پر لعنت بھیجنا جائز ہے۔

علاوہ ازیں اعمال صالحہ اور مصائب و آلام کی بنا پر بعض اوقات عذاب ٹل بھی جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ

(سورہ نساء۔ ۴۸)

اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتے اور اس کے سوا دوسرے گناہ جس کو چاہیں بخش دیں۔

علاوہ ازیں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا وہ یزید کا تھا اور وہ اس کا امیر و سپہ سالار تھا۔

اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ "اولین لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوگا وہ مغفور ہوگا"

ہم اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ ہیں کہ اکثر مسلمان ظلم سے پاک نہیں ہو سکتے۔ اگر ظلم کی بنا پر مسلمانوں پر لعنت کرنے کا دروازہ کھولا جائے تو اکثر فوت شدہ مسلمان لعنت کا شکار ہوں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فوت شدگان کا جنازہ پڑھنے کا حکم دیا ہے اور ان پر لعنت بھیجنے کے لیے مامور نہیں فرمایا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فوت شدہ پر لعنت بھیجنا کسی زندہ شخص پر لعنت بھیجنے سے مذموم تر ہے۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ آنحضور نے فرمایا۔ "مردوں کو برا بھلا مت کہو اس لیے کہ انہوں نے اپنے کیے کی سزا پالی۔"

شیعہ نے جو روایت امام احمد سے نقل کی ہے اس ضمن میں ثابت شدہ روایت وہ ہے جو امام احمد کے بیٹے صالح نے ان سے بیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا: "اور تو نے اپنے والد کو کسی پر لعنت بھیجتے کب دیکھا ہے؟" امام احمد سے لعنت بھیجنے کی روایت منقطع ہے اور آپ سے ثابت نہیں ہے۔ جہاں تک آیت کریمہ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ کا تعلق ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی مخصوص شخص پر لعنت کرنا جائز ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے ہر شخص پر لعنت کرنا درست ہوتا تو کوئی شخص بھی لعنت سے نہ بچ سکتا۔ یہ ایک قسم کی وعید مطلق ہے جو معین کے حق میں اسی وقت ثابت ہوگی جب اس کے شرائط موجود اور موانع مفقود ہوں۔ لعنت کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔

یہ اس صورت میں ہوگا جب فرض کیا جائے کہ یزید ایسے افعال کا مرتکب ہوا تھا۔ جو قطع رحمی کے موجب ہیں۔ مزید براں جو بنی ہاشم، بنی عباس اور بنی ابی طالب کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے یہ بات ان پر بھی صادق آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ان سب پر لعنت بھیجی جائے گی؟ اسی طرح جو شخص اپنے قرابت دار پر ظلم کرے خواہ وہ اس کا دور کا رشتہ دار ہو تو کیا وہ صرف اسی پر لعنت بھیجے گا؟ نیز یہ کہ جب ان پر لعنت بھیجی جائے گی تو اس لعنت میں ہر وہ شخص شریک ہوگا جس کو وہ الفاظ شامل ہوں اندریں صورت جمہور مسلمین ملعون ٹھہریں گے۔

سورہ محمد کی آیت اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ایک وعید عام کی حیثیت رکھتی ہے اور جو شخص بھی کام کرے گا وہ لعنت کا مورد ہوگا۔ بنی ہاشم نے ایک دوسرے کے ساتھ جو سلوک کیا وہ یزید کے فعل سے بھی بدتر تھا[1]۔ اس پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا

---

[1] یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے ہر تاریخ داں آگاہ ہے۔ علامہ شیخ محمد خضری جب ۱۳۲۹ھ ماہ رمضان المبارک کی ایک رات شیخ علی یوسف ایڈیٹر المؤید قاہری کے یہاں ان کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں انہوں نے پر زور طریقہ پر یہ بات کہی میں اس مجلس میں شریک تھا۔ تا متوز علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "الانتقاد علی التمدن الاسلامی بجرجی زیدان" (باقی بر صفحہ ۴۲۷)

کہ بہت سے عباسی اور علوی لعنت کے مستحق ہوں گے۔ محدث ابن الجوزی نے یزید پر لعنت بھیجنے کے جواز کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی ہے اور اس میں عبد المغیث حربی کی تردید کی ہے جو اس سے منع کیا کرتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص۴۲۶) شائع نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ کتاب چھپ گئی اور بعد ازاں الجزائر میں قاضی ابن العربی مالکی کی کتاب العواصم من القواصم پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو لوگ ان جھوٹی باتوں سے آشنا ہوئے جنہوں نے تاریخ اسلام کو مسخ کر ڈالا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اموی، عباسی دونوں ادوار کی تاریخ اختلاط و آمیزش اور افراط و تفریط سے پاک نہیں رہ سکی بنا بریں ان تاریخی احداث و عوامل کا از سر نو جائزہ لینا ناگزیر ہے تاکہ ہمیں ایک صاف ستھری تاریخ تک رسائی حاصل ہو جو ان لوگوں کے گروہی تعصب سے پاک ہو جنہوں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نیز حضرت علی اور ان کے اہلبیت کے بارے میں جھوٹ وضع کرنے سے بھی احتراز نہ کیا اور ان کی جانب وہ باتیں منسوب کیں جو انہوں نے نہیں فرمائیں۔ اب تاریکی کا وہ زمانہ بیت چکا ہے اور لوگ مستند مراجع و مآخذ سے بچشم خود حقائق کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ باطل تھوڑی دیر چمکتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے مضمحل اور بے نور ہو جاتا ہے۔"

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) ۱؎ امام حافظ عبد المغیث بن زہیر بن علوی الحربی المتوفی (۵۰۰ — ۵۸۳) بڑے عابد، شب زندہ دار اور صادق و امین تھے۔ یہ بڑے خوش اخلاق، متبع سنت اور امانت و دیانت میں عدیم المثال تھے۔ ابن الحنبلی کا قول ہے کہ میں جب انہیں دیکھتا تو مجھے خیال آتا کہ یہ احمد بن حنبل ہیں۔ شیخ موصوف کی جلالت قدر و منزلت کے لیے یہ بات کیا کم ہے کہ خلیفہ بھیس بدل کر یہاں آتا ہے اور آپ پہچاننے کے باوجود اسے ایسا جواب دیتے ہیں جو ایک عام شخص کو دیا جاتا ہے اور مطلقاً اس کی پرواہ نہیں کرتے۔

خلیفہ الناصر عباسی کا واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب خلیفہ الناصر عباسی کو پتہ چلا کہ شیخ عبدالمغیث یزید پر لعنت بھیجنے سے روکتے ہیں تو وہ بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ شیخ موصوف نے پہچان لیا کہ یہ خلیفہ الناصر ہے مگر اسے جتلایا نہیں۔ شیخ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ مسلم وُلاۃ و خلفاء سے زبان کو روکا جائے۔ اس لیے کہ اگر یہ دروازہ کھل گیا تو خلیفہ الناصر اپنے افعال شنیعہ کی بنا پر لعنت کیے جانے کا سب سے زیادہ حقدار ہوگا۔ پھر شیخ نے خلیفہ کے مظالم شمار کرنا شروع کیے۔ آخر کار خلیفہ کہنے لگا۔ حضور میرے لیے دعا فرمایئے" اور یہ کہہ کر چل دیا۔

یزید نے جو کچھ اہل حرہ[1] کے ساتھ کیا اس کا اصل واقعہ یہ ہے کہ جب اہل مدینہ نے اس کی بیعت توڑ دی اور اس کے نائبوں کو مدینہ سے نکال کر ان کے اہل خانہ کو گھیر لیا تو یزید نے اہل مدینہ کو پیہم پیغامات بھیج کر اطاعت کا مطالبہ کیا مگر انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی[2] چنانچہ

---

[1] حرہ اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوں اور اگر انہیں توڑنا چاہیں تو آسانی سے ٹوٹ جائیں جیسے وہ آگ میں جلے ہوئے ہوں ایسی جگہ عموماً گول ہوا کرتی ہے اگر مستطیل ہو تو اسے "کراع" کہتے ہیں۔ حرہ کی جمع حرار آتی ہے ایسے سنگلاخ مقامات بلاد عرب میں عموماً مدینہ سے شام جاتے ہوئے راستہ میں آتے ہیں۔ مشہور عرب جغرافیہ دان یاقوت نے ایسے ۲۹ مقامات گنائے ہیں۔ ابو عبید نے صرف ۱۸ جگہوں کا ذکر کیا ہے مدینہ کے گرد و نواح میں ایسے کئی مقامات ہیں ان میں سے ایک جگہ مدینہ سے جانب قبلہ ہے اسے حرۃ قبا[1] کہتے ہیں۔ دوسری جگہ حرۃ الوبرہ[2] کہلاتی ہے یہ مدینہ سے تین میل دور ہے۔ تیسری جگہ حرۃ النار[3] ہے یہ مدینہ کے قریب واقع ہے رافضی مصنف نے جس حرہ کا ذکر کیا ہے اس کا نام قوم عمالقہ کے ایک شخص واقم کے نام پر حرۃ واقم[4] رکھا گیا ہے یزید بن معاویہ کے ایام خلافت ۶۳ھ میں حرۃ واقم ہی میں وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔"

[2] ان اوراق کا قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے متعدد داعی مدینہ میں موجود تھے ان کے سرخیل عبداللہ بن مطیع العدوی تھے یہ داعی یزید پر طرح طرح کے بہتان لگا کر لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مطیع (باقی بر صفحہ ۴۲۹)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۸) کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ یزید کی بیعت توڑنا کوئی اچھا کام نہیں ہے بلکہ یہ عظیم غدر اور بے وفائی ہے (دیکھئے صحیح بخاری کتاب الفتن ج ۸ ص ۹۹ نیز صحیح مسلم کتاب الامارۃ ج ۶ ص ۲۲)

شہادت حق اور بندوں کی خیر خواہی کے اعتبار سے امام ابن الحنفیہ کا موقف بھی حضرت ابن عمر کے نقطۂ نظر سے کم نہیں ہے جنھوں نے شیعی اکاذیب کی تردید کرتے ہوئے یہ سچی شہادت دی کہ آپ یزید کے ہاں اقامت گزین رہ کر اچھی طرح اس کی سیرت و اخلاق کا بچشم خود ملاحظہ کر چکے ہیں۔ آپ اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ یزید پابند نماز، اعمال خیر کا حریص، متبع سنت اور فقیہ تھا (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۳۳)

مگر عبد اللہ بن عمر اور امام ابن الحنفیہ کی شہادت حق فتنہ پردازی کے شور و شغب میں دب کر رہ گئی۔ مدینہ کی فضا اشاعت روایات کے شور و غل سے مسموم ہو گئی اور وہاں کے حکماء و علماء اور صلحاء جاہل اور شر پسند عوام کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اہل ہوی کا مقصد وحید فتنہ پردازی اور شر پسندی تھا۔ اندریں حالات یزید نے سخت غلطی یہ کی کہ امراء مدینہ کو یکے بعد دیگرے معزول کرتا چلا گیا۔ چنانچہ عمرو بن سعید بن العاص کو معزول کر کے اس کی جگہ ولید بن عتبہ کو مقرر کیا۔ پھر عبد اللہ بن زبیر کی تدبیر سے متاثر ہو کر ولید کو معزول کر کے عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو والی مدینہ مقرر کیا حالانکہ وہ اس منصب کے لیے موزوں نہ تھا۔

اسی دوران نعمان بن بشیر انصاری جو خود صحابی اور صحابی زادے تھے ملک شام سے مدینہ پہنچے یہ اولیں نومولود تھے جو اسلام کے بعد انصار کے یہاں پیدا ہوئے یہ دمشق کے قاضی اور بہترین خطیب تھے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے انصار کو اطاعت امیر اور لزوم جماعت کی تلقین کی اور فتنہ بازی سے یہ کہہ کر ڈرایا کہ تم اہل شام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یزید نے ان کو فتنہ کے فرو کرنے کے لیے شام سے روانہ کیا تھا۔ عبد اللہ بن مطیع نے نعمان بن بشیر کو مخاطب کر کے کہا

"نعمان! تم کس لیے ہماری شیرازہ بندی کو منتشر کر کے ہم میں فساد پیدا کر رہے ہو؟"

یہ عجیب بات ہے کہ فتنہ پردازوں نے فتنہ کا نام اصلاح اور اس سے روکنے کا نام فساد مقرر کر رکھا تھا۔ یہ سن کر نعمان نے ابن مطیع کو جواباً کہا جس بات کی طرف (باقی بر ص ۴۳۰)

یزید نے مسلم بن عقبہ مری کو مدینہ بھیجا اور اسے اہل مدینہ کو ڈرانے دھمکانے کا حکم دیا۔ یہ بھی کہا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ آزما ہو۔ چنانچہ غلبہ پاکر مسلم بن عقبہ نے تین شب و روز تک مدینہ کو لوٹا۔ یہ بدعملی یزید کے کبائر میں شمار ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص۴۲۹) آپ دعوت دے رہے ہیں اگر وہ پوری ہوگئی تو آپ دیکھیں گے کہ مدینہ میں خون کی ندیاں بہ رہی ہیں اور لوگ شمشیر بکف بے دریغ ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ آپ خچر پر سوار ہوکر عازم مکہ ہوں گے اور یہ انصار غریب شہر کی گلیوں، مسجدوں اور اپنے گھروں کے دروازہ پر مقتول پڑے ہوں گے (تاریخ طبری ج ۷، ص ۴-۵ بطبع حسینیہ)

شیعہ کا مشہور راوی اور مورخ ابومخنف لوط بن یحییٰ کہتا ہے کہ لوگوں نے نعمان کی بات نہ مانی مگر جس طرح اس نے کہا تھا اسی طرح ہوا۔ نعمان بن بشیر کے نصائح کو ٹھکرانے کے بعد اہل مدینہ نے والیٔ مدینہ عثمان بن محمد بن ابوسفیان کو نکال دیا۔ علانیہ یزید کی بیعت توڑ ڈالی اور مدینہ میں جس قدر بنوامیہ اور ان کے ہم خیال قریش موجود تھے سب کا محاصرہ کر لیا۔ ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور یہ سب مروان کے گھر میں جمع ہو گئے تھے۔ بنوامیہ نے یزید کے نام ایک خط لکھا۔ عبدالملک بن مروان یہ خط لے کر نکلا۔ حبیب بن کرہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ حبیب کا بیان ہے کہ عبدالملک نے یہ خط دیکر اسے کہا۔ میں تجھے چوبیس دن کی مہلت دیتا ہوں بارہ دن جانے کے لیے اور بارہ دن واپسی کے لیے چوبیسویں رات میں اسی جگہ بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔"

حبیب کا بیان ہے کہ وہ یزید کے یہاں آیا۔ یزید ایک بیماری کی وجہ سے اپنے پاؤں پانی سے لبریز ایک طشتری میں رکھے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ یزید نقرس کے مرض میں مبتلا تھا۔ میں نے خط پیش کیا۔ یزید نے خط پڑھ کر استشہاد کے طور پر یہ شعر پڑھا ؎

لَقَدْ بَدَّلُوا الْحِلْمَ الَّذِیْ مِنْ سَجِیَّتِیْ　　فَبَدَّلْتُ قَوْمِیْ غِلْظَۃً بِلِیَانٖ

(علم و تحمل جو میری فطرت میں داخل تھا۔ لوگوں نے اسے بدل دیا اور میں نے اپنی قوم کے لیے اپنی نرمی کو سختی میں تبدیل کر دیا)

یزید نے اپنے ایک فوجی سپہ سالار مسلم بن عقبہ المری کو بلایا۔ مسلم بن عقبہ بڑا معمر کمزور اور بیمار تھا یزید اسے مدینہ جانے کا حکم دیا اور کہا۔ تین شب و روز اہل مدینہ کو صلح کی دعوت دو (باقی بر ص۴۳۱)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا تھا "کیا آپ یزید کی روایت تحریر کریں گے"؟۔

آپ نے فرمایا "نہیں! کیا یزید وہی شخص نہیں جس نے اہل مدینہ کے ساتھ جو کرنا تھا کیا۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۰) اگر وہ قبول کرلیں تو بہتر ورنہ ان سے جنگ کیجئے۔ جب اہل مدینہ پر غلبہ حاصل ہوجائے تو تین شب و روز تک مدینہ کو اپنے لیے مباح سمجھو۔ اس میں جو مال، اسلحہ یا خوراک ہو اس کا مالک لشکر ہوگا تین شب و روز گذرنے کے بعد اس سے رک جاؤ۔ علی بن حسین زین العابدین کا ہر طرح خیال رکھو اور انہیں کوئی تکلیف نہ دو۔ انہوں نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔ ان کا خط میرے پاس آچکا ہے"۔

مسلم بن عقبہ بارہ ہزار جنگجو اشخاص کی معیت میں مدینہ پہنچا۔ یہ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا۔ مسلم نے ظلم و تعدی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ اسی لیے اہل مدینہ اسے مُسْرِف بن عقبہ کہا کرتے تھے۔ یہ ہے واقعہ حرہ کا پس منظر، جس کی تفصیل ہم نے دانستہ ایک شیعہ مورخ کی زبانی بیان کی ہے یہ راوی و مورخ ابو مخنف ہے جو عبدالملک بن نوفل سے روایت کرتا ہے اور وہ بنو امیہ کے قاصد حبیب بن کرہ سے نقل کرتا ہے (تاریخ طبری ج ۷ ص ۵-۷)

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱۔ اس سے معلوم ہوا کہ یزید راوی حدیث اور سنت نبوی کا دلدادہ تھا جیسا کہ امام ابن الحنفیہ نے فرمایا ہے کہ "یزید نماز کا پابند، اعمال صالحہ کا حریص، متبع سنت اور فقیہ تھا"۔

۲۔ یزید سے یہ فعل اس وقت صادر ہوا جب اہل مدینہ نے یزید کے خلاف جو کچھ کرنا تھا وہ کیا۔ اہل سنت کا عدل و انصاف اس ضمن میں قابل تحسین ہے کہ وہ ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کرنے سے گریز نہیں کرتے ایک طرف وہ یزید کی سیرت و کردار کے بارے میں حق کے متلاشی ہیں اور جھوٹ بولنے والوں کی دروغگوئی کو ٹھکرا دیتے ہیں لیکن بایں ہمہ وہ یزید کی روایت کردہ حدیث کو اس لیے تسلیم نہیں کرتے کہ اس کے مقرر کردہ سپہ سالار نے ان لوگوں کے خلاف ظلم و تعدی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا تھا۔ جنہوں نے یزید کی بیعت توڑی اور عبداللہ بن عمر نیز ابن الحنفیہ و زین العابدین و سعید بن مسیب ایسے مخلص ناصحین کی نصیحت کو ٹھکرا دیا تھا۔ جب امام احمد اپنے تلامذہ کو یزید کی روایت قبول کرنے سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ اس سے ایک جرم صادر ہوا تھا حالانکہ ایسا جرم ہر اس شخص سے صادر ہو سکتا ہے جو برسر اقتدار ہو تو شیعہ کو امام بخاری و مسلم اور دیگر محدثین پر صرف اس وجہ (باقی بر صفحہ ۴۳۲)

یہ بات غلط ہے کہ یزید نے تمام اشرافِ مدینہ کو قتل کروا دیا تھا۔ مقتولوں کی جو تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے یہ بھی درست نہیں۔ اس بات میں بھی صداقت کا کوئی عنصر شامل نہیں کہ خون مسجد نبوی تک پہنچ گیا تھا۔ خونریزی شہر سے باہر ہوئی تھی مسجد میں نہیں[1] مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ دروغگوئی کے خوگر ہیں اور اگر کوئی بات سچی بھی ہو تو وہ اس میں جھوٹ کی آمیزش کر لیتے ہیں۔

یزید نے کعبہ کی توہین قصداً نہیں کی تھی بلکہ اس کا لشکر عبداللہ بن زبیر سے لڑنے کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ باتفاق مسلمین یزید نے نہ کعبہ کو منہدم کیا اور نہ گرایا۔ بات یہ ہوئی کہ ایک عورت کے ہاتھ سے ایک چنگاری اڑ کر کعبہ کے پردوں پر جا گری جس سے کعبہ جل گیا۔

ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کو منہدم کر کے از سر نو پہلے سے بہتر تعمیر کیا جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

شیعہ مصنف کی پیش کردہ حدیث کہ "حضرت حسین کا قاتل آگ کے صندوق میں ہوگا"۔ یہ ایسے شخص کا بیان کردہ جھوٹ ہے جو دروغگوئی سے شرماتا نہ ہو۔ پھر اس پر یہ اضافہ کہ قاتل حسین کو سب اہل جہنم سے آدھا عذاب دیا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر ابلیس و فرعون و ابوجہل اور قاتلین انبیاء کے لیے کیا باقی رہا؟ خصوصاً جب کہ حضرت عمرؓ و عثمان و علی کا قاتل

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۱) سے اظہار غیظ و غضب کرنے کا کیا حق ہے کہ یہ محدثین ان معروف بالکذب راویوں کی باطل روایات کو تسلیم نہیں کرتے جو وہ اہل بیت سے نقل کرتے ہیں۔ اہلسنت کے یہاں اہل بیت کی روایات مرغوب و مطلوب ہیں بشرطیکہ ان کے راوی صدق و عدالت سے بہرہ ور ہوں اور ان رواۃ سے فروتر نہ ہوں جن سے بخاری و مسلم روایات اخذ کرتے ہیں۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) [1] یہ واقعہ بیرون شہر پیش آیا تھا اسی لیے اس کو واقعہ حرہ کہا جاتا ہے۔ اہل مدینہ مسلم بن عقبہ کے لشکر سے جنگ آزما ہونے کے لیے مدینہ سے باہر حرۂ واقم نامی سنگلاخ مقام کی جانب نکلے تھے ۱۲

[2] مشہور شیعہ علی بن مظاہر واسطی نے شیخ الشیعہ احمد بن اسحاق بن عبداللہ بن سعد القمی (باقی بر ص ۴۳۳)

حضرت حسین کے قاتل سے بھی بڑھ کر مجرم ہے۔ روافض کا یہ غلو تو اصب کے اس قول سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے کہ حضرت حسین خوارج میں سے تھے اور انہوں نے ملت کے شیرازہ کو منتشر کر دیا۔ لہٰذا آنحضور کی مندرجہ ذیل حدیث کی بنا پر وہ مباح الدم تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

جو شخص آکر تم میں تفریق پیدا کرنا چاہے تو اسے قتل کر دو خواہ وہ کوئی بھی ہو (مسلم)

شہادت حسین کے بارے میں اہل سنت کا موقف

بخلاف ازیں اہلسنت کہتے ہیں کہ حضرت حسین بحالت مظلومی شہید ہوئے اور آپ کے قاتل ستم ران اور ظالم ہیں۔ حضرت حسین قتل خوارج سے متعلق احادیث کا مصداق نہیں ہو سکتے اس لیے کہ آپ نے امت میں انتشار پیدا نہیں کیا تھا۔ آپ کو اس وقت شہید کیا گیا تھا جب آپ واپس مدینہ جانے کے خواہاں تھے یا یزید کے یہاں تشریف لا کر بیعت کرنا چاہتے تھے۔

بہر کیف رافضی قلمکار کی ذکر کردہ حدیث صحیح نہیں اور ایک جاہل اسے آنحضور کی جانب منسوب کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت حسین کے خون کی عصمت ایمان و تقوی کی بنا پر ہے نہ کہ صرف قرابت رسول کے بل بوتے پر۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"اگر فاطمہ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں ان کا ہاتھ کاٹ ڈالتا۔"

اس حدیث میں آنحضور نے اہل بیت کے عزیز ترین فرد حضرت فاطمہ کے بارے میں جو کچھ بیان فرمایا وہ ایک ایسا حکم ہے جس میں ادنیٰ و اعلیٰ کے مابین کوئی امتیاز سرے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۲) الاحوص سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب کی شہادت کا دن عید اکبر کا دن ہے اور شیعہ اس دن کو یوم المفاخرہ و یوم البرکۃ و یوم الزکوۃ و یوم التثلیثۃ اور یوم مسرت کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ احمد بن اسحاق مذکور نے اس عید کا اختراع کیا تھا۔ شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل ابو لولو مجوسی کو "بابا شجاع الدین" کے لقب سے ملقب کرتے ہیں اور آپ کے یوم شہادت کو عید بابا شجاع الدین سے موسوم کرتے ہیں (تحفہ اثنا عشریہ شاہ عبدالعزیز دہلوی ص ۲۰۸-۲۰۹)

سے موجود ہی نہیں۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اگر ایک شادی شدہ علوی زنا کا مرتکب ہوگا۔ تو اسے سنگسار کیا جائے گا اور اگر کسی کو قتل کرے گا تو قصاص میں اسے بھی قتل کیا جائے گا آنحضور نے فرمایا۔

"سب مسلمانوں کا خون مساوی حیثیت رکھتا ہے"

اسی طرح آپ کے اہل بیت یا حضرات صحابہ یا آپ کی سنت ان میں سے کسی کی توہین کر کے آنحضور کو ایذا دینا کبیرہ گناہ ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

صاحب عقل و خرد کو غور کرنا چاہئے کہ فریقین (شیعہ و اہل سنت) میں احق بالامن کون ہے؟ وہ فریق جو اللہ تعالٰے و ملائکہ و انبیاء و ائمہ کو منزہ قرار دیتا ہے اور اس کے ساتھ شریعت کو مسائل ردیہ سے پاک سمجھتا ہے یا وہ فریق جو اس کے برعکس ہے؟ علاوہ ازیں اہل سنت ائمہ اثنا عشرہ پر درود و سلام نہ بھیج کر اپنی نمازوں کو برباد کرتے ہیں حالانکہ وہ دوسرے آئمہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں"۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ شیعہ مصنف جس کو تنزیہ تصور کرتا ہے وہ ہمارے نزدیک اللہ و رسول کی توہین و تنقیص ہے۔ اور یہ نفی صفات کا قول ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ صفات کمال سے عاری اور جمادات و معدومات کی مانند ہے۔ جب شیعہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میں حیات و علم و قدرت نیز مشیئت اور حب و بغض و رضا و سخط میں سے کوئی صفت بھی پائی نہیں جاتی۔ وہ بذات خود کوئی فعل انجام نہیں دیتا اور نہ کسی تصرف پر قادر ہے تو گویا وہ اسے جمادات کے مشابہ قرار دیتے ہیں جو اس کی تنقیص و تعطیل ہے۔ باری تعالیٰ کی تنزیہ کا مطلب یہ ہے کہ اسے ان نقائص سے منزہ قرار دیا جائے جو کمال کے منافی ہیں۔ مثلاً اسے موت، نیند، غفلت عجز و جہل اور حاجت مندی سے پاک سمجھا جائے جیسا کہ قرآن مجید میں اس نے اپنی ذات کو عیوب سے منزہ قرار دیا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اس کا کوئی نظیر و مثیل نہیں۔

انبیاء کے بارے میں شیعہ کا زاویۂ نگاہ

انبیاء کرام توبہ و استغفار نیز ایک کمال سے بڑے کمال کی طرف منتقل ہو کر جو درجات عالیہ حاصل کرتے ہیں شیعہ اس کی نفی کرتے اور اس ضمن میں وارد شدہ آیات کی تحریف کرتے ہیں۔ شیعہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ کسی شخص کا جہالت سے علم اور ضلالت سے ہدایت کی طرف منتقل ہونا نقص و عیب ہے۔ حالانکہ جو شخص خیر و شر دونوں کا ذوق آشنا ہوتا ہے اسے اس شخص کی نسبت خیر سے زیادہ محبت اور شر سے زیادہ نفرت ہوتی ہے جو ان سے ناآشنا ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔[1]

"جب اسلام میں جاہلیت سے ناآشنا لوگ پیدا ہوں گے تو اسلام کا شیرازہ ایک ایک کڑی کر کے بکھر جائے گا"۔

باقی رہی یہ بات کہ شیعہ اپنے ائمہ کو عیوب و نقائص سے منزہ قرار دیتے ہیں تو یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ خصوصاً اس امام کا پاک و صاف ہونا جو دین و دنیا میں کسی کام کا نہیں بلکہ وہ ایک معدوم چیز ہے جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں (شیعہ کا امام غائب جس کے وہ منتظر ہیں)، جہاں تک شریعت کو گھٹیا درجہ کے مسائل سے منزہ قرار دینے کا تعلق ہے ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اہل سنت نے یک زبان ہو کر اس قسم کا ایک مسئلہ بھی بیان نہیں کیا۔ جبکہ روافض کے ہاں اس کی بھرمار ہے (روافض کے شرمناک مسائل کے لیے دیکھئے تحفہ اثنا عشریہ باب السابع از ص۲۰۸ تا ص۲۳۷ طبع سلفیہ)

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں یا خارج از نماز

---

[1] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اولیں شخص تھے جو اس عظیم حقیقت سے آگاہ ہوئے آپ نے فرمایا۔

"جو شخص شر سے ناآشنا ہے اس بات کا قوی احتمال ہے کہ وہ اس کا شکار ہو جائے"۔

جو لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا رہنے کی وجہ سے زہد کی زندگی اختیار کرتے ہیں اس کا حضرت عمر بن عبد العزیز کے زہد سے کیا مقابلہ؟ غور فرمائیے کہ کرۂ ارض کی عظیم ترین حکومت کا مال آپ کے زیر تصرف تھا اور خدا کے سوا آپ سے کوئی حساب لینے والا بھی نہ تھا اس کے باوصف آپ فقر و زہد کی زندگی بسر کرتے تھے ۱۲

حضرت علی یا کسی اور امام پر درود وسلام بھیجنے کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی صحابہ و تابعین نے کبھی اس پر عمل کیا اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص نماز میں بارہ اماموں پر درود وسلام بھیجنے کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں بجز اس کے نماز باطل ہوتی ہے تو وہ تحریف فی الدین کا ارتکاب کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ آل محمد میں ائمہ اثنا عشرہ بھی داخل ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو بنو ہاشم[1] اور امہات المومنین[2] کو بھی شامل ہے حالانکہ امامیہ بنو عباس کی مذمت کرتے ہیں۔

یہ بات ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ شیعہ تعظیم آل محمد کے مدعی ہیں حالانکہ انہوں نے خود تاتاریوں کو بلایا جنہوں نے اولاد علی و عباس میں سے ہزاروں کو قتل کیا۔ ان کے بیوی بچوں کو قیدی بنایا اور اس کے علاوہ دس لاکھ اسی ہزار نفوس کو موت کے گھاٹ اتارا۔[3]

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ آپ نے فرمایا یوں کہو۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ"[4]

---

[1] بلکہ بنو عباس و بنو لہب نیز حاکم بامر اللہ و آمر بن مستعلی اور نزار بن مستعلی بھی اس میں داخل ہیں ۱۲

[2] اس لیے کہ امہات المومنین کو اس آیت میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (سورۃ الاحزاب ۳۲-۳۳)

[3] علاوہ ازیں لاتعداد نادر کتب کے مسودات جن میں سے بعض کے نام بھی ہم کو معلوم نہیں دریائے دجلہ میں بہا دیئے ۱۲

[4] بخاری و مسلم نے یہ حدیث حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ محدث شہیر محمد بن تیمیہؒ نے یہ حدیث اپنی کتاب المنتقیٰ میں حدیث ۱۰۱۴ کے تحت درج کی ہے قاضی شوکانی نے المنتقیٰ کی شرح نیل الاوطار ج ۲ ص ۳۰۰-۳۰۱ مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی قاہرہ طبع ثانی میں اس حدیث کی شرح لکھی ہے

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے نقل کردہ روایت بھی ابو حمید ساعدی کی روایت کے قریب قریب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے

"جو شخص آل محمد پر صلوٰۃ بھیجتے وقت پورا ثواب حاصل کرنا چاہے وہ یوں کہے۔ (باقی بر صفحہ ۴۳۷)

اس بات پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آل عباس اور بنو حارث بن عبد المطلب آل محمد اور ذوی القربیٰ میں شامل ہیں اور ان پر زکوٰۃ حرام ہے۔ بعض مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک آل محمدؐ سے آپ کی امت مراد ہے۔ صوفیہ کا ایک گروہ اس سے اتقیاء امت مراد لیتا ہے۔ جمہور فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آنحضور اور آپ کی آل پر صلوٰۃ بھیجنا نماز میں واجب نہیں ہے۔ جو لوگ آل پر صلوٰۃ بھیجنا نماز میں واجب سمجھتے ہیں ان کے نزدیک بعض آل پر اکتفا درست نہیں۔ رافضی مصنف کا یہ قول کہ کسی معین خلیفہ پر صلوٰۃ بھیجنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے باطل ہے۔ اکثر علماء کی رائے ہے کسی معین شخص کے حق میں دعا یا بد دعا کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعائے قنوت میں ایک قوم کے حق میں دعائے خیر کرتے اور دوسری قوم کے افراد کا نام لے کر ان پر لعنت بھیجا کرتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۶) اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ النَّبِیِّ وَاَزْوَاجِہٖ اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَذُرِّیَّتِہٖ وَاَھْلِ بَیْتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ (ابو داؤد)

علماء زیدیہ میں سے قاضی شوکانی نیل الاوطار میں اس حدیث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"علما کی ایک جماعت نے اس حدیث سے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ "آل" سے ازواج و اولاد مراد ہے"

وجہ استدلال یہ ہے کہ حدیث ہذا میں ازواج و اولاد کو آل محمد کی جگہ رکھا گیا ہے۔ قبل ازیں سورۂ احزاب کی آیات ۳۲۔۳۳ پر تبصرہ کیا جا چکا ہے ۱۲

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خلافت علی رضؓ

حضرت علیؓ کی امامت وخلافت

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامیہ نے جب دیکھا کہ حضرت علی لاتعداد اوصاف وکمالات سے بہرہ ور ہیں جن کے روایت کرنے والے موافق ومخالف سبھی قسم کے لوگ ہیں۔ علاوہ ازیں جمہور علماء دیگر خلفاء پر مطاعن واعتراضات کا ذکر کرتے ہیں مگر حضرت علی کے بارے میں کوئی طعن منقول نہیں۔ نظر بریں امامیہ نے حضرت علی کو اپنا امام مقرر کر کے دیگر ائمہ وخلفاء کو ترک کر دیا۔ اتمام حجت کے نقطۂ خیال سے ہم چند دلائل ذکر کرتے ہیں

ان دلائل وبراہین میں سے ایک روایت وہ ہے جسے ابو الحسن اندلسی نے اپنی کتاب "الجمع بین الصحاح الستۃ" میں ام سلمہ سے نقل کیا ہے کہ آیت کریمہ

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ (سورہ احزاب)

ان کے گھر میں نازل ہوئی۔ جبکہ وہ دروازہ کے قریب بیٹھی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں اہل بیت میں شامل نہیں؟ فرمایا تو ازواج النبی میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ گھر میں حضرت علی وفاطمہ وحسن وحسین رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ آپ نے ان سب کو ایک چادر سے ڈھانپ لیا اور فرمایا۔

"اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے نجاست کو دور کر کے ان کو پاک کر دے"۔

ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر وعمر کے فضائل ومناقب میں وارد شدہ احادیث فضائل علی کی احادیث سے بہت زیادہ ہیں۔ شیعہ مصنف نے اس ضمن میں بعض احادیث نقل کر کے کہا ہے کہ جمہور ان پر اعتماد کرتے ہیں یہ صریح کذب ہے ان میں سے جو احادیث صحیح ہیں ان

سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی حضرت ابو بکر سے افضل تھے بلکہ ان فضائل و مناقب میں دیگر خلفاء حضرت علی کے ساتھ برابر کے سہیم و شریک ہیں۔ البتہ حضرت ابو بکر و عمر کے فضائل ان کے ساتھ مختص ہیں اور دوسرا کوئی شخص اس ضمن میں ان کے ساتھ شریک نہیں۔ خصوصاً ابو بکر فضائل میں منفرد ہیں جہاں تک خلفاء ثلاثہ کو ہدف طعن بنانے کا تعلق ہے شیعہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو اعتراضات وہ اصحاب ثلاثہ پر کرتے ہیں۔ ناصبی اسی اعتراض کا نشانہ حضرت علی کو بناتے ہیں۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "موافق و مخالف حضرت علی کو عیب و خطا سے منزہ سمجھتے ہیں" یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ مخالفین حضرت علی کو پاک و صاف قرار نہیں دیتے بلکہ متعدد فرقے آپ کو جرح و قدح کا نشانہ بناتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت علی کو مورد طعن بنانے والے حضرت ابو بکر و عمر کے مخالفین سے افضل ہیں اور وہ ان لوگوں کی نسبت بھی اولیٰ و افضل ہیں جو حضرت کی شان میں غلو کرتے ہیں مثلاً خوارج جو حضرت علی کے کفر پر یک زبان ہیں سب مسلمانوں کے نزدیک ان غالی شیعہ سے بہتر ہیں جو حضرت علی کو الٰہ اور نبی تسلیم کرتے ہیں بلکہ بالفاظ صحیح تر خوارج اور حضرت علی کے خلاف جنگ آزما ہونے والے صحابہ ان اثنا عشری شیعہ سے افضل ہیں جو حضرت علی کو امام معصوم قرار دیتے ہیں[1]۔ روافض

---

[1] خوارج کے شیعہ سے افضل ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غیر انبیاء کو معصوم قرار دینے کی ضلالت سے پاک ہیں۔ دوسری وجہ فضیلت یہ ہے کہ حضرت علی کی رفاقت میں حضرت ابو بکر و عمر کے بارے میں خوارج کا جو عقیدہ تھا حضرت علی سے برگشتہ خاطر ہونے کے بعد بھی اس میں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ پہلے بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابو بکر و عمر ہیں اور بعد ازاں بھی اسی نظریہ پر قائم رہے۔ خوارج کے گمراہ ہونے کے دو اسباب تھے (۱) اس کی ایک وجہ خوارج کی وہ میراث تھی جو انہوں نے قاتلین عثمان سے حاصل کی (۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے تحکیم کی بنا پر حضرت علی کی تکفیر کی بہر کیف جو شخص خوارج و روافض کی ضلالت میں بحیثیت مجموعی موازنہ کرنا چاہتا ہے وہ مقابلۃً خوارج کو کم گمراہ پائے گا۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ حضرت علی کو من جانب اللہ جو عظیم تر اجر و ثواب دیا جائے گا وہ اس بات پر ملے گا کہ مدینہ سے عازم عراق ہونے و باقی رہ علیہم

کے سوا مسلمانوں کا کوئی فرقہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو ہدف طعن نہیں بناتا۔

حضرت علی کی تکفیر کرنے والے خوارج حضرت ابوبکر و عمر سے دوستی رکھتے اور اظہار خوشنودی کرتے ہیں۔ فرقہ مروانیہ والے حضرت علی کو ظالم قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ آپ خلیفہ نہ تھے۔ دوسری جانب وہ حضرت ابوبکر و عمر سے دوستی رکھتے ہیں حالانکہ وہ ان کے اقارب میں سے نہیں۔ پھر یہ بات کہاں تک قرین صدق و ثواب ہے کہ موافق و مخالف سب حضرت علی کو منزہ قرار دیتے ہیں اور صحابِ ثلاثہ کو نہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کو منزہ قرار دینے والے حضرت علی کے مداحین کی نسبت اکثر و افضل اور اعظم ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت علی کو فسق اور عصیان سے متہم کرنے والے فرقے مسلمانوں میں بڑے معروف ہیں۔ وہ روافض کی نسبت زیادہ عالم اور دیندار بھی ہیں جبکہ روافض ان کے مقابلہ میں کیا بلحاظ علم اور کیا باعتبار قوت و شوکت ضعیف و ناتواں ہیں۔ روافض نہ اپنے حریفوں کے خلاف حجت قائم کر کے ان کا منہ بند کر سکتے ہیں اور نہ قوت بازو کو کام میں لا کر انہیں شکست دے سکتے ہیں۔ جو لوگ حضرت علی کی شان میں قدح وارد کرتے ہیں اور ان کو کافر و ظالم تک قرار دینے سے احتراز نہیں کرتے ان میں کوئی گروہ ایسا نہیں جو اسلام سے منحرف و برگشتہ ہو گیا ہو۔

اس کے عین برخلاف جو لوگ اصحاب ثلاثہ کو مورد طعن بناتے اور حضرت علی کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ مثلاً فرقہ نصیریہ والے الوہیت علی کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اسمٰعیلیہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ بعض شیعہ حضرت علی کو نبیؑ قرار دیتے ہیں۔ یہ سب کافر اور مرتد ہیں۔ اللہ و رسول کے ساتھ ان کا کفر کسی عالم دین سے مخفی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی انسان کی الوہیت کا قائل ہے یا آنحضورؐ کے بعد کسی کو نبی سمجھتا ہے اس کا کافر ہونا ہر اس شخص پر واضح ہے جو دینی علم سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہو۔

(بقیہ حاشیہ ص۴۲) سے لے کر شہادت پانے تک آپ نے خوارج و شیعہ جیسے مسرف و غالی فرقہ کے ہاتھوں عظیم مصائب جھیلے اور ان پر صبر و تحمل سے کام لیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ وہ فرقے جو شیعہ کے شاگرد ہیں اور ان سے متفرع ہوئے ہیں مثلاً اسمٰعیلیہ، نصیریہ شیخیہ، بابیہ اور بہائیہ یہ سب اس ضمن میں شیعہ کے ہم نوا ہیں۔ ۱۲ (حاشیہ نمبر ۲ و ۳ آئندہ صفحہ پر دیکھئے)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ؎۱ مشہور شیعہ عالم المامقانی کا قول ہے کہ جن عقائد وافکار کی بنا پر قدیم شیعہ کو غالی کہا جاتا تھا وہ اب ضروریات دین میں شمار ہوتے ہیں۔ دور حاضر میں تقیہ کیے بغیر جو شیعہ واشگاف الفاظ میں اپنے عقیدہ کا اظہار کرے گا۔ تو اس میں اور متقدمین غالی شیعہ میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسے ضروریاتِ مذہب سے منحرف تصور کیا جائے گا۔

؎۲ کسی شخص کو نبی قرار دینے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اسے نبی کہہ کر پکارا جائے بلکہ صفات انبیاء سے متصف کرنا بھی اسے نبی قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ علامہ کلینی نے جو شیعہ کا امام بخاری سمجھا جاتا ہے۔ شیعہ کی عظیم ترین کتاب "الکافی" میں جس طرح عنوانات قائم کیے ہیں اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ ائمہ امور خداوندی کے مالک اور اس کے علم کا خزانہ ہیں

(۲) ائمہ زمین کا ستون ہیں

(۳) اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ ائمہ کے یہاں سب کتابیں ہوتی ہیں اور اختلاف السنہ کے باوجود وہ ان کے مضامین سے آگاہ ہوتے ہیں۔

(۴) اس بات کا باب کہ قرآن کو ائمہ نے جمع کیا ہے

(۵) اس باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ائمہ سب علوم سے واقف ہوتے ہیں

(۶) اس بات کا باب کہ اماموں کو اپنی موت کا وقت معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے فوت ہوتے ہیں۔

(۷) اس باب میں بیان کیا جائے گا کہ امام ماکان ومایکون کا علم رکھتے ہیں اور کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔

(۸) اس بات کا باب کہ حضرت علی علم میں آنحضور کے شریک تھے۔

(۹) اس بات کا باب کہ اگر ائمہ سے کوئی بات پوشیدہ رکھی جائے تو وہ اسے ظاہر کر دیتے ہیں

(۱۰) ہر امام جانتا ہے کہ اس کے بعد کون شخص منصب امامت پر فائض ہوگا۔

(۱۱) اس بات کا باب کہ ائمہ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ حق ہوتی ہے نیز جو بات ان کے ہاں سے نہیں آئی وہ باطل ہے۔ (باقی بر صفحہ ۴۴۳)

خوارج جو حضرت علی کی تکفیر کرتے اور آپ پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جو لوگ حضرت علی پر لعنت بھیجتے تھے اور آپ کے خلاف صف آرا بھی ہوئے ان میں سے اصحاب معاویہ اور بنی مروان بھی تھے۔ یہ سب لوگ مُقر بالاسلام تھے اور دینی شرائع و احکام پر عمل پیرا تھے یہ نماز کی پابندی کرتے زکوٰۃ ادا کرتے روزے رکھتے۔ زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوتے۔ حلال کو حلال سمجھتے اور محرمات کو حرام سمجھتے تھے۔ ان میں ظاہری کفر کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا تھا۔ بخلاف ازیں ان میں اسلامی شعائر و شرائع برملا پلٹے جاتے تھے اور وہ ان کی تعظیم بجالاتے تھے ان باتوں سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جو اسلامی حالات سے باخبر ہے۔

ان حالات کے باوصف یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ سب مخالفین حضرت علی کو منزہ سمجھتے ہیں اور اصحاب ثلاثہ کو نہیں۔ بخلاف ازیں حضرت عثمان کے اعوان و انصار جو حضرت علی کو ناپسند کرتے تھے شیعان علی سے بوجوہ افضل ہیں اگر اہل سنت کو معاندین علی کی فہرست سے الگ کر لیا جائے تو ان کو چاہنے والوں میں ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو

(بقیہ حاشیہ صہ ۴۴۲) ۱۲۔ اس بات کا باب کہ یہ کائنات ائمہ کی ملک ہے۔

یہ اس کتاب کے عنوانات ہیں جو شیعہ کی نہایت ہی قابل اعتماد کتاب ہے۔ یہ عقائد و افکار شیعہ میں اس وقت رائج تھے جب غلو کو ضروریات دین میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں تک ضروریات دین میں شمار کیے جانے والے غلو کا تعلق ہے تو اسے ان تراجم میں تلاش کرنا چاہیے جو اعداء دین روافض نے اپنے قلم سے تحریر کیے۔ مثلاً تحفہ اثنا عشریہ میں ص ۱۰۰ پر دیکھیے۔ شیعہ کا یہ عقیدہ کہ حضرت علی اولوالعزم نبیوں کو چھوڑ کر سب انبیاء و رسل سے افضل تھے آگے چل کر صفحہ ۱۰۲ پر لکھا ہے کہ ائمہ انبیاء سے بڑے عالم ہوتے ہیں اس لیے ان کا مرتبہ بھی بلند تر ہوتا ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۰۳ پر شیعہ کا یہ عقیدہ تحریر کیا ہے کہ حضرت علی جمیع اولین و آخرین سب سے افضل تھے۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۱۰۴ پر لکھا ہے کہ شیعہ کے نزدیک حضرت علی کی جانب وحی کی جاتی تھی اور آپ اس کی آواز سنتے تھے ۱۲

(تحفہ اثنا عشریہ)

آپ کے مخالف فرقوں یعنی خوارج، اموریہ اور مروانیہ کا مقابلہ کر سکے۔ اعداء علی کے متعدد فرقے ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اعداء علی میں سب سے بڑے خوارج ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علی کافر و مرتد تھے اور تقرب خداوندی حاصل کرنے کیلئے ان کو قتل کرنا حلال ہے۔ ایک خارجی شاعر عمران بن حطان کہتا ہے ؎

(۱) یَا ضَرْبَةً مِنْ تَقِيٍّ مَا أَرَادَ بِهَا ۔۔۔ إِلَّا لِيَبْلُغَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ رِضْوَانَا

(۲) إِنِّي لَأَذْكُرُهُ يَوْمًا فَأَحْسَبُهُ ۔۔۔ أَوْفَى الْبَرِيَّةِ عِنْدَ اللهِ مِيزَانَا

(۱) متقی (قاتل علی) کی وہ ضرب قابل تحسین تھی جس کا اس کا مقصد صرف رضائے خداوندی کا حصول تھا

(۲) میں کبھی کبھی اسے یاد کرتا ہوں تو یوں خیال کرتا ہوں کہ سب مخلوقات سے خدا کے نزدیک اس کا اعمال نامہ زیادہ بھرپور تھا۔

ایک سنی شاعر نے اس کے مقابلہ میں یہ اشعار کہے ؎

(۱) يَا ضَرْبَةً مِنْ شَقِيٍّ مَا أَرَادَ بِهَا ۔۔۔ إِلَّا لِيَبْلُغَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ خُسْرَانَا

(۲) إِنِّي لَأَذْكُرُهُ يَوْمًا فَأَلْعَنُهُ ۔۔۔ لَعْنًا وَأَلْعَنُ عِمْرَانَ ابْنَ حِطَّانَا

(۱) ہائے اس بدبخت کی وہ ضرب جس سے اس کا مقصد خدا سے خسارہ پانے کے سوا اور کچھ نہ تھا

(۲) میں بعض اوقات یاد کر کے اس پر لعنت بھیجتا ہوں اور عمران بن حطان پر بھی لعنت بھیجتا ہوں (جس نے مذکورہ اشعار کہے)

یہ خوارج حضرات صحابہ و تابعین کی زندگی میں بقید حیات تھے۔ صحابہ ان سے مناظرے کرتے اور ان سے جنگیں لڑتے تھے مگر ان کی تکفیر نہیں کرتے تھے۔ حضرت علی نے بھی ان کو کافر قرار نہیں دیا تھا۔ اس کے عین برخلاف حضرات صحابہ اور تمام مسلمان حضرت علی میں غلو کرنے والوں کو بالاتفاق کافر سمجھتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ حضرت علی نے بذات خود ان کو کافر سمجھا اور انہیں نذر آتش کیا تھا۔ جہاں تک خوارج کا تعلق ہے حضرت علی ان کے خلاف اس وقت جنگ آزما ہوئے جب انھوں نے لوگوں کو قتل کرنے اور ان کا مال لوٹنے کا بیڑا اٹھایا۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت علی کی ذات میں غلو کرنے والوں کو صحابہ بلکہ خود حضرت علی نے

مرتد قرار دیا۔ بعد ان سے مرتدین کا سا سلوک کیا۔ مگر خوارج سے کسی نے بھی مرتدین ایسا سلوک روا نہ رکھا۔ یہ حقائق اس بات کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ اصحاب ثلاثہ سے بغض رکھنے والا جو حبِ علی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ان میں بالاتفاق علی و جمیع صحابہ جو شر و کفر پایا جاتا ہے وہ ان لوگوں میں موجود نہیں جو حضرت علی سے عداوت رکھتے اور آپ کی تکفیر کرتے تھے۔ یہ بات بھی نکھر کر سامنے آئی کہ اصحاب ثلاثہ سے بغض رکھنے والے حضرت علی و جمیع صحابہ کے نزدیک اعداء علی سے بدتر تھے۔

جس حدیث میں حضرت حسن و حسین کو چادر تلے چھپانے کا ذکر کیا گیا ہے امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ امام مسلم نے یہ حدیث حضرت عائشہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیاہ بالوں کی بنی ہوئی ایک منقوش چادر اوڑھے علی الصبح گھر سے نکلے۔ اتنے میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما آ گئے تو آپ نے دونوں کو چادر کے نیچے چھپا لیا۔ پھر حضرت علی و فاطمہ آئے تو ان کو بھی چادر میں چھپا لیا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ۔

ظاہر ہے کہ حدیث میں بیان کردہ وصف حضرت علی کی خصوصیت نہیں بلکہ حضرت فاطمہ اور حسن و حسین بھی اس میں آپ کے ساتھ شریک تھے۔ ظاہر ہے کہ عورت امامت و خلافت کی اہل نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ حدیث میں بیان کردہ فضیلت خلفاء و ائمہ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی اس ضمن میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ حدیث میں صرف دعا کی گئی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی آلودگی دور کر کے ان کو پاک و صاف فرمائے۔

اس سے آگے بڑھ کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو "اتقیٰ" کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (سورۃ اللیل۔ ۱۷۔ ۲۱)

(وہ صاحب تقوی جو پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے)

حضرت علی اس وقت "اتقیٰ" کے زمرہ میں اس لیے شامل نہ تھے کہ آپ ان دنوں

مالدار نہ تھے۔ آپ اس وصف سے اس وقت متصف ہوئے جب غزوہ خیبر کے بعد آپ مال و دولت سے سرفراز ہوئے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ حضرت علی نے آیت کریمہ

اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً (مجادلہ ۱۲)

کے بارے میں فرمایا کہ "اس آیت پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا"۔

ادائے صدقہ میں حضرت علی کی انفرادیت

اس کا جواب یہ ہے کہ صدقہ مسلمانوں پر ادا جب نہ تھا جس کو ترک کرنے سے وہ عاصی کہلاتے البتہ جو شخص آنحضور سے کوئی راز کی بات بیان کرنا چاہتا ہو اسے صدقہ دینے کا حکم دیا گیا تھا یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت صرف علی نے آنحضور سے مشورہ کرنا چاہا اور حکم خداوندی کی تعمیل میں صدقہ ادا کیا۔ صدقہ کی یہ ادائیگی بعینہ یوں ہے جیسے حج تمتع کرنے والے پر یا جس شخص کو ادائے حج سے روک دیا جائے اس پر قربانی واجب ہے اسی طرح جو شخص کسی تکلیف کی بنا پر حالت احرام میں سر منڈانے پر مجبور ہو جائے اس پر فدیہ واجب ہے۔ اسی طرح قسم توڑنے والے پر بھی کفارہ واجب ہے۔ اس پر مزید یہ کہ مشورہ سے پہلے صدقہ دینے کا حکم تا دیر باقی نہ رہا اور اتفاقاً حضرت علی ہی نے دو درہم یا اس سے کم و بیش خرچ کرکے عمل کیا۔ دوسری جانب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے جذبۂ جود و سخا کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ سارا مال راہ خدا میں دے دیا اور جب آپ سے دریافت کیا کہ گھر میں کیا چھوڑا؟ تو حضرت صدیق نے جواباً فرمایا ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس ۔۔۔ صدیق کے لیے ہے خدا اور رسول بس

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"محمد بن کعب القرظی روایت کرتے ہیں کہ طلحہ بن شیبہ اور حضرت عباس و علی رضی اللہ عنہم باہم فخر کرنے لگے۔

طلحہ:۔ نے کہا میں کعبہ کا کنجی بردار ہوں اگر چاہوں تو کعبہ ہی میں رات بسر کر لوں

عباس:۔ نے فرمایا میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں اگر چاہوں تو مسجد ہی میں رات

بسر کر لوں۔

علی:۔ میں نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے قبلہ رو ہو کر نماز ادا کی ہے اور میں صاحب جہاد بھی ہوں۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (سورہ توبہ۔۱۹)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت حدیث کی قابل اعتماد کتب میں موجود نہیں بلکہ بوجوہ اس کا کاذب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) کذب کی پہلی دلیل یہ ہے کہ طلحہ بن شیبہ کوئی شخص نہیں۔ خادم کعبہ کا نام شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ[1] ہے۔ اس سے معلوم کہ یہ حدیث صحیح نہیں

(۲) دوسری دلیل حضرت عباس کا یہ قول ہے کہ "اگر چاہوں تو مسجد میں رات بسر کروں" مسجد میں رات بسر کرنا کونسی بڑی بات ہے کہ اس پر خوشی کا اظہار کیا جائے۔

(۳) تیسری دلیل حضرت علی کا یہ قول ہے کہ میں نے لوگوں سے چھ ماہ پیشتر کعبہ رو ہو کر

---

[1] یہ عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ کے چچا زاد بھائی تھے جو مکہ سے حضرت خالد بن ولید کی معیت میں عازم مدینہ ہوئے مقام "الہدہ" میں مکہ و عسفان کے درمیان حضرت عمرو بن العاص سے ملاقات ہوئی۔ یہ تینوں حضرات بیک وقت دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔ شیبہ غزوۂ حنین تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ حنین میں دھوکہ دے کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ آنحضور نے دست مبارک شیبہ کے سینہ پر رکھا اور فرمایا "شیطان دفع ہو" نتیجہ کے طور پر شیبہ مسلمان ہو گئے اور آپ سے مل کر کفار سے لڑے اور حوادث و آلام میں صبر و تحمل کا ثبوت دیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو آپ نے کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ اور ان کے چچا زاد بھائی شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کو دے کر فرمایا۔ "اے طلحہ کے بیٹو! ہمیشہ کے لیے یہ کنجی لے لو کوئی ظالم شخص ہی تم سے یہ کنجی واپس لے گا" کعبہ کی کنجی آج تک قبیلہ بنی عبدالدار کے اسی کنبہ کے قبضہ میں چلی آتی ہے ان کو "الشیبیین" کہا جاتا ہے۔

نمازیں پڑھی تھیں"۔ یہ باطل ہے۔ وجہِ بطلان یہ ہے کہ حضرت علی کے مشرف بہ اسلام ہونے اور حضرت ابوبکر و خدیجہ و زید کے اسلام میں صرف ایک دن یا اس کے لگ بھگ کا فرق پایا جاتا ہے۔ پھر یہ بات کیوں کر درست ہوئی کہ آپ نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے نمازیں ادا کی تھیں۔

۴۔ مذکورہ حدیث کے کاذب ہونے کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی نے اپنے آپ کو "صاحب الجہاد" کہا حالانکہ اس خصوصیت میں دوسرے صحابہ بھی آپ کے ساتھ برابر کے سہیم و شریک تھے۔

ان دلائل کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر سے جو حدیث مروی ہے وہ اس کی تردید کرتی ہے۔ حضرت نعمان فرماتے ہیں۔

"میں منبر نبوی کے پاس بیٹھا تھا۔ اسی دوران ایک شخص نے کہا "میں اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرنا چاہتا"

دوسرے نے کہا "میں مسجد حرام میں اقامت گزین رہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرنا چاہتا"

تیسرے نے کہا اور جہاد کا ذکر کیا کہ وہ ان دونوں سے افضل ہے"۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر انھیں ڈانٹا اور فرمایا کہ جمعہ کے دن منبر نبوی کے نزدیک یہ شور و غل موزوں نہیں۔ البتہ میں نماز جمعہ سے فارغ ہو کر آنحضور سے تمہارے اختلافی مسائل کا حل دریافت کروں گا۔ تب مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل ہوئی (مسلم)

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی کی اس کی کوئی خصوصیت نہیں کیونکہ اصحاب ایمان و جہاد تو اور بھی بہت سے صحابہ تھے۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

"جو لوگ ایمان لائے ہجرت سے مشرف ہوئے اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا تو یہ لوگ بلاشبہ خدا کے نزدیک عالی مرتبت ہیں" (سورۂ توبہ۔ ۲۰)

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر کا جہاد مال و جان حضرت علی مقابلہ میں یقیناً بڑھ کر تھا۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے۔

آنحضور نے فرمایا۔

"مجھ پر حضرت ابو بکر کے احسانات۔ باقی سب لوگوں سے زیادہ ہیں"۔

آپ نے یہ بھی فرمایا۔

"کسی شخص کے مال سے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا حضرت ابو بکر کے مال سے"۔

حضرت ابو بکر سیف وسنان و زر دونوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا کرتے تھے۔

ابو بکر اولین شخص تھے جن کو راہ خدا میں آنحضور کے بعد لاتعداد حوادث و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ پہلے شخص تھے جو آنحضور کی حفاظت کے سلسلہ میں اعداء دین کے سامنے سینہ سپر ہوئے۔ ہجرت و جہاد میں آنحضور کے رفیق رہے اس کی حد یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں سائبان کے نیچے آپ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ابو سفیان نے غزوۂ احد کے دن صرف آنحضور اور ابو بکر و عمر کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

ابو سفیان نے جب پوچھا کہ "کیا محمد موجود ہیں"؟ تو آپ نے فرمایا "اسے جواب نہ دو" پھر اس نے پوچھا "کیا ابو بکر ہیں"؟ آپ نے جواب دینے سے منع کیا۔ ابو سفیان پھر بولا "کیا عمر ہیں"؟ آپ نے پھر بھی جواب دینے کی اجازت نہ دی۔

ابو سفیان کہنے لگا۔ "ان سب کا خاتمہ ہو چکا ہے"۔ حضرت عمر سے نہ رہا گیا تو بولے "دشمن خدا! تو جھوٹ کہتا ہے یہ سب زندہ ہیں"۔ (البخاری)

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔[1]

"ان دلائل میں سے امام احمد بن حنبل کی ذکر کردہ یہ روایت ہے کہ حضرت انس نے سلمان سے کہا آنحضور سے دریافت کیجیے کہ "آپ کا وصی کون ہے"؟ جب سلمان نے یہ سوال کیا تو آپ نے جواباً فرمایا "اے سلمان! حضرت موسیٰ کا وصی کون تھا؟" کہا "یوشع" فرمایا "میرا وصی اور وارث علی ہے"

[1] مشہور شیعہ المامقانی نے اپنی کتاب "تنقیح المقال" ج ۲ ص ۱۸۴ پر جرح و تعدیل کے ماہر شیعہ عالم محمد بن عمر الکشی سے روایت کیا جس نے سب سے پہلے اس فن میں کتاب تصنیف کی۔ محمد بن عمر کی تحریر کا لب لباب یہ ہے کہ "بقول اہل علم عبد اللہ بن سبا یہودی تھا۔ مسلمان ہو کر (باقی بر صفحہ ۴۵۰)

حضرت علیؓ کو وصیؐ کہنا ابن سبا کی اختراع ہے

ہم کہتے ہیں کہ روایت باتفاق محدثین کذب و دروغ اور موضوع ہے اور مسند ابن حنبل میں موجود نہیں۔ امام احمد نے فضائل صحابہ میں ایک کتاب تصنیف کی تھی اس میں خلفاء اربعہ اور دیگر صحابہ کے فضائل و مناقب بیان کیے ہیں۔ اس

(بقیہ حاشیہ ملا ۴۴۹) اس نے حضرت علی سے دوستانہ مراسم قائم کیے۔ ابن سبا جب یہودی تھا تو کہا کرتا تھا کہ یوشع بن نون حضرت موسیٰ کے وصی تھے۔ اسلام لانے کے بعد وہ حضرت علی کو آنحضور کا وصی بتایا کرتا تھا۔ مشہور شیعہ عالم کا یہ بیان اس باب میں نص صریح کا حکم رکھتا ہے کہ حضرت علی کے وصی کا لقب ابن سبا نے اختراع کیا۔ چونکہ سابقاً ذکر کردہ حضرت انس کی روایت بے بنیاد ہے اس لیے اس باب میں یقینی بات یہی ہے جو المامقانی نے الکشی سے نقل کی کہ اس لقب کا واضع ابن سبا یہودی تھا۔

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اس روایت کے راوی جب شیعہ خود ہوئے تو اب یا تو وہ اپنے علماء کو جھوٹا کہیں یا یہ کہیں کہ الکشی نے علماء سے یہ روایت نقل کرنے میں دروغگوئی سے کام لیا ہے۔ ہمیں اس ضمن میں مزید کسی دلیل کی حاجت نہیں اور یہی بات کافی ہے کہ یہ روایت شیعہ علماء کی زبانی نقل ہوتے ہوتے ابن سبا سے الکشی تک پہنچی اور پھر المامقانی کے ذریعہ شیعہ جرح و تعدیل کی عظیم و جدید ترین کتاب میں مندرج ہوئی۔

یہ اسی روایت کا ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ انس و سلمان کا دامن اس تہمت سے پاک کر دیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کو ایسے عیب سے داغدار ہونے سے بچا لیا جس کی وجہ سے امت بنی نوع آدم میں سے ہونے والے اوصیاء کے زیر اثر سب تصرفات سے محروم ہو جاتی اس پر طرہ یہ کہ ان میں کا آخری وصی ہنوز "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ" کا مصداق ہے۔ حالانکہ پیام اسلام دنیائے انسانیت کو حریت فکر و نظر کا عطیہ دینے کے لیے آیا تھا اور اس کا اولین مقصد یہ تھا کہ عقل انسانی اسلام کے اس چشمۂ صافی سے بکمال آزادی اور بدون جبر و اکراہ ہدایت عظمیٰ کا آب زلال پیئے جس پر اس عالی شریعت کے سوا کسی کو نگران یا وصی مقرر نہیں کیا گیا۔

کتاب میں صحیح وضعیف روایات سب جمع کردی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کتاب میں جو حدیث بھی ہو وہ صحیح ہو۔ مزید براں اس کتاب میں امام احمد کے بیٹے عبداللہ نے اپنی روایات کا اضافہ بھی کیا ہے۔

قطیعی[1] نے اپنے شیوخ کی روایات سے بھی امام احمد کی کتاب فضائل صحابہ پر اضافہ کیا ہے قطیعی کا اضافہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ قطیعی کے شیوخ زیادہ تر امام احمد کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیعہ کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ اس کتاب میں جب بھی کوئی حدیث دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ امام احمد کی روایت کردہ ہے۔ حالانکہ اس کا قائل قطیعی مذکور ہے۔ جس کے اساتذہ امام موصوف کے ہم طبقہ لوگوں سے روایات اخذ کرتے ہیں۔

مسند امام احمد میں بھی آپ کے بیٹے عبداللہ نے زیادات کی ہیں۔ مسند احمد میں جہاں حضرت علی کی مرویات ذکر کی گئی ہیں وہاں عبداللہ نے خصوصی طور پر اضافہ کیا ہے[2]۔ خلاصہ

---

[1] بغداد کے گردونواح میں اراضی کے کچھ قطعات بے آباد پڑے تھے۔ عباسی امراء و حکام نے زمین کے وہ ٹکڑے بعض لوگوں کو جاگیر کے طور پر دے دیے تھے۔ زمین کے ہر ٹکڑہ کو قطیعہ کہتے تھے اور اہل علم جن کو وہ جاگیریں ملی تھیں قطیعی کہلاتے تھے۔ امام احمد کی کتاب فضائل صحابہ پر جس نے اضافہ کیا ہے ممکن ہے وہ احمد بن جعفر بن حمدان القطیعی المتوفی (۲۷۳ــ۳۶۸) ہو۔ احمد بن جعفر نواح بغداد کی آبادی قطیعۃ الرقیق میں بودوباش رکھتے تھے ۱۲

[2] حافظ ابن کثیر مقدمہ ابن الصلاح کے خلاصہ میں جس کا نام "الباعث الحثیث فی اختصار علوم الحدیث" ہے لکھتے ہیں

حافظ ابوموسیٰ محمد بن ابی بکر مدینی کا مسند امام احمد کے بارے میں یہ ارشاد کہ "اَنَّہٗ صَحِیْحٌ" ضعیف قول ہے اس لیے کہ مسند احمد میں نہ صرف ضعاف بلکہ موضوعات بھی ہیں مثلاً وہ احادیث جن میں مرو وعسقلان نیز حمص کے نواحی شہر "البرث الاحمر" کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ محدثین نے اس پر روشنی ڈالی ہے"۔ میں کہتا ہوں فضائل پر مشتمل احادیث اگرچہ بخاری ومسلم کی روایت کردہ احادیث کی طرح صحیح نہ بھی ہوں تاہم لوگ از راہ تساہل انکو قبول کر لیتے ہیں جس طرح ترغیب وترہیب پر مشتمل ضعیف احادیث کو بھی قبول کر لیا جاتا ہے ۱۲

یہ کہ یہ حدیث کسی دجّال کا کذب و دروغ ہے اور خدا کی قسم یہ امام احمد کی بیان کردہ نہیں انھوں نے نہ اپنی مسند میں یہ حدیث ذکر کی اور نہ فضائل صحابہ میں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"یزید بن ابی مریم حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں آئے۔ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے کندھے پر سوار ہوئے میں نے اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکا۔ آپ میری کمزوری دیکھ کر اتر آئے پھر آپ بیٹھے اور میں آپ کے کندھے پر سوار ہو گیا۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور میں خانہ کعبہ پر چڑھ گیا۔ کعبہ پر تانبہ کی ایک مورتی تھی میں نے اسے اکھاڑ کر پھینک دیا اور وہ ٹوٹ گئی پھر ہم بھاگنے لگے۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے"۔

ہم کہتے ہیں کہ بشرط صحت اس واقعہ میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی جو ائمہ وخلفاء کے خصائص میں شمار ہونے کے قابل ہو۔ احادیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حالت نماز میں امامہ بنت ابی العاص کو اٹھائے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ حالتِ سجدہ میں حضرت حسن آ کر آپ پر سوار ہو گئے جب آپ ایک لڑکے اور لڑکی کو اٹھا سکتے ہیں۔ تو حضرت علی کو اٹھانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خلیفہ و امام تھے۔ خصوصاً جبکہ آپ نے حضرت علی کو اس لیے اٹھایا کہ حضرت علی آنحضور کو اٹھانے سے قاصر تھے۔ بنا بریں اس واقعہ کو مناقب رسول میں شمار کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس پر مزید یہ کہ جو شخص نبی کو اٹھاتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو نبی پر سوار ہو۔ جیسے طلحہ بن عبید اللہ نے غزوۂ احد میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے آنحضور کو اٹھایا اس نے نبی کو فائدہ پہنچایا اور جو نبی پر سوار ہوا اس نے نبی سے فائدہ حاصل کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نبی کو فائدہ پہنچانے والا اس سے نفع حاصل کرنے والے کی نسبت بہت زیادہ افضل ہے۔

شیعہ مضمون نگار رقمطراز ہے۔

"ابن ابی لیلیٰ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدّیق تین ہیں۔

(۱) حبیب نجار (۲) مومن آلِ فرعون (۳) علیؓ اور یہ تینوں میں افضل ہیں"۔
ہم کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ آنحضورؐ نے حضرت ابوبکر کو صدیق کے لقب سے ملقب کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔

"آدمی سچ بولتا اور سچ کا قصد کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ درگاہ ایزدی میں صدیق لکھا جاتا ہے"۔

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ صدیق ہو سکتے ہیں۔ حضرت مریمؑ کو صدیقہ کا لقب عطا کیا۔ حالانکہ وہ عورت تھیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ (المائدہ ۵-۷۵) (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ صدیقہ تھیں)

رافضی مصنف کی پیش کردہ حدیث "اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ"۔ کا جواب یہ ہے کہ بخاری مسلم نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت علی وجعفر اور زید رضی اللہ عنہم سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی کفالت کے بارے میں جھگڑنے لگے تو آپ نے حضرت جعفر کے حق میں فیصلہ صادر کیا کیونکہ وہ لڑکی کے خالو تھے۔ تاہم آپ نے فرداً فرداً تینوں کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے حق میں مدحیہ کلمات ارشاد فرمائے۔ حضرت علی کو مخاطب کرکے فرمایا اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ (تم میرے ہو اور میں آپ کا ہوں) حضرت جعفر کے حق میں فرمایا "آپ کی صورت و سیرت مجھ سے ملتی جلتی ہے"۔ زید کو مخاطب کرکے فرمایا "آپ ہمارے بھائی اور مولیٰ ہیں"۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو کلمات آپ نے حضرت علی کی شان میں فرمائے وہ متعدد صحابہ کی شان میں فرما چکے تھے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ان کے قبیلہ کے حق میں فرمایا۔

ھُمْ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْھُمْ (وہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں)

حضرت علی کے فضائل عشرہ

شیعہ مصنف لکھتا ہے
عمرو بن میمون روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی میں دس اوصاف پائے جاتے ہیں جو کسی اور میں موجود نہیں۔

(۱) حضرت علی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آنحضور نے ان کے حق میں فرمایا "میں ایک ایسے شخص کو بھیجوں گا جسے اللہ تعالےٰ ہرگز رسوا نہیں کرے گا وہ اللہ و رسول کو چاہتا ہے اور اللہ و رسول اسے چاہتے ہیں۔ آپ نے ادھر ادھر دیکھا پھر فرمایا علی رضؓ کہاں ہیں"؟

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو سورہ توبہ دے کر بھیجا بعد ازاں ان کے پیچھے حضرت علی کو روانہ کیا اور فرمایا "اس سورت کو لے کر وہ شخص جائے گا جو میرا ہے اور میں اس کا ہوں"۔

(۳) رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا زاد بھائیوں سے پوچھا۔ "کون شخص دنیا و آخرت میں مجھ سے دوستی لگانا چاہتا ہے"؟ سب نے انکار کر دیا۔ حضرت علی رضؓ نے کہا "میں آپ سے دنیا و آخرت میں دوستی لگاؤں گا"۔ آپ نے فرمایا۔ "تو دنیا و آخرت میں میرا دوست ہے"۔

(۴) حضرت علی اولیں شخص تھے جو حضرت خدیجہ کے بعد اسلام لائے

(۵) آنحضور نے اصحاب خمسہ کو چادر تلے چھپایا اور آیت کی تلاوت فرمائی۔

(۶) حضرت علی کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے جان کی بازی لگائی اور مکہ میں آنحضور کے بستر پر سوئے رہے۔

(۷) حضرت علی کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے لیے مدینہ سے نکلے اور حضرت علی کو ساتھ جانے کی اجازت نہ دی تو آپ رو پڑے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔

(۸) حضرت علی کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ آنحضور نے ان کے حق میں فرمایا۔ "میرے

بعد آپ ہر مومن کے دوست ہیں"۔

(۹) حضرت علی کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ آنحضور نے حضرت علی کے سوا باقی سب لوگوں کے وہ دروازے بند کر دیے جو مسجد سے ہو کر گذرتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی بحالت جنابت مسجد نبوی میں سے گذرا کرتے تھے۔ دوسرا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

(۱۰) حضرت علی کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ آنحضور نے ان کے حق میں فرمایا: "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر کو سورۂ توبہ دے کر مکہ روانہ کیا۔ چنانچہ آپ تین شب و روز چلتے رہے۔ پھر حضرت علی کو بھیج کر حضرت ابوبکر کو واپس بلوایا اور علی کو حکم دیا کہ وہ سورہ توبہ مکہ پہنچائیں حضرت ابوبکر بارگاہ نبوی میں پہنچ کر رو پڑے اور عرض کیا حضور! کیا میرے بارے میں کوئی نئی بات پیش آئی ہے؟ آپ نے فرمایا "نہیں البتہ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ یہ سورت خود مکہ پہنچاؤں یا میرا کوئی اپنا آدمی یہ فریضہ انجام دے"۔

ہم جواباً کہتے ہیں کہ عمرو بن میمون کی روایت کردہ یہ حدیث مرسل ہے (اس لیے کہ عمرو بن میمون نے حضرت معاذ بن جبل کے ہاتھ پر بیعت اسلام کی اور آنحضور سے نہ مل سکے) مزید براں اس حدیث کے بعض الفاظ منکر ہیں۔ مثلاً یہ فقرہ

لَا یَنْبَغِیْ اَنْ اَذْھَبَ اِلَّا وَاَنْتَ خَلِیْفَتِیْ

(میں اسی صورت میں مدینہ سے باہر جا سکتا ہوں جب آپ میرے خلیفہ ہوں)

حالانکہ آنحضور نے حضرت علی کے علاوہ متعدد مرتبہ دوسرے صحابہ کرام کو اپنا نائب بنایا تھا۔

اسی طرح شیعہ کی پیش کردہ حدیث سُدُّوا الْاَبْوَابَ اِلَّا بَابَ عَلِیٍّ روافض کی اپنی گھڑی ہوئی ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور نے مرض الموت میں فرمایا۔

(۱) "میں سب لوگوں سے زیادہ ابوبکر کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں"
(۲) اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودت کسی شخص کے ساتھ مختص نہیں"۔
(۳) حضرت ابوبکر کے سوا کسی شخص کی کھڑکی مسجد کی جانب کھلی نہ رہے (بخاری مسلم)
شیعہ کی پیش کردہ حدیث "اَنْتَ وَلِیِّیْ فِیْ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ" بہ اتفاق محدثین موضوع ہے۔

حدیث میں جن دیگر امور کا ذکر کیا گیا ہے وہ حضرت علی کی خصوصیات نہیں ہیں مثلاً
(۱) حضرت علی اللہ و رسول کو چاہتے ہیں۔
(۲) حضرت علی کو حاکم مدینہ[1] مقرر کرنا
(۳) یہ بات کہ حضرت علی کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے۔
(۴) حضرت علی کا سورہ توبہ کو لے کر مکہ جانا۔

ان میں سے کوئی بات بھی حضرت علی کے ساتھ مختص نہیں۔ حضرت علی کو سورہ توبہ دے کر مکہ بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ نقض عہد کی اطلاع دینے کے لیے حاکم اعلیٰ کے قبیلہ کا کوئی شخص جایا کرتا تھا۔ اس سورت میں بھی نقض عہد کی اطلاع دی گئی ہے اس لیے حضرت علی کا مکہ جانا ضروری[2] تھا۔

[1] ہم قبل ازیں تحریر کر چکے ہیں کہ حضرت علی کو صرف ایک ہی مرتبہ حاکم مدینہ مقرر کیا گیا تھا۔ جبکہ دیگر صحابہ کو متعدد مرتبہ یہ خدمت تفویض ہوئی تھی جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اگر حاکم مدینہ کا سب لوگوں سے افضل ہونا ضروری ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی دوسرا حاکم مقرر کیا گیا حضرت علی اس وقت مفضول تھے۔ مزید براں دوسرے صحابہ کی حاکمیت مدینہ کے زمانہ میں وہاں سب مومن موجود ہوا کرتے تھے مگر جب حضرت علی کو حاکم مدینہ مقرر کیا تو عورتوں اور بچوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی اس سے افسردہ خاطر ہوئے اور اسے اپنی توہین پر محمول کیا۔ اس وقت مدینہ مامون تھا اور اسے کوئی خطرہ لاحق نہ تھا نہ وہاں جہاد کی ضرورت تھی ۱۲

[2] یہ بات غلط ہے کہ حضرت ابوبکر سورہ توبہ لے کر گئے اور پھر انہیں معزول کر کے (باقی بر صفحہ ۴۵۷)

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

خوارزم کے عظیم ترین خطیب نے یہ روایت ذکر کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا۔"اے علی اگر کوئی شخص اس قدر عرصہ دراز تک خدا کی عبادت کرے جتنا عرصہ حضرت نوح اپنی قوم میں ٹھہرے تھے اور احد پہاڑ جتنا سونا خدا کی راہ میں صرف کرے اور پا پیادہ ایک ہزار مرتبہ حج کرے پھر بحالت مظلومی صفا و مروہ کے مابین مارا جائے اور وہ تجھے دوست نہ رکھتا ہو تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا اور نہ وہ اس میں داخل ہو گا۔"

شیعہ کی وضع کردہ احادیث

اس کا جواب یہ ہے کہ خوارزم کے عظیم ترین خطیب نے اس باب میں ایک کتاب لکھی ہے جو جھوٹی روایات کا پلندہ ہے یہ روایت بھی ان میں سے ایک ہے۔

شیعہ مصنف کی ذکر کردہ احادیث ملاحظہ ہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۶) حضرت علی کو مکہ بھیجا گیا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضور نے حضرت ابوبکر کو امیر حج مقرر کیا تھا اور آپ بہمہ وجوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی یا عدم موجودگی میں اس کے اہل تھے۔ حضرت ابوبکر مدینہ سے رخصت ہو چکے تھے کہ سورہ توبہ نازل ہوئی۔ آنحضور نے حضرت علی کو یہ سورت دے کر حضرت ابوبکر کی جانب بھیجا اس کے دو اسباب تھے پہلی وجہ ذکر کی جا چکی ہے دوسری وجہ یہ تھی کہ اس سورت میں یہ آیت بھی ہے "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ" اس آیت میں حضرت ابوبکر صدیق کی جو مدح و ثنا بیان کی گئی ہے وہ اس وقت تک باقی ہے جب تک قرآن دنیا میں موجود ہے حضرت علی کا اس عظیم سورت کو لے کر مکہ جانا جو صدیق اکبر کی فضیلت و منقبت پر مشتمل ہے خود حضرت علی کی فضیلت کی دلیل اور ان لوگوں کے لیے ابدی ذلت کا موجب ہے جو ابوبکر صدیق کے لیے اپنے دل میں بغض و عداوت رکھتے ہیں ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ اخطب خوارزم (خوارزم کا عظیم ترین خطیب) ایک شیعہ ادیب ہے یہ زمخشری کا شاگرد تھا اس کا نام الموفق بن احمد بن اسحاق (۴۸۴ھ ــ ۵۶۸ھ) ہے دیکھئے بغیۃ الوعاۃ ص ۴۰۱ نیز روضات الجنۃ طبع ثانی صـ ۲۲ اخطب خوارزم کی کتاب کا نام "مناقب اہل البیت" ہے مقام افسوس ہے کہ غریب اہل بیت کی مدح میں شیعہ نے جھوٹی روایات وضع کر کے ان پر کتنا بڑا ظلم ڈھایا ہے ۱۲

(۱) ایک شخص نے سلمان سے کہا کہ آپ حضرت علی سے کتنی شدید محبت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جس نے حضرت علیؓ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی"

(۲) حضرت انس سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کے چہرہ کے نور سے ستر ہزار فرشتے پیدا کیے ہیں جو حضرت علی اور ان کے احباب کے لیے تاقیامت مغفرت طلب کرتے رہیں گے۔

(۳) عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو حضرت علی سے محبت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نماز و دعا اور صیام و قیام کو قبول فرماتے ہیں۔

(۴) جو حضرت علی سے محبت رکھتا ہے اللہ تعالےٰ اس کے ہر رگ و ریشہ کے عوض جنت میں ایک شہر عطا کریں گے۔ جو شخص آل محمد سے محبت کرتا ہے وہ حساب، میزان اور پلصراط سے خائف نہ ہوگا۔ نیز جس کی موت حب آل محمد پر ہوگی میں اسے جنت میں لے جانے کا ضامن ہوں۔ جو شخص آل محمد سے بغض رکھے گا بروز قیامت اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا "خدا کی رحمت سے ناامید"۔

(۵) عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا کہ شب معراج اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس زبان میں مخاطب کیا؟ آپ نے فرمایا "علی کے لہجہ میں"۔ پھر میں نے بنا بر الہام پوچھا "بار خدایا کیا تو نے مجھے مخاطب کیا یا علی نے"؟ اللہ تعالےٰ نے فرمایا میں دیگر اشیاء کی طرح نہیں میں نے تجھے اپنے نور سے پیدا کیا اور علی کو تیرے نور سے خلق کیا۔ جب میں نے تیرے دل کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ حضرت علی آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں لہذا اسی کے لہجہ میں آپ کو مخاطب کیا تاکہ آپ مطمئن رہیں

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر سب باغات قلمیں بن جائیں۔ اور سمندر سیاہی بن جائیں۔ جن حساب دار اور سب بنی نوع انسان کاتب بن جائیں۔ تو پھر بھی حضرت علیؓ کے محاسن تحریر کرنے سے قاصر رہیں گے"۔

ہم خدائے واحد و قہار کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ سب احادیث جھوٹ کا طومار ہیں اور ان کو وضع کرنے والا ملعون ہے اسی طرح وہ شخص بھی ملعون ہے جو حضرت علی سے محبت نہ رکھتا ہو۔ شیعہ مصنف نے کہا تھا کہ وہ صرف احادیث صحیحہ بیان کرے گا مگر وہ خرافات بیان کرنے پر تلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ شیعہ سب فرقوں سے بڑے جاہل و کاذب ہوتے ہیں اور یہ مصنف تو ان کا سردار ہے پھر اس کے جاہل و کاذب ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

حضرت علی بمنزلہ ہارون علیہ السلام تھے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے۔ کہ معاویہ نے انھیں حضرت علی کو برا بھلا کہنے کا حکم دیا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ معاویہ نے وجہ پوچھی تو بتایا مجھے آنحضور نے تین باتیں بتائی تھیں اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہو جائے تو وہ سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے ایک مرتبہ آنحضور حضرت علی کو مدینہ میں چھوڑ کر گئے اور حضرت علی نے کہا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں تو آنحضور نے اس کے جواب میں فرمایا۔ "اے علی! تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی"۔ شیعہ نے یہ حدیث تفصیلاً ذکر کی اور قبل ازیں یہ بیان کی جا چکی ہے[1]"

ہم جواباً کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ مگر رافضی مصنف کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ اسے موضوعات کے طومار میں شمار کر کے ذکر کر رہا ہے جیسے کوئی نا اہل قیمتی موتی کو مینگنیوں کے درمیان پرو دے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حاکم مدینہ مقرر کرنے میں حضرت علی کی کوئی خصوصیت نہیں اس لیے کہ آپ نے متعدد صحابہ کو یہ خدمت سپرد کی تھی۔

حضرت علی کو اگر ہارون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو حضرت ابوبکر کو حضرت ابراہیم و عیسیٰ اور حضرت عمر کو حضرت نوح و موسیٰ کے مشابہ قرار دیا گیا ہے[1]

---

[1] یہ حدیث مندرجہ ذیل کتب میں ملاحظہ کی جائے (باقی بر صفحہ ۴)

[1] علامہ موسیٰ جار اللہ اپنی کتاب "الوشیعہ" میں انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ در اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو یہ فرمایا تھا کہ اگرچہ تیرا مقام نیکی میں بلند ہے لیکن

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۵۹)

(۱) مسند احمد ج ا ص ۳۸۳ حدیث نمبر ۳۶۳۲ بروایت ابو عبیدہ

(۲) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱-۲۲ بطریق جریر عن اعمش

(۳) ترمذی جلد ۲ ص ۳۷ نیز ج ۴ ص ۱۱۳ بطریق ابو معاویہ از اعمش

(۴) تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۹۴-۹۵

ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۹۷-۲۹۸ پر لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

حضرت ابوبکر نے عرض کیا "حضور! یہ آپ کی قوم و قبیلہ کے لوگ ہیں انہیں زندہ رہنے دیجئے ممکن ہے کہ خدا ان کو توبہ کی توفیق عطا کرے"۔

حضرت عمر نے جواب دیا "ان لوگوں نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا لہٰذا ان کو تہ تیغ کر دیجئے"۔

عبد اللہ بن رواحہ نے کہا "ان کو نذر آتش کر دیجئے"۔

حضرت عباس نے کہا "آپ نے قطع رحمی کا ثبوت دیا ہے"۔

آنحضور نے یہ سب باتیں سنیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے کسی نے کہا ابوبکر کے قول پر عمل کریں گے۔ کسی نے کہا عمر کی تجویز کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ کسی نے کہا عبد اللہ بن رواحہ کے قول پر عمل کریں گے۔ آنحضور باہر تشریف لائے اور فرمایا۔

اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دل کو انتہائی نرم بنا دیتے ہیں اور بعض کا دل اتنا سخت ہوتا ہے کہ اس کے سامنے پتھر کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ پھر ابوبکر کو مخاطب کر کے فرمایا آپ کی مثال حضرت ابراہیم جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا۔ مَنْ تَبِعَنِی فَاِنَّہٗ مِنِّی وَمَنْ عَصَانِی فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (سورہ ابراہیم ۳۶) نیز آپ کی مثال حضرت عیسیٰ جیسی ہے جن کا ارشاد ہے اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ (سورۃ المائدہ ۱۱۸)

پھر حضرت عمر سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ کی مثال حضرت نوح جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا (سورہ نوح ۲۶)

(باقی بر ص ۴۶۱)

ظاہر ہے کہ یہ چاروں پیغمبر حضرت ہارون علیہ السلام سے افضل تھے۔ مزید براں حضرات ابوبکر و عمر ہر دو کو دو انبیاء کے مشابہ قرار دیا ہے ایک کے نہیں۔ بنابریں یہ تشبیہ حضرت علی کی تشبیہ سے عظیم تر ہے۔ نیز یہ کہ استخلاف علی میں دیگر صحابہ بھی ان کے سہیم و شریک تھے مگر اس تشبیہ میں کوئی صحابی حضرت ابوبکر و عمر کا شریک نہیں۔ لہٰذا یہ تشبیہ کسی طرح بھی حضرت علی کی خصوصیت قرار نہیں دی جا سکتی۔

اس حدیث میں نواصب کا رد ہے جو حضرت علی کو بغض و عداوت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نیز خوارج کی تردید ہے جو حضرت علی کی تکفیر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس حدیث سے ان روافض کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ جو احادیث فضائل صحابہ میں وارد ہوئی ہیں وہ ان کے مرتد ہونے سے پہلے کی ہیں۔ خوارج بھی حضرت علی کے بارے میں یہی کہتے ہیں

خوارج و روافض دونوں کے اقوال باطل ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ اس شخص سے خوشنودی کا اظہار نہیں کر سکتے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ اس کی موت کفر پر ہو گی۔ اسی طرح مباہلہ بھی آپ کی خصوصیت نہیں کیونکہ حسن و حسین بھی اس میں آپ کے ساتھ شریک تھے۔

اگر سوال کیا جائے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے ان تین باتوں میں سے ایک کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہراً و باطناً حضرت علی کے مومن ہونے کی شہادت دی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی معیّن شخص کے بارے میں نبی کی شہادت عظیم ترین فضائل و مناقب میں سے ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۰) نیز آپ کی مثال حضرت موسیٰ جیسی ہے انہوں نے فرمایا تھا (رَبَّنَا اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (سورۂ یونس - ۸۸)

پھر آپ نے فرمایا چونکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کمزور ہے اس سے کفار یا تو فدیہ ادا کریں یا انہیں قتل کر دیا جائے ۱۲

شخص کا جنازہ پڑھتے ہوئے جب دعا فرمائی تو عوف بن مالک کہہ اٹھے "اے کاش! اس میت کی جگہ میں ہوتا۔ حالانکہ یہ دعا اس میت کے ساتھ مختص نہ تھی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"عامر بن واثلہ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر نے چھ صحابہ کو اپنے میں سے خلیفہ منتخب کرنے کے لیے مقرر کیا تو حضرت علی نے ان کو مخاطب کر کے کہا

"میں تمہارے سامنے ایسی دلیل پیش کروں گا جس سے تمہیں مجال انکار نہ ہوگی۔ مندرجہ ذیل باتوں کا جواب دیجئے۔

(۱) میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم میں سے کوئی شخص مجھ سے پہلے توحید کا قائل ہوا ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ (یہ ایک طویل حدیث ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں)

(۲) میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص موجود ہے جس پر بیک وقت تین ہزار فرشتوں۔ نیز جبرئیل و میکائیل اور اسرافیل نے سلام بھیجا ہو۔ یہ اس وقت ہوا جب میں کسی اور کے کنوئیں سے آنحضور کے پاس پانی لایا۔ انہوں نے کہا۔ ہم میں سے ایسا کوئی شخص نہیں۔

حضرت علی کے چار اوصاف خصوصی

ابو عمر زاہد حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا حضرت علی میں چار اوصاف پائے جاتے ہیں جو کسی اور میں موجود نہیں۔

(۱) علی اولین شخص ہیں جس نے آنحضور کے ساتھ نماز ادا کی۔

(۲) یہ حضور کے علم بردار تھے

(۳) علی وہ شخص ہے جس نے غزوہ حنین میں آنحضور کے ساتھ صبر کیا۔

(۴) علی وہ شخص ہے جس نے آنحضور کو غسل دیا اور قبر میں اتارا!

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "شب معراج میرا گذر ایسی قوم پر ہوا جن کے جبڑے چھیلے جا رہے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا یہ کون ہیں؟

اس نے کہا "یہ چغل خور ہیں" پھر میں ایسے لوگوں کے نزدیک سے گذرا جو چلا رہے تھے۔ میں نے جبریل سے دریافت کیا یہ کون ہیں؟ اس نے کہا "یہ کافر ہیں"۔ پھر ہم دوسری راہ پہ چل دیے جب چوتھے آسمان پر پہنچے تو حضرت علی کو نماز پڑھتے دیکھا۔ میں نے جبرئیل سے دریافت کیا یہ کون ہے کیا علی ہم سے پہلے یہاں پہنچ گئے؟ جبرئیل نے کہا "یہ علی نہیں ہے۔ بات یہ تھی کہ فرشتوں نے جب سے حضرت علی کے فضائل۔ نیز آنحضور کی حدیث اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی سنی اس وقت سے حضرت علی کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔ اللہ تعالے نے حضرت علی کا ہم شکل فرشتہ پیدا کر دیا"۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضور نے ایک دن فرمایا تھا "میں خود نوجوان نوجوان کا بیٹا اور نوجوان کا (حضرت علی) کا بھائی ہوں"

حضرت جبرئیل جنگ بدر کے دن خوش وخرم آسمان کی جانب چڑھے اور وہ کہہ رہے تھے

"لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَارِ وَلَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ"

(تلوار ہے تو ذوالفقار اور نوجوان ہے تو علی)

ابن عباس فرماتے ہیں میں نے "ابوذر" کو کعبہ کے پردوں سے لٹکتے دیکھا وہ کہہ رہے تھے "جو مجھے پہچاننا چاہتا ہو وہ پہچان لے میں ابوذر ہوں۔ اگر تم نماز وروزہ کی پابندی کرتے کرتے سوکھ جاؤ اور کانٹے کی طرح ہو جاؤ تو تمہیں اس وقت تک اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا جب تک علی سے محبت نہ کرو"۔

(شیعہ مصنف کے دلائل ختم ہوئے)

شیعہ کے دلائل پر تنقید و تبصرہ

شیعہ کے پیش کردہ دلائل کا جواب یہ ہے کہ واثلہ کی روایت باتفاق محدثین کذب ہے۔ حضرت علی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ بلکہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا تھا "اگر میں آپ کو امیر مقرر کر دوں تو کیا آپ انصاف کریں گے؟" حضرت علی نے کہا "ہاں" عبدالرحمن نے پھر کہا "اگر میں عثمان کی بیعت کر لوں تو کیا آپ ان کی اطاعت کریں گے؟" حضرت علی نے کہا "ہاں"۔

حضرت عثمان سے بھی یونہی کہا۔ پھر تین دن تک مسلمانوں سے مشورہ کرتے رہے
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی باطل ہے۔ اس لیے کہ غزوۂ احد میں آنحضور
کے عَلَم بردار بالاتفاق مصعب بن عمیر تھے اور فتح مکہ کے دن حضرت زُبیر (بخاری) غزوہ حنین
میں آنحضور کے قریب تر آپ کے چچا حضرت عباس اور ابو سفیان بن حارث تھے۔
حضرت عباس آپ کی رکاب تھامے تھے۔

معراج سے متعلق شیعہ کی ذکر کردہ روایت بہت گھٹیا قسم کا دروغ ہے۔ اس پر
غور کرنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایت من گھڑت ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ
ملائکہ نے حضرت علی کے فضائل و مناقب سن کر اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا اور اللہ
تعالی نے حضرت علی کا ہم شکل فرشتہ پیدا کر دیا۔ حالانکہ معراج کا واقعہ مکہ مکرمہ میں پیش
آیا اور آنحضور نے حضرت علی کو "اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ" غزوہ تبوک کے موقع
پر فرمایا جو آپ کا آخری غزوہ ہے اور ۹ھ میں پیش آیا۔

اسی طرح حدیث "لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ" بھی کذب ہے "اَلْفَتٰی" کا لفظ اسماء مدح وذم میں
سے نہیں بلکہ "اَلشَّابُ" (جوان) اور "اَلْکَھْلُ" (ادھیڑ عمر کا) کی طرح مطلق اسم ہے۔ مشرکین
کا قول "سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُھُمْ" (سورہ انبیاء۔ ۶۰) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح پر
مبنی نہیں ہے۔

یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنا بھائی بنایا اور حضرت ابوبکر
نے حضرت عمر کو صریح کذب ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ آپ نے مہاجرین و انصار کے
مابین مواخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔

ذوالفقار ابو جہل کی تلوار کا نام ہے۔ غزوہ بدر میں یہ تلوار مال غنیمت میں مسلمانوں کو
ملی تھی۔ دراصل یہ مسلمانوں کی ملکیت نہ تھی۔ امام احمد و ترمذی نے ابن عباس سے روایت
کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالفقار نامی تلوار غزوۂ بدر میں انعام کے طور پر دے
دی تھی۔

آنحضور کے "اَنَا فَتٰی" کہنے کی روایت بھی جھوٹ ہے کیونکہ جب آپ نبوت سے

سرفراز ہوئے تو اس وقت نوجوان نہ تھے بلکہ ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ ابو ذر کا قول بھی صحیح نہیں۔ مزید براں حضرت علی سے محبت کرنا اسی طرح فرض ہے جیسے حب انصار و ابی بکر۔ آنحضور کا ارشاد ہے "حب انصار علامت ایمان ہے" صحیح مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ اُمّی نبی ﷺ نے مجھ سے عہد کیا کہ مجھ سے وہی محبت رکھے گا جو مومن ہو گا اور مجھ سے وہی شخص عداوت رکھے گا جو منافق ہو گا۔"

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ان دلائل میں سے ایک دلیل صاحب الفردوس کی معاذ سے ذکر کردہ یہ روایت ہے۔ کہ حضرت علی کی محبت ایک ایسی نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے برائی سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور حضرت علی سے بغض رکھنا ایک ایسا جرم ہے جس کی موجودگی میں نیکی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔"

ہم کہتے ہیں کہ کتاب الفردوس کا مصنف شیرویہ بن شہریار دیلمی محدث ہے۔ اس میں موضوعات کی بھرمار ہے اور یہ حدیث بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ مومن کو برائیوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ آنحضور نے حمار نامی ایک شخص پر شراب کی حد قائم کرنے کا حکم دیا تھا۔ ایک شخص نے اسے گالی دی تو آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دیجئے کیونکہ یہ اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں ابو طالب اپنے بیٹے حضرت علی سے محبت رکھتے تھے اس کے باوصف انہیں شرک سے نقصان پہنچا اور وہ جہنمی قرار پائے۔ اسی طرح غالی شیعہ بھی حب علی کے دعوی دار ہیں اور یہ بھی جہنمی ہیں۔ حب رسول حضرت علی کی محبت سے عظیم تر ہے اس کے باوجود آپ کو چاہنے والے دوزخ میں جائیں گے اور آپ کی شفاعت کی بنا پر جہنم سے نکلیں گے۔

حب علی سے متعلق احادیث پر نقد و جرح

رافضی مصنف کی ابن مسعود سے ذکر کردہ روایت "آل محمد سے ایک دن محبت کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے"۔ موضوع ہے

اسی طرح یہ حدیث۔
"میں اور علی خدا کی مخلوق پر حجت ہیں"۔ کذب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (سورۃ نساء - ۱۶۵)
شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اگر سب لوگ حب علی پر جمع ہو جاتے تو جہنم کو پیدا ہی نہ کیا جاتا"۔
کذب صریح ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسمٰعیلیہ محب علی ہونے کے باوصف جہنم کا ایندھن ہیں اور ہم علی سے محبت رکھنے کے باوجود دوزخ سے ڈرتے ہیں علاوہ ازیں انبیاء کی تصدیق کرنے والے بہت سے لوگ جنت میں جائیں گے حالانکہ وہ علی کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ کا ذکر کردہ ضابطہ بے بنیاد ہے۔
شیعہ کی ذکر کردہ یہ حدیث کہ "خدا نے حضرت علی سے عہد کیا تھا نیز یہ کہ علی عَلَم الہدیٰ و امام الاولیاء نیز وہ کلمہ ہیں جو متقیوں کے لیے ضروری ہے"۔ صاف جھوٹ ہے۔ حلیۃ الاولیاء کے مصنف نے خلفاء اربعہ کی فضیلت میں چند موضوع روایات[1] ذکر کی ہیں۔
علی وہ کلمہ اس لیے نہیں ہو سکتے کہ کلمۃ التقویٰ "لا الٰہ الا اللہ" ہے جیسا کہ حدیث نبوی سے ثابت ہے۔
شیعہ مصنف لکھتا ہے۔
"جہاں تک صحابہ کے نقائص و معائب کا تعلق۔ اس کی حد یہ ہے کہ کلبی نے "مثالب صحابہ" کے موضوع پر ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے"۔
ہم جواباً کہتے ہیں کہ کلبی اور اس کا بیٹا ہشام دونوں شیعہ کذاب[2] ہیں

[1] محدث ابو الفرج ابن الجوزی نے اپنی کتاب "صفۃ الصفوۃ" کے مقدمہ میں کتاب حلیۃ الاولیاء کی اس کمزوری کی جانب اشارہ کیا ہے (خلفاء اربعہ انبیاء کرام کے بعد جملہ مخلوقات سے چیدہ و برگزیدہ ہیں اور اس لیے اسی بات سے قطعی بے نیاز ہیں کہ ان کے فضائل میں ضعیف یا موضوع روایات بیان کی جائیں ۱۲
(حاشیہ نمبر ۲ آئندہ صفحہ پر دیکھئے)

(حاشیہ متعلقہ ص ۲۶۶) ۲ ہشام بن محمد بن سائب کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔ ہشام کے والد کلبی کے بارے میں محدث ابن حبان فرماتے ہیں

"کلبی ابن سبا کے معتقدین میں سے تھا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ حضرت علی ابھی فوت نہیں ہوئے وہ لوٹ کر آئیں گے اور کرہ ارضی کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے لبریز ہو چکی ہے"۔

تبوذکی کہتے ہیں "میں نے ہمام سے سنا اس نے کلبی کو یہ کہتے سنا کہ میں سبائی عقیدہ رکھتا ہوں" امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابوالنضر کلبی یحییٰ اور ابن مہدی کے نزدیک متروک الحدیث ہے۔ امام بخاری نے کلبی کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ "میں جو روایت ابوصالح سے بیان کروں وہ جھوٹی ہوتی ہے"۔ محدث ابن حبان فرماتے ہیں کلبی کے مذہب اور اس کی دروغگوئی کے پیش نظر اس کی تعریف بے سود ہے"۔ کلبی بطریق ابوصالح از ابن عباس تفسیری روایات بیان کرتا ہے حالانکہ ابوصالح نے ابن عباس کو دیکھا بھی نہیں۔ کلبی نے بھی ابوصالح سے بہت تھوڑی روایات سنی ہیں مگر بوقت ضرورت کلبی ابوصالح سے لاتعداد روایات بیان کرتا ہے۔ تصانیف میں کلبی کا نام لینا بھی حلال نہیں اس کی روایات سے احتجاج تو درکنار"۔

احمد بن زہیر کا قول ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا "کلبی کی تفسیر سے استفادہ کرنا حلال ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا "نہیں"۔ محدث ابوعوانہ کہتے ہیں "میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا جبریئل آنحضور کو وحی لکھوایا کرتے تھے جب آپ بیت الخلاء میں داخل ہو جاتے تو جبرائیل حضرت علی کو وحی لکھواتے"۔ محدث ابن معین یحییٰ بن یعلی سے اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں کلبی سے قرآن پڑھا کرتا تھا۔ میں نے اسے یہ کہتے سنا "ایک مرتبہ میں ایسا بیمار پڑا کہ مجھے سب کچھ بھول گیا۔ میں آل محمد کے پاس گیا اور انھوں نے میرے منہ میں اپنا تھوک ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بھولا تھا دوبارہ مجھے یاد ہو گیا"۔ میں نے یہ سنکر کہا میں آپ سے کوئی روایت بیان نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے اسے ترک کر دیا"۔

ابو معاویہ کہتے ہیں "میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا "میں نے چھ یا سات دن میں قرآن حفظ کیا۔ دوسرا کوئی شخص اتنی جلدی قرآن یاد نہیں کر سکتا اور میں ایسی چیز بھولا جس کو کوئی (باقی بر ص ۲۶۸)

صحابہ کے بارے میں جو معائب منقول ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

معائب صحابہ میں قسم اول

پہلی قسم کے وہ معائب و نقائص ہیں جو صریح کذب ہیں یا محرّف ہیں اور ان میں کمی بیشی کر کے ان کو ذم وطعن کی شکل دے دی گئی ہے۔ شیعہ کے ذکر کردہ اکثر مطاعن اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے راوی مشہور و معروف کذاب ہیں۔ مثلاً ابو مخنف لوط بن یحییٰ اور ہشام بن محمد بن سائب کلبی۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ مصنف ہشام کلبی کی تصنیفات سے استشہاد کرتا ہے حالانکہ وہ اکذب الناس ہے۔ ہشام کلبی شیعہ ہے یہ اپنے والد اور ابو مخنف دونوں سے روایت کرتا ہے حالانکہ یہ دونوں متروک الحدیث اور کذاب ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کلبی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص کلبی سے روایت کرتا ہو یہ تو صرف ایک داستان گو اور نسابہ تھا"۔

امام دارقطنی فرماتے ہیں۔ کلبی متروک الحدیث ہے۔

محدث ابن عدی کہتے ہیں "ہشام کلبی افسانہ گو تھا۔ مسند احمد میں اس سے کوئی حدیث مروی نہیں۔ اس کا باپ بھی کذاب ہے"۔

امام زائدہ ولیث وسلیمان فرماتے ہیں "کلبی کذاب ہے"۔

محدث یحییٰ فرماتے ہیں "کلبی کذاب، ساقط الاحتجاج اور بیکار ہے"۔

محدث ابن حبان فرماتے ہیں "کلبی کا کاذب ہونا عیاں راچہ بیاں" کا مصداق ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۷) شخص فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی ڈاڑھی پکڑ کر چاہا کہ اس میں معمولی تخفیف کردوں گا مگر میں نے زیادہ کتر ڈالی"۔ یہ ہیں کلبی سبائی کذاب کے بارے میں ائمہ حدیث کے ارشادات عالیہ۔ رافضی مصنف ایسے شخص کی کتاب سے ان صحابہ کے نقائص و معائب پر استدلال کرنا چاہتا ہے جو رسول اللہ کے بعد اس کائنات ارضی پر خدا کی بہترین مخلوق تھے۔ ان کی عظمت و فضیلت کا یہ عالم ہے کہ اعدائے اسلام بھی ان کے مقام رفیع سے انکار نہیں کر سکتے جو انہیں تاریخ اسلام میں حاصل ہے (۲)۔

معائب صحابہ کی دوسری قسم | صحابہ پر دوسری قسم کے وہ اعتراضات ہیں جو بجائے خود صحیح ہیں مگر صحابہ کے عذرات کی بنا پر
ان کو گناہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ وہ اجتہادی غلطی کی قسم کی چیزیں ہیں جس کے درست ہونے کی صورت میں دو اجر ملتے ہیں اور غلط ہونے کی صورت میں ایک اجر۔ خلفاء راشدین کے بارے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔
تاہم اگر بفرض محال ان میں سے کسی چیز کے بارے میں ثابت بھی ہو جائے کہ وہ گناہ ہے تو اس سے ان کے فضائل و مناقب اور جنتی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ گناہ کی سزا متعدد اسباب کی بنا پر آخرت میں ٹل بھی جاتی ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں۔

(۱) توبہ گناہوں کو محو کر دیتی ہے۔ شیعہ کے بارہ اماموں کے بارے میں ثابت ہے کہ انہوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی تھی۔

(۲) اعمال صالحہ گناہوں کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (سورہ نساء ۳۱)

(اگر تم کبائر سے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ معاف کر دیں گے)

(۳) مصائب و آلام بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں اور ان سے گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

(۴) مومنوں کی دعا سے بھی گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے

(۵) انبیاء کی شفاعت سے بھی گناہ دور ہو جاتے ہیں۔

بہر کیف جن اسباب و وجوہ کی بنا پر افراد امت میں سے کسی کے گناہ کو معاف کیا جاسکتا اور اس کی سزا کا ازالہ ممکن ہے، صحابہ ان سب سے زیادہ اس امر کے مستحق ہیں کہ ان سے ذم و عتاب کو دور کیا جائے اور ان کے گناہوں کو معاف کیا جائے۔
ہم اس ضمن میں صحابہ اور دیگر افراد امت کے لیے ایک جامع قاعدہ ذکر کرتے ہیں۔

قاعدہ جامعہ | عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے لیے بنی نوع انسان کے پاس کچھ قواعد کلیہ ہوتے ہیں جن پر رکھ کر جزئیات کو جانچا پرکھا

جاتا ہے۔ پھر جزئیات کو پہچانا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان جزئیات سے بے بہرہ رہتا اور کلیات کے بارے میں جہل و ظلم کا شکار ہو جاتا۔ جس سے عظیم فساد رونما ہوتا۔ علماء نے مجتہدین کے خطا و صواب اور تاثیم یا عدم تاثیم کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں بیش قیمت قواعد نافعہ بیان کرتے ہیں۔

اصل اول:۔ کیا مجتہد کے لیے یہ ممکن ہے کہ اپنے اجتہاد کے بل بوتے پر معلوم کر لے کہ فلاں متنازع مسئلہ حق ہے؟ اور اگر یہ ممکن نہیں اور مجتہد انتہائی سعی و جہد کے باوجود حق کو نہ پا سکے اور کہے کہ میرے علم کی حد تک یہ حق ہے حالانکہ وہ حق نہ ہو تو کیا اُسے سزا دی جائے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ ہذا کی اساس و اصل ہے۔ علماء کے اس میں تین اقوال ہیں۔ ہر قول کو ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔

پہلا قول:۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مسئلہ میں حق کی ایک دلیل مقرر کر رکھی ہے۔ جو شخص کما حقہ جہد و کاوش سے کام لیتا ہے وہ حق کو پا لیتا ہے۔ بخلاف ازیں جو شخص کسی اصولی یا فروعی مسئلہ میں حق کو معلوم کرنے سے قاصر رہتا ہے اس کی وجہ اس کا تساہل و تغافل ہے۔ قدریہ و معتزلہ یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ متکلمین کا ایک گروہ بھی اسی کا قائل ہے

دوسرا قول:۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مجتہد بعض اوقات حق کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور بعض اوقات نہیں۔ بصورت عجز اللہ تعالیٰ بعض اوقات اس کو سزا دیتے ہیں اور بعض اوقات نہیں۔ یہ جہمیہ و اشاعرہ کا مذہب ہے اور مذاہب اربعہ کے اکثر اتباع بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

تیسرا قول:۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ہر مجتہد حق کو معلوم کرنے پر قادر نہیں اور نہ ہی وعید کا مستحق ہے۔ بخلاف ازیں وہی مجتہد وعید کا مستحق ہو گا جو کسی فعل مامور کو ترک کر دے یا فعل محظور کا مرتکب ہو۔ یہ فقہاء و ائمہ کا قول ہے۔ سلف صالحین اور جمہور اہل اسلام اسی کے قائل ہیں پہلے دونوں اقوال میں جو صحیح بات پائی جاتی ہے۔ یہ قول ان کا جامع ہے۔

اصل ثانی:۔ اصل ثانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اسی شخص کو سزا دے گا جو ترک

مامور یا فعل محظور کی بنا پر خدا کی نافرمانی کرے۔ سلف صالحین و جمہور کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ لہذا وجوب قدرت کے ساتھ مشروط ہے اور سزا صرف ترک مامور اور فعل محظور کی صورت میں ملے گی۔

ہم قبل ازیں وعد و وعید اور ثواب و عقاب کے بارے میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ گنہگار کی سزا دس اسباب کی بنا پر معاف کی جا سکتی ہے۔ جب سزا کی معافی امت کے سب گنہگاروں کے لیے خواہ وہ مجتہد ہوں یا کوئی اور گناہ گار تو اصحاب رسول کی سزا کیونکر معاف نہیں کی جائے گی؟ اس پر طرہ یہ کہ جب بعد میں آنے والے مجتہدین سے ذم و عقاب کا ازالہ ممکن ہے تو سابقین اولین مہاجرین و انصار بالاولیٰ اس رعایت کا استحقاق رکھتے ہیں۔

ہم اس پر کھل کر گفتگو کرنا چاہتے ہیں یہ امر قابل غور ہے کہ جو روافض وغیرہ خلفاء راشدین و صحابہ کرام کی گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں یہ ان کی ناموس و آبرو پر حملہ ہے۔ لہذا اس کا تعلق حقوق اللہ و حقوق العباد دونوں سے ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب ہم صحابہ کے سوا سلاطین و ملوک اور علماء و مشائخ کو موضوع سخن بناتے ہیں تو اس وقت جہل و ظلم کے علی الرغم علم و عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اس لیے کہ عدل ہر شخص کے لیے ہر حال میں ضروری ہے اور ظلم مطلقاً حرام ہے۔ کسی صورت میں مباح نہیں جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے۔

"کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل نہ کر سکو۔ عدل کیجئے کیونکہ وہ تقویٰ سے قریب تر ہے"۔ (سورہ مائدہ ۸)

جو بغض حکم خداوندی کے مطابق ضروری ہے جب اس میں بھی مبغوض پر ظلم کرنے کی ممانعت ہے تو تاویل یا شبہ کی آڑ لینے والا مسلمان اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے انصاف کیا جائے۔ اور اسے تختۂ مشق ستم نہ بنایا جائے۔

اصحاب رسول سب لوگوں کی نسبت اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ قول و عمل میں ان کے ساتھ انصاف برتا جائے۔ عدل اور اصحاب عدل بالاتفاق مدح و ستائش کے

لائق ہیں اور ظلم و اہل ظلم بالاتفاق قابل مذمت ہیں۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ عدل و انصاف کے تقاضہ کے مطابق فیصلہ صادر کرنا ہر زمان و مکان میں ہر شخص پر ہر ایک کے لیے واجب ہے۔ خصوصاً شریعت محمدی کی روشنی میں حکم صادر کرنا ایک خاص قسم کا عدل ہے جو عدل کے جملہ انواع سے اکمل و احسن ہے۔ یہ فیصلہ نبی کے لیے بھی ضروری ہے اور اتباع نبی کے لیے بھی۔ اس کی پابندی نہ کرنے والا یقیناً کافر ہے ایسا فیصلہ امت کے جملہ متنازعہ امور میں ضروری ہے خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (سورہ نساء۔ ۵۹)

اگر کسی بات میں تمہارے یہاں تنازع بپا ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔

امت کے درمیان جملہ امور مشترکہ میں کتاب و سنت کا فیصلہ ناطق ہو گا نہ کہ کسی عالم و امیر یا شیخ و سلطان کا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں دو قاضی دوزخی اور ایک جنتی ہو گا۔

(۱) جو قاضی حق کو معلوم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرے وہ جنت میں جائے گا۔

(۲) جو حق کو جاننے کے باوجود اس کے برخلاف فیصلہ کرے وہ جہنمی ہو گا۔

(۳) جو جہالت کے باوجود لوگوں کا فیصلہ کرے وہ دوزخ میں جائے گا۔

جب کوئی شخص علم و عدل کی روشنی میں فیصلہ کرے اور اس کا اجتہاد مبنی بر صواب ہو تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر اس کا اجتہاد درست نہ ہو تو وہ ایک اجر کا مستحق ہے۔

(بخاری و مسلم)

جب دوسرے لوگوں کے باہمی معاملات میں عدل کو یہ اہمیت حاصل ہے۔ تو صحابہ دوسروں کی نسبت عدل و انصاف کیے جانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ روافض نے حضرات صحابہ کے بارے میں دو عملی اور تفرقہ کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ بعض صحابہ سے غلو کی حد تک محبت و مودت روا رکھتے ہیں اور بعض کے ساتھ انتہائی بغض و عناد کا مظاہرہ

کہتے ہیں یہ وہ تفرق وانقسام ہے جس سے اللہ و رسول نے منع فرمایا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (سورۂ انعام ۔۱۵۹)

جن لوگوں نے دین میں تفریق پیدا کی اور فرقوں میں بٹ گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں

نیز فرمایا۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا (آل عمران ۔۱۰۵)

(ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور جنہوں نے اختلاف پیدا کیا)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالی تین باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ (۱) خدا کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ (۲) قرآن کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقے نہ بنو (۳) اپنے حکام وولاۃ کی خیر خواہی کرو۔ (مسلم)

اللہ تعالے نے زندہ اور مردہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کا خون ان کا مال اور ان کی آبرو بھی حرام ہے۔ بخاری و مسلم میں آنحضور سے مروی ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا خون، ان کا مال اور ان کی آبرو اسی طرح حرام ہے جیسے اس دن کی حرمت تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں۔ گواہ رہو کہ میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں تک یہ احکام پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں اس لیے کہ جن لوگوں تک یہ احکام پہنچیں گے ان میں سے بعض ان لوگوں سے بھی ان احکام کو زیادہ یاد رکھیں گے جنہوں نے براہ راست یہ مسائل مجھ سے سنے"۔ (بخاری و مسلم)

اللہ تعالی فرماتے ہیں "جو لوگ مومن مرد اور عورتوں کو بلا وجہ ایذا دیتے ہیں انہوں نے ایک عظیم بہتان اور ظاہر گناہ کمایا" (احزاب ۔۵۸)

جو شخص کسی زندہ یا مردہ مومن کو دکھ پہنچائے گا وہ اس آیت کا مصداق ہوگا۔ البتہ مجتہد پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ جب کسی نے مومن کو اذیت پہنچائی تو یہ بلا وجہ اور بلا استحقاق ہی

ہو گی۔ جو شخص گنہگار ہو اور گناہ سے توبہ کر چکا ہو یا کسی اور وجہ سے اس کا گناہ بخشا گیا ہو اس کے باوجود کوئی شخص اسے تکلیف پہنچائے تو یہ ایذا ابلا استحقاق ہو گی۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا (حجرات - ۱۲) (ایک دوسرے کی چغلی مت کھاؤ)

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ آنحضور نے فرمایا۔

غیبت کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے مسلمان بھائی کا ذکر ایسے انداز میں کرو کہ وہ اسے ناپسند کرے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ اگر اس میں وہ عیب موجود ہو تب بھی اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں ؟ فرمایا اگر اس میں وہ عیب موجود ہو پھر تو غیبت ہے اور اگر موجود نہ ہو تو یہ بہتان ہے"

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ کسی میں ایسا عیب ثابت کرنا جو فی الواقع اس میں نہ ہو بہتان کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ پر ایسا بہتان لگانا کس قدر مذموم ہو گا۔ جو شخص کسی مجتہد کے بارے میں کہے کہ اس نے دانستہ ظلم کیا یا دانستہ کتاب و سنت کی خلاف ورزی کی حالانکہ ایسا نہ ہو تو یہ بہتان ہے ورنہ غیبت۔

البتہ غیبت کی وہ قسم مباح ہے جسے اللہ و رسول نے روا کیا ہو۔ غیبت مباح وہ ہے جو قصاص و عدل کے طور پر ہو یا اس میں کوئی دینی یا دنیوی مصلحت مضمر ہو۔ مثلاً مذموم کہے کہ فلاں شخص نے مجھے مارا یا میرا مال لے لیا یا میرا حق غصب کر لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (سورۃ نساء - ۱۴۸)

(اللہ تعالیٰ اونچی آواز سے بری بات کہنے کو پسند نہیں کرتے البتہ مظلوم ایسا کر سکتا ہے)

مذکورہ صدر آیت کریمہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو کسی قوم کے پاس مہمان ٹھہرا اور انہوں نے حق مہمانی ادا نہ کیا۔ اس لیے کہ مہمانی حدیث نبوی کی رو سے واجب ہے جب انہوں نے ادائے واجب میں تساہل کا ارتکاب کیا تو مہمان ان کی کوتاہی کا تذکرہ کر سکتا ہے۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ ہند بنت عتبہ نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ میرا خاوند ابو سفیان کنجوس آدمی ہے اور مجھے اتنا نان و نفقہ نہیں دیتا جس سے میری اور

میرے بچوں کی بسر اوقات ہو سکے تو کیا مجھے اس کے مال سے کچھ لینے کی اجازت ہے۔؟ آپ نے فرمایا! ہاں۔ اتنا مال لے سکتی ہو جو تیرے اور تیرے بچوں کے لیے کافی ہو (بخاری ومسلم بروایت عائشہ صدیقہ)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور نے ہند کو شکایت کرنے سے نہ روکا تھا یہ فریادِ مظلوم کی مثال ہے

خیر خواہی کے لیے غیبت کی مثال یہ حدیث ہے کہ چند آدمیوں نے فاطمہ بنت قیس کو نکاح کا پیغام دیا تھا۔ انہوں نے جب اس ضمن میں آنحضور سے مشورہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ معاویہ ایک مفلس آدمی ہے اور ابو جہم عورتوں کو پیٹنے کا خوگر ہے لہذا تم اسامہ سے نکاح باندھ لو"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فاطمہ بنت قیس نے جب خاوند کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو آپ نے اس کو مشورہ دے دیا۔ یہ خیر خواہی کے نقطۂ خیال سے تھا اور خیر خواہی ایک ضروری امر ہے۔ آنحضور نے حدیث صحیح میں تین مرتبہ فرمایا کہ دین خیر خواہی کا دوسرا نام ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا حضور کس کی خیر خواہی؟ فرمایا اللہ کی خیر خواہی رسول کی خیر خواہی اور مسلم حکام اور عوام سے ہمدردی"۔

جو شخص آنحضور کی حدیث بیان کرنے میں غلطی کرتا ہو یا دانستہ آنحضور یا کسی عالم پر جھوٹ باندھتا ہو یا دین کے علمی و اعتقادی مسائل میں غلط رائے کا اظہار کرتا ہو تو ایسے شخص پر علم و عدل اور خیر خواہی کی نیت سے نقد و جرح کرنے والا خدا کے نزدیک ماجور ہو گا خصوصاً جبکہ وہ شخص بدعت کی طرف دعوت دیتا ہو تو لوگوں کو اس کی غلطی سے آگاہ کرنا اور اس کے شر کو روکنا ڈاکو اور رہزنوں کے شر کو روکنے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

جو شخص علمی و دینی مسائل پر اپنے اجتہاد سے اظہارِ خیال کرتا ہے وہ مجتہدین کا حکم رکھتا ہے اور مخطی بھی ہو سکتا ہے اور مصیب بھی۔ بعض اوقات زبان و قلم یا شمشیر و سنان کے ساتھ اختلاف کرنے والے دونوں اشخاص مجتہد ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں بعض دفعہ وہ دونوں خطا پر ہوتے ہیں مگر ان کو بخش دیا جاتا ہے جیسا کہ ہم صحابہ کے باہمی

تنازعات کے بارے میں بیان کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاجرات صحابہ و تابعین پر اظہار خیال ممنوع ہے۔

جب دو مسلمان کسی بات میں جھگڑ پڑیں اور وہ معاملہ رفت گذشت ہو جائے اور لوگوں کا اس سے کچھ تعلق نہ ہو اور نہ وہ اس کی حقیقت سے آگاہ ہوں تو اس پر اظہار رائے کرنا ظلم و عدل ہوگا جس سے انہیں بلا وجہ ایذا پہنچے گی اور اگر لوگ جانتے ہوں کہ وہ دونوں گنہگار یا خطا کار تھے تو بلا مصلحت اس کا ذکر کرنا بد ترین قسم کی غیبت ہے چونکہ صحابہ کی عزت و حرمت اور ناموس و آبرو دوسرے لوگوں کی نسبت بہت زیادہ ہے اور ان کے فضائل و مناقب احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اس لیے ان کے باہمی تنازعات کو موضوع گفتگو بنانا دوسرے لوگوں کی مذمت بیان کرنے کی نسبت بہت بڑا گناہ ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ اہل سنت روافض کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان کے عیوب و نقائص بیان کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے کیونکر روا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی متعین آدمی کا نام لے کر اس کی مذمت بیان کرنا اور ہے اور کسی گروہ کی مذمت بحیثیت گروہ چیزے دیگر آنحضور سے ثابت ہے کہ آپ نے بعض گروہوں پر لعنت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (اعراف - ۴۴)

کتاب و سنت بد کردار لوگوں اور ان کے افعال کی قباحت و مذمت سے لبریز ہیں۔ جس کا مقصد اس فعل شنیع سے باز رکھنا اور یہ بتانا ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا وعید شدید کا مستوجب ہوگا۔

علاوہ ازیں جس گناہ کو آدمی گناہ تصور کرتا ہے اس سے تائب ہو جاتا ہے۔ مگر بتدعین مثلاً خوارج و نواصب جنہوں نے مسلمانوں میں بغض و عداوت کا دروازہ کھولا اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں اور جو لوگ ان کی ایجاد کردہ بدعت میں ان کے ہمنوا نہیں ہوتے ان کی تکفیر کرتے ہیں بنا بریں ان سے مسلمانوں کو ان ظالموں کی نسبت زیادہ ضرر لاحق ہو سکتا ہے جو حرام سمجھتے ہوئے ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

روافض خوارج سے بھی بڑے بتدع ہیں اس لیے کہ یہ ابوبکر و عمر کی تکفیر کرتے ہیں

جس کی جسارت خوارج بھی نہ کر سکے۔ مزید براں یہ آنحضور اور صحابہ کے بارے میں دروغگوئی سے کام لیتے ہیں۔ خوارج جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ بلکہ وہ شیعہ کی نسبت زیادہ سچے زیادہ بہادر اور عہد کے پابند ہوا کرتے تھے۔ خوارج مرد میدان اور بڑے جنگجو تھے جب کہ ان کے مقابلہ میں رافضی نہایت جھوٹے۔ حد درجہ بزدل، بے عہد اور نہایت ذلیل ہوا کرتے تھے۔ شیعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار تک سے مدد لینے سے گریز نہیں کرتے۔ جیسا کہ چنگیز خاں کے زمانہ میں ہوا جب شیعہ نے اس کی مدد کی۔ جب چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں خراسان اور عراق و شام کے علاقہ میں آیا تو شیعہ نے علانیہ اس کی مدد کی یہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور کسی کو اس سے مجال انکار نہیں[1]۔

---

[1] شہرہ آفاق شیعہ مورخ مرزا محمد باقر خوانساری نے اپنی کتاب روضات الجنات طبع ثانی کے صفحہ ۵۷۸ پر نصیر الدین طوسی کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ خواجہ نصیر الدین کی زندگی کا مشہور ترین واقعہ یہ ہے کہ وہ عظیم تاتاری سلطان اور اپنے دور کے پرشوکت و حشمت فاتح ہلاکو خاں بن تولی خاں بن چنگیز خاں کی ملاقات کے لیے ایران پہنچا اور پھر وہاں سے اس کے موید و منصور لشکر کی معیت میں ارشاد عباد، اصلاح بلاد اور قطع فساد کے لیے بغداد پہنچا۔ اس کا مقصد بنی عباس کی حکومت کو ختم کرنا اور ان کے اتباع کو صفحۂ ہستی سے مٹانا تھا۔ چنانچہ خواجہ طوسی اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور بغداد میں عباسیوں کے ناپاک خون کی ندیاں بہا دیں"۔

مذکورہ بالا اقتباس میں شیعہ مورخ نے شیخ روافض خواجہ طوسی کے مشہور سفاک ہلاکو خاں کے یہاں آنے کو ارشاداً للعباد و اصلاحاً للبلاد قرار دیا ہے۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ اس آمد کا مقصد وحید یہ تھا کہ سب سے بڑے اسلامی دار الخلافہ میں خون کی ندیاں بہا دی جائیں۔ مرزا محمد باقر اس بات پر فخر و مباہات کا اظہار کرتا ہے کہ ہلاکو خاں نے سفاکی و خونریزی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو مسلمان اس کی سفاکی کا شکار ہوئے وہ سب جہنمی ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ بت پرست ہلاکو اور اس کا رافضی ہادی و مرشد خواجہ طوسی دونوں قطعی جنتی ہیں۔ اس سے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے بیان کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ ہم قبل ازیں شیعہ مورخ کے قول کی جانب اشارہ کر چکے ہیں اب ضرورت کے پیش نظر تفصیلاً اس کا اقتباس نقل کیا گیا ہے[2]۔

خلیفہ بغداد کا وزیر ابن العلقمی بھی شیعہ تھا وہ ہمیشہ خلیفہ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتا رہا

لہ اس کا نام محمد بن احمد بغدادی ہے۔ یہ ابن العلقمی کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ۶۵۶ھ میں فوت ہوا۔ نوجوانی میں یہ شیعہ ادبا میں شمار ہوتا تھا۔ اہل سنت نے اس کے بارے میں تساہل سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مناصب جلیلہ طے کرتے کرتے خلافت عباسیہ میں وزارت کے عہدہ تک پہنچا اور چودہ سال تک اس پر فائز رہا۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم نے ابن العلقمی پر اس قدر اعتماد کیا کہ جملہ امور سلطنت اسے تفویض کر دیئے۔ جب صنم پرست ہلاکو خاں کا لشکر بلاد ایران میں داخل ہوا تو ابن العلقمی نے اسے بغداد پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ ابن العلقمی کو امید تھی کہ خلافت عباسیہ کے سقوط کے بعد ہلاکو خاں کسی شیعہ کو امام یا خلیفہ مقرر کرے گا۔ ہلاکو خاں قوم تاتار کے ج اور یاجوج ماجوج کے دولاکھ سپاہیوں کو لیکر بغداد پر حملہ آور ہوا۔ ابن العلقمی نے خلیفہ المستعصم کو دھوکہ دے کر ہلاکو خاں کے کام کو بڑی حد تک آسان کر دیا۔ جب ہلاکو نے اپنی فوج کو بغداد کی شرقی و غربی جانب اتار دیا۔ ابن العلقمی نے خلیفہ سے صلح کی سلسلہ جنبانی کے لیے خلیفہ سے ہلاکو خاں کو ملنے کی اجازت مانگی۔ جب ابن العلقمی نے ہلاکو کو اپنی وفا شعاری اور خلافت عباسیہ سے خیانت کاری کا یقین دلا چکا تو خلیفہ کے پاس لوٹ کر واپس آیا اور کہنے لگا ہلاکو اپنی بیٹی کا نکاح خلیفہ کے بیٹے ابوبکر سے کرنا چاہتا ہے۔ نیز ہلاکو کی خواہش ہے کہ وہ سلجوق سلاطین کی طرح خلیفہ کے زیر اثر رہے۔ خلیفہ علماء و رؤسا اور اعیان حکومت کی معیت میں بزعم خود اپنے بیٹے کو بیا ہنے کے لیے ہلاکو کی جانب چل دیا۔

جب لوگ خلیفہ کی رفاقت میں ہلاکو کے یہاں پہنچے تو اس نے سب کو تہ تیغ کرنے کا حکم دیا پھر یاجوج ماجوج کے لشکر نے شہر میں داخل ہو کر قتل عام کا بازار گرم کیا۔ مسلسل چالیس دن تک قتل و غارت جاری رہا۔ کہا گیا ہے کہ ہلاکو نے جب مقتولوں کو شمار کرنے کا حکم دیا تو وہ دس لاکھ اسی ہزار نکلے۔ جو مقتول شمار نہ کیے جا سکے ان کی تعداد اس سے کئی گنا زائد تھی۔

دشمن خدا ابن العلقمی اپنے مقاصد میں ناکام رہا اور شیعہ حکومت قائم کرنے سے متعلق اس کی آرزو بر نہ آئی۔ خیانت پیشہ لوگ ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھا کرتے ہیں اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ہلاکو اسے حقیر سمجھنے لگا اور اس کی حیثیت تاتاریوں میں ایک غلام سے زیادہ (باقی بر صفحہ ۴۷۹)

اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو زک پہنچے۔ ضرر رسانی کے لیے وہ طرح طرح کے حیلے اختیار کیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافر تاتاری بغداد میں داخل ہو گئے اور انھوں نے لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسلام میں تاتاری کفار کی جنگ سے بڑھ کر کوئی لڑائی نہیں لڑی گئی۔ تاتاریوں نے ہاشمیوں کو تہ تیغ کر کے عباسی اور غیر عباسی سب خواتین کو قیدی بنا لیا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ جو شخص کفار کو مسلمانوں پر مسلط کر کے انہیں قتل کرتا اور مسلم مستورات کو قیدی بنانے میں مدد دیتا ہے ایسا شخص محب آل رسول ہو سکتا ہے؟

شیعہ حجاج ثقفی پر یہ بہتان لگاتے ہیں کہ اس نے خاندانی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حالانکہ سفّاک ہونے کے باوصف حجاج نے کسی ہاشمی کو قتل نہیں کیا تھا۔ البتہ بنی ہاشم کے علاوہ دیگر عرب شرفاء کو اس نے ضرور قتل کیا تھا۔ حجاج نے ایک ہاشمی خاتون بنت عبداللہ بن جعفر سے نکاح کیا تھا مگر بنو امیہ نے یہ کہہ کر بدیں وجہ تفریق کرا دی کہ حجّاج ایک شریف ہاشمی خاتون کا کفو نہیں ہو سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ رافضیوں میں خال خال کچھ عابد و زاہد لوگ بھی پائے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا معاملہ دیگر بدعتین اور اہل الاہواء سے یکسر مختلف ہے معتزلہ شیعہ کے مقابلہ میں زیادہ دانشمند زیادہ دیندار اور ان سے بڑھ کر عالم ہوا کرتے ہیں۔ کذب و فجور بھی معتزلہ میں روافض کی نسبت کم ہے۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ نسبتاً بہتر اور علم و عدل سے قریب تر ہے۔ اہل بدعت میں خوارج سب سے زیادہ سچے اور عبادت گذار ہوا کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۸) نہ تھی بعد ازاں ابن العلقمی یہ مصرعہ گنگنایا کرتا تھا ؎

وَجَرَى الْقَضَاءُ بِعَكْسِ مَا أَمَّلْتُهُ (تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ)

پھر افسردگی کی حالت میں جہنم واصل ہوا۔ بت پرست تاتار کے ہاتھوں مسلمان جس عظیم حادثہ سے دوچار ہوئے شیعہ مورخ بڑے فخریہ انداز میں اس کا ذکر کرتا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شیعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کا ساتھ دینے کے خوگر ہیں اور مسلمانوں کو بغض و عناد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ۱۲۔

بایں ہمہ اہل سنت سب فرقوں کے ساتھ یکساں طور پر عدل و انصاف کا برتاؤ کرتے ہیں اور کسی پر بھی ظلم نہیں ڈھاتے۔ کیونکہ ظلم مطلق حرام ہے۔ اہل سنت کے عدل و انصاف کی حد یہ ہے کہ وہ روافض سے بہ حیثیت مجموعی جو سلوک روا رکھتے ہیں وہ اس سلوک سے بدرجہا بہتر ہے جو شیعہ کے بعض فرقے دوسرے فرقوں سے روا رکھتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ روافض خود بھی اس کے معترف ہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ روافض کے مختلف فرقوں کا یہ الاشتراک ظلم و جہل پر مبنی ہے اور وہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عدل و انصاف کا خوگر مسلمان شیعہ کے ساتھ جس عدل و انصاف کے ساتھ کام لے سکتا ہے وہ آپس میں ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے (کیونکہ ظلم و جور ان کی فطرت بن چکا ہے)

خوارج اہل سنت کی تکفیر کرتے ہیں اسی طرح اکثر معتزلہ و روافض بھی اپنے مخالفین کو مسلمان قرار نہیں دیتے یا کم از کم ان کی تفسیق کرتے ہیں۔ اکثر مبتدعین کا عام انداز یہ ہے کہ وہ ایک رائے کو تصنیف کرتے ہیں اور پھر اس کی مخالفت کرنے والے پر کفر کا فتویٰ عائد کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں اہل سنت حق کی پیروی کرتے ہیں اور مخالفین کو کافر نہیں ٹھہراتے بلکہ وہ سب سے زیادہ حق کی واقفیت رکھتے ہیں اور مخلوقات پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے بھی وہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران - ۱۱۰)

(تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی بہبود کے لیے پیدا کیا گیا ہے)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں "تم لوگوں کے حق میں سب سے زیادہ مفید ہو"۔

چونکہ اہل سنت سب لوگوں سے چیدہ و برگزیدہ ہیں اس لیے وہ صحیح معنی میں اس آیت کے مصداق ہیں۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ ساحل شام پر ایک بڑا پہاڑ تھا[۱] جس پر ہزاروں شیعہ بود و باش

[۱] اس پہاڑ کا نام الجرد و کیردان تھا۔ جب غازان نامی بادشاہ دمشق پر حملہ آور ہوا تو اس پہاڑ (باقی بر صفحہ ۴۹۱)

رکھتے تھے وہ لوگوں کا خون بہاتے اور ان کا مال چھین لیا کرتے تھے۔

جس[1] سال مسلمانوں نے تاتاری بادشاہ غازان کے ہاتھوں شکست کھائی تو اس پہاڑ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۰) کے باشندوں اور ان شیعہ نے جو یہاں سکونت رکھتے تھے اس موقع کو غنیمت خیال کیا۔ چنانچہ تاتاریوں سے شکست کھا کر جو سپاہی یا عام لوگ وہاں سے گذرتے یہ ان کو قتل کر دیتے اور ان کا ساز و سامان اور گھوڑے وغیرہ چھین لیتے۔ انہوں نے برملا اپنے عقائد فاسدہ اور کفر و ضلالت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے بلاد شام کو تاتار کے ظالمانہ چنگل سے رہائی بخشی تو نائب السلطنت جمال الدین اقوش الافرم دمشق سے لشکر لے کر اس پہاڑ کی جانب روانہ ہوا جیسا کہ البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۱۲ پر لکھا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لاتعداد اتباع و متعلقین کو لے کر اس پہاڑ کی جانب چل دیئے۔ وہاں پہنچے تو بہت سے شیعہ سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ اور اس سے بڑا فائدہ پہنچا۔ شیعہ نے لوٹا ہوا مال سب واپس کر دیا اور اسلامی حکومت کے زیر سایہ امن و امان سے رہنے کا عہد باندھا۔ الافرم اور امام ابن تیمیہ کی روانگی کا مذکورہ واقعہ ۲۰ شوال کو پیش آیا اور ۱۳ ذیقعدہ سنہ ۶۹۹ھ بروز اتوار واپس لوٹے ۱۲

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) [1] غازان کا حملہ سنہ ۶۹۹ھ میں ہوا تھا۔ غازان المتوفی (۶۷۰-۷۰۳) شیعہ سلطان خدابندہ المتوفی (۶۸۰-۷۱۶) کا بھائی تھا۔ اسی خدابندہ نامی بادشاہ کے لیے ابن المطہر شیعہ نے وہ کتاب لکھی جس کی تردید شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں کی ہے۔ شیخ الاسلام نے یہاں جس واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ دمشق ان دنوں حکومت مصر کے تحت تھا مصر پر ان دنوں سلطان الناصر محمد بن قلاوون کی حکومت تھی۔ جس نے المنصور لاجین کو سنہ ۶۹۸ھ میں قتل کر کے مقام کرک کی جلاوطنی سے نجات پائی تھی۔ بلاد شام میں سلطان مصر کا نائب ان دنوں اقوش الافرم تھا۔ اقوش کا پیشرو سیف الدین قبجق المنصوری ایران میں جا کر تاتاری بادشاہ غازان سے مل گیا تھا۔ سنہ ۶۹۸ھ یہ خبر پہنچی کہ غازان ایران سے حلب کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔ سلطان مصر محمد بن قلاوون جب اس سے آگاہ ہوا تو وہ ماہ محرم سنہ ۶۹۹ھ میں مصر سے غزہ پہنچ کر دو ماہ تک غازان کی نقل و حرکت کا منتظر رہا۔

ماہ ربیع الاول سنہ ۶۹۹ھ مطابق دسمبر سنہ ۱۲۹۹ء میں سلطان الناصر محمد بن قلاوون (باقی بر صفحہ ۴۸۲)

(بقیہ حاشیہ ۴۸۱) شدید سردی کے موسم میں دمشق پہنچا۔ سلطان نے رجال واموال کی فراہمی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی یہاں تک کہ یتیموں کا مال بھی قرض لے لیا۔ آخر کار مورخہ ۲۷ ربیع الاول سنہ ۶۹۹ھ وادی سلمیہ میں پہنچ کر تاتاریوں سے ملا وہاں گھمسان کا رن پڑا۔ سلطان محمد بن قلاوون نے شکست کھائی اور غازان نے آگے بڑھ کر بعلبک پر قبضہ کر لیا۔

دمشق کے امراء وخواص سلطان الناصر کی پیروی میں مصر پہنچے اور دمشق حکام وولاۃ سے خالی رہ گیا۔ ادھر اہل شام نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کی کہ وہ غازان کے پاس جا کر قوم کے لیے امان طلب کریں۔ شیخ الاسلام نے یہ درخواست قبول کر لی۔ آپ ڈرتے تھے مبادا تاتاری بدعہدی کریں اس لیے آپ نے امیر ارجواش کو مل کر تاکید کی کہ قلعہ کے اندرونی انتظامات اچھی طرح مضبوط کیے جائیں اور تاتاریوں کو اسی وقت قلعہ میں داخل ہونے کی اجازت دی جب وہ ایک ایک پتھر کر کے قلعہ کو مسمار کر دیں۔ شیخ الاسلام اہل شام کی رفاقت میں بروز سوموار ۳ ربیع الاول سنہ ۶۹۹ھ کو غازان کی ملاقات کے لیے نکلے اور مقام النبک کے نزدیک اس سے ملے۔ شیخ الاسلام نے غازان کے ساتھ بڑے موثر اور پُر زور طریقہ سے بات چیت کی۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۷، نیز ج ۱۴ ص ۸۹ پر مشہور صالح وعابد شخص ابو عبد اللہ محمد بن البالسی (۶۵۰ - ۷۱۸) کی زبانی یہ بات چیت تفصیلاً ذکر کی ہے۔ البالسی ان علماء وقضاۃ میں شامل تھے جو شیخ الاسلام کے ہمراہ غازان سے ملنے گئے تھے۔ البالسی کا بیان ہے کہ شیخ الاسلام نے غازان کو مخاطب کر کے کہا جب کہ ترجمان ساتھ ساتھ آپ کی گفتگو کا ترجمہ کرتا جاتا تھا۔ شیخ نے فرمایا۔

"تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے ساتھ موذن۔ قاضی اور امام بھی ہیں پھر تم بلاد اسلامیہ پر کیوں حملہ آور ہوئے؟ تمہارے باپ دادا کافر تھے تاہم معاہدہ کرنے کے بعد انہوں نے اسلامی ممالک پر حملہ نہیں کیا تھا۔ مگر تم نے عہد باندھ کر بدعہدی کی اور اپنی بات کو پورا نہ کیا۔"

ابو عبد اللہ البالسی بیان کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام نے غازان، قطلوشاہ اور بولائی کے ساتھ جو گفتگو کی اس میں کئی نشیب وفراز آئے۔ مگر شیخ نے حق وصداقت کا دامن (باقی بر ۴۸۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۲) ہاتھ سے نہ چھوڑا اور نہ خدا کے سوا کسی سے ہراساں ہوئے۔ غازان نے ان علماء کو کھانا پیش کیا ابن تیمیہ کے سوا سب نے کھانا کھایا۔ جب آپ سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا۔ میں یہ کھانا کیونکر کھا سکتا ہوں؟ یہ سب لوگوں سے چھینا ہوا مال ہے اور تم نے ناجائز طور پہ لوگوں کے درخت کاٹ کر اسے پکایا ہے۔ غازان نے جب شیخ الاسلام سے دعا کی درخواست کی۔ تو آپ نے یہ دعا فرمائی۔

"اے اللہ اگر غازان تیرے دین کی سربلندی اور نشر و اشاعت کے لیے جنگ کر رہا ہے تو اسے غلبہ عطا کر اور اسے عباد و بلاد کا مالک بنا دے اور اگر حرص اقتدار اور شہرت کے لیے یہ جنگ آزما ہے اور اسلام اور اہل اسلام کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اسے ذلیل کر اسے برباد کر دے اور اس کی جڑ کاٹ ڈال"۔

غازان ہاتھ اٹھا کر آپ کی دعا پہ آمین کہتا جا رہا تھا۔ عبداللہ البالسی کا بیان ہے کہ یہ دعا سن کر ہم اپنے کپڑے سمیٹ رہے تھے کہ جب ابن تیمیہ کو قتل کیا جائے تو ان کے خون سے ہمارے کپڑے آلودہ نہ ہو جائیں۔ جب غازان کے یہاں سے نکلے تو قاضی القضاۃ نجم الدین صعری نے کہا۔

"آپ ہمیں بھی برباد کرنے لگے تھے اور اپنے آپ کو بھی بخدا اب ہم آپ کے ساتھ نہیں چلیں گے" شیخ الاسلام نے فرمایا "بخدا میں بھی آپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتا"۔ چنانچہ یہ سب علماء ایک جماعت کی صورت میں چل دیئے اور شیخ الاسلام چند اصحاب کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ جب غازان کے خواص و امراء کو پتہ چلا تو وہ آپ کی دعا سے برکت حاصل کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔

شیخ الاسلام دمشق تھے اور یہ امرا آکر آپ کے ساتھ ملتے جا رہے تھے۔ چنانچہ جب دمشق پہنچے تو تین صد سوار آپ کے ہم رکاب تھے۔ شیخ البالسی کا بیان ہے کہ میں بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ جو علماء آپ کی رفاقت سے الگ ہو گئے تھے جب راستہ میں پہنچے تو تاتاریوں کی ایک جماعت نے ان سب کا مال و متاع چھین لیا۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۷ پر لکھتے ہیں۔

شیخ الاسلام کی گفتگو سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا اور دمشق میں امن وامان کا فرمان جاری ہو گیا۔ امن کا فرمان جاری کرنے کے دوسرے روز تاتاریوں نے مدرسہ قیمریہ میں ایک دربار منعقد کیا جس کا نام انہوں نے "دیوان الاستخلاص" رکھا اس میں تاتاریوں نے یہ حکم جاری کیا (باقی بر صفحہ ۴۸۴)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

کہ لوگوں نے جو گھوڑے اور ہتھیار اور مال و متاع چھپا کر رکھا ہوا ہے وہ سب لا کر حاضر کر دیں۔
سیف الدین قبجق المنصوری جو قبل ازیں تاتاریوں سے جا ملا تھا حاکم شام قرار پایا۔ المنصوری نے قلعہ دار کو قلعہ حوالہ کرنے کا حکم جاری کیا مگر اس نے انکار کر دیا اور وہ مدافعت پر ڈٹا رہا۔ ربیع الثانی کے نصف میں تاتاریوں نے اپنے ہمنوا معاونین ارمن و کرج وغیرہ سے مل کر لوٹ مار کا آغاز کیا۔ انھوں نے "جامع التوبہ" کو نذر آتش کر دیا اور "الصالحیہ" کو لوٹ کر اس کے مدارس پر دھاوا بولا اور جو علماء وہاں موجود تھے سب کو تہ تیغ کر دیا۔ الصالحیہ کے رہنے والوں میں سے چار سو افراد کو قتل کیا اور چار ہزار کو قیدی بنا لیا۔ جن میں الشیخ ابو عمر کے خاندان کے ستر افراد بھی تھے۔ شیخ ابو عمر امام الموفق مصنف المغنی و المقنع کے بھائی تھے۔
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۰ ربیع الثانی کو بروز جمعرات تاتاری سلطان کو نصیحت کرنے اور ظلم و جور سے روکنے کے لیے نکلے مگر اس کے وزیر سعد الدین اور مشیر حکومت مسلمانی نے جو ایک یہودی زادہ تھا۔ شیخ کو اس سے باز رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوٹ مار کا بازار گرم رہا اور تاتاریوں نے دس ہزار سے زیادہ گھوڑے مسلمانوں سے چھین لیے۔ شہریوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جامع اموی میں قلعہ شکن آلات نصب کر دیئے تا کہ وہاں سے قلعہ پر پتھر پھینکے جائیں۔ تاتاریوں نے مسجد میں داخل ہو کر اس کے دروازے بند کر دیئے اور آس پاس کے بازاروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ مورخہ ۱۹ جمادی الاولی کو غازان دمشق میں بولائی کے زیر قیادت ساٹھ ہزار جنگجو چھوڑ کر عراق کے راستہ واپس لوٹ گیا۔
تاتاری قلعہ کو فتح نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب غازان اور اس کا نائب قطلوشاہ وہاں سے چلے گئے تو قلعہ والوں نے مسجد پر حملہ کر کے قلعہ شکن آلات کو توڑ پھوڑ ڈالا اور تاتاریوں کے بعض معاونین کے ساتھ واپس قلعہ میں لوٹ آئے۔ تاتاریوں کے اک احباب و انصار کا سرخیل محمد بن محمد بن احمد بن المرتضی تھا اس کو وہ شریف القمی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ قتل و غارت کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔
علم الدین البیرزالی نے ابن المنجا سے نقل کیا ہے کہ دمشق سے جو مال غازان کے خزانہ میں پہنچا اس کی تعداد چھتیس لاکھ درہم تھی۔ ٹیکس اور رشوت اس میں شمار نہیں (باقی بر صفحہ ۴۸۵)

پر رہنے والے شیعہ نے مسلمانوں کے گھوڑے، اسلحہ اور قیدیوں کو پکڑ کر فرنگ اور قبرص کے عیسائیوں کے پاس فروخت کر دیا۔ جو سپاہی وہاں سے گذرتا اس کو پکڑ لیتے۔ یہ مسلمانوں کے حق میں سب دشمنوں سے زیادہ ضرر رساں تھے۔

اس پہاڑ پر رہنے والے بعض شیعہ نصاریٰ کے علمبردار تھے۔ ان سے جب دریافت کیا جاتا کہ اہل اسلام اور نصاریٰ میں سے بہتر کون ہے؟ تو وہ کہتے "نصاریٰ"۔ پھر پوچھا جاتا تمہارا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۴) شیخ المشائخ کو اس میں سے چھ لاکھ درہم ملے تھے۔ بدنصیب خواجہ طوسی کے حصہ میں ایک لاکھ درہم آئے۔ بدکاری و شراب خواری کا دور چلنے لگا۔ سیف الدین تبجق کی روزانہ آمدنی ایک ہزار درہم تھی۔ مدارس کے اوقاف میں سے وہ جو کچھ چھینا کرتا تھا وہ اس پر مزید ہے

تاتاری سپہ سالار بولائی کے خیمہ میں بہت سے قیدی تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ آغاز رجب میں بولائی کے یہاں گئے۔ اور قیدیوں کو رہا کرنے کے بارے میں اس کے ساتھ بات چیت کی۔ بولائی نے تعمیل ارشاد کر دی۔ شیخ الاسلام نے تین دن وہاں قیام کیا اور پھر واپس لوٹ آئے۔

اسی اثنا میں یہ خبر پہنچی کہ مصری لشکر عازم دمشق ہے۔ چنانچہ بولائی غازان کی فوج کو لے کر دمشق سے چل دیا اور وہاں کوئی حاکم بھی موجود نہ رہا۔ بولائی کے کوچ کی خبر سن کر امیر ارجواش قلعہ سے نکلا اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مدد سے فصیل شہر کی حفاظت کے لیے ایک فوج مرتب کی۔

شیخ الاسلام ہر رات فصیل کے ارد گرد چکر لگاتے۔ اور آیات قرآنیہ تلاوت کر کے لوگوں کو جہاد و قتال اور صبر و شکر کی ترغیب دلایا کرتے تھے۔

سو دن تک خطبہ میں غازان کا نام لیا جاتا تھا۔ اب پھر سے خطبہ میں سلطان مصر کا نام لیا جانے لگا۔

شیخ الاسلام نے شہر میں جو شراب خانے اور قحبہ خانے تھے سب بند کرا دیے۔ نائب دمشق جمال الدین آقوش الافرم شامی لشکر سمیت مصر سے واپس لوٹا اس کے بعد باقی لشکر بھی مصر سے دمشق پہنچ گیا۔ یہ عظیم مصیبت وسط شعبان ۶۹۹ھ کو ختم ہوئی۔

حشر کن کے ساتھ ہوگا؟ تو وہ کہتے "نصاریٰ کے ساتھ"۔ مسلمانوں کے بعض شہر بھی ان کے زیر تسلط تھے۔ بایں ہمہ جب بعض سلاطین نے ان کے خلاف جنگ آزما ہونے میں بارے میں مجھ سے فتویٰ چاہا تو میں نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔ چنانچہ ہم وہاں پہنچے اور میرے پاس ان کی ایک جماعت حاضر ہوئی۔ ان کے ساتھ ہم نے کئی مرتبہ مناظرہ کیا جس کی تفصیلات طوالت کی موجب ہوں گی۔ جب مسلمانوں نے وہ علاقہ فتح کر لیا اور شیعہ ہر طرح ان کے قابو میں آگئے تو میں نے شیعہ کو قتل کرنے اور قیدی بنانے سے روکا۔ ہم نے ان کو متفرق مقامات پر بھیج دیا تاکہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو پائیں۔ اس کتاب میں میں نے شیعہ کی ضلالت وجہالت سے متعلق جو کچھ ذکر کیا ہے وہ ان معلومات کے مقابلہ میں مشتے نمونہ از خروارے کا مصداق ہیں جو میں شیعہ کے بارہ میں رکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں شیعہ میں اور بھی بہت سے نقائص ہیں جن کو میں بھی نہیں جانتا۔

شیعہ کے ساتھ ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہم کتاب ہذا کے مصنف ابن المطہر اور اس کے نظائر و امثال کے سامنے ان کا وہ سلوک پیش کرتے ہیں جو انہوں نے امت کے سلف اور خلف کے ساتھ روا رکھا۔ شیعہ کا یہ کمال کیا کم ہے کہ انہوں نے انبیاء کے بعد کرۂ ارضی پر بسنے والوں میں سے افضل الاولین والآخرین یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم پر افترا پردازی کا بیڑا اٹھایا اور ان کے نیک اعمال کو افعال قبیحہ ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دوسری طرف فرقہائے ضالّہ کے سرخیل یعنی شیعہ کو جو کئی فرقوں میں منقسم ہیں مثلاً امامیہ، زیدیہ اور غالی شیعہ وغیرہ۔ اس کائنات ارضی کی چیدہ و برگزیدہ مخلوق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ خدا جانتا ہے کہ جتنے فرقے بھی اسلام کی طرف منسوب ہیں ان میں کوئی فرقہ بھی بدعت و ضلالت کے باوجود شیعہ سے بڑھ کر جاہل، کاذب اور ظالم نہیں ہے اور نہ ہی کفر و فسق اور عصیان سے قریب تر اور ایمانی حقائق سے بعید تر ہے۔

شیعہ پوری امت کی تکفیر و تضلیل کرتے اور کہتے ہیں کہ صرف شیعہ ہی حق پر ہیں۔ اور یہ ضلالت پر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ گویا شیعہ سب بنی نوع انسان سے اعلیٰ و اولیٰ ہیں شیعہ کی مثال یوں ہے جیسے کوئی شخص ایسی جگہ جائے جہاں بہت سی بکریاں ہوں۔ اور

بکریوں کے مالک سے کہے کہ قربانی کے لیے بہترین بکری دو۔ بکریوں کا مالک یوں کہے کہ ایک لنگڑی لولی بیمار بکری کی جانب اشارہ کر کے کہے کہ یہ سب سے عمدہ بکری ہے اس کے سوا کوئی بکری قربانی کے لائق ہی نہیں۔ بلکہ باقی بکریاں واجب القتل خنزیر ہیں۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"جس شخص نے مومن کو منافق سے بچایا۔ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کے گوشت کو جہنم کی آگ سے بچائے گا"۔

روافض یا جاہل ہوتے ہیں اور یا منافق۔ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ کوئی رافضی یا جہمی منافق نہ ہو یا آنحضور کے ارشادات سے جاہل نہ ہو۔ شیعہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو آنحضور کے اقوال کو جانتا اور ان کو مانتا بھی ہو۔ ارشادات حضور سے شیعہ کا فرار اور آنحضور پر افترا پردازی صرف اسی شخص سے پوشیدہ رہتی ہے جو جہل وہوا اس حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ شیعہ مصنفین اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کے اکثر اقوال صریح کذب کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

کذب دانی کے باوصف وہ میدان تصنیف میں صرف اس لیے اترتے ہیں کہ ان کے اقتدار کا سکہ جاری رہے۔ ابن المطہر کا دامن بھی اس تہمت سے ملوث ہے مگر اس نے یہ زحمت اپنے اتباع کو متاثر کرنے کے لیے گوارا کی۔ اگر کوئی مصنف جانتا ہے کہ اس کی بات غدر ہے اور اس کے باوجود اسے من جانب اللہ قرار دیتا ہے تو وہ علماء یہود کی جنس میں سے ہے جن کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

یَکْتُبُوْنَ الْکِتَابَ بِاَیْدِیْہِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (سورہ البقرہ - ۷۹)

(کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے)

اور اگر وہ اسے حق سمجھتا ہے تو یہ اس کی جہالت وضلالت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

جب سلف صالحین نے یہ بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے لیے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا ہے تو شیعہ نے اس کے برعکس ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ آنحضور نے صحیح

حدیث میں فرمایا ہے۔

لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ (میرے صحابہ کو گالی نہ دو)

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ صحابہ کو گالی دینا حرام ہے۔ استغفار کا حکم اور گالی دینے کی مخالفت یہ دونوں عام حکم ہیں کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

"مسلم کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے" (بخاری ومسلم)

قرآن پاک میں ارشاد فرمایا۔

"اے ایمان والو! ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ اس سے بہتر ہو عورتیں بھی دوسری عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اپنے آپ (اپنے بھائی بندوں) کو طعن نہ دو اور نہ نام الٹ دو"۔ (سورۃ حجرات۔۱۱)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ (سورۃ التوبہ۔۵۸)

اور بعض لوگ صدقات کے بارے میں آپ کو طعن دیتے ہیں۔

ایک مسلم دعا کے دوران جب کہتا ہے رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (سورۃ الحشر۔۱۰)

تو اس سے مراد وہ مومن ہوتا ہے جو گذشتہ زمانہ میں گذر چکا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ غلط تاویل کر کے وہ سنت کی خلاف ورزی کر چکا ہو یا کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہو۔ بہر کیف گناہ کا مرتکب ہونے کے باوجود وہ آیت کے عموم میں داخل رہے گا اور اس سے خارج نہ ہوگا اگرچہ اس کا شمار بہتر فرقوں میں ہی کیوں نہ ہوتا ہو اس لیے کہ ہر فرقہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو کافر نہیں ہوتے بلکہ وہ مومن ہوتے ہیں اگرچہ گمراہی وگنہ گاری کے باعث عاصی مومنین کی طرح وعید کے مستحق ہوا کرتے ہیں۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو اپنی امت سے خارج نہیں کیا اور نہ ہی انھیں دائمی جہنمی قرار دیا ہے بلکہ وہ آپ کی امت میں شامل ہیں۔

مذکورہ صدر قاعدہ ایک عظیم اصل ہے جسے ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے کہ سنت کی جانب منسوب بعض فرقوں میں خوارج اور روافض کی قسم کی بدعات پائی جاتی ہیں۔ یہ بات بھولنے نہ پائے کہ اصحاب رسول مثلاً حضرت علی ان خوارج کی تکفیر نہیں کرتے تھے جن کے خلاف وہ جنگ آزما تھے۔ خوارج نے جب پہلی مرتبہ حروراء نامی مقام پہ جمع ہو کر حضرت علی کے خلاف خروج کیا تو حضرت علی نے انھیں مخاطب کرکے فرمایا۔

"ہم تو مساجد سے نہیں روکتے اور نہ مال غنیمت کے حصہ سے محروم کرتے ہیں"۔

پھر حضرت علی نے ابن عباس کو خوارج کی طرف بھیجا اور آپ نے ان سے مناظرہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوارج میں سے آدھے حضرت علی کی طرف لوٹ آئے جو باقی بچے ان کے خلاف آپ نے جنگ لڑی اور ان کو زیر کیا تاہم نہ ان کی اولاد کو قیدی بنایا نہ ان کے مال کو مال غنیمت قرار دیا اور نہ ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جو صحابہ مسیلمہ جیسے مرتدین سے کیا کرتے تھے۔

قیس بن مسلم طارق بن شہاب سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت علی نہروان (واسط و بغداد کے درمیان ایک بڑا قصبہ جہاں حضرت علی نے خوارج سے جنگ لڑی تھی) کی لڑائی سے فارغ ہوئے تو میں آپ کے ہمراہ تھا۔ لوگوں نے دریافت کیا کیا خارج مشرک ہیں؟ آپ نے فرمایا "وہ شرک سے تو بھاگے تھے"۔ لوگوں نے پوچھا کیا وہ منافق ہیں؟ فرمایا۔ "منافق تو خدا کو بہت کم یاد کیا کرتے ہیں"۔ لوگوں نے دریافت کیا آخر خوارج ہیں کون؟ حضرت علی نے جواباً فرمایا۔ "انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی تھی اور ہم نے ان سے جنگ لڑی"۔

حضرت علی نے واضح کر دیا کہ خوارج مومن ہیں کافر و منافق نہیں۔ اس سے ابواسحٰق اسفرائنی اور اس کے اتباع کی تردید ہوتی ہے۔ جن کا قول ہے کہ جو فرقہ ہماری تکفیر کرتا ہے ہم اس کو کافر قرار دیں گے۔ اس لیے کہ کفر کسی انسان کا حق نہیں بلکہ خدا کا حق ہے۔ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ تکذیب کرنے والے کی تکذیب کرے اور جو اس کی بیوی سے بدکاری کا ارتکاب کرے وہ اس کی بیوی سے زنا کرے کیونکہ یہ حرام ہے۔ فرض کیجئے ایک عیسائی

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی بکتا ہے تو کیا ہم حضرت مسیح کو گالی دینے پر تل جائیں۔ روافض اگر شیخین کی تکفیر کرتے ہیں تو ہم حضرت علی کی تکفیر نہیں کر سکتے۔ سفیان جعفر بن محمد سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد امام باقر سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی نے جنگ جمل یا صفین کے دن ایک شخص کو سنا جو بہت مبالغہ آمیزی سے کام لے رہا تھا۔ حضرت علی نے یہ سن کر فرمایا۔

"وہی بات کہو جو اچھی ہو ہمارے مخالفین نے سمجھا تھا کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی۔ ادھر ہم نے یہ خیال کیا کہ وہ باغی ہیں۔ اس لیے ہم ان کے خلاف جنگ آزما ہوئے"۔

مکحول روایت کرتے ہیں کہ اصحاب علی نے رفقاء معاویہ کے بارے میں پوچھا جو مقتول ہو چکے تھے کہ وہ کون ہیں؟ حضرت علی نے جواباً فرمایا "وہ مومن ہیں"

عبد الواحد بن ابی عون کہتے ہیں کہ حضرت علی اشتر نخعی کے ساتھ ٹیک لگائے جنگ صفین کے مقتولوں کے بارے میں گذرے۔ اچانک دیکھا کہ حابس[1] یمانی مقتول پڑے ہیں۔ اشتر نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور کہا حابس یمانی مقتولوں میں پڑے ہیں اور ان پر حضرت معاویہ کی علامت ہے (یہ جنگ میں رفقائے معاویہ کے ساتھ تھے) بخدا یہ بڑے پکے مومن تھے۔ یہ سنکر حضرت علی نے فرمایا "وہ اب بھی مومن ہیں"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر سے مروی ہے کہ انھوں نے منبر پر کہا۔ نبی کریم وحی کی بنا پر غلطی سے محفوظ رہتے تھے اور میرے سامنے شیطان حائل ہو جاتا ہے۔ لہذا اگر میں سیدھا چلوں تو میری مدد کیجئے اور اگر سیدھی راہ سے بھٹک جاؤں تو مجھے جادۂ مستقیم پر ڈال دو۔ ایسے شخص کی خلافت کیونکر درست ہوگی جو رعیت سے سیدھا کرنے کی فرمائش کر رہا ہو"۔

ہم کہتے ہیں کہ رافضی مصنف جس بات کو موجب طعن قرار دے رہا ہے اسی سے

---

[1] حابس بن ربیعۃ الیمانی بڑے عابد و زاہد صحابی تھے۔ انھوں نے جنگ صفین میں حضرت معاویہ کا ساتھ دیا اور اسی جنگ میں مقتول ہوئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ میں ان کا ترجمہ نقل کیا ہے ۱۲

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ اقتدار کے طالب اور ظالم نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اگر میں اللہ و رسول کی اطاعت پر قائم رہوں تو میری مدد کیجئے اور اگر اس سے بھٹک جاؤں تو جبراً مجھے سیدھی راہ پر لائیے"۔

حضرت ابوبکر نے یہ بھی فرمایا۔ کہ "جب تک میں خدا کی اطاعت کرتا رہوں تم میرے مطیع رہو"۔

جو شیطان حضرت ابوبکر کی راہ میں حائل ہوا کرتا تھا وہ دوسرے کے کام میں بھی دخل اندازی کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی وارد ہوا ہے۔ "ہر شخص کے ساتھ دو ساتھی ہر وقت لگے رہتے ہیں ایک جنوں میں سے اور ایک ملائکہ سے۔ اور پھر یہ کہ شیطان انسان کے رگ و پے میں خون کی طرح جاری و ساری ہوتا ہے۔ حضرت صدیق کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ آپ معصوم نہیں۔

خلیفہ کی شرعی حیثیت

حضرت صدیق کا ارشاد بجا ہے اس لیے کہ خلیفہ اپنی رعایا کا مالک و آقا نہیں ہوتا کہ وہ ان سے بے نیاز ہو جائے بلکہ رعایا برّ و تقویٰ کے کاموں میں خلیفہ کے ساتھ تعاون کرتی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ امام صلوٰۃ اگر نماز کے ارکان ٹھیک ادا کرتا ہے تو مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں اور اگر وہ بھول جاتا ہے تو اس کی رہنمائی اسے راہ راست پر لایا جاتا ہے۔

اس کے جواب میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی نے اپنی رعیت سے حضرت ابوبکر کی نسبت زیادہ مدد طلب کی اور انھیں مدد طلب کرنے کی ضرورت بھی حضرت صدیق کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ نیز یہ کہ حضرت ابوبکر نے اپنی رعیت کی زیادہ رہنمائی کی اور ان کی رعیت بھی ہمیشہ ان کی مطیع فرمان رہی۔ اور رعیت کو یہ موقع کم ہی حاصل ہوا کہ انھوں نے کسی وقت حضرت ابوبکر کی رہنمائی کی ہو، بخلاف ازیں حضرت علی اس حد تک اپنی رعایا کو جادۂ مستقیم پر نہ لا سکے اور ان کی رعیت چنداں اطاعت کیش بھی نہ تھی۔

جب لوگ کسی مسئلہ میں حضرت ابوبکر سے اختلاف کرتے تو آپ حجت و برہان پیش کر کے

ان کو قائل کر لیتے۔ حضرت عمر نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ آزما ہونے کے مسئلہ میں حضرت ابوبکر سے اختلاف کیا تھا مگر آپ نے دلیل کے ذریعہ ان کو قائل کر لیا۔ حضرت ابوبکر جب رعیت کو کسی بات کا حکم دیتے تو وہ اس کی اطاعت کیا کرتے تھے۔

حضرت علی نے امہات الاولاد (وہ لونڈیاں جو صاحب اولاد ہو جائیں) کے بارے میں فرمایا کہ میں اس ضمن میں حضرت عمر کے قول سے متفق ہوں کہ ان کو فروخت نہ کیا جائے۔

پھر آپ نے فروخت کرنے کا حکم دے دیا تو آپ کے قاضی عبیدہ سلمانی نے کہا۔ "حضرت عمر کے ساتھ متفقہ رائے آپ کے انفرادی قول سے ہمیں زیادہ عزیز ہے"

حضرت علی فرمایا کرتے تھے۔

"خلفاء سابقین کے زمانہ میں تم جس طرح فیصلے کیا کرتے تھے اب بھی کرتے رہو۔ میں اختلاف کو ناپسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ لوگ یا تو ایک جماعت بن جائیں یا میں بھی اپنے اصحاب و رفقاء کی طرح موت سے ہمکنار ہو جاؤں"

حضرت علی کی رعایا اکثر آپ کی مخالفت کیا کرتی تھی۔ آپ بھی ان کی مخالفت کرتے پھر آپ کو پتہ چلتا کہ ان کی رائے درست ہے۔ حضرت حسن نے حضرت علی کو مشورہ دیا تھا کہ مدینہ سے باہر نہ نکلیں اور نہ معاویہ کو معزول کریں۔ کوئی عقلمند آدمی اس سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ حضرت ابوبکر و عمر کے زمانہ میں حالات جس طرح منظم تھے یہ انتظام و انصرام حضرت علی کے عہد خلافت میں مفقود تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر نے کہا میری بیعت واپس کر دو میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ حضرت علی تم میں موجود ہیں۔ اگر ابوبکر کی خلافت برحق تھی تو اس کا واپس کرنا گناہ تھا اور اگر مبنی برحق نہ تھی تو ان کی خلافت باطل ٹھہری"۔

ہم کہتے ہیں یہ روایت صریح کذب اور بے سند ہے۔ تاریخ میں ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ کے دن فرمایا تھا۔ "ابو عبیدہ یا عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو"۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ "بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم سب سے

بہتر ہیں بنی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے"۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر حضرت ابوبکر کا یہ قول صحیح ہے تو آپ نے اپنے آخری وقت میں حضرت علی کو خلیفہ کیوں نہ مقرر کیا؟ خلیفہ و امام کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ امامت و خلافت کی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو جائے۔ یہ ایک قسم کا انکسار بھی ہے جس سے اس کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عمر کا قول ہے کہ ابوبکر کی خلافت ایک عاجلانہ اقدام تھا جس کی شر سے خدا نے بچا لیا اگر کوئی اور شخص اس کا مرتکب ہو تو اسے قتل کر دو"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ قول افترا پردازی اور کذب کا آئینہ دار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ "حضرت صدیق کی بلا مہلت و تاخیر اس لیے عمل میں آئی تھی کہ آپ پہلے سے مقرر شدہ تھے"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

ابوبکر نے کہا "اے کاش! میں نے آنحضور سے دریافت کیا ہوتا کہ کیا انصار کا بھی خلافت میں کوئی حصہ ہے"؟

ہم کہتے ہیں یہ صریح کذب ہے۔ مزید براں یہ شیعہ کے اس دعوی کے خلاف ہے کہ آنحضور نے بہ نص صریح حضرت علی کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اس لیے کہ جب نص صریح کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہو چکے تھے تو پھر انصار کا کیا حق باقی رہا؟

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

ابوبکر نے عند الموت کہا "اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی اور میں اینٹ میں ایک تنکا ہوتا"۔ حالانکہ اہل سنت یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ قریب الموت شخص اپنی آخری آرامگاہ جنت یا جہنم کو دیکھ لیتا ہے"۔

حضرت ابوبکر صدیق پر افتراء

ہم جواباً کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہرگز یہ منقول نہیں بلکہ حضرت ابوبکر کی وفات

کے وقت جب حضرت عائشہ نے کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا تھا۔

لَعَمْرُكَ مَا يُغْنِي الثَّرَاءُ عَنِ الْفَتَى   إِذَا حَشْرَجَتْ يَوْمًا وَضَاقَ بِهَا الصَّدْرُ

(تمہاری زندگی کی قسم دولت اس وقت کسی کام نہیں جب آدمی آخری وقت میں غرغرانے لگے اور سانس سینہ میں تنگ ہو جائے)

حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر اپنے چہرہ سے کپڑا اٹھایا اور فرمایا۔ اس طرح نہیں بلکہ یوں کہو"

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ (سورہ ق)

اور سکرات موت سچ مچ طاری ہو گئے یہ وہی ہیں جس سے تو منہ موڑا کرتا تھا۔

باقی رہا حضرت ابوبکر کا یہ قول کہ "اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی" تو آپ نے یہ حالت صحت میں فرمایا تھا نہ کہ مرض الموت میں۔ یہ قول ائمہ سلف کی ایک جماعت سے منقول ہے انہوں نے خوف الٰہی کے باعث یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

"بخدا میں چاہتا ہوں کہ میں (انسان ہونے کے بجائے) ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا"۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"اگر مجھے جنت و دوزخ کے درمیان کھڑا کر کے کہا جاتا کہ تم ان دونوں میں سے کسی ایک میں جانا چاہتے ہو یا راکھ ہونے کو پسند کرتے ہو تو میں راکھ ہو جانے کو ترجیح دیتا"۔

امام ذہبی فرماتے ہیں۔

"حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ میں اللہ کے حضور میں اپنے ظاہری و باطنی عیوب ونقائص کا شکوہ کرتا ہوں"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر نے کہا اے کاش! کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے دن میں دو شخصوں میں سے کسی ایک

کی بیعت کر کے اس کو امیر بنا دیتا اور خود وزیر بن جاتا"۔

ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات ازرہ فروتنی و انکسار اور خوف خدا کے پیش نظر کہی تھی اگر اس حالت میں ان کے پاس حضرت علی کی خلافت سے متعلق رسول خدا کی کوئی نص صریح ہوتی تو حضرت علی کو ترجیح دیتے اور ان دو آدمیوں کا نام نہ لیتے۔ اس لیے کہ حضرت علی کی خلافت سے متعلق نص صریح کے ہوتے ہوئے جیسا کہ تمہارا خیال ہے ان دو اشخاص کو خلیفہ بنانے سے حضرت ابو بکر کی امامت ضائع ہو جاتی اور آپ ایک ظالم (جو بلا استحقاق خلیفہ بن گیا) کے وزیر ٹھہرتے اور اس طرح دنیا کے عوض اپنی آخرت فروخت کر دیتے۔ حالانکہ جو شخص اپنے اندر خوف خدا رکھتا ہے وہ ہرگز ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت کی حالت میں متعدد بار فرمایا۔ اسامہ رضی کا لشکر بھیج دو خدا اس پر لعنت کرے جو اس لشکر میں شامل نہ ہو۔ تینوں اصحاب اسامہ کے ساتھ تھے مگر ابو بکر نے عمر کو اس میں شرکت کرنے سے روک دیا"۔

سیرت رسول سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ یہ کذب ہے۔ آنحضور حضرت ابو بکر کو جیش اسامہ میں کیونکر بھیج سکتے تھے۔ جبکہ مرض وفات میں آپ نے انھیں امام صلوٰۃ مقرر کیا تھا اور نقل متواتر کے مطابق آپ نے بارہ دن نماز بھی پڑھائی۔ سوموار کے دن علی الصبح آنحضور نے پردہ ہٹا کر دیکھا کہ لوگ حضرت ابو بکر کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ کا چہرہ مبارک اس وقت یوں چمک رہا تھا جیسے قرآن کا ورق۔ آپ اس سے بہت خوش ہوئے۔ پھر ایسی حالت میں ان کو لشکر اسامہ کے ساتھ کیسے روانہ کر سکتے تھے؟

جیش اسامہ کو آنحضور کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر نے روانہ کیا تھا اور حضرت اسامہ سے حضرت عمر کو لشکر کے ساتھ نہ بھیجنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی ایک مدبر آدمی تھے جن کی مدینہ میں اس وقت شدید ضرورت تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت

ابوبکر کو لشکر بھیجنے سے روکا تھا۔ مگر حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ جو جھنڈا آنحضور اپنے ہاتھ سے باندھ چکے ہیں میں اسے کھول نہیں سکتا"۔

شیعہ کا یہ قول کہ آنحضور نے حضرت ابوبکرؓ کو کبھی کوئی منصب عطا نہ کیا

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"آنحضور نے ابوبکرؓ کو کبھی کوئی خدمت تفویض نہیں کی تھی۔ البتہ عمرو ابن العاص اور اسامہ کو بعض کاموں پر مامور فرمایا تھا۔ جب سورۃ توبہ دے کر مکہ روانہ کیا تو بحکم وحی آپ کو واپس بلا لیا"۔

ہم کہتے ہیں یہ جھوٹ کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ یہ ایک قطعی بات ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حضرت ابوبکر کو امیر الحج مقرر کیا تھا جو آپ کی عظیم خصوصیت ہے۔ امام صلوٰۃ مقرر کرنا بھی حضرت ابوبکر کی خصوصیت ہے جس میں آپ منفرد ہیں۔ اس حج میں حضرت علی آپ کے ماتحت تھے۔ حضرت علی جب حضرت ابوبکر سے جا کر ملے تو آپ نے دریافت فرمایا کیا امیر ہو کر آئے ہیں یا محکوم؟ حضرت علی نے جواباً فرمایا محکوم! اس حج میں حضرت علی دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت ابوبکر کی اقتدا میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ البتہ حضرت علی کی خصوصیت سورہ توبہ کے احکام کو پہنچانا اور پھیلانا ہے۔[۱]

[۱] اس کے دو سبب تھے جن کی جانب قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

(۱) اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ سورہ توبہ میں مشرکین کے ساتھ باندھے ہوئے عہود سابقہ کو توڑنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ عربوں کے یہاں دستور ہے کہ عہد شکنی کا اعلان حاکم خود کرتا ہے یا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار۔ لہٰذا رشتہ دار ہونے کی بنا پر یہ خدمت حضرت علی کو تفویض ہوئی۔

(۲) اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سورہ توبہ میں اللہ تعالےٰ نے حضرت صدیق کی مدح وستائش فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ (باقی بر صفحہ ۴۹۷)

جہاں تک حضرت عمرو بن عاص کے واقعہ کا تعلق ہے آنحضور نے غزوۂ ذات سلاسل میں ان کو بنی عذرہ کی جانب بھیجا تھا۔ یہ حضرت عمرو بن العاص کے ننہال کا قبیلہ تھا اس لیے آنحضور متوقع تھے کہ یہ لوگ آپ کی اطاعت اختیار کرکے اسلام قبول کرلیں گے۔ پھر ان کے بعد حضرت ابو عبیدہ کو روانہ کیا حضرت ابوبکر و عمر بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت ابو عبیدہ کو مخاطب کرکے فرمایا "ایک دوسرے کی اطاعت کریں اور آپس میں اختلاف پیدا نہ کریں"۔ یہ سب حضرات عمرو بن العاص کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے۔ حالانکہ سب لوگ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ یہ اکابر حضرت عمرو بن عاص سے افضل ہیں یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ کسی مصلحت کے پیش نظر افضل کی موجودگی میں مفضول کو امیر بنانا جائز ہے۔ جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ کو ان کے والد کا انتقام لینے کے لیے امیر لشکر مقرر کیا تھا۔

شیعہ مصنف کا قول ہے۔

"ابوبکر نے چور کا بایاں ہاتھ کاٹ ڈالا انھیں اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ چوری کی سزا میں دایاں (بقیہ حاشیہ ص۴۹۶) ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (سورہ توبہ ۴۰) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ان فضائل و مناقب کا اظہار ان کے بھائی حضرت علی کے ذریعہ ہو۔ ہمیں روافض سے ایسے لوگوں کا علم ہے کہ اگر قرآن کریم میں یہ آیت نہ ہوتی تو وہ اسلام چھوڑ کر یہودی یا مجوسی ہو جاتے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لے یہ بات حضرت صدیق کے فضائل میں شمار ہوتی ہے کہ آنحضور جہاں بھی ہوتے حضرت صدیق کو شرف رفاقت حاصل ہوا کرتا تھا۔ اس لیے کہ زندگی میں حضرت صدیق آپ کے پہلے وزیر اور بعد از وفات خلیفۂ اول تھے۔ ہجرت کرتے وقت حضرت صدیق آپ کے ہمراہ تھے۔ جنگ بدر میں جو سائبان لگایا گیا تھا اس میں بھی حضرت ابوبکر آپ کے رفیق تھے۔ سنہ۹ھ میں امیر الحج مقرر ہوئے آنحضور کی جگہ شرف امامت سے مشرف ہوئے اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ صحابہ میں عظیم رتبہ پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں غزوۂ فزارہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو امیر لشکر مقرر کیا تھا دیکھئے روایت حضرت سلمہ بن اکوع المنتقی حدیث نمبر ۲۸۳۳ بحوالہ مسلم و مسند احمد و ابو داؤد ۱۲

ہاتھ کاٹا جاتا ہے"۔

ہم کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ جھوٹی بات اور کیا ہو گی کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اسے جائز تصور کرتے ہوں اس لیے کہ قرآن میں صراحۃً دست راست کی تصریح نہیں ہے۔ البتہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یہ تصریحاً مذکور ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "فَاقْطَعُوا اَیْمَانَہُمَا"۔

آنحضورؐ کا تعامل بھی یہی ہے مگر اس کی کیا دلیل کہ حضرت ابوبکرؓ نے چور کا بایاں ہاتھ قطع کیا تھا۔ اور اس کی اسناد کہاں ہے؟ ہمارے پاس علماء آثار کی تصانیف موجود ہیں مگر یہ بات کسی میں بھی مذکور نہیں۔ اختلافی مسائل کے بارے میں جو کتب تحریر کی گئی ہیں ان میں بھی اس روایت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ حالانکہ سب علماء حضرت ابوبکرؓ کی عظمت و فضیلت کے قائل ہیں۔

رافضی قلمکار لکھتا ہے۔

"ابوبکرؓ نے فجاءۃ سُلمی کو زندہ جلا دیا تھا حالانکہ یہ شرعاً ممنوع ہے"۔

ہم کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے بھی زنادقہ کو نذر آتش کر دیا تھا۔ یہ تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے۔ روایات صحیحہ میں مذکور ہے کہ حضرت علیؓ کی خدمت میں زنادقہ کی ایک جماعت کو پیش کیا گیا تو آپ نے انھیں جلا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو فرمایا "اگر علیؓ کی جگہ میں ہوتا تو ہرگز یوں نہ کرتا اس لیے کہ آنحضورؐ نے کسی کو

لے اس شخص کا اصلی نام ایاس بن عبداللہ بن عبد یالیل تھا یہ فتنۂ ارتداد کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ "میں مسلم ہوں اور مرتدین کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں مجھے سواری عنایت فرمائیے اور میری مدد کیجئے"۔ حضرت ابوبکرؓ اسے سواری اور اسلحہ جنگ عطا کیا۔ اس نے قبیلہ بنی سلیم و عامر و ہوازن کے مسلمانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے طریفہ بن حاجز کو اسے سزا دینے کے لیے بھیجا چنانچہ طریفہ نے اس کے ہمراہیوں سمیت اسے ٹھکانے لگا کر مسلمانوں کو اس کے شر سے بچا لیا۔

عذاب خداوندی میں مبتلا کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ ہمیں انھیں قتل کردینا جیسا کہ آنحضور کا فرمان ہے "جو اپنے دین کو بدل ڈالے اسے قتل کردو"۔

شیعہ مضمون نگار رقمطراز ہے۔

"ابوبکرؓ اکثر شرعی احکام سے نابلد تھے۔ کلالہ کی میراث کا مسئلہ بھی آپ کو معلوم نہ تھا۔ اسی لیے اس کے بارے میں فرمایا "میں اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ اگر درست ہوا تو خدا کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہوا تو شیطان کی طرف سے ہے"۔ اس سے ابوبکر کی کوتاہی کا ثبوت ملتا ہے"۔

حضرت ابوبکر پر شیعہ کا بہتان کہ آپ شرعی مسائل سے آگاہ نہ تھے

ہم کہتے ہیں یہ عظیم بہتان ہے۔ عہد نبوت میں حضرت ابوبکر کے سوا کوئی شخص فتوی نہ دیتا تھا اور نہ فیصلہ صادر کیا کرتا تھا۔ آنحضور جملہ امور میں حضرت ابوبکر و عمر سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر شرعی مسائل سے نابلد ہوں؟

منصور بن عبدالجبار السمعانی نے اس بات پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر اعلم الامت تھے۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں جب بھی کسی بات میں کچھ اختلاف پیدا ہوا تو آپ نے کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا حل تجویز کیا۔

چنانچہ آپ نے آنحضور کی وفات اور مقام تدفین پر روشنی ڈال کر صحابہ کو ایمان پر ثابت قدم رکھا۔ اور اس پر آیت قرآنی سے استشہاد کیا۔ حضرت صدیق نے واضح کیا کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ آزما ہونا شرعاً ضروری ہے۔ آپ نے بدلائل ثابت کیا کہ خلافت خاندان قریش میں محدود رہنی چاہیئے۔ اگر حضرت ابوبکر نماز اور حج کے مسائل سے کما حقہ باخبر نہ ہوتے تو آپ انھیں امیر الحج اور امام صلوٰۃ مقرر نہ فرماتے۔ حالانکہ حج کے مسائل عبادات میں سب سے مشکل ہیں پھر یہ کہ آپ نے حج اور نماز میں کسی صحابی کو بھی اپنا نائب مقرر نہیں کیا تھا۔ آنحضور نے زکوٰۃ کے بارے میں جو کتاب مرتب کرائی تھی حضرت انس

نے وہ حضرت ابوبکر سے حاصل کی تھی۔ زکوٰۃ کے بارے میں جس قدر احادیث روایت کی گئی ہیں یہ ان سب میں صحیح تر ہے۔ فقہاء نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ دوسرے لوگوں کے عین برخلاف کسی شرعی مسئلہ میں بھی حضرت ابوبکر سے غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی۔[1]

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت ابوبکر کلالہ کی میراث سے آگاہ نہ تھے"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہی بات آپ کے عظیم عالم ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے کلالہ کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا کہ کلالہ وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو نہ والد جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔ دادا کے بارے میں فیصلہ کرنے والے حضرت عمر تھے۔ حضرت ابوبکر دادا کو باپ کی مثل قرار دیتے ہیں یہ متعدد صحابہ کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور بعض شافعیہ وحنابلہ بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں دلیل کے اعتبار سے یہی مسلک قوی تر ہے امام شافعی اور احمد بن حنبل نے اس ضمن میں زید بن ثابت کے قول کو اختیار کیا ہے۔ حضرت علی نے دادا کے بارے میں جو نظریہ اختیار کیا ہے ائمہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ جب اس بات پر مسلمانوں کا اجماع قائم ہو چکا ہے کہ جدّ اعلیٰ چچا کی نسبت اولیٰ ہے تو جدّ ادنیٰ بھائیوں سے اولیٰ ہو گا۔ جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ بھائی دادا کے شریک ہوتے ہیں ان کے اقوال میں شدید تناقض پایا جاتا ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر کو علی سے کیا نسبت جو کہا کرتے تھے کہ میرے مفقود (فوت ہو جانے) سے پہلے جو دریافت کرنا ہو کر لو۔ مجھ سے آسمان کے راستوں کے بارے میں پوچھئے کیونکہ

---

[1] بفرض محال اگر مسائل میں حضرت صدیق سے غلطی سرزد ہوتی تو اس سے آپ کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہ پڑتا اس لیے کہ آپ غیر معصوم بشر تھے۔ یہی حال حضرت علی کا تھا آپ سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا آپ نے یہ فتویٰ دیا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت اَبْعَدُ الاَجَلَیْن ہے۔ یہ فتویٰ اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ حضرت علی بھی دیگر صحابہ کی طرح غیر معصوم تھے ۱۲۔

مجھے زمین کے راستوں سے ان کا زیادہ علم ہے"۔

حضرت علیؓ کا قول سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ

ہم کہتے ہیں حضرت علی کے اس ارشاد کی وجہ یہ تھی کہ کوفہ والے جاہل تھے اور آپ انھیں مسائل واحکام سکھانا چاہتے تھے حضرت ابوبکر کا معاملہ اس سے دگرگوں تھا۔ آپ اکابر صحابہ میں بود و باش رکھتے تھے اور آپ کی رعیت امت بھر میں زیادہ صاحب علم اور دیندار تر تھی۔ حضرت علی کے مخاطب عوام تابعین میں سے تھے بلکہ یوں کہیے کہ ان میں بہت سے بدترین تابعین میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی ان کی مذمت بیان کرتے اور ان پر بددعا کیا کرتے تھے۔ مکہ و مدینہ اور شام و بصرہ کے تابعین کوفہ والوں سے بدرجہا بہتر تھے۔ خلفاء اربعہ سے منقول فتاوی جمع کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے حضرت ابوبکر و عمر کے فتاوی قرین صحت و صواب اور ان کے علم و فضل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کے فتاوی عمر کے فتاوی سے بھی صحیح تر ہیں۔ حضرت عمر کے فتاوی میں سے مخالف نص حضرت علی کی قضایا کی نسبت تعداد میں کم ہیں۔ آج تک کوئی ایسی نص معلوم نہیں ہو سکی جو حضرت ابوبکر کے بیان کردہ مسائل کے خلاف ہو۔ خلافت صدیقی میں حضرت ابوبکر ہی مشتبہ مسائل کی وضاحت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں صحابہ کا اختلاف معروف نہیں ہے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوالبختری کا بیان ہے میں نے حضرت علی کو کوفہ کے منبر پر بیٹھے دیکھا۔ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زرہ تلوار اور عمامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ انگلی میں آنحضور کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اسی دوران آپ نے شکم مبارک سے کپڑا اٹھا کر فرمایا مجھے گم پانے سے پہلے جو پوچھنا چاہو پوچھ لو۔ اِلیٰ اٰخِرِ مَا قَالَ"۔

میں کہتا ہوں یہ صریح کذب ہے اس لیے کہ حضرت علی اہل کتاب کے معاملات کا فیصلہ تورات و انجیل کی روشنی میں کرنے کے مجاز نہ تھے۔ بلکہ صرف قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرنا آپ کے لیے ناگزیر تھا۔ جو شخص حضرت علی کی جانب یہ بات کو منسوب

(حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کرتا ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ کے باہمی معاملات کا فیصلہ تورات و انجیل کے مطابق کیا کرتے تھے اور اس پر ان کی مدح بھی کرتا ہے یا تو وہ بہت بڑا جاہل ہے اور یا زندیق و ملحد ہے کہ اس مدح کے پردے میں آپ پر جرح و قدح وارد کرنے کا خواہاں ہے۔ اس لیے یہ بات مدح و ثواب کی موجب نہیں بلکہ ذم و عقاب کا باعث ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"محدث بیہقی اپنی سند کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص حضرت آدم علیہ السلام کا علم نوح علیہ السلام کا تقویٰ ابراہیم علیہ السلام کا حلم موسیٰ علیہ السلام کا رعب و داب اور حضرت عیسیٰ کی طاعت و عبادت کو دیکھنا چاہے وہ علی کو دیکھ لے"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے اگر شیعہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو اس کی سند ذکر کریں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک بلاشبہ کذب و موضوع ہے یہی وجہ ہے کہ فضائل علی احادیث کے حریص ہونے کے باوجود نسائی جیسے محدثین نے بھی اسے ذکر نہیں کیا۔ امام نسائی نے اپنی کتاب الخصائص میں فضائل علی سے متعلق روایات کو جمع کر دیا ہے۔ امام ترمذی نے بھی متعدد احادیث آپ کے فضائل میں ذکر کی ہیں جن میں سے بعض ضعیف بلکہ موضوع بھی ہیں۔ مگر یہ حدیث کسی نے بھی ذکر نہیں کی۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۵۰۱) لہ قرآنی احکام کو منسوخ کر کے یہود کے شرائع و احکام کو معمول بہا ٹھہرانا یہود کی دیرینہ خواہش ہے جو ماضی ہی میں ختم نہیں ہوئی بلکہ مستقبل تک جاری و ساری ہے۔ ہم قبل ازیں شیعہ کی معتبر کتاب کافی کلینی ـــــ جو شیعہ کے یہاں بخاری کے مرتبہ سے کم نہیں سے نقل کر چکے ہیں کہ اس کے ایک باب کا عنوان ہے "جب ائمہ کا بول بالا ہوگا تو داؤد اور آل داؤد کے مطابق فیصلے کیا کریں گے۔ گواہ کی حاجت نہ ہوگی"۔

ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ وہ آنحضور کی آخری رسالت کا یہ حشر نہ ہونے دے اور اس سے اسے محفوظ و مصئون رکھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابو عمر زاہد کا قول ہے کہ ابو العباس نے کہا ہمیں حضرت شیث سے لیکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی نبی ایسا معلوم نہیں جس نے یہ الفاظ کہے ہوں کہ جو پوچھنا چاہو پوچھ لو" البتہ حضرت علی نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اکابر صحابہ مثلاً ابوبکر و عمر آپ سے مسائل دریافت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سوالات کا سلسلہ رک گیا۔ پھر حضرت علی نے کہا اے کمیل بن زیاد میری ذات میں علم کی فراوانی ہے اے کاش! اس علم کا کوئی حامل ہوتا"

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس روایت کی نقل ثعلب سے درست بھی ہو تو یہ بے سند ہونے کی وجہ سے قابل احتجاج نہیں ہے۔ ثعلب ائمہ حدیث میں سے نہیں ہے جس کی صحیح وسقیم روایات کا محدثین کو علم ہو۔ بڑے بڑے فقہاء بے اصل احادیث ذکر کرتے ہیں۔ ثعلب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ مزید یہ کہ ثعلب نے یہ روایت ایسے لوگوں سے سنی ہے جو اپنے اساتذہ کا نام ہی بیان نہیں کرتے۔ حضرت علی کا یہ ارشاد حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کے زمانہ کا نہیں بلکہ آپ نے یہ الفاظ کوفہ میں فرمائے۔ آپ کوفہ کے لوگوں کو کہا کرتے تھے کہ آپ سے دینی مسائل پوچھیں۔

جس طرح آپ نے کمیل کو مخاطب کرکے کہا۔ جہاں تک حضرت ابوبکر کا تعلق ہے آپ حضرت علی سے کچھ بھی دریافت نہیں کیا کرتے تھے حضرت عمر حضرت علی سے اسی طرح مشورہ کیا کرتے تھے جس طرح باقی لوگوں سے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر نے شرعی حدود کو ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ جب خالد بن ولید نے مالک بن نویرہ کو قتل کر دیا تو ان سے قصاص نہیں لیا تھا۔ جب عمر نے خالد کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ تو ابوبکر نے قبول نہ کیا"

---

[۱] ابو عمر زاہد المتوفی (۲۶۱ - ۳۴۵) کا اصلی نام محمد بن عبد الواحد بن ابو ہاشم المطرز المعروف غلام ثعلب ہے۔ ابو العباس کا نام احمد بن یحیی ثعلب المتوفی (۲۰۰ - ۲۹۱) ہے۔ یہ ابو عمر زاہد کا استاد ہے ۱۲

شیعہ کا یہ اعتراض کہ حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن ولید سے قصاص نہ لیا

ہم جواباً کہتے ہیں کہ اگر کسی بے گناہ کے قتل کا قاتل سے قصاص نہ لینا جرم ہے تو حضرت علی کے خلاف حامیانِ عثمان کی سب سے بڑی دلیل یہی ہوگی کہ وہ آپ کا قصاص لینے سے قاصر رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عثمان مالک بن نویرہ ایسے لوگوں سے بدرجہا افضل تھے۔ آپ بحالتِ مظلومی شہید ہوئے اور حضرت علی نے قاتلوں سے قصاص نہ لیا۔ اسی وجہ سے شامی لوگ حضرت علی کی بیعت میں شریک نہ ہوئے۔

اگر حضرت علی ترکِ قصاص میں معذور تھے تو شیعہ کو چاہئے کہ اہل سنت کی طرح ابوبکر و علی دونوں کو معذور قرار دیں۔ حضرت عمر نے جو قاتل کے قتل کا مشورہ دیا تھا یہ ان کے اجتہاد پر مبنی تھا۔ شیعہ حضرت عثمان پر جو اعتراض کرتے ہیں کہ جب عبیداللہ بن عمر نے ہرمزان کو قتل کر دیا تو انہوں نے عبیداللہ سے قصاص نہ لیا اس کا بھی یہی جواب ہے کہ آپ حضرت علی کی طرح معذور تھے (ہرمزان کے قتل کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ص ۱۰۶ - ۱۰۸)

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر نے حضرت فاطمہ کو فدک کی جاگیر نہ دے کر ارشادِ حضور کی خلاف ورزی کی"۔

ہم کہتے ہیں کہ جاہل شیعہ کے سوا سب اہل اسلام ابوبکر کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے اس لیے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ "لَا نُوْرَثُ"۔

رافضی قلمکار کا قول ہے۔

"حلیۃ الاولیاء میں عمر سے مروی ہے کہ ابوبکر نے وفات کے وقت یہ الفاظ کہے" اے کاش! میں ایک مینڈھا ہوتا اور میری قوم کے لوگ مجھے ذبح کر دیتے"۔ یہ تو اسی طرح ہوا جیسے کافر بروزِ قیامت کہے گا۔ "یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا"۔

ابن عباس ذکر کرتے ہیں کہ عمر فاروق نے عند الموت کہا۔ "اگر میرے پاس اتنا سونا ہوتا

جس سے ساری کائنات بھر جاتی تو عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے اسے فدیہ کے طور پر دے دیتا"۔

یہ بعینہ ایسے ہے جس طرح قرآن پاک میں فرمایا وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَہٗ مَعَہٗ لَافْتَدَوْا بِہٖ"

ایک طرف عند الموت ابوبکر و عمر کے قول کو پیش نظر رکھیے۔ دوسری طرف حضرت علی کا قول ملاحظہ ہو کہ آپ اپنے آخری وقت میں فرماتے تھے کہ "میں محمد اور آپ کی جماعت سے کب ملوں گا؟ شہید ہوتے وقت فرمایا "فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ"۔ (رب کعبہ کی قسم میں نے اپنی مراد پالی)

حضرت ابوبکر و عمر کے آخری الفاظ پر شیعہ کا اعتراض

اس کا جواب یہ ہے کہ مندرجہ بالا قول قائل کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔ ایسے اقوال تو ان لوگوں سے بھی منقول ہیں جو حضرت علی کے مرتبہ سے فروتر تھے بلکہ بعض خوارج نے بھی ایسے الفاظ کہے۔ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آخری وقت تھا اور آپ کی بیوی نے "وَاحَزْنَاہُ" (ہائے غم) کہا تو آپ نے فرمایا۔ خوشی کی بات ہے کہ میں کل آنحضور اور آپ کی جماعت سے مل جاؤں گا"۔

بخاری میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر کو جب نیزہ لگا تو درد سے کراہنے لگے حضرت ابن عباس ان کو تسلی دے رہے تھے۔ ابن عباس نے کہا "امیر المؤمنین! کوئی فکر کی بات نہیں آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور آپ نے بہترین رفیق ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ جب آنحضور کا آخری وقت آیا تو آپ سے راضی تھے۔ پھر آپ حضرت ابوبکر کی صحبت میں رہے اور آخر وقت تک وہ بھی آپ سے خوش رہے۔ پھر آپ مسلمانوں کی صحبت میں رہے اور اگر آپ ان سے تشریف لے جائیں گے تو سب امت سے راضی ہو گی۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ آپ نے سرور کائنات اور حضرت ابوبکر کی صحبت کا جو ذکر کیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر عظیم احسان ہے۔ میری

یہ بے قراری تم اور تمہارے اصحاب کی وجہ سے ہے۔ بخدا اگر میرے پاس روئے زمین کی دولت ہوتی تو میں عذاب الٰہی کو دیکھنے سے قبل اسے فدیہ کے طور پہ دے ڈالتا۔"

مذکورہ صدر حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریمؐ اور جمیع امت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے راضی ہے باقی رہا عذاب خداوندی سے حضرت عمر کا خوف تو یہ ان کے کمال علم کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر - ۲۸)

(بندگان خدا میں سے اصحاب علم ہی خدا تعالے سے ڈرتے ہیں)

حدیث میں آیا ہے جب آنحضور نماز پڑھتے تو رونے کی وجہ سے آپ کے سینہ میں ہنڈیا کی طرح جوش پایا جاتا تھا۔

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ جب حضرت عثمان بن مظعون قتل کیے گئے تو آپ نے فرمایا "خدا کا رسول ہونے کے باوجود مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اور تمہارے ساتھ کیا"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا "جو باتیں مجھے معلوم ہیں اگر تم جانتے ہوتے تو کم ہنستے اور زیادہ روتے"۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "اے کاش! میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا"۔

جہاں تک کافر کا تعلق ہے وہ بروز قیامت کہے گا "يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا"۔ بخلاف ازیں مومن دنیا میں خدا سے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن کا دنیا میں خدا سے ڈرنا کافر کے بروز آخرت خدا سے خائف ہونے کے برابر نہیں۔ نور و ظلمت اور نور و سایہ کیونکر مساوی ہو سکتے ہیں؟ جو شخص امارت و خلافت سے بہرہ ور ہو کر عدل و انصاف کی راہ پہ گامزن ہے اور اس کے باوصف خدا سے ڈرتا ہو کہ مبادا وہ کسی پہ ظلم کر چکا ہو وہ اس شخص کی نسبت افضل ہے۔ جس کی رعیت اسے ظالم تصور کرتی ہو اور اس کے باوجود وہ اپنے اعمال پہ ناز کرتا ہو۔ حضرت عمر عدل میں ضرب المثل تھے۔

حضرت عمرؓ کے حق میں حضرت علیؓ کی مدح وثنا

امام ذہبی امام جعفر صادق کے والد سے نقل کرتے ہیں۔

کہ انہوں نے حضرت جابر سے سنا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نعش پر پردہ ڈالا گیا تھا۔ تو حضرت علی تشریف لائے۔ اور کہا "خدا تجھ پر اپنی رحمت نازل کرے"۔ یہ صحیح ترین روایت ہے۔ حضرت عباس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت نے حضرت عمر فاروق کی نعش کا احاطہ کر لیا اور آپ کے لیے دعائے خیر کرنے لگے۔ اتنے میں ایک شخص نے اچانک آکر میرا کندھا تھام لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علی تھے۔ انہوں نے حضرت عمر کے لیے رحم کی دعا فرمائی اور کہا "اے عمر تو نے اپنے پیچھے کوئی آدمی نہیں چھوڑا جس کے اعمال کو لے کر خداوند تعالے سے ملاقات کرنا مجھے تجھ سے عزیز تر ہو"۔ یہ روایت بھی بہت صحیح ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

ابن عباس سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں فرمایا "قلم دوات لاؤ کہ میں تمہیں کچھ لکھ دوں جس کی موجودگی میں تم میرے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ عمر نے کہا آپ کے حواس بجا نہیں ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ جب شور وغل بپا ہوا تو آنحضور نے فرمایا یہاں سے چلے جاؤ نبی کے پاس شور وغل زیب نہیں دیتا۔ ابن عباس نے کہا مصیبت تو یہ ہے کہ آنحضور کو لکھوانے کا موقع نہ مل سکا۔

جب آنحضور کا انتقال ہوا تو عمر نے کہا آپ فوت نہیں ہوئے اور نہ ہوں گے۔ جب ابوبکر نے اس سے منع کیا اور یہ آیت پڑھی "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" تو حضرت عمر نے یہ آیت سن کر کہا گویا میں نے قبل ازیں یہ آیت نہیں سنی تھی"۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت عمر کا علم وفضل صحابہ میں مسلم تھا اور حضرت ابوبکر کے سوا دوسرا کوئی صحابی اس ضمن میں آپ کا ہمسر نہ تھا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اُمم سابقہ میں کچھ لوگ مُلہَم ہوا کرتے تھے میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ

عمر ہے (مسلم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

بنی اسرائیل میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو اللہ تعالیٰ شرف مکالمہ سے مشرف فرماتے تھے۔ میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہوا تو وہ عمر ہے (بخاری بروایت ابوہریرہ)

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

حالت خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا گیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پیا یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا جو دودھ بچ گیا وہ میں نے عمر کو دے دیا۔" صحابہ نے دریافت کیا۔ پھر آپ نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی؟ فرمایا "دودھ سے علم مراد ہے (بخاری)

حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ آنحضور نے فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگوں کو میرے روبرو پیش کیا جارہا ہے۔ یہ لوگ قمیص پہنے تھے۔ بعض لوگوں کی قمیص چھاتی تک آتی تھی اور بعض کی کم و بیش، اسی دوران حضرت عمر دامن کشاں گذرے صحابہ نے پوچھا پھر آپ نے اس سے کیا مراد لیا؟ فرمایا "دین" (یہ حدیث صحیح ہے)

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا میرے تین اقوال منشائے ایزدی کے موافق نکلے (۱) مقام ابراہیم کے بارے میں (۲) پردہ سے متعلق (۳) بدر کے قیدیوں کے بارے میں (بخاری و مسلم)

۱؎ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ مقام ابراہیم کو جائے نماز بنا لیتے۔ تب یہ آیت اتری۔ "وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى"۔ (سورۂ بقرہ ۱۲۵) حضرت عمر نے یہ بھی عرض کیا کہ حضور آپ کے یہاں نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ازواج مطہرات کو پردہ کا حکم دیں تب آیت حجاب نازل ہوئی۔ قبل قبل ازیں اساری بدر کے بارے میں مسند امام احمد کی حدیث گذر چکی ہے۔ جس میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے مشورہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپ نے حضرت عمر کے مشورہ پر عمل فرمایا تھا ۱۲

واقعۂ قرطاس

قرطاس کا واقعہ بخاری و مسلم میں بروایت عائشہ صدیقہ تفصیلاً مذکور ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ آپ نے بیماری کی حالت میں فرمایا اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ کہ میں کچھ لکھ دوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد بعض لوگ یہ کہیں کہ میں امامت وخلافت کے لیے زیادہ موزون ہوں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتے (بخاری ومسلم)

صحیح بخاری میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عائشہ نے کہا "ہائے سر" آنحضور نے یہ سن کر فرمایا اگر یہ واقعہ میری زندگی میں پیش آیا تو میں آپ کے حق میں دعائے مغفرت کروں گا۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ مقام افسوس ہے بخدا آپ چاہتے ہیں کہ میں مرجاؤں۔ اگر میں مرگئی تو آپ اسی روز اور شادی کرلیں گے"۔ آنحضور نے فرمایا۔

"میرے سر میں تکلیف ہے میں ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلا کر ایک عہدنامہ تحریر کرنا چاہتا تھا۔ مبادا کوئی خلافت کا حریص اٹھ کھڑا ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان ایسا نہیں چاہتے" (بخاری)

صحیح مسلم میں ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ اگر آپ کسی کو خلیفہ مقرر کرنا چاہتے تو کسے مقرر کرتے؟ آپ نے جواباً فرمایا "ابوبکر کو" پھر پوچھا گیا "ان کے بعد کس کو"؟ حضرت عائشہ نے کہا "حضرت عمر کو" پھر پوچھا گیا ان کے بعد کس کو؟ کہا "ابوعبیدہ کو"۔

حضرت عمر کو اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ آپ یہ حکم شدت مرض کی وجہ سے دے رہے ہیں یا حسب معمول (بقائمی ہوش وحواس) صحیح حالت میں یہ بات فرما رہے ہیں۔ انبیاء بیمار پڑ سکتے ہیں اس لیے کہ مرض اور نبوت ورسالت کے مابین کوئی منافات نہیں۔ اسی لیے حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر شک میں مبتلا تھے اور بجزم ووثوق سے یہ بات نہیں فرما رہے تھے۔ حضرت عمر شک میں مبتلا ہو سکتے ہیں کیونکہ نبی کے سوا کوئی شخص معصوم نہیں۔ بنا بریں وہ اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ آپ شدت بخار کی وجہ سے یہ گفتگو فرما رہے ہوں۔ حضرت عمر کا یہ قول بھی شک پر مبنی ہے کہ

آنحضور فوت نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ دلیل و برہان سے آپ کی وفات ثابت ہو گئی۔ آں حضور وہ عہد نامہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جب آپ نے دیکھا کہ اب لوگ شک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو آپ نے سوچا کہ اب یہ عہد نامہ لکھنے سے بھی شک کا ازالہ نہ ہوگا۔ لہذا اب اس کے لکھنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حسب ارادہ ان کو کسی شخصیت پر جمع کر دیں گے۔ جس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں کیا۔ "وَیَابَی اللّٰہُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَابَکْرٍ"۔

حدیث قرطاس کی مزید توضیح

حضرت ابن عباس کے قول کا مطلب یہ ہے۔ کہ عہد نامہ کا نہ لکھنا ان لوگوں کے لیے باعث مصیبت ہے جن کے نزدیک حضرت ابوبکر کی خلافت مشتبہ ہے۔ اگر آپ عہد نامہ لکھوا دیتے تو شک کا ازالہ ہو جاتا۔ جن کے نزدیک آپ کی خلافت برحق ہے ان کے نزدیک عدم کتابت سے کوئی نقصان نہیں پہنچا و للہ الحمد۔

بخلاف ازیں جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ حضرت علی کی خلافت کا عہد لکھنے والے تھے وہ علماء اہل سنت و شیعہ ہر دو کے نزدیک بالاتفاق گمراہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک بالاتفاق حضرت ابوبکر افضل الامت تھے لہذا آپ کی موجودگی میں دوسرا کوئی شخص خلیفہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شیعہ جو حضرت علی کو خلافت کا حق دار خیال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آنحضور قبل ازیں ایک نص جلی کے ذریعہ حضرت علی کو خلیفہ مقرر کر چکے تھے لہذا عہد نامہ لکھنے کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب (بقول شیعہ) امت آنحضور کی مشہور و معروف (حضرت علی کی خلافت سے متعلق) نص کو چھپانے کی مرتکب ہو چکی تھی تو وہ اس عہد نامہ کو بھی بڑی آسانی سے چھپا سکتے تھے۔ جس میں حاضرین کی تعداد بے حد قلیل تھی۔

نیز یہ کہ لوگوں کے شک کی بنا پر آپ عہد نامہ کو تا وفات کیونکر ملتوی کر سکتے تھے؟ عہد نامہ میں جو کچھ آپ لکھنا چاہتے تھے اگر وہ کوئی واجب الاظہار بات ہوتی تو آنحضور بہر کیف اسے لکھوا کر رہتے اور کسی کے قول کو بھی لائق التفات قرار دیتے جب آپ نے کتابت ترک

کر دی تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ دین کی کوئی ضروری بات نہ تھی۔

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی جب آنحضور کے فتوی کے خلاف فیصلہ صادر کر سکتے ہیں تو کیا حضرت عمر سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا؟ حضرت علی کا فعل حضرت عمر کے فعل سے خلیج تر ہے اس لیے کہ عمر شک میں مبتلا ہوئے تھے اور علی نے پورے جزم و یقین کے ساتھ آنحضور کے خلاف حکم صادر کیا تھا۔ یہ دونوں فعل ایسی خطا سے تعلق رکھتے ہیں جو قابل عفو و درگذر ہے۔ مسئلہ کی توضیح یہ ہے کہ ایک حاملہ عورت کے بارے میں جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا حضرت علی نے فتوی دیا تھا کہ اس کی عدت اَبعد الاجلین ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں سُبَیعہ کی روایت بالکل صحیح ہے مگر وہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ تک نہ پہنچ سکی۔

جس عورت کے ساتھ مہر مقرر کیے بغیر نکاح کیا جائے اس کے بارے میں حضرت علی نے فیصلہ کیا تھا کہ خاوند کی موت کی صورت میں عورت کا مہر ساقط ہو جاتا ہے حالانکہ بروَع نامی عورت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے وہ مہر دیا جائے گا جو ان کے خاندان میں عام طور سے رائج ہے۔

حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لانے کا ارادہ کیا تھا۔ جب آنحضور نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا تو یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں۔ ایسے واقعات جب مبنی بر اجتہاد ہوں تو اس سے حضرت علی یا دیگر اہل علم کی شان میں کچھ قدح وارد نہیں ہوتی۔ حضرت علی کا قول ہے کہ جب خاوند اپنی بیوی کو طلاق کا اختیار دے اور بیوی کہے کہ میں طلاق کی بجائے خاوند کے گھر میں آباد رہنا چاہتی ہوں تو اس کے باوجود عورت مطلقہ ہو جائے گی۔ حالانکہ آنحضور نے اپنی ازواج مطہرات کو اختیار دیا تھا اور ان پر طلاق واقع نہ ہوئی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جن امور سے حضرت علی کا رجوع کرنا ضروری تھا وہ ان امور کی نسبت تعداد میں بہت زیادہ ہیں جن سے رجوع کرنا حضرت عمر کے لیے ناگزیر تھا۔ اس کے باوصف حضرت عمر نے اکثر امور سے رجوع کر لیا تھا اور حضرت علی کا رجوع صرف

بعض امور سے ثابت ہے۔

جن امور سے حضرت علی نے رجوع کیا ان میں ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنا بھی شامل ہے۔ جہاں تک دیگر مسائل کا تعلق ہے مثلاً یہ مسئلہ کہ حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت اَبعد الأجلین ہے نیز یہ مسئلہ کہ جس عورت کا مہر مقرر نہ ہو اور اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اسے مہر نہیں دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں یہ کہ جس عورت کو طلاق کا اختیار دیا جائے اور وہ خاوند کے گھر میں رہنا چاہے تو اسے طلاق ہو جائے گی حضرت علی تادمِ واپسیں ان مسائل پر قائم رہے اور ان سے رجوع نہ کیا۔

جن مسائل سے حضرت علی کا رجوع کرنا ثابت نہیں وہ کثیر التعداد ہیں امام شافعی نے اس قسم کے مسائل اپنی کتاب "اختلاف علی وعبداللہ" میں اور محمد بن نصر المروزی نے کتاب "رفع الیدین فی الصلوٰۃ" میں ذکر کیے ہیں۔

اس قسم کے اکثر مسائل ان کتب میں مذکور ہیں جن میں باسند یا بے سند اقوال صحابہ بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً مصنف عبدالرزاق و سنن سعید بن منصور و مصنف وکیع و مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ و سنن الاثرم و مسائل حرب و عبداللہ بن احمد و صالح و کتاب ابن المنذر و ابن جریر الطبری و ابن نصر و ابن حزم و دیگر مصنفین رحمہم اللہ تعالیٰ

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"جب حضرت فاطمہ نے فدک کے بارے میں ابوبکر سے بات چیت کی تو ابوبکر نے اس ضمن میں ایک کاغذ لکھ کر حضرت فاطمہ کو دے دیا۔ جب ابوبکر کے یہاں سے لوٹیں تو راستہ میں عمر (رضی اللہ عنہ) ملے اور وہ کاغذ حضرت فاطمہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہا) سے لے کر جلا ڈالا۔ حضرت فاطمہ نے عمر کے حق میں بد دعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابولؤلؤ نے عمر کو قتل کر دیا۔"

ہم کہتے ہیں خدا کی قسم یہ روافض کا بدترین خود ساختہ جھوٹ ہے کیا شیعہ حضرت عمر پر یہ عیب لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے تیرہ سال بعد حضرت عمر کو ابولؤلؤ کے ہاتھوں شہادت سے مشرف کیا؟ یہ سعادت حضرت علی

(حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے حصہ میں بھی آئی تھی۔
شیعہ مصنف کا یہ قول کہ حضرت عمر نے شرعی حدود کو معطل کر دیا تھا اور مغیرہ بن شعبہ پر حد قائم نہ کی"۔

شیعہ کا اعتراض کہ فاروق اعظم شرعی حدود میں سہل انگاری سے کام لیتے تھے

اس کا جواب یہ ہے کہ جمہور علماء نے اس ضمن میں حضرت عمر کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ جب شہادت کا نصاب کامل نہ ہو تو حد مجرم کی بجائے گواہوں پر لگائی جائے گی۔ صحابہ کی موجودگی میں ایسا کیا گیا تھا۔ حضرت علی بھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے حضرت عمر کی تائید کی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب تین گواہوں پر حد قذف لگائی جا چکی تھی تو ابوبکرہ نے از سر نو پھر کہنا شروع کہ بخدا مغیرہ نے زنا کیا ہے جب حضرت عمر نے دوبارہ ابوبکرہ پر حد قذف لگانے کا ارادہ کیا تو حضرت علی نے کہا ابوبکرہ کی بجائے اب مغیرہ کو رجم کرنا چاہیئے۔ حضرت علی کا مقصد یہ تھا کہ ابوبکرہ ایک گواہ ہیں اور قبل ازیں شہادت دے چکے ہیں۔ اب ان کی تکرار شہادت چوتھے گواہ کے قائم مقام ہے بایں طور چار گواہ پورے ہو گئے لہذا رجم واجب ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی اس پر رضامند تھے کہ ان پر حد لگائی جائے ورنہ آپ اس سے منع کر سکتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف کا یہ عالم تھا کہ اپنے بیٹے پر شراب کی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۱؎ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر اپنی رحمت نازل فرمائے وہ اس بات پر اظہار حیرت کر رہے ہیں کہ حضرت عمر کا ایک مجوسی کے ہاتھوں شہید ہونا بھی شیعہ کے نزدیک ایک جرم ہے انہیں کیا معلوم تھا کہ شیعہ حضرت عمر کے قاتل مجوسی کو بابا شجاع الدین کہہ کر پکاریں گے۔ شیعہ کے مشہور شیخ احمد بن اسحاق احوص نے حضرت عمر کی شہادت پر اظہار مسرت کرنے کے لیے اس مجوسی کے اعزاز میں جشن کا ایک دن مقرر کیا اور اس کا نام "عید بابا شجاع الدین" رکھا۔ فاروق اعظم کے یوم شہادت کو "عید اکبر"، "یوم التسلیہ" اور "یوم المفاخرۃ" کے ناموں سے یاد کرتے ہیں ۱۲

حد لگائی۔ واقعہ یہ تھا کہ ان کا بیٹا مصر میں شراب خوری کا مرتکب ہوا حضرت عمرو بن عاص نے چپکے سے گھر میں ہی اس پر حد لگا دی۔ حالانکہ باقی لوگوں پر علانیہ حد لگائی جاتی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے عمرو بن عاص کو ڈانٹا اور اپنے بیٹے کو مدینہ بلا کر دوبارہ حد لگائی۔ آپ شرعی حدود میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے تھے آپ کے عدل و انصاف کا منکر ایک رافضی ہی ہو سکتا ہے۔ قاتلین عثمان پر حد قائم نہ کرنے کے بارے میں حضرت علی پر بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حضرت علی بھی حضرت عمر کی طرح ایک مجتہد سے زیادہ نہ تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عمر ازواج مطہرات کو اس سے زیادہ مال دیا کرتے تھے جس قدر عطا کرنا ضروری تھا عائشہ و حفصہ کو سالانہ دس ہزار درہم دیا کرتے تھے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عطیہ جات دیتے میں حضرت عمر تفضیل کے مسلک پر عمل پیرا تھے۔ چنانچہ آپ بنی ہاشم کو سب سے پہلے دیتے اور سب سے زیادہ دیتے اور فرمایا کرتے تھے "اس مال کے حقدار ہونے میں سب لوگ مساوی ہیں۔ البتہ ہر شخص کی اپنی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ پھر اسلام کی راہ میں صعوبات اٹھانے اور سبقت اسلام کا بھی لحاظ ہے"۔

آپ اپنے بیٹے عبد اللہ کو اسامہ بن زید سے کم دیا کرتے تھے۔ خدا کی قسم حضرت عمر کسی کی رو رعایت یا الفت و محبت کی اساس پر کسی کو زیادہ عطیہ جات دینے سے متہم نہ تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عمر شراب پینے والے کو ملک بدر کر کے شرعی حکم کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شراب نوشی کی حد میں جلا وطنی کا حکم حاکم کی صواب دید پر موقوف ہے۔ صحابہ سے شراب کی حد کے بارے میں چالیس اور اسی کوڑے مارنے کی روایات ملتی ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا تھا کہ ان دونوں پر عمل کر سکتے ہیں اور یہ دونوں سنت ہیں بعض علماء کا قول ہے کہ چالیس سے زیادہ کوڑے مارنا واجب ہے امام ابو حنیفہ اور مالک بھی اسی کے قائل ہیں امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے امام شافعی فرماتے ہیں کہ

چالیس پر اضافہ کرنا حاکم کی مرضی پر منحصر ہے۔ حضرت عمر شراب پینے والے کا سر منڈوا کر جلا وطن کر دیا کرتے تھے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جو شخص چوتھی مرتبہ شراب پئے اس کو قتل کر دو۔ اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا قتل کا حکم منسوخ ہو چکا ہے یا ہنوز باقی ہے؟ حضرت علی چالیس سے زیادہ کوڑے لگاتے اور فرمایا کرتے تھے۔ "اگر کسی شخص پر حد لگائی جائے اور وہ مر جائے تو مجھے اس کا کچھ افسوس نہیں۔ البتہ اگر شراب پینے والا حد لگانے سے مر جائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا کیونکہ یہ حد ہم نے اپنی رائے سے مقرر کی ہے"۔ یہ روایت امام شافعی نے ذکر کی ہے اور اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ حاکم اپنے اجتہاد کی بنا پر تعزیر میں اضافہ کرنے کا مجاز ہے۔

شیعہ لکھتا ہے۔

"عمر شرعی احکام سے نابلد تھے ایک حاملہ عورت کو جب سنگسار کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی نے اس سے روکا"۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ درست ہے تو ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر کو اس کے حاملہ ہونے کا علم نہ ہو۔ کیونکہ عدم حمل اصل ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آپ کو یہ حکم یاد نہ رہا ہو اور حضرت علی نے یاد دلا دیا۔ ایسے معاملات کی بنا پر ائمہ ہدایت کو ہدف طعن و ملامت بنانا کہاں تک قرین انصاف ہے؟ حضرت علی سے اس سے کئی گنا مسائل مخفی رہے آپ کے اجتہاد کا یہ حال ہے کہ جنگ جمل و صفین میں نوے ہزار انسان کو تہ تیغ کر دیا۔ اس کے مقابلے میں حضرت عمر کا قصور صرف یہ تھا کہ آپ نے حاملہ کو سنگسار کرنے کا حکم دے کر ایک ولد الحرام کو قتل کرنا چاہا تھا اور وہ ابھی قتل نہیں کیا گیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ حضرت علی کا جرم آپ کے مقابلہ میں عظیم تر تھا۔

بقول شیعہ فاروق اعظم نے ایک مجنونہ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"عمر نے ایک مجنون عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت علی نے فرمایا مجنون

مرفوع القلم ہوتا ہے یہاں تک کہ ہوش میں آئے یہ سن کر اس سے عمر باز آگئے اور کہا اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"۔

ہم کہتے ہیں کہ "لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ" کا اضافہ معروف نہیں ہے۔ یہ حدیث اگر حضرت عمر کو معلوم نہ بھی تھی تو اس سے ان کی عظمتِ شان پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ بھول گئے ہوں یا آپ کے اجتہاد پر مبنی ہو۔ آخر آپ معصوم تو نہیں کہ ان سے کوئی غلطی ہی صادر نہ ہو خصوصاً جبکہ دیگر حضرات سے بھی ایسی غلطیاں صادر ہو چکی ہیں۔

شیعہ کا قول ہے۔

"عمر نے خطبہ دیتے ہوئے کہا جو شخص کسی عورت کا زیادہ مہر مقرر کرے گا تو میں مہر کی رقم بیت المال میں داخل کر دوں گا ایک عورت نے کھڑے ہو کر کہا جو چیز خدا نے ہمیں اپنی کتاب عزیز میں عطا کی ہے آپ اس سے کیوں منع کر رہے ہیں؟ ارشاد باری ہے "وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا" عمر نے یہ سن کر کہا "ہر شخص عمر سے بڑا فقیہ ہے"۔

ہم کہتے ہیں یہی بات حضرت عمر کے کمال فضل و تقویٰ کی دلیل ہے کہ جب حق آپ پر واضح ہو گیا تو آپ نے فی الفور کتاب عزیز کی طرف رجوع کیا اور ایک عورت کے قول سے بھی انحراف نہ کیا۔ افضل کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مفضول اسے کسی بات پر بھی متنبہ نہ کر سکے۔ ہُدہُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا۔

اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ (سورہ نمل-۲۲) (مجھے وہ باتیں معلوم ہیں جو آپ نہیں جانتے) حضرت موسیٰ علیہ السلام خضر کے پاس علم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے۔ حالانکہ خضر کا مرتبہ آپ سے فروتر تھا۔ حضرت عمر نے جو بات کہی تھی وہ ایک فاضل مجتہد کہہ سکتا ہے اس لیے کہ مہر میں خدا کا بھی حق ہے اور یہ سودا بازی کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"حضرت عمر نے قدامہ پر شراب کی حد نہیں لگائی تھی کیونکہ اس نے یہ آیت تلاوت کی لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا۔ حضرت علی نے یہ سن کر کہا کہ آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے قدامہ ان میں شمار نہیں

ہوتا"۔ حضرت عمر کو معلوم نہ تھا کہ کیا حد لگائیں۔ چنانچہ حضرت علی نے کہا کہ "قدامہ کو اسی چابک لگائیں"

شراب خوری کی حد کے بارے میں حضرت عمر کا علم کسی دلیل کا محتاج نہیں بارہا آپ کو اس کا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔ ذکر کردہ واقعہ کی تفصیل بروایت ابو اسحاق جوزجانی از ابن عباس یہ ہے کہ قدامہ بن مظعون نے شراب پی تو حضرت عمر نے دریافت کیا "تمہیں کس چیز نے شراب نوشی پر آمادہ کیا"۔ قدامہ نے ذکر کردہ آیت تلاوت کی اور کہا کہ میں مہاجرین اولین میں سے ہوں۔ حضرت عمر نے فرمایا "اسے جواب دو"۔ سب صحابہ خاموش رہے۔ پھر آپ نے ابن عباس کو جواب دینے کا حکم دیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ "یہ آیت ان لوگوں کو معذور قرار دینے کے لیے نازل ہوئی جو شراب کی حرمت سے قبل شراب نوشی کے مرتکب ہو چکے تھے"۔

حضرت علی نے فرمایا جب کوئی شخص شراب پئے گا تو بیہودہ بکے گا اور جب بیہودہ بکے گا تو جھوٹ بولے گا۔ آپ قدامہ کو اسی درے لگائیں۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس کی تعمیل کر دی اس روایت کے مطابق حضرت علی نے اسی درے لگانے کا مشورہ دیا۔ روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ حضرت علی نے حضرت عثمان کی موجودگی ولید بن عقبہ کو چالیس درے لگائے تھے اور اسی درے کی روایت کو حضرت عمر کی جانب منسوب کیا۔ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ اسی درے لگانے کا مشورہ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے دیا تھا۔ اور یہ حکم حضرت علی سے اخذ نہیں کیا گیا تھا۔ ہم قبل ازیں حضرت علی کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ "اگر شراب کی حد لگاتے ہوئے کوئی شخص مر جائے گا تو میں اس کی دیت ادا کروں گا کیونکہ آپ نے یہ حد مقرر نہیں فرمائی تھی"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عمر نے ایک حاملہ عورت کو بلا بھیجا اور خوف کے مارے اس کا حمل ساقط ہو گیا تو صحابہ نے کہا کہ آپ پر دیت وغیرہ نہیں آئے گی"۔ پھر عمر نے حضرت علی سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا اس کے ورثاء کو دیت ادا کرنا واجب ہے"۔

بقول شیعہ فاروق اعظم کی اجتہادی غلطیاں

ہم کہتے ہیں کہ یہ اختلافی و اجتہادی مسائل میں سے ہے۔ فاروق اعظم صحابہ کبار مثلاً حضرت عثمان و علی و ابن مسعود و زید اور ابن عباس وغیرہم رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ یہ آپ کے کمال علم و فضل کی دلیل ہے۔ ایک عورت کو بارگاہ فاروقی میں لایا گیا جس نے زنا کا اقرار کیا تھا۔ حضرت عثمان نے فرمایا میرا خیال ہے کہ یہ عورت زنا کی حرمت سے آگاہ نہیں ہے۔ بنا بریں اس پر حد قائم نہ کی۔ جب حضرت اسامہ نے ایک لا الہ الا اللہ کہنے والے شخص کو قتل کر دیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سزا نہ دی۔ کیونکہ اسامہ اس کے قتل کو جائز سمجھتے تھے۔ خالد بن جذیمہ اور مالک بن نویرہ کا قتل بھی اسی قبیل سے ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"دو عورتیں ایک بچے کے بارے میں جھگڑتی ہوئیں حضرت عمر کے پاس آئیں اور ان کا فیصلہ نہ کر سکے تو حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دونوں عورتوں کو بلا کر سمجھایا مگر وہ باز نہ آئیں۔ آپ نے فرمایا آری لاؤ تاکہ میں بچے کو چیر کر آدھا آدھا تقسیم کر دوں ایک عورت بولی۔ ابو الحسن! ایسا نہ کیجئے اور یہ بچہ اس عورت کو دے دیجئے۔ حضرت علی نے فرمایا اللہ اکبر! یہ تیرا ہی بیٹا ہے اگر اس کا بیٹا ہوتا تو اس کو بچے پر رحم آتا۔"

ہم کہتے ہیں یہ واقعہ حضرت عمر سے متعلق نہیں بلکہ جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی سمجھ حضرت سلیمان کو عطا کی۔ اور حضرت داؤد اسے نہ سمجھ سکے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے۔

فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ (سورۃ الانبیاء - ۷۹) (ہم نے سلیمان کو اس کا فہم عطا کیا۔)

حضرت سلیمان نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تھی کہ انھیں ایسی حکومت عطا کی جائے جو اس کی حکومت سے ملتی جلتی ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان حضرت داؤد سے افضل ہوں۔ خصوصاً جبکہ احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت داؤد سب انسانوں سے

بڑھ کر عابد تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

حضرت عمر نے ایک عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا جس کے یہاں نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوا تھا۔ حضرت علی نے حضرت عمر کو مخاطب کر کے کہا اگر یہ عورت کتاب خداوندی کے مطابق آپ سے جھگڑے گی تو آپ پر غلبہ حاصل کر لے گی اللہ تعالی فرماتے ہیں۔

وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (سورہ احقاف - ۱۵)

نیز فرمایا۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (سورہ بقرہ - ۲۳۳)

(مائیں اپنے بچوں کو دو سال دودھ پلائیں)

ایک آیت میں حمل و فصال کی مدت دو سال چھ ماہ بتائی دوسری میں ذکر کیا کہ مدت رضاعت دو سال ہے تو اس سے حضرت علی نے استدلال کیا کہ اقل مدت حمل چھ ماہ بھی ہو سکتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ حضرت عمر صحابہ کرام سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالی نے اہل ایمان کی مدح کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (وہ اپنے کام باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں)

غیر شادی شدہ حاملہ کا شرعی حکم

یہ مسئلہ متنازع فیہا ہے کہ جب ایک عورت حاملہ ہو اور اس کا نہ خاوند ہو نہ آقا نہ اس کا یہ دعوی ہو کہ کسی نے شبہ کی بنا پر غلطی سے اس کے ساتھ مجامعت کر لی تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

امام مالک فرماتے ہیں کہ اسے رجم کیا جائے۔ امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔

امام ابو حنیفہ اور شافعی فرماتے ہیں کہ اسے رجم نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس کے ساتھ جبر کیا گیا ہو یا اسے بلا مجامعت حمل ٹھہر گیا ہو۔ خلفائے راشدین کا مسلک یہ ہے کہ اسے سنگسار کیا جائے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر نے اپنی زندگی کے

آخری دور میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"زانی کو رجم کرنا حق ہے۔ بشرطیکہ گواہ موجود ہوں یا استقرار حمل ہو جائے یا وہ شخص بذات خود زنا کا اعتراف کرے"۔

ایک شرابی جب قے کر رہا ہو تو اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔

ممکن ہے حضرت عمر یہ خیال کرتے ہوں کہ نکاح کے چھ ماہ بعد شاذو نادر حالت میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے جس طرح بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی عورت کو چار سال یا سات سال حمل رہا۔ اس کی تحدید میں علماء کا اختلاف ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت عمر کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے چنانچہ دادا کے بارے میں آپ نے مختلف و متضاد فیصلے کیے"

اس کا جواب یہ ہے کہ جد (دادا) کے بارے میں حضرت عمر کا فیصلہ دیگر صحابہ کی نسبت اقرب الی الحق ہے۔ جب میت کا دادا بھی زندہ ہو اور بھائی بھی موجود ہوں تو اس کے بارے میں صحابہ کے دو قول ہیں۔

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں بھائیوں کو ورثہ نہیں ملے گا۔ حضرت ابوبکر و ابو موسیٰ و ابن عباس اسی کے قائل ہیں۔ علاوہ ازیں امام ابوحنیفہ، شافعیہ میں سے ابن سُریج اور حنابلہ میں سے ابو حفص برمکی کی بھی یہی رائے ہے۔ اور یہ مسلک اقرب الی الحق ہے۔

اس لیے کہ حقیقی بھائیوں کے بیٹوں کو دادا سے وہی نسبت ہے جو دادا کے بیٹوں یعنی چچوں کو دادا کی طرف۔ اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ دادا یہاں باپ کا قائم مقام ہے اور باپ چچوں سے اولیٰ ہے۔ لہٰذا دادا بھائیوں سے اولیٰ ہو گا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ دادا بھائیوں کے ساتھ ورثہ میں شریک ہو گا۔ حضرت عثمان، علی و زید اور ابن مسعود اسی کے قائل ہیں۔ مگر اس کی تفصیل میں ان کے مابین بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام مالک و شافعی و احمد اور جمہور حضرت زید بن ثابت کے

نظریہ کو درست تسلیم کرتے ہیں۔

دادا کے بارے میں حضرت علی نے جس نظریہ کا اظہار کیا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ کے سوا فقہاء میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

جد کی میراث اور حضرت عمرؓ

اگر حضرت عمرؓ کے بارے میں راوی کا قول "قضٰی فیھا بمائۃ قضیۃ" درست بھی ہو تو راوی کا اس سے یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی مسئلہ میں حضرت عمر کے سو اقوال ہیں۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ جد کے مسئلہ میں جو نزاع پایا جاتا ہے وہ ماں، بہن اور دادا کے مسئلہ سے زیادہ نہیں جسے علم وراثت میں "مسألۃ الخرقاء" کہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں صرف چھ اقوال ہیں اس سے معلوم ہوا کہ راوی کی مراد دادا کے سو حوادث و واقعات ہیں۔ دادا کے بارے میں فاروق اعظم کے اقوال دو یا تین سے ہرگز زیادہ نہیں۔

دادا کے بارے میں حضرت علی سے بھی مختلف اقوال منقول ہیں۔ علمائے فرائض سے یہ بات پوشیدہ نہیں۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ سو اقوال والی روایت کذب کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت شاذونادر ہی پیش آتی ہے کہ میت کے بھائی بھی زندہ ہوں اور دادا بھی۔ حضرت عمر صرف دس سال منصب خلافت پر فائز رہے تھے اس قدر مختصر زمانہ میں ایسے سو واقعات کیونکر پیش آ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے دادا کے بارہ میں فتویٰ دینا بند کر دیا تھا۔ روایات صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا: "اے کاش! کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزیں ہمارے لیے اچھی طرح بیان فرماتی ہوتیں (جد کی میراث (۲) کلالہ (۳) سود سے متعلق مسائل۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت عمر جب ان مسائل میں توقف فرماتے تھے تو آپ سے اس ضمن میں حکم صادر کرنے کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے؟ حضرت عمر مال تقسیم کرنے میں بعض لوگوں کو ترجیح دیتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مساوات کو ضروری قرار دیا ہے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر مال غنیمت خود تقسیم نہیں کیا کرتے تھے بلکہ یہ امراء

لشکر کا کام ہے۔

امیر جیش خمس (مال غنیمت کا ۱/۵) فاروق اعظم کی خدمت میں بھیج دیا کرتا تھا۔

علماء کے یہاں اس مسئلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا کسی مصلحت کے پیش نظر کسی مجاہد سے مال غنیمت کی تقسیم میں ترجیحی سلوک روا رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں منقول ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ کو جاتے وقت خمس نکال کر مال غنیمت کا ۱/۴ حصہ بعض مجاہدین کو انعام کے طور پر دے دیا تھا۔ واپسی کے وقت خمس نکال کر ۱/۳ انعام کے طور پر بانٹ دیا۔

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمہ بن اکوع کو غزوہ الغابہ میں غیر معمولی کارنامہ سرانجام دینے کے صلہ میں ایک پیدل اور ایک سوار کا حصہ دیا تھا حالانکہ سلمہ پا پیادہ تھے۔

امام مالک وشافعی فرماتے ہیں کہ انعام خمس کے ۱/۵ یعنی کل مال غنیمت کے ۱/۲۵ میں سے دے سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ عدل و انصاف میں بھلا حضرت عمر کا ہمسر اور کون ہو گا جن کے قلب ولسان پر حق ہمہ وقت جاری وساری رہتا تھا۔ آپ تقسیم غنیمت میں فرق مراتب کو پیش نظر رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر مساوات کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ بہرکیف یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔

شیعہ مصنف کی یہ بات بے اصل ہے کہ "مساوات واجب ہے"۔ اس نے اس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ اگر دلیل ذکر کرتا تو دیگر اجتہادی مسائل کی طرح ہم اسے بھی موضوع گفتگو ضرور بناتے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"حضرت عمر ظن وقیاس کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے"۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر قیاس ورائے پر عمل کرنا جرم ہے تو حضرت علی حضرت عمر کی نسبت زیادہ قصوروار ہیں۔ آپ کا جنگ صفین کے لیے جانا بھی ان کی رائے پر مبنی تھا۔ حضرت

علی خود فرماتے ہیں۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ یہ میری ذاتی رائے پر مبنی ہے"۔

حضرت علی نے خوارج سے جو جنگ لڑی اس کی داستان طویل ہے جن لوگوں نے جنگ جمل وصفین میں عملی حصہ لیا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اس سلسلہ میں کوئی نقل بیان نہیں کی البتہ جو صحابہ ان جنگوں میں شریک نہ تھے انہوں نے فتنہ کے دوران ترک قتال کے بارے میں احادیث روایت کی ہیں۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ قیاس ورائے اگر قابل مذمت نہیں ہیں تو اس کا قائل کسی حال میں بھی قابل ملامت نہیں اور اگر رائے واجتہاد ایک مذموم چیز ہے تو اس رائے سے اور مذموم تر رائے کیا ہو گی جس کی بنا پر ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون (جنگ جمل وصفین میں) بہایا گیا، اور اس سے مسلمانوں کو کوئی دینی ودنیوی فائدہ بھی نہ پہنچا۔ بلکہ شر میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور خیر بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ جب ایسی رائے معیوب ومذموم نہیں ہے تو فرائض وطلاق کے مسائل میں فاروق اعظم کی رائے بالاولی معیوب نہ ہو گی۔ حالانکہ حضرت علی عملاً اس میں شریک تھے اور آپ کے بیٹے حضرت حسن اور اکثر سابقین اولین صحابہ جنگ وقتال کو خلاف مصلحت تصور کرتے تھے۔ اور یہ رائے یقیناً بدلائل کثیرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے سے اصلح واصوب تھی۔

یہ بھی معلوم ہے کہ جدّ کے مسئلہ میں بھی حضرت علی کا فیصلہ قول بالرائے تھا۔ حضرت علی نے فرمایا تھا "میری اور حضرت عمر دونوں کی رائے اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ ام الولد لونڈیوں کو فروخت نہ کیا جائے۔ مگر میں اب ان کے فروخت کرنے اجازت دیتا ہوں"۔

اس کے جواب میں حضرت علی کے قاضی عبیدہ سلمانی نے کہا تھا۔

"آپ اور حضرت عمر کی متفقہ رائے آپ کی انفرادی رائے سے ہمیں عزیز تر ہے"۔

صحیح بخاری میں بروایت عبیدہ از علی مروی ہے کہ آپ (حضرت علی) نے فرمایا۔

جس قسم کے فیصلے تم کیا کرتے ہو کرتے رہو میں اختلاف کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں

کہ یا تو جماعت کا نظام قائم رہے۔ یا اپنے اصحاب کی طرح میں بھی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں" (بخاری)

یہ روایت ابن سیرین نے عبیدہ سے نقل کی ہے۔ ابن سیرین کا خیال تھا کہ حضرت علی سے جو روایات نقل کی جاتی ہیں وہ عموماً جھوٹی ہوا کرتی ہیں (کیونکہ وہ اختلاف کی آئینہ داری کرتی ہیں حالانکہ حضرت علی اختلاف کو ناپسند فرمایا کرتے تھے)

باقی رہی وہ حدیث جس میں عہد شکنی کرنے والوں اور ظلم و خروج کرنے والوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو وہ موضوع ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں "حضرت فاروق اعظم جس چیز کے بارے میں جس خیال کا اظہار فرماتے وہ ہو بہو اسی طرح ہوا کرتی تھی"۔

نصوص کتاب و سنت اور اجماع و قیاس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ فاروق اعظم کی رائے دیگر اکابر صحابہ مثلاً حضرت عثمان و علی اور طلحہ و زبیر رضوان اللہ علیہم کی نسبت بہت زیادہ صائب ہوا کرتی تھی اور اس کے نتائج و ثمرات بھی قابل مدح و ستائش ہوا کرتے تھے۔ جس شخص میں عدل و انصاف کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے وہ حضرت عمر کی کمال سیرت و کردار و کثرت علم و فضل میں ذرہ بھر شک نہیں رکھتا۔ حضرت ابوبکر و عمر کو ہدف طعن و ملامت بنانے والا یا تو ناتجربہ کار جاہل ہوگا یا ملحد و منافق جو ان پر طعن و تشنیع کرنے کو سرور کائنات کو نشانِ طعن بنانے کا ذریعہ بناتا ہے۔ روافض و باطنیہ کا یہی حال ہے۔

کیا حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت کی؟

اگر رافضی کہے چونکہ حضرت علی معصوم تھے اس لیے آپ اپنی رائے سے جو بات فرماتے وہ نص کی طرح حجت ہوا کرتی تھی اس کے جواب میں ہم کہیں گے ذرا خوارج کو تو دیکھو جو حضرت علی کو دائرہ اسلام ہی سے خارج کر رہے ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عمر نے اپنے بعد انتخاب خلیفہ کو شوریٰ کے حوالہ کیے حضرت ابوبکر کی مخالفت کی۔

عمر کہا کرتے تھے کہ اگر سالم مولیٰ ابو حذیفہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ مقرر کر دیتا۔ حالانکہ حضرت علی اس وقت موجود تھے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ گفتگو دو قسم سے خالی نہیں۔

(۱) جو نقل کے اعتبار سے صریح کذب ہے (۲) جس میں دانستہ حق کو ٹھکرایا گیا ہے پہلی قسم کا کلام صاف جھوٹ ہے یا کم از کم اس کی صداقت کا علم نہیں دوسری قسم کا کلام سچا ہے مگر اس میں کوئی چیز موجب طعن نہیں ہے۔ بلکہ وہ باتیں حضرت عمر کے فضائل و محاسن میں شامل ہیں۔

مگر اس بات کا کیا علاج کہ شیعہ فرط ضلالت وجہالت کی بنا پر نقلی و عقلی حقائق کو قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ ان امور کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جو وقوع پذیر ہو چکے ہیں اور وہ اس بات کو جانتے بھی ہیں مگر اس کے باوصف کہتے ہیں کہ وہ واقع نہیں ہوئے پھر جو امور وقوع میں نہیں آئے اور ان کے عدم وقوع سے وہ آگاہ بھی ہیں بکمال دیدہ دلیری کہتے ہیں کہ وہ وقوع میں آچکے ہیں۔

خیر و صلاح کا نام ان کی اصطلاح میں فساد ہے اور فساد کا نام خیر و صلاح۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

خرد کا نام جنون رکھ دیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

وہ عقل و نقل دونوں سے عاری ہیں۔ وہ صحیح معنی میں آیت ہذا کے مصداق ہیں

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (سورۃ الملک - ۱۰)

(اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے تو آج دوزخ والوں میں نہ ہوتے)

باقی رہا رافضی مصنف کا یہ قول کہ حضرت عمر نے انتخاب خلیفہ کے معاملہ کو شوریٰ کے حوالہ کر کے حضرت ابوبکر کی مخالفت کی"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اختلاف تضاد۔

(۲) اختلاف تنوع۔

اختلاف کی قسم اول کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایک امر کو واجب ٹھہراتا ہو اور دوسرا اسے حرام قرار دیتا ہو۔

اختلاف کی دوسری قسم کی مثال وہ اختلاف ہے جو قراءت میں پایا جاتا ہے۔ ہر قراءت بجائے خود جائز ہے۔ تاہم ایک قاری کے نزدیک ایک قراءت مختار ہوتی ہے اور دوسرا کسی اور کو مختار تصور کرتا ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

حدیث مشہور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ہر حرف شافی و کافی ہے"۔

روایات میں مذکور ہے کہ عمر اور ہشام بن حکیم بن حزام کے مابین سورہ فرقان کی تلاوت میں اختلاف پیدا ہوا۔ جب دونوں نے مختلف طریقہ سے پڑھ کر سنایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے کہا "یہ سورت اسی طرح اتاری گئی ہے"۔

خلیفۃ المسلمین کا مسلمانوں کے لیے تصرف اسی قبیل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنگ بدر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اساری بدر کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا تو حضرت ابوبکر نے فدیہ لینے کا مشورہ دیا اور آپ نے انھیں حضرت ابراہیم و عیسیٰ کے ساتھ تشبیہ دی۔ حضرت عمر نے ان کو قتل کرنے کا مشورہ دیا آپ نے ان کو نوح و موسیٰ کے مشابہ قرار دیا۔ آپ نے دونوں میں سے کسی کی مذمت نہ کی بلکہ انبیاء کے ساتھ تشبیہ دیکر ان کی مدح و ستائش فرمائی۔ اگر آنحضور حتمی طور پر ایک بات پر عمل کرنے کے مامور ہوتے تو صحابہ سے مشورہ نہ لیتے۔

علاوہ ازیں اجتہادی امور میں اختلاف کا امکان ہے اور ہر اجتہاد مبنی بر صواب ہوتا ہے مثلاً حضرت ابوبکر غزوات میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا کرتے تھے حضرت عمر ان کو معزول کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے مگر حضرت ابوبکر اس مشورہ پر عمل نہیں کیا کرتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے "خالد مشرکین پر خدا کی شمشیر برہنہ ہیں"۔ حضرت عمر جب مسند خلافت پر فائز ہوئے تو حضرت خالد کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو مقرر کیا۔ دونوں کا طرز عمل اپنے اپنے وقت پر درست تھا۔ حضرت ابوبکر نرم مزاج تھے

اور حضرت عمر ان کے مقابلہ میں جابر و سخت گیر تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے مشورہ لیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

"جب عمرو ابو بکر دونوں کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میں ان کی خلاف ورزی نہیں کروں گا"۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات میں فرمایا۔

"اگر لوگ ابو بکر و عمر کی اطاعت کریں گے تو سیدھی راہ پر چلیں گے"۔

روایاتِ صحیحہ میں آیا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا "جب نبی موجود نہ ہوں اور نماز کا وقت آجائے تو لوگ اس وقت کیا کریں گے"؟ صحابہ نے جواب دیا۔ "اللہ و رسول ہی کو علم ہو گا"۔ آپ نے فرمایا "کیا ابو بکر و عمر موجود نہیں؟ اگر ان دونوں کی اطاعت کرتے رہیں گے تو راہ راست پر آجائیں گے اور اگر ان کی نافرمانی کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے اور پوری امت گمراہی سے ہمکنار ہو جائے گی۔ آنحضور نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عباس حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا۔ "جنگ بدر کے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا۔ ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ آپ کے رفقاء تین سو انیس ۳۱۹ تھے۔ آنحضور قبلہ رخ ہوئے پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے "اے اللہ اپنے وعدہ کو پورا کر اور جو چیز دینے کا وعدہ کیا ہے وہ عطا کر اے اللہ اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو گا"۔ آپ ہاتھ اٹھائے قبلہ رو دعا کرنے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ آپ کی چادر کندھوں پر سے گر پڑی۔ ابو بکر آئے اور چادر اٹھا کر آپ کے کندھوں پر ڈال دی پھر پیچھے سے ہو کر آنحضور کے ساتھ چمٹ گئے اور کہا۔

"خدا کے نبی! بس کیجئے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی"۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

اختلاف کی قسم اول کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایک امر کو واجب ٹھہراتا ہو اور دوسرا اسے حرام قرار دیتا ہو۔

اختلاف کی دوسری قسم کی مثال وہ اختلاف ہے جو قراءت میں پایا جاتا ہے۔ ہر قراءت بجائے خود جائز ہے۔ تاہم ایک قاری کے نزدیک ایک قراءت مختار ہوتی ہے اور دوسرا کسی اور کو مختار تصور کرتا ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

حدیث مشہور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ہر حرف شافی و کافی ہے"۔

روایات میں مذکور ہے کہ عمر اور ہشام بن حکیم بن حزام کے مابین سورہ فرقان کی تلاوت میں اختلاف پیدا ہوا۔ جب دونوں نے مختلف طریقہ سے پڑھ کر سنایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے کہا "یہ سورت اسی طرح اتاری گئی ہے"۔

خلیفۃ المسلمین کا مسلمانوں کے لیے تصرف اسی قبیل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنگ بدر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اساری بدر کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا تو حضرت ابوبکر نے فدیہ لینے کا مشورہ دیا اور آپ نے انھیں حضرت ابراہیم و عیسٰی کے ساتھ تشبیہ دی۔ حضرت عمر نے ان کو قتل کرنے کا مشورہ دیا آپ نے ان کو نوح و موسٰی کے مشابہ قرار دیا۔ آپ نے دونوں میں سے کسی کی مذمت نہ کی بلکہ انبیاء کے ساتھ تشبیہ دیکر ان کی مدح و ستائش فرمائی۔ اگر آنحضور حتمی طور پر ایک بات پر عمل کرنے کے مامور ہوتے تو صحابہ سے مشورہ نہ لیتے۔

علاوہ ازیں اجتہادی امور میں اختلاف کا امکان ہے اور ہر اجتہاد مبنی بر صواب ہوتا ہے مثلاً حضرت ابوبکر غزوات میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا کرتے تھے حضرت عمر ان کو معزول کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے مگر حضرت ابوبکر اس مشورہ پر عمل نہیں کیا کرتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے "خالد مشرکین پر خدا کی شمشیر برہنہ ہیں"۔ حضرت عمر جب مسند خلافت پر فائز ہوئے تو حضرت خالد کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو مقرر کیا۔ دونوں کا طرز عمل اپنے اپنے وقت پر درست تھا۔ حضرت ابوبکر نرم مزاج تھے

اور حضرت عمران کے مقابلہ میں جابر و سخت گیر تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے مشورہ لیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

"جب عمر و ابو بکر دونوں کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میں ان کی خلاف ورزی نہیں کروں گا"۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات میں فرمایا۔

"اگر لوگ ابو بکر و عمر کی اطاعت کریں گے تو سیدھی راہ پر چلیں گے"۔

روایاتِ صحیحہ میں آیا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا "جب نبی موجود نہ ہوں اور نماز کا وقت آجائے تو لوگ اس وقت کیا کریں گے"؟ صحابہ نے جواب دیا۔ "اللہ و رسول ہی کو علم ہو گا"۔ آپ نے فرمایا۔ "کیا ابو بکر و عمر موجود نہیں؟ اگر ان دونوں کی اطاعت کرتے رہیں گے تو راہ راست پر آجائیں گے اور اگر ان کی نافرمانی کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے اور پوری امت گمراہی سے ہمکنار ہو جائے گی۔ آنحضور نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عباس حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا۔ "جنگ بدر کے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا۔ ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ آپ کے رفقاء تین سو انیس ۳۱۹ تھے۔ آنحضور قبلہ رخ ہوئے پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے "اے اللہ اپنے وعدہ کو پورا کر اور جو چیز دینے کا وعدہ کیا ہے وہ عطا کر اے اللہ اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو گا"۔ آپ ہاتھ اٹھائے قبلہ رو دعا کرنے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ آپ کی چادر کندھوں پر سے گر پڑی۔ ابو بکر آئے اور چادر اٹھا کر آپ کے کندھوں پر ڈال دی پھر پیچھے سے ہو کر آنحضور کے ساتھ چمٹ گئے اور کہا۔

"خدا کے نبی! بس کیجئے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

مُرْدِفِيْنَ (سورۃ انفال-۹)

ائمہ سلف کے یہاں حضرت ابوبکر و عمر کی عظمت و فضیلت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کی حد یہ ہے کہ شیعان علی تک اس سے متفق ہیں۔ ابن بطہ اپنے شیخ سے روایت کرتے ہیں جو ابوالعباس بن مسروق کے نام سے مشہور ہیں کہ ابواسحٰق سبیعی جب کوفہ آئے تو شمر بن عطیہ نے ہمیں تعظیماً کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ ابواسحٰق بیٹھ کر ہم سے بات چیت کرنے لگے۔ انہوں نے کہا جب میں کوفہ سے نکلا تھا تو میں نے کوفہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں پایا جو حضرت ابوبکر و عمر کی عظمت شان میں شک رکھتا ہو۔ اب میں واپس لوٹا ہوں تو لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ بخدا مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں[1]؟

ضمرہ سعید بن حسن سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے لیث[2] بن ابی سُلَیم کو یہ کہتے سنا میں

---

[1] یہ اس باب میں ایک تاریخی شہادت ہے کہ شیعہ کے نظریات کس عجلت کے ساتھ تغیر پذیر رہے۔ ابواسحٰق سُبیعی کوفہ کے مشہور شیخ اور عالم تھے۔ خلافت عثمانی میں حضرت عثمان کی شہادت سے تین سال قبل پیدا ہوئے۔ طویل عمر پائی اور ۱۲۷ھ میں فوت ہوئے۔ حضرت علی کے عہد خلافت میں کمسن تھے وہ خود کہتے ہیں "میرے والد مجھے اٹھا کر حضرت علی کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت علی کا سر اور داڑھی سفید تھی اور آپ خطبہ دے رہے تھے"۔ اگر ہمیں یہ بات معلوم ہو جائے کہ آپ کب کوفہ سے گئے اور کب واپس لوٹے تو ہم جان سکیں گے کہ وہ زمانہ کونسا تھا جس میں شیعہ حضرت علی کے اتباع میں شیخین کی عظمت و فضیلت کے قائل تھے۔ اور تاریخ کے کس دور میں شیعان علی نے آپ کی پیروی چھوڑ دی اور ان نظریات سے منحرف ہو گئے جن کا اظہار حضرت کوفہ کے منبر پر کیا کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ حضرت ابوبکر و عمر افضل الامت اور آپ کے وزیر و خلیفہ تھے۔ یہ امر موجب حیرت ہے کہ خوارج اور اباضیہ نے حضرت ابوبکر و عمر کے بارے میں اپنے اس نظریہ کو تبدیل نہ کیا جو انہوں نے حضرت علی کی رفاقت میں واقعۂ تحکیم تک اختیار کر رکھا تھا۔ حضرت ابواسحاق سبیعی کی زندگی کے آخری دور میں شیعہ نے اپنا یہ نظریہ تبدیل کر دیا اور اس ضمن میں حضرت علی کی نافرمانی کرنے لگے ۱۲

[2] اس حدیث کے راوی لیث بن ابی سلیم قرشی کوفی بہت بڑے عالم و زاہد تھے۔ انہوں نے عکرمہ سے استفادہ کیا۔ یہ معمر و شعبہ اور ثوری کے استاد تھے۔ یہ مسائل حج کے مشہور کوفی عالم تھے اور کوفہ بھر میں ممتاز تھے۔ ان کی وفات ۱۴۳ھ میں ہوئی ۱۲

نے متقدمین شیعہ کو دیکھا کہ وہ کسی کو بھی ابوبکرؓ و عمرؓ سے افضل نہیں سمجھتے تھے"۔

امام احمد بن حنبل رح سفیان بن عیینہ سے بطریق خالد بن سلمہ از مسروق روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا۔

"ابوبکرؓ و عمرؓ کی محبت اور ان کی فضیلت کی معرفت حاصل کرنا اتباع سنت میں داخل ہے"

حضرت مسروق و طاؤس جلیل القدر تابعین کوفہ میں سے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

متقدمین شیعہ کیوں نہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی فضیلت کے قائل ہوتے جب کہ حضرت علیؓ کا قول ہے۔

"آنحضورؐ کے بعد امت محمدی میں سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ"۔

حضرت علیؓ کا یہ قول قریباً اسی طرق سے روایت کیا گیا ہے۔

قبیلہ ہمدان والوں کے ساتھ حضرت علیؓ کے خصوصی مراسم تھے۔ آپ یہ شعر گنگنایا کرتے تھے

ولو کنت بوابا علی باب جنۃ   لقلت لھمدان ادخلی بسلام

(اگر میں جنت کے دروازہ کا دربان ہوتا تو قبیلہ ہمدان والوں سے کہتا کہ آرام سے جنت میں داخل ہو جاؤ)

قبیلہ ہمدان والوں سے بھی امام بخاری نے حضرت علیؓ کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے مثلاً سفیان ثوری منذر سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں ہمدانی ہیں کہ حضرت علیؓ کے بیٹے محمد بن حنفیہ نے ان سے دریافت کیا "آنحضورؐ کے بعد سب سے افضل کون ہیں؟" حضرت علیؓ نے فرمایا "بیٹا کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں؟" محمد بن حنفیہ نے کہا "نہیں"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "سب سے افضل حضرت ابوبکرؓ ہیں"۔ ابن حنفیہ نے پوچھا "ان کے بعد کون؟" فرمایا "عمرؓ"۔ یہ محمد بن حنفیہ اور حضرت علیؓ باپ بیٹے کا مکالمہ ہے۔ اسے تقیہ پر محمول نہیں کر سکتے ابن حنفیہ نے یہ روایت خاص طور سے اپنے والد سے نقل کی ہے اور یہ بات انہوں نے منبر پر کہی تھی۔ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے۔

"جو شخص مجھے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے افضل قرار دے گا میں اس پر حد قذف لگاؤں گا"۔

سنن میں حضرت علی سے مروی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"وہ دونوں جو میرے بعد ہیں یعنی ابوبکر و عمر کی اطاعت کیجیے"۔
علماء سے ایک قول یہ منقول ہے اور امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کا متفق علیہ قول لازم الاتباع ہے کیونکہ آنحضور نے ان کی سنت کی پیروی کا حکم دیا ہے۔
سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعدل و اکمل امور دے کر مبعوث کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ہنس مکھ بھی تھے اور مجاہد بھی آپ نبی الرحمۃ بھی تھے اور صاحب قتال و جہاد بھی۔ یہ صرف آپ ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ آپ کی امت بھی دونوں اوصاف کی حامل تھی۔ قرآن میں فرمایا۔
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (سورۃ الفتح - ۲۹)
نیز فرمایا۔
اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (سورۃ المائدہ - ۵۴)
چنانچہ آنحضور فاروقی شدت و حدت اور صدیقی لطف و کرم دونوں کے جامع تھے اور اسی بات کا حکم دیتے تھے جو عدل و انصاف پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ حضرت ابوبکر و عمر آپ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں حضرات کے امور و افعال کمالِ استقامت کے آئینہ دار تھے۔ جب آنحضور اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور یہ دونوں اکابر یکے بعد دیگرے آپ کے خلیفہ و نائب قرار پائے۔ تو ابوبکر نے اپنے کمال کا یوں اظہار فرمایا کہ حضرت عمر سے مشورہ لیکر اپنی روایتی نرمی کے ساتھ ان کی غلظت و شدت کو مخلوط کرتے رہے تاکہ اعتدال قائم رہے یہ حقیقت ہے کہ خالص نرمی اور خالص درشتی و سختی دونوں بگاڑ کی موجب ہوا کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکر نے یہ طرز عمل اسوۂ نبوی کی پیروی میں اختیار کیا تھا۔ آنحضور حضرت عمر فاروق سے بھی مشورہ لیا کرتے تھے اور بعض امور میں حضرت خالد بن ولید کو بھی شرف نیابت سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر آپ اولین خلیفۂ رسول قرار پائے۔ مرتدین کے خلاف حضرت ابوبکر نے جس شدت و غلظت کا ثبوت دیا تھا وہ فاروقی شدت و حدت سے بھی بڑھ کر تھی۔ حضرت عمر نے آپ سے کہا تھا۔ "اے نائب رسول! لوگوں پر رحم کیجیے"۔ حضرت ابوبکر نے کہا "کس بات پر رحم کروں آیا کسی جھوٹی بات پر یا کسی خود ساختہ شعر پر"!

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"آنحضور کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر نے خطبہ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم لومڑی کی طرح بزدل تھے آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں شیر بنا دیا۔"

جہانتک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات کا تعلق ہے آپ بذات خود سخت گیر تھے آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ نرم طبع صحابہ سے مشورہ لے کر اعتدال کو قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور سعد بن ابی وقاص و ابو عُبَید ثقفی و نعمان بن مقرن و سعید بن عامر جیسے اہل صلاح و زہد جو حضرت خالد بن ولید جیسے صحابہ سے بھی بڑے عابد و زاہد تھے آپ کے مشیر تھے۔

شوریٰ کا معاملہ بھی اسی قبیل میں شامل ہے۔ جن معاملات میں اللہ و رسول کا حکم حضرت عمر کو معلوم نہیں ہوا کرتا تھا۔ آپ ان میں صحابہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اصل بات یہ ہے کہ شرعی نصوص جامع کلمات، قضایا کلیہ اور قواعد عامہ کی حیثیت رکھتے ہیں شارع کے لیے یہ ممکن نہیں کہ روز قیامت تک پیدا ہونے والے جملہ مسائل کے ایک ایک فرد کو بوضاحت و صراحت بیان کر دے۔ نظر بریں امور متعینہ میں غور و فکر کر کے اجتہاد کے ذریعہ سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا وہ شارع کے کلمات جامعہ میں داخل بھی ہیں یا نہیں؟ فقہی اصطلاح میں اس اجتہاد کو تحقیق المناط کہتے ہیں جس پر مثبتین و منکرین قیاس سب کا اتفاق ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دو عادل اشخاص کو گواہ بنا لینا چاہئے اب کسی مخصوص شخص کے بارے میں ہمیں نص کے ذریعہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ عادل ہے یا نہیں بلکہ یہ بات اجتہاد خاص سے معلوم ہو گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ امانت اس کے حقدار کو ادا کر دینی چاہئے اور فرائض و مناصب بھی اسی شخص کو تفویض کرنا چاہئے جو ان کا اہل ہو مگر کسی متعین شخص کا کسی منصب کے لیے موزوں ہونا نص سے نہیں بلکہ اجتہاد خاص سے معلوم کیا جاتا ہے۔

اگر روافض کا خیال ہے کہ خلیفہ منصوص علیہ ہوتا ہے اس کا تقرر شرعی نص کی بنا پر

وجود میں آتا ہے) اور اس کے پہلو بہ پہلو وہ معصوم بھی ہوتا ہے تو یہ غلط ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلفاء وعمال غیر معصوم تھے تو امام وخلیفہ کیونکر معصوم ہو سکتا ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے کہ شارع ہر مخصوص ومتعین چیز کو صراحتاً بیان کرے اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ نبی وامام کو کسی مخصوص شخص کے باطنی احوال کا علم ہو۔ جہاں تک حضرت علی کا تعلق ہے جزئیات کے بارے میں آپ کا ظن اکثر مرتبہ غلط نکلا۔ اس سے معلوم ہوا کہ معصوم وغیر معصوم دونوں کے لیے جزئیات میں اجتہاد کرنا ضروری ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آپ میرے پاس جھگڑے چکانے آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے دعویٰ کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کر سکتا ہو۔ میں تو اسی طرح فیصلہ کرتا ہوں جیسے سنتا ہوں۔ جس شخص کو میں نے اس کے بھائی کا حق دے دیا تو اسے وصول نہ کرے یہ تو اسی طرح ہے جیسے میں اسے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر دیدوں"۔

کسی مخصوص معاملہ میں آنحضور کا فیصلہ اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے اسی لیے آپ نے دوسرے کا حصہ وصول کرنے سے منع فرمایا جب کہ وہ درحقیقت اس کا حقدار نہ ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے اس اعتبار سے آپ پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں جو سب سے زیادہ موزوں ہو اس کو منصب خلافت پر فائز کریں۔ لہٰذا اجتہاد کی بنا پر آپ کو معلوم ہوا کہ یہ چھ حضرات باقی لوگوں کی نسبت خلافت کا زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔ آپ کا یہ اجتہاد اپنی جگہ درست تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی شخص نے یہ بات نہ کہی کہ دوسرا کوئی شخص ان سے موزوں تر ہے۔ خلیفہ مقرر کرنے کا کام چھ اشخاص کی اس کمیٹی کے سپرد کیا، مبادا آپ ان چھ میں سے کسی کو امام مقرر کر دیں اور دوسرا شخص اس سے اصلح وانسب ہو چھ حضرات کو یہ کام تفویض کرنا کسی ایک شخص کی تعیین کی نسبت آپ کو زیادہ موزوں نظر آیا۔ یہ ایک بے غرض خلیفہ عادل ومخلص کا عمدہ ترین اجتہاد تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (سورۃ شوریٰ - ۳۸) (وہ اپنے معاملات شوریٰ سے طے کرتے ہیں)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (سورہ آل عمران۔ ۵۹) (معاملات میں صحابہ کے ساتھ مشورہ کیجئے۔)

نظر بریں حضرت عمر کا شوریٰ کو اختیار کرنا مصلحت کے پیش نظر تھا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر کا حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کرنا بھی مصلحت سے خالی نہ تھا۔ حضرت ابوبکر پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ علم و فضل اور استحقاق خلافت کے اعتبار سے کوئی شخص حضرت عمر کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آپ نے شوریٰ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس مبارک انتخاب کا اثر بھی مسلمانوں پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہا۔ ہر با انصاف دانشمند اس حقیقت سے باخبر ہے کہ عثمانؓ و علیؓ و طلحہؓ و زبیرؓ اور سعدؓ و عبدالرحمٰنؓ بن عوف رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی حضرت عمر کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حضرت ابوبکر و عمر کے طرز عمل میں چنداں فرق و امتیاز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔

"دنیا میں عاقل ترین افراد تین تھے (۱) حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی جس نے کہا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ (سورۃ القصص۔ ۲۶) (اے باپ اس کو مزدور بنا لو)

(۲) فرعون کی بیوی جس نے کہا تھا۔ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا (سورۃ القصص۔ ۹) (ممکن ہے ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے اپنا لڑکا بنا لیں)

(۳) حضرت ابوبکر جنہوں نے حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

میرے والد محترم کے کیا کہنے؟ وہ ایک بلند پہاڑ اور اونچی شاخ تھے۔ لوگوں کے سب خیالات جھوٹے ثابت ہوئے۔ وہ کامیاب ہوئے اور تم ناکام ٹھہرے وہ آگے بڑھ گئے اور تم پیچھے رہے جیسے گھوڑا منزل مقصود پر پہنچ کر تیز ہو جاتا ہے۔ عنفوان شباب میں وہ نوجوان قریش تھے۔ ادھیڑ عمر کو پہنچ کر قریش کی جائے پناہ تھے۔ قیدیوں کو چھڑاتے تنگدست کو کپڑے پہناتے۔ پراگندہ خاطر کو تسلی دلاتے۔ یہاں تک کہ ان کے دلوں کو آپ نے موہ لیا۔ پھر دینی کوششوں میں لگ گئے اور آپ کی غیرت و خودداری بڑھتی ہی چلی

گئی۔ آپ نے اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنا کر اسلامی رسوم کو زندگی بخشی۔ آپ حزین القلب اور کثرت سے رونے والے تھے۔ آپ کی آواز بڑی درد بھری تھی۔ مکہ کی عورتیں اور بچے آپ کی آواز سننے کے لیے جمع ہو جاتے اور آپ کا مذاق اڑاتے۔ قریش کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے تیر اندازی کے لیے اپنی کمانیں تان لیں اور آپ کو تیروں کا نشانہ بنا لیا۔ مگر آپ کا بال بیکا بھی نہ کر سکے اور آپ کی رفتار میں کچھ فرق نہ آیا جب دین کو استحکام نصیب ہوا۔ اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ لوگ فوج در فوج اس میں داخل ہونے لگے اور ہر قبیلہ جماعت در جماعت مشرف بہ اسلام ہونے لگا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

آنحضور کے وصال پر شیطان نے اپنے خیمے گاڑ دیے۔ ان کی طنابیں کھینچ دیں اور اپنے تمام حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ لوگوں کے جی میں خیال آیا کہ اب ان کی امیدیں پوری ہوں گی۔ حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ بھلا حضرت صدیق کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ آپ ہمہ تن اس کے لیے تیار ہو گئے۔ اپنے اصحاب و انصار کو جمع کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی رونق رفتہ لوٹ آئی۔ اس کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر سے جمع ہو گیا اور اس کی کجی جاتی رہی۔ آپ نے نفاق کو للکارا اور اسلام کو حیات نو بخشی۔ جب حقدار مل نے حق کو پا لیا اور جان و مال ضائع ہونے سے بچ گئے تو آپ کا آخری وقت آ پہنچا۔ آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ اس شخصیت سے پر کیا گیا جو رحم و کرم اور عدل و انصاف میں ان ہی جیسی تھی۔ وہ عمر بن خطاب تھے — وہ ماں قابل تحسین ہے جس نے عمر جیسے بیٹے کو شکم میں رکھا اور اسے دودھ پلایا۔ اس باب میں اس کا کوئی نظیر نہیں۔ آپ نے کفر کی مٹی پلید کر دی۔ شرک کو پارہ پارہ کر دیا اور دور افتادہ علاقوں کو فتح کر لیا۔ زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے اور جو کچھ چھپا رکھا تھا وہ نکال پھینکا۔ یہ مال و زر آپ کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور آپ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے یہ تعاقب کرتا اور آپ بچ نکلتے۔ زندگی بھر ورع و زہد سے جیا کیے اور اسی حالت میں دنیا چھوڑ کر راہیٔ ملک بقا ہوئے۔

اب مجھے بتائیے کہ تمہیں کس بات میں شک ہے اور تم میرے والد پر کیا حرف گیری کرتے

ہو؟ آیا ان کے عہد خلافت پر جب وہ عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل پیرا تھے۔ یا ان کے یوم وفات پر جب وہ تم پر مہربان تھے (کہ حضرت عمر جیسے شخص کو مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کیا) یہ خطبہ جعفر بن عون نے اپنے والد سے اور اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ یہ سب بخاری و مسلم کے راوی ہیں۔

اب باقی رہا حضرت عمر کا معاملہ تو آپ نے ان چھ حضرات کو متقارب الصفات خیال کیا تھا اور کسی کو بھی ترجیح نہ دی۔ بروایات صحیحہ آپ سے منقول ہے۔ کہ آپ نے فرمایا۔

"اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کردوں تو حضرت ابوبکر نے جو مجھ سے افضل تھے ایسا کیا تھا اور اگر کسی کو خلیفہ نہ بناؤں تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ میرے سامنے موجود ہے"۔

اختلاف بجائے خود کوئی معیوب چیز نہیں۔ اختلاف تو مختلف قراءتوں اور فقہی مسائل میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ ایک ہی عالم سے ایک ہی مسئلہ میں دو دو قول منقول ہیں۔ ائمہ کبار میں اختلاف ہمیشہ موجود رہا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات کے موقع پر فرمایا تھا۔

"اگر لوگ ابوبکر و عمر کی اطاعت کریں گے تو سیدھی راہ پر قائم رہیں گے"۔

نیز آنحضور سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر و عمر کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"اگر تم دونوں کسی بات پر متفق ہو جاؤ گے تو میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"میرے بعد ابوبکر و عمر کی پیروی کیجئے"۔

حضرت ابوبکر کا حضرت عمر کو خلیفہ بنانا مبنی بر مصلحت تھا کیونکہ آپ ہر اعتبار سے اس کے مستحق تھے اور جملہ کمالات سے بہرہ ور تھے۔ بعد میں ہر عاقل نے حضرت ابوبکر کے اس اقدام کی داد دی۔ حضرت عمر کا فعل بھی مصلحت سے عاری نہ تھا۔ آپ کے نزدیک وہ چھ حضرات صفات و کمالات میں ایک دوسرے کے لگ بھگ تھے۔ اس لیے آپ کسی کو

بھی ترجیح نہ دے سکے۔ ہر شخص میں ایک ایسی انفرادی فضیلت تھی جو دوسرے میں نہ تھی بنا بریں زہد و ورع کے تقاضا سے آپ نے کسی کی تعیین نہ کی اور امکانی حد تک امت کی مصلحت کو پیش نظر رکھا۔

ان چھ حضرات نے بالاتفاق حضرت عثمان کو خلیفہ مقرر کر دیا۔ آپ کے انتخاب میں مصلحت زیادہ اور فساد کم تھا۔ واجب بھی یہی ہے کہ ایسے شخص کو منصب خلافت پر فائز کیا جائے جس کی مصلحت فساد پر غالب ہو۔

خلیفہ کے لیے شرعاً ضروری نہیں کہ وہ اپنی موت کے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظم نے یہ معاملہ چھ صحابہ کی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ جن سے آخری وقت تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم راضی رہے تھے۔

شیعہ مصنف نے سالم مولیٰ ابی حذیفہ کا جو ذکر کیا ہے اس ضمن میں واضح ہو کہ صحابہ کے نزدیک احادیث نبویہ کے پیش نظر امامت و خلافت قریش کے قبیلہ میں محدود و محصور تھی۔ اسی دلیل سے سقیفہ بنی ساعدہ کے دن انہوں نے انصار کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ پھر حضرت عمر سالم کو خلیفہ کیونکر مقرر کر سکتے تھے؟ البتہ یہ ممکن ہے کہ انہیں جزئی امامت و ولایت تفویض کرنا چاہتے ہوں یا اس ضمن میں ان سے مشورہ لینا چاہتے ہوں یا اس قسم کے دیگر امور جن کے لیے سالم موزوں تھے۔ اس لیے کہ سالم بہترین صحابہ میں سے تھے۔

استخلافِ عثمان اور حضرت عمرؓ

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ حضرت عمر نے فاضل و مفضول کو جمع کر دیا تھا"۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ روافض کے نزدیک ہے۔ اہل سنت ان چھ حضرات کو متقارب الصفات قرار دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صحابہ شوریٰ میں متردد تھے۔ اگر شیعہ کہیں کہ علی افضل تھے اور عثمان مفضول تو ہم کہیں گے کہ پھر انصار و مہاجرین نے بالاتفاق مفضول کو خلیفہ کیوں بنا دیا؟ بعض علماء کا قول ہے (حضرت ایوب سختیانی کا نظریہ بھی یہی ہے)"جو شخص حضرت علی کو حضرت عثمان سے افضل قرار دیتا ہے وہ مہاجرین و انصار پر عیب لگاتا ہے"۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم عہد نبوت

میں صحابہ کی درجہ بندی کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔

"سب سے افضل ابوبکر ہیں پھر عمر اور پھر عثمان"

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ

"تینوں کے بعد ہم دیگر صحابہ میں تفاوت مراتب قائم نہیں کرتے تھے"۔

یہ تھے صحابہ کے نظریات عہد نبوت میں! اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ نے بالاتفاق کسی خوف و رغبت کے بغیر حضرت عثمان کی بیعت کرلی۔ اللہ تعالے نے صحابہ کی شان میں فرمایا

اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ (المائدہ - ۵۴)

(وہ مومنوں پر بڑے رحم دل اور کافروں کے مقابلہ میں سخت تھے اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرتے تھے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہ تھے)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "ہم نے سب سے بہتر شخص کو خلیفہ بنایا اور اس میں کوتاہی نہیں کی"۔

صحابہ میں حضرت عباس بن عبدالمطلب، عبادہ بن صامت اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم جیسے لوگ تھے۔ اگر یہ حق و صداقت پر مشتمل بات کہتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ بعض صحابہ عمال کے نصب و عزل کے بارے میں آنحضور سے بھی بات چیت کیا کرتے تھے اور آپ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچاتے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کیا تو طلحہ وغیرہ صحابہ نے اس پر اعتراض کیا۔ عہد نبوت میں حضرت اُسید بن حضیر نے اسامہ کے تقرر پر جرح کی تھی۔ حضرت عمر جب بعض حکام کو مقرر کرتے یا معزول کرتے تو صحابہ اس پر بھی معترض ہوا کرتے تھے۔ باوجودیکہ بنوامیہ کا بڑا زور تھا اور حضرت عثمان کے اعوان و انصار کی تعداد بہت تھی تاہم حضرت عثمان کے عزل و نصب پر لوگ نقد و جرح کیا کرتے تھے۔ خلافت عثمانی کے آخری دور میں جب لوگوں نے بعض عمال پر اعتراض کیا۔ تو حضرت عثمان نے ان کو معزول کر دیا۔

جب لوگوں نے حضرت عثمان سے بعض عمال کی شکایت کی کہ وہ ناجائز طور سے

مال وصول کرتے ہیں تو آپ نے ان کو معزول کر کے مال اخذ کرنے سے روک دیا۔ حالانکہ یہ اعتراض کہنے والے معمولی درجہ کے لوگ تھے اور حضرت عثمان خلیفۂ محتشم ہونے کے باوصف ان کی شکایات سنتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عزت وقوت کے باوجود جلیل القدر صحابہ کی بات حضرت عثمان کے بارے میں سنی نہ جاتی اور اس کے باوجود وہ خلیفہ قرار پاتے۔

خلافت عثمانی کی کثیر فتوحات تاریخ اسلام کا زریں باب ہیں[1]۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت عثمان نے اپنے اقارب کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا اور ان کو بھاری انعامات دیئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور اقارب کو ولایت وامارت پر فائز کیا جاتا رہا۔

---

[1] حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "میں نے حضرت عثمان کے منادی کو یہ آواز دیتے سنا اے لوگو! صبح حاضر ہو کر اپنی تنخواہ وصول کرو۔ چنانچہ لوگ حاضر ہو کر اپنا مشاہرہ وصول کر لیتے بعض اوقات منادی کہتا اے لوگو! مال غنیمت میں سے اپنا حصہ لے لو۔ لوگ جاتے اور پورا حصہ وصول کر لیتے۔ خدا کی قسم میں نے بگوش خود منادی کو یہ پکارتے سنا اے لوگو! حاضر ہو کر کپڑے لے لو۔ لوگ جاتے اور کپڑے لے لیتے۔ اسی طرح گھی اور شہد بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں خلافت عثمانی میں مال و دولت اور روپیہ پیسہ کی فراوانی تھی۔ علاوہ ازیں یہ کوئی مومن دوسرے مومن سے ڈرتا نہ تھا بلکہ الفت و محبت کا سلوک کرتا اور اس کی مدد کرتا تھا (یہ روایت محدث ابن عبدالبر نے ذکر کی ہے)

حضرت حسن بصری کے مشہور معاصر اور رفیق کار ابن سیرین جو حضرت عثمان کے ہم عصر تھے۔ فرماتے ہیں "حضرت عثمان کے عہد خلافت میں مال و دولت کی افراط تھی۔ اس کی حد یہ ہے کہ ایک لونڈی سونے میں تول کر فروخت کی گئی تھی۔ ایک گھوڑا لاکھ درہم اور کھجور کا ایک درخت ہزار درہم کے عوض فروخت کیا گیا تھا۔"

حضرت عبداللہ بن عمر سے حضرت علی و عثمان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ "تیرا برا ہو تو ایسے دو حضرات کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہا ہے جو دونوں مجھ سے افضل ہیں تم چاہتے ہو کہ میں ایک کی قدر بڑھا دوں اور دوسرے کی گھٹا دوں"۔

اس دور میں جو فتنے اٹھے وہ اس پہ مزید ہیں[1]۔ صحابہ کرام تلخ گھونٹ پی کر چپ رہنے کے خوگر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر نے فاروق اعظم کو خلیفہ مقرر کیا تو وہ اس پر بھی چپ نہ رہ سکے اور ابوبکر صدیق کو مخاطب کر کے کہا۔

---

[1] مورخ طبری اپنی تاریخ کی جلد پنجم صفحہ ۱۹۵ اپر لکھتے ہیں۔ "حضرت علی جب جنگ جمل کے بعد بیعت لینے سے فارغ ہوئے اور عبداللہ بن عباس کو والی بصرہ مقرر کیا تو اشتر نخعی یہ بات سنکر سخت ناراض ہوا اور کہا پھر ہمیں حضرت عثمان کو قتل کر کے کیا فائدہ پہنچا؟ یمن عبید اللہ کو مل گیا حجاز قثم کو بصرہ عبداللہ کو اور کوفہ حضرت علی کو حصہ میں آیا"۔ پھر سوار ہو کر واپس چل دیا۔ جب حضرت علی کو اشتر کی واپسی کا علم ہوا تو کوچ کا حکم دیا اور تیزی سے اشتر کے پاس جا پہنچے۔ مگر آپ نے اسے جتلایا نہیں اور کہا ہم آپ سے آگے نکل گئے"۔

حضرت عثمان پر اقربا نوازی کا اعتراض لغو ہے یہ بات دراصل ان کے فضائل و مناقب میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت علی حضرت عثمان کی مدح میں فرمایا کرتے تھے "وہ آپ صلہ رحمی کرنے میں سب صحابہ سے پیش پیش ہیں۔ حضرت عثمان نے بذاتِ خود اس اعتراض کا یہ جواب دیا تھا۔ "مجھ پر طعن کیا جاتا ہے کہ میں اپنے کنبہ و قبیلہ سے محبت رکھتا ہوں میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ان پر جملہ حقوق بھی عائد کرتا ہوں جہاں تک ان کو عطیہ جات دینے کا تعلق ہے میں اپنے مال سے ان کو تحائف دیتا ہوں اور مسلمانوں کے مال کو اپنے لیے یا کسی اور کے لیے حلال نہیں سمجھتا۔ میں عہد رسالت اور حضرت ابوبکر و عمر کے زمانہ میں بھی اپنے مال سے اقارب کو دیا کرتا تھا جب کہ مجھے مال کی شدید ضرورت تھی اور میں اس کا حریص بھی تھا۔ اب جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میں نے اپنا سب اثاثہ اپنے قبیلہ والوں کو دے دیا ہے۔ مجھے ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے"۔ مورخ طبری اپنی تاریخ کی جلد پنجم صفحہ ۱۰۳ اپر لکھتے ہیں۔

"حضرت عثمان نے اپنا مال و دولت اور اراضی بنو امیہ میں بانٹ دی تھی اور اپنے بیٹوں کو بھی وہی حصہ دیا جو دیگر اموی افراد کو ملا تھا۔ ابوالعاص کے بیٹوں سے شروع کر کے آپ نے آل حکم کے مردوں میں سے ہر ایک کو دس دس ہزار درہم دیئے چنانچہ انہوں نے ایک لاکھ درہم وصول کیئے۔ بنو عثمان کو بھی اتنا ہی دیا۔

آپ نے بنو العاص۔ بنو العیص اور بنو حرب میں اپنا سب اثاثہ تقسیم کر دیا"۔ ۱۲

آپ نے عمر جیسے متشدد کو ہم پر خلیفہ مقرر کر دیا ہے۔ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟

حضرت ابو بکر نے کہا۔

میں بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر کہوں گا کہ "میں نے سب سے بہتر شخص کو خلیفہ بنایا تھا"۔

لوگوں کی عادت ہے کہ جس شخص کے خلیفہ مقرر کیے جانے کی امید ہو اس کی رعایت کرتے ہیں مبادا بر سر اقتدار ہو کر وہ ان سے انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے مگر حضرت عثمان کی رو رعایت کی اس وقت کیا ضرورت تھی؟ اس لیے کہ آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا۔

مندرجہ بالا بیانات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ حضرت عثمان کو استحقاق کی بنا پر خلیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ یہ ایسے دلائل و براہین ہیں کہ ان پر غور و فکر کرنے سے ایک دانا شخص کی بصیرت و فراست میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر جاہل اور صاحب غرض عقل کا اندھا ہوتا ہے۔ جو شخص واقعات سے آگاہ اور دلائل سے باخبر ہو وہ ان دلائل کو دیکھ کر حق و انصاف کا ساتھ دے گا۔

بقول شیعہ حضرت عمر کے اقوال و افعال میں تناقض پایا جاتا ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت عمر نے شوریٰ کے لیے جن صحابہ کو چنا تھا ان میں سے ہر ایک کو آپ نے مورد طعن بنایا اور یہ ظاہر کیا کہ آپ اپنی موت کے بعد کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے برعکس تعیین امام کے لیے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بھی بنا دی"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے ان چھ حضرات پر اس طرح نقد و جرح نہیں کیا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ کوئی اور شخص ان کی نسبت خلافت کا زیادہ حقدار ہے بلکہ آپ نے صرف خلیفہ مقرر نہ کرنے کی وجہ بتائی تھی کہ چونکہ ان حضرات میں یہ نقائص موجود ہیں اس لیے میں ان کو خلیفہ نہیں بناتا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت عمر کے افعال میں تناقض پایا جاتا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے آپ نے چار

آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی کہ خلیفہ ان میں سے ایک آدمی ہو گا۔ پھر تین آدمی مقرر کیے اور پھر ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص نقلی دلائل سے احتجاج کر رہا ہو اسے چاہئے کہ کسی نقلی دلیل سے اسے ثابت کرے۔ بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے مگر اس میں ایسی کوئی بات مذکور نہیں بلکہ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ ان چھ حضرات نے یہ معاملہ تین اشخاص کو تفویض کر دیا تھا پھر تینوں نے مل کر عبدالرحمن بن عوف کو یہ اختیار دیا۔

حضرت عمر نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر سعد کو خلافت مل گئی تو بہتر ورنہ جس سے چاہے مدد حاصل کرے۔ کیونکہ میں نے اسے عجز و خیانت کی بنا پر خلافت سے محروم نہیں رکھا۔ پھر فرمایا میرے بعد جو شخص خلیفہ مقرر ہو گا۔ میں اسے تقوی اور اس بات کی وصیت کرتا ہوں۔ کہ انصار و مہاجرین کا حق پہچانے جن کو اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ نیز یہ کہ وہ ان کی عزت و آبرو کا خیال رکھے۔ یہ طویل حدیث ہے۔

حضرت فاروق اعظم کسی سے ڈرا نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک روافض (قاتلہم اللہ) ان کو امت محمدی کا فرعون کہہ کر پکارتے ہیں[1]۔ جب زندگی بھر آپ کسی سے نہیں ڈرا کرتے تھے تو حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے سے انہیں کونسی چیز مانع ہو سکتی تھی۔ اگر آپ ایسا کرتے تو سب لوگ آپ کا حکم مان لیتے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت عثمان سے حضرت عمر کو کیا فائدہ حاصل ہوتا جو حضرت علی سے نہیں ہو سکتا تھا؟ حضرت عمر نے تو اپنے بیٹے کو بھی خلافت کے امیدواروں میں سے نکال دیا تھا۔ سعید بن زید کو قریبی رشتہ دار ہونے کے باوجود اہل شوریٰ میں داخل نہ کیا۔ پھر آپ اپنے آخری وقت میں جب کہ کافر

---

[1] شیعہ حضرت صدیق اعظم کو الجبت اور حضرت فاروق کو الطاغوت کے نام سے پکارتے ہیں حوالہ کے لیے جرح و تعدیل کے فن میں شیعہ کی اہم کتاب تنقیح المقال فی احوال الرجال للمامقانی ج ۱ ص ۲۰۷ حالانکہ حضرت ابوبکر وہ عظیم شخصیت ہیں جن کی مدح و ثنا پر مشتمل سورہ توبہ کو لے کر حضرت علی خود آنحضور کے حکم کے مطابق مکہ مکرمہ پہنچے تھے"

بھی مومن ہو جاتا ہے اور فاسق و فاجر بھی خدا سے ڈرنے لگتا ہے کسی کا لحاظ کیونکر کرسکتے تھے ؟ اگر آپ جانتے ہوتے کہ حضرت علی بنا بر نص یا عظمت و فضیلت کی وجہ سے زیادہ حقدار ہیں تو آپ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے ان کو منصب خلافت پر فائز کرتے۔ یہ بات عادۃً محال ہے کہ حضرت عمر خدا سے ملتے وقت ایک ایسا کام کرتے جو دین و دنیا میں آپ کے لیے مفید نہ تھا۔ اور جس پر عذاب خداوندی میں گرفتار ہونا ناگزیر تھا۔ بفرض محال اگر حضرت عمر دشمن رسول بھی تھے (جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں) تاہم صحبت نبوی کی برکت سے آپ بہت کچھ حاصل کر چکے تھے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت عمر بے حد ذہین و فطین تھے۔ دلائل نبوت جن سے آنحضور بہرہ ور تھے آفتاب نصف النہار کی طرح واضح تھے۔ حضرت عمر جانتے تھے کہ اگر میں نے عداوت رسول کو ترک نہ کیا تو بروز آخرت عذاب الٰہی میں گرفتار ہونا پڑے گا۔ اس پر مزید یہ کہ موت کے وقت حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے سے آپ کا کونسا مقصد حل ہو جاتا ؟ آخر کیا وجہ تھی کہ (بقول شیعہ) آپ آخری دم تک آلِ رسول اور آپ کے چچازاد بھائی حضرت علی کی عداوت پر تلے رہے۔ حالانکہ عمر وہ شخص تھے جس نے اپنی خلافت کے زمانہ میں انتہائی سادہ زندگی بسر کی۔ موٹا جھوٹا پہنا۔ عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل کیا مال جمع کرنے اور جاہ و منصب سے گریزاں رہے۔

شیعہ کا یہ قول کہ "اگر حضرت علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے"۔ امام ابو المعالی الجوینی فرماتے ہیں۔ "فلک کج رفتار نے عمر جیسا انسان نہیں دیکھا تھا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "جب عمر ایک راہ پر چلتے ہیں تو شیطان اسے چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے"۔ حضرت عمر کے فضائل و مناقب اظہر من الشمس اور "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق ہیں۔

بنو ہاشم و بنو امیہ کے باہمی روابط

عہد رسالت اور خلافت صدیقی و فاروقی میں بنو ہاشم و بنو امیہ کے مابین حد درجہ یگانگت و اتحاد پایا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے سال جب ابو سفیان مسلمانوں کے حالات

معلوم کرنے کے لیے مکہ سے نکلا اور حضرت عباس نے اسے دیکھ لیا تو اپنے پیچھے سواری پر بٹھا کر آنحضور کی خدمت میں لائے اور عرض کیا حضور! ابوسفیان کو کوئی منصب عطا کیجئے کیونکہ یہ عز و جاہ کا حریص ہے۔ یہ سب محبت کی کرشمہ سازی ہے اس لیے کہ بنو ہاشم و بنو امیہ دونوں بنی عبد المناف سے تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت علی کا حد بندی کے بارے میں کسی مسلمان کے ساتھ جھگڑا تھا۔ حضرت عثمان چند آدمیوں کے ساتھ نکلے ان میں حضرت معاویہ بھی تھے۔ حضرت معاویہ نے آگے بڑھ کر حد کے ایک نشان کے بارے میں دریافت کیا کہ آیا یہ حضرت عمر کے زمانہ میں بھی موجود تھا؟ لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت معاویہ نے کہا۔ اگر یہ ناروا ہوتا تو حضرت عمر اسے تبدیل کر دیتے"۔ اس جھگڑا میں حضرت معاویہ نے حضرت علی کا ساتھ دیا حالانکہ علی موجود نہ تھے۔ بلکہ آپ نے ابن جعفر کو اپنا وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ حضرت علی فرمایا کرتے تھے "خصومات کا معاملہ بڑا دشوار ہوتا ہے اور شیطان ان میں آ دھمکتا ہے"۔

اس محاکمہ میں حضرت علی نے ابن جعفر کو اپنا وکیل بنا کر بھیجا تھا، امام شافعی اور دیگر فقہائ نے اس سے احتجاج کیا ہے کہ فریق مخالف کی مرضی کے بغیر خصومات میں وکیل بنانا جائز ہے۔ امام شافعی اور اصحاب احمد بن حنبل اسی کے قائل ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

حضرت علی کے رفقاء جب واپس آئے تو ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا۔ تمہیں معلوم ہے کہ معاویہ نے ہمارا ساتھ کیوں دیا؟ پھر خود ہی اس کی وجہ بتائی کہ ہم (بنو ہاشم) اور بنو امیہ دونوں بنی عبد مناف سے تعلق رکھتے ہیں"۔

ایک مرتبہ ایک محاکمہ پیش آیا جس میں ایک قاضی القضاۃ نے ہم سے مشورہ لینا چاہا انہوں نے ایک کتاب پیش کی جس میں حضرت علی کے اس محاکمہ کا ذکر تھا وہ "المنافیۃ" کا مطلب نہ سمجھ سکے تو میں نے انھیں اس کا مطلب سمجھایا کہ سب بنو عبد مناف عہد رسالت اور حضرت ابوبکر و عمر کی خلافت میں متحد تھے۔

حضرت عثمان و علی نے اپنی مرضی سے بلا جبر و اکراہ حضرت عبد الرحمن بن عوف کو انتخاب

امام کا اختیار تفویض کر دیا تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عمر جانتے تھے کہ عبد الرحمن بن عوف اپنے بھائی اور ابن العم (حضرت عثمان) کے سوا کسی اور کو خلیفہ مقرر نہیں کر سکتے"۔

یہ صاف جھوٹ اور شیعہ کی علم الانساب سے جہالت کا بیّن ثبوت ہے اس لیے کہ عبد الرحمن بن عوف حضرت عثمان کے برادر اور ابن العم ہرگز نہ تھے۔ بلکہ وہ حضرت عثمان کے ہم قبیلہ بھی نہ تھے۔ بخلاف ازیں وہ بنو زہرہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ بنو زہرہ آنحضور کے ننہال تھے اس لیے اس کا میلان بنی ہاشم کی جانب تھا۔ البتہ حضرت سعد قبیلہ بنو زہرہ میں سے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ میرے ماموں ہیں"۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سعد عبد الرحمن بن عوف کے قبیلہ بنو زہرہ سے تعلق رکھتے تھے پھر ان کو خلیفہ کیوں نہ مقرر کر دیا؟

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت عمر نے حکم دیا تھا کہ اگر تین دن تک بیعت نہ کریں تو ان سب کو قتل کر دیا جائے"

ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ کس دلیل سے ثابت ہے؟ مشہور بات یہ ہے کہ حضرت عمر نے انصار کو حکم دیا تھا کہ جانے سے پہلے چھ اشخاص میں سے ایک کی بیعت کر لیں۔ یہ چھ اشخاص حضرت عمر کے نزدیک منتخب روزگار تھے۔ پھر آپ ان کے قتل کا حکم کیونکر صادر کر سکتے تھے؟ نیز یہ کہ انصار ان کو قتل کرنے کے بارے میں حضرت عمر کی اطاعت کیسے کر سکتے تھے؟ اگر آپ قتل کا حکم صادر کرتے تو یہ بھی بتاتے کہ ان کے بعد کس شخص کو اس منصب پر فائز کیا جائے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ یہ سب اپنے اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ ان کو قتل کرنے کی جرأت کون کرتا؟ کسے معلوم نہیں کہ صرف حضرت عثمان کے قتل سے کس قدر فتنوں کا ظہور ہوا تھا۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ چھ حضرات خلیفہ بننا پسند نہیں کرتے تھے تو پھر ان کو قتل کرنا کس بنا پر جائز ہوا؟ ہم نے ایسا کبھی نہیں سنا کہ کسی شخص نے خلیفہ بننے سے انکار کیا ہو اور اس جرم میں اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے۔

یہ امر موجب حیرت ہے کہ روافض کے نزدیک وہ چھ حضرات حضرت علی کے سوا واجب القتل تھے۔ حضرت عمر ان کو خلیفہ بنا کر ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ پھر ان کو تہ تیغ کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں یہ "جمع بین الضدین" نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت میں شرکت نہ کی مگر کسی شخص نے انہیں نہ پیٹا نہ قید کیا قتل کرنا تو درکنار۔ حضرت علی نے کافی مدت تک حضرت ابوبکر کی بیعت نہ کی تاہم آپ نے انہیں کچھ نہ کہا۔ یہانتک کہ بلاجبر و اکراہ خود حاضر ہو کر انہوں نے بیعت کر لی اس کے باوجود حضرت ابوبکر و عمر دونوں حضرت علی کی تعظیم و تکریم بجالاتے رہے۔

حضرت ابوبکر فرمایا کرتے تھے "لوگو! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے آپ کے اہل بیت کا خیال رکھو"۔

اکرام اہل بیت اور ابوبکرؓ و عمرؓ

حضرت ابوبکرؓ ایک مرتبہ تنہا حضرت علی کے گھر تشریف لے گئے وہاں دیگر بنو ہاشم بھی تھے۔ حضرت ابوبکر نے ان کی مدح و ستائش کی۔ اس کے جواب میں بنو ہاشم نے آپ کے مستحق خلافت ہونے کا اعتراف کیا۔ اگر حضرت ابوبکر و عمر اپنے اپنے عہد خلافت میں حضرت علی کو الم و رنج پہنچانا چاہتے تو وہ بہمہ وجوہ اس کی قدرت رکھتے تھے۔ مگر ان کا مقام بلحاظ تقویٰ اس سے کہیں بلند تھا۔ کہ وہ ایسی پست حرکات پر اتر آتے۔

جاہل شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر نے حضرت علی کو اس وقت ظلم کا نشانہ بنایا جب وہ ظلم کی مدافعت کر سکتے تھے اور ابوبکر و عمر اگر ظلم کرنا چاہتے تب بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے اس پر طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر نے قوت و شوکت کے زمانہ میں جب سب لوگ آپ کے زیر فرمان تھے حضرت علی پر ظلم و ستم کیوں نہ ڈھایا؟ جیسے سلاطین و ملوک کی عادت ہے کہ جس کا خوف انہیں دامنگیر رہتا ہو وہ اپنے عروج کے زمانہ میں اس پر کاری ضرب لگاتے ہیں اگر ابوبکر و عمر حضرت علی پر مظالم توڑنا چاہتے تو یہ بات ان کے لیے آنحضور کی وفات کے بعد وجود نص کے باوجود

(جیسا کہ شیعہ کا خیال ہے) حضرت علی کو محروم خلافت کرنے سے بھی آسان نہ تھی۔
اس کے عین برعکس یہ دونوں حضرات حضرت علی سے بہترین سلوک روا رکھتے تھے۔
حضرت علی نے بھی ان کی شان میں کبھی ایک لفظ تک نہ کہا۔ نہ کبھی ان کے ظلم سے فریاد کی۔
بلکہ حضرت علی ابوبکر و عمر سے الفت و محبت کا سلوک کرتے اور ظاہراً و باطناً ان کی تعظیم بجا
لاتے رہے۔ یہ ایک مشہور بات ہے اور ہر تاریخ دان اس سے آگاہ ہے اور اگر کوئی شخص
روافض کے کذب و بہتان کا دلدادہ ہو جو اس امت میں منقولات سے نابلد محض علم الآثار
سے یکسر بیگانہ اور محال و متناقض جھوٹ کے پجاری ہیں جس کو ایک چوپایہ ہی باور کر سکتا
ہے ــــ تو یہ ایک الگ بات ہے۔ روافض دیہات کے ان افسانہ گو لوگوں کی مانند ہیں
جو دیہاتی عوام کو جھوٹی کہانیاں سناتے ہیں اور پہاڑی و جنگلی باشندے اس پر سر
دھنتے ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"جہاں تک عثمان کا تعلق ہے اس نے نااہل لوگوں کو بڑے بڑے منصب عطا کیے
تھے۔ ان میں سے بعض خائن و فاسق بھی تھے[1]۔ اقارب کو بڑے بڑے علاقے عطا کیے
اور عتاب کے باوجود اس سے باز نہ رہے۔ ولید بن عقبہ کو عامل مقرر کیا اس نے نشہ کی حالت
میں نماز پڑھائی[2]

---

[1] اعداء صحابہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جن مطاعن کا نشانہ بنایا ہے قاضی ابوبکر بن العربی نے ان کا نام قواصم رکھا ہے اور ہر قاصمہ کا جواب کتاب و سنت کے دلائل و براہین سے "عاصمہ" کے نام سے دیا ہے اس مجموعہ کا نام "العواصم من القواصم" ہے جس پر علامہ محب الدین نے بڑے عالمانہ حواشی تحریر کیے ہیں۔ صحابہ کے بغض و عناد سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کا مطالعہ بیحد مفید ہے۔ اعداء صحابہ نے اپنی تصانیف کو جھوٹ کا پلندہ بنا دیا تھا۔ یہ جھوٹ لوگوں میں خوب پھیلتا رہا اور بعض مسلمان حضرات صحابہ سے بددل ہونے لگے قاضی ابن العربی کی اس قابل قدر تصنیف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق کا بول بالا کیا اور لوگ بڑی حد تک مستفید ہوئے وللہ الحمد ۱۲

[2] اس کی تحقیق کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ص ۸۵-۸۷ نیز ۹۰-۹۳۔

نوٹ:۔ العواصم من القواصم کا ترجمہ عنقریب شائع ہو رہا ہے ۱۲

سعید بن عاص کو کوفہ کا والی مقرر کیا اس نے وہاں ایسے کام کیے جن کی بنا پر اسے کوفہ سے نکال دیا گیا۔

لے حضرت سعید بن عاص فصحائے قریش میں سے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب قرآن کریم لکھوانا شروع کیا تو سعید بن عاص کو بلا کر اس کی عبارت درست کی کیونکہ سعید کا لہجہ آنحضور صلی اللہ علیہ و سلم سے بہت ملتا جلتا تھا۔ سعید اس حد تک مخلص مسلمان تھے کہ جب ایک مرتبہ حضرت عمر نے کہا کہ "میں نے تمہارے والد قتل نہیں کیا بلکہ اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا تھا" اس کے جواب میں سعید نے کہا: "اگر آپ قتل بھی کرتے تو آپ حق پر ہوتے اور وہ باطل پر"۔
سعید بن عاص نے طبرستان کا علاقہ فتح کیا اور جرجان پر بھی چڑھائی کی تھی۔ آپ کی فوج میں حضرت حذیفہ اور دیگر کبار صحابہ شامل تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت دھاری دار چادر لے کر آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا حضور میں نے نذر مانی تھی کہ یہ چادر اس شخص کو دوں گی جو عرب بھر میں سب سے زیادہ باعزت ہو۔ آپ نے فرمایا اس لڑکے کو دے دو وہ لڑکا نامی گرامی مجاہد و فاتح سعید بن عاص تھا جس کے بارے میں رافضی نے حضرت عثمان پر تنقید کی ہے کہ انہوں نے اسے کوفہ کا والی مقرر کیا۔
اگر قرآن کی عربیت کی تصحیح شیعہ کے نزدیک قابل فخر کارنامہ نہیں ہے تو آنحضور کا حضرت سعید کو اکرم العرب قرار دینا یقیناً دین و دنیا میں باعث فخر ہے۔ حضرت سعید میں صرف ایک ہی عیب پایا گیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے طبرستان کو فتح کیا اور کبار صحابہ نے قائد کی حیثیت سے جرجان پر حملہ کرکے اہل ایران کو مجوسیت سے نکال کر دین اسلام سے روشناس کرایا۔ حضرت سعید کی مرویات صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی میں موجود ہیں۔ مگر شیعہ کے نزدیک احادیث نبویہ کے یہ سب ذخیرے بیکار ہیں اور الکافی کی موجودگی میں ـــــ جو اکاذیب کا ایک عظیم طومار ہے ـــــ ان کی کچھ حاجت نہیں۔
حضرت سعید کے مفاخر میں سے یہ حدیث ہے جس کو دیکھ کر شیعہ غصہ سے دانت پیسنے لگتے ہیں۔ محدث طبرانی بطریق محمد بن قانع بن جبیر بن مطعم وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سعید بن عاص کی عیادت کرتے دیکھا (باقی بر صفحہ ۵۴۸)

(بقیہ حاشیہ ص۵۴۷) آپ ایک کپڑے کو گرم کر کے سعید کو ٹکور کر رہے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ سعید بن عاص کے دادا سے متعلق ہے۔ اس کا نام بھی سعید بن عاص ہے۔ اس صورت میں یہ واقعہ مکہ میں قبل از ہجرت پیش آیا۔ حالانکہ سعید کا دادا سعید بن عاص اس وقت مشرک تھا۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ عیادت کا واقعہ سعید کے دادا سے متعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے قرابتداری کی بنا پر ایسا نہیں کیونکہ سعید کا دادا بنو امیہ کے قبلیہ سے تعلق رکھتا تھا اور بنو ہاشم و بنو امیہ دونوں بنی عبد مناف کے خاندان سے ہیں۔ اس صورت میں بھی آنحضور کا یہ فعل شیعہ کے منافی ہے جو جاہلیت و اسلام کے ہر دور میں بنو امیہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف آنحضور نے قرابت داری کے پیش نظر بنو امیہ سے دوستانہ مراسم استوار کر رکھے تھے۔ قبل ازیں ابوسفیان کا واقعہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ آنحضور کا یہ ارشاد کہ سعید بن عاص اکرم العرب ہے اعلام نبوت میں سے ہے۔ آنحضور کو نور وحی کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ سعید بہت بڑے فاتح ہوں گے اور اس طرح اکرم العرب قرار پائیں گے۔

ابن ابی خیثمہ بطریق یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ محمد بن عقیل بن ابی طالب اپنے والد کے پاس آئے اور پوچھا سب لوگوں میں سے افضل کون ہے؟ فرمایا میں اور میرا بھائی"۔ حضرت معاویہ فرمایا کرتے تھے "سعید بن عاص قریش کے نور نظر ہیں"۔

سعید بن عاص بڑے سخی تھے۔ جب سائل کوئی چیز مانگتا اور آپ کے پاس موجود نہ ہوتی تو اسے لکھ کر دے دیتے کہ میں فلاں چیز تجھے دیدوں گا۔ جب فوت ہوئے تو ان پر اسی ہزار دینار قرض تھا جو ان کے بیٹے عمرو نے ادا کیا۔ صالح بن کیسان روایت کرتے ہیں کہ سعید بڑے باوقار اور متحمل مزاج تھے۔ جب کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرتے تو اس کا اظہار نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کا قول ہے۔ "دل کی حالت بدلتی رہتی ہے یہ موزوں نہیں کہ آدمی ایک چیز کی آج تعریف کرے اور کل اسی کی مذمت کرنے لگے"۔

یہ ہیں حضرت سعید بن عاص اموی کے فضائل و مناقب جن کے بارے میں رافضی امیر المومنین عثمان کو ملعون کرتا ہے کہ انہوں نے سعید کو والی کوفہ مقرر کیا۱۲۔

حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو حاکم مصر مقرر کیا جہاں اس نے

۱؎ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح آنحضور کے صحابی ہیں۔ یہ قریش کے قبیلہ عامر بن لوئیؓ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے۔ فتح مکہ کے وقت حضرت عثمان نے جب ان کے لیے پناہ طلب کی تو آنحضور نے ان کو پناہ دیدی۔ یہ مخلص مسلمان اور عظیم مجاہد و فاتح تھے۔
جب ملک مصر دین اسلام کے حلقہ میں داخل ہوا تو ابن ابی سرح ان مجاہدین صحابہ کے سرخیل تھے جن کو مصر فتح کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جہاد مصر میں یہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کے دائیں بازو میں تھے اور بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جب وادی نیل میں مسلمانوں کے قدم جم گئے تو ابن ابی سرح نے فسطاط کے گردونواح میں جہاں مصر میں اولین مسجد تعمیر ہوئی۔ اپنے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات میں ابن ابی سرح کا ذکر ان صحابہ میں کیا ہے جنہوں نے مصر میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔

حافظ ابن حجر نے الاصابہ ج ۲ ص ۳۱۷ میں البرقی کی تاریخ سے بروایت ابی صالح کاتب لیث بن سعد امام مصر حضرت لیث بن سعد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

"خلافت فاروقی میں ابن ابی سرح علاقہ الصعید کے حاکم تھے۔ جب حضرت عثمان منصب خلافت پر فائز ہوتے تو آپ نے مصر کا سب علاقہ ان کو تفویض کر دیا۔ امارت کے زمانہ میں ان کی تعریف کی جاتی تھی۔"

مصر کے عظیم امام و فاضل حضرت لیث بن سعد کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ روافض نے ابن ابی سرح پر کس قدر جھوٹ باندھا ہے۔ ۲۵ھ میں ابن ابی سرح پورے مصر کے حاکم اعلیٰ تھے۔ ۲۷ھ میں پورا افریقہ فتح ہو گیا۔ یہ عظیم ترین فتح تھی جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ مال غنیمت کی یہ فراوانی تھی کہ ایک سوار کے حصہ میں تین ہزار دینار آئے۔ چاروں عبادلہ (عبداللہ بن عمر عبداللہ بن زبیر عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن عاص) جلالت قدر کے باوصف ابن ابی سرح کے زیر قیادت تھے۔

شمالی افریقہ فتح ہونے کے بعد بھی ابن ابی سرح نے ۳۱ھ تک جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۳۴ھ میں ذات السواری پر چڑھائی کی۔ اسی دوران باغیوں نے حضرت عثمان کے (باقی برصفحہ ۵۵۰)

بہت مظالم ڈھائے۔ لوگوں نے جب اس کی شکایت کی تو حضرت عثمان نے پوشیدہ طور پر اسے لکھا کہ وہ اپنے عہدہ پر ڈٹا رہے اور محمد بن ابی بکر کو قتل کر دے۔ حضرت عثمان نے

(بقیہ حاشیہ ص ۵۴۹) خلاف خروج کیا۔ ابن ابی سرح نے حضرت عثمان کو لکھ کر امداد کی پیشکش کی اور براستہ عریش و عقبہ مدینہ پہنچنے کی اجازت چاہی۔ سائب بن ہشام بن عُمیر کو حاکم مقرر کیا۔ ابھی مدینہ نہیں پہنچ سکے تھے کہ ابن ابی سرح کو حضرت عثمان کی شہادت کی خبر پہنچی اور آپ مصر لوٹ آئے مصر پر ابن ابی حذیفہ نے قبضہ جما لیا تھا۔ اس نے ابن ابی سرح کو عدود مصر میں داخل ہونے سے روکا۔ چنانچہ آپ فلسطین چلے گئے اور عسقلان و رملہ کے درمیان سکونت اختیار کی۔ ۵۷ھ تک فلسطین میں گوشہ نشین رہے۔

بغوی نے بسند صحیح یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا۔

"ابن ابی سرح مقام رملہ کی طرف چل دیئے جب صبح ہوئی تو کہا "اے اللہ اس صبح کو میرا آخری عمل بنا دے"۔ پھر وضو کیا اور نماز ادا کی۔ پھر دائیں جانب سے سلام پھیرا۔ جب بائیں جانب سلام پھیرنے لگے تو ان کی قفس عنصری سے پرواز کر گئی"۔ رحمہ اللہ تعالےٰ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت اسی سند سے ذکر کی ہے ۱۲

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا) لے ہم نے العواصم من القواصم ص ۱۰۹-۱۱۰ نیز ۱۲۶-۱۲۹ کے حواشی پر اس خط کے بارے میں علمی تحقیق کی ہے جو بقول شیعہ حضرت عثمان یا مروان نے ابن ابی سرح کے نام ارسال کیا تھا۔ نیز حضرت علی کے اظہار حیرت کرنے پر گفتگو کی ہے کہ عراقی فتنہ پرداز اور مصر کے شریر لوگ مختلف راستوں سے بیک وقت مدینہ پہنچ گئے۔ جیسے پہلے انہوں نے یہ بات طے کر رکھی ہو۔ حالانکہ عراق والوں کو مطلقاً اس خط کا علم نہ تھا۔ جو اہل مصر نے حامل خط سے لے لیا تھا۔ جب حضرت علی نے اس پر اظہار تعجب کیا تو اہل عراق نے کہا "کیا آپ نے ہمیں تحریر نہیں کیا تھا۔ کہ واپس مدینہ آجاؤ"۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حلف اٹھا کر کہا کہ انہیں اس خط کا کوئی علم نہیں"۔

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کا مظہر ہے کہ دو جعلی خط تحریر کیے گئے تھے۔ ایک حضرت علی کی جانب سے اہل عراق کے نام اور دوسرا حضرت عثمان کی طرف سے اہل مصر کی طرف (باقی بر صفحہ ۵۵۱)

معاویہ کو امیر شام مقرر کیا جہاں اس نے فتنے برپا کئے۔

حضرت عثمان پر شیعہ کے اعتراضات

حضرت عثمان نے عبداللہ بن عامر بن کریز کو بصرہ کا والی مقرر کیا جہاں اس نے بہت برے کام کیے[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۰) یہ بات عقل و قیاس کے منافی ہے کہ یہ خط حضرت عثمان یا مروان نے ابن ابی سرح کے نام لکھا خصوصاً جبکہ انہیں معلوم تھا کہ اس نے مدینہ حاضر ہونے کی اجازت چاہی ہے اور وہ اس وقت فلسطین اور مدینہ کے درمیان غالباً عقبہ کے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ جب ابن ابی سرح مصر میں موجود ہی نہیں تھے۔ تو یہ خط ان کی جانب مصر کیونکر بھیجا گیا؟

فتنہ سامانی کے دور کی تاریخ لکھنے والے مصنفین اس حقیقت سے مطلع نہ ہو سکے کہ جب عراق و مصر کے انقلابی مدینہ سے چلے گئے تھے تو انقلاب کے دو عظیم لیڈر اور حضرت عثمان کے شدید مخالف یعنی اشتر نخعی و حکیم بن جبلہ مدینہ سے نہیں گئے تھے۔ مدینہ قیام پذیر رہنے سے ان کا مقصد وحید یہ تھا کہ جس مشن کے لیے وہ مدینہ آئے تھے (حضرت عثمان کا قتل) اس کو بہر صورت پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان و علی کی جانب سے دو جعلی خط تیار کیے اور زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے دو اونٹ کرایہ پر لے کر دو اعرابیوں کے ذریعہ ایک کو مشرقی راستہ سے عراق اور دوسرے کو مصریوں کی طرف بھیجا جو مغربی جانب ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ خطوط نویسی کا واحد مقصد سوئے ہوئے فتنہ کو جگانا اور از سر نو شر کو امت میں پھیلانا تھا۔ فتنہ کے ان دونوں بانیوں کے سوا کسی اور کو اس فتنہ پردازی میں ہرگز دلچسپی نہ تھی۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] امت محمدی کے مجوس (شیعہ) کی نگاہ میں حضرت عبداللہ بن عامر کا بدترین فعل یہ تھا کہ اس نے ایران میں کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ عبداللہ بن عامر کے عہد امارت میں فارس کے آخری بادشاہ یزدگرد کو قتل کر دیا گیا تھا۔ عبداللہ بن عامر والد کے اعتبار سے نسباً عبشمی اور والدہ کی طرف سے ہاشمی تھے ان کی دادی اروی بنت کریز تھیں۔ والدہ کا نام البیضاء بنت عبدالمطلب بن ہاشم تھا۔ یہ آنحضور کی پھوپھی تھیں۔ جب عبداللہ بن عامر پیدا ہوئے (باقی بر صفحہ ۵۵۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۱) اور انھیں آنحضور کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے بنو عبد شمس کو مخاطب کر کے فرمایا۔ یہ بچہ تمہاری نسبت ہم سے زیادہ ملتا جلتا ہے"۔ آپ بچے کے منہ میں تھوک ڈالتے جاتے تھے اور وہ نگلتا جاتا تھا آپ نے فرمایا "یہ بچہ تروتازہ ہے"۔ آنحضور کے ارشاد مبارک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن عامر جس زمین میں بھی کام کرتے وہاں پانی نکل آتا۔ ابن عامر پہلا شخص ہے جس نے عرفات میں حوض بنائے اور چشمے کا پانی وہاں پہنچایا۔

ابن عامر بڑے سخی، شجاع اور نیک فال تھے۔ حضرت عثمان نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بعد ۲۹ھ میں ابن عامر کو بصرہ کا والی مقرر کیا پھر عثمان بن ابو العاص کے بعد فارس کا علاقہ بھی ان کو سونپ دیا۔ ابن عامر نے پورا خراسان۔ اطراف فارس و سیستان اور کرمان کے ممالک فتح کر لیے اور غزنہ کے قریب جا پہنچے۔ ان فتوحات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ابن عامر نے نیشاپور سے احرام باندھا اور حالت احرام میں پاپیادہ حجاز پہنچے۔ اتفاق سے وہ سردی کا موسم تھا۔ جب حضرت عثمان کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ملامت کی اور فرمایا "آپ نے یہ اقدام فریب دہی کے لیے کیا ہے"۔

ان فتوحات سے کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا حضرت عثمان نے یہ سب مال مہاجرین و انصار میں تقسیم کر دیا۔ اور اس سے اسلامی جہاد و فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنے میں مدد ملی۔

یہ ہیں حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ "افعال شنیعہ" جن پر رافضی قلمکار نقد و جرح کر رہا ہے۔ اس پر جس قدر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ یہ مجاہدین و فاتحین شیعہ کی نگاہ میں مذموم ہیں اور ان کے مقابلہ میں ہلاکو خاں اور سلطان خدابندہ تک اس کی نسل قابل مدح و ستائش ہے۔ آنحضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سچ فرمایا۔ کہ بروز حشر آدمی کو اس شخص کی رفاقت نصیب ہوگی۔ جس کے ساتھ وہ محبت رکھتا ہو"۔

شیعہ کی یہ تضاد خیالی صرف دینی مرض ہی نہیں بلکہ عقلی و اخلاقی بیماری بھی ہے۔ وَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانَا مِمَّا ابْتَلٰی بِہٖ کَثِیْرًا مِّنْ خَلْقِہٖ۔ ۱۲

مروان کو والی مقرر کر کے اپنی انگوٹھی اس کے حوالہ کر دی[1]۔ جس کا نتیجہ قتل عثمان کی صورت

---

[1] انگوٹھی پر قبضہ کرنے سے رافضی مصنف کا اشارہ اس جعلی خط کی جانب ہے جس کا تذکرہ ہم قبل ازیں کر چکے ہیں۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ قائد کوفہ اشتر نخعی اور قائد بصرہ حکیم بن جبلہ جب اپنے مقصد میں ناکام رہے اور کوفہ و بصرہ کے انقلابی حضرت عثمان کے دلائل سے مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ عراقیوں نے مشرق کی جانب عراق کا رخ کیا اور مصری جانب غرب عازم مصر ہوئے۔ یہ دونوں لیڈر مدینہ میں مقیم رہے اور اپنے رفقاء کے ساتھ واپس نہ گئے۔

چند دنوں کے بعد بیک وقت دو سوار مصری و عراقی قافلہ سے ملے۔ جو سوار مصری قافلہ سے ملا تھا وہ ان کے قریب پہنچ کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگا جب اسے یقین ہو گیا کہ قافلہ والوں نے اسے دیکھ لیا ہے تو پھر چھپنے کی کوشش کی۔ جب انہوں نے وجہ پوچھی تو اس نے ایک خط دکھایا جس پر حضرت عثمان جیسی مہر لگی تھی اس نے بتایا کہ وہ یہ خط لیکر امیر مصر عبد اللہ بن ابی سرح کی طرف جا رہا ہے۔ خط میں لکھا تھا کہ محمد بن ابی بکر کو قتل کر دو بعینہ اسی وقت عراقی قافلہ کو ایک شخص ملا جس کے پاس ایک خط تھا جس پر حضرت علی کی مہر کی مانند مہر لگی ہوئی تھی خط میں لکھا تھا کہ مدینہ واپس آجاؤ"۔

جب دونوں فریق مدینہ پہنچے تو حضرت علی اور اکابر صحابہ وجہ دریافت کرنے کے لیے نکلے مصری لوگوں نے حضرت عثمان کے جعلی خط کا ذکر کیا۔ حضرت علی نے پھر عراقیوں سے وجہ دریافت کی انہوں نے کہا کیا آپ نے خط کے ذریعہ ہمیں واپس آنے کا حکم نہیں دیا؟ حضرت علی نے حلف اٹھا کر کہا کہ مجھے اس خط کے بارے میں کچھ علم نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان و علی کے نام سے یہ جعلی خط تیار کیے گئے تھے خصوصاً جبکہ حضرت عثمان و مروان کو معلوم تھا کہ عبد اللہ بن ابی سرح مصر میں موجود ہی نہیں۔ مروان ایک ادنیٰ آدمی کے ساتھ بھی خیانت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر وہ ازراہ خیانت حضرت عثمان کی انگوٹھی کیونکر استعمال کر سکتے تھے جو امور خلافت میں بڑی اہم چیز سمجھی جاتی ہے۔ بفرض محال اگر حضرت عثمان کی انگوٹھی ازراہ فریب مروان نے استعمال کی تھی تو حضرت علی کی انگوٹھی استعمال کرنے والا کون تھا؟

(بقیہ بر صفحہ ۵۵۴)

میں ظہور پذیر ہوا۔ حضرت عثمان اپنے اقارب کو بہت مال دیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان کی کثرت جود وسخا کا یہ عالم تھا کہ ان کے چار داماد تھے ان کو چار لاکھ دینار عطا کیے[1]۔ ابن مسعود حضرت عثمان کو مورد طعن بناتے اور ان کی تکفیر کیا کرتے تھے[2]۔ حضرت عثمان

(بقیہ حاشیہ ص ۵۵۳) روافض اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مروان وہ شخص ہے کہ حضرت زین العابدین جیسے لوگ اس سے دینی احکام پر مشتمل روایات اخذ کرتے ہیں۔ مروان سے جن لوگوں نے روایت کی ہے ایک حضرت زین العابدین علی بن حسین بھی ہیں۔ جن حفاظ وائمہ حدیث نے یہ بات بیان کی ہے ان میں سے آخری محدث حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں جنھوں نے "الاصابہ" میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے طبقات الشافعیۃ الکبریٰ از تاج الدین السبکی زیر ترجمہ ابو منصور محمد بن احمد بن الازہر صاحب تہذیب اللغۃ (۲۸۲-۳۷۰)

حافظ ابن حجر نے مروان کو جن رواۃ وتلامذہ کا ذکر کیا ہے ان میں سرخیل تابعین سعید بن مسیب اور ان کے برادر فقہائے سبعہ ابوبکر بن عبد الرحمن وعُبید اللہ بن عبد اللہ وعروہ بن زبیر اور ان کے نظائر وامثال مثلاً عراک بن مالک غفاری مدنی جو صائم الدہر تھے نیز عبد اللہ بن شداد جو حضرت عمر وعلی ومعاذ سے روایت اخذ کیا کرتے تھے۔ عروہ بن زبیر کی مروان سے روایت صحیح بخاری کتاب الوکالت میں موجود ہے نیز دیکھئے مسند احمد ج ۴ ص ۳۲۱ و ۳۲۳ و ۳۲۶ و ۳۲۸ نیز ج ۵ ص ۱۸۹۔

عراک کی مروان سے روایت امام اہل مصر لیث بن سعد نے یزید بن حبیب سے ذکر کی ہے دیکھئے مسند احمد ج ۴ ص ۳۲۸۔ عبد اللہ بن شداد کی مروان سے روایت مسند احمد ج ۶ ص ۳۶۷ و ۳۲۳ پر موجود ہے۔

مروان کے رواۃ وتلامذہ میں امام یمن عبد الرزاق کا نام بھی شامل ہے جو کسی حد تک شیعہ تھا جب مروان امام زین العابدین سے لیکر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی جیسے ائمہ حدیث کے نزدیک قابل اعتماد ہے تو ایک رافضی کا اسے مورد طعن بنانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے" (حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] قبل ازیں اس کا جواب دیا جا چکا ہے کہ حضرت عثمان اپنے ذاتی مال سے یہ عطیہ جات دیا کرتے تھے۔

[2] یہ صریح کذب ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان کی شان میں فرمایا کرتے تھے "ہم نے بہترین آدمی کو خلیفہ بنایا ہے اور سہل انگاری سے کام نہیں لیا"۔

نے ان کو اس قدر پٹوایا کہ ان کی موت واقع ہوگئی[۵۱] عمار کو اس قدر پٹوایا تھا کہ ان کو فتق کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ حالانکہ آنحضور نے فرمایا تھا "عمار میرا نور نظر ہے اسے ایسی باغی جماعت قتل کرے گی جو میری شفاعت کی مستحق نہیں ہے۔ عمار بھی حضرت عثمان پر طعن کیا کرتے تھے۔ بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کے چچا حکم کو مدینہ سے نکال دیا تھا عثمان نے پھر مدینہ میں بلا لیا[۵۲]۔ ابوذر غفاری کو مار پیٹ کر ربذہ کی طرف نکال دیا تھا[۵۳]۔ حالانکہ آنحضور نے فرمایا تھا اس کرۂ ارضی کے اوپر اور فلک نیلگوں کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچا اور کوئی نہیں"۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں شرعی حدود کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ ہرمزان کے قصاص میں عبیداللہ بن عمر کو قتل نہیں کیا تھا۔ ہرمزان حضرت علی کا آزاد کردہ غلام تھا[۵۴]۔

---

۵۱ جھوٹے کلمات جو ددو فگو کے منہ سے نکلتے ہیں اگر اس شرابی کی طرح بدبودار ہوتے جو ہمیشہ شراب کے نشہ میں سرشار رہنے کا عادی ہو تو روافض کا یہ جھوٹ اتنا بڑا ہے کہ اس کا تعفن اور بدبو تا قیام قیامت ختم ہونے میں نہ آتی (دیکھئے العواصم من القواصم ص ۶۳-۶۴)

۵۲ اس کے جواب کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ص ۶۴-۶۶

۵۳ اس کے جواب کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ص ۷۷-۷۹

۵۴ یہ صاف جھوٹ ہے۔ مورخ ابن خلدون اپنی تاریخ جلد دوم صفحہ ۱۳۹ پر لکھتے ہیں

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے امیرالمومنین عثمان سے مدینہ سے باہر جانے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ ابوذر نے کہا "مجھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی سلع نامی مقام تک پہنچ جائے تو اس سے نکل جائیں"۔ چنانچہ حضرت عثمان نے ان کو اجازت دیدی تھی۔ ابوذر ربذہ نامی جگہ میں قیام پذیر ہوئے اور وہاں مسجد بنوائی۔ حضرت عثمان نے ابوذر کو اونٹوں کا ایک ریوڑ اور دو غلام عطا کیے تھے۔ ان کی تنخواہ بھی مقرر کر دی تھی۔ حضرت ابوذر مدینہ میں آیا جایا کرتے تھے وہ جگہ جہاں وہ اقامت پذیر تھے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ مشہور جغرافیہ داں یاقوت لکھتا ہے۔

"مدینہ کے راستہ پر یہ بہترین جگہ تھی"۔

۵۵ یہ صریح کذب اور شیعہ کی اختراع ہے۔ ہرمزان حضرت علی کا آزاد کردہ غلام ہرگز نہ تھا دیکھئے العواصم من القواصم ص ۱۰۶-۱۰۸۔

ولید جب شراب نوشی کا مرتکب ہوا تو عثمان اس پہ حد نہیں لگانا چاہتے تھے بحضرت علیؓ نے حدِ شرعی قائم کی اور فرمایا میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔ جمعہ کے دن ایک اذان کا اضافہ کیا جو کہ بدعت ہے۵۲ مسلمانوں نے عثمان کی مخالفت کی اور اس کے کاموں پہ تنقید کی۵۳۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کر دیا گیا۔ لوگوں نے حضرت عثمان سے کہا تھا آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۵۴ اور غزوہ احد کے دن بھاگ گئے۵۵۔ بیعت الرضوان میں بھی شامل نہ ہوئے۵۶۔ خلاصہ یہ کہ ایسے واقعات لاتعداد ہیں"۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

---

۵۱ اس کے جواب کے لیے دیکھئے العواصم من القواصم ص ۹۴-۹۹

۵۲ جب مدینہ کی آبادی بڑھ گئی تو اس کی ضرورت پیش آئی تھی ۱۲

۵۳ حضرت عثمان کی مخالفت کرنے والے باغی تھے اور آپ کی امداد کرنے والے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما جیسے لوگ تھے ۱۲

۵۴ بدر میں شرکت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں مبتلا تھیں آنحضور نے حضرت رقیہ کی تیمارداری کے لیے آپ کو مدینہ میں رہنے دیا اور فرمایا۔ آپ کو بدر میں شرکت کرنے والوں ایسا اجر و ثواب اور مال غنیمت کا حصہ ملے گا"۔ حضرت اسامہ بن زید کو بھی حضرت عثمان کی رفاقت میں رہنے دیا۔ جنگ بدر میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عنایت فرمائی تو آنحضور نے حضرت عثمان کو فتح کی بشارت بھیجی۔ حضرت اسامہ کا بیان ہے "ہم کو فتح کا مژدہ اس وقت ملا جب ہم حضرت رقیہ کی قبر پہ مٹی برابر کر چکے تھے"۔ ۱۲

۵۵ غزوہ احد میں جو واقعہ پیش آیا اس میں بہت سے لوگ شریک تھے۔ اس بات کی تعیین میں اختلاف ہے کہ کون ثابت قدم رہا اور کون نہ رہا۔ جب اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی یہ لغزش معاف کر دی ہے تو اس کا تذکرہ کسی مسلم کے شایانِ شان نہیں ۱۲

۵۶ حضرت عثمان بیعت الرضوان میں اس لیے شرکت نہ کر سکے کہ آنحضور نے انہیں قریش مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ آنحضور نے سفارت کا منصب پہلے حضرت عمر کو پیش کیا انہوں نے کہا یا رسول اللہ! مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک آدمی بھی نہیں جو میری حفاظت کر سکے (باقی بر صفحہ ۵۵۷)

شیعہ مصنف کے وارد کردہ جملہ اعتراضات کا جواب علی الترتیب یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان کے عمال و حکام نے ان سے خیانت کی اور ان کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا تو حضرت علی کے نائبین اس ضمن میں ان سے دو قدم آگے ہی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل عبید اللہ بن زیاد کے والد زیاد بن ابی سفیان کو والی مقرر کیا تھا۔ آپ نے اشتر نخعی اور محمد بن ابی بکر جیسے لوگوں کو بھی حاکم مقرر کیا تھا۔ حالانکہ حضرت معاویہ ان سب سے بہتر تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۵۵۶) ہیں آپ کو ایک شخص بتاتا ہوں جو اس مقصد کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں ہے ـــ وہ عثمان بن عفان ہے"ـــ چنانچہ آپ نے حضرت کو بلا کر اس خدمت پر مامور کیا۔ اگر مسلمانوں میں کوئی اور شخص ہوتا جو وادی مکہ میں زیادہ پرقوت و شوکت ہوتا تو آپ عثمان کی جگہ اسے اس کام پر مامور فرماتے۔

تاریخ اسلام کی اس اولیں سفارت کے جرم میں عثمان مکہ میں چند روز محبوس رہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ عثمان قتل کر دیے گئے ہیں۔ آنحضور نے حضرت عثمان کا قصاص لینے کے لیے صحابہ سے بیعت رضوان لی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیعت رضوان حضرت عثمان کی عظمت و فضیلت کا بیّن ثبوت۔ عظمتِ عثمان کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ آپ کا انتقام لینے کے لیے اسلام کی پوری قوت و شوکت سید الاولین والآخرین کے زیر قیادت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس داماد سے کتنی گہری الفت و محبت رکھتے تھے۔

جب سب صحابہ عقد بیعت کے لیے جمع ہو گئے تو اس آخری لمحہ میں آنحضور کو پتہ چلا کہ عثمان بخیر و عافیت ہیں۔ تاہم آپ نے بیعت کے معاملہ کو تشنۂ تکمیل چھوڑنا مناسب خیال نہ کیا۔ حضرت عثمان کو دوہرا شرف یہ حاصل ہوا کہ بیعت کرتے وقت آنحضور کے ہاتھ میں حضرت عثمان کے ہاتھ کی ہاتھ کی جگہ کام کیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دیا اور کہا "یہ عثمان کا ہاتھ ہے"۔ پھر اسے دوسرے ہاتھ پر مار کر فرمایا "یہ بیعت عثمان کے لیے ہے"۔ مقام افسوس ہے کہ شیعہ تاریخ اسلام کی اس عظیم مدح و ثنا کو نقص و عیب پر محمول کرتے ہیں۔ رفض کی اصل حقیقت یہی ہے اگر وہ یوں نہ کرتے تو رافضی نہ کہلاتے ۱۲ (محب الدین الخطیب) یہ بیعت انتہائی اہم تھی کہ آنحضور کے زیر قیادت اسلام کی پوری قوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اسی سابقہ بیعت نے ہی صحابہ کرام کو شہادت عثمان پر قصاص کا مطالبہ کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ انھیں حضرت علی سے کوئی عناد نہ تھا۔ (ناشر)

یہ امر باعث حیرت ہے کہ شیعہ جس امر میں حضرت عثمان کو ہدف ملامت بناتے ہیں اسی بات کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی اس میں حضرت عثمان سے سبقت لے گئے تھے۔ مثلاً شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے اپنے قرابتدار اور بنو امیہ کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا تھا۔ دوسری جانب حضرت علی نے والد اور والدہ کی جانب سے اپنے قرابت داروں کو حاکم و والی مقرر کیا۔ مثلاً حضرت عباس کے بیٹے عبداللہ و عبیداللہ نیز قُثَم بن عباس و ثمامہ بن عباس یہ سب حضرت علی کے چچازاد بھائی تھے حضرت علی نے محمد بن ابی بکر کو والیٔ مصر مقرر کیا جو آپ کا تربیت کردہ تھا (کیونکہ حضرت صدیق اعظم کے انتقال کے بعد حضرت علی نے محمد بن ابی بکر کی والدہ کے ساتھ نکاح کر لیا تھا)

حضرت علی نے اپنی ہمشیرہ ام ہانی کے بیٹے جعدہ بن ابی ہُبیرہ کو خراسان کا والی مقرر کیا تھا۔ امامیہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی نے اپنی اولاد کو صراحتہً والی و امیر مقرر کیا تھا۔[1] یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اگر اقارب کو عہدے تفویض کرنا جرم ہے تو ان کو خلافت عظمیٰ پر فائز کرنا جُرم عظیم ہے۔ نیز یہ کہ چچازاد بھائیوں کی نسبت اولاد کو والی مقرر کرنا مذموم تر ہے اگر حضرت علی معصوم ہونے کے باوجود اس اقارب نوازی کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور کسی شخص کو بنا بر عصمت آپ پر حرف گیری کی مجال نہیں ہے۔ تو حضرت عثمان کی مدافعت اس دعویٰ سے ممکن ہے کہ آپ ایک مجتہد تھے۔ لہذا یہ امور ان سے اجتہادی غلطی کی بنا پر صادر ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ عقل و نقل سے زیادہ میل کھاتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ عذر بھی صحیح ہے کہ بنو امیہ کو عہدہ ہائے جلیلہ عطا کرنے میں ان کے سامنے اسوۂ نبوی موجود تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و سلم نے عَتَّاب بن اُسَید اموی کو حاکم مکہ مقرر کیا اور ابو سفیان اموی کو نجران کا۔ علاوہ

---

[1] امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ پر یہ شیعہ کا عظیم بہتان ہے ہم نے العواصم من القواصم ص ۱۹۸-۱۹۹۔ کے حواشی پر حضرت علی کے ارشادات اس ضمن میں نقل کیے ہیں (محب الدین الخطیب)

ازیں آنحضور نے خالد بن سعید بن العاص اموی کو بھی عامل مقرر کیا تھا۔ اسی طرح آں حضور نے جب ولید بن عقبہ کو عامل مقرر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ۔

نظر بریں حضرت عثمان یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے انہی افراد اور اسی جنس و قبیلہ کے لوگوں کو عہدے عطا کیے ہیں جن کو آنحضور دیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر بھی اسی ڈگر پر گامزن رہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے فتوحات شام کے سلسلہ میں یزید بن ابوسفیان کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت عمر نے اسے اس عہدہ پر قائم رکھا۔ پھر حضرت عمر نے یزید کے بعد اس کے بھائی حضرت معاویہ کو یہ منصب عطا کیا۔ بنو امیہ کو حاکم و عامل مقرر کرنے کی روایت آنحضور سے نہ صرف ثابت و مشہور بلکہ اہل علم کے نزدیک متواتر کی حد تک معروف ہے۔ لہٰذا اس سے بنو امیہ کو عہدے عطا کرنے پر احتجاج کرنا آنحضور کی نص کے مطابق اور ہر عاقل کے نزدیک خلافت کو بنی ہاشم کے ایک ہی فرد میں محدود کرنے کی نسبت اظہر ہے۔

کیونکہ بنو ہاشم میں مناصب جلیلہ کو محدود کرنے کا دعویٰ باتفاق محدثین کذب ہے اور بنو امیہ کو عہدے تفویض کرنے کی روایت بالاتفاق صدق ہے۔ جہاں تک بنو ہاشم کو عامل و حاکم بنانے کا تعلق ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حضرت علی کو یمن کا حاکم مقرر کیا اور حضرت جعفر کو زید اور ابن رواحہ کی معیت میں غزوۂ موتہ کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔

حضرت عثمان معصوم نہ تھے

ہم حضرت عثمان کے معصوم ہونے کے مدعی نہیں ہیں بلکہ آپ نے یقیناً گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا جن کو اللہ تعالےٰ معاف کر دیں گے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کا مژدہ بھی سنایا تھا۔ ادھر روافض کا یہ حال ہے کہ ایک شخص میں غلو کر کے اس کے گناہوں کو بھی نیکیاں قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف ایک شخص کے جملہ اعمال صالحہ کو فراموش کر دیتے ہیں جو اسے جنت میں لے جانے کے موجب ہیں اور اس کے گناہوں

کو شمار کرنے لگتے ہیں۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ اس بات پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ توبہ سے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمان نے گناہوں سے توبہ نہیں کی تھی۔

آیات و احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ سب گناہ بخش دیتے ہیں۔ نمازوں سے بھی گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے درمیانی اوقات میں جو گناہ ہوتے ہیں جب وہ نمازوں سے معاف ہو جاتے ہیں تو پھر جمعہ، رمضان، عرفہ و عاشوراء کے روزہ سے کون سے گناہ معاف کیے جاتے ہیں

بعض لوگ اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جب گناہ باقی نہ ہوں تو ان کے درجے بلند کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جن اعمال سے گناہوں کو معاف کیا جاتا ہے وہ اعمال مقبولہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (سورۃ المائدہ ۲۷)

اللہ تعالےٰ متقیوں کے اعمال کو قبول کرتے ہیں۔

علماء کے اس آیت کی تفسیر میں تین اقوال ہیں۔

(۱) خوارج و معتزلہ کا قول ہے کہ جو شخص کبائر سے بچتا ہے اس کے اعمال قبول کیے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک صاحب کبائر کا کوئی عمل مقبول نہیں۔

(۲) مرجیہ کہتے ہیں کہ جو شرک سے اجتناب کرتا ہے وہ متقیوں میں داخل ہے۔ اگرچہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتا ہو۔

(۳) علمائے سلف و ائمہ کہتے ہیں کہ جو شخص خلوص دل سے اور خوف خداوندی سے کوئی کام کرتا ہے تو اس کا وہ عمل قبول کیا جاتا ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ آیت کریمہ "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "احسن" سے وہ عمل مراد ہے جو شرعاً درست ہو اور خلوص پر مبنی ہو۔ اس لیے کہ عمل اگر پر خلوص بھی ہو مگر شرعاً درست نہ ہو تو وہ مقبول نہیں ہو گا اور اگر شرعاً درست ہو اور خلوص سے عاری ہو تب بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ عمل خالص کا

مطلب یہ ہے کہ صرف خدا کے لیے ہو اور شرعاً درست ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ سنت نبوی کے مطابق ہو۔

سنن میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور نے فرمایا بعض آدمی نماز سے فارغ ہوتے ہیں اور ان کی نصف یا تہائی یا چوتھائی نماز لکھی جاتی ہے۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ بعض آدمیوں کو نماز کا دسواں حصہ ۱/۱۰ نصیب ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہیں نماز روزہ حج اور جہاد میں سے صرف اسی عبادت کا ثواب ملے گا جو عقل و فہم سے ادا کرو۔

بہر کیف گناہوں سے معافی ایسے اعمال کی بنا پر ملتی ہے جو بارگاہ ربانی میں مقبول ہوں۔ وہ خوش نصیب آدمی ہو گا جس کی آدھی نماز قبولیت سے مشرف ہو۔ اندریں صورت کچھ گناہ مقبول نمازوں سے معاف ہو جائیں گے اور جو بچیں گے وہ جمعہ و رمضان سے معاف ہوں گے۔ معافی کا امکان صغائر و کبائر دونوں قسم کے گناہوں میں ہے جس حدیث میں صاحب البطاقہ کا ذکر کیا گیا ہے[۱]۔ اس میں مذکور ہے کہ اس کا عمل سب گناہوں پر چھا جائے گا۔ یہ اس شخص کا حال ہے جس کے اعمال صدق و اخلاص اور عجز و انکسار کے آئینہ دار ہوں ورنہ اہل کبائر جو دوزخ میں داخل ہوں گے وہ سبھی کلمہ گو ہوں گے۔

---

[۱] ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آنحضور نے فرمایا بروز قیامت میری امت کے ایک شخص کو لوگوں کے روبرو پکارا جائے گا۔ اس کے سامنے ننانوے رجسٹر کھول کر رکھ دیئے جائیں گے جن میں اس کے اعمال قبیحہ درج ہوں گے ہر رجسٹر وہاں تک پھیلا ہوا ہو گا جہاں تک نظر پہنچے۔ اس سے کہا جائے گا: "ان میں جو اعمال مندرج ہیں کیا تم ان میں سے کسی کے منکر ہو؟" وہ کہے گا "نہیں اے میرے رب!" پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔" پھر کاغذ کا ایک ٹکڑا ہتھیلی کے برابر لایا جائے گا جس میں "لا الٰہ الا اللہ" تحریر ہو گا۔ وہ شخص کہے گا۔ کاغذ کا یہ پرزہ ان رجسٹروں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ چنانچہ یہ پرزہ ایک پلڑے میں اور وہ رجسٹر دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں گے۔ کاغذ کے پرزے والا پلڑا جھک جائے گا اور رجسٹروں والا پلڑا اوپر کو اٹھ جائے گا ۱۲۔

اسی طرح حدیث میں مذکور ہے کہ ایک زانیہ نے بہ کمال اخلاص ایک کتے کو پانی پلایا اور اسے بخش دیا گیا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ دو آدمی نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی نمازوں میں اتنا فرق ہوتا ہے جتنا کہ فاصلہ مشرق و مغرب میں پایا جاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

اعمال کا معیار و مدار

اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے تو وہ صحابہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

ابوبکر بن عیاش فرماتے ہیں "حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حصہ میں جو فضیلت آئی وہ کثرت صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس (صدق وخلوص) کی وجہ سے حاصل ہوئی جو آپ کے دل میں جاگزیں تھا"۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کہ کہا ستارے آسمان کے لیے باعث امن ہیں جب ستارے رخصت ہو جائیں گے تو آسمان سے جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا کر دیا جائے گا۔ اسی طرح میری ذات صحابہ کے لیے باعث امن و سکون ہے۔ جب میں نہیں ہوں گا تو صحابہ موعود مصائب سے دوچار ہو جائیں گے۔ میرے صحابہ میری امت کے لیے باعث امن ہے جب میرے صحابہ رخصت ہو جائیں گے تو امن وامان اٹھ جائے گا۔ (مسلم)

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ ایک جماعت مصروف جنگ ہو گی۔ ان سے دریافت کیا جائے گا کیا تم میں کوئی صحابی ہے؟ وہ کہیں گے "ہاں" چنانچہ انھیں فتح نصیب ہو گی۔ پھر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کر رہی ہو گی۔ اس سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے کسی صحابی کو دیکھا ہو؟ کہیں گے "ہاں"۔ چنانچہ ان کو فتح حاصل ہو گی۔ پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایک جماعت مصروف پیکار ہو گی۔ اس سے پوچھا جائے گا کیا تم میں سے کسی نے کسی تابعی کو دیکھا ہے کہیں گے "ہاں"۔ چنانچہ وہ فتح و نصرت سے ہمکنار ہوں گے۔

حدیث ہذا کے تمام طرق میں تینوں طبقات (صحابہ، تابعین، تبع تابعین) کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے طبقہ کا ذکر بعض روایات میں ملتا ہے۔ متعدد روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ آپ نے قرون ثلاثہ کی مدح و ستائش فرمائی۔

مقصود یہ ہے کہ اعمال کی فضیلت کا انحصار ان کی ظاہری صورت پر نہیں بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر ہے جو کہ دل میں پنہاں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بڑا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اس سے ان علماء نے احتجاج کیا ہے جو کہتے ہیں کہ ہر صحابی بعد میں آنیوالے ہر شخص سے افضل ہے۔ جمہور علماء اس مسئلہ میں متحد الخیال ہیں کہ جملہ صحابہ جملہ تابعین سے افضل ہیں۔ البتہ اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا ہر صحابی ہر تابعی سے افضل ہے یا نہیں؟ اسی قاعدہ کے مطابق کیا حضرت معاویہ عمر بن عبد العزیز سے افضل ہیں یا نہیں؟۔

قاضی عیاض وغیرہ نے اس مسئلہ میں دو قول ذکر کیے ہیں۔ اکثر علماء صحابہ کے ہر فرد کو ہر تابعی سے افضل قرار دیتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک اور احمد بن حنبل سے یہی منقول ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ تابعین کے اعمال صالحہ صحابہ کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے زہد و عدل میں بڑھ کر تھے۔ مگر فضیلت کا انحصار حقیقت ایمان پر ہے جو کہ ایک قلبی چیز ہے۔ آنحضور کا ارشاد گرامی ہے۔

"اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ اتنا سونا بھی خرچ کرے تو صحابہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا"۔

اس نظریہ کے حامل علماء یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ بعض تابعین کے اعمال صحابہ سے بڑھ کر تھے مگر ہم یہ کیسے معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کا ایمان بھی صحابہ کے ایمان پر فائق تھا۔ اس حدیث میں آنحضور نے فرمایا کہ متاخرین جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے اگر سونے کا پہاڑ بھی خرچ کریں تو اولین صحابہ کے نصف مد (ایک عربی پیمانہ جو کہ قریباً گیارہ چھٹانک کا ہوتا ہے) کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے لوگوں کے حقوق ادا

کیئے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا۔ اگر فرض کیا جائے کہ آپ نے لوگوں کو جو کچھ دیا وہ آپ کی ملکیت تھا اور آپ نے صدقہ کر دیا۔ تاہم اس سے صحابہ کے انفاق فی سبیل اللہ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور احد پہاڑ جتنا سونا آئے کہاں سے کہ اسے خرچ کیا جا سکے؟ پھر جب کہ بفرض محال اسے خرچ بھی کیا جائے تو بقول آنحضور وہ نصف مُد کے کے برابر بھی نہ ہو گا۔

علماء سلف میں سے بعض کا قول ہے کہ

"سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں جو غبار حضرت معاویہ کی ناک میں داخل ہوا وہ عمر بن عبد العزیز کے سب اعمال سے افضل ہے"۔

بہر کیف یہ مسئلہ بسط و تفصیل کا مقتضی ہے اور یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں سے برے اعمال کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ اعمال درجہ بدرجہ ہوتے ہیں۔ کسی شخص میں جس قدر ایمان و تقویٰ ہو گا اس کے اعمال اسی قدر دوسروں سے افضل ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ جب اعمال صالحہ کی بنا پر دوسرے لوگوں کے برے اعمال نیست و نابود ہو جاتے ہیں تو حضرات صحابہ بالاولیٰ اس کے مستحق ہیں۔

گناہوں کا ازالہ اور طریقوں سے بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص اس کے حق میں دعا کرے یا اس کی موت کے بعد اس کا جنازہ پڑھے اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کرے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔ کسی کو موت کے بعد نیک اعمال مثلاً صدقہ، حج، اور روزہ وغیرہ کا جو تحفہ اسے بھیجا جاتا ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہے حدیث میں آیا ہے کہ یہ ہدیہ میت کو وصول ہوتا ہے۔ لڑکوں کی نیک دعا اس سے جداگانہ چیز ہے کیونکہ یہ اس کے اپنے عمل و کسب میں شامل ہے۔ دنیوی حوادث و آلام بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ نصوص متواترہ سے ثابت ہے۔ صحیح حدیث میں آنحضور سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"میں نے اپنے رب سے تین چیزیں طلب کیں اس نے دو چیزیں مجھے عطا کیں۔ اور تیسری نہیں دی"۔

(۱) میں نے بارگاہ ربانی میں التجا کی کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ کرے اس نے یہ دعا قبول کر لی۔

(۲) میں نے درخواست کی کہ میری امت پر بیرونی دشمن ایسا مسلط نہ کرے جو ان کا استیصال کر دے۔ اس نے یہ دعا بھی قبول کر لی۔

(۳) میں نے درخواست کی کہ میری امت میں خانہ جنگی رونما نہ ہو۔ یہ دعا مقبول نہیں ہوئی

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت "قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ" نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا "أَعُوذُ بِوَجْهِكَ"۔ پھر یہ الفاظ پڑھے "أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ" تو فرمایا "أَعُوذُ بِوَجْهِكَ" پھر پڑھا "أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا" تو فرمایا "یہ بہت آسان ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت میں باہمی اختلافات کا ظہور و شیوع ایک ناگزیر امر ہے تاہم بعد والے لوگوں کی نسبت صحابہ کے مابین فتنہ بازی کا ظہور کم ہوا تھا۔ عہد نبوت سے جتنی دوری ہوتی چلی گئی فتنہ بازی روبترقی رہی۔

یہی وجہ ہے کہ خلافت عثمانی میں کوئی ظاہری بدعت رونما نہیں ہوئی تھی۔ جب آپ نے شہادت پائی اور امت کا شیرازہ بکھر گیا تو بیک وقت دو متقابل بدعتیں سامنے آ گئیں

(۱) ایک خوارج کی بدعت جو حضرت علی کی تکفیر کرتے تھے۔

(۲) روافض جو حضرت علی کی عصمت و امامت بلکہ اس سے بڑھ کر نبوت و الوہیت کے مدعی تھے۔

عصر صحابہ کے آخری دور اور حضرت عبداللہ بن زبیر و عبدالملک اموی کے عہد امارت میں مرجیہ و قدریہ کے فرقوں نے پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ پھر عصر تابعین کے اوائل اور اموی خلافت کے آخری دور میں جہمیہ و مشبّہہ کا ظہور ہوا۔ حالانکہ عہد رسالت میں ایسی کوئی بدعت بھی موجود نہ تھی۔

پھر شمشیر کی فتنہ گری نے اس کی جگہ لی۔ حضرت معاویہ کی امارت کے زمانہ میں سب مسلمان مل کر کفار کے خلاف صف آرا ہوا کرتے تھے۔ جب حضرت معاویہ نے وفات

پائی تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ دل گداز وقوع پذیر ہوا۔ مکہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ادھر مدینہ میں حرہ کا فتنہ بپا ہوا۔ یزید کی موت کے بعد ملک شام میں مروان اور ضحاک کے مابین مرج راہطہ کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ پھر مختار نے ابن زیاد کو قتل کیا تو زبردست فتنہ اٹھا۔ بعد ازاں مُصعب بن زبیر نے مختار کو قتل کر دیا۔ دوسری جانب عبد الملک اموی نے مصعب کا کام تمام کر دیا اور سخت فتنہ اٹھا۔ حجاج نے عرصہ دراز تک حضرت ابن زبیر کا محاصرہ کیے رکھا پھر آپ کو قتل کر دیا۔ جب حجاج عراق کا والی قرار پایا تو ابن الاشعث نے عراق کے ایک جم غفیر کے ساتھ اس کے خلاف خروج کیا۔ یہ افسوسناک حوادث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیش آئے۔ پھر خراسان میں ابن مہلب نے سر اٹھایا اور زید بن علی کوفہ میں قتل کیے گئے۔ علاوہ ازیں کافی عرصہ تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ ادھر خراسان میں ابو مسلم خراسانی بنو عباس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس قدر خونریز جنگیں ہوئیں جن کا ذکر طوالت کا موجب ہو گا۔ خلاصہ یہ کہ حضرت معاویہ سب مسلم سلاطین سے بڑھ کر تھے۔ لوگوں نے جو امن و عافیت اور خوشحالی آپ کے دور میں دیکھی وہ بعد میں نصیب نہ ہو سکی۔ البتہ حضرت ابو بکر و عمر کا عہد خلافت اس سے یقیناً بڑھ کر تھا۔

حضرت معاویہ کے فضائل و مناقب

حضرت معاویہ گنہ گار ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں ان کا ہم پلہ کوئی سلطان پیدا نہیں ہوا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"اگر تم حضرت معاویہ جیسے کام کرنے لگو تو لوگ پکار اٹھیں یہ مہدی ہے"۔

احمد بن جواس کہتے ہیں مجھے ابو ہریرہ المکتب نے بتایا کہ اعمش کے یہاں عمر بن عبد العزیز اور ان کے عدل و انصاف کا ذکر چل پڑا تو اعمش نے کہا۔ "اگر تم حضرت معاویہ کا عہد خلافت دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا؟" لوگوں نے کہا۔ "کیا آپ معاویہ کی بردباری کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" اعمش نے کہا۔ "نہیں بخدا میں حضرت معاویہ کے عدل کی بات کر رہا ہوں"۔

ابو اسحاق سُبیعی نے حضرت معاویہ کی شان میں فرمایا۔

"اگر تم حضرت امیر معاویہ کو دیکھ پاتے تو کہہ اٹھتے کہ امام مہدی یہی ہیں"۔

ابوبکر بن عیاش ابو اسحاق سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا

"میں نے حضرت معاویہ کے بعد ان کا ثانی نہیں دیکھا"۔

امام بغوی ابو قیس سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے ہر قبیلہ میں ایک آدمی مقرر کر رکھا تھا جو اس کے حالات سے ان کو باخبر رکھتا تھا ایک شخص جس کی کنیت ابو یحیٰی تھی علی الصبح ہر مجلس میں جا کر پوچھتا تھا "کیا تمہارے یہاں شب گذشتہ کوئی بچہ پیدا ہوا۔ یا کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے یا کوئی مہمان باہر سے آیا ہے"؟ لوگ بتایا کرتے تھے کہ ہاں اہل یمن میں سے فلاں آدمی اپنے کنبہ میں آیا ہے وہ اس شخص اور اس کے قبیلہ کا نام ذکر کر دیا کرتے تھے۔ قبائل سے فارغ ہو کر وہ دفتر میں آتا اور وہاں ان کے نام تحریر کیا کرتا تھا۔

عطیہ بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا فرماتے تھے۔

"تنخواہ تقسیم کرنے کے بعد بیت المال میں کچھ مال بچ گیا ہے۔ اب میں وہ تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آئندہ سال بھی حسب دستور کچھ مال بچ گیا تو تمہارے درمیان تقسیم کر دوں گا ورنہ مجھے معتوب نہ کریں۔ اس لیے کہ یہ میرا نہیں بلکہ اس خدا کا مال ہے جس نے تمہیں یہ عطا کیا"۔

سیرت و کردار اور عدل واحسان کے اعتبار سے حضرت معاویہ کا دامن ایسے فضائل و مناقب سے پُر ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا۔ امیر المومنین معاویہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا۔ معاویہ نے ٹھیک کیا وہ فقیہ ہیں"۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

"میں نے حضرت معاویہ سے بڑھ کر کسی شخص کو نہیں دیکھا جس کی نماز آنحضور سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہو"۔

یہ ہے حضرات صحابہ کی شہادت حضرت معاویہ کے تدین و تفقہ کے بارے میں! فقاہت معاویہ کے گواہ ابن عباس ہیں اور حسن صلوٰۃ کی گواہی دینے والے ابو درداء۔ دونوں

جس پایہ کے صحابی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے مؤید آثار اور بھی بہت ہیں۔
اس میں شبہ نہیں کہ حضرت معاویہ سابقین اولین صحابہ میں شمار نہیں ہوتے۔ بخلاف ازیں کہا گیا ہے کہ آپ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت معاویہ خود اس بات کے معترف تھے کہ وہ فضلاء صحابہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے باوصف آپ کثیر اوصاف کے حامل تھے۔ آپ کی سلطنت حدود خراسان سے لے کر مغرب میں بلاد افریقہ اور قبرص سے لے کر یمن تک پھیلی ہوئی تھی اس بات پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے کہ معاویہ ابوبکر و عمر تو درکنار عظمت و فضیلت میں حضرت عثمان و علی کے قریب بھی نہ تھے۔ پھر کسی اور بادشاہ کو ان کے مشابہ کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ نیز مسلم سلاطین میں سے کوئی مسلم سلطان سیرت و کردار کے اعتبار سے حضرت معاویہ کا حریف کیسے ہو سکے گا؟
اکابر صحابہ نے فتنہ پردازی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ایوب سجستانی ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔
"جب فتنہ کی آگ بھڑکی تو اس وقت دس ہزار صحابہ بقید حیات تھے مگر سو صحابہ نے بھی فتنہ پردازی میں شرکت نہ کی بلکہ بالفاظ صحیح تر تیس صحابہ بھی اس میں شریک نہیں ہوئے۔"
یہ ابن سیرین کا قول ہے جو زہد و ورع کی وجہ سے بڑی محتاط گفتگو کرنے کے خوگر تھے۔
منصور بن عبد الرحمن نے کہا کہ امام شعبی کا قول ہے
"آنحضور کے صحابہ میں سے جنگ جمل میں صرف حضرت علیؓ، عمارؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ شامل ہوئے اگر کوئی شخص پانچویں صحابی کا نام بتا دے تو میں کاذب ٹھہروں گا۔"
امام شعبی کا مطلب سابقین مہاجرین صحابہ کا ذکر کرنا تھا۔
عبد الرحمن بن ابی لیلی فرماتے ہیں۔
"جنگ صفین میں ستر بدری صحابہ نے شرکت کی تھی"
جب شلیعہ نے یہ بات سنی تو انہوں نے کہا بخدا یہ جھوٹ ہے صرف خزیمہ بن ثابت نے صفین میں شرکت کی تھی۔ امام ذہبی فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمل و صفین

میں بہت تھوڑے صحابہ شامل ہوئے تھے۔

جن اسباب کی بنا پر ایک مومن عذاب دوزخ سے نجات پائے گا۔ ان میں وہ تکلیف بھی شامل ہے جو مومن قبر میں اٹھائے گا۔ نیز منکر و نکیر کا سوال کرنا اور روز محشر کا درد و کرب سب اس میں داخل ہے۔

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ مومن جب پلصراط پر سے گذریں گے تو جنت و جہنم کے درمیان انھیں ایک پل پر ٹھہرالیا جائے گا جہاں وہ ایک دوسرے سے انتقام لینے کے بعد پاک صاف ہو کر جنت میں جا داخل ہوں گے۔

یہ ایسے امور ہیں جو شاذ و نادر ہی مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں پھر صحابہ خیر القرون کے مصداق ہونے کے باوجود انہیں کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ صحیح روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر کی موجودگی میں حضرت عثمان پر تنقید کی اور کہا کہ وہ جنگ احد میں بھاگ گئے تھے یہ سن کر ابن عمر نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف کردی تھی"۔

معترض نے کہا۔ "عثمان بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے"۔

حضرت ابن عمر نے کہا۔ "آنحضور نے حضرت عثمان کو اپنی بیٹی کی تیمارداری کے لیے پیچھے چھوڑ دیا دیا اور مال غنیمت میں سے ان کو حصہ بھی دیا تھا"۔

مخالف نے پھر کہا۔ حضرت عثمان نے بیعت رضوان میں شرکت نہیں کی تھی"۔

حضرت ابن عمر نے فرمایا۔ "بیعت رضوان حضرت عثمان ہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی آنحضور نے حضرت عثمان کی جگہ بیعت کرتے وقت اپنا ہاتھ استعمال کیا تھا اور آپ کا ہاتھ عثمان کے ہاتھ سے بہتر تھا"۔

معائب صحابہ حسد یا کذب پر مبنی ہیں

حضرات صحابہ پر وارد کیے جانے والے عام اعتراضات یا تو بغض و حسد کے آئینہ دار ہیں یا کذب و دروغگوئی پر مبنی ہیں۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت عثمان نے نااہل لوگوں کو عہدے عطا کیے تھے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان ایک مجتہد تھے ان سے اجتہادی غلطی سرزد ہوئی۔ جو اللہ تعالےٰ نے معاف کر دی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ عبد اللہ بن سعد مرتد ہو گیا تھا۔ پھر مسلمان ہو کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کی معذرت قبول کی حالانکہ آپ نے اسے مباح الدم قرار دیا تھا۔ مزید یہ کہ حضرت علی کو بھی اس سے سابقہ پڑا تھا اور عمّال کی ایسی حرکات ان کے علم میں آئیں جن کی آپ کو توقع نہ تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عثمان کو جب ولید کی شراب نوشی کا علم ہوا تو طلب کر کے اس پر شرعی حد لگائی تھی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت عثمان نے اپنے اقارب میں مال تقسیم کیا تھا"۔

"ہم کہتے ہیں یہ ایسا گناہ نہیں جس پر آخرت میں سزا دی جائے۔ اسے ایک اجتہادی غلطی بھی قرار دے سکتے ہیں"[1]

یہ مسئلہ علماء کے یہاں مختلف فیہا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں جن اختیارات سے بہرہ ور تھے۔ آپ کے امام و خلیفہ کو وہ اختیارات حاصل ہوں گے یا نہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ جب یتیم کا ولی دولت مند ہو تو کیا وہ یتیم کے مال میں سے اپنی اجرت وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا اجرت کا ترک کرنا واجب ہے یا افضل؟ جو علماء تونگری کے باوجود یتیم کے مال میں سے اجرت لینے کو جائز تصور کرتے ہیں ان کے نزدیک امام و خلیفہ بھی بیت المال میں سے اپنی اجرت وصول کر سکتا ہے۔ اسی طرح قاضی و حاکم کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ جو علماء یتیم کے مال میں سے اجرت وصول کرنے کو ناروا تصور کرتے ہیں ان میں سے بعض بیت المال میں سے اپنی اجرت لینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جس طرح فراہم کرنے والا تونگری کے باوجود اس میں سے اپنی اجرت

---

[1] ہم قبل ازیں سعید بن عاص کے سیرت و سوانح اور مکارم اخلاق پر روشنی ڈال چکے اور بتا چکے ہیں کہ انھوں نے دعوت اسلامی کو فروغ دینے میں کس حد تک مساعی جمیلہ انجام دی تھیں اہل کوفہ کی یہ حالت تھی کہ اگر ابو بکر و عمر کو بھی ان کا امیر بنا دیا جاتا تو ان کے ساتھ وہ وہی سلوک کرتے جو سعید بن عاص کے ساتھ روا رکھا تھا ۱۲

لینے کا مجاز ہے۔ یتیم کے ولی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ

(سورہ نساء - ۶)

جو دولت مند ہو وہ اس سے پرہیز کرے اور جو تنگدست ہو وہ حسب دستور اس میں سے کھا لیا کرے۔

بعض فقہاء نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اقارب کا حصہ خلیفہ و امام کے رشتہ داروں کو ملے گا۔ حسن اور ابو ثور اسی کے قائل ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقارب کو بحکم ولایت عطیہ جات دیا کرتے تھے۔ اکثر علماء کے نزدیک آنحضور کی وفات سے اقارب کا حق ساقط ہو گیا۔ امام ابو حنیفہ کا نظریہ یہی ہے۔ علماء کی ایک جماعت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ یہ ساقط شدہ حق گھوڑے اور دیگر سامان حرب خریدنے پر خرچ کیا جائے۔ حضرت ابو بکر و عمر اسی پر عمل فرماتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان نے اس میں تاویل سے کام لیا ہے۔ ان سے منقول ہے کہ وہ اپنے کام کی اجرت لے لیا کرتے تھے اور اسے جائز خیال کیا کرتے تھے۔ اگرچہ حضرت ابو بکر و عمر کا طرز عمل بلاشبہ افضل تھا۔ تاہم حضرت عثمان دونوں باتوں پر عمل کرنے کے مجاز تھے۔

وہ اپنے اقارب کو اس خیال سے عطیہ جات دیا کرتے تھے کہ وہ بقول مجوزین امام و خلیفہ کے اقارب تھے۔ خلاصۂ کلام! جو لوگ حضرت عمر کے بعد منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ وہ اپنے اقارب کو مال دیا کرتے تھے یا ان کو مناصب جلیلہ پر فائز کرتے تھے۔ حضرت علی نے بھی اپنے اقارب کو بعض علاقوں کا والی مقرر کیا تھا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اہل کوفہ نے سعید بن عاص کے خلاف خروج کیا اور انہیں کوفہ سے نکال دیا تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سعید قصوروار بھی ہو۔ اس لیے کہ اہل کوفہ اپنے امراء کے خلاف ہمیشہ بغاوت و سرکشی کا مظاہرہ کرنے کے خوگر تھے۔ اسی قدیم عادت کے پیش نظر انہوں نے سعید سے یہ سلوک روا رکھا۔ بھلا سعید جیسا امیر کوفہ والوں کو کہاں نصیب؟

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت عثمان نے پوشیدہ طور پر ابن ابی سرح کو لکھا تھا کہ وہ اپنے منصب پر قائم رہے اور بظاہر لوگوں کو بتایا کہ میں نے اسے معزول کر دیا ہے"۔ یہ صریح جھوٹ ہے اس لیے کہ حضرت عثمان نے حلف اٹھا کر کہا تھا کہ انہوں نے یہ نہیں لکھا اور حضرت عثمان یقیناً سچے تھے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ مروان نے حضرت عثمان کو بتائے بغیر یہ خط لکھا تھا۔ جب انہوں نے مروان کو قتل کرنے کا مطالبہ کیا تھا تو آپ نے اس سے انکار کر دیا۔

اگر مروان کا قتل ناروا تھا تو حضرت عثمان کا فعل درست ہے اور اگر اسے قتل کرنا جائز تھا اور واجب نہ تھا تو آپ نے ایک جائز کام کیا اور اگر وہ واجب القتل تھا اور آپ نے اسے قتل نہ کیا تو آپ ایک غلطی کے مرتکب ہوئے۔ حالانکہ کسی دلیل سے مروان کا واجب القتل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت عثمان نے مروان کو قتل نہ کر کے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ (اجتہادی غلطی کا نہیں) تو ہم نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ عثمان گناہوں سے پاک تھے؟ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے بیشمار اچھے کام بھی کیے ہیں۔ مزید برآں آپ بدری صحابہ میں شامل ہیں۔ جن کی مغفرت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت عثمان نے محمد بن ابی بکر کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا"۔ یہ صریح افتراء پردازی ہے۔ جو شخص حضرت عثمان کی سیرت و کردار سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ لوگ ان کو قتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور آپ ان کو روکتے تھے۔ پھر آپ ایک معصوم الدم کو بلا وجہ کیونکر قتل کر سکتے تھے؟ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت عثمان نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے شر کا ازالہ کیا جائے۔ لہٰذا امت کی مصلحت کے نقطۂ خیال سے ایسا کیا۔

باقی رہا حضرت معاویہ کا معاملہ تو حضرت عثمان نے ان کو والی شام مقرر کیا اور آپ اس منصب پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت حسن نے خلافت سے دست بردار ہو کر امور سلطنت امیر معاویہ کو تفویض کر دیے۔ حضرت معاویہ حلم و کرم اور کثرت تجربہ کی بنا پر رعایا میں

بڑے محبوب تھے۔ حضرت معاویہ حضرت علی کی وُلاۃ و حکام مثلاً اشتر نخعی و محمد بن ابی بکر و عبید اللہ بن عمرو ابو اعور سلمی و بسر بن ارطاۃ سے یقیناً افضل تھے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان سے اس لیے ناراض ہو گئے تھے کہ آپ نے قرآن کریم کی کتابت ان کی بجائے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سپرد کی تھی۔ جمہور صحابہؓ اس ضمن میں حضرت عثمان کے ساتھ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضور نے

لـه ابو عبد اللہ زنجانی ایک شیعہ معاصر نے اپنی کتاب تاریخ القرآن کے صفحہ ۴۶ پر لکھا ہے کہ علی بن موسیٰ المعروف ابن طاؤس المتوفی (۵۸۹ - ۶۶۴) ایک شیعہ عالم نے اپنی کتاب "سعد السعود" میں علامہ شہرستانی کی تفسیر کے مقدمہ سے بروایت سوید بن علقمہ نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت علی سے سنا فرماتے تھے " اے لوگو! خدا سے ڈرو اور عثمان کے معاملہ میں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لو اور یہ نہ کہو کہ انہوں نے قرآن کے اوراق جلا دیئے تھے۔ خدا کی قسم یہ اوراق انہوں نے صحابہ کی ایک جماعت کے روبرو جلائے تھے۔ حضرت عثمان نے ہمیں جمع کیا اور کہا "ان مختلف قراءتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ ایک شخص دوسرے سے مل کر کہتا ہے کہ میری قراءت تم سے بہتر ہے اس کا نتیجہ کفر کی صورت میں برآمد ہو گا"۔ ہم نے کہا آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت عثمان نے کہا" میں لوگوں کو ایک قرآن پر جمع کرنا چاہتا ہوں۔ اگر قراءت قرآن میں ابھی تمہارے یہاں اختلاف پیدا ہو گیا۔ تو بعد میں آنے والے مسلمان شدید اختلافات میں مبتلا ہو جائیں گے"۔ ہم نے کہا "آپ ٹھیک فرماتے ہیں"۔ ہم نے العواصم من القواصم ص ۶۳ - ۶۴ کے حواشی میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جملہ بلاد اسلامیہ میں قرآن کے ایک ہی نسخہ کو پھیلانا اور صحابہ کرام کو اس بات پر متفق کرنا چاہا۔ مصحف عثمانی یہی قرآن کریم کا وہ کامل نسخہ ہے جو قرآن کریم کی اس قراءت کے مطابق ہے جس کے مطابق حضرت جبریل نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری مرتبہ قرآن کریم سنایا تھا۔ حضرت ابن مسعود چاہتے تھے کہ کتابت قرآن کی خدمت انھیں سپرد کی جائے آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ قبل ازیں قرآن کا جو نسخہ وہ جمع کر چکے ہیں اسے باقی رکھا جائے۔ حضرت عثمان نے یہ دونوں باتیں تسلیم نہ کیں۔

حضرت زید بن ثابت کو یہ خدمت تجویز کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابو بکر (باقی بر صفحہ ۵۸۴)

آخری مرتبہ حضرت جبرئیل کو جب قرآن مجید سنایا تھا حضرت زید اس قراءت کے دیگر صحابہ سے زیادہ واقف تھے۔

حضرت عثمان سے پہلے حضرت ابوبکر و عمر نے بھی زید بن ثابت کو قرآن کی جمع و تدوین پر مامور فرمایا تھا۔

مشاجرات صحابہ میں کفّ لسان کی افضلیت

جب ولید بن عقبہ نے شراب پی۔ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ نے اس کی مذمت کی تھی۔ پھر ابن مسعود مدینہ آئے۔ ابھی حضرت کی شہادت کا سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔ حضرت عثمان نے ابن مسعود کو شادی کرنے کے لیے کہا۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر بفرض محال ابن مسعود نے حضرت عثمان پر طعن کیا تھا تو یہ امر دونوں حضرات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵) و عمر نے آپ کو خلافت صدیقی میں اس کام پر مامور فرمایا تھا۔ کیونکہ آخری مرتبہ جس قراءت کے مطابق قرآن آنحضور کو سنایا گیا تھا۔ حضرت زید کو وہ قراءت یاد تھی لہٰذا حضرت عثمان حضرت زید کو یہ خدمت تفویض کرنے میں حق بجانب تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ حضرت عثمان حضرت ابن مسعود کے علم و فضل اور صدق ایمان سے آگاہ نہ تھے۔ حضرت عثمان اس فعل میں بھی حق بجانب تھے کہ آپ نے قرآن کریم کے تمام نسخوں کو دھو ڈالا تھا اس میں عبداللہ بن مسعود کا مصحف بھی شامل تھا۔ اجماع صحابہ کے مطابق پوری امت کو قرآن کریم کے ایک صحیح تر اور کامل نسخہ پر جمع کرنا حضرت عثمان کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ تاہم حضرت عثمان حضرت ابن مسعود کی قدر افزائی کرتے رہے اور اس میں کچھ فرق نہ آیا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عثمان کے مطیع فرمان رہے اور انھیں سب مسلمانوں سے افضل خیال کرتے رہے کیونکہ آپ نے صدق دل سے ان کی بیعت کی تھی اور آخری دم تک اس پر قائم رہے تھے ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵ حقیقت یہ ہے کہ خلافت عثمانی کے مخالفین اور ولید بن عقبہ کے دشمنوں نے ولید پر یہ افترا باندھا تھا۔ ولید کے خلاف شراب نوشی کی شہادت دینے والے سب جھوٹے، چور اور کمینے آدمی تھے۔ ان کی یہ شہادت صاف جھوٹ تھی دیکھیے العواصم من القواصم ص ۹۴-۹۹۔

کے لیے موجب قدح ہے صرف حضرت عثمان ہی کے لیے نہیں بلکہ اسے دونوں کی اجتہادی غلطی پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ دونوں حضرات جلیل القدر بدری صحابہ میں شامل تھے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی خطائیں معاف کردی ہیں پھر یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں زبان کو بند رکھنا اولیٰ و افضل ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے۔

"اللہ تعالےٰ نے میرے ہاتھ کو صحابہ کے خون سے آلودہ نہیں کیا۔ میں اپنی زبان کو بھی اس سے ملوث نہیں کرنا چاہتا"

حضرت عمار سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا "عثمان صراحۃً کافر ہو گئے تھے"۔ حضرت حسن نے حضرت عمار کی یہ بات ناپسند کی تھی۔ حضرت علی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا۔

"اے عمار! کیا آپ اس خدا سے منکر ہیں جس پر عثمان ایمان لائے تھے؟

ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ بعض اوقات ایک ولی اللہ اور مومن شخص دوسرے ولی کی از راہ خطا تکفیر کرتا ہے مگر اس کے باوصف دونوں کے ایمان میں قدح وارد نہیں ہوتی۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اُسید بن حضیر نے آنحضور کی موجودگی میں سعد بن عبادہ سے کہا تھا کہ تو منافق ہے اور منافقین کی وکالت کرتا ہے"۔ اسی طرح حضرت عمر نے حاطب کے بارے میں کہا تھا۔

"یارسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں"۔

آنحضور نے فرمایا۔ "حاطب غزوہ بدر میں شرکت کر چکا ہے"

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"حضرت عثمان نے ابن مسعود کو اس قدر پیٹا کہ ان کی موت واقع ہو گئی"۔

یہ بڑا ذلیل جھوٹ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان نے عمار و ابن مسعود دونوں کو پیٹا تھا۔ بشرطِ صحت حضرت عثمان خلیفہ تھے اور بنا بر اجتہاد انھیں تعزیر کا

حق حاصل تھا خواہ یہ اجتہاد صحیح ہو یا غلط۔ حضرت عمر نے ابی بن کعب کو درّہ سے مارا جب دیکھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ "یہ متبوع کے لیے باعث فتنہ اور تابع کی رسوائی کا موجب ہے"۔

حضرت عمار جانتے تھے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دنیا میں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں اور آخرت میں بھی۔ اس کے باوجود فرمایا۔

"حضرت عائشہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمایا ہے کہ آیا تم حضرت علی کی اطاعت کرتے ہو یا حضرت عائشہ کی؟"۔

حضرت عمار لوگوں کو حضرت عائشہ کے خلاف جنگ آزما ہونے پر ابھارتے بھی تھے تاہم حضرت عائشہ کو جنتی قرار دیتے تھے۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "عمّار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی"۔ صحیح حدیث صرف اتنی ہے باقی اضافہ سب جھوٹ ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حَکَم اور ان کے بیٹے کو مدینہ سے نکال دیا تھا"۔

ہم کہتے ہیں کہ مروان کے بیٹے سات یا اس سے کم و بیش تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بلا وجہ ان کو مدینہ سے کیوں نکالا گیا؟ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے والد نے مدینہ ہجرت کی تھی یا نہیں تاکہ وہاں سے نکالنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس لیے کہ جو لوگ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے (طلقاء) ان میں سے کسی نے بھی ہجرت نہیں کی تھی۔ آں حضور کا ارشاد ہے لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ (فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں) یہی وجہ تھی کہ جب صفوان بن امیہ ہجرت کر کے مدینہ وارد ہوئے تو آنحضور نے انھیں مکہ لوٹ جانے کا حکم دیا۔ حَکَم کو مدینہ سے جلا وطن کرنے کا واقعہ بلا سند ہے۔ اگر اس کی اسناد ہوتی تو اس کی صحت معلوم کی جا سکتی تھی۔ اگر خارج از بلد کیا بھی تھا تو مکہ سے کیا ہو گا نہ کہ مدینہ سے اور اگر مدینہ سے نکالا تھا تو وہاں سے مکہ جانے کا حکم دیا ہو گا

شیعہ کا یہ دعویٰ کہ حکم اور اس کے بیٹے کو خارج از مدینہ کیا گیا تھا۔

بہت سے اہل علم نے حکم کو جلاوطن کرنے کی روایت پر طعن کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گیا تھا۔ خارج از بلد کرنے کی سزا تعزیراً زانی یا مخنث کو دی جاسکتی ہے اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آنحضور نے کسی کو جلاوطن کیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر میں قدم نہ رکھ سکے۔ یہ سزا شرعاً کسی جرم میں بھی ثابت نہیں کہ دائما کسی شخص کو خارج از بلد کردیا جائے۔ بخلاف ازیں جلاوطن کرنے کی سزا سنت میں صرف ایک سال کے لیے ہے۔ زنا کا ارتکاب کرنے والا اگر صحابی و مجاہد بھی ہو تو اسے ایک سال کے لیے جلاوطن کیا جائے گا۔ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ حضرت عثمان نے حکم کو آں حضور کی نافرمانی اور اسلام کی تذلیل کے لیے مدینہ نہیں بلایا تھا بلکہ اس لیے کہ حضرت عثمان کے خیال میں حکم کی حالت سدھر گئی تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ آپ کا یہ اجتہاد صحیح تھا یا غلط؟[۱]

---

[۱] قاضی ابن العربی العواصم من القواصم ص ۷۷ پر لکھتے ہیں

"ہمارے علماء کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو مدینہ واپس آنے کی اجازت دیدی تھی۔ حضرت عثمان نے جب ابوبکر و عمر سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا۔ "اگر آپ اس بات کا کوئی گواہ پیش کریں تو ہم حکم کو واپس بلالیں گے"۔ جب عثمان منصب خلافت پر فائز ہوئے تو اپنے علم کے مطابق انہوں نے حکم کو واپس بلالیا۔ حضرت عثمان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ جس شخص کو آنحضور نے نکال دیا ہو اس کو واپس بلالیں اگرچہ وہ آپ کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔

مشہور محدث امام ابن حزم نے اپنی کتاب "الامامۃ والمفاضلۃ" میں جو ان کی کتاب الفصل کی جلد چہارم میں شامل ہے صفحہ ۱۵۴ پر علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حکم کو جلاوطن کرنا ایک واجب حد شرعی کی حیثیت نہیں رکھتا اور ہمیشہ کے لیے بھی نہ تھا۔ بخلاف ازیں آپ نے حکم کو کسی جرم کی سزا دی تھی جس کی بنا پر وہ خارج از بلد ہونے کا مستحق قرار پایا۔ دین اسلام میں توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے بصورت توبہ اس کی یہ سزا باتفاق اہل اسلام ساقط ہوجائے گی اور وہ جہاں چاہے جاسکتا ہے"۔

(باقی بر صفحہ ۵۷۸)

مروان میں خامیاں ہو سکتی ہیں مگر اس کے ظاہراً و باطناً مسلمان ہونے میں شبہ نہیں وہ قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتا۔ اور اس پر عمل پیرا تھا۔ لہٰذا یہ اعتراض لغو ہے کہ حضرت عثمان نے اسے کاتب کیوں مقرر کیا۔

جہاں تک ابوذر غفاری کا تعلق ہے حضرت عبداللہ بن صامت سے ثابت ہے کہ حضرت ابوذر کی بیوی ام ذر نے کہا "بخدا حضرت عثمان نے ابوذر کو ربذہ کی طرف نہیں نکالا بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر کو فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی سلع تک پہنچ جائے تو وہاں سے نکل جانا"۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"پناہ بخدا کہ ابوذر کو حضرت عثمان نے مدینہ سے نکالا ہو"۔

اس میں شبہ نہیں کہ ابوذر رضی اللہ عنہ ایک عابد و زاہد شخص تھے آپ کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ جو مال بھی ضرورت سے زائد ہو اسے خرچ کر دینا چاہیے۔ جو شخص ایسا مال جمع کرے گا بروز قیامت اس مال کو آگ میں گرم کر کے اس شخص کو داغا جائے گا۔

وہ اس آیت سے استدلال کیا کرتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷۷) فرقہ زیدیہ کے عظیم مجتہد سید محمد بن ابراہیم الوزیر یمنی المتوفی ۸۴۰ھ نے اپنی کتاب الروض الباسم ج اص ۱۴۱-۱۴۲ پر مشہور شیعہ معتزلی محسن بن کرامہ کی کتاب "شرح العیون" سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو اجازت دی تھی کہ حکم کو مدینہ بلالیں۔ ابن الوزیر کہتے ہیں۔ معتزلہ اور شیعہ زیدیہ کو چاہیے کہ اس حدیث کو قبول کر کے حضرت عثمان کو مورد طعن بنانا ترک کر دیں کیونکہ اس حدیث کا راوی شیعہ کے نزدیک قابل اعتماد ہے اور صحت عقیدہ و علم و فضل کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ پھر ابن الوزیر نے اس پر کھل کر کلام کیا ہے اور امیر المومنین عثمان سے دفاع کرنے میں دلائل و براہین کا انبار لگا دیا ہے جو تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس حدیث کا راوی ایک شیعہ عالم ہے ابن الوزیر جنہوں نے حضرت عثمان کی مدافعت میں دلائل دیے ہیں وہ بھی زیدی شیعہ ہے۔ اس کے علاوہ اہل سنت میں سے ابن تیمیہ، ابن حزم اور ابن العربی کے نظریات آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ و اہل سنت علما سب حضرت عثمان کی بریت پر متفق ہیں"

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (سورہ توبہ۔ ۳۴)

نیز آنحضور کا یہ قول پیش کرتے تھے۔

"اے ابوذر! میں نہیں چاہتا کہ میرے پاس کوہ احد کے برابر سونا ہو تیسری رات گذر جائے اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی ہو۔"

آنحضور فرماتے ہیں

"زیادہ مالدار لوگ بروز قیامت کم درجہ والے ہوں گے سوا ان لوگوں کے جو مال کو ادھر ادھر بکھیر دیں"۔

جب حضرت عبدالرحمن بن عوف نے وفات پائی اور بہت سا مال پیچھے چھوڑا تو حضرت ابوذر نے اسے کنز (خزانہ) پر محمول کیا جس پر سزا دی جائے گی اس ضمن میں حضرت عثمان ابوذر سے تبادلۂ افکار کر رہے تھے۔ اتنے میں کعب داخل ہوئے اور انھوں نے عثمان کی تائید کی تو ابوذر نے ان کو پیٹا۔ انہی نظریات کی بنا پر حضرت ابوذر اور حضرت معاویہؓ کے مابین ملک شام میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ مگر پوری امت ابوذر کی اس رائے کے خلاف ہے۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ جس مال میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے وہ کنز نہیں ہے۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں ورثاء کے حصص مقرر کیے ہیں ظاہر ہے کہ میراث اسی شخص کی ہوتی ہے جس نے اپنے پیچھے مال چھوڑا ہو۔ صحابہ میں ایسے لوگ کثیر التعداد تھے جن کے پاس بہت سا مال تھا مگر کسی نے ان کو ہدف ملامت نہ بنایا۔ بہت سے انبیاء بھی مالدار ہوئے ہیں۔ ابوذر نے اس میں اس حد تک مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ لوگوں کو ایک مباح چیز سے بھی روک دیا اور پھر ان سے الگ ہو گئے۔ ابوذر مومن تھے مگر ان میں یہ کمزوری موجود تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کرکے فرمایا تھا۔

اے ابوذر! میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور ہو میں تمہارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے۔ دیکھیے دو آدمیوں کا بھی امیر نہ بننا۔ اور نہ کسی یتیم کے سرپرست بنو۔

آنحضور کا ارشاد ہے۔

"طاقتور مومن اللہ تعالےٰ کو کمزور مومن سے عزیز تر ہے۔ یوں دونوں اچھے ہیں"

چونکہ اہل شوریٰ صحابہ حضرت ابوذر کی نسبت اقویٰ ہیں بدیں وجہ وہ ان سے افضل ہیں

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت عثمان نے شرعی حدود کو پامال کیا اور ہرمزان اولی علی کے قصاص میں عُبَید اللہ بن عمر کو قتل نہ کیا"۔

ہم کہتے ہیں یہ صاف جھوٹ ہے۔ ہرمزان حضرت علی کا آزاد کردہ غلام نہ تھا بلکہ مسلمانوں نے اسے قید کیا تھا حضرت عمر نے اس پر احسان کر کے اسے آزاد کر دیا تھا اور یہ اسلام لایا اس کو غلام بنانے اور آزاد کرنے میں حضرت علی کی جہد وسعی کو کوئی دخل نہیں ہے ہرمزان اس بات سے متہم تھا کہ اس نے حضرت عمر کے قاتل کی امداد کی ہے۔

حضرت عمر نے عبد اللہ بن عباس کو کہا تھا "تم باپ بیٹا دونوں یہ چاہتے تھے کہ مدینہ میں عجمی کافروں کی بھرمار ہو جائے گی"۔ ابن عباس نے دریافت کیا "ہم ان کو قتل نہ کر دیں"؟ حضرت عمر نے فرمایا "جب یہ تمہاری بولی بولنے اور تمہارے قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے ہیں تو تم ان کو کیونکر قتل کر سکتے ہو"؟

شیعہ کا یہ اعتراض کہ حضرت عثمان نے عبید اللہ بن عمر سے قصاص نہ لیا

غور کیجئے ابن عباس فقہ دانی کے باوجود حضرت عمر سے عجمی کفار کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں اس لیے کہ وہ فساد بپا کرتے ہیں پھر عبید اللہ ہرمزان کے قتل کو کیونکر جائز نہ سمجھتے ہوں گے؟ جب عبید اللہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا اور حضرت عثمان مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے عبید اللہ کو ہرمزان کے قصاص میں قتل کرنے کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا۔ متعدد صحابہ نے اس کو قتل نہ کرنے کا مشورہ دیا اور کہا ابھی کل اس کے والد حضرت عمر شہید ہوئے اور آج اسے قتل کر دیا جائے تو اس سے بڑا فساد رونما ہو گا۔

گویا ان کے نزدیک ہرمزان کا معصوم الدم ہونا مشتبہ تھا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ہرمزان معصوم الدم تھا۔ تاہم عبیداللہ نے اس کے قتل کو حلال تصور کیا تھا۔ اس شبہ کی بنا پر اس کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا جس طرح حضرت اسامہ نے اس شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھا تھا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ کو معذور قرار دے کر اس کے عوض اسے قتل نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں دونوں مقتولوں کے خون کا مطالبہ کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ حاکم وقت کو شرعاً اختیار حاصل ہے کہ قاتل کو معاف کر دے یا دیت وصول کرے یا اسے قتل کر دے بنا بریں حضرت عثمان نے آل عمر کو معاف کر دیا اور ان سے دیت وصول نہ کی۔ جب اس طرح حضرت عثمان نے عبیداللہ کی جان بچالی تھی تو اب اسے قتل کرنا کسی طرح روا نہ تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہرمزان کے خون کا دعوی کھڑا کیا جاتا ہے حالانکہ وہ حضرت عمر کے قتل سے متہم تھا۔ اس کے برعکس امام المسلمین حضرت عثمان کے خون کا کچھ احترام ملحوظ نہیں رکھا جاتا جن کو بے گناہ ہونے کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"تین باتیں ہیں جس نے ان سے نجات حاصل کر لی وہ فلاح وبہبود سے ہمکنار ہوا۔

(۱) میری وفات (۲) خلیفہ مظلوم کا ناحق قتل (۳) دجّال۔

باقی رہا ولید کا معاملہ تو اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی نے حضرت عثمان کے حکم سے ولید پر حد لگائی تھی۔ رافضی کا یہ قول کہ "میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جا سکتا"۔ صریح کذب ہے۔ یہ امر باعث حیرت و استعجاب ہے کہ شیعہ خود اس بات کے دعویدار ہیں کہ حضرت علی کے زمانہ میں شرعی حدود کو پامال کیا جاتا رہا اور آپ موجود ہوتے ہوئے تقیہ کی بنا پر خاموش رہا کرتے تھے۔ اگر آپ نے حضرت عثمان کی موجودگی میں یہ بات کہی بھی تھی تو اس لیے کہی ہوگی کہ حضرت عثمان اور ان کے اعوان و انصار اقامت حدود میں ان کی اعانت کرتے تھے اگر آپ ان سے تقیہ کیے ہوتے تو یوں نہ کہتے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عثمان نے جمعہ میں ایک اذان کا اضافہ کیا جو بدعت ہے"

ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی نے اپنے عہد خلافت میں اسی پر عمل کیا اور اس اذان کو بند نہ کیا حالانکہ اس کا بند کرنا حضرت معاویہ کو معزول کرنے اور ان کے خلاف نبرد آزما ہونے سے آسان تر تھا۔

اگر کہا جائے کہ اگر حضرت علی اس اذان کو بند کر دیتے تو لوگ اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہم کہیں گے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اس اذان کے مستحب ہونے میں حضرت عثمان کے ہمنوا تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ حضرت عمار بن یاسر سہل بن حُنَیف اور دیگر سابقین اولین صحابہ بھی حضرت عثمان کے موید تھے اور اگر وہ ان سے اختلاف بھی کرتے تو اجتہادی امور میں اختلاف ایک عام بات ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ اذان بدعت ہے تو تو ہم کہیں گے کہ اہل قبلہ سے لڑنا بھی بدعت ہے۔ مزید براں شیعہ نے اذان میں "حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ" کا اضافہ کیا ہے جو آنحضور سے ثابت نہیں تو کیا یہ بدعت نہیں؟ اگر نقلاً یہ ثابت ہو بھی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابن عمر بعض اوقات یہ الفاظ کہا کرتے تھے جس طرح بعض صحابہ اذان و اقامت کے درمیان کہا کرتے تھے حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ، اَلصَّلٰوۃُ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" اس کو نداء الامراء کہتے تھے اکثر علماء کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"سب مسلمان حضرت عثمان کے خلاف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو قتل کر دیا گیا"۔

شیعہ کا یہ الزام کہ سب مسلمان حضرت عثمان کے خلاف تھے۔

اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان حضرت عثمان کے اس حد تک مخالف تھے کہ وہ آپ کو مباح الدم خیال کرتے تھے تو یہ کذب و بہتان ہے اس لیے کہ آپ کو چند ظالم باغیوں نے قتل کیا تھا۔ سابقین اولین صحابہ اس پر رضامند نہ تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

"خدا قاتلین عثمان پر لعنت کرے وہ چوروں کی طرح بستی کی پچھلی جانب سے داخل ہوئے۔ خدا ان کو غارت کرے۔ ان میں سے وہی لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے جو راتوں رات بھاگ گئے تھے اور مسلمانوں کو خبر بھی نہ تھی۔ مدینہ میں جو لوگ موجود تھے انھیں معلوم نہ تھا کہ یہ حضرت عثمان کو قتل کرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے"۔

علاوہ ازیں سب لوگ آپ کے خلاف نہ تھے بلکہ اکثر ہم خیال تھے۔ آپ پر جو جو اعتراضات کیے گئے تھے۔ ان میں اکثر مسلمان آپ کو حق بجانب قرار دیتے تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ جو شیعہ علماء مداہنت فی الدین کے عادی نہیں ہیں وہ بھی حضرت عثمان کی تائید کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان اعتراضات کے بارے میں حضرت عثمان کا ساتھ دیا ہے وہ ان مسلمانوں کی نسبت اکثر و افضل ہیں جنہوں نے حضرت علی پر وارد کردہ مطاعن سے متعلق جملہ امور یا اکثر امور میں حضرت علی کی پشت پناہی کی تھی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"لوگوں نے حضرت عثمان سے کہا آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۔ آپ احد میں بھاگ گئے اور بیعتِ رضوان میں شریک نہیں ہوئے تھے"۔

ہم کہتے ہیں یہ جاہل شیعہ کا قول ہے۔ حضرت عثمان و ابن عمر نے ان معترضین کو جواب دیا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمان کو مدینہ میں رہنے دیا تھا۔ صلح حدیبیہ میں آپ نے حضرت عثمان کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا تھا۔ جب آپ کو خبر پہنچی کہ حضرت عثمان کو قتل کر دیا گیا ہے تو آپ نے صحابہ سے موت کی بیعت لی صحابہ میں سے جو لوگ جنگ احد سے واپس آ گئے تھے اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى

الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ آل عمران۔۱۵۲)

پھر تم کو ان سے پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائے اور تمہیں معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔

نیز فرمایا۔

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (سورہ آل عمران۔۱۵۵)

اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا وہ بخشنے والا بردبار ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"انہوں نے جیش اسامہ کو تیار کیا جو اس سے پیچھے رہا۔ اللہ تعالیٰ اس پر لعنت بھیجے"۔

یہ صریح کذب ہے۔ مقام افسوس ہے کہ شیعہ جھوٹ کو قبول کرنے میں بہت جلدبازی سے کام لیتے ہیں اور سچائی کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کے ساتھ جانے سے توقف کیا اور کہا تھا۔ "میں لشکر لے کر کیسے جاؤں حالانکہ میں سواروں سے آپ کے بارے میں پوچھتا پھرتا ہوں"۔ چنانچہ آپ نے ان کو پیچھے رہنے کی اجازت دیدی۔ پھر آپ کی وفات کے بعد سب صحابہ حضرت اسامہ کے ساتھ باہر نکلے۔ اگر آپ اسامہ کو جانے کا حکم دیتے تو وہ لشکر کے ساتھ روانہ ہو جاتے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اسلام میں اولین اختلاف مسئلہ امامت میں رونما ہوا"۔

ہم کہتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ صحابہ میں اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا اور انہوں نے بالاتفاق حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ ایسا اتفاق حضرت علی کے عہد خلافت میں نہیں دیکھا گیا۔ اس لیے کہ اہل شام نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود جب بعض شیعان علی نے آپ کی موجودگی میں اہل شام کو برا بھلا کہا تو حضرت علی نے اس سے منع کیا اور کہا۔

"اہل شام کو گالیاں نہ دو ان میں ابدال بھی ہیں"۔
ایک مرتبہ حضرت علی نے فرمایا۔
"اہل شام ہمارے بھائی ہیں مگر انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کردی ہے"
اللہ تعالے فرماتے ہیں۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (سب مومن بھائی بھائی ہیں۔ بھائیوں میں صلح رکھو)
خلاصۂ کلام! حضرت علی کی خلافت حق ہے اور آپ بلاشبہ ایک امام راشد تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت آپ کی بیعت میں شریک نہیں ہوئی اس لیے کہ بیعت خلافت میں جمہور اہل حل وعقد کا لحاظ ہوتا ہے اور وہ سب بیعت میں شریک ہوگئے تھے۔
شیعہ مصنف لکھتا ہے
پانچواں اختلاف فدک اور توارث کے مسئلہ میں ہے اہل سنت یہ روایت بیان کرتے ہیں لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ۔
ہم کہتے ہیں یہ ایک شرعی مسئلہ میں اختلاف تھا جواب زائل ہو چکا ہے اس میں جو اختلاف تھا وہ اس اختلاف سے کم ہے جو اس مسئلہ میں پایا جاتا ہے کہ میت کے بھائیوں کو دادا اور چچا کی موجودگی میں کیا حصہ ملے گا؟ علاوہ ازیں مسئلہ اقاربہ اور اس مسئلہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ دادی کو اس کے بیٹے کی موجودگی میں کیا حصہ ملے گا؟ اسی طرح یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ ماں کی موجودگی میں دو بھائیوں کو حصہ نہیں ملے گا۔ نیز یہ کہ اگر میت کا دادا اور ماں دونوں زندہ ہوں تو دادا اس وقت باپ کا حکم رکھتا ہے اور اس قسم کے دیگر مسائل۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل میں مسئلہ فدک کی نسبت عظیم تر اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان مسائل میں اہمیت اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ان مسائل میں شیعہ نے ہم سے اختلاف کیا اور ہمارے ساتھ متحد الخیال نہیں ہوئے۔ بلکہ اہل سنت وشیعہ دونوں اپنے اپنے دلائل پیش کرتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ

یہ اختلاف مکرر نہیں بلکہ ایک ہی معاملہ پر مبنی ہے اور وہ بھی معمولی سے مال میں علاوہ ازیں حضرت ابوبکر وعمر نے فدک کی جاگیر سے کئی گنا زائد مال اہلبیت کو عطا کیا تھا۔ اصل قصہ یہ ہے کہ جہلا اور شرارت پسند لوگ بات کا بتنگڑ بنا کر فدک کے واقعہ کو پیش کرتے ہیں اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی کے عہد خلافت میں یہ جملہ اموال حضرت علی کے زیر تصرف تھے مگر آپ نے اولاد فاطمہ کو واپس نہیں کیے تھے اور نہ آنحضور کا ترکہ ورثا میں تقسیم کیا۔ بقول شیعہ اگر حضرت ابوبکر وعمر نے ظلم کیا تھا تو حضرت علی نے اپنے عہد خلافت میں اسکا ازالہ کیوں نہ کیا؟

منکرین زکوٰۃ سے جنگ کے بارے میں شیعہ کا اعتراض

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"چھٹا اختلاف منکرین زکوٰۃ کے بارے میں ہے۔ حضرت ابوبکر نے ان سے جنگ کیا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں اجتہاد سے کام لے کر لونڈی غلام اور مال ان کو واپس کیا اور قیدیوں کو رہا کر دیا"۔

ہم کہتے ہیں یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ بخاری ومسلم میں ہے کہ ابوبکر وعمر دونوں منکرین زکوٰۃ کے خلاف جنگ آزما ہونے میں متفق تھے۔ دونوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ ذیل حدیث سے احتجاج کیا تھا۔ آپ فرماتے ہیں۔

"مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ جب یہ بات کہہ دی تو ان کا خون و مال محفوظ ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے کسی حق کی وجہ سے ان کا خون و مال مباح ٹھہرے اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا"۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ زکوٰۃ بھی حقوق اسلامی میں سے ایک ہے"۔

چنانچہ حضرت ابوبکر نے باتفاق صحابہ منکرین زکوٰۃ سے جنگ کی تھی۔ ان لوگوں نے زکوٰۃ کا اقرار کر لیا تھا۔ آپ نے نہ کسی کو قیدی بنایا نہ کسی کو محبوس رکھا۔ بلکہ خلافت

صدیقی میں سرے سے کوئی قید خانہ ہی نہ تھا لہٰذا یہ جھوٹ ہے کہ بہت سے لوگ قید خانہ میں مر گئے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"لوگ ابو بکر پر اعتراض کرتے تھے کہ تو نے ایک سنگدل آدمی حضرت عمر کو ہمارا حاکم بنا دیا"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی باتوں کو اختلاف پر محمول کرنا متکلم کے جاہل اور مبتدع ہونے کی دلیل ہے۔ صرف طعن کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بعض صحابہ حضرت اسامہ اور ان کے والد کو امیر بنانے پر معترض ہوئے تھے مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اعتراض حضرت طلحہ نے کیا تھا بعد ازاں وہ سب لوگوں سے زیادہ حضرت عمر کی تعظیم بجالایا کرتے تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

آٹھواں اختلاف شوریٰ کا معاملہ ہے۔ اختلاف کے بعد صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے"۔

ہم کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے جو شیعہ کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ بیعت عثمان میں کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تین روز تک لوگوں سے مشورہ کرتے رہے تھے۔ مشورہ کے بعد آپ نے بتایا کہ لوگوں کی نگاہ میں حضرت عثمان کا کوئی ہمسر نہیں ہے اگر کوئی شخص آپ کی بیعت میں اختلاف کرتا تو اس کا قول ہم تک پہنچ کر رہتا جیسے انصار کا یہ قول ہم تک پہنچ گیا کہ "ایک امیر ہم میں سے ہو گا اور ایک تم میں سے"۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

"کسی خلیفہ کی بیعت پر اس قدر اتفاق نہیں ہوا جیسا حضرت عثمان کی بیعت پر ہوا تھا"۔

صحابہ میں اختلافات

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "صحابہ میں لاتعداد اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان

نے حکم کو واپس مدینہ بلا لیا"۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر ایسی معمولی باتوں کا نام اختلاف ہے تو خلیفہ جو حکم بھی صادر کرے گا اور دوسرا کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کا نام اختلاف رکھا جائے گا اس طرح اختلاف ایک غیر محدود چیز ٹھہرے گا جس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت عثمان نے اپنی بیٹی مروان کے نکاح میں دیدی تھی آپ نے مروان کو افریقہ کے مال غنیمت کا خمس (۱/۵) دیا جس کی مالیت دو لاکھ دینار تھی"۔

ہم کہتے ہیں کہ اس واقعہ کا اختلاف سے کیا تعلق؟ نیز اس کی دلیل کیا ہے کہ حضرت عثمان نے اس قدر مال دیا تھا ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ حضرت عثمان اپنے اقارب سے الفت و محبت رکھتے اور ان کو عطیہ جات دیا کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی نے بھی اپنے اقارب و شیعہ کو مناصب جلیلہ عطا کیے اور انہیں بڑے بڑے تحائف دیے تھے۔ مزید براں بنا بر اجتہاد مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور بڑے بڑے معاملات پیش آئے۔ تاہم ہمارا عقیدہ ہے کہ عثمان و علی دونوں جنتی اور غیر معصوم تھے ان کے افعال سب اجتہاد پر مبنی ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی سرح کو مباح الدم قرار دیا تھا مگر حضرت عثمان نے اس کو پناہ دی تھی"۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ابن ابی سرح ہجرت و اسلام سے مشرف ہو کر مدینہ میں کتابت وحی پر مامور تھا۔ پھر مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا اور آپ کے خلاف افتراپردازی کرنے لگا۔ آنحضور نے اسے مباح الدم قرار دیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو حضرت عثمان نے اسے بارگاہ نبوی میں پیش کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا۔ حضرت عثمان نے عرض کیا حضور! عبداللہ کو بیعت فرما لیجئے"۔ مگر آپ نے جواب نہ دیا اور دو دفعہ یا تین دفعہ اعراض فرمایا پھر بیعت کر لیا اور فرمایا۔ "تم میں کوئی دانشمند آدمی نہیں جو مجھے دیکھتا اور جب میں نے اعراض

کیا تھا اس وقت اس کا کام تمام کر دیتا"۔ ایک انصاری نے عرض کیا۔ آپ نے مجھے اشارہ کر دیا ہوتا"۔ آپ نے فرمایا "نبی کے لیے موزوں نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کار ہو"
اس کے بعد عبداللہ بن ابی سرح خلوص دل سے اسلام لایا اور اس سے کوئی برا کام منقول نہیں۔ یہ بڑا مجاہد و جانباز سپاہی تھا۔ مکہ کے بعض لوگ اس سے بھی بڑے دشمن تھے۔ مثلاً صفوان اور ابوسفیان وغیرہ۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ (الممتحنہ - ۷)

عین ممکن ہے کہ جن کے ساتھ تمہاری عداوت ہے اللہ تعالےٰ ان کے اور تمہارے درمیان دوستی پیدا کر دے وہ اس بات پر بخوبی قدرت رکھتا ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"نواں اختلاف وہ ہے جو حضرت علی کی بیعت کرنے کے بعد پیدا ہوا۔ پہلے طلحہ و زبیر نے خروج کیا۔ پھر حضرت علی و معاویہ کے مابین اختلاف رونما ہوا جس کا نتیجہ جنگ صفین کی صورت میں برآمد ہوا۔ پھر ابوموسیٰ اشعری کے خلاف عمرو بن عاص کی وعدہ خلافی قابل ذکر ہے۔ پھر خوارج کا ظہور ہوا۔ حضرت علی خلیفہ برحق تھے مگر خوارج نے آپ کے خلاف خروج کیا۔ مثلاً اشعث بن قیس و مسعر بن فدکی و زید بن حصین وغیرہ۔ حضرت علی کے عہد خلافت میں عبداللہ[1] بن سبا جیسے غالی پیدا ہوئے اور ان دونوں فرقوں سے بدعت و ضلالت نے پر پرزے نکالے"۔

---

[1] اس شخص نے یہ عقیدہ اختراع کیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی ہیں جس طرح یوشع علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے وصی تھے۔ اس کے بعد دوسرا مخترع شیطان الطاق محمد بن جعفر رافضی تھا جس نے یہ عقیدہ گھڑ لیا تھا کہ امامت کے منصب پر چند مخصوص اشخاص فائز ہوں گے ۱۲۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں اختلاف کا ظہور و شیوع

ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی سے پہلے تینوں خلفاء بھی حق و صداقت کے حامل تھے۔ صرف حضرت علی کو خلیفۂ برحق قرار دینا دعوی بلادلیل ہے۔ شیعہ مصنف کا یہ دعوی غلط ہے کہ حضرت علی کے عہد خلافت میں اتفاق کے بعد اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اہل شام نے بالاتفاق حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اسی طرح مدینہ کی ایک جماعت اور بہت سے مصری اور اہل مغرب نے بھی اس میں شرکت نہیں کی تھی۔ حضرت طلحہ و زبیر کی معذرت کا ذکر کیے بغیر ان پر زبان طعن دراز کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ طلحہ و زبیر و حضرت علی رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا تھا بلکہ یہ لڑائی اچانک بپا ہو گئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ فریقین صلح پر آمادہ ہو گئے تھے اور بالاتفاق یہ طے پایا تھا کہ قاتلین عثمان سے انتقام لیا جائے۔ دوسری جانب قاتلین عثمان فتنہ پردازی پر اتر آئے اور انھوں نے حضرت عائشہ کی جماعت پر دھاوا بول دیا۔ حضرت عائشہ رضہ کے رفقاء نے مدافعت کی سعی کی۔ قاتلوں نے حضرت علی کو بتایا کہ حضرت عائشہ کی فوج نے حملہ کر دیا۔ حضرت علی نے مدافعت کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے فریقین دفاع کر رہے تھے۔ ابتداءً حملہ کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

مگر روافض بھی عجیب لوگ ہیں نہ سچی بات کہتے ہیں نہ سچی بات مانتے ہیں۔ ہر چیخ و پکار پر سر دھننے لگتے ہیں۔ صحابہ کبار کے جانی دشمن اور اعداء اسلام تاتاریوں کے گہرے دوست ہیں اہل سنت عوام کو ایذا پہنچانے کے لیے تاتاری کفار کی طرف طلب امداد کا ہاتھ بڑھاتے ہیں عراق و دیگر بلاد و امصار کو برباد کرنے کا فن کوئی ان سے سیکھے جیسے خلافت عباسیہ کے وزیر ابن العلقمی نے کیا تھا۔ اس نے ہلاکو خاں سے مراسلت کر کے اسے عراق آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ بڑے پختہ ارادے کے ساتھ عراق آیا اور ہر طرف تباہی پھیلا دی۔ بغداد میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ علوی و عباسی خواتین کو قیدی بنا لیا۔ مسلمانوں کی اولاد کفر و شرک کی گودیں میں پرورش پانے لگی۔ بہر کیف شیعہ کا وجود اسلام اور اہل اسلام کے لیے مارِ آستین

سے کم نہیں۔ وہ ملاحدہ اور غالی روافض کی تعظیم بجالاتے ہیں اور اصحاب رسول سے بغض وکینہ رکھتے ہیں۔

گویا روافض صحیح معنی میں اس آیت کے مصداق ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (سورہ نساء ۵۱)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ جبت وطاغوت پر ایمان رکھتے اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اہل ایمان کی نسبت زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔

شیعہ کا طرز فکر وعمل

اس بات کا کیا علاج کہ شیعہ جھوٹی روایات سے ہمارے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور منقولات میں سے صرف انہی دلائل کو قبول کرتے ہیں جو ان کی خواہشات کے موافق ہوں وہ معرفت اسناد سے بیگانہ اور فن حدیث سے نابلد محض ہیں۔ جب ان میں سے کوئی شخص جھوٹی یا سچی کوئی دلیل پیش کرتا ہے تو وہ اس سے کتاب وسنت کی دلیل کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی دلیل اس کی معارض ہے۔ جب ان کی تردید میں مخالف احادیث صحیحہ پیش کرتا ہے تو ضد وعناد سے ان کی تکذیب کرتے ہیں۔ آیات قرآنیہ کی تحریف کرتے ہیں۔ اگر مخالف بالادست ہو اور شیعہ اس سے خائف ہوں تو فوراً اس کے پیش کردہ دلائل کی تائید کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اس وقت وہ امامیہ سے اظہار براءت کرنے لگتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے منافقین سے مناظرہ کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟۔

شیعہ نے تین اصول مقرر کر رکھے ہیں۔

(۱) ائمہ معصوم ہیں

(۲) جو بات ائمہ سے نقل کی جائے وہ اسی طرح ہے جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو۔

(۳) اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔

شیعہ کے ائمہ اہل بیت میں شامل ہیں اس لیے گویا ان کے یہاں نہ کوئی شرعی دلیل ہے

اور نہ تعلیل۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ فقہ وتحقیق اور علم وتوفیق سے محروم ہیں۔ شیعہ جن مسائل میں باقی امت سے منفرد ہیں ان میں شیعہ کا اعتماد انہیں اصول سہ گانہ پر ہے جو کتاب و سنت، عقل وفکر اور اجماع امت کے خلاف ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"تیسری فصل میں حضرت علی کی امامت کے دلائل بیان کیے جائیں گے ہم کہتے ہیں کہ امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ اگر امام کے لیے عصمت کی شرط تسلیم کر لی جائے تو اس سے حضرت علی کا امام ہونا خودبخود لازم آتا ہے۔ امام کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ انسان تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ اپنی بقاء میں اکل وشرب لباس اور جائے سکونت کا محتاج ہے۔ بنا بریں قیام نوع کے لیے وہ اعوان وانصار کا محتاج ہے جب بہت سے انسان ایک جگہ اکٹھے ہوں گے تو ان میں دنگہ وفساد کا خطرہ لاحق ہوگا اس لیے کہ بسا اوقات انسان کو ایسی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جس پر دوسرا شخص قابض ہوتا ہے۔ چنانچہ قوت شہوانیہ اسے وہ چیز جبراً حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے جس کا نتیجہ فتنہ وفساد کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

بنا بریں ایک امام معصوم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو ان کو فساد سے روکے اور حقدار کو اس کا حق پہنچائے یہ امام سہو وخطا سے پاک ہو ورنہ ایک اور امام کی ضرورت پڑے گی اس لیے کہ امام کو اس ضرورت کے پیش نظر نصب کیا گیا تھا کہ امت سے خطا کا صدور ممکن ہے اگر امام سے بھی خطا سرزد ہو سکتی ہو تو کسی اور امام کی ضرورت پڑے گی اگر وہ خطا سے معصوم ہو تو پھر اس کی امامت درست ہے ورنہ ایک اور امام نصب کرنا پڑے گا اور اس طرح تسلسل لازم آئے گا۔ چونکہ ابوبکر وعمر بالاتفاق معصوم نہ تھے جب کہ علی معصوم تھے لہٰذا وہی امام ہوں گے۔"

ہم جواباً کہتے ہیں کہ معصوم صرف رسول کی ذات ہوتی ہے اور اطاعت بھی اسی کی واجب ہے۔ رسول کے اوامر واحکام کا علم حاصل کرنا امام منتظر کے احکام معلوم کرنے سے آسان تر ہے لہٰذا رسول ہی امام معصوم ہوتا ہے جس کے اوامر امت کے لیے واجب

التعمیل ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے دوسرے کسی امام کی حاجت نہیں۔ اولی الامر رسول کے احکام کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں۔ یہ بات قطعی طور سے معلوم ہے کہ آنحضور کے مقرر کردہ حکام یمن اور دیگر بلاد اسلامیہ میں اپنے اجتہاد کی روشنی میں رعیت کے امور کا فیصلہ کیا کرتے تھے حالانکہ وہ معصوم نہ تھے۔ مگر شیعہ صرف حضرت علی ہی کو امام تصور کرتے ہیں حالانکہ حضرت علی کے نائبین ملک کے دور افتادہ گوشوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان میں ایسے بھی تھے جن کو شرعی اوامر و نواہی کا کچھ پتا نہ تھا۔ بلکہ وہ ایسے امور میں بھی تصرف کرتے تھے جن سے حضرت علی بھی واقف نہ تھے۔

امامت علیؓ کے دلائل

مزید براں جو صفات شیعہ نے امام میں ضروری قرار دی ہیں ایسا امام ہمارے زمانہ میں کہیں موجود نہیں۔ شیعہ کے نزدیک وہ مفقود اور بے حقیقت ہے۔ بھلا ایسے امام سے امامت کے مقاصد کس حد تک پورے ہو سکتے ہیں؟ ایسے فرضی امام سے تو ایک جاہل و ظالم بھی بہتر ہے۔ امام کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ اس سے علم حاصل کیا جائے اور اس کے اعمال کی پیروی کی جائے۔

شیعہ کا یہ قول کہ "امام معصوم کا تقرر ضروری ہے"۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ آیا تمہاری مراد یہ ہے کہ ایسے امام کو پیدا کرنا اور نصب کرنا خدا کے لیے ضروری ہے جو معصوم ہو یا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کے لیے ایسے امام کی بیعت کرنا ناگزیر ہے۔ شیعہ حضرت علی کو معصوم قرار دیتے ہیں مگر وہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں مسند خلافت پر متمکن نہ ہو سکے بلکہ وہ اپنے عہد خلافت میں بھی محروم اقتدار رہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے تین ظالموں کو یکے بعد دیگرے خلافت پر فائز کیا اور انہوں نے امت کے لیے بڑے مفید کام کیے مگر حضرت علی کو یہ توفیق نہ بخشی اور اللہ تعالیٰ نے ایسی ضرورت کے زمانہ میں اس معصوم کو پیدا نہ کیا۔

اگر شیعہ کہیں کہ امت کے لیے ایسے امام کا تقرر اور اس کی اعانت ضروری ہے تو ہم کہیں گے کہ جب وہ ائمہ کی اطاعت کے پہلو بہ پہلو ان کی نافرمانی بھی کرتے ہیں تو امام کا فائدہ

کیا ہوا؟ نیز یہ کہ جب ان کے وجود سے جملہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے بلکہ بہت سے شرائط مفقود ہوتے ہیں تو عصمت کی شرط کس لیے باقی رکھی جائے؟ علاوہ ازیں جب عدم عصمت یا معصوم کے عاجز ہونے کی وجہ سے مقصود حاصل نہ ہو تو عصمت کا وجود و عدم یکساں ہے۔ پھر عقلی دلیل کی رو سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ امام معصوم کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے؟ اور اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا امام پیدا کیا ہے تو اس کی مصلحت اور لطف و کرم کہاں گیا؟ جمہور اس کا انکار کرتے اور شیعہ کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتے۔ بنا بریں معتزلہ کی اس فریب دہی کو ترک کر دینا چاہیئے جس کی بنا پر وہ ایسے امور کو اللہ تعالیٰ کے لیے واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ نقطۂ نگاہ اس لیے غلط ہے کہ وہ مصلحت عامہ کلیہ اور مصلحت جزئیہ کے مابین فرق و امتیاز قائم نہیں کر سکتے۔

روافض و نصاریٰ کی مشابہت

روافض کا یہ قول نصاریٰ کے اس قول کی مانند ہے کہ اللہ تعالیٰ مجسم ہو کر اتر آیا یا اس نے اپنے بیٹے کو زمین پر بھیجا تاکہ اسے سولی دیا جائے اور یہ سولی دیا جانا سب بنی آدم کی مغفرت کا باعث ہو اور شیطان کو بھی اس سے دور کیا جائے۔ نصاریٰ کو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جب مسیح کا قتل و صلیب اور تکذیب عظیم شرارت و ضلالت ہے تو گویا اس نے خود بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر کے چھوٹے گناہ کو معاف کرنا چاہا۔ اس کے باوجود اس نے شر کو کم کرنے کے بجائے اس میں اور اضافہ کیا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

"جب انسان مدنی الطبع ہے تو اہل مدینہ سے شر کو دور کرنے کے لیے امام معصوم کا تقرر ضروری ہے"۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے کیا ہر شہر میں ایک ایسا امام معصوم موجود رہا ہے جو ان سے ظلم کا ازالہ کرتا رہا ہو یا نہیں؟ اگر شیعہ اس کا جواب اثبات میں دیں تو یہ ظاہر مجادلہ ہے اس سے لازم آئے گا کہ کفار و مشرکین کے شہروں میں بھی امام معصوم ہوگا۔

پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ آیا شام میں حضرت معاویہ کے یہاں بھی کوئی معصوم امام موجود تھا؟ اگر شیعہ کہیں کہ امام معصوم کے نائبین ہر جگہ موجود ہوتے ہیں تو یہ خلاف ظاہر ہے اور اگر کہیں کہ ان کے نائب بعض شہروں میں ہوتے ہیں اور بعض میں نہیں تو یہ خدا پر واجب کیسے ہوا؟ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ امام معصوم کے نائب بھی معصوم ہوتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ غیر معصوم ہیں تو لوگوں کو امام معصوم سے کیا فائدہ پہنچا؟ خصوصاً جبکہ وہ غیر معصوم کی اقتداء میں نماز پڑھتے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر شیعہ کہیں کہ ان امور کا ذمہ وار امام معصوم ہے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اگر وہ حضرت ابوبکر و عمر کی طرح با اقتدار ہو تب بھی اس کا عدل سب لوگوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ ہر شہر کے لیے ایک طاقتور عادل کا دستیاب ہونا یوں بھی مشکل ہے۔ جب امام معصوم کو ایسا شخص نہیں مل سکے گا تو اس سے یہ فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ امام معصوم کا تقرر پھر خدا پر واجب کیسے ٹھہرا؟ یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ امام معصوم شیعہ کے نزدیک عاجز ہے اور ہمارے نزدیک معدوم ہے۔

معصومیت ائمہ کا مسئلہ

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ امام معصوم اسی صورت میں ظلم کا ازالہ کر سکتا اور اپنی رعیت سے عدل و انصاف کا سلوک کر سکتا ہے جب وہ ظلم کے روکنے اور اپنا حق وصول کرنے پر قدرت رکھتا ہو جب وہ خود ہی عاجز ہوگا تو رعیت سے ظلم کو کیونکر دور کر سکے گا؟ شیعہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا امام خائف ہے اور خوف قتل کی بنا پر چار سو ساٹھ سال سے باہر نہیں نکل رہا۔ اللہ تعالیٰ سے ظلم کا صدور نہیں ہوتا نہ وہ امر واجب میں خلل ڈالتا ہے اس لئے امر واجب کو پورا کر دیا ہے مگر اس کے باوجود جن مصالح کا ظہور امام معصوم سے ضروری تھا وہ بروئے کار نہیں آئے۔ اگر ان مصالح کا حصول صرف امام کی تخلیق سے ہی پورا کر دیا ہے اور وہ حاصل نہیں ہوئے تو امام کو پیدا کرنا واجب نہیں ہوگا اور اگر ان مقاصد و مصالح کا حصول تخلیق امام کے علاوہ چند دیگر امور کے پیدا کرنے پر موقوف تھا اور ان دونوں کے مجموعہ سے مقصد کا حاصل ہونا ضروری تھا تو اس نے وہ مجموعہ پیدا نہیں کیا۔ قلیل ہو یا کثیر

اخلال بالواجب اللہ تعالے پر ممتنع ہے۔ بنابریں دونوں صورتوں میں ان مقاصد کے موجبات کا پیدا کرنا اس پر ضروری نہ ٹھہرا۔ اور جب واجب نہ ہوا تو اس میں کچھ فرق نہیں کہ وہ معصوم کو پیدا کرے جس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو یا اسے پیدا نہ کرے اور اس پر یہ واجب بھی نہ ہو۔ بنابریں اس کا وجود بھی ضروری نہ ہوگا۔ لہٰذا ہر صورت میں اس کے وجود کو ضروری قرار دینا باطل ٹھہریگا۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالے پر معصوم کو پیدا کرنا واجب تھا وہ اس لئے کر دیا۔ مگر لوگوں نے اس کی نافرمانی کر کے اس مصلحت کو پورا نہ ہونے دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالے کو معلوم تھا کہ لوگ مصلحت کی تحصیل کے سلسلہ میں امام معصوم کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے بلکہ نافرمانی کر کے عذاب میں مبتلا ہوں گے تو اس کا پیدا کرنا واجب نہ ہوا اور نہ اس میں کچھ حکمت و مصلحت مضمر ہوئی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سب لوگ اس کے نافرمان نہیں بخلاف ازیں کچھ لوگ نافرمانی کرتے ہیں اور بعض اس کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں پھر وہ ان لوگوں کو اطاعت کی توفیق کیوں نہیں دیتا عصمت ائمہ کا مسئلہ اس لیے بھی درست نہیں کہ شہر کی اصلاح کے لیے جس قدر ایک ناظم و مدبّر کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی بذات خود اپنے بدن کی اصلاح کرے۔ جب اللہ تعالے نے نفس انسانی کو معصوم پیدا نہیں کیا تو اس پر معصوم رئیس کو پیدا کرنا کیونکر واجب ٹھہرا؟

ایک سوال یہ بھی ہے کہ معصوم کو پیدا کرنے کا مقصد آیا دنیا سے فساد کو ختم کرنا ہے یا کم کرنا؟ اگر ختم کرنا مقصود ہے تو دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور اگر فساد کی تقلیل مقصود ہے تو یہ کام معصوم کے بغیر بھی ممکن ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر کے عہد خلافت میں فساد میں جو کمی آئی تھی وہ حضرت علی کے عہد خلافت میں رونما نہیں ہوئی۔ اسی طرح بارہ اماموں کے وجود سے فساد جس حد تک زائل ہوا اسی قدر دیگر خلفاء کے زمانہ میں بھی اس میں انحطاط پیدا ہوا۔

کہا گیا ہے کہ ظالم امام کے زیر تسلط ساٹھ سال بسر کرنا ایک رات بدوں امام و حاکم

گذارنے سے بہتر ہے"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اگر امام معصوم نہ ہو تو کسی اور امام کی ضرورت لاحق ہو گی"۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ جب امام سے غلطی صادر ہو تو امت کا کوئی فرد اس کی اصلاح کر دے تاکہ سب لوگوں کا غلطی پر جمع ہونا لازم نہ آئے جس طرح رعیت کا کوئی فرد غلطی کر رہا ہو تو امام یا اس کا نائب اس کی اصلاح کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ گناہ سے بچ جاتے ہیں اور اس پر جمع نہیں ہوتے جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ خبر متواتر میں ایک ایک کے ہر شخص کے بارے میں کذب و خطا کا احتمال ہوتا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی عادۃً یہ احتمال باقی نہیں رہتا بنا بریں بہ حیثیت مجموعی پوری امت کو معصوم قرار دینا ایک شخص کو معصوم قرار دینے سے بہتر ہے اس سے عصمتِ امام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور امام کو معصوم قرار دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

عقیدۂ رفض کا بانی ایک زندیق تھا

روافض کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ ان کے خیال میں سب اہل اسلام غلطی پر ہو سکتے ہیں مگر ایک شخص کا غلطی سے پاک ہونا ضروری ہے۔ متعدد علماء نے ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے تشیع کی بنا ڈالی اور بنا بہ نص حضرت علی کو خلیفہ قرار دیا وہ ایک زندیق تھا اور دین میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اس نے ایسا کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا تھا جو پولوس نے نصاریٰ کے ساتھ کیا تھا مگر اسے اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو پولوس کو ہوئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ سب نصاریٰ ضعیف العقل تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور آپ کے پیرو ایسے نہ تھے جو صحیح معنی میں دین عیسوی سے باخبر ہوں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں جب پولوس نے حضرت مسیح کے بارے میں غلو کا عقیدہ اختراع کیا تو بہت سے عیسائی اس کی پیروی کرنے لگے بلکہ بہت سے سلاطین اس کے ہمنوا بن گئے۔ نصاریٰ کی ایک جماعت نے جب

ان کی تردید کا بیڑا اٹھایا تو پولوس کے ہمنوا سلاطین نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا بعض نصاریٰ نے بادشاہوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا اور عبادت گاہوں میں عزلت گزین ہو گئے۔ للہ الحمد۔ کہ امت مسلمہ کا معاملہ نصاریٰ سے یکسر مختلف ہے۔ حدیث نبوی کے مطابق مسلمانوں کی ایک جماعت حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گی۔ بنابریں کوئی ملحد و بے دین اپنے غلو کی بنا پر یا حق پر غلبہ پا کر اس میں بگاڑ نہیں پیدا کر سکتا البتہ جو شخص اس کی پیروی کرے گا وہ یقیناً گمراہ ٹھہرے گا۔

علاوہ ازیں امام معصوم کے نائب جزئیات میں معصوم نہیں ہو سکتے اس کے باوصف اکثر بلکہ تمام امور وہی فیصل کرتے ہیں۔ اب کلیات میں معصوم ہونے کا مسئلہ باقی رہا۔ تو اس ضمن میں واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کلیات کی اس طرح تصریح کر سکتا ہے کہ اس کی موجودگی میں کلیات کی معرفت حاصل کرنے میں امام کی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ نص نبوی کو نص امام سے اکمل بنا دے بنابریں ہم کلیات و جزئیات دونوں میں عصمتِ امام کے محتاج نہیں ہیں۔

ہم شیعہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی رائے میں عصمتِ امام سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ امام ادا عبادات یا ترک معاصی میں مختار ہے؟ حالانکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ اپنے اختیار کا خالق نہیں ہے۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کا خالق ہے یا یہ معنی کہ وہ معصیت کی قدرت کو سلب کر سکتا ہے۔ حالانکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہمارے اختیار کا خالق نہیں ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ خداوند تعالیٰ معصوم کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اگر شیعہ تقدیر کے بارے میں اپنے نظریہ کی خلاف ورزی کریں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ معصوم کو طاعت و عبادت کا اجر نہیں دیا جائیگا۔

شیعہ کا قول ہے

"علی کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں"۔

یہ صحیح نہیں اس لیے کہ بہت سے عابد و زاہد اور عوام شیعہ کی طرح اپنے مشائخ کو معصوم قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا عقیدہ ہے کہ عام صحابہ کرام ان کے شیوخ سے افضل

ہیں۔ خلفائے راشدین تو بالاولی افضل ہوں گے۔ فرقہ اسمعیلیہ والے اپنے اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں ان کے امام بارہ اماموں سے الگ ہیں۔ بنو امیہ کے متبعین کہا کرتے تھے کہ خلفاء پر حساب وکتاب نہیں ہو گا۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ امام کا ہر حکم واجب الاطاعت ہے اسے معصوم کی ضرورت نہیں وہ کہہ سکتا ہے میرے لیے اس امام یا شیخ یا امیر کی عصمت ہی کافی ہے جس کا میں پیرو ہوں۔ اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء۔ ۵۹)

اللہ تعالے، رسول علیہ السلام اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرتے رہو۔

امامیہ عصمتِ علی کے دعویٰ میں منفرد ہیں

اگر شیعہ کہیں کہ ان لوگوں کی مخالفت کچھ اہمیت نہیں رکھتی تو یہ بات ناقابل قبول ہے اس لیے کہ وہ جس امام کے پیرو ہیں وہ موجود ہے۔ بخلاف ازیں روافض جس امام کی پیروی کے مدعی ہیں وہ امام منتظر معدوم ہے جس کی اطاعت قطعی طور پہ بے سود ہے۔ مزید براں اصحاب رسول تابعین اور اصحاب علم میں سے کوئی بھی عصمتِ علی کا مدعی نہیں ہے۔ البتہ جاہل امامیہ اس دعوی میں اسی طرح منفرد ہیں جس طرح گمراہ خوارج حضرت علی کو کافر قرار دیتے ہیں اور نواصب آپ کو فاسق تصور کرتے ہیں۔

ہم شیعہ سے کہیں کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔

(۱) امام معصوم کا وجود ضروری ہے

(۲) امام معصوم کا وجود ضروری نہیں

بصورت ثانی شیعہ کا قول باطل ٹھہرا اور اگر معصوم کا وجود ضروری ہے تو ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ معصوم علی ہیں اور خلفاء ثلاثہ معصوم نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں اگر یہ نظریہ درست ہے تو معصوم صرف حضرت ابوبکر و عمر ہوں گے اس لیے کہ اہل سنت ان کو بالاتفاق حضرت علی سے افضل قرار دیتے ہیں اور اگر حضرت ابوبکر و عمر معصوم نہیں تو حضرت علی بالاولیٰ معصوم نہیں ہو سکتے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ مسلمان صرف موسیٰ و

عیسٰی کی نبوت کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے پہلو بہ پہلو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کے ایمان کو اصحاب ثلاثہ کے ایمان سے منفرد اور مستقل مانتے ہیں۔ اصحاب ثلاثہ سے جب عصمت کی نفی کی جائے گی تو اس کے پہلو بہ پہلو عصمت علی کو بھی ٹھکرا دیا جائے گا۔[1]

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی کی امامت اجماع سے ثابت ہے مگر اصحاب ثلاثہ کی امامت اجماعاً ثابت نہیں"۔ یہود کے اس قول سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی نبوت اجماع سے ثابت ہے جب کہ محمد کی نبوت اجماع سے ثابت نہیں" یا نصاریٰ کے اس قول کی مانند کہ محمد و موسیٰ اجماع کی رو سے الٰہ نہیں مگر عیسٰی الٰہ ہیں"۔

ہم بداہۃً اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت عیسٰی میں الوہیت کی ایسی کوئی خصوصیت موجود نہیں جو محمد و موسیٰ میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح ہمیں قطعیت کے ساتھ اس مسلمہ صداقت کا علم حاصل ہے کہ حضرت علی میں ایسی کوئی مزیت نہیں پائی جاتی جس سے حضرت ابوبکر وعمر محروم ہوں۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ انہیں یہ بات کیونکر معلوم ہوئی کہ علی معصوم تھے اور ابوبکر و عمر معصوم نہ تھے؟ اگر شیعہ کہیں کہ ہمیں اجماع سے اس بات کا علم حاصل ہوا کہ حضرت علی کے سوا کوئی بھی معصوم نہ تھا۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اگر اجماع دین میں حجت نہیں ہے تو شیعہ کا دعویٰ غلط ٹھہرا۔ اور اگر حضرت علی کی عصمت کے اثبات میں اجماع حجت ہے جو کہ اصل ہے تو آپ کی عصمت سے جو چیز مقصود ہے یعنی شریعت کے حفظ و نقل کے بارے میں بھی اجماع حجت ہوگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیعہ اجماع کو حجت قرار نہیں دیتے مگر اپنے نظریات کے اثبات میں اجماع سے احتجاج کرتے ہیں۔

اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی کا معصوم ہونا خبر متواتر سے ثابت ہے تو یہ دعویٰ اسی طرح ہے جیسے ان کا یہ دعویٰ کہ حضرت علی کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ مزید براں شیعہ کے نزدیک اجماع اس صورت میں حجت ہے جب اس میں معصوم کا قول ثابت ہو۔ اگر معصوم کی معرفت اجماع پر موقوف ہو تو دور لازم آئے گا اس لیے کہ اس کا معصوم ہونا اس کے اپنے قول پر منحصر

---

[1] لکھنؤ کے کسی محلہ میں شیعہ روزانہ رات کو دیواروں پر اصحاب ثلاثہ کو تبرا (گالیاں) لکھ دیا کرتے تھے اور سنی مٹاتے رہتے۔ ایک سنی مولوی صاحب نے کہا کہ آئندہ نہیں لکھیں گے ہم ان کا علاج کر لیتے ہیں چنانچہ انہوں نے اصحاب ثلاثہ کے ساتھ حضرت علی کا نام بھی لکھ دیا۔ اور فرمایا کہ جب نیکی اور ہدایت کی زندگی میں ان سب نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا تو اب مشکل میں حضرت علی الگ کیسے رہ سکتے ہیں؟

ہے اور اس کے قول کا حجت ہونا اسی صورت میں پہچانا جاتا ہے جب یہ بات معلوم ہو کہ وہ معصوم ہے۔ لہٰذا دونوں میں سے کوئی بات بھی ثابت نہ ہوگی اور اس کا نتیجہ اس صورت میں یہ آمد ہوگا کہ گویا شیعہ نے کہا "فلاں شخص اس لیے معصوم ہے کہ اس نے کہا میں معصوم ہوں اور میرے سوا کوئی بھی معصوم نہیں ہے"۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص یہ بات کہہ سکتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کہے "میری ہر بات سچی ہے"۔ اگر اس کی سچائی اسی بات پر موقوف ہے تو اس کی صداقت معلوم نہ ہوگی۔

حضرت علی منصوص علیہ امام نہ تھے

اسماعیلیہ کا دعوی بھی اسی طرح ہے وہ کہتے ہیں کہ امام معصوم ہوتا ہے اور اس پر امامت کا نشان لگا ہوتا ہے۔ اسمٰعیلیہ کہتے ہیں حصول علم کا ذریعہ سمع و عقل ہے اور اس کی صحت امام معصوم اور اس کی تعلیمات سے حاصل ہوتی ہے جب کسی معیّن و مخصوص امام کے معصوم ہونے کی دلیل پوچھی جائے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکیں گے اور ثابت ہو جائے گا کہ ان کے قول میں تناقض پایا جاتا ہے۔

اگر ہم حضرت علی کے اس قول پر عمل کرنے کے لیے تیار بھی ہوں کہ "میں معصوم ہوں" تو ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ یہ قول ان سے کس نے نقل کیا؟ بخلاف ازیں بتواتر آپ سے اس کے خلاف منقول ہے۔ حضرت علی نے اپنے قاضیوں کو بتاکید حکم دیا تھا کہ ان کی رائے کے برخلاف فیصلہ صادر کریں۔ بہ نقل صحیح ثابت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا۔

"میری اور عمر کی رائے اس بات پر متفق ہوگئی تھی کہ صاحب اولاد لونڈیوں کو فروخت نہ کیا جائے۔ اب میں ان کے فروخت کرنے کے حق میں ہوں"۔ یہ سن کر حضرت علی کے قاضی عبیدہ سلمانی نے کہا۔

"حضرت عمر کے ساتھ آپ کی متفقہ رائے ہمیں آپ کی انفرادی رائے سے عزیز تر ہے"

قاضی شریح اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے اور حضرت علی سے مشورہ نہیں لیا کرتے تھے، حضرت علی اس ضمن میں ان کے موید تھے۔ حضرت علی اپنے اجتہاد کے مطابق فتوی دیتے اور فیصلہ صادر کیا کرتے تھے پھر اپنے اجتہاد ہی سے اپنے سابقہ فتوی سے

رجوع کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں آپ کے اقوال باسانید صحیحہ ثابت ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"یہ ضروری ہے کہ خلیفہ و امام کا تقرر نص کی بنا پر ہو اس لیے کہ ہم طریق انتخاب کا بطلان ثابت کر چکے ہیں۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ بعض لوگ جو امام کو منتخب کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے افضل نہیں ہیں جو کسی اور امام کا انتخاب عمل میں لاتے ہیں ورنہ تنازع بپا ہو جائے گا۔ حضرت علی کے سوا دوسرے ائمہ و خلفاء بالاتفاق منصوص علیہ نہ تھے لہٰذا حضرت علی کے سوا کوئی بھی امام برحق نہ ہو گا"

ہم دونوں مقدمات کو تسلیم نہیں کرتے۔ علمائے سلف و خلف کے نزدیک حضرت ابوبکر کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ ایک قلیل جماعت کے نزدیک حضرت عباس بھی منصوص علیہ امام تھے۔ پھر حضرت علی کے منصوص علیہ امام ہونے پر اجماع کیسے رہا؟

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں (۱) خلیفہ کے تقرر میں نص معتبر ہے۔ (۲) خلیفہ کے تقرر میں نص معتبر نہیں ہے۔ بصورت اول ہم کہیں گے کہ نص حضرت ابوبکر کے حق میں ہے نہ کہ حضرت علی کے بارے میں۔

بصورت ثانی اگر نص معتبر نہیں تو شیعہ کا دعویٰ باطل ٹھہرا۔

شیعہ کے نزدیک امام معصوم کا قول حجت ہے اور اجماع حجت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اثبات نص کے لیے امام معصوم کا قول ضروری ہو گا اور اس طرح نہ نص ثابت ہو گی اور نہ امام کی معصومیت۔ بخلاف ازیں اس کی صورت منطقی اعتبار سے یوں ہو گی۔

"میں امام معصوم ہوں اور میں خود ہی معصومیت کی دلیل ہوں"۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ امام کا معصوم اور منصوص علیہ ہونا واجب ہے"۔

آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بصراحت فرمائیں کہ فلاں شخص میرے بعد امام و خلیفہ ہو گا؟ یا یہ کہ اس کی امامت اس وقت تک درست نہ ہو گی جب تک اس کی بیعت خلافت نہ کی جائے؟۔ پہلی صورت میں نص کا ہونا ضروری نہیں۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ اہل سنت

کی طرح ایسی نص کا انکار کرتا ہے۔ ہم حضرت علی پر بہتان نہیں لگاتے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امام معصوم نہ ہونے کی صورت میں تنازع پیدا ہوگا"

حضرت ابوبکر کی افضلیت

ہم کہتے ہیں جن نصوص سے نظر واستدلال کی بنا پر حضرت ابوبکر کی افضلیت ثابت ہوتی ہے ان سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ کی افضلیت کے دلائل ہی اس ضمن میں کافی ہیں۔ جن انصار نے حضرت ابوبکر سے جھگڑا کیا تھا وہ حضرت ابوبکر کی افضلیت کے منکر نہ تھے بخلاف ازیں وہ آپ کی افضلیت کا اعتراف کرنے کے باوجود ان پر تفوق حاصل کرنا چاہتے تھے۔

شیعہ کے نزدیک نص کا وجود قطع نزاع کے لیے ضروری ہے مگر معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان یکے بعد دیگرے منصب خلافت پر فائز ہوئے مگر فساد و نزاع ختم نہ ہوا۔ فتنہ پردازی کا آغاز خلافت عثمانی کے آخری دور میں ہوا۔ جب بقول شیعہ امام منصوص و معصوم (حضرت علی) خلیفہ قرار پائے تو فتنہ بازی اوج کمال پر پہنچ گئی۔ گویا امام معصوم سے جو مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوا بلکہ مقصود کی نقیض حاصل ہوئی۔

ہم کہتے ہیں کہ کسی امام کے بارے میں وجود نص سے فساد کا ازالہ ہو جاتا ہے نص کے متعدد طرق ہیں۔

(۱) نص کا ایک طریق یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کی خلافت کے بارے میں پیشگوئی فرمائیں اور اس کی تعریف کریں۔ امت کو اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر یہ شخص مسند امارت پر فائز ہوا تو لوگوں کے حق میں مفید ثابت ہوگا بلاشبہ اس سے نزاع اٹھ جاتا ہے اگرچہ آپ یہ نہیں فرماتے کہ فلاں شخص کو امام مقرر کر لو۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کے بارے میں آپ نے ایسی پیشگوئی فرمائی تھی۔

(۲) نص کا دوسرا طریق یہ ہے کہ آنحضور ایسے امور کی پیشگوئی فرمائیں جو کسی شخص کی خلافت و امارت کی عمدگی کی دلیل ہوں جیسے آپ نے فارس و روم کے فتح ہونے کی بشارت دی تھی جو خلافت صدیقی و فاروقی میں پوری ہوئی۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آنحضور اپنے بعد میں آنے والے کو کسی شخص کے پاس جانے کا حکم دیں، یہ حکم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص خلیفہ ہوگا، حضرت ابوبکر کے بارے میں یہ واقعہ پیش آچکا ہے۔

(۴) چوتھا طریقہ یہ ہے کہ آپ خلافت کے بارے میں ایک عہد نامہ لکھنا چاہتے ہوں اور جب اس کی تکمیل نہ ہو سکے تو فرمائیں "اللہ تعالیٰ اور مومن ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کر سکتے"۔ جیسے آپ نے فرمایا تھا اسی طرح وقوع پذیر ہوا۔

(۵) پانچواں طریقہ یہ ہے کہ آنحضور اپنے بعد کسی شخص کی پیروی کا حکم صادر کریں اور وہ منصب خلافت پر فائز بھی ہو جائے۔

(۶) چھٹا طریقہ یہ ہے کہ آپ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم دیں اور ان کی مدت خلافت کی تعیین کر دیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت کے اندر اندر جو لوگ منصب امامت پر فائز ہوں گے وہ خلیفہ راشد اور ہدایت یافتہ ہوں گے۔

(۷) ساتواں طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو چند باتوں کے ساتھ مختص کر دیں جو اس بات کی مقتضی ہوں کہ یہ سب پر فائق ہے یہ صفت صرف ابوبکر میں موجود تھی۔

(۸) آٹھواں طریقہ یہ ہے کہ ترک نص رسول کے لیے موزوں تر ہے اس لیے کہ اگر نص معصوم کے حق ہو تو آنحضور کے بعد کوئی شخص معصوم نہیں اور اگر غیر معصوم کے حق میں ہو تو اس کی ہر بات کے واجب الاطاعت ہونے میں بعض اوقات نص سے احتجاج کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ رسول علیہ السلام کی وفات کے بعد اس بات کا امکان باقی نہیں رہتا کہ آپ سے مراجعت کر کے اس امام و خلیفہ کی بات کو مسترد کر دیا جائے، یا اسے معزول کیا جائے۔ البتہ جس شخص کو آنحضور اپنی زندگی میں تعینات کریں گے تو آپ اسے غلطی پر متنبہ کر سکیں گے اور اسے اس منصب سے معزول بھی کر سکیں گے اگر رسول اپنے بعد کسی کو بصراحت اس بات کے لیے مقرر فرمائیں کہ ہم اس سے دین اخذ کریں تو خدا کی حجت باطل ٹھہرے گی اور رسول کے سوا دوسرا کوئی شخص اس کا اہل بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ معصوم صرف رسول ہی ہوتا ہے دوسرا

کوئی شخص معصوم نہیں ہوتا۔

جزئیات کی تنصیص ممکن نہیں

(۹) نواں جواب یہ ہے کہ جزئیات کی تنصیص ممکن نہیں اور کلیات قبل ازیں منصوص ہیں۔ اگر رسول کسی مخصوص آدمی کو اس منصب پر مقرر کر دے اور کلیات کی تنصیص میں اس کی اطاعت کا حکم صادر کریں تو یہ باطل ہوگا۔ اور اگر جزئیات میں اس کی اطاعت کا حکم دے خواہ وہ جزئیات کلیات کے موافق ہوں یا مخالف تو یہ بھی باطل ہے اور اگر جزئیات میں اس کی اطاعت اس صورت میں ضروری ٹھہرائے جب وہ کلیات سے ہم آہنگ ہوں تو ہر والی ایسا حکم صادر کرتا ہے اس میں اس کی کیا خصوصیت ہے اور اگر رسول علیہ السلام تصریحاً کسی کو اس منصب پر مقرر کر دیں تو بھی بعض اوقات اس کی اطاعت امام سابق کی طرح نہیں کی جاتی کیونکہ دوسرے امام کی امامت کسی نص قطعی سے ثابت نہیں ہوتی۔

اگر سوال کیا جائے کہ ہر امام اپنے بعد والے امام کا ذکر تصریحاً کرتا ہے تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دوسرا امام معصوم ہو حالانکہ آنحضورؐ کے بعد کوئی شخص معصوم نہیں بنا بریں قول بالنص عصمتِ امام کے عقیدہ کی فرع ہے واضح ہو کہ یہ فاسد ترین قول ہے اسی طرح روافض جس نص کے دعویدار ہیں کہ حاکم و امیر کی ہر بات واجب الاطاعت ہوا کرتی ہے اور اسے کتاب و سنت کے معیار پر رکھ کر پرکھنے کی ضرورت نہیں یہ بھی فاسد ہے۔ اگر ہم ارشاد باری کے مطابق اپنے قول کو کتاب و سنت پر پرکھ کر دیکھیں تو نص کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ دین محفوظ ہے اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص رسول کے جملہ علوم سے آگاہ ہو یا اس کی طرف وحی آتی ہو۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ امام کا حافظ شرع ہونا ضروری ہے اس لیے کہ وحی ختم ہو چکی ہے اور کتاب و سنت میں جزئیات کی تفصیل نہیں ہے۔ لہٰذا ایک منصوص من اللہ امام کا وجود ناگزیر ہے جو معصوم بھی ہو تاکہ شرعی احکام میں عمداً یا سہواً کمی بیشی نہ کر دے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرا کوئی شخص ان صفات کا حامل نہ تھا۔"

حضرت علی شیخین سے بڑے عالم نہ تھے | ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ امام کا حافظ شریعت ہونا ضروری ہے

بخلاف ازیں امت کا حافظ شرع ہونا ضروری ہے۔ یہ مقصد جس طرح ایک سے حاصل ہوتا ہے اجتماعی طور پر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ اہل تواتر کا شریعت کو نقل کرنا ایک شخص کے نقل کرنے سے بہتر ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت علی سب سے بڑے حافظ شرع تھے بلکہ حضرت ابوبکر و عمر آپ سے بڑھ عالم دین تھے۔ لہٰذا شیعہ کا اجماع باطل ٹھہرا اور اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی معصوم تھے لہٰذا شرع کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی مسئلہ کا آپ سے منقول ہونا ضروری ہے اس سے یہ لازم آیا کہ اہل زمین پر حجت قائم کرنے کے لیے آپ سے نقل کا ہونا ضروری ہے اور نقل کی صحت اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک آپ کا معصوم ہونا ثابت نہ ہو جائے حضرت علی کے معصوم ہونے کا علم ہمیں اس بات سے حاصل ہوا کہ دوسرا کوئی شخص بالاجماع معصوم نہیں۔

اگر یہ معصومین کا اجماع ہو تو شریعت کی حفاظت اس سے ممکن ہے اور اگر وہ معصومین کا اجماع نہیں ہے تو ہمیں اس کا غلطی سے پاک ہونا بھی معلوم نہیں ہے۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا امام ہر فرد بشر تک شرعی احکام کو تواتر پہنچا سکتا ہے یا یہ کہ شرعی احکام ایک معصوم سے دوسرے معصوم تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر امام کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے تو رسول کے لیے بطریق اولیٰ ممکن ہے۔ اندریں صورت نقل امام کی حاجت نہ ہوگی اور اگر شیعہ کہیں کہ امام ایسا نہیں کر سکتا تو اس سے یہ لازم آیا کہ دین اسلام کا نقل کرنے والا اقارب رسول میں سے ایک شخص فرد واحد ہوتا ہے جس کے بارے میں منکر رسالت یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اقارب جو چاہتے ہیں رسول کے بارے میں کہتے ہیں اس سے یہ بھی لازم آیا کہ رسول خدا حکومت و سلطنت کے حریص تھے اور اب آپ کے بعد ان کے اقارب امور سلطنت کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ دین کے تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے معصومین کی ضرورت

ہے۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ صحابہ کرام ہی وہ معصوم ہوں جن سے دین کا مقصد پورا ہوا اور جنہوں نے دین کو کائنات ارضی کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا اور اس میں کیا برائی ہے کہ ہر گروہ کو دین کے تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اسی قدر عصمت حاصل ہو جس حد تک وہ اس کا حامل ہے۔ مثلاً قراء حفظ قرآن اور اس کی تبلیغ میں معصوم ہیں اسی طرح محدثین احادیث صحیحہ کے حفظ و ابلاغ اور فقہا فہم کلام اور استدلال اور احتجاج میں معصوم ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک معدوم امام سے بے نیاز کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں اگر شریعت کے حفظ و ابلاغ کا کام ایک معصوم ہی انجام دے سکتا ہے جو دوسرے معصوم سے اخذ کر رہا ہو تو یہ کیا بات ہے کہ چار سو ساٹھ سال کے طویل عرصہ میں کسی نے امام منتظر سے ایک مسئلہ بھی نہیں سیکھا؟ اب سوال یہ ہے کہ پھر شیعہ نے قرآن کریم اور دین کا علم کہاں سے حاصل کیا؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ جو قرآن وہ پڑھ رہے ہیں وہ اس قرآن سے الگ ہو جو نازل ہوا تھا؟۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کے حالات سے کیونکر آگاہی ہوئی۔ جبکہ بذات خود تم نے کسی معصوم سے اس ضمن میں کچھ نہیں سنا۔ اگر شیعہ کہیں کہ ہمارے نزدیک یہ تواتر کی حد تک معروف ہے تو ہم کہیں گے کہ جب تمہارے ائمہ کا تواتر تحفظِ شرع کا موجب ہے تو پوری امت کا تواتر اس کی نسبت اولیٰ و احریٰ ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے نہ کہ ایک شخص کی نقل کو دوسرے سے معتبر تسلیم کیا جائے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "نصوص تفاصیل احکام سے قاصر ہیں"۔

ہم کہتے ہیں ہر امیر کا طریق کار یہی ہوتا ہے۔ امیر جب عوام الناس سے مخاطب ہوتا ہے تو عوامی طرزِ تخاطب اختیار کرتا ہے اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ فاعل کے ہر فعل کو ہر وقت میں معیّن کر دے جہاں تک خطاب کلی کا تعلق ہے وہ خاصۂ رسول ہے اگر روافض کہیں کہ نصوصِ رسول قواعد کلیہ کی حیثیت نہیں رکھتے تو ہم کہیں گے کہ یہ غیر مسموع ہے ہم اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور اگر نصوص رسول میں یہ بات ممنوع ہے

تو خطاب امام میں شیعہ کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ اس کے الفاظ یا معانی میں عموم پایا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی ہوگی اسے کلام رسول سے ثابت کرنا ممکن ہوگا اور اس طرح امام کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ لوگوں پہ رسول ہی کی وجہ سے حجت تمام کی گئی ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں

دین اسلام کا تحفظ

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (سورۂ نحل۔ ۴۴)

تاکہ آپ لوگوں پر اس چیز کو واضح کر دیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

خداوند تعالےٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے بنا بریں کلام پاک تبدیل و تغییر سے مامون و مصئون ہے۔ پھر یہ بات ہر کس و ناکس کو معلوم ہے کہ اکثر مسلمانوں کو قرآن و حدیث کا علم حضرت علی کی وساطت کے بغیر حاصل ہوا۔ فاروق اعظم رضا نے جب بلاد و امصار کو فتح کیا تو وہاں ایسے معلم صحابہ بھیجے جنہوں نے لوگوں کو دینی و فقہی مسائل کی تعلیم دی۔ پھر ان لوگوں کی بدولت باقی مسلمانوں نے علم دین سیکھا۔ حضرت علی نے علم دین کو اسی حد تک پہنچایا جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود و معاذ بن جبل و ابی بن کعب اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے۔ ماشاء اللہ! روافض کی جہالت کے کیا کہنے؟

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نصب امام کی قدرت سے بہرہ ور ہے اور اس میں کچھ خرابی بھی نہیں۔ بلکہ ضرورت اس کی داعی ہے۔ جب حضرت علی کے سوا کسی اور میں یہ اوصاف موجود ہی نہیں تو صرف وہی خلیفہ برحق ہوں گے"۔

یہ محض تکرار ہے ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اجماع اگر معصوم ہے تو عصمت علی کی حاجت نہیں۔ اور اگر معصوم نہیں تو عصمتِ علی پہ اس کا دلالت کرنا باطل ہے اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ معصوم کے موجود ہونے کی صورت میں امت کی حالت اکمل ہوگی تو بلا شبہ معصوم نائبین کی موجودگی میں بھی ان کی حالت تمام و کمال سے بہرہ ور ہوگی۔

اور اگر وہ بذات خود معصوم ہوں تو یہ اور بھی بہتر ہے مگر اللہ تعالے پر یہ واجب نہیں ہے۔

شیعہ کا یہ دعوی کہ "جب معصوم نہ ہوگا تو لوگ جہنم میں جائیں گے اور دنیا میں زندہ نہ رہ سکیں گے یا یہ کہ سخت مصیبتیں آئیں گی"۔ ہم کہتے ہیں بفرض محال اگر یہ درست ہے تو تم نے یوں کیا کہا۔ کہ مصائب و آلام کا ازالہ ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں بیماریاں اور ہموم و غموم موجود ہیں اس کے علاوہ گرانی اور حوادث و آلام بھی پائے جاتے ہیں۔ امام مظلوم کے ظہور پذیر ہونے کی صورت میں اسے جو ضرر لاحق ہوتا وہ ان مصائب سے زیادہ نہ ہوتا اور اللہ تعالے نے اس کا ازالہ بھی نہیں کیا۔ اس پر مزید یہ کہ بشری حوائج و ضروریات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مثلاً انسان کو صحت و قوت مال و سرور اور لاتعداد امور کی ضرورت ہے۔

اگر شیعہ کے اصل فاسد کو پیش نظر رکھا جائے تو اللہ تعالے مومن و کافر کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ معصوم کو پیدا کرنے پر کس طرح قادر ہے؟ یہ بات پہلے گذر چکی ہے۔ اس سے شیعہ کا تناقض بھی کھل کر سامنے آیا۔ ایک طرف ان کا یہ دعوٰی ہے کہ معصوم کو پیدا کرنا اللہ تعالٰی پر واجب ہے۔ دوسری جانب ان کا قول ہے کہ اللہ تعالٰے اپنے اختیار سے کسی کو اس طرح معصوم نہیں بنا سکتا کہ اسے طاعات و عبادات کا اجر دیا جائے اور معاصی کی سزا دی جائے۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا معصوم تحصیل مصالح اور ازالہ مفاسد پر قادر ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا معصوم عاجز ہونے کی صورت میں بھی معصوم رہے گا؟ ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ بصورت عجز بھی وہ معصوم ہی رہے گا کیونکہ عاجز سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ قدرت کا ہونا اس میں شرط ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ تحصیل مصالح پر قادر ہے تو یہ بات اس سے ظاہر نہیں ہوئی لہذا یا وہ معصوم نہیں بلکہ عاصی ہوگا اور یا عاجز ہوگا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امام کا اپنی رعیت سے افضل ہونا ضروری ہے یہ ایک بدیہی بات ہے کہ حضرت علی فاضل دوران ویکتائے زبان تھے۔ لہٰذا وہی امام ہوں گے اس لیے کہ فاضل کی موجودگی میں مفضول کا تقدم عقلاً وشرعاً قبیح ہے"

حضرت علی افضل اہل زبان نہ تھے

ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی افضل اہل زبان نہ تھے۔ آپ نے کوفہ کے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا تھا۔

"اس امت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر اور پھر عمر ہیں"۔ مزید اں اکثر علماء کے نزدیک افضل کو حاکم بنانا ضروری نہیں۔ بعض کے نزدیک مفضول کو والی بنانا جائز ہے جب کہ اس میں کوئی مصلحت پائی جاتی ہو۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ یہی نظریہ رکھتا ہے۔

شیعہ مصنف امامت علی پر قرآنی دلائل پیش کرتا ہوا لکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"تمہارا ولی اللہ تعالےٰ اس کا رسول اور وہ مومن ہیں جو نماز کی پابندی کرتے زکوٰۃ ادا کرتے اور رکوع کرنے والے ہیں"۔ (سورہ مائدہ۔ ۵۵)

علماء کا اجماع اس بات پر منعقد ہو چکا ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ ثعلبی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضور سے اپنے ان دو کانوں کے ساتھ سنا اور اگر نہ سنا ہو تو یہ بہرے ہو جائیں۔ فرماتے تھے علی نیکیوں کے قائد اور کفار کے قاتل ہیں جو ان کی مدد کرے گا ان کی مدد کی جائے گی اور جو ان کو رسوا کرے گا اسے رسوا کیا جائے گا میں نے ایک دن آنحضور کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔ اتنے میں ایک سائل نے آکر سوال کیا مگر کسی نے اسے کچھ بھی نہ دیا اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے تیرے نبی کی مسجد میں سوال کیا اور مجھے کچھ بھی نہیں دیا گیا"۔ حضرت علی رکوع کی حالت میں تھے آپ نے حالت رکوع میں اپنی چھوٹی انگلی کی جانب اشارہ کیا۔ سائل نے آگے بڑھ کر آپ کی انگوٹھی اتار لی۔

آنحضور یہ ماجرا دیکھ رہے تھے جب فارغ ہوئے تو آسمان کی جانب سر اٹھا کر کہا۔

"اے اللہ موسیٰ علیہ السلام نے تجھ سے سوال کیا تھا وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ اے اللہ میں تیرا نبی و برگزیدہ ہوں اس لیے میرا سینہ کھول دے۔ میرا کام آسان کر دے اور میرے گھر کے ایک آدمی کو میرا وزیر بنا دے"۔

آپ اپنی گفتگو ختم نہ کر پائے تھے کہ جبرئیل مذکورہ بالا آیت لے کر حاضر ہوئے۔ فقیہ ابن المغازی حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت میں جو ولی کا لفظ مذکور ہے اس سے متصرف مراد ہے۔ گویا اللہ تعالےٰ نے جس طرح اپنے اور رسول علیہ السلام کے لیے ولایت فی الامۃ کا اثبات کیا ہے اسی طرح حضرت علی کے لیے بھی کیا" (شیعہ کا بیان ختم ہوا)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل نہیں ہوئی اور اس ضمن میں اجماع کا دعویٰ سراسر بے بنیاد اور کذب صریح ہے بلکہ اجماع اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر حضرت علی کے بارے میں نازل نہیں ہوئی شیعہ کی بیان کردہ روایت صاف جھوٹ ہے۔ ثعلبی کی تفسیر موضوعات کا طومار ہے ثعلبی اور اس کا تلمیذ واحدی دونوں "حاطب لیل" (رات کا لکڑہارا جو خشک و تر میں تمیز کیے بغیر ہر قسم کی لکڑیاں جمع کرتا ہے) تھے۔ علاوہ ازیں شیعہ مصنف کے ذکر کردہ دلائل سب باطل ہیں اور وہی شخص ان کو تسلیم کر سکتا ہے جو گونگا بہرہ صاحب ہویٰ و ضلالت ہو اور اللہ تعالےٰ نے اس کے دل کو قبول حق سے اندھا کر دیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر زنادقہ اسلام میں تشیع کے دروازہ سے داخل ہوئے اور ان اکاذیب کے بل بوتے پر اسلام کو مطعون کرنا شروع کیا۔ جہلاء ان مکذوبات کی بنا پر شبہات کا شکار ہو گئے۔ فرقہ ہائے اسمعیلیہ و نصیریہ بھی اسی وجہ سے گمراہ ہوئے انہوں نے تفسیر اور مناقب و مثالب سے متعلق شیعہ کی روایت کردہ اکاذیب پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے آل محمد پر اظہار رحم و کرم کا آغاز کیا پھر صحابہ پر تنقید

جرح اور گالی گلوچ کا بیڑا اٹھایا۔ بعد ازاں حضرت علی کو ہدف ملامت بنایا۔ کیونکہ آپ یہ سب باتیں سن کر خاموش رہے تھے پھر رسول علیہ السلام کو تنقید کا نشانہ بنایا اور بعد ازاں خدا کی تردید و تکذیب پر اتر آئے۔ جیسا کہ صاحب البلاغ الاکبر نے اس ترتیب پر روشنی ڈالی ہے۔

شیعہ مصنف نے اپنی تائید میں ثعلبی کا حوالہ دیا ہے ہم کہتے ہیں کہ ثعلبی نے حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "یہ آیت ابوبکر کی شان میں نازل ہوئی" نیز ثعلبی نے عبد الملک سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابو جعفر باقر سے اس آیت کی تفسیر پوچھی۔ تو انہوں نے فرمایا۔ "اس سے سب مومن مراد ہیں" میں نے عرض کیا بعض لوگ اس سے حضرت علی مراد لیتے ہیں یہ سن کر امام باقر نے فرمایا "اہل ایمان میں علی بھی شامل ہیں"۔ ضحاک سے بھی یہی مروی ہے۔

علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔

"سب مومن و مسلم اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں"۔

ہم شیعہ کے ادعاء اجماع کو معاف کرتے اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے دعویٰ کے اثبات میں ایک سند صحیح ہی پیش کریں۔ ثعلبی سے ذکر کردہ روایت ضعیف ہے اور اس کے راوی متہم بالکذب ہیں۔ باقی رہا فقیہ ابن المغازلی واسطی تو اس کی کتاب اکاذیب کا پلندہ ہے۔ اس حقیقت سے ہر وہ شخص آشنا ہے جو علم حدیث سے معمولی سی واقفیت بھی رکھتا ہے۔

اگر آیت کا مطلب یہ قرار دیا جائے کہ حالت رکوع میں بھی زکوۃ ادا کی جا سکتی ہے تو یہ موالات کی شرط ٹھہرے گی اور حضرت علی کے سوا کوئی مسلمان ولی نہیں بن سکے گا۔ بنا بریں حسن و حسین بھی امام نہیں ہوں گے علاوہ ازیں اس آیت میں یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ جمع کا صیغہ ہے۔ لہٰذا فرد واحد اس کا مصداق نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں تعریف کسی اچھے کام پر کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز میں یہ کام کرنا فعل محمود نہیں ہے اگر یہ اچھا کام ہوتا

تو آنحضور بھی ایسا کرتے اور اس کی ترغیب دیتے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار یہ فعل سرانجام دیتے۔

ظاہر ہے کہ نماز میں ایک طرح کا انہماک ہوتا ہے لہٰذا یہ فعل نماز کے منافی ہے پھر یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ ولی وہی شخص ہو گا جو حالت رکوع میں سجدہ کرے۔ علاوہ ازیں وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ" کے الفاظ وجود زکوٰۃ پر دلالت کرتے ہیں حالانکہ عہد رسالت میں حضرت علی تنگدست تھے اور زکوٰۃ ان پر فرض نہ تھی۔ چاندی کی زکوٰۃ اس شخص پر فرض ہوتی ہے جو نصاب کا مالک ہو اور اس پر ایک سال گذر جائے مگر حضرت علی صاحب نصاب نہ تھے۔

مزید براں اکثر علماء کے نزدیک زکوٰۃ میں انگوٹھی کا دینا کافی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیعہ مصنف کی ذکر کردہ آیت مندرجہ ذیل آیات کی مانند ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

(۱) وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ (البقرہ-۴۳)

(۲) اُقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرَّاکِعِیْنَ۔ (سورہ آل عمران-۴۳)

متنازعہ آیت کی صحیح تفسیر

مفسرین کے یہاں یہ بات عام طور سے معروف ہے کہ زیر نظر آیت موالاتِ کفار سے رک کر اور اہل اسلام کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاق کلام بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

"اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔ تم میں سے جو شخص ان سے دوستی لگائے گا وہ انہی میں سے ہو گا بے شک اللہ تعالےٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا (المائدہ-۵۱-۵۲)

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا۔

"جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بھاگ بھاگ کر ان (یہود و

نصاریٰ) کی طرف جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں (ان کے ساتھ دوستی نہ لگانے کی صورت میں) کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب ہی کسی فتح یا کسی اور بات کی بشارت سنائے گا جس سے وہ ان باتوں پر نادم ہوں گے جو انہوں نے اپنے جی میں پوشیدہ رکھی تھیں"۔

اس کے بعد فرمایا۔" اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ " اس سے معلوم ہوا کہ یہ مومنین کا عام وصف ہے۔ مگر حضرت ابوبکر و علی اور سابقین اولین صحابہ ان میں بالاولیٰ داخل ہیں۔ جو شخص حدیث نبوی میں غور و فکر کرے گا اس پر شیعہ مصنف کی دروغگوئی واضح ہوگی اور اگر شیعہ کی ذکر کردہ تفسیر صحیح ہوتی تو جن لوگوں نے حضرت علی کا ساتھ چھوڑا تھا اور ان کی مدد کا حق ادا نہیں کیا تھا وہ ذلیل و خوار ہو جاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ مظفر و منصور ہوئے اور انہوں نے بلاد فارس و روم اور قبط کو فتح کیا۔ شیعہ کا دعویٰ ہے کہ شہادت عثمان تک سب امت نے حضرت علی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امت مسلمہ حضرت عثمان کی شہادت تک ہر میدان میں کامیاب و کامران رہی ایسا غلبہ بعد میں کبھی حاصل نہیں ہوا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد امت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک گروہ حضرت علی کا معاون تھا اور دوسرا مخالف۔ تیسرا گروہ غیر جانبدار تھا۔

بقول شیعہ اہل اسلام حضرت علی سے بغض رکھتے ہیں

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ لوگوں کا آں حضور پر ایمان اور آپ کی اطاعت شعاری حضرت علی کی وجہ سے نہ تھی۔ بخلاف ازیں بنی اسرائیل ہارون علیہ السلام کو بے حد چاہتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے خائف و ہراساں رہتے تھے ہارون حضرت موسیٰ سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھتے تھے۔ روافض کا دعویٰ ہے کہ اہل اسلام حضرت علی سے بغض رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت علی کی بیعت نہ کی اور ان کے بارے میں جو نص تھی اس کو پوشیدہ رکھا۔ پھر یہ کہنا کیونکر درست ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ و سلم حضرت علی کے اسی طرح محتاج تھے جس طرح موسیٰ ہارون کے؟ حضرت ابوبکر کو لیجئے ان کے

دستِ حق پرست پر پانچ ایسے صحابہ نے بیعت کی تھی جو عشرہ مبشرہ میں شمار کیے جاتے ہیں وہ یہ صحابہ تھے۔

عثمانؓ۔ طلحہؓ۔ سعدؓ۔ عبد الرحمنؓ بن عوف۔ ابو عبیدہؓ رضی اللہ عنہم

مگر ہمیں نہیں معلوم کہ سابقین اولین صحابہ میں سے کسی نے بھی حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کی ہو۔ حضرت مصعب بن عمیر سابقین صحابہ میں شامل ہیں ان کے ہاتھ پر حضرت اُسید بن حضیر اور سعد بن معاذ نے بیعت کی تھی۔

اللہ تعالے موالات کے بارے میں فرماتے ہیں۔

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَ جِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۃ التحریم۔۴)

اس آیت میں اللہ تعالے نے فرمایا کہ جو بھی صالح مومن ہو اللہ تعالے رسول علیہ السلام اور جبریل امین سب اس کے مولیٰ ہیں اور وہ ان کا مولیٰ ہے۔ مولا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آنحضور کا متولی و متصرف ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (سورہ توبہ۔ ۷۱)

مومن مرد اور عورتیں باہم ایک دوسرے کے مولیٰ ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر مومن و متقی خدا کا ولی ہے اور خدا اس کا ولی (دوست) ہے

اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (سورہ بقرہ۔ ۲۵۷) (اللہ تعالے اہل ایمان کا دوست ہے)

نیز فرمایا۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ (سورہ یونس۔ ۶۲) (خدا کے دوستوں پر کوئی خوف نہیں ہے)

مذکورہ صدر آیات میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں کہ جو کسی کا ولی ہوگا وہ اس کا متولی بھی ہوگا وِلایت اور وَلایت کا فرق علماء میں عام طور پر معروف ہے۔ چنانچہ امیر کو والی کہتے ہیں اور ولی نہیں کہتے۔ فقہاء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ جب والی اور ولی دونوں جنازہ میں موجود ہوں تو جنازہ کون پڑھائے اس سے معلوم ہوا کہ موالات معادات کی ضد ہے۔

امامت علی کے اثبات میں دوسری دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔
"امامت علی (بلا فصل) کی دوسری دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ (المائدہ۔ ۶۷)

(اے رسول جو کچھ آپ کی طرف اتارا گیا ہے وہ پہنچا دیجئے)

بالاتفاق یہ آیت کریمہ حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابو نعیم سنداً بیان کرتے ہیں کہ "یہ آیت حضرت علی کے بارے میں اتری" تفسیر ثعلبی میں ہے۔

"یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئے" اس کے نزول کے بعد آنحضور نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ"

ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر کے اجماعاً مولیٰ تھے بنابریں حضرت علی ان کے بھی مولیٰ ہوں گے۔ لہٰذا وہی امام برحق ہوں گے۔

تفسیر ثعلبی میں ہے۔

"سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کے روز صحابہ کو پکارا جب سب جمع ہوگئے تو آپ نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ"

چنانچہ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح مشہور ہوگئی جب حارث بن نعمان فہری نے آپ کا یہ ارشاد مبارک سنا تو مدینہ پہنچا۔ اپنا اونٹ وادی میں بٹھایا اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ آپ چند صحابہ سمیت تشریف فرما تھے۔ اس نے کہا۔

"اے محمد آپ نے ہمیں دو شہادتوں۔ نماز۔ روزہ۔ حج و زکوٰۃ کا حکم دیا تھا وہ ہم نے قبول کر لیا اب آپ نے اپنے چچازاد بھائی علی کا سر اونچا کر دیا اور اس کو ہم پر فوقیت بخشی ہے۔ کیا آپ خدا کے حکم سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا "خدا کی قسم یہ خدا کا حکم ہے" چنانچہ حارث

یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ

"اگر یہ بات منجانب اللہ ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا ہمیں دردناک عذاب میں مبتلا کر"۔

ابھی وہ منزل مقصود پر نہیں پہنچا تھا کہ ایک پتھر اس کے سر پر گرا اور ڈبر سے نکل گیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ تب یہ آیت اتری۔ "سَاَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ"۔ نقاش نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت بیان کی ہے۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

ہم کہتے ہیں یہ دلیل پہلی دلیل سے بھی زیادہ جھوٹی ہے۔ رافضی کا یہ قول کہ "یہ آیت بالاتفاق حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی"۔ صریح کذب ہے بلکہ یہ بات کسی عالم نے بھی نہیں کہی۔ باقی رہیں ابو نعیم و ثعلبی اور نقاش کی تصانیف تو ان میں لاتعداد جھوٹی روایات موجود ہیں۔ احادیث و روایات کے بارے میں ان علماء پر اعتماد کیا جائے گا جو حدیث رسول اللہ کے امین ہیں۔ جس طرح نحوی مسائل میں علمائے نحو کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور قراءت، لغت اور طب کے مسائل میں ان علماء کی طرف رخ کیا جاتا ہے جو ان علوم میں ماہرانہ بصیرت رکھتے ہیں اس لیے کہ "لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ"۔

محدثین کرام سب لوگوں کی نسبت حق و صداقت کے زیادہ طلبگار تھے جیسا کہ علم حدیث سے واقفیت رکھنے والے حضرات کلیۃً اس سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ جس روایت کو وہ بالاتفاق ضعیف یا لغو قرار دیں وہ ساقط عن الاحتجاج ہو گی اور جس کی صحت پر متفق ہوں وہ صحیح ہو گی اور جس میں وہ مختلف الخیال ہوں اس میں عدل و انصاف کے تقاضا کے مطابق غور و فکر کیا جائے گا۔ محدثین کرام علم حدیث کا معیار و مدار ہیں۔ شہرۂ آفاق محدثین حضرات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

محدثین کرام اور ان کی خدمات جلیلہ

امام مالک[1]، شعبہ[2]، اوزاعی[3]، لیث[4]، سفیان بن عیینہ[5]، سفیان ثوری[6]، ذوالنون[7]، حماد[8]۔ ابن مبارک[9]۔ یحییٰ قطان[10]۔ عبدالرحمٰن بن مہدی[11]۔ وکیع[12]۔ ابن علیہ[13]۔ شافعی[14]۔ عبدالرزاق[15]

فریابی۔ ابو نعیم۔ قعنبی۔ حمیدی۔ ابو عبید۔ ابن المدینی۔ احمد۔ اسحاق۔ ابن معین۔ ابوبکر بن شیبہ ذھلی۔ بخاری۔ ابوزرعہ۔ ابوحاتم۔ ابو داؤد۔ مسلم۔ موسیٰ بن ہارون۔ صالح جزرہ۔ نسائی ابن خزیمہ۔ ابواحمد بن عدی۔ ابن حبان۔ دار قطنی اور دیگر محدثین و ماہرین علم الرجال و جرح و تعدیل۔

معرفت رجال کے موضوع پر متعدد کتب تصنیف کی گئی ہیں۔ چند ایک کتب کے نام حسب ذیل ہیں۔

طبقات ابن سعد۔ تاریخ صغیر بخاری۔ تاریخ کبیر بخاری۔ کلام ابن معین۔ کلام احمد بروایت تلامذہ۔ کتاب یحییٰ بن سعید القطان۔ کتاب علی بن مدینی۔ تاریخ یعقوب الفسوی ابن ابی خیثمہ۔ ابن ابی حاتم۔ عقیلی۔ ابن عدی۔ ابن حبان۔ دار قطنی۔ مسند طبرانی۔ مسند احمد مسند اسحاق۔ مسند ابو داؤد۔ مسند ابن ابی شیبہ۔ مسند العدنی۔ مسند ابن منیع۔ مسند ابو یعلی مسند بزار۔

مندرجہ ذیل کتب حدیث فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی ہیں۔
مؤطا۔ سنن سعید بن منصور۔ صحیح بخاری۔ صحیح مسلم۔ سنن ترمذی۔ سنن نسائی۔ سنن ابی داؤد۔ سنن ابن ماجہ اور دیگر لاتعداد کتب حدیث جن کا ذکر طوالت کا موجب ہے۔

خلاصۂ کلام! فرقہ ہائے اسلامیہ میں روافض سے بڑھ کر کوئی فرقہ نہ احادیث و آثار سے اس قدر نابلد ہے نہ باطل کو اتنی تیزی سے قبول کرنے والا ہے اور نہ احادیث صحیحہ کو اس حد تک ٹھکراتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خوارج و معتزلہ جو روافض کا توڑ ہیں صدق کے طلبگار رہتے ہیں اور جھوٹی روایات سے احتجاج نہیں کرتے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ صحیح روایات سے بھی استناد نہیں کرتے۔ انہوں نے از خود کچھ قواعد گھڑ رکھے ہیں اور وہ انہی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ روافض کا یہ عالم ہے کہ عقل و نقل دونوں سے تہی دامن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث و آثار اور اسانید کی پہچان اہل سنت والجماعت کا خاصہ بن کر رہ گیا ہے۔ روافض کے نزدیک کسی حدیث کی صحت کی علامت یہ ہے کہ وہ اس کے افکار و معتقدات سے ہم آہنگ ہو امام عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں۔

"اہل علم موافق و مخالف سب احادیث لکھتے ہیں مگر مبتدعین وہی روایات لکھتے ہیں جن سے ان کے نظریات کی تائید ہوتی ہو"۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ آیا تم نقاش و ثعلبی و ابو نعیم کی مرویات ہر حال میں قبول کرتے ہو، مخالف یا موافق ہوں یا مطلقاً ان کو ٹھکرا دیتے ہو؟ یا موافق روایات کو قبول کرتے اور مخالف کی تکذیب کرتے ہو؟ اگر ہر حال میں ان کی روایات تمہارے نزدیک قابل قبول ہیں تو ان میں فضائل شیخین کی صحیح و ضعیف روایات بھی موجود ہیں اور اگر موافق و مخالف کسی قسم کی روایات بھی تمہارے نزدیک قابل احتجاج نہیں ہیں تو تمہارا دعوی ان منقولات کے بارے میں باطل ٹھہرا۔ اور اگر موافق روایات کو قبول کرتے ہو تو تمہارے مخالف کو یہ حق حاصل ہے کہ تمہاری مقبول روایات کو مسترد کر دے اور تمہاری رد کردہ روایات سے استناد کرے۔ لوگوں میں یہ بات عام طور سے رائج ہے کہ وہ مناقب و مثالب کے بارے میں ہر قسم کی روایات کو قبول کر لیتے ہیں۔

بے بنیاد روایات

ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت باتفاق محدثین جھوٹی ہے اور حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں مندرج نہیں۔ اس حدیث کی صحت کا دعوی وہی شخص کرتا ہے جو اس حد تک جھوٹا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کا پیرو خیال کرتا ہے اور اس بات کا دعوی دار ہے کہ امام ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ آنحضورؐ سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ یا جس طرح ترکوں کا ایک گروہ کہتا ہے۔ کہ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں اور وہ ان لڑائیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت حمزہؓ نے بدر میں شرکت کی تھی اور غزوہ احد میں شہادت سے مشرف ہوئے۔ یا جس طرح بہت سے عوام یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت ام سلمہ دمشق میں مدفون ہیں۔ یا عوام کا یہ نظریہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جامع دمشق کے باب القبہ میں احادیث روایت کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح یہ افواہ بھی بے بنیاد ہے کہ حضرت علی نجف میں مدفون ہیں حالانکہ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ حضرت علی و معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو قصر الامارت میں دفن کیا گیا تھا کیونکہ

اس بات کا خطرہ دامنگیر تھا کہ خوارج ان کی قبریں نہ کھود ڈالیں[۵]

[۱] کوفہ کا قصر الامارت جس میں حضرت علی مدفون ہیں جامع کوفہ سے جانب قبلہ واقع ہے۔ مشہور شیعہ مورخ لوط بن یحییٰ کہتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جامع کوفہ کے ایک کونہ اور قصر الامارت کے صحن میں ابواب کندہ کے قریب دفن کیے گئے تھے۔ شیعہ نے تیسری صدی ہجری میں حضرت علی اور حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہم کے ایک مدت بعد یہ دعوی کیا کہ آپ نجف میں مدفون ہیں حقیقت شناس لوگوں کا قول ہے کہ نجف میں جو قبر حضرت علی کی جانب منسوب ہے دراصل وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔

دمشق کا قصر الامارت جہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مدفون ہیں اس کو الخضراء کہتے ہیں یہ مسجد دمشق کی اس دیوار سے متصل ہے جو جانب قبلہ واقع ہے اس کی مشرقی جانب جیرون نامی حوض ہے۔ مغرب میں باب البرید اور جنوب میں قصر اسعد پاشا واقع ہے

دمشق کے معمر لوگ اپنے آباؤ اجداد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس دیوار کے نیچے مدفون ہیں جو جامع دمشق اور الدار الخضراء کے درمیان واقع ہے دولت عباسیہ کے عہد اقبال میں متقدمین نے جامع دمشق کی قبلہ والی دیوار پر حضرت معاویہ کی قبر کے نزدیک ایک کتبہ لگا دیا تھا جس پر لکھا تھا

"یہ خدا کے نبی ہود علیہ السلام کی قبر ہے"۔

اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حاسد لوگ آپ کی قبر نہ کھود ڈالیں۔

الدار الخضراء میں ایک اور قبر بھی تھی جو آجکل "البزوریہ" نامی بازار میں واقع ہے غالباً یہ معاویہ بن یزید بن معاویہ کی قبر ہے

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عید الفطر ۴۳ھ میں وفات پائی آپ کے بیٹے عبد اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی مجھے تادم تحریر اس بات کی کوئی دلیل معلوم نہ ہو سکی کہ آپ دار الامارۃ میں مدفون ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ آپ وادی المعظم میں گھاٹی کے دروازہ کے نزدیک مدفون ہیں صحابہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ آدمی اعمال سے زندہ جاوید ہوتا ہے پکی قبر سے نہیں یہی وجہ ہے کہ فراعنہ وجبابرہ کی طرح وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ صلحاء اور نامور فاتحین صحابہ کی قبروں پر مقبرے بنائے جائیں اور ان پر عالیشان عمارتیں تعمیر کی جائیں ۱۲

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ "غدیر خم" پر آنحضور نے جو الفاظ کہے وہ حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت کہے تھے اس کی دلیل شیعہ کا یہ عمل ہے کہ وہ بارہ ذی الحجہ کو عید مناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آنحضور حجۃ الوداع کے بعد پھر کبھی مکہ تشریف نہ لائے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں اس حدیث کے اندر ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ من گھڑت حدیث ہے۔ مثلاً یہ الفاظ "کہ آپ مکے میں تشریف فرما تھے کہ حارث آپ کے پاس آیا"۔ نیز یہ بات کہ پھر "سَاَلَ سَائِلٌ" والی آیت نازل ہوئی۔ حالانکہ یہ آیت ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں یہ آیت "اِنْ کَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ" بالاتفاق غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی تھی۔ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ مثلاً ابوجہل کے اقوال کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ان پر پتھر نہیں برسائے گئے تھے اگر یہ واقعہ درست ہوتا کہ پتھر حارث کے سر پر گرا اور دبر کے راستہ نکل گیا تو اصحاب الفیل کے واقعہ کی طرح یہ عظیم معجزہ تھا اور ہر کس و ناکس اس کو جانتے ہوتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامت علی کی تیسری دلیل یہ آیت ہے۔ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ"۔

ابونعیم ابوسعید سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غدیر خم پر بلایا! ہمیں کانٹے اور جھاڑیاں ہٹانے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر حضرت علی کے دونوں بازو تھام لیے اور انھیں بلند کیا یہاں تک کہ لوگوں کو آنحضور کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ ابھی لوگ جدا نہیں ہو پائے تھے کہ یہ آیت اتری اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس نے دین کو تکمیل بخشی اور میری رسالت اور علی کی ولایت پر رضامندی کا اظہار کیا پھر آپ نے فرمایا۔ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ اے اللہ جو علی سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ۔ جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اس کی نصرت و تائید سے ہاتھ کھینچ لے تو بھی اس کی مدد نہ کر۔"

ہم کہتے ہیں موضوعات کے علماء کے نزدیک یہ حدیث بالاتفاق جھوٹی ہے۔
احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ آیت غدیرخم کے واقعہ سے سات روز پہلے اس وقت نازل ہوئی جب آنحضور عرفات میں قیام پذیر تھے۔ اس میں حضرت علی کی امامت کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ نظر بریں شیعہ کا یہ دعویٰ کہ قرآنی دلائل سے امامت علی کا ثبوت ملتا ہے صاف جھوٹ ہے۔ البتہ صحیح احادیث سے انھیں اس بات کا ثبوت پیش کرنا چاہئے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی سے امامتِ علی پر استدلال

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔
"امامت علی کی چوتھی دلیل یہ آیت ہے وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی"۔
فقیہ ابن مغازلی شافعی حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ میں بنی ہاشم کی ایک جماعت کے ساتھ بارگاہ نبوی میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹا۔ آنحضور نے فرمایا جس کے گھر میں یہ ستارہ ٹوٹا وہ میرے بعد میرا وصی ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ستارہ حضرت علی کے گھر پہ ٹوٹا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ آپ حضرت علی کی محبت میں سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں، تب یہ آیت اتری۔ "وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی"۔

ہم کہتے ہیں یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے اور بلا علم و معرفت خدا کے بارے میں کوئی بات کہنا حرام ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔
وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء۔ ۳۶)
جس بات کا تجھے علم نہیں وہ بیان نہ کر۔
جو شخص حدیث نبوی سے استدلال کرنا چاہے اس پر لازم ہے کہ احتجاج کرنے سے قبل اس کی صحت معلوم کرلے اور جب اس سے کسی دوسرے کے خلاف احتجاج کرے تو ساتھ ہی اس کی صحت بھی بیان کردے۔ جب یہ بات معلوم ہے کہ کتابوں میں جھوٹی روایات بھی پائی جاتی ہیں تو ان کے مندرجات پہ اعتماد کرنا اسی طرح ہے جیسے فاسق کی شہادت

سے استدلال کرنا جو سچ بھی بولتا ہو اور جھوٹ بھی۔

علاوہ ازیں محدث ابن الجوزی نے اس حدیث کو بالفاظ دیگر موضوعات میں شمار کیا ہے۔ ابن الجوزی نے یہ حدیث بروایت محمد بن مروان ذکر کی ہے اس نے کلبی سے اس نے ابو صالح سے اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ جب آنحضور کو ساتویں آسمان کی سیر کرائی گئی اور اللہ تعالے نے آپ کو بہت سے عجائبات دکھلائے تو علی الصبح آپ نے وہ واقعات بیان کر دیئے۔ اہل مکہ نے آپ کی تکذیب کی اسی دوران آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا۔ آنحضور نے فرمایا جس کے گھر میں یہ ستارا گرے گا وہ میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا چنانچہ وہ ستارا حضرت علی کے گھر میں گرا اہل مکہ کہنے لگے محمد گمراہ ہو گئے اپنے اہل بیت کی محبت میں گمراہ ہو گئے اور اپنے چچازاد بھائی کی طرف جھک گئے۔ تب یہ آیت اتری۔ "وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى"۔

محدث ابن الجوزی فرماتے ہیں یہ حدیث موضوع ہے اس کا واضع کتنا برا آدمی ہے اور اس نے کس قدر بعید از عقل بات بیان کی ہے۔ اس کی سند میں اندھیرا ہی اندھیرا کذاب راوی ہے۔ مثلاً ابو صالح نیز کلبی اور محمد بن مروان سدّی۔ کلبی متہم بالکذب ہے۔ ابو حاتم بن حبّان لکھتے ہیں۔

"کلبی ان لوگوں میں سے تھا جو کہتے ہیں کہ حضرت علی فوت نہیں ہوئے اور وہ لوٹ کر دنیا میں آئیں گے۔ جب بادل کو دیکھتا تو کہتا اس میں حضرت علی ہیں۔ اس کی روایت سے احتجاج کرنا حلال نہیں ہے۔ حیرانی کی بات ہے اس حدیث کو وضع کرنے والے نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ عقل کے منافی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ستارہ کسی جگہ گرے اور وہ اتنی دیر وہاں موجود رہے کہ دوسرا شخص اسے دیکھ سکے اس کی حماقت کا اندازہ لگائیے کہ اس نے اس روایت کو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ ابن عباس کی عمر اس وقت دو سال تھی۔ پھر ابن عباس اس واقعہ کے شاہد کیسے ہو سکتے تھے"؟

محدث ذہبی فرماتے ہیں۔ "میں کہتا ہوں چونکہ یہ روایت کلبی کی معروف تفسیر میں نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث اس کے بعد وضع کی گئی ہے۔ اقرب الی الصحت

یہی بات ہے"۔

ابوالفرج ابن الجوزی فرماتے ہیں۔

"بعض لوگوں نے اس حدیث کے الفاظ چرا لیے اس کی اسناد تبدیل کر دی اور ایک غریب سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے"۔

مزید براں ستارہ ٹوٹنے کا واقعہ صحیح نہیں۔ مکہ و مدینہ بلکہ کسی جگہ بھی یہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اس وقت بکثرت انگارے آسمان سے پھینکے جایا کرتے تھے بایں ہمہ ایسی من گھڑت روایت بیان کرنا بڑے ڈھیٹ اور بے حیا آدمی کا کام ہے۔ علاوہ ازیں اگر یہ واقعہ پیش آچکا تھا تو غدیر خم کے موقع پر وصیت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"پانچویں دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے

"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ"

امام احمد نے اپنی مسند میں واثلہ بن اسقع سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت علی کو ان کے گھر میں تلاش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ وہ آنحضور کی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی دونوں آئے۔ حضرت فاطمہ بھی وہاں پہنچ گئیں آپ نے علی کو بائیں جانب اور فاطمہ کو دائیں طرف اور حسن و حسین کو اپنے سامنے بٹھایا پھر ان پر اپنی چادر تان لی اور فرمایا "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ"۔ اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ام سلمہؓ کا قول ہے کہ آنحضور اس وقت میرے گھر میں تشریف فرما تھے اس روایت کے آخر میں ہے اِنَّکِ عَلٰی خَیْرٍ۔

مذکورہ صدر آیت میں اِنَّمَا کا لفظ بتاکید اہل بیت کی عصمت پر دلالت کرتا ہے مزید براں خبر پر "لام" داخل کیا گیا ہے اس سے بھی تاکید کا مفہوم نکل رہا ہے اس آیت سے مستفاد ہوا کہ اہل بیت کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں۔ لہٰذا امام صرف حضرت علی ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے متعدد اقوال میں اس کا دعویٰ کیا ہے جیسے آپ کا یہ قول۔

"ابن ابی قحافہ نے یہ لباس اوڑھا (منصب خلافت پر فائز ہوئے) حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک چکی میں درمیانی سیخ کو حاصل ہوتا ہے"۔ علاوہ ازیں آپ سے نجاست کی نفی بھی کر دی گئی ہے لہٰذا حضرت علی ہی خلیفۂ صادق ہوں گے۔

آیتِ تطہیر سے شیعہ کا استدلال

ہم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے امام مسلم نے یہ روایت حضرت عائشہ سے نقل کی ہے اور سنن میں حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے مگر اس میں عصمت و امامت کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ سورہ احزاب کی آیت ۳۳ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ سورۃ المائدہ کی آیت ۶۔ مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ کی مانند ہے۔ مندرجہ ذیل آیات بھی اسی قبیل سے ہیں۔

(۱) یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ (سورۃ البقرہ۔ ۱۸۵)

(۲) یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ (النساء۔ ۲۶)

(۳) وَاللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ (النساء۔ ۲۷)

ان آیات میں ارادہ سے مراد محبت و رضا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس نے یہ بات مقدر کر دی ہے یا اسے ایجاد کر دیا ہے۔

اس آیت کے نزول کے بعد آنحضور نے فرمایا: "اے اللہ یہ میرے گھر والے ہیں تو ان سے نجاست کو دور کر دے"۔

آنحضور نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں یہ التجا کی ہے۔ اگر آیت کا مطلب ہوتا کہ اہلبیت کو پاک کیا جا چکا ہے تو دعا کی حاجت نہ تھی۔ فرقہ قدریہ (منکرین تقدیر) کے قول کے مطابق یہ بات اور بھی واضح ہے اس لیے کہ قدریہ کے نزدیک خدا کے ارادہ کے لیے وجود مراد ضروری نہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ ارادہ کرتا ہے اور وہ چیز وقوع میں نہیں آتی اور بعض دفعہ وہ چیز ظہور پذیر ہوتی ہے جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا۔ کیا شیعہ اپنا قانون فاسد بھی بھول گئے۔؟

اہل سنت کی رائے میں ارادہ کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ارادہ شرعیہ جو اللہ تعالیٰ کی محبت و رضا کو متضمن ہے جیسا کہ مذکورہ صدر

آیات ہیں۔

(۲) ارادہ کونیہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلق و تقدیر کو شامل ہے۔

ارادہ کونیہ کی مثال یہ آیت ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ (سورہ ھود-۳۴)

نیز فرمایا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (سورۃ الانعام ۱۲۵)

حقیقت یہ ہے کہ زیر نظر آیت کے آغاز میں ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں بھی انہی کا ذکر ہے۔ بنا بریں یہ خطاب ازواج سے ہے۔ نجاست دور کرنے کا ارادہ اور تطہیر اہل بیت صرف ازواج ہی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ سب اہل بیت اس میں شامل ہیں۔ بلا شبہ حضرت علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم باقی اہل بیت کی نسبت اخص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعا میں خصوصیت سے ان کا ذکر کیا۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ دعا سکھائی۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّاتِهٖ"۔

آیت تطہیر سے شیعہ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا

اگر شیعہ کہیں کہ فرض کیجئے قرآن کریم سے اہلبیت کی طہارت اور پاکیزگی ثابت نہیں ہوتی مگر آنحضور کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع ان سے نجاست کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ صرف قرآن کریم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اہل بیت سے نجاست کو دور کر دیا گیا ہے۔ باقی رہی عصمت و امامت تو قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں پایا جاتا۔

اس پہ مزید یہ کہ بالفرض اگر قرآن سے ان کی طہارت ثابت ہو بھی جائے تو عصمت کہاں سے لازم آئے گی؟

نیز اس کی دلیل کیا ہو گی کہ اہل بیت سے سہو و خطا کا صدور نہیں ہوتا۔ ازواج مطہرات

کو جو احکام اس آیت میں دیے گئے ہیں۔ ان سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوگی۔

آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی ان سے خبث و فواحش کو دور کرنا چاہتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان اکابر سے اللہ تعالٰی نے شرک و خبائث کو دور کرکے ان کو فواحش و منکرات سے پاک کر دیا تھا۔ مگر متقی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس سے صغیرہ گناہ بھی صادر نہ ہو۔ اگر متقی کے لیے یہ بات شرط ہوتی تو پوری امت میں ایک بھی متقی نہ ہوتا۔ خلاصۂ کلام جو شخص بھی نیک اعمال سے اپنے گناہوں کو زائل کرے وہ متقی ہوگا۔

اللہ تعالٰی فرماتے ہیں۔

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا" (التوبہ ۱۰۳)

ان کے مالوں سے صدقہ لے کر اس سے ان کو پاک کیجئے اور ان کا تزکیہ فرمائیے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ آیت میں جس تطہیر کا ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے جو دعا فرمائی تھی اس سے بالاتفاق اہل بیت کا معصوم ہونا مراد نہیں جہاں تک اہل سنت کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے وہ رسول کے لیے عصمت کا اثبات کرتے ہیں۔ شیعہ نبی کے علاوہ حضرت علی اور ائمہ کو بھی معصوم قرار دیتے ہیں۔ بنا بریں آنحضور کی ازواج و بنات عصمت کے حکم میں داخل نہ ہوں گی۔ جب یہ بات ہے تو جن چار اکابر کے حق میں تطہیر کی دعا کی گئی ہے وہ اس عصمت کو شامل نہ ہوگی جو نبی و امام کے ساتھ مخصوص ہے۔

علاوہ ازیں گناہوں سے معصوم ہونے اور تطہیر کی دعا قدریہ کے قاعدہ کے مطابق ممتنع ہے (شیعہ بھی قدریہ یعنی منکرین تقدیر میں داخل ہیں) اس لیے کہ افعال باختیار یہ یعنی واجبات کا فعل اور منکرات کا ترک قدریہ کے نزدیک خدا کی قدرت میں داخل نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی انسان کو نہ پاکیزہ و طائع بنا سکتا ہے نہ عاصی۔ لہذا اس اصل کی بنا پر فعل خیرات اور ترک منکرات کی دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

قدریہ کے نزدیک خدا کی عطا کردہ قدرت نیک و بد دونوں قسم کے افعال کی صلاحیت

رکھتی ہے۔ جس طرح تلوار سے مسلمان کو بھی قتل کر سکتے ہیں اور کافر کو بھی یا مال کو طاعت میں بھی خرچ کر سکتے ہیں اور معصیت کے کاموں میں بھی، اسی طرح بندہ خدا کی عطا کردہ قدرت سے اچھے کام بھی انجام دیتا ہے اور برے بھی۔ شیعہ کی پیش کردہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے کیونکہ اس حدیث میں آپ نے اہل بیت کے لیے تطہیر کی دعا فرمائی ہے۔ اگر شیعہ کہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اہل بیت کی مغفرت فرمائے گا اور وہ بروز آخرت ماخوذ نہیں ہوں گے تو اس سے عصمت کے اثبات پر استدلال کرنا بالکل ہی غلط ہوگا۔ شیعہ کے نزدیک گناہوں سے معصوم رہنے کی دعا بھی ممنوع ہے بفرض محال اگر عصمت ثابت بھی ہو جائے تاہم ہمارے نزدیک یہ امامت کے لیے مشروط نہیں ہے۔

شہادت عثمان سے قبل حضرت علی نے امامت کا دعویٰ نہیں کیا تھا

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی امامت کے مدعی تھے اور نجاست کا ازالہ بھی ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا آپ ہی امام صادق ہوں گے۔"

ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ شہادت عثمان تک حضرت علی نے امامت کا دعویٰ کیا ہو۔ بے شک آپ دل سے امامت کے خواہاں تھے مگر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں امام یا معصوم ہوں۔ نہ یہ کہ آنحضور نے اپنے بعد مجھے امام بنایا اور میری اطاعت لوگوں پر واجب ٹھہرائی ہے اور نہ اس قسم کے دیگر الفاظ ارشاد فرمائے۔ بخلاف ازیں ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جس شخص نے ان سے اس قسم کے الفاظ نقل کیے ہیں وہ کاذب ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت صحیح معنی میں متقی تھے اور ایسے صریح کذب کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جس کا کذب ہونا سب صحابہ پر عیاں ہو۔

شیعہ مصنف نے حضرت علی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "لَقَدْ تَقَمَّصَهَا"۔ یہ حضرت علی کا قول نہیں ہے۔ ہم شیعہ سے تقاضا کرتے ہیں کہ اس کی سند پیش کریں۔ البتہ یہ قول

نہج البلاغۃ میں موجود ہے۔ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ نہج البلاغۃ کے اکثر خطبات خود ساختہ اور جھوٹے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کسی قدیم کتاب میں مندرج نہیں[1]۔ اور نہ ان کی کوئی سند معروف ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ میں علوی یا عباسی ہوں حالانکہ اس کے اسلاف میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہ کیا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ بے بنیاد ہے اس لیے کہ نسب اپنی اصل کے اعتبار سے جانا پہچانا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ اپنی فرع سے مل جاتا ہے۔

نہج البلاغۃ کے خطبات میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کے خلاف صراحۃً حضرت علی سے منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر یہ ضروری قرار نہیں دیا کہ کسی بات کو بلا دلیل تسلیم کرلیں یہ "تکلیف مالا یطاق" ہے۔

ہم حضرت علی کے ادعاء خلافت کو ان لوگوں کے قول کی بنا پر کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں جو متہم بالکذب تھے؟ فرض کیجئے کہ حضرت علی نے ایسا کہا تھا تو تم نے یوں کیا کہا۔ کہ حضرت علی نے امام منصوص ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ آپ یہ بتانا چاہتے ہوں کہ وہ دوسروں کی نسبت خلافت کے لیے موزوں تر ہیں۔ لہٰذا اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ آپ

---

[1] اس کی حد یہ ہے کہ کتب ادب جن میں سند مذکور نہیں ہوتی ان میں بھی یہ الفاظ مذکور نہیں ہیں۔ مثلاً جاحظ کی "البیان والتبیین" میں حضرت علی کا یہ خطبہ صرف چند سطروں تک محدود ہے اگر اس خطبہ کا تقابل نہج البلاغۃ میں ذکر کردہ خطبہ کے ساتھ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ نہج البلاغت میں اس خطبہ کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور وہ اضافہ کیا گیا ہے جو جاحظ کے زمانہ تک موجود نہ تھا۔ مشہور شیعہ عالم رضی اور ان کے بھائی مرتضیٰ نے نہج البلاغۃ میں جس جعل سازی سے کام لیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ثابت شدہ چیز پر بے بنیاد باتوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ "لقد تقمصہا" کا جملہ بھی اسی میں شامل ہے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نہج البلاغت میں ذکر کردہ اقوال حضرت علی کے معروف ارشادات کی نقیض ہوتے ہیں اور ان کی کوئی سند ہوتی ہے نہ دلیل۔ روافض کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ اس طرح انھوں نے حضرت علی کے اقوال میں تناقض ثابت کر دیا جس سے ان کا دامن پاک تھا۔[12]

نے دانستہ جھوٹ کا ارتکاب کیا بلکہ یہ بات آپ نے اپنے اجتہاد کی بنا پر کہی ہوگی۔ بہر کیف اگر ان میں سے کوئی بات ثابت ہو بھی جائے تو وہ قرآن سے ماخوذ نہ ہوگی۔ پھر شیعہ مصنف کے قرآنی دلائل کہاں ہیں جن کا وہ ڈھنڈورا پیٹتا ہے؟

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامت علی کی چھٹی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ (سورۂ نور ۳۶-۳۷)

ثعلبی نے حضرت انس و بریدہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا یا رسول اللہ! "فی بیوت" سے کون سے گھر مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا "انبیاء کے گھر"۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا کیا حضرت علی و فاطمہ کا گھر بھی ان میں شامل ہے؟ آپ نے فرمایا۔ یہ ان میں کے افضل ترین گھروں میں سے ہے"

ہم شیعہ مصنف سے پوچھتے ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ ہرگز اس کی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ باقی رہا ثعلبی تو وہ "حاطب لیل" ہے۔ یہ حدیث بلاشبہ جھوٹی ہے مزید براں یہ آیت بالاتفاق مساجد سے متعلق ہے۔ بفرض محال اگر حضرت علی "رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ" میں داخل بھی ہیں تو اس سے آپ کا افضل الامت ہونا لازم نہیں آتا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آیت میں "رجال" جمع کا لفظ ہے واحد نہیں ہے لہٰذا حضرت علی اس کے مصداق نہیں ہو سکتے اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت علی سب سے افضل تھے تو شیعہ افضل کی امامت کو واجب کیوں قرار دیتے ہیں؟

امامت علی کی ساتویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی ساتویں دلیل یہ آیت ہے۔ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا حضور! آپ کے کون سے رشتہ دار

ہیں جن سے محبت رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے؟ آپ نے فرمایا۔ "علی و فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے"۔

تفسیر ثعلبی اور بخاری و مسلم میں بھی اسی طرح مروی ہے۔ چونکہ حضرت علی کے سوا دیگر صحابہ سے محبت رکھنا واجب نہیں۔ لہٰذا حضرت علی ان سے افضل ٹھہرے اور وہی امام ہوں گے۔ بنا بریں ان کی مخالفت محبت کے منافی ہے اور محبت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ لہٰذا آپ واجب الاطاعت ہوئے"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث مسند اور صحیحین میں مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ان پر کھلا ہوا افترا ہے بلکہ ان میں ایسی احادیث موجود ہیں جو اس کی نقیض ہیں۔ ایسے کاذب و جہال لوگوں پر کیا اعتماد کیا جائے۔ البتہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے خلفاء اربعہ کے فضائل و مناقب میں ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں صحیح و سقیم ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ بعد ازاں امام احمد کے بیٹے عبداللہ اور القطیعی نامی عالم نے بھی اس میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا جس میں جھوٹی اور ضعیف روایات شامل ہیں۔ جہلا نے سمجھا کہ یہ سب امام احمد کی مرویات ہیں حالانکہ یہ بدترین غلطی ہے۔ عبداللہ کی زیادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انہوں نے اپنے والد حضرت امام احمد سے روایت نہیں کیں۔ القطیعی کی زیادات بھی عبداللہ بن احمد کی بجائے دیگر راویوں سے منقول ہیں۔

اس پر مزید یہ کہ مذکورہ صدر آیت سورۂ شوریٰ میں شامل ہے جو بالاتفاق مکی سورت ہے۔ حضرت علی کا نکاح حضرت فاطمہ کے ساتھ مدینہ میں ہوا تھا۔ اسی طرح حضرت حسن ۳ھ میں اور حضرت حسین ۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ آنحضور ایک مکی آیت کی تفسیر میں ان لوگوں کی محبت کو کیونکر واجب قرار دے سکتے تھے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ بخاری و مسلم میں اس آیت کی تفسیر میں مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو سعید بن جبیرؒ نے کہا۔ "اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضور کے اقارب سے محبت کا سلوک کرکے ان کی ذات سے الفت قائم رکھے"۔

یہ سن کر حضرت ابن عباس نے فرمایا "آپ نے جلد بازی سے کام لیا قریش کا کوئی چھوٹا قبیلہ بھی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ آنحضور کے قرابتدارانہ روابط نہ ہوں۔ اس لیے فرمایا" لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا۔ یعنی اس قرابتداری کی بنا پر جو میں آپ سے رکھتا ہوں میں چاہتا ہوں تم مجھ سے محبت کا سلوک روا رکھو"۔

آپ نے مفسر قرآن حضرت ابن عباس کا بیان ملاحظہ کیا جو حضرت علی کے بعد سب اہل بیت میں بہت بڑے عالم تھے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ آیت کے الفاظ میں" اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی" یوں نہیں فرمایا "اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِلْقُرْبٰی"۔ اور یوں بھی نہیں فرمایا" اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذِی الْقُرْبٰی۔

اور اگر وہ مطلب مراد ہوتا جو شیعہ کہتے ہیں تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے جیسے ہم نے نقل کیے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے

(۱) فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی (انفال۔ ۴۱)

(۲) فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی۔ (سورۂ حشر۔ ۷)

(۳) فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (الروم۔ ۳۸)

(۴) وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (البقرہ۔ ۱۷۷)

آیت اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی سے شیعہ کا استدلال

قرآن کریم میں جہاں جہاں اقارب کے حق میں وصیت کی گئی ہے اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آیت میں "المودۃ" کا لفظ مصدر استعمال کیا گیا ہے۔ اسم نہیں لہٰذا اس سے بھی معلوم ہوا کہ "القربیٰ" سے اقارب مراد نہیں۔ اگر اقارب مراد ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے "اَلْمَوَدَّةَ لِذَوِی الْقُرْبٰی"۔ مزید برآں اس صورت میں "فی" کا لفظ بھی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس لیے کہ عربی محاورہ میں یوں نہیں کہتے" اَسْئَلُكَ الْمَوَدَّةَ فِی فُلَانٍ" بلکہ "لفلان" بولتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول تبلیغ شریعت کی اجرت ہرگز طلب نہیں کرتا بلکہ وہ صرف خدا سے اجرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (الفرقان - ۵۷)

آپ فرما دیں کہ میں اس کی کچھ اجرت طلب نہیں کرتا۔

نیز فرمایا۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (الطور - ۴۰)

کیا آپ اجرت طلب کرتے ہیں کہ وہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں

ارشاد ہوتا ہے۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (سورۂ یونس - ۷۲)

میری اجرت صرف خدا کے ذمہ ہے

اس میں شبہ نہیں کہ اہل بیت کی محبت واجب ہے مگر اس کا وجوب اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ ان کی محبت کو رسول کی اجرت بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ دیگر شرعی مامورات کی طرح عبادات کی حیثیت رکھتی ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیرِ خُم پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں خدا کو یاد دلاتا ہوں"۔ آپ نے تین مرتبہ یہی الفاظ دہرائے۔

ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ میں ہے کہ آنحضور نے فرمایا۔

"مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ لوگ اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکیں گے جب تک اللہ تعالے اور میری قرابت کی وجہ سے اہل بیت کو چاہنے نہ لگیں"۔

اگر اہل بیت سے ہماری محبت آنحضور کی اجرت رسالت میں داخل ہوتی تو ہمیں اس کا اجر و ثواب نہ دیا جاتا۔ اس لیے کہ ہم نے آپ کی وہ اجرت ادا کی تھی جس کا آپ رسالت کی بنا پر استحقاق رکھتے تھے۔ کیا کوئی مسلمان یہ بات کہنے کے لیے تیار ہے؟

یہ بات ہمیں تسلیم ہے کہ دیگر دلائل کی بنا پر حضرت علی کی محبت ہمارے لیے ضروری ہے مگر اس سے ان کی افضلیت اور امامت و خلافت کیونکر ثابت ہوئی؟

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

خلفاء ثلاثہ سے محبت رکھنا ضروری نہیں ہے"۔

یہ بات ہمارے لیے ناقابل قبول ہے بلکہ اہل بیت کی الفت و محبت کے دوش بدوش اصحاب ثلاثہ کی محبت بھی ناگزیر ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ خلفائے ثلاثہ سے محبت رکھتے ہیں اور جس سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہوں اس سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھنا ہم پر واجب ہے اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ اسلام کا طرۂ امتیاز اور ایمان کی مضبوط ترین کڑی ہے۔ خلفاء ثلاثہ کبار اولیاء میں سے تھے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔

جمیع صحابہ واجب الاحترام ہیں

بخاری و مسلم میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں کے رحم و کرم اور الفت و محبت کی مثال ایک جسم ایسی ہے کہ جب اس کا کوئی عضو بیمار پڑتا ہے تو پورا جسم بخار و بیداری سے بیقرار ہو جاتا ہے"۔

ایک رافضی قوت دلیل سے خوارج و نواصب کو قائل نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اس مکالمہ سے ظاہر ہے۔ اگر خارجی و ناصبی ایک شیعہ سے کہیں تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ علی خدا کے ولی ہیں"؟

اگر شیعہ اس کے جواب میں کہے کہ "مجھے تواتر سے حضرت علی کا ولی اللہ ہونا معلوم ہوا۔ کیونکہ آپ مسلمان تھے اور اعمال صالحہ انجام دیتے تھے"، تو خارجی و ناصبی اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ "نقل متواتر تو حضرت ابوبکر اور دیگر صحابہ کے بارے میں بھی موجود ہے"۔

اور اگر شیعہ کہے کہ قرآن سے حضرت علی کا ولی اللہ ہونا ثابت ہے تو خوارج و نواصب کہہ سکتے ہیں کہ "قرآنی عمومات میں تو دیگر صحابہ بھی حضرت علی کے ساتھ شامل ہیں مگر شیعہ عام صحابہ کو ان عمومات سے خارج کر دیتے ہیں"۔

اس سے آسان تر یہ ہے کہ جمیع صحابہ کی بجائے صرف ایک حضرت علی کو ان سے خارج کر دیا جائے"۔ اور اگر شیعہ کہے کہ "احادیث نبویہ سے حضرت علی کا ولی ہونا ثابت ہے"۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیگر صحابہ کے فضائل و مناقب کی احادیث اکثر و اصح ہیں مگر شیعہ ان پر قدح

وارد کرتے ہیں۔ دوسری جانب تفضیلت علی میں شیعہ جو روایات بیان کرتے ہیں ان کے ناقل وہی صحابہ ہیں جو شیعہ کے نزدیک مطعون ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں۔

(۱) اگر صحابہ پر شیعہ کی جرح وقدح درست ہے تو تفضیلت علی رضی اللہ میں ان کی روایات بھی معتبر نہیں ہیں۔

(۲) اگر تفضیلت علی کی روایات قابل اعتماد ہیں تو صحابہ پر شیعہ کے مطاعن لغو ہیں۔

اگر روافض کہیں کہ تفضیلت علی کی روایات شیعہ کی نقل کے مطابق معتبر ہیں تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ معدودے چند کے سوا شیعہ کے نزدیک سب صحابہ مطعون ہیں کہا جاتا ہے کہ دس سے زائد صحابہ ایسی روایات کے نقل کرنے میں یک زبان ہیں جب روافض جمہور صحابہ کی مرویات کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تو معدودے چند صحابہ کی روایت کردہ احادیث کیونکر ان کے نزدیک حجت ہوں گی؟

یہ درست ہے کہ محبوب خداوند رسول ہونے کے اعتبار سے حضرت علی کی محبت ہم پر واجب ہے تاہم دیگر صحابہ کی محبت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا کہ سب لوگوں میں سے آپ کو عزیز تر کون ہے؟ فرمایا "عائشہ" عرض کیا گیا مردوں میں سے کون عزیز ہیں؟ فرمایا "ان کے والد ابوبکر صدیق"۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے دن حضرت عمر نے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"آپ ہمارے سردار اور ہم سب سے بہتر اور آنحضور کو ہم سب سے عزیز ہیں"۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"اگر میں اس امت میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابوبکر کو بناتا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"حضرت علی کی مخالفت ان کی محبت کے منافی ہے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی سے محبت رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت

واجب ٹھہرتی ہے تو اقارب کی اطاعت بھی ضروری ہوگی اس لیے کہ ان کی محبت واجب ہے۔ جس سے حضرت فاطمہ کا امام ہونا لازم آتا ہے۔ ورنہ محبت و مودت کسی طرح بھی امامت کو مستلزم نہیں۔ اگر محبت کو امامت کا ملزوم قرار دیا جائے تو ملزوم کا انتفاء لازم کی نفی کا تقاضا کرتا ہے۔ بنا بریں صرف اسی شخص کی محبت لازم ہوگی جو امام معصوم ہو۔

شیعہ کا یہ قول کہ "مخالفت مودت کے منافی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب مخالفت صرف اسی صورت میں قادح فی المودت ہوتی ہے جب وہ شخص واجب الاطاعت ہو تو پہلے وجوب اطاعت کا علم ضروری ہے"۔ جب اطاعت کو اس لیے واجب قرار دیا جائے گا کہ محبت واجب ہے تو دور لازم آئے گا۔ الّایہ کہ وہ شخص امام ہو۔ علاوہ ازیں حضرت علی کے حکم کی خلاف ورزی صرف اس صورت میں قادح فی المودت ہوگی جب حضرت علی نے ہمیں اپنی اطاعت کا حکم دیا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ بنا بریں خلفاء ثلاثہ کی مودت و اطاعت بھی واجب ہوگی اور ان کی مخالفت ان کی محبت بلکہ اللہ و رسول کی محبت میں بھی قادح ہوگی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علیؓ کی آٹھویں دلیل

امامت علی کی آٹھویں دلیل یہ آیت ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللهِ (سورۃ البقرہ)

ثعلبی کہتے ہیں جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ کیا تو قرض اور امانتوں کی ادائیگی کے لیے حضرت علی کو مکہ میں ہی رہنے دیا۔ جس رات آپ غار کی جانب چلے اور کفار قریش نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا تو آپ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ آپ کی سبز چادر اوڑھے آپ کے بستر پر سو رہیں۔ آپ نے حضرت علی سے کہا: "کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں دے سکیں گے"۔ حضرت علی نے تعمیل ارشاد کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل و میکائیل کی طرف وحی کی کہ میں نے تمہارے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا اور ایک کی عمر دوسرے سے طویل کر دی۔ بتائیے تم میں سے کون اپنی زندگی کا حصہ دوسرے کو عطا کرتا ہے۔ دونوں نے جینے کو پسند کیا اور کوئی بھی ایثار نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم نے

حضرت علی کی تقلید نہ کی ۔ میں نے محمد و علی کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ علی محمد کے بستر پر سو گئے اور ان کے لیے یہ ایثار قبول کیا ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو حضرت علی کی حفاظت کا حکم دیا ۔ جبرئیل حضرت علی کے سر کے پاس کھڑے ہو گئے اور میکائیل پاؤں کے پاس ۔ جبرئیل نے کہا " شاباش ! اے علی تیرے جیسا اور کون ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے فرشتوں پر فخر کرتے ہیں ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عازم مدینہ تھے کہ مذکور صدر آیت نازل ہوئی "۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ آیت حضرت علی کی فضیلت میں نازل ہوئی ۔ جب آپ مکہ سے غار ثور کی طرف جا رہے تھے ۔ یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس میں حضرت علی منفرد ہیں بنا بریں یہ واقعہ حضرت علی کی عظمت و فضیلت کی زبردست دلیل ہے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ ہی امام ہیں ۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

ہم شیعہ مصنف سے اس واقعہ کی صحتِ نقل کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ اس روایت کو ثعلبی کی طرف منسوب کرنے میں ہی اس کا جھوٹا ہونا ثابت ہو رہا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آنحضور نے ہجرت فرمائی ۔ قریش مکہ حضرت علی سے قطعی طور پر بے تعلق تھے ۔ ان کا اصلی مطلوب آنحضور کی ذات گرامی اور صدیق اکبر تھے ۔ قریش مکہ نے انعام بھی انہی دو حضرات کو پکڑنے والے کے لیے مقرر کیا تھا ۔ جیسا کہ روایات صحیحہ میں مذکور ہے ۔ جہاں تک شیعہ کی ذکر کردہ روایت کا تعلق ہے وہ نہایت پست درجہ کا جھوٹ ہے ۔ حضرت علی کو آپ کے بستر پر سلانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ قریش اس وہم میں مبتلا رہیں کہ آپ گھر ہی میں ہیں اور آپ کی تلاش نہ کریں جب صبح ہوئی تو قریش پر ان کی ناکامی کا راز فاش ہوا ۔ تاہم انھوں نے حضرت علی کو کچھ ایذا نہ پہنچائی ۔ ان سے صرف یہ دریافت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں ؟ حضرت علی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ۔ اگر انھیں حضرت علی سے کوئی پرخاش تھی تو وہ انھیں ضرور تکلیف پہنچاتے ۔ کفار مکہ کا حضرت علی سے تعرض نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا ۔

جس شخص نے قصداً آپ کا دفاع کیا وہ حضرت ابو بکر صدیق تھے ۔ آپ کی حفاظت

کے نقطۂ خیال سے دوران سفر کبھی حضرت ابوبکر آنحضور کے آگے ہوتے اور کبھی پیچھے۔ بعض صحابہ نے لڑائیوں میں اپنی جانیں تک آنحضور پر نثار کی تھیں۔ بعض شہید ہوئے اور بعض کے اعضاء تک شل ہو گئے۔ مثلاً طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔ آنحضور کی تائید و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔

سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ جبریل امین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا آج رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ رات کے اندھیرے میں کفار آپ کے دروازہ پر جمع ہو کر انتظار کرنے لگے کہ جب سو جائیں تو آپ پر حملہ کر دیں۔

ان کو کھڑے دیکھ کر آپ نے حضرت علی سے کہا "میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو جائیے کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے"۔

واقعہ ہجرت

محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ جب کفار مکہ آنحضور کی تلاش میں جمع ہوئے تو ان میں ابوجہل بھی تھا۔ اس نے کہا۔ محمد کہتے ہیں "اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو عرب و عجم کے بادشاہ بن جاؤ گے اور موت کے بعد جب دوبارہ زندہ ہو گے تو تمہیں ایسے باغات ملیں گے جیسے اردن کے باغات ہیں اور اگر تم نے ان کی پیروی نہ کی تو وہ تمہیں ہلاک کر ڈالیں گے اور بعد از موت جب اٹھائے جاؤ گے تو تمہیں آگ میں جلایا جائے گا"۔ راوی کا بیان ہے کہ آنحضور گھر سے نکلے اور مٹھی بھر مٹی ان پر دے ماری پھر فرمایا۔ ہاں میں یونہی کہتا ہوں۔ ابوجہل کو مخاطب کر کے فرمایا تو بھی آگ میں جلنے والوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی قوت بصارت سلب کر لی اور وہ آپ کو دیکھ نہ سکے۔ یہ مٹی ان سب آدمیوں کے سر پر پڑی۔ اور وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ پھر ایک شخص ان کے پاس آیا اس نے کہا "تم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟" انہوں نے کہا "محمد کا"۔ وہ کہنے لگا۔ "بخدا محمد جا چکے ہیں تم اپنے مقصد میں ناکام ہوئے۔ جاتے جاتے وہ آپ کے سر پر خاک بھی جھونک گئے ہیں"۔ چنانچہ کفار نے دیکھا کہ ان کے سر پر مٹی پڑی ہے۔ پھر وہ گھر میں ادھر ادھر جھانکنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ علی آپ کی چادر اوڑھے پڑے ہیں وہ کہنے لگے بخدا محمد اپنی چادر تانے سو رہے ہیں اتنے میں صبح ہو گئی اور حضرت علی اٹھ کھڑے ہوئے تو کفار نے کہا اس شخص نے سچی بات

کہی تھی۔ کہ محمد یہاں سے چلے گئے ہیں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

"اس وقت کو یاد کیجئے جب کافر آپ کے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا مکہ سے نکال دیں ادھر یہ تدبیریں کر رہے تھے اور ادھر اللہ تعالےٰ بھی (آپ کو بچانے کی) تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے (سورہ انفال - ۳۰)

مذکورہ صدر روایت سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ آنحضور نے حضرت علی کو یقین دلایا تھا کہ ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بنا بریں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر طرح مسرور و مطمئن تھے۔

شیعہ مصنف نے جبرئیل و میکائیل کا جس مکالمہ کا ذکر کیا ہے وہ سراسر باطل اور بے بنیاد ہے۔ حضرت علی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مواخات بھی صحیح نہیں تاہم اگر مواخات وقوع میں آئی بھی تھی تو بعد از ہجرت مدینہ میں نہ کہ مکہ میں۔

علاوہ ازیں یہ آیت "مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهٗ" سورہ بقرہ میں ہے جو بالاتفاق مدنی سورت ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت اس وقت اتری جب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی اور مشرکوں نے آپ کو پکڑنا چاہا تو آپ نے اپنا مال ان کو دے دیا اور خود مدینہ پہنچ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھ کر فرمایا۔

"ابو یحییٰ! یہ سودا سود مند ہے"۔ (یہ واقعہ متعدد تفاسیر میں مذکور ہے)

ابو قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت مجاہدین مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی۔

عکرمہ کہتے ہیں یہ آیت حضرت صُہیب و ابو ذرؓ کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب بدر والوں نے ابو ذر کو پکڑ لیا مگر وہ ان سے چھوٹ کر بارگاہ نبوی میں پہنچ گئے۔ جب واپس لوٹے تو کفار پھر مر الظہران میں مل گئے آپ دوبارہ ان سے چھوٹ گئے۔

حضرت صہیب کو ان کے گھر والوں نے پکڑ لیا تھا۔ آپ نے فدیہ دے کر ان سے رہائی حاصل کر لی۔ علاوہ ازیں آیت کے الفاظ عام ہیں اور رضائے خداوندی کے لیے اپنی جان کو فروخت کرنے والا ہر شخص اس میں داخل ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بیعت الرضوان میں شمولیت کرنے والوں نے رسول اللہ سے موت کی بیعت کی تھی۔ (بخاری)

اس میں شبہ نہیں کہ غار میں جو فضیلت ابوبکر کو حاصل ہوئی اس میں وہ دیگر صحابہ سے منفرد ہیں۔ اسی طرح واقعہ ہجرت میں آنحضور کی رفاقت کا شرف بھی صرف حضرت ابوبکر کے حصہ میں آیا۔ لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق ہی خلیفۂ برحق تھے۔ یہ وہ سچی دلیل ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ۔ ۴۰)

اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو اللہ نے اس کی مدد کی تھی جب کفار نے ان کو نکال دیا تھا وہ دو اشخاص کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے اور اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر خدا ہمارے ساتھ ہے۔

بتائیے نص قرآنی کے مطابق یہ خصوصیت حضرت صدیق کے سوا اور کس میں پائی جاتی ہے؟ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آنحضور کے بستر پر سونے میں حضرت علی کو کسی تکلیف کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ آنحضور کی حفاظت میں دیگر صحابہ کو جسمانی تکلیفیں پہنچی تھیں۔

امامت علی کی نویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

”حضرت علی کی امامت کی نویں دلیل آیت مباہلہ ہے جمہور کا قول ہے کہ اس آیت میں ”اَبْنَاءَنَا“ کا اشارہ حضرت حسن وحسین کی طرف ہے۔ ”نِسَاءَنَا“ سے حضرت فاطمہ مراد ہیں اور ”اَنْفُسَنَا“ سے حضرت علی۔

یہ آیت امامت علی کی زبردست دلیل ہے۔ اس لیے کہ آیت زیر دست میں حضرت علی کو ”نفس رسول“ قرار دیا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ رسول علیہ السلام اور حضرت علی۔ ایک تو ہو نہیں سکتے۔ لہٰذا دونوں کی مساوات کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی آپ کے قائم مقام ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر دوسرا کوئی شخص فضیلت میں ان کا ہمسر ہوتا تو اللہ اس کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم صادر کرتے کیونکہ قبولیت دعا کے لیے ان کی ضرورت تھی۔ جب اہل بیت سب سے افضل ہوئے تو پھر امام بھی وہی ہونگے۔

یہ آیت اس قدر واضح ہے کہ اس کی دلالت صرف اس شخص پر پوشیدہ رہ سکتی ہے جس

پر شیطان نے قبضہ جما رکھا ہو"۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

جہاں تک مباہلہ میں حضرت علی و فاطمہ اور ان کے بیٹوں کو لے جانے کا تعلق ہے صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے حضرت علی کے کنبہ کو بلا کر فرمایا "اے اللہ یہ میرے گھر کے لوگ ہیں"۔

مگر اس سے افضلیت اور امامت کیونکر ثابت ہو گئی۔؟ شیعہ کا یہ قول کہ حضرت علی کو "نفس رسول" بنا دیا تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ مساوات کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ بلکہ اسے مساوات پر محمول کرنا ممتنع ہے کیونکہ کوئی شخص رسول سے مساوی نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں "انفسنا" کا لفظ لغت میں مساوات کے لیے نہیں بولا جاتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا (سورہ نور۔ ۱۲)

اس سے مومن مرد اور عورتوں کا مساوی ہونا لازم نہیں آتا۔

نیز فرمایا

فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (سورہ بقرہ۔ ۵۴) (یعنی ایک دوسرے کو قتل کرو)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی وہ ان لوگوں کے مساوی ہیں جنہوں نے اسے نہیں پوجا تھا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (سورۃ النساء ۲۹)

مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ یہ مراد نہیں کہ وہ سب لوگ مرتبہ میں مساوی تھے۔ بخلاف ازیں ان میں بہت کچھ فرق مراتب پایا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ (سورہ بقرہ۔ ۸۵)

یہ لفظ مختلف امور کی مشابہت و مماثلت پر دلالت کرتا ہے۔

مذکورہ صدر آیات قرآنیہ کی روشنی میں آیت مباہلہ کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم اپنے آدمی بلا

لیں اور تم اپنے"۔ یعنی وہ آدمی بلالیں جو دین و مذہب اور حسب و نسب کے اعتبار سے ہمارے ہم جنس ہیں اور جن میں تماثل و تشابہ قرابت داری کے لحاظ سے بھی پایا جاتا ہے اور ایماندار ہونے کے لحاظ سے بھی چنانچہ اس میں اولاد، مستورات اور اقارب مردوں کو داخل کیا۔ ظاہر ہے کہ عصبات میں سے آنحضور کے قریب ترین رشتہ دار حضرت علی تھے پھر آپ نے ان پر اپنی چادر بھی تان دی تھی مباہلہ میں قریبی رشتہ داروں کو شامل کیا جاتا ہے دور کے رشتہ داروں کو اگرچہ افضل ہوں تب بھی شامل نہیں کیا جاتا۔ آیت مباہلہ سنہ ھ میں وفد نجران کے وارد مدینہ ہونے پہ نازل ہوئی تھی۔ آنحضور کے چچا حضرت عباس اس وقت زندہ تھے باقی چچا سب فوت ہو چکے تھے۔ حضرت عباس کو اسلام سبقت حاصل تھی اور نہ آپ کے ساتھ کوئی اور خصوصیت تھی۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "اگر کوئی اور شخص اہل بیت کے مساوی ہوتا تو آپ اس کو بھی مباہلہ میں شریک کر لیتے"۔

آیت مباہلہ سے استدلال کا ابطال

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر آنحضور حضرت ابوبکر و عمر اور کبار صحابہ کو اس مقصد کے لیے طلب کرتے تو یہ سب لوگ تعمیل ارشاد کے لیے حاضر تھے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس سے مباہلہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نجران کے نصاریٰ اپنے اقارب و اعزہ کو مجلس مباہلہ میں لا رہے تھے۔ اگر آنحضور اجنبی لوگوں کو بھی اس میں آنے کی دعوت دیتے تو نصاریٰ بھی ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسے اجنبی اشخاص کی معیت میں مباہلہ میں شرکت کرنا ان پر کچھ بھی شاق نہ گذرتا جس طرح اقارب کے ہوتے ہوئے ان پر گراں گذر سکتا تھا۔ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ اقارب کی تکلیف کا احساس اس سے خائف و ہراساں رکھتا ہے اجانب کا الم و رنج اسے اس قدر پریشان نہیں کر سکتا۔

جب کسی قوم سے مصالحت کرنا مقصود ہو تو ہر فریق دوسرے سے کہتا ہے کہ اپنے بیوی بچے ہمارے یہاں رہن رکھ دو۔ اس کے برخلاف اگر وہ کچھ اجنبی لوگوں کو ان کے

پاس گروی رکھ دیں تو وہ اس پر رضا مند نہیں ہوں گے کسی شخص کے اہلبیت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کی نسبت افضل ہیں۔

ان دلائل و براہین کی روشنی میں شیعہ کو چاہیے کہ وہ نصوص صریحہ کو نظر انداز کر کے مجمل الفاظ کا سہارا نہ لیں اور نہ کسی کو رسول کریم کا ہمسر و ہم پلہ قرار دیں۔ ہم کہتے ہیں اگر آنحضور کی دوسری بیٹیاں بقید حیات ہوتیں تو آپ ان کو مباہلہ میں ضرور شریک کرتے۔ اگر آپ کا بیٹا ابراہیم اس وقت جاتا پہچانا ہوتا تو آپ اسے بھی مجلس مباہلہ میں ضرور لاتے۔ اسی طرح اگر آنحضور کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو وہ بھی مباہلہ میں ضرور شرکت کرتے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی دسویں دلیل یہ آیت ہے۔ فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ (البقرہ۔ ۳۷)

ابن المغازلی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور سے جب دریافت کیا گیا کہ "کلمات" سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا "حضرت آدم نے بحق محمد و علی و فاطمہ و حسن و حسین اپنے گناہ کی بخشش چاہی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ گناہ معاف کر دیا۔" اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توسل جائز ہے اسی طرح اہل بیت کو بھی وسیلہ بنا سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اس کی صحت ثابت کرنا بفحوائے "مَنِ ادَّعٰی فَعَلَیْهِ الْبَیَانُ" شیعہ مصنف کا کام ہے۔ ہماری دعوی ہے کہ یہ روایت اللہ و رسول پر بدترین جھوٹ ہے۔ اور روافض اس کی صحت ثابت نہیں کر سکتے۔ محدث ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے اور محدث دارقطنی کے افراد میں سے ہے دارقطنی نے اپنی بعض کتابوں میں افراد و غرائب کو جمع کیا ہے۔ دارقطنی کا قول ہے کہ حسین الاشقر یہ روایت بیان کرنے میں منفرد ہے وہ ثقہ راویوں سے موضوع روائتیں بیان کیا کرتا ہے۔ حالانکہ نہ وہ ثقہ ہے نہ مامون۔

شیعہ مصنف نے "کلمات" کی جو تفسیر بیان کی ہے وہ درست نہیں۔ قرآن کریم میں خود اس کی تفسیر مذکور ہے اور وہ "کلمات" یہ ہیں۔

"قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ" (سورہ اعراف-۲۳)

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ توبہ کرنے میں حضرت آدم کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ جب کوئی کافر و فاسق بھی خدا کے حضور میں توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے خواہ شیعہ کے ذکر کردہ کلمات پڑھے یا نہ پڑھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی کو یہ کلمات پڑھ کر دعا کرنے کا حکم نہیں دیا۔

امامت علی کی گیارھویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامت علی کی گیارہویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے

"اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ" (سورہ بقرہ-۱۲۴)

ابن المغازلی شافعی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ دعا مجھ پر اور علی پر پہنچ کر ختم ہو گئی۔ ہم میں سے کسی نے بھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ چنانچہ خدا نے مجھے نبی اور علی کو وصی بنایا"۔ یہ دلیل اس بات میں نص کی حیثیت رکھتی ہے"۔

یہ حدیث باتفاق حفاظ جھوٹی ہے اگر دعا حضرت علی تک پہنچ کر ختم ہو گئی ہے تو اس سے لازم آیا کہ بارہ اماموں کی امامت درست نہ ہو گی۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت علی نے بت کو سجدہ نہیں کیا تو امت میں بہت سے فاجر و فاسق لوگ بھی موجود ہیں۔ جنہوں نے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا تو کیا وہ بھی امام ٹھہریں گے؟ بخلاف ازیں عام صحابہ جو تبول کے پجاری رہ چکے تھے وہ اپنی اولاد سے بالاتفاق افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت لوط حضرت ابراہیم پر ایمان لائے تھے حالانکہ وہ نبوت سے سرفراز تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجَّانَا اللّٰهُ مِنْهَا۔

(سورۂ اعراف - ۸۹)

اگر ہم تمہارے مذہب سے نجات حاصل کرنے کے بعد پھر اس میں لوٹ آئے تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

حضرت علی کے امام ہونے کی بارہویں دلیل یہ آیت ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (سورہ مریم - ۹۶)

ابونعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی "وُدًّا" سے وہ الفت و محبت مراد ہے جو مومنوں کے دلوں میں حضرت علی کے لیے موجود ہے۔ ثعلبی حضرت براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اے علی! آپ کہہ دیں کہ اے اللہ میرے لیے اپنے پاس عہد مقرر کر دے اور مومنوں کے دلوں میں میری محبت پیدا کر دے"۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ چونکہ یہ خصوصیت کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا حضرت علی ہی امام ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں بیان کردہ روایت کی صحت نقل ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے ورنہ مقدمات کو ثابت کیے بغیر استدلال کرنا باطل اور قول بلا برہان ہے۔ مزید براں شیعہ مصنف کی پیش کردہ روایت موضوع ہے۔ نیز یہ کہ آیت زیر نظر کے الفاظ عام ہیں۔ بنا بریں یہ آیت حضرت علی کو بھی شامل ہے اور دیگر صحابہ کو بھی۔ لہٰذا اسے حضرت علی پر محدود و مقصور کرنا درست نہیں۔ بلکہ یہ آیت حضرت فاطمہ اور حسن و حسین کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا اجماع کی روشنی میں معلوم ہوا کہ یہ آیت کسی کے ساتھ مختص نہیں ہے اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا اس لیے اس نے قلوب مومنین میں محبت پیدا کرنے کے وعدہ کو پورا کر دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کے دلوں میں صحابہ و تابعین نیز خلفاء راشدین عموماً و حضرت ابوبکر و عمر کی محبت و الفت خصوصاً پیدا کر دی۔ سب صحابہ جن میں حضرت علی پیش پیش تھے ــــ حضرت ابوبکر و عمر سے محبت و مودت رکھتے تھے۔ کوئی صحابی ایسا نہ تھا جو ان دونوں حضرات کو برا بھلا کہتا ہو۔ یہ خصوصیت حضرت علی میں نہیں پائی جاتی اس لیے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے حضرت علی کی شان میں سخت سست الفاظ

کہے تھے۔ حضرت عثمان کو بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر و عمر کی جو محبت پیدا کر دی تھی۔ دوسروں کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامت علی کی تیرہویں دلیل یہ آیت ہے۔ اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (سورۃ الرعد۔ ۷)

کتاب الفردوس میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "میں منذر ہوں اور علی ہاد (رہنما و پیشوا) ہے۔ اے علی! ہدایت پانے والے تجھ سے ہدایت پاتے ہیں"۔ ابونعیم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ یہ حدیث حضرت علی کے امام ہونے کی صریح دلیل ہے۔

امامت علی کی تیرھویں دلیل

شیعہ نے اس روایت کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی روایت کے کسی کتاب میں مندرج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صحیح بھی ہے

دیلمی کی کتاب الفردوس موضوعات کا پلندہ ہے یہ ان میں سے قبیح ترین روایت ہے اس کو آنحضور کی طرف منسوب کرنا بھی گناہ ہے۔ حضرت علی کو ہادی قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ آنحضور کی بجائے ان سے ہدایت پاتے ہیں یہ ایسی بات ہے کہ کوئی مسلمان اسے زبان پر لانے کے لیے تیار نہیں۔ اور اگر شیعہ اس کا مطلب یہ بیان کریں کہ لوگ اسی طرح حضرت علی سے فیض ہدایت حاصل کرتے ہیں جیسے آنحضور سے تو اس سے حضرت علی کی آنحضور کے ساتھ مشارکت لازم آتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نص قرآنی کی بنا پر صرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی بنا کر بھیجا تھا۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الشوریٰ۔ ۵۲)

بلاشبہ آپ سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

شیعہ کا قول کہ "ہدایت یافتہ لوگ آپ (حضرت علی) سے راہ پاتے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مسلم نے بھی ہدایت پائی۔ اس نے حضرت علی کے ذریعہ پائی یہ واضح جھوٹ ہے اس لیے کہ لاتعداد لوگ سرور کائنات سے ہدایت پا کر جنت کے وارث بنے اور انہوں نے حضرت علی سے کچھ استفادہ بھی نہیں کیا۔ جب بیرونی بلاد و امصار فتح ہوئے تو وہاں کے لوگوں نے صحابہ سے فیض ہدایت حاصل کیا اور حضرت علی کی شکل بھی نہ دیکھی جو ان دنوں مدینہ میں بود وباش رکھتے تھے۔ پھر شیعہ کا دعویٰ کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

مزید براں ارشاد باری "وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ"۔ جملہ اقوام عالم کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی اولین و آخرین سب کے لیے ہادی نہیں ہو سکتے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی سے ہدایت حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ امام و خلیفہ بھی ہوں گے۔ اس لیے کہ ہدایت صرف خلیفہ ہی سے حاصل نہیں کی جاتی بلکہ علماء سے بھی یہ فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ باطل ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

امامت علی کی چودھویں یہ آیت ہے۔ "وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ" (الصافات-۲۴)

(ان کو سوال کیا جانے کے لیے ٹھہراؤ)

ابو نعیم بطریق شعبی حضرت ابن عباس سے نقل کر کے اس آیت کا یہ بیان کرتے ہیں کہ "لوگوں سے حضرت علی کی ولایت و امارت کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔ اسی طرح کتاب الفردوس میں حضرت ابو سعید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "بروز قیامت حضرت علی کی خلافت کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت علی ہی خلیفہ بلافصل ہیں"۔

ہم کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے۔ آیت ہذا کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کفار قریش سے متعلق ہے اس سے پہلی آیات میں ان مشرکین کا ذکر کیا گیا ہے جو روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ ان سے توحید و ایمان کے بارے میں

دریافت کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ان سے حضرت علی کی حب کے بارے میں سوال کرنے کا کیا مطلب؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ مشرک ہوتے ہوئے بھی حضرت علی سے محبت رکھیں گے تو انھیں فائدہ پہنچے گا۔ پناہ بخدا کہ کتاب الٰہی کو ایسے غلط معنی پہنائے جائیں

امامتِ علی کی پندرھویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی پندرھویں دلیل یہ آیت ہے

"وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِي لَحۡنِ ٱلۡقَوۡلِ" (سورہ محمد۔ ۳۰)

ابو نُعیم حضرت ابو سعید سے روایت کرتے ہیں کہ "لحن القول" سے بغض علی مراد ہے یہ خصوصیت دیگر صحابہ میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا حضرت علی ہی امام ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابو سعید پر افترا ہے۔ عام منافقین حضرت علی کی عداوت میں مبتلا نہ تھے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی کے دشمن حضرت عمر فاروق سے زیادہ نہ تھے۔ بلکہ کفار و منافقین حضرت فاروق اعظم سے شدید عداوت رکھتے تھے۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"معمولی درجہ کا نفاق انصار سے بغض و عداوت رکھنا ہے"۔

بنا بریں بغض انصار کی وجہ سے منافقین کی پہچان زیادہ موزوں تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ منافقین کے سوا کوئی شخص حضرت علی سے بغض نہیں رکھتا۔ نفاق کے بہت سے علامات ہیں۔ بغض علی بھی ان میں شامل ہے علاوہ ازیں کذب و خیانت وعدہ خلافی اور فسق و فجور سب علامات نفاق ہیں"۔

ہم کہتے ہیں کہ جو شخص حضرت علی کے ایمان و جہاد کی بنا پر آپ سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھتا ہے یا الہٰی اوصاف کی بنا پر انصار کو چاہتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی علامت ہے بخلاف ازیں جو شخص حضرت علی و انصار کو الہٰی اوصاف اور آنحضور کی تائید و نصرت کے جرم میں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ منافق ہے۔ علاوہ ازیں جو شخص کسی طبعی امر مثلاً رشتہ داری یا کسی دنیوی امر کی بنا پر ان سے محبت رکھتا ہے تو یہ اسی قسم کی محبت ہے جیسے ابو طالب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی۔ جو شخص حضرت مسیح یا حضرت موسیٰ

وعلی کے بارے میں غلو سے کام لیتا اور ان کے بارے میں مبالغہ آمیزی کرنے والے کو بنظر استحسان دیکھتا ہے تو یہ شخص مبالغہ آمیزی و غلو کا ارتکاب کرتا ہے۔ حضرت مسیح جن کی شان میں نصاریٰ نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا تھا حضرت علی سے افضل تھے تاہم یہ محبت نصاریٰ کے لیے مفید ثابت نہ ہوئی۔ محبت وہی سودمند ہے جو خدا کے لیے ہو نہ وہ جس میں کسی کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔ اسی طرح جو شخص انصار یا کبار صحابہ میں سے کسی کے ساتھ ایک سنی سنائی بات کی بنا پر بغض رکھتا ہو تو وہ خطاکار گمراہ اور جاہل ہوگا منافق نہیں ہوگا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"سولھویں دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔ وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ (سورۃ الواقعہ)

حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ اس امت میں سے سابق حضرت علی ہیں"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ مزید براں شیعہ مصنف نے اس کی سند بھی ذکر نہیں کی۔ بشرط صحت بھی یہ روایت حجت نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ (التوبہ ۔ ۱۰۰)

مہاجرین و انصار میں سے اولین سابقین اور وہ لوگ جنہوں نے نیک اعمال میں ان کی پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گئے۔

سابقین وہ صحابہ ہیں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جہاد کیا اس میں وہ صحابہ بھی شامل ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی پھر یہ بات کیونکہ صحیح ہو سکتی ہے کہ پوری امت میں ایک ہی سابق (حضرت علی) تھے؟ حالانکہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر اسلام لائے تھے۔ عورتوں میں سے حضرت خدیجہ بچوں میں سے حضرت علی اور غلاموں میں سے حضرت زید رضی اللہ عنہم اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا بچے کا اسلام لانا شرعاً معتبر بھی ہے یا نہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کا

اسلام باقی سب کی نسبت اکمل وانفع تھا۔

امامت علی کی سترھویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی سترھویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً (سورۃ التوبۃ۔ ۲۰)

رزین بن معاویہ نے اپنی کتاب "الجمع بین الصحاح" میں روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی اس لیے آپ سب سے افضل ہوئے اور ساتھ امام اور خلیفہ بھی"۔

ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس روایت کی صحت ثابت کرے۔ محدث رزین کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی جانب سے روایت میں بعض الفاظ بڑھا دیا کرتا ہے۔

صحیح حدیث وہ ہے جس کے راوی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں انہوں نے کہا کہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس بیٹھا تھا ایک شخص نے کہا میں اسلام لانے کے بعد صرف حاجیوں کو پانی پلاؤں گا اور کچھ نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں صرف خانہ کعبہ کو آباد کروں گا دوسرا کوئی کام نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا جہاد ان سب سے بہتر ہے حضرت عمر نے انھیں ڈانٹ کر کہا۔ آنحضور کے منبر کے پاس آواز بلند نہ کرو۔ میں نماز جمعہ سے فارغ ہو کر آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور تمہارے اختلافی مسائل کا حل دریافت کروں گا"۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

"کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور خانہ کعبہ کے آباد کرنے والے کو اس شخص کی مانند قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا اور خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہو (سورہ توبہ۔ ۱۹۔ ۲۰) (صحیح مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی جنہوں نے جہاد کو حاجیوں کو پانی پلانے اور کعبہ کی حفاظت کی نسبت افضل قرار دیا تھا۔ حق بجانب تھے۔ ان کے مقابلہ میں اس شخص کا قول درست نہیں جس نے ان امور کو افضل تصور کیا تھا۔ اس سے یہ بھی واضح

ہوا کہ مسئلہ تنازعہ میں حضرت علی گے پاس اپنے حریف کی نسبت حق و صداقت کا زیادہ علم تھا۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے متعدد امور میں حکم ربانی سے ہم آہنگ رہی تھی آپ ایک بات فرماتے اور اس کی تائید میں قرآن کریم نازل ہو جاتا۔ وہ یہ امور ہیں۔

(۱) مقام ابراہیم (۲) حجاب (۳) اسارٰی بدر

اللہ تعالٰی فرماتے ہیں۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ (سورہ تحریم-۵)

بہت ممکن ہے کہ اگر وہ (محمد) تم کو طلاق دے دیں تو تمہارے عوض وہ آپ کو بہتر بیویاں عطا کر دے۔

فرض کیجئے حضرت علی میں ایک خصوصیت پائی جاتی ہے تو اس سے ان کی امامت ثابت نہیں ہوتی اور نہ یہ کہ آپ امت میں سب سے افضل تھے۔ خضر کو ایسے مسائل معلوم تھے جو حضرت موسیٰ کو معلوم نہ تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ حضرت موسیٰ سے افضل تھے اس سے بڑھ کر یہ کہ ہُدہُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ "(جو بات مجھے معلوم ہے آپ نہیں جانتے) پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابوبکر بالاولی اس آیت کے مصداق تھے۔ اس لیے کہ حضرت علی تنگدست تھے خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس مال موجود ہی نہ تھا بخلاف ازیں حضرت ابوبکر غنی تھے اور انہوں نے خدا کی راہ میں کثیر مال صرف کیا تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

امامت علی کی اٹھارویں دلیل

"حضرت علی کے منصب خلافت پر فائز ہونے کی اٹھارویں دلیل یہ آیت ہے۔

اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً (المجادلہ ۱۲)

حضرت ابن فرماتے ہیں کہ آنحضور کے ساتھ گفتگو کرنے کے پہلے صدقہ دینا ضروری ہے۔ باقی صحابہ بخل سے کام لیا کرتے تھے صرف حضرت علی صدقہ دیتے تھے"۔

حضرت عبد اللہ بن عمر کا قول ہے کہ حضرت علی تین اوصاف کے حامل تھے اگر مجھ میں ان تین باتوں میں سے ایک بھی ہوتی تو مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ عزیز تھا۔

(۱) حضرت فاطمہ کے ساتھ شادی (۲) غزوہ خیبر میں آنحضور کا حضرت علی کو جھنڈا عطا کرنا (۳) آیت نجوی۔

حضرت علی فرمایا کرتے تھے "اس آیت پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا اور میری وجہ سے اللہ تعالے نے امت کا بوجھ ہلکا کر دیا۔"

مذکورہ صدر اقوال سے حضرت علی کی فضیلت ثابت ہوتی ہے لہذا آپ احق بالامامت ہوں گے۔"

ہم کہتے ہیں حضرت علی نے اس آیت پر عمل کیا اور یہ جلد ہی منسوخ ہو گئی۔ بنا بریں دیگر صحابہ کو اس پر عمل کرنے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں اس آیت میں صدقہ کو واجب قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب رسول علیہ السلام سے رازدارانہ طور پر کوئی بات کرنا چاہیں تو صدقہ ادا کریں۔ جو شخص ایسی بات نہ کرنا چاہتا ہو اس کے لیے صدقہ ادا کرنا ضروری نہیں۔ چونکہ سرگوشی واجب نہ تھی لہذا غیر واجب چیز کو ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو شخص صدقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو اور اس کی نیت یہ ہو کہ بشرط قدرت وہ آنحضور سے بات چیت کرے گا اور صدقہ دے گا تو اسے اس کی نیت کا اجر و ثواب مل جائے گا۔

جس شخص کو آنحضور سے ایسی خفیہ بات کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہو تو اسے ناقص قرار نہیں دیا جائے گا۔ البتہ جس شخص کو ایسی ضرورت لاحق ہوئی ہو مگر اس نے بخل سے کام لے کر آپ سے خفیہ بات نہ کی تو اس نے ایک مستحب فعل کو ترک کیا۔ خلفاء کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بخیل تھے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اصحاب ثلاثہ اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بعض ان میں سے موجود نہ ہوں یا تنگدست ہوں یا انھیں آنحضور کے ساتھ رازدارانہ بات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اصحاب ثلاثہ نے ایک مستحب فعل کو ترک کر دیا تو کیا مستحب پہ

عمل کرنے والا افضل الامت کہلائے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ "تم میں سے آج کون روزہ سے ہے"؟ ابوبکر نے کہا "میں ہوں" فرمایا کہ "تم میں سے کسی نے جنازہ کو الوداع کہا ہے"؟ ابوبکر نے کہا "حضور! میں نے جنازہ پڑھا ہے"۔ پھر آپ نے دریافت کیا۔ "کیا تم میں سے کسی نے صدقہ دیا ہے"؟ ابوبکر نے کہا "حضور! میں نے صدقہ دیا ہے" آپ نے فرمایا جس شخص میں یہ سب باتیں جمع ہو جائیں وہ جنتی شخص ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ابوبکر کے مال سے مجھے جس قدر فائدہ پہنچا دوسرے کسی کے مال سے نہیں پہنچا"۔

بخاری و مسلم میں روایت کیا گیا ہے کہ آنحضور نے فرمایا۔ "صحبت اور رفاقت اور انفاق مال کے اعتبار سے ابوبکر میرے سب سے بڑے محسن ہیں اور اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مسجد نبوی کی طرف کھلنے والی سب کھڑکیاں بند کر دی جائیں مگر ابوبکر کی کھڑکی کھلی رہے۔

سنن ابی داؤد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو مخاطب کر کے فرمایا "اے ابوبکر! آپ سب سے پہلے جنت میں جائیں گے"۔

ترمذی و ابوداؤد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ میرے پاس ان دنوں مال تھا۔ میں نے کہا آج میں ابوبکر سے سبقت لے جاؤں گا۔ چنانچہ میں گھر میں گیا اور آدھا مال لا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آنحضور نے دریافت کیا۔ "بال بچوں کے لیے کیا باقی چھوڑا"؟ میں نے کہا "اس کے برابر"۔ ابوبکر گھر کا تمام اثاثہ لے آئے۔ آپ نے "ابوبکر! گھر میں کیا باقی چھوڑا"۔ عرض کیا ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس ۔ صدیق کے لیے ہے خدا و رسول بس

حضرت عمر فرماتے ہیں۔ "میں نے کہا اس کے بعد میں کبھی ابوبکر کا مقابلہ نہیں کروں گا"۔

ترمذی میں مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ "جس قوم میں ابوبکر موجود ہوں ان کو چاہئے کہ ابوبکر کے سوا اور کسی کو امام مقرر نہ کریں"۔

حضرت عثمان کا ایک ہزار اونٹ کو جنگ کے لیے تیار کرنا سرگوشی کے صدقہ سے کئی گنا بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ جہاد پر خرچ کرنا فرض ہے بخلاف ازیں خفیہ بات چیت سے پہلے صدقہ ادا کرنا "نجوی" کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ جو شخص آنحضور سے خفیہ بات چیت نہ کرنا چاہتا ہو اس پر صدقہ دینا واجب نہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ایک شخص ایک بیل کو ہانکنے لیے جا رہا تھا اور اس پر بوجھ لاد رکھا تھا۔ بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "مجھے اس لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ بلکہ میں کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ لوگوں نے گھبرا کر کہا۔ حیرت ہے کہ بیل کس طرح بات چیت کرنے لگ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اور ابوبکر و عمر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں"۔ حالانکہ ابوبکر و عمر وہاں موجود نہ تھے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری کے یہاں ایک مہمان آیا۔ گھر میں صرف بچوں کی خوراک تھی۔ بیوی کو کہا بچوں کو سلا کر دیا گل کر دو اور جو کچھ ہے مہمان کو پیش کر دو۔ بیوی نے یونہی کیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ حشر ۹)

(وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے رہیں)

یہ نجوی کی نسبت بہت بڑا کام ہے۔

امامت علی کی انیسویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"امامت علی کی انیسویں دلیل یہ آیت ہے۔

وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (زخرف - ۴۵)

ابن عبدالبر و ابونعیم نے روایت کیا ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالے نے سب انبیاء کو جمع کر کے فرمایا اے محمد! ان سے پوچھئے کہ تمہاری بعثت کس بات پر عمل میں آئی تھی؟ انہوں نے کہا اس بات کی شہادت پر کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں نیز آپ سچے نبی ہیں اور علی آپ کے امام و خلیفہ ہیں۔ اس روایت سے صراحۃً حضرت علی کی امامت کا اثبات

ہوتا ہے"۔

بلاشبہ یہ روایت اور اس کے نظائر و امثال سب کذب ہیں اور اگر یہ روایت کذب نہ بھی ہوتی۔ جب بھی اثبات صحت سے قبل استدلال کرنا ناروا تھا۔ سخت حیرت ہے کہ جو چیز اصل ایمان میں داخل نہیں اس کے بارے میں انبیاء سے کیونکر پوچھا جائے گا؟ اس بات پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر ایک شخص آنحضور پر ایمان رکھتا اور آپ کی اطاعت کرتا ہو وہ مر جائے اور اسے علم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر و علی کو پیدا کیا تھا تو عدم علم سے اس کے ایمان کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ صحابہ میں سے ایک (حضرت علی) پر ایمان لانا انبیاء کے لیے ناگزیر ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے صرف یہ عہد لیا تھا کہ اگر ان کی زندگی میں مبعوث ہو کر آجائیں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا ہوگا حضرت ابن عباس نے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۸۱ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ کی تفسیر میں یہ بات کہی ہے۔ مزید براں شیعہ نے جس آیت سے استدلال کیا ہے اس میں یہ بات مذکور نہیں کہ "انبیاء سے پوچھیں کہ انہیں کس بات پر مبعوث کیا گیا ہے"؟ بخلاف ازیں آیت میں انبیاء سے یہ بات دریافت کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم نے کچھ اور بھی معبود مقرر کیے ہیں جن کی پرستش کی جائے"؟

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"امامت علی کی بیسویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (سورۃ الحاقۃ - ۱۲)

ثعلبی کی تفسیر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے علی! میں نے خدا سے یہ دعا کی تھی کہ وہ تیرے کانوں کو ایسا بنا دے۔ اسی طرح ثعلبی نے بطریق ابونعیم ذکر کیا ہے۔ یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس میں حضرت علی منفرد تھے۔ لہٰذا وہی امام ہوں گے"

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ جہاں تک زیر نظر آیت کا تعلق ہے اس میں جملہ بنی آدم سے خطاب کیا گیا ہے ایک شخص سے خطاب نہیں ہے اس لیے کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کو کشتی میں سوار کرنا عظیم ترین نشانی ہے۔ بے شک حضرت

علی کے گوش حق نیوش حضرت ابوبکر و عمر اور امت کے باقی لوگوں کی مانند تھے اس بات کو کون تسلیم کر سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حسن و حسین اور عمار و ابو ذر کے کان آواز حق کو سننے والے نہ تھے۔ بتائیے اب تفرد و افضلیت کی کونسی بات رہی؟ شیعہ کے بیان کردہ مقدمات اسی طرح بے بنیاد ہیں جس طرح متقدمین شیعہ کے براہین و دلائل بے حقیقت ہیں ایسے دلائل کو وہی شخص تسلیم کر سکے گا جو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر چکا ہو یا صاحب بدعت و عصبیت ہو۔ اسی لیے یہ مقولہ زبان زد خاص و عام ہے کہ شیعہ عقل و نقل اور دین و مذہب سے بے گانہ اور حکومت و سلطنت سے عاری ہیں

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"حضرت علی کے امام ہونے کی اکیسویں دلیل آیت قرآنی "ھل اتی" ہے۔
مفسر ثعلبی نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن و حسین بیمار پڑ گئے تو ان کے نانا اور عام لوگ بیمار پرسی کے لیے آئے۔ لوگوں نے حضرت علی سے کہا ابو الحسن! اپنے بچوں کے لیے نذر مانئے۔ آپ نے تین دن روزہ کی منت مانی۔ اسی طرح ان کی والدہ نے بھی نذر مانی۔ چنانچہ بچے تندرست ہو گئے۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا حضرت علی نے تین صاع جو قرض لیے حضرت فاطمہ نے اس سے پانچ روٹیاں پکائیں۔ حضرت علی نے آنحضور کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی اور گھر آئے۔ آپ کے سامنے کھانا رکھا گیا تو ایک مسکین آ کر کھانا طلب کرنے لگا۔ چنانچہ کھانا مسکین کو دے دیا اور شب و روز پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔ جب دوسرا روز ہوا تو حضرت فاطمہ نے کھانا پکایا۔ حضرت علی آئے اتنے میں ایک یتیم آ کر کھانا طلب کرنے لگا اس نے کہا: "اے محمد کے گھر والو! میں مہاجرین کی اولاد میں سے یتیم ہوں۔ میرے والد یوم العقبہ شہید ہو گئے تھے مجھے کھانا کھلاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دستر خوان پر سے کھانا کھلائے گا"۔ حضرت علی نے اسے کھانا دے دیا۔ اور دو دن اور دو راتیں پانی کے سوا کچھ نہ کھایا اسی طرح تیسرے دن ایک قیدی کو کھانا کھلایا۔ چوتھے روز جبریل یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔

هَلْ اَتیٰ عَلَی الْاِنْسَانِ ۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی گوناگون اوصاف کے حامل تھے یہ ان کے امام ہونے کی دلیل ہے۔

امامت علی کی اکیسویں دلیل

ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کی صحت ثابت کرے یہ روایت بہ اتفاق محدثین موضوع ہے اس کے موضوع ہونے میں ذرہ بھر شبہ نہیں یہ روایت کسی قابل اعتبار مسند یا حدیث کی کتاب میں موجود نہیں۔ امام نسائی کی جمع کردہ کتاب "خصائص علی" میں صحیح و ضعیف ہر قسم کی روایتیں فضائل علی کے بارے میں جمع کی گئی ہیں۔ مگر یہ روایت اس میں بھی مذکور نہیں ۔ اسی طرح ابو نعیم کی کتاب الخصائص نیز ابن ابی خثمہ و جامع ترمذی میں فضائل علی کی ضعیف احادیث موجود ہیں مگر ان کتب میں سابق الذکر روایت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اصحاب السیر مثلاً ابن اسحاق نے بھی فضائل علی پر مشتمل احادیث ضعیفہ ذکر کی ہیں مگر یہ روایت بیان نہیں کی جو بہ اتفاق اہل نقل موضوع ہے۔

یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت علی و فاطمہ کا نکاح مدینہ میں ہوا اور سورۃ الدہر باتفاق مفسرین مکی ہے۔ اس سے سابق الذکر روایت کا کذب ظاہر ہو گیا۔

صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ البتہ بخیل کا مال ضرور نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ایفاءِ نذر کی تعریف کی ہے مگر نذر ماننے کو قابل تعریف فعل قرار نہیں دیا۔ جس طرح ظہار (بیوی سے یوں کہنا کہ تو میرے لیے اسی طرح ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) کوئی قابل تعریف فعل نہیں ہے مگر کوئی شخص جب ظہار کا مرتکب ہو اور کفارہ ادا کر دے تو یہ ایک ممدوح فعل ہے۔ حضرت فاطمہ کی کوئی لونڈی فضہ نامی نہیں تھی۔ بلکہ مدینہ بھر میں اس نام کی کوئی کنیز نہ تھی۔ یہ اسی طرح ہے جیسے "ابن عقب" ایک فرضی نام وضع کیا گیا ہے حالانکہ اس نام کا کوئی آدمی نہ تھا۔

بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ نے آں حضور سے ایک خادم طلب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ سوتے وقت سو مرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ یہ خادم سے بہتر ہے۔

علاوہ ازیں تین شب و روز بچوں کو کھانا نہ کھلانا خلاف شرع ہے اور ہلاکت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ آنحضور کا ارشاد ہے کہ "پہلے اپنے اہل و عیال کو کھلاؤ" نیز یہ کہ وہ سائل کو ایک روٹی دے کر بھی اطمینان دلا سکتے تھے پھر تمیم کا یہ قول کہ میرے والد یوم العقیہ شہید ہو گئے تھے صاف جھوٹ ہے اس لیے کہ عقبہ کی رات صرف آنحضور کی بیعت کی گئی تھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ خدا اس شخص کو رسوا کرے جس نے یہ واقعہ تصنیف کیا۔

مدینہ میں قیدی بھیک نہیں مانگا کرتے تھے بلکہ مسلمان ہر طرح ان کی ضروریات کی کفالت کیا کرتے تھے۔ لہذا یہ کہنا کہ ایک قیدی مدینہ میں بھیک مانگا کرتا تھا صاف جھوٹ ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب سب لوگوں کی نسبت غرباء کو زیادہ کھانا کھلایا کرتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شان میں فرمایا تھا "آپ کی سیرت و صورت میرے جیسی ہے"۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ لطف و احسان کے سلسلہ میں کوئی شخص حضرت جعفر سے بڑھ کر آنحضور کے نقش قدم پر نہیں چلا۔ تاہم جعفر علی کی نسبت افضل نہیں تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انفاق فی سبیل اللہ عام طور سے معروف ہے۔ ایسا انفاق آج کل ممکن ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ آنحضور نے فرمایا تھا۔ "میرے صحابہ کو برا نہ کہو مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو صحابہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی بائیسویں دلیل	امامت علی کی بائیسویں دلیل یہ آیت ہے۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (سورۃ الزمر۔ ۳۳)

ابونعیم مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ "صَدَّقَ بِہٖ" حضرت علی کے بارے میں ہے۔ یہ حضرت علی کی عظیم خصوصیت ہے لہٰذا آپ امام و خلیفہ ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں کہ اس ضمن میں مجاہد کا قول اگر ثابت ہو جائے تو بھی حجت نہیں حالانکہ مجاہد سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ صدق سے قرآن مراد ہے۔ اور "صَدَّقَ بِہٖ" کا مطلب یہ ہے کہ جو اس پر عمل کرے شیعہ کا قول جمہور مفسرین کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ اس آیت کے مصداق حضرت ابوبکر ہیں۔ ابن جریر طبری اور دیگر مفسرین نے یہ بات ذکر کی ہے۔ ابوبکر بن عبدالعزیز بن جعفر الفقیہ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ آیت حضرت ابوبکر کی شان میں نازل ہوئی معترض نے کہا۔ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ سن کر ابوبکر الفقیہ نے کہا "اس آیت سے اگلی آیات تلاوت کیجئے"۔ اس نے جب یہ آیت پڑھی۔ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا (الزمر۔ ۳۵) تو ابوبکر الفقیہ نے کہا "حضرت علی تمہارے نزدیک معصوم ہیں پھر ان سے کون سے گناہ دور کیے جائیں گے"۔ معترض لاجواب ہو گیا۔ جہاں تک آیت کے الفاظ کا تعلق ہے وہ عام ہیں اس میں ابوبکر و علی بھی شامل ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی کے امام ہونے کی تیئسویں دلیل یہ آیت ہے۔ هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ"۔ (سورۃ انفال۔ ۶۲)

ابونعیم حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ "عرش پر یہ لکھا ہے محمد میرے بندے اور رسول ہیں۔ میں نے علی سے ان کی تائید کی"۔ یہ حضرت علی کی عظیم فضیلت ہے لہٰذا آپ ہی امام تھے"۔

ہم پوچھتے ہیں کہ یہ روایت کہاں مذکور ہے؟ شیعہ نے ابونعیم کو اس روایت کا ناقل ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ اس نے اپنی کتاب "الفضائل" اور "الحلیہ" میں صحابہ کے جو مناقب و فضائل بیان کیے ہیں وہ اس کے خلاف ہیں۔ ہم خدا کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ یہ حضرت

ابوہریرہ پر یہ بہتان باندھا گیا ہے۔ ہمارے پاس اس کا واضح علم موجود ہے جس کو شیعہ ہمارے دلوں سے زائل نہیں کر سکتے۔ جو شخص علم الآثار سے بیگانہ ہے وہ ہمارے زمرہ میں داخل نہیں۔ ہم ضعیف اقوال و آثار کو اسی طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح ایک ماہر نقاد قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سکہ کھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی اور مومنوں کی نصرت و تائید سے مؤید کیا اور مومنوں کے دلوں میں الفت پیدا کر دی"۔

یہ آیت اس بات پر نص قاطع کی حیثیت رکھتی ہے کہ جمیع صحابہ سے آنحضور کو مؤید فرمایا گیا تھا اس کو حضرت علی کے ساتھ مختص قرار دینا اس آیت کی تحریف ہے یہ بدیہی بات ہے کہ دین اسلام کا قیام صرف ابوبکر و علی کی اعانت کا رہین منت نہ تھا۔ بلکہ سب مہاجرین و انصار قیام دین کے سلسلہ میں آپ کے دست و بازو بنے تھے۔

امامت علی کی چوبیسویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی چوبیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الانفال۔ ۶۴) ابونعیم کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی لہٰذا وہی امام برحق ہوں گے"۔

ہم شیعہ سے اس روایت کی صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ اے نبی! آپ کے لیے اور آپ کی پیروی کرنے والے اہل ایمان کے لیے خدا کی مدد کافی ہے۔ جیسے شاعر کا قول ہے ؎

فَحَسْبُكَ وَالضَّحَّاكَ سَيْفٌ مُّهَنَّدٌ

(تمہارے اور ضحاک کے لیے صرف شمشیر براں کافی ہے)

اس کی وجہ یہ ہے کہ "حَسْبُ" مصدر ہے۔ مضاف ہونے کی صورت میں مستحسن یہ ہے کہ اعادہ جار کے ساتھ اس پر عطف ڈالا جائے۔ اعادہ جار کے بغیر شاذ و نادر

ہی اس پر عطف ڈالا جاتا ہے۔ بعض عارفین نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اے نبی! اللہ تعالے اور مومن آپ کے لیے کافی ہیں"۔ اس صورت میں "مَنِ اتَّبَعَکَ" رفعی حالت میں ہوگا اور اس کا عطف لفظ اللہ پر ہوگا"۔

یہ اتنی بڑی غلطی ہے کہ اس سے کفر لازم آتا ہے اس لیے کہ صرف اللہ تعالے ساری مخلوقات کے لیے کافی ہے۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں

وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران - ۱۷۳)

(انہوں نے کہا اللہ تعالے ہمارے لیے کافی ہے اور وہ عمدہ کارساز ہے)

اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ "مَنِ اتَّبَعَکَ" فاعل ہے اور اللہ پر معطوف ہے تو بھی یہ حضرت علی کے ساتھ مختص نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ نزول آیت کے وقت آپ کی پیروی کرنے والے بے شمار مومن موجود تھے۔ کوئی دانشمند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جہاد کفار میں آنحضور کے لیے صرف حضرت علی ہی کافی تھے۔ خدانخواستہ آپ کی اعانت کے لیے حضرت علی کے سوا اگر دیگر صحابہ موجود نہ ہوتے تو اسلام کا بول بالا نہ ہوتا۔ مکہ میں آنحضور کے ساتھ حضرت علی کے علاوہ چند صحابہ موجود تھے تاہم دین کا بول بالا نہ ہو سکا بلکہ دین کو غلبہ اسی وقت حاصل ہوا جب آپ نے مدینہ میں ہجرت فرمائی۔ غور کیجئے حضرت علی کی امداد کے لیے لشکر جرار موجود تھا تاہم آپ حضرت معاویہ سے شام کا ملک چھین نہ سکے۔

شیعہ کے جہل و ظلم کا اندازہ لگائیے کہ یہ دو متضاد باتوں کو جمع کر دیتے ہیں ایک جانب حضرت علی کو قدرت و شجاعت کے اعتبار سے اکمل البشر قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محتاج تھے۔ دین اسلام کی توسیع و اشاعت بھی ان کے خیال میں حضرت علی کی رہین منت تھی۔ دوسری جانب یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی ظہور اسلام کے بعد عجز و نیاز کا زندہ پیکر بن گئے تھے اور آپ نے تقیہ کر رکھا تھا یہ بات کس قدر اعجوبۂ روزگار ہے کہ جو شخص اسلام کی کمزوری اور قلت افراد کے زمانہ میں مشرکین

بلکہ جن وانس سب پر غالب تھا۔ ایک باغی گروہ کے مقابلہ میں کیونکہ عاجز آگیا اور اس کو زیر نہ کرسکے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی کہ حضرت علی تنہا مشرکین کو زیر نہیں کرسکتے تھے۔

شیعہ حضرت علی کی جن لڑائیوں کا تذکرہ کرتے ہیں ان سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے وہ سب جھوٹ اور شیعہ کی وضع کردہ ہیں خدا ان کے گھڑنے والے کو رسوا کرے۔ روافض کے اس فعل کی نظیر نصاریٰ کا یہ طرز عمل ہے کہ وہ ایک طرف حضرت عیسٰی کو الٰہ قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ان کے دشمنوں نے ان کی تذلیل کی ان کے سر پر کانٹے رکھے اور انہیں سولی پر چڑھایا۔ حضرت مسیح واویلا کرتے رہے مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ اگر حضرت مسیح کو یہ تکلیف خدا کی مرضی سے دی جارہی تھی تو یہ ایک طاعت وعبادت تھی جو یہود بجالا رہے تھے۔ بنا بریں وہ مدح وستائش کے مستحق تھے نہ کہ مذمت کے۔ یہ عظیم ترین کفر وجہالت ہے۔

عام شیوخ وفقراء بھی اسی قسم کے تضاد میں مبتلا ہیں ایک طرف وہ بلند بانگ دعاوی کرتے نہیں تھکتے اور دوسری طرف ضعف وعجز کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالٰی بروز قیامت تین آدمیوں پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ اس سلسلہ میں آپ نے تنگدست متکبر کا ذکر کیا۔ ایک روایت میں عیالدار متکبر کے الفاظ ہیں ایک مفلس وقلاش آدمی کے اظہار فخر وغرور کا طرز وانداز یہ ہے کہ جب وہ کبر وغرور پر اترے تو اپنے آپ کو خدا کا جانشین قرار دے اور یہ کہے کہ میرے سوا نہ کوئی رب ہے اور نہ رسول۔ اس کا انجام یہ ہو کہ وہ بھیک مانگنے پر اتر آئے اور لوگوں سے روٹی کے ٹکڑے طلب کرتا پھرے یا امراء کے دروازہ پر جا دستک دے۔

اللہ تعالٰی فرماتے ہیں۔

"جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنایا ان کی مثال ایک مکڑی جیسی ہے جس نے ایک گھر بنایا ہو اور سب سے کمزور ترین گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے اے کاش! کہ انہیں معلوم ہوتا" (العنکبوت۔ ۴۱)

متکبر آخر کار ہمیشہ ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔
"ان پر ذلت و رسوائی چھاگئی تھی وہ جہاں بھی ہوں مگر یہ کہ وہ خدا کی پناہ میں ہوں یا لوگوں کی پناہ میں آجائیں۔ وہ مورد غضب الٰہی ہوئے اور ان پر مسکینی چھاگئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آیات خداوندی کے ساتھ کفر کرتے انبیاء کو بلاوجہ تہ تیغ کرتے خدا کے نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے (سورہ آل عمران۔ ۱۱۲)
مذکورہ صدر آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ جہل (غلو) اور اباطیل کے سامنے سر نیاز جھکانا نصاریٰ کا طریق کار ہے اور کبر و حسد، انکار حق اور ذلت و نقبہ دین یہود ہے مگر روافض فرقہ ہائے یہود و نصاریٰ دونوں کے اعمال قبیحہ کو سموئے ہوئے ہیں اور ان سے تمسک کرتے ہیں۔ خداوند کریم ہمیں اور ان کو ہدایت کی توفیق بخشے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی چھبیسویں دلیل

"امامت علی کی چھبیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (المائدہ۔ ۵۴)
ثعلبی کہتے ہیں یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی دیگر صحابہ سے افضل تھے لہٰذا وہی امام و خلیفہ ہوں گے"۔
ہم کہتے ہیں کہ یہ ثعلبی پر افترا ہے۔ ثعلبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتا ہے۔
"علی بن ابی طالب و قتادہ و حسن کا قول ہے کہ اس سے ابوبکر اور ان کے رفقاء مراد ہیں۔ مجاہد اس سے اہل یمن مراد لیتا ہے"۔
اس میں شک نہیں کہ حضرت علی ان لوگوں میں سے تھے جو اللہ و رسول کے محبوب بھی تھے اور محب بھی۔ حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر سابقین و متاخرین بھی انہیں میں شامل تھے۔ کیا کوئی دانشمند آدمی بقائمی ہوش و حواس کہہ سکتا ہے کہ آیت کریمہ "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ"۔ ایک واحد شخص (حضرت علی) کے بارے میں نازل ہوئی حالانکہ سب جمع کے الفاظ ہیں۔
شیعہ مصنف لکھتا ہے

"امامت علی کی چھبیسویں دلیل یہ آیت ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ (الحدید-۱۹)

امام احمد ابن ابی لیلیٰ سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے باپ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"صدیق تین ہیں (۱) حبیب نجار مومن آل یاسین (۲) حزقیل مومن آل فرعون (۳) علی بن ابی طالب اور یہ تینوں میں سے افضل ہیں۔ یہ ایسی فضیلت ہے جو آپ کی امامت پر دلالت کرتی ہے"۔

ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی صحت ثابت کرے۔ اس لیے کہ امام احمد کی جمیع مرویات صحیح نہیں ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ یہ روایت امام احمد نے نہ اپنی "المسند" میں ذکر کی ہے اور نہ "الفضائل" میں القطیعی نے الکدیمی سے اس کا اضافہ کیا ہے حسن بن محمد نے عمرو بن جمیع سے سنا اس نے ابن ابی لیلےٰ سے اس نے اپنے بھائی سے اس نے عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ سے اس نے اپنے باپ سے مرفوعاً یہ روایت بیان کی ہے۔ القطیعی کہتے ہیں ہماری طرف عبد اللہ بن غنام نے لکھا کہ ہم نے حسن بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ نابینا سے سنا اس نے عمرو بن جمیع سے سنا۔ محدث ابن عدی عمرو بن جمیع کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ وضاع ہے۔ اسی طرح الکدیمی معروف بالکذب ہے۔ لہذا یہ روایت ساقط عن الاحتجاج ہے۔

علاوہ ازیں احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی کے سوا کچھ اور لوگ بھی صدیق کے لقب سے ملقب تھے۔ بخاری ومسلم میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کوہ احد پر چڑھے۔ آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ پہاڑ کانپا تو آپ نے فرمایا احد کے پہاڑ ٹھہر! تجھ پر تو صرف ایک نبی ہے ایک صدیق اور دو شہید۔ (بخاری ومسلم)

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور راست گوئی کا قصد کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کے نزدیک

صدیق لکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو بھی صدیقہ کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ قرآن کریم میں بعض انبیاء کو بھی صدیق کہا گیا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی شان میں فرمایا

اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (سورہ مریم۔۵۶) (آپ راستباز نبی تھے)

عام لوگوں کے حق میں فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ (الحدید۔۱۹)

(جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ صدیق ہیں)

یہ آیت اس امر کی مقتضی ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور رسولوں پر ایمان رکھتا ہے وہ صدیق ہے۔ اگر صدیق امام ہی کو کہتے ہیں تو اس نام کے سب سے زیادہ حقدار حضرت ابوبکر تھے اور انہی کے لیے یہ نام اور امامت و خلافت ثابت ہے۔

امامتِ علی کی ستائیسویں دلیل

شیعہ مصنف رقمطراز ہے۔

"امامت علی کی ستائیسویں دلیل درج ذیل آیت ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً (سورۃ البقرہ۔۲۷)

ابونعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے پاس چار درہم تھے۔ ایک درہم رات کے وقت خرچ کیا ایک دن کے وقت ایک خفیہ اور ایک علانیہ۔ چونکہ حضرت علی اس فضیلت میں منفرد ہیں لہٰذا امام بھی وہی ہیں"۔

ہم اس نقل کا ثبوت طلب کرتے اور دعوی کرتے ہیں کہ یہ صریح کذب ہے۔ یہ آیت ہر خرچ کرنے والے کے بارے میں عام ہے۔ پھر اس سے صرف حضرت علی کیونکر مراد لیے جاسکتے ہیں۔ جن کے پاس خرچ کرنے کے لیے مال بھی نہ تھا۔ مزید براں خرچ کرنے کا جو واقعہ حضرت علی کی جانب منسوب کیا گیا ہے وہ ممتنع ہے۔ کیونکہ ایسا تو وہ شخص کرے گا جو آیت کے مفہوم سے یکسر بیگانہ ہے اس لیے کہ

سرًّا وعلانیۃً خرچ کرنے اور شب و روز کرنے میں تضاد نہیں پایا جاتا بلکہ جو شخص ظاہر و پوشیدہ خرچ کرتا ہے وہ شب و روز بھی خرچ کرتا ہے اور جو شب و روز بھی خرچ کرتا ہے وہ سرًّا وعلانیۃً بھی خرچ کرتا ہے۔ نیز یہ کہ ایک درہم کو دو نصف درہم میں بھی تقسیم کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ آپ کے پاس چار درہم ہوں۔ اگر یہ مطلب مراد ہوتا تو عبارت یوں ہوتی "وَسِرًّا وَعَلَانِیَۃً"۔

بلکہ سرًّا وعلانیہ دونوں لیل و نہار (شب و روز) میں بھی داخل ہیں خواہ سرًّا وعلانیۃً مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہوں یا حال ہونے کی وجہ سے۔ نیز یہ کہ اگر حضرت علی نے ایسا کیا بھی تھا تو ہر شخص کے لیے خرچ کرنے کا دروازہ کھلا ہے اور تا قیامت کوئی ممانعت نہیں پھر اس میں حضرت علی کی کیا خصوصیت ہے؟ اور اگر چار درہم خرچ کرنا حضرت علی کی خصوصیت ہے تو حضرت علی اس سے افضل الامت کیسے ہوگئے؟

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی اٹھائیسویں دلیل

"امامت علی کی اٹھائیسویں دلیل امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی وہ روایت ہے جو انہوں نے ابن عباس سے نقل کی ہے۔ کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا آیا ہے حضرت علی اس کے رئیس و امیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اصحاب رسول کو معتوب کیا ہے مگر علی کا ذکر ہمیشہ مدحیہ انداز میں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی سب سے افضل اور لہٰذا امام ہیں"

ہم شیعہ سے زیر تبصرہ روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں یہ روایت امام احمد نے نقل نہیں کی بلکہ یہ القطیعی کے اضافات میں سے ہے اور ابن عباس سے مروی ہے۔ دراصل یہ ابن عباس پر افترا ہے۔ اس کی سند میں زکریا نامی راوی ثقہ نہیں ہے۔ بخلاف ازیں ابن عباس سے تبواتر منقول ہے کہ آپ شیخین کو حضرت علی سے افضل قرار دیتے تھے۔ ابن عباس نے کئی دفعہ حضرت علی کو معتوب کیا اور ان کی مخالفت کی۔ جب حضرت علی نے زنادقہ کو نذر آتش کیا تھا تو ابن عباس نے فرمایا اگر علی کی جگہ میں ہوتا تو زنادقہ کو جلانے کی بجائے ان کو قتل کر دیتا کیونکہ آنحضور

نے فرمایا ہے کہ کسی کو عذاب خداوندی میں مبتلا نہ کرو"۔ (بخاری)

علاوہ ازیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا میں مدح کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں
یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سورۂ صف - ۲)

(اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو)

اگر حضرت علی اس آیت کے رئیس و امیر ہیں تو اس عتاب میں وہ بھی داخل ہیں لہٰذا اس سے تمہاری وہ روایت غلط ٹھہری کہ علی کا ذکر ہمیشہ مدحیہ انداز میں کیا ہے قرآن کریم میں فرمایا۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَاءَ (الممتحنۃ - ۱)

(اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ)

یہ طے شدہ بات ہے کہ یہ آیت حاطب بن ابی بلتعہ کے بارے میں نازل ہوئی اس کے امثال و نظائر بہت ہیں۔ اس قسم کے الفاظ میں سب اہل ایمان شامل ہیں بعض آیات ایسی ہیں جن پر حضرت علی سے پہلے دوسرے لوگوں نے عمل کیا اور بعض ایسی بھی ہیں جن پر حضرت علی عمل نہ کر سکے۔

شیعہ کا یہ قول کہ "صحابہ کو معتوب کیا اور حضرت علی کی ہمیشہ مدح فرمائی"۔ صریح کذب ہے۔ قرآن کریم میں حضرت ابوبکر کو کہیں بھی معتوب نہیں کیا گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا تھا۔ "اے لوگو! ابوبکر کا حق پہچانو اس نے مجھے کبھی تکلیف نہیں پہنچائی"۔

آنحضور کا یہ خطبہ آپ کے اس خطبہ کے بالکل برعکس ہے جو آپ نے اس وقت دیا جب حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ایسا خطبہ آپ نے ابوبکر کے بارے میں کبھی نہیں دیا تھا۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس طرح حضرت ابوبکر و عمر آنحضور کے ساتھ بڑے بڑے کاموں میں حصہ لیا کرتے تھے حضرت علی ایسے کاموں میں مداخلت نہیں کیا کرتے تھے یہ دونوں بزرگ آپ کے وزیر کی حیثیت رکھتے تھے اور حضرت علی ان کے بچوں کی طرح

صغیر السن تھے۔

بخاری و مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ جب حضرت عمر نے شہادت پائی تو حضرت علی آئے اور فرمایا۔

"مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اٹھائیں گے۔ میں آنحضور سے اکثر سنا کرتا تھا "میں اور ابوبکر و عمر داخل ہوئے" "میں اور ابوبکر و عمر نکلے" "میں اور ابوبکر و عمر گئے" (بخاری و مسلم)

نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی امور میں حضرت علی سے مشورہ لیا کرتے تھے واقعہ افک کے بارے میں جب آپ نے حضرت علی سے مشورہ لیا تو انہوں نے کہا "آپ پر کوئی تنگی نہیں حضرت عائشہ کے سوا عورتیں اور بھی بہت ہیں لونڈی سے پوچھئے وہ آپ کی تصدیق کرے گی"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس ضمن میں حضرت اسامہ سے مشورہ لیا تو انہوں نے کہا "حضرت عائشہ آپ کی بیوی ہیں ہمیں ان کے متعلق بھلائی ہی کا علم ہے"

چنانچہ قرآن کریم میں حضرت عائشہ کی براءت نازل ہوئی اور آپ کو حکم دیا گیا کہ عائشہ کو اپنے گھر میں آباد رکھیں جیسا کہ اسامہ نے مشورہ دیا تھا۔

اس واقعہ میں علی کے مشورہ کو ٹھکرا کر حضرت اسامہ کے مشورہ کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ حضرت علی کا مرتبہ حضرت اسامہ سے یقیناً بڑا ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

امامت علی کی انتیسویں دلیل یہ آیت ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ"۔

صحیح بخاری میں کعب بن عجرہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اہل بیت پر صلوٰۃ کیسے بھیجیں؟ فرمایا یوں کہو اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ اور بلاشبہ حضرت علی سب آل محمد میں افضل ہیں لہذا آپ اولیٰ بالامامت ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں یہ صحیح ہے کہ حضرت علی آل محمد میں شامل ہیں مگر یہ آپ کی خصوصیت نہیں بلکہ جمیع بنی ہاشم اس میں داخل ہیں مثلاً حضرت عباس اور ان کی اولاد نیز حارث بن عبد المطلب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں حضرت رقیہ و ام کلثوم جو یکے بعد دیگرے حضرت عثمان کے نکاح میں آئیں۔ علاوہ ازیں آپ کی ازواج مطہرات بھی آل میں شامل ہیں۔

بخاری و مسلم میں ہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ علی الآل عام ہے اور حضرت علی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ اس میں عقیل بن ابی طالب اور ابو سفیان بن حارث بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ حضرات کے صلوٰۃ وسلام میں داخل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نہ داخل ہونے والوں کی نسبت افضل ہیں اور نہ یہ کہ وہ امامت کے اہل ہیں۔ امامت کے ساتھ مختص ہونا ایک جداگانہ بات ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت کہ حضرت عمار و مقداد اور ابو ذر رضی اللہ عنہم کی فضیلت اہل سنت کے نزدیک ایک طے شدہ بات ہے حالانکہ صلوٰۃ علی الآل میں وہ شامل نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت عقیل و عباس اور ان کی اولاد آل میں داخل ہے حالانکہ سابق الذکر باتفاق اہل سنت و شیعہ متاخر الذکر کی نسبت افضل ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت عائشہ اور دیگر ازواج بھی اس میں داخل ہیں۔ حالانکہ خواتین امامت و خلافت کی صلاحیت سے محروم ہیں اور بہ اتفاق اہل سنت و شیعہ باقی لوگوں سے افضل بھی نہیں۔

بنا بریں یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو حضرت علی میں بھی پائی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں میں بھی نیز یہ کہ جو لوگ اس سے متصف ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں افضل نہیں ہیں جو اس صفت سے موصوف نہیں۔

شیعہ مصنف کی تیسویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "امامت علی کی تیسویں دلیل یہ آیت ہے

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ" (الرحمن - ۱۹)

ثعلبی حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ "بَحْرَیْن" سے حضرت علی و فاطمہ مراد ہیں۔ "بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ لؤلؤ اور مرجان سے حضرت حسن و حسین مراد ہیں۔ یہ فضیلت صحابہ میں سے اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی لہذا حضرت علی اولی بالامامت ہوں گے۔"

جواباً گذارش ہے کہ یہ تفسیر قرآن نہیں بلکہ تحریف و ہذیان ہے جیسے ملاحدہ نے وضع کیا ہے اس کی نظیر نام نہاد اہل سنت جہلاء کا یہ قول ہے کہ:

(۱) صابرین سے مراد محمد ہیں۔

(۲) صادقین سے ابوبکر مراد ہیں۔

(۳) القانتین سے عمر مراد ہیں۔

(۴) المستغفرین بالاسحار یعنی حضرت علی۔

(۵) مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ یعنی حضرت ابوبکر

(۶) اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔ یعنی حضرت عمر

(۷) رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ یعنی حضرت عثمان

(۸) رُكَّعًا سُجَّدًا۔ یعنی حضرت علی

(۹) وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ۔ یعنی حضرت ابوبکر و عمر

(۱۰) وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ۔ یعنی حضرت عثمان

(۱۱) وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ۔ یعنی حضرت علی

(۱۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یعنی حضرت ابوبکر

(۱۳) وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یعنی حضرت عمر

(۱۴) وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ یعنی حضرت عثمان

(۱۵) وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ یعنی حضرت علی۔

(۱۶) شیعہ کے نزدیک فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ سے حضرت علی مراد ہیں۔

(۱۷) اَلشَّجَرَةُ الْمَلْعُوْنَةُ۔ یعنی بنو امیہ[۱]۔

[۱] لاہور کی قادیانی جماعت نے اپنے مجلہ Light مورخہ ۱۶/۶/۱۹۳۳ء میں سب مسلمانوں کو الشجرۃ الملعونہ سے تعبیر کیا ہے ۱۲ ([illegible])

شیعہ مصنف کا یہ بیان از سرتاپا دروغ ہے اور حضرت ابن عباس نے یہ بات یقیناً نہیں کہی۔ مزید براں سورہ الرحمن مفسرین کے اجماع کے مطابق مکی سورت ہے۔ اور حضرت علی و فاطمہ کا نکاح مدینہ میں ہوا۔ لغت عرب ان معانی کی متحمل نہیں ہوسکتی جو بیان کیے گئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آل ابراہیم کے اکابر حضرت اسمٰعیل و اسحاق آل علی کی نسبت یقیناً افضل ہیں۔ لہٰذا آیت سے آل علی کی خصوصیت و افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

"مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ" کے الفاظ سورہ فرقان میں بھی مذکور ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا (الفرقان/۵۳)

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ "مِلْحٌ اُجَاجٌ" سے وہ کیا مراد لیتے ہیں حضرت علی یا حضرت فاطمہ؟ علاوہ ازیں "یَبْغِیَانِ" کے لفظ سے مستفاد ہوتا ہے کہ برزخ ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے مانع ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مدح نہیں بلکہ مذمت ہے۔

امامت علی کی اکتیسویں۳۱ دلیل

شیعہ مصنف رقمطراز ہے "امامت علی کی اکتیسویں دلیل یہ آیت ہے

وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (الرعد/۴۳)

ابن الحنفیہ کہتے ہیں کہ اس سے حضرت علی مراد ہے۔ ثعلبی حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضور سے پوچھا "علم الکتاب کس کے پاس ہے"؟ فرمایا علی کے پاس"۔

ہم شیعہ سے صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں نیز یہ کہ علماء کی مخالفت کے باوصف یہ روایت کیونکر حجت ہوسکتی ہے؟ ہمارا دعوی ہے کہ یہ دروغ اور بے بنیاد بات ہے اگر اس سے حضرت علی مراد ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ آنحضور کفار کے خلاف اپنے چچازاد بھائی حضرت علی سے استشہاد کر رہے تھے حالانکہ حضرت علی اگر آپ کی رسالت کی شہادت دیتے بھی تو یہ کفار کے حق میں حجت نہ ہوتی اور نہ وہ اس دلیل کے سامنے گردن جھکا لینے کے

لیے تیار تھے وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ علی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آپ ہی نے سکھایا ہے یا وہ آپ ہی کی زبان سے بول رہے ہیں اور اس طرح آپ خود ہی اپنے حق میں شاہد بن گئے۔ کفار یہ بھی کہتے کہ علی نے آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ حضرت علی کے پاس اس تہمت کا کیا جواب تھا؟

البتہ اگر اہل علم اہل کتاب اپنے انبیاء کی متواتر روایات کی بنا پر شہادت دیں تو ان کی شہادت آنحضور کے حق میں نفع بخش ہوگی۔ یہ شہادت اسی طرح ہے جیسے حضرات انبیاء بذات خود شہادت دیں اس لیے کہ جو بات انبیاء سے بتواتر منقول ہو وہ ان کی ذاتی شہادت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات کی بنا پر امم سابقہ کے حق میں شہادت دیں گے علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعدد مقامات پر اہل کتاب کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ (الاحقاف-۱۰)

بنی اسرائیل کے ایک گواہ نے گواہی دی)

نیز فرمایا۔

"اگر آپ کو قرآن کے بارے میں کوئی شبہ لاحق ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں"۔ (سورۂ یونس-۹۴)

فرض کیجئے حضرت علی نے گواہی دی تھی پھر آپ افضل الصحابہ کیونکر ہو گئے؟

گواہی دینے والوں میں حضرت عبداللہ بن سلام و سلمان و کعب الاحبار وغیرہ لوگ شامل تھے حالانکہ یہ باقی صحابہ سے افضل نہ تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامت علی کی تیئسویں دلیل یہ آیت ہے يَوۡمَ لَا يُخۡزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ (التحریم-۸)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جو شخص سب سے پہلے جنتی لباس پہنے گا وہ

حضرت ابراہیم ہیں کیونکہ آپ خلیل ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے کہ آپ خدا کے برگزیدہ ہیں اور حضرت علی دونوں کے درمیان جنت کی سیر کرینگے"۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ حضرت ابن عباس نے یہ بات یقیناً نہیں فرمائی۔ خدا اس کے واضع کو ذلیل وخوار کرے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں اور اس میں سب مومن شامل ہیں لہٰذا اس سے فرد واحد کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامت علی کی تینتیسویں ۳۳ دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ" (البینہ۔۷)

ابو نعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"اس آیت میں تم اور تمہارے شیعہ کا ذکر کیا گیا ہے جو بروز قیامت شاداں و فرحاں آئیں گے اور تمہارے دشمن غصہ سے بھرے ہوئے ہوں گے جب حضرت علی "خیر البریۃ" (مخلوقات میں سے بہتر) ہوئے تو امام بھی وہی ہوں گے"۔

ہم شیعہ سے اس کی صحت کے اثبات کا مطالبہ کرتے اور پورے جزم و وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ روایت موضوع ہے۔ علاوہ ازیں یہ ان لوگوں کے قول سے متصادم ہے جو کہتے ہیں کہ "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے خارجی وناصبی لوگ مراد ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی سے دوستی لگانے والا کافر ہے وہ اس کی دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (المائدہ۔۴۴)

(جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے)

وہ کہتے ہیں جو شخص خدا کے دین میں اشخاص ورجال کو حکم بناتا ہے وہ خدا کے نازل کردہ حکم کے بغیر فیصلہ کرتا ہے لہٰذا وہ کافر ہوگا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ (المائدہ۔۵۱)

(تم میں سے جو کفار کے ساتھ دوستی لگائے گا وہ انہی میں سے ہوگا)

ان کا قول ہے کہ حضرت عثمان اور ان کے ہمنوا آنحضور کی درج ذیل حدیث کے مطابق مرتد ہو چکے تھے۔ آنحضور نے فرمایا۔

بہت سے آدمیوں کو میرے حوض سے دور کر دیا جائے گا جس طرح اجنبی اونٹ کو دور کر دیا جاتا ہے۔ میں کہوں گا یا رخدایا! یہ میرے صحابی ہیں یہ میرے صحابی ہیں اس کے جواب میں کہا جائے گا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کون سی باتیں ایجاد کر لی تھیں۔

نیز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے بعد کافر نہ ہو جاؤ کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو"۔

اگرچہ خوارج کے یہ دلائل باطل ہیں مگر روافض کے براہین و دلائل ان سے بڑھ کر لغو و بے بنیاد ہیں۔ مشہور ادیب جاحظ نے مروانیہ کے لیے ایک کتاب تحریر کی تھی اس میں ایسے دلائل پیش کیے ہیں جن کو شیعہ توڑ نہیں سکتے البتہ اہل سنت ان کا تار و پود بکھیر سکتے ہیں۔

امامت علی کی چونتیسویں دلیل[۳۴]

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی کی چونتیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا (الفرقان ۵۴)

ثعلبی ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے کر دیا چونکہ یہ فضیلت کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔ لہذا حضرت علی ہی امام و خلیفہ ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں یہ ابن سیرین پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔ سورہ فرقان مکی ہے اور حضرت فاطمہ کی شادی سے عرصہ دراز قبل نازل ہو چکی تھی۔ آیت کے الفاظ عام ہیں اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ اگر یہ حضرت علی کی شادی پر مشتمل ہے تو حضرت عثمان اور ابو العاص کی شادی کو بالاولی شامل ہوگی۔

کیونکہ آنحضور کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان کے نکاح میں آئی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ آیت حضرت ابوبکر و عمر کے آنحضور کے ساتھ رشتۂ مصاہرت پر بھی مشتمل ہو گی کیونکہ آنحضور نے دونوں حضرات کی بیٹیوں کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ جب آپ کا رشتۂ مصاہرت چاروں خلفاء کے ساتھ ثابت ہو گیا تو پھر حضرت علی کی خصوصیت منتفی ہو گئی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامت علی پر پینتیسویں دلیل یہ آیت ہے۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔ (سورۃ التوبۃ۔ ۱۱۹)

اس آیت میں ان لوگوں کی معیت و رفاقت کو واجب قرار دیا گیا ہے جن کا صادق ہونا واضح ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک معصوم ہی صحیح معنی میں صادق ہو سکتا ہے اور معصوم خلفاء اربعہ میں سے صرف حضرت علی ہی تھے۔ ابن عباس کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔"

ہم کہتے ہیں کہ صدیق صیغۂ مبالغہ ہے۔ حضرت ابوبکر کثیر دلائل کی بنا پر صدیق تھے لہٰذا حضرت ابوبکر اس آیت کے اولیں مصداق ہیں۔ بنا بریں حضرت ابوبکر کی معیت و رفاقت ہمارے لیے ضرور ہوئی اور اگر خلفاء اربعہ کو صدیق قرار دیا جائے تو حضرت علی کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب حضرت کعب۔ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر سکے اور راست بیانی کی وجہ سے ان کی توبہ قبولیت سے مشرف ہوئی تھی۔ یہ احادیث صحیحہ میں مذکور ہے۔

علاوہ ازیں آیت کے الفاظ ہیں "وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" نہ کہ كُونُوا مَعَ الصَّادِقِ اگر حضرت علی مراد ہوتے تو واحد کا صیغہ چاہئے تھا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ راست باز لوگوں کی طرح راست گفتاری کے عادی بنو۔ جھوٹوں کی رفاقت اختیار نہ کرو۔ قرآن کریم میں فرمایا۔ "وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ" (سورہ بقرہ۔ ۴۳)

ایسی آیات میں معیت سے یہ مراد نہیں لیا گیا کہ ہر بات میں ان کا انداز اختیار کرو یہاں تک کہ مباحات و ملبوسات میں بھی ان کی رفاقت کے دائرہ سے باہر نہ نکلو۔ جیسے کہا جاتا ہے "کُنْ مَعَ الْاَبْرَارِ" یا "کُنْ مَعَ الْمُجَاهِدِیْنَ" اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس وصف میں ان کے شریک و سہیم بن جاؤ۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامتِ علی چھتیسویں ۳۶ دلیل یہ آیت قرآنی ہے۔ وَارْکَعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ (سورہ البقرہ۔ ۴۳)

"حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ آیت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ ان دونوں نے سب سے پہلے نماز پڑھی۔ اور رکوع کیا تھا"۔

ہم اس کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مزید براں یہ آیت سورہ بقرہ میں ہے جو مدنی ہے۔ آیت کا سیاق و سباق بنی اسرائیل سے متعلق ہے اس سے ثابت ہوا کہ نزول آیت سے قبل رکوع کرنے والے بے شمار لوگ تھے۔ اور اگر آنحضور اور حضرت علی دونوں مراد ہوتے تو یہ لفظ "مَعَ الرَّاکِعِیْنَ" تثنیہ کے وزن پر ہوتے۔ جمع کے صیغہ سے صرف تثنیہ مراد نہیں لیا جاسکتا۔ لہٰذا اس سے سب رکوع کرنے والے مراد ہوں گے۔

علاوہ ازیں حضرت مریم کو حکم دیا گیا تھا وَارْکَعِیْ مَعَ الرَّاکِعِیْنَ (آل عمران۔ ۴۳) نیز یہ کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ اور حضرت علی کے ساتھ رکوع کرنا مراد ہوتا تو یہ حکم دونوں کی وفات کے ساتھ ختم ہوتا۔ اگرچہ لوگوں کا قول ہے کہ حضرت ابوبکر نے آنحضور کے ساتھ مل کر حضرت علی سے پہلے نماز ادا کی تھی۔

امامتِ علی کی سینتیسویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی کے منصب امامت پر فائز ہونے کی سینتیسویں ۳۷ دلیل یہ آیت ہے۔ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ (طٰہٰ۔ ۲۹)

ابونعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں

میلاد علی کا ہاتھ پکڑا اور چار رکعت نماز ادا کی۔ پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی "اے اللہ! حضرت موسیٰ نے بھی تجھ سے دعا کی تھی اور میں بھی دعا کرتا ہوں کہ میرے کنبہ میں سے علی کو میرا وزیر مقرر کر دے اس کے ساتھ میری کمر کو مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے" ابن عباس کہتے ہیں میں نے ایک پکارنے والے کو سنا وہ پکارتا تھا "اے احمد! آپ کی دعا قبول ہوئی"۔

ہم کہتے ہیں محدثین کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے، پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ابن عباس ہجرت سے قبل مکہ میں ایک شیر خوار بچہ سے زیادہ نہ تھے۔ پھر وہ اس واقعہ میں کیونکر شریک ہو سکتے ہیں؟ ہجرت کے بعد اللہ تعالے نے آنحضور کو ہر طرح قوت و شوکت عطا کر دی تھی اور آپ ایسی مدد سے بے نیاز ہو گئے تھے اگر شیعہ یہ کہیں کہ حضرت علی آنحضور کے اسی طرح شریک و سہیم تھے جیسے ہارون حضرت موسیٰ کے ساتھ شریک تھے تو اس سے حضرت علی کا نبی ہونا ثابت ہوتا ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ نبوت کے علاوہ دوسرے کاموں میں آپ کے ساتھ شریک تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضور اپنی زندگی میں بذات خود امت کا انتظام و انصرام سنبھالنے سے قاصر تھے اور دوسروں کی مدد کے محتاج تھے۔ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کس بات میں حضرت علی کو آنحضور کا شریک ٹھہراتے ہیں؟

امامت علی کی اڑتیسویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "امامت علی کی اڑتیسویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (الحجر۔ ۴۷)

مسند احمد میں حضرت زید بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے کہ میں مسجد نبوی میں پہنچ کر آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس میں انہوں نے آنحضور کی مواخات کا واقعہ بیان کیا اس کے آخر میں ہے کہ آنحضور نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا میں نے تجھے (حضرت علی کو) اپنے لیے منتخب کیا ہے آپ کو مجھ سے وہی تعلق ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھا البتہ میرے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جائیگا

آپ میرے بھائی اور وارث ہیں آپ میرے جنت کے محل میں میرے ہمراہ ہوں گے.
اور وہاں میری بیٹی بھی ہوگی پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ
اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت علی کو آپ نے مواخات (بھائی چارہ) کے لیے
مختص کیا تھا۔ لہذا آپ ہی امام ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت امام احمد نے ذکر نہیں کی بلکہ یہ القُطیعی کے اضافات سے
ہے جو ساقط الاحتجاج ہیں۔ القطیعی نے زید بن ابی اوفی سے روایت کیا ہے اور اس
میں یہ الفاظ بھی ہیں جو رافضی نے قصداً حذف کر دیے ہیں "حضرت علی نے عرض کیا یا
رسول اللہ! میں آپ سے کیا ورثہ پاؤں گا؟ آپ نے فرمایا وہی ورثہ جو انبیاء سابقین
دوسروں کو دیا کرتے تھے۔ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول"۔

یہ روایت باتفاق محدثین کذب ہے بلکہ مواخات پر مشتمل تمام روایات جھوٹی ہیں
یہ مواخات آپ نے مہاجرین کے درمیان قائم نہیں کی تھی بلکہ مہاجر و انصار کے
درمیان۔ پھر روایت کے یہ الفاظ "آپ میرے وارث ہیں" درست نہیں۔ اس لیے کہ
اگر اس سے مالی وراثت مراد لی جائے تو ان کا یہ قول باطل ٹھہرے گا کہ حضرت فاطمہ آپ
کی وارث ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب آنحضور کے چچا عباس موجود تھے تو حضرت علی
چچا زاد بھائی ہونے کی صورت میں کیونکر وارث ہو سکتے تھے؟ پھر یہ کہ جب آنحضور
کے چچا زاد اور بھی موجود تھے تو ان میں سے صرف حضرت علی کس طرح وارث قرار پا
سکتے تھے؟

اور اگر علمی وراثت یا امامت و خلافت مراد ہے تو شیعہ کا احتجاج آیت کریمہ۔ وَ
وَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ" (النمل۔ ۱۶) اور آیت يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ
(سورہ مریم۔ ۶) سے باطل ٹھہرا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علمی ورثہ عطا کیا تھا اس میں حضرت علی کی کوئی
تخصیص نہیں بلکہ آنحضور کا یہ فیض سب صحابہ کے لیے عام تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی
اللہ عنہ نے آنحضور سے سن کر ستر سورتیں یاد کی تھیں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ علم مال کی

طرح کسی فرد لبشر کے ساتھ مختص نہیں ہوتا بلکہ ایک کے حصہ میں جو ورثہ آتا ہے دوسرا بھی اس سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ دونوں میں تزاحم و تصادم کا کوئی امکان نہیں۔ مال کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ بخاری و مسلم میں آنحضور سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید سے کہا "آپ میرے بھائی اور مولیٰ ہیں"۔ جب حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت زید کی لڑکی کا رشتہ طلب کیا تھا تو اسے مخاطب کر کے کہا "کیا میں آپ کا بھائی نہیں؟ زید نے کہا یہ ٹھیک ہے" تمہاری بیٹی میرے لیے حلال ہے"۔

روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا "اسلامی برادری سب سے بہتر ہے"۔

احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا "میری خواہش ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا"۔ صحابہ نے عرض کیا "کیا ہم آپ کے بھائی نہیں"؟ فرمایا نہیں! تم میرے صحابہ ہو میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد پیدا ہوں گے وہ بلا دیکھے مجھ پر ایمان لائیں گے"۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات۔۱۰) (سب مومن بھائی بھائی ہیں)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "سب خدا کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ"۔ مطلق مواخات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بھائی چارہ قائم کرنے والوں میں کامل تماثل و تشابہ پایا جاتا ہے۔ بنا بریں اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ آنحضور نے حضرت علی کو اپنا بھائی بنایا تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سب سے افضل ہوں گے۔ اور امام بھی"۔

حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور نے فرمایا اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابو بکر کو بناتا۔

حدیث صحیح میں منقول ہے کہ آنحضور سے دریافت کیا گیا تھا "حضور! آدمیوں میں سے کون آپ کو عزیز تر ہے"؟ فرمایا "ابو بکر"۔

تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا۔ "امت محمدی میں آنحضور کے بعد سب سے افضل ابو بکر ہیں پھر عمر" (بخاری)

مذکورہ صدر نصوص کے بارے میں وہی شخص شک و شبہ کا شکار ہو سکتا ہے جو جاہل ہو یا جس پر بدعت کا غلبہ ہو۔ امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ صحابہ و تابعین میں سے کسی نے بھی حضرت ابوبکر و عمر کو افضل الصحابہ قرار دینے میں اختلاف نہیں کیا"۔

امام ابوحنیفہ و مالک و احمد و ثوری و لیث و اوزاعی و اسحاق و داؤد اور ابن جریر و ائمہ سلف و خلف رحمہم اللہ سب یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوبکر و عمر کی افضلیت پر اجماع نقل کیا اور فرمایا کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ابن جریر و مسلم بن خالد زنجی و ابن عُیینہ اور علماء مکہ کی بھی یہی رائے ہے۔ علاوہ ازیں ابن ابی عَروبہ دونوں حمّاد و دیگر علماء بصرہ نیز ابن ابی لیلیٰ و شریک اور شیعہ کے مرکز کوفہ کے علماء بھی اسی کے قائل ہیں۔

مصری علماء میں سے عمر بن حارث و لیث بن سعد و ابن وہب اور شامی علماء میں سے اوزاعی و سعید بن عبد العزیز اور لاتعداد علماء یہی رائے رکھتے تھے۔

امامتِ علی کی انتالیسویں دلیل [۳۹]

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

امامتِ علی کی انتالیسویں دلیل یہ آیت ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ (الاعراف۔ ۱۷۲)

کتاب الفردوس میں حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حضرت علی کو امیر المومنین کے لقب سے کب ملقب کیا تھا تو ان کی فضیلت کا انکار نہ کرتے۔ آپ اس وقت اس لقب سے نوازے گئے تھے جب آدم کی تخلیق ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ"۔ فرشتوں نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میں تمہارا رب ہوں۔ محمد تمہارے نبی ہیں اور علی تمہارے امیر ہیں۔ یہ روایت اظہار مدعا میں بالکل صریح ہے"۔

یہ روایت سب محدثین کے نزدیک جھوٹی ہے۔ قرآن کریم کی ذکر کردہ آیت میں

صرف یہ الفاظ ہیں "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى"۔ اس میں نہی و امر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ صرف توحید کے معاہدہ پر مشتمل ہے۔ اسی آیت میں فرمایا گیا ہے۔ مبادا تم کہو کہ ہمارے اکابر نے شرک کا ارتکاب کیا تھا اور ہم ابھی کم عمر تھے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت صرف میثاق توحید پر مشتمل ہے اس میں میثاق نبوت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا باقی امور تو الگ رہے۔ علاوہ ازیں چونکہ یہ عہد سب لوگوں سے لیا گیا تھا۔ لہذا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علی جملہ انبیاء از نوح تا محمد کے بھی امیر ہیں ظاہر ہے کہ یہ ایک احمقانہ بات ہے۔ اس لیے کہ یہ انبیاء حضرت علی کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے ان کے امیر کیونکر قرار پا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ حضرت علی اپنے اہل زمانہ کے امیر ہو سکتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت علی پہلے لوگوں کے بھی امیر تھے اور ان لوگوں کے بھی جو آپ کے بعد پیدا ہوئے تو کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ احمق رافضی عقلاء یہود سے بھی گیا گذرا ہے جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا تھا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (سورۃ الجمعۃ - ۵)

ایک عاقل شخص سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ شیعہ کے یہ دلائل عقلاً و شرعاً باطل ہیں اس کی نظیر ابن عربی اور اس کے امثال کا یہ قول ہے کہ

"انبیاء کرام معرفت خداوندی کا علم خاتم الاولیاء (ابن عربی اپنی کتاب "الفصوص" میں لکھتے ہیں کہ میں خاتم الاولیاء ہوں) کے سینہ سے اخذ کیا کرتے تھے جو ان کے ایک مدت بعد پیدا ہوا تھا"۔

ابن عربی کے ہمنوا اولیاء کے بارے میں اسی طرح غلو سے کام لیتے ہیں جیسے شیعہ اماموں کے بارے میں۔ حیرت بالائے حیرت ہے کہ شیعہ مصنف ایسے دلائل کو "صریح فی الباب" قرار دیتا ہے بھلا ایسے دلائل کو کوئی شخص تسلیم کر سکتا ہے؟

امامت علیؓ کی چالیسویں دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے

امامت علی کی چالیسویں دلیل یہ آیت ہے۔ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ (التحریم-۴)

مفسرین کا اجماع ہے کہ "صالح المومنین" سے حضرت علی مراد ہیں۔ ابو نعیم حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے سنا آپ نے فرمایا۔ اس سے حضرت علی مراد ہیں۔ حضرت علی کی اس خصوصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افضل ہیں لہذا آپ ہی امام ہوں گے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضمن میں اجماع کا دعویٰ افترا پر مبنی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس روایت پر اجماع تو کجا کتب تفسیر میں اس کے برعکس مذکور ہے۔ چنانچہ مجاہد اور دیگر علماء اس سے حضرت ابوبکر و عمر مراد لیتے ہیں۔ ابن جریج نے یہ نقل کیا ہے۔ بعض علماء اس سے انبیاء مراد لیتے ہیں اس سے حضرت علی کی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ حدیث یقیناً کذب ہے۔

مزید برآں "وصالح المؤمنین" کے الفاظ عام ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ آنحضور نے فرمایا "فلاں گھر والے میرے دوست نہیں ہیں۔ میرا دوست صرف اللہ تعالیٰ اور نیکوکار مومن ہیں"۔

نیز یہ کہ مذکورہ صدر آیت میں نیک نہاد اہل ایمان کو رسول اللہ کا "مولیٰ" قرار دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ مولیٰ سے موالی مراد ہے۔ لہذا جو شخص بھی نیک دل مومن ہو گا وہ آنحضور کا قطعی طور پر موالی (دوست) ہوگا۔ اگر وہ آپ سے دوستی نہ لگاتا ہو تو وہ صالح مومنین میں سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بعض اوقات مومن صالح نہ ہونے کے باوجود بھی آپ سے دوستی رکھتا ہے۔

شیعہ کا یہ قول کہ وَالْآيَاتُ فِي هٰذَا الْمَعْنٰى كَثِيرَةٌ۔ ہم کہتے ہیں شیعہ کے متروکہ دلائل اسی طرح کمزور اور بودے ہوں گے جس طرح ان کے ذکر کردہ دلائل بے کار ہیں۔ آخر جھوٹ کی کیا کمی ہے؟ مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کو باطل پر پھینک مارتا ہے اور

وہ مغلوب ہو کر دب جاتا ہے۔

قاسم بن زکریا کی حکایت مشہور ہے۔ وہ عباد بن یعقوب اسدی رافضی کے پاس گیا۔ عباد بن یعقوب شیعہ ہونے کے باوجود بڑا راست گفتار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "دریا کس نے کھودا؟" میں نے کہا۔ "اللہ تعالےٰ نے"۔ اس نے کہا۔ "تم سچ کہتے ہو مگر یہ بتاؤ دریا کس نے کھودا؟" میں نے کہا۔ "پھر آپ ہی ارشاد فرمائیں"۔ عباد نے کہا۔ "حضرت علی نے کھودا تھا"۔ پھر اس نے پوچھا۔ "دریا کو کس نے جاری کیا؟" میں نے کہا۔ "آپ ہی فرمائیں"۔ عباد نے کہا "حسین نے جاری کیا"۔ عباد نابینا تھا۔ میں نے اس کے پاس ایک تلوار اور ڈھال دیکھی تو پوچھا یہ کس کی ہے؟ عباد کہنے لگا۔ "میں نے مہدی کے ساتھ لڑنے کے لیے یہ تلوار رکھی ہے"۔

جب میں اس کی باتیں سن کر فارغ ہوا تو اس کے پاس آیا۔ اس نے پوچھا۔ "دریا کس نے کھودا؟" میں نے کہا "حضرت معاویہ نے اور اسے عمرو بن عاص نے جاری کیا" پھر میں کود کر باہر نکلا اور چلایا۔ "اس دشمن خدا فاسق کو قتل کر دو"۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں یہ حکایت صحیح ہے اسے ابن مظفر نے قاسم سے روایت کیا ہے۔ محمد بن جریر کہتے ہیں میں نے عباد بن یعقوب کو یہ کہتے سنا۔ "جو نماز میں ہر روز اعداء اہل بیت پر تبرا نہ بھیجے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"تیسرے باب میں احادیث نبویہ سے استدلال کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک وہ حدیث جو سب لوگوں نے بیان کی ہے کہ جب آیت کریمہ "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ"۔ نازل ہوئی تو آنحضور نے تمام بنی عبد المطلب کو ابو طالب کے گھر میں جمع کیا۔ ان میں دو عورتیں اور چالیس مرد تھے۔ آپ نے ان کے لیے کھانا پکایا۔ یہ کھاؤ پیؤ آدمی تھے۔ مگر یہ سب تھوڑے سے کھانے سے سیر ہو گئے۔ اور انہیں پتہ نہ چل سکا کہ انہوں نے کیا کھایا ہے۔ آپ کی اس اعجاز نمائی سے ان پر واضح ہو گیا کہ آپ نبوت میں سچے ہیں۔ آپ نے فرمایا "اے بنی عبد المطلب! اول تو مجھے اللہ تعالےٰ نے

سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا ہے مگر خاص طور سے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور فرمایا ہے "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ"۔ (اور اپنے اقارب و اعزہ کو ڈرائیے)

میں تمہیں دو ہلکے پھلکے کلمات کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ جن کا زبان پر جاری کرنا بڑا آسان ہے اور جو میزان اعمال میں بڑے بوجھل ہوں گے۔ تم ان دونوں کلمات کی برکت سے عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے اور جملہ اقوام عالم تمہارے زیر نگین ہو جائیں گی۔ ان کلمات کی بنا پر تم جنت میں جاؤ گے اور جہنم سے رہائی پاؤ گے۔ وہ کلمات یہ ہیں

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

جو شخص میری اس دعوت کو قبول کرے گا اور میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی میرا وصیّ میرا وزیر اور میرے بعد میرا خلیفہ ہو گا۔ حضور کا یہ ارشاد گرامی سن کر حضرت علی نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں اس کے لیے تیار ہوں"۔

امامت علی پر احادیث نبویہ سے احتجاج

ہم شیعہ سے مذکورہ صدر روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ روایت نہ سنن میں ہے نہ مغازی میں اور نہ مسانید میں پھر شیعہ کا یہ قول کس حد تک صحیح ہے کہ "یہ روایت سب لوگوں نے بیان کی ہے" خلاف ازیں یہ موضوع حدیث[۱] ہے۔ بنی عبد المطلب کی تعداد نزول آیت کے وقت چالیس نہ تھی آپ کی زندگی

---

[۱] اس کے واضع کا نام عبد الغفار بن قاسم بن فہد ابو مریم کوفی رافضی ہے۔ شیعہ کی اکثر تصانیف میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ المامقانی نے اپنی کتاب "تنقیح المقال" ج ۲ ص ۱۵۸-۱۵۹ پر بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ جلد ۴ ص ۸۱ پر لکھا ہے کہ یہ اجماعاً متروک راوی ہے۔ ابن المدینی فرماتے ہیں کہ یہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ نسائی اور حاتم نے اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ ابن حبان البستی فرماتے ہیں کہ یہ شراب کے نشہ سے سرشار رہا کرتا تھا۔ امام احمد فرماتے ہیں اس کی اکثر روایات باطل ہوا کرتی ہیں۔ سماک بن حرب اور ابو داؤد نے اسے کاذب قرار دیا ہے اس روایت کی سند میں ایک اور رافضی بھی ہے اس کا نام عبد اللہ بن عبد القدوس ہے وہ سابق الذکر شیعہ

میں بھی وہ اس تعداد کو نہ پہنچ سکے۔ بنو عبد المطلب حضرت عباس و ابو طالب و حارث و ابو لہب کی اولاد میں سے تھے۔ ابو طالب کے چار بیٹے تھے۔ علیؓ۔ جعفرؓ۔ عقیلؓ۔ طالب۔ آخر الذکر نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ حضرت عباس کے بچے ابھی شیر خوار تھے یا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ حارث کے تین بیٹے تھے۔ ابو سفیانؓ۔ ربیعہؓ۔ نوفلؓ۔ ابو لہب کے بھی دو یا تین بیٹے تھے۔ بنا بریں تمام بنو ہاشم اس وقت دس سے کچھ زیادہ تھے۔ پھر چالیس کیسے ہو گئے؟

شیعہ کا یہ قول کہ "بنو ہاشم بڑے پیٹو تھے"۔ صاف جھوٹ ہے۔ بنو ہاشم بسیار خوری کے مرض کا شکار نہ تھے۔ بلکہ ان میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا۔

اس روایت کے الفاظ رکیک ہیں جن کی بنا پر دل اس کے باطل ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ آپ نے چالیس آدمیوں کو یہ پیشکش کی تھی۔ فرض کیجئے کہ اگر وہ سب آدمی اس دعوت کو قبول کر لیتے تو ان میں سے خلیفہ کون قرار پاتا؟

نیز یہ کہ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس سے اس کی تردید ہوتی ہے فرماتے ہیں جب آیت کریمہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو جمع کر کے ان سے اجتماعی اور انفرادی طور پر بات چیت کی۔ آپ نے فرمایا۔ "اے بنی کعب اپنی جان دوزخ سے بچا لو۔ اے بنی عبد شمس۔ اے بنی عبد المطلب اپنی جان دوزخ سے بچا لو۔ اے فاطمہ! اپنی جان دوزخ سے بچا لے۔ میں تم سے عذاب خداوندی کو روک نہیں سکوں گا تاہم قرابت داری کا حق ادا کرتا رہوں گا"۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ جب زیر تبصرہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ "اے گروہ قریش! اپنے آپ کو عذاب خداوندی سے بچا لو میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔ اے بنی عبد المطلب اے میری پھوپھی صفیہؓ! اور اے میری بیٹی فاطمہ! میرا مال جتنا چاہو لے لو میں تمہیں عذاب خداوندی سے نہیں چھڑا سکوں گا۔ امام مسلم نے یہ روایت قبیصہ بن مخارق و زہیر و عائشہ سے نقل کی ہے۔ اس میں ہے کہ آنحضور نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر

یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔

امامتِ علی کے اثبات میں دوسری حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے "امامت علی کے اثبات میں دوسری حدیث یہ ہے کہ جب آیت کریمہ یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (المائدہ ۶۷) نازل ہوئی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کے مقام پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "اے لوگو! کیا میں تمہیں تمہاری جانوں کی نسبت زیادہ قریب نہیں؟ انہوں نے کہا "کیوں نہیں"۔ آپ نے فرمایا جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ اے اللہ! جو علی سے دوستی رکھے اس سے دوستی رکھ اور جو علی سے عداوت رکھتا ہو اس سے عداوت رکھ جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اسے تنہا چھوڑ دے تو بھی اسے تنہا چھوڑ دے۔ حضرت عمر نے فرمایا بڑی خوشی کی بات ہے آپ (حضرت علی) میرے اور سب مومن مردوں اور عورتوں کے مولیٰ ہیں"۔

ہم قبل ازیں اس حدیث کا جواب دے چکے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم کے واقعہ سے بہت عرصہ پہلے نازل ہوئی۔ اگرچہ یہ سورہ مائدہ کی آیت ہے۔ اسی سیاق میں فرمایا "وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ"۔ جس کا تعلق آغاز اسلام سے ہے۔ امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل نے المسند میں اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کیا ہے۔ روایت کے یہ الفاظ وَالِ مَنْ وَالَاہُ بلاشبہ جھوٹے ہیں۔ اثرم نے سنن میں امام احمد سے نقل کیا ہے کہ عباس نے امام احمد سے دریافت کیا کہ حسین[۵] الاشقر نے دو حدیثیں روایت کی ہیں۔ ایک مذکورہ صدر روایت اور دوسری یہ کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو کہا آپ کو مجھ سے اظہار بیزاری کرنے پر مجبور کیا جائے گا مجھ سے بیزار نہ ہونا"۔ یہ سن کر امام احمد نے ان حدیثوں کو تسلیم نہ کیا اور فرمایا یہ جھوٹ ہیں۔

---

[۵] اس کا نام حسین بن حسن اشقر کوفی ہے اس کا ترجمہ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۴۹ پر مذکور ہے بخاری فرماتے ہیں "فیہ نظر"۔ ابوزرعہ کہتے ہیں یہ منکر الحدیث ہے ابوحاتم کہتے ہیں یہ ضعیف راوی ہے جوزجانی فرماتے ہیں یہ صحابہ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ یہ ۲۰۸ھ میں فوت ہوا ۱۲

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔
فضائل علی کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیثیں صحیح ہیں۔
(۱) آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے۔
(۲) غزوۂ خیبر کے موقع پر حضور کا یہ ارشاد کہ کل میں ایک شخص (حضرت علی) کو جھنڈا دوں گا۔
(۳) آنحضور کا یہ عہد کہ مومن حضرت علی سے محبت کرتے اور منافق بغض رکھتے ہیں آخر الذکر حدیث انصار مدینہ کے بارے میں بھی وارد ہوئی ہے۔
باقی رہی حدیث "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ" تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ روافض جو احادیث حضرت علی کے فضائل و مناقب کے بارے میں بیان کرتے ہیں وہ سب موضوع ہیں جیسا کہ علم حدیث سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے۔
اگر سوال کیا جائے کہ محدث ابن حزم نے مذکورہ صدر قول میں حدیث "اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ"، نیز حدیث "مباہلہ" اور حدیث "الکساء" ذکر نہیں کیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک یہ احادیث بھی ضعیف ہیں۔
اس کا جواب یہ ہے کہ ابن حزم نے احادیث صحیحہ سے وہ حدیثیں مراد لی ہیں جن میں صرف علی کی مدح و ستائش کی گئی ہے اور کسی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ الفاظ آنحضور نے غدیر خم کے مقام پر ارشاد فرمائے بھی تھے تو آپ کی مراد امامت و خلافت ہرگز نہ تھی اس لیے کہ ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا ایسی اہم بات بڑے واضح انداز میں بیان کرنا چاہیئے نہ کہ مجمل و مبہم الفاظ میں۔
مَولیٰ کا لفظ عربی زبان میں وَلی کا مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔
اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (المائدہ ۵-۵۵)
اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ سب مومن خدا کے دوست ہیں۔ یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ موالات (دوستی لگانا) معادات (دشمنی رکھنا) کی ضد ہے۔ یہ جانبین سے استوار کی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ دوستی لگانے والے دونوں

فریق مرتبہ و مقام کے لحاظ سے برابر ہوں۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک فریق عالی منصب ہو اور اس کا دوسرے سے دوستی لگانا اس کے فضل و احسان پر مبنی ہو اس کے مقابلہ میں ایک فریق فروتر درجہ رکھتا ہو اور اس کا فریق اعلیٰ سے دوستی لگانا طاعت و عبادت کا درجہ رکھتا ہو۔ بنا بریں اللہ و رسول اور حضرت علی کے مولیٰ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ سب مومنوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ گویا مولیٰ کا لفظ اندریں صورت موالات سے ہوگا جو معادات کی ضد ہے۔ مومن جو اللہ و رسول کے ساتھ موالات قائم کرتے ہیں وہ بھی معادات کی ضد ہے۔ دوستی لگانے کا یہ حکم سب مومنوں کے لیے ہے۔ حضرت علی ایک بلند پایہ مومن ہیں اور وہ باقی مومنوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ بنا بریں اس میں خوارج و نواصب کی تردید پائی جاتی ہے۔ حدیث یہ کہیں مذکور نہیں کہ علی کے سوا مومنوں کا کوئی دوست ہی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قبیلہ اسلم و غفار و جہینہ و مزینہ اور قریش و انصار یہ سب میرے دوست ہیں۔ اللہ و رسول کے سوا ان کا کوئی دوست نہیں۔

امامتِ علی کے اثبات میں تیسری حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے "امامت علی کے اثبات میں تیسری حدیث یہ ہے۔

"اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ"۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون کو یہ مرتبہ عطا کیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کے قائم مقام تھے اور اگر ان کے بعد زندہ رہتے تو ان کے خلیفہ ہوتے۔ نیز اس لیے کہ حضرت موسیٰ کی غیوبت میں وہ آپ کے قائم مقام رہ چکے تھے۔ حضرت موسیٰ کی وفات کی صورت میں جب آپ کی غیوبت طوالت اختیار کر لیتی تو آپ کا خلیفہ ہونا زیادہ قرین عقل و قیاس تھا"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث بخاری و مسلم میں موجود ہے آنحضور نے یہ الفاظ غزوۂ تبوک کو جاتے وقت ارشاد فرمائے تھے۔ آنحضور کی عادت تھی کہ جب

مدینہ سے باہر جاتے تو کسی کو اپنا نائب مقرر کر دیا کرتے تھے۔ غزوہ تبوک کو جاتے وقت کسی کو پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی۔ صرف وہی لوگ پیچھے رہے جو معذور تھے۔ یا منافق۔ تین صحابہ بھی آپ کے ہمراہ نہ جا سکے تھے۔ فتح مکہ اور حجۃ الوداع کو جاتے وقت بھی آپ نے اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ میں مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے یہ استخلاف اپنی نوعیت میں نرالا تھا۔ حضرت علی آنحضور کی طرف روتے ہوئے آئے اور عرض کیا۔ حضور! آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منافقین نے یہ گپ اڑائی تھی کہ محمد علی سے بغض رکھتے ہیں اس لیے ان کو جنگ میں ہمراہ نہیں لے جا رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو بتایا کہ میں نے تمہیں امین سمجھ کر اپنا نائب مقرر کیا ہے بغض کی بنا پر نہیں۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عدم موجودگی میں حضرت ہارون کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اسی طرح نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مطمئن کر دیا۔

مگر حضرت علی کا استخلاف حضرت ہارون کی خلافت ونیابت کی مانند نہ تھا۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ جب مناجات باری تعالے کے لیے کوہ طور پر گئے تھے تو اپنی عدم موجودگی میں ہارون کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ حضرت علی کو اس وقت مدینہ کا نائب مقرر کیا گیا تھا۔ جب کہ اہل اسلام آنحضور کی رفاقت میں جنگ کے لیے جا رہے تھے باقی رہا یہ کہ آنحضور کے الفاظ تھے "اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی" تو یاد رہے کہ ایسے الفاظ میں تشبیہ ہر لحاظ سے مقصود نہیں ہوتی اور یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مُشَبَّہ اور مُشَبَّہ بِہٖ دونوں بالکل مساوی ہیں۔

حدیث استخلاف کی توضیح

جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اساریٰ بدر کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا۔ تو حضرت ابوبکر نے فدیہ کا مشورہ دیا۔ اور حضرت عمر نے فرمایا کہ ان کو قتل کر دینا چاہیئے یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ اے ابوبکر! آپ کی مثال حضرت ابراہیم ایسی ہے جب انہوں

نے فرمایا "فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"
اور اے عمر آپ کی مثال حضرت نوح جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا "رَبِّ لَا تَذَرْ
عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا"۔

اس حدیث میں حضرت ابوبکر کو حضرت ابراہیم اور حضرت عمر کو حضرت نوح کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تشبیہ من کل الوجوہ ہے۔ بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ حضرت ابوبکر لطافت طبع اور نرم مزاجی میں حضرت ابراہیم کی طرح اور حضرت عمر اپنے طبعی تشدد میں حضرت نوح کی مانند تھے۔ حضرت علی کو ہارون کے ساتھ تشبیہ صرف اس بات میں دی گئی ہے کہ جس طرح ہارون موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ان کے قائم مقام قرار پائے تھے اسی طرح علی آنحضور کی عدم موجودگی میں ان کے نائب و خلیفہ تھے۔

یہ استخلاف حضرت علی کی خصوصیت نہیں ہے اور نہ ہی آپ کے دیگر استخلافات کی مانند ہے۔ آپ کے مقرر کردہ نائبین اس طرح نہیں تھے جیسے حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے خلیفہ تھے۔ حضرت علی کی تخصیص بالذکر لقب کے مفہوم سے ظاہر ہو رہی ہے۔ لقب دو قسم کا ہوتا ہے

(۱) وہ لقب جو جنس کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) وہ لقب جو عَلَم کا قائم مقام ہوتا ہے۔ مثلاً زید۔ یہ مفہوم نہایت کمزور ہے اسی لیے تمام علمائے اصول کا نظریہ یہ ہے کہ اس سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حضرت علی کو نبوت کے سوا باقی ہر بات میں ہارون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ باطل ہے۔ آنحضور کے ارشاد گرامی "اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ہَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی" سے واضح ہوتا ہے کہ آپ حضرت علی کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علی کو حضرت ہارون جیسا مرتبہ حاصل ہے۔ اور اگر حضرت علی بالکل حضرت ہارون کے مشابہ ہوتے تو ۹ھ میں آنحضور ان پر حضرت ابوبکر کو امیر مقرر نہ کرتے۔ چنانچہ حضرت علی حضرت ابوبکر کی اقتداء میں

نماز پڑھتے اور اطاعت کیا کرتے تھے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو خاص طور پر کفار کے عہد واپس کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ عربوں کے یہاں رسم تھی کہ عہد باندھنے اور توڑنے کے لیے یا حاکم خود جایا کرتا تھا یا اپنے کنبہ کا کوئی آدمی بھیجا کرتا تھا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "ہارون حضرت موسیٰ کی غیوبت میں ان کے قائم مقام تھے"۔ ہم کہتے ہیں کہ آنحضور نے اپنی موجودگی وعدم موجودگی میں حضرت علی کے سوا اور لوگوں کو بھی اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ لہٰذا استخلاف علی المدینہ حضرت علی کی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کو آپ اپنی زندگی میں بعض لوگوں کے لیے اپنا قائم مقام مقرر کر دیں وہ آپ کی وفات کے بعد آپ کا خلیفہ بھی ہو۔

امامتِ علی کی چوتھی دلیل

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امامت علی کی چوتھی دلیل یہ حدیث ہے۔ کہ آنحضور نے حضرت علی کو اپنا نائب مقرر کیا تھا حالانکہ آپ کی غیوبت کا زمانہ نہایت محدود تھا۔ لہٰذا علی آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے قائم مقام ہوں گے کیونکہ علی کے سوا کسی کی امامت وخلافت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔ نیز اس لیے کہ آنحضور نے حضرت علی کو استخلاف علی المدینہ کے منصب سے معزول نہیں کیا تھا۔ لہٰذا حضرت علی آپ کی وفات کے بعد بھی اس منصب پر فائز ہوں گے۔ جب مدینہ میں آپ کے نائب ہوں گے تو دیگر بلاد وامصار میں بھی یقیناً آپ کے خلیفہ ٹھہریں گے۔"

ہم جواباً کہتے ہیں کہ شیعہ کے دیگر دلائل کی طرح یہ دلیل بھی نہایت بودی اور تارِ عنکبوت کی طرح بے جان ہے اس کے متعدد جوابات ہیں۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے مطابق آنحضور نے اپنی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کو خلیفہ مقرر کیا تھا اور اگر شیعہ کہیں کہ آپ نے حضرت علی کو خلیفہ بنایا تھا۔ تو ہم کہیں گے کہ پھر فرقہ راوندیہ کا قول بھی صحیح ہونا چاہئے جو کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت عباس کو خلیفہ بنایا تھا۔ جو شخص بھی کماحقہ نقلی دلائل سے آگاہ ہے

وہ جانتا ہے کہ احادیث صحیحہ سے حضرت ابوبکر کا استخلاف ثابت ہوتا ہے نہ کہ حضرت علی یا عباس کا۔ اور اگر آپ نے کسی کو بھی خلیفہ مقرر نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام کا تقرر آپ نے امت کی رائے عامہ پر چھوڑ دیا تھا کہ جس کو چاہیں مقرر کرلیں۔

باقی رہا زندگی میں کسی کو اپنا قائم مقام بنانا تو یہ ایک قسم کی نیابت ہے اس کے لیے ہر امام کے عزم و قصد کا ہونا ضروری ہے اور موت کے بعد وہ خلیفہ بنانے کا مکلف ہی نہیں رہتا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ (المائدہ ۵-۱۱۷)

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت علی کو مدینہ کی امارت سے معزول نہیں[1] کیا تھا" ایک غلط بات ہے۔ اس لیے کہ جونہی آنحضور مدینہ وارد ہوئے حضرت علی خود بخود معزول ہو گئے۔ جس طرح آپ کے دیگر نائبین آپ کی تشریف آوری سے از خود اس منصب سے الگ ہو جایا کرتے تھے جس پر آپ ان کو اپنی عدم موجودگی میں مقرر فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے اس کے بعد حضرت علی کو کفار سے اظہار براءت کرنے کے لیے مکہ بھیجا تھا۔ نیز یمن میں عامل مقرر کیا اور حجۃ الوداع کے موقع پر ان سے ملے

امامت علی کی پانچویں حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "امامت علی کے اثبات میں پانچویں حدیث وہ ہے جو جمہور علماء نے روایت کی ہے کہ آنحضور نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ آپ میرے بھائی میرے وصی میرے خلیفہ اور میرے بعد میرے قرض

---

[1] حضرت علی کے امارت مدینہ سے معزول نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپس آنے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں حضرت علی کے محکوم ہوں گے۔ ممکن ہے شیعہ مصنف الوہیت علی کا قائل ہو اور اس کے نزدیک سرور کائنات کا حضرت علی کے زیر فرمان ہونا چنداں قابل اعتراض نہ ہو جیسا کہ اس کے پیشرو ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغۃ کا قول ہے ۱۲

کو ادا کرنے والے ہیں"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم شیعہ سے اس روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ جمہور علماء نے روایت ذکر کی ہے"۔ مبنی بر مبالغہ ہے۔ اگر شیعہ مصنف کی مراد اس سے علماء حدیث ہیں تو یہ کھلا ہوا افترا ہے اور اگر وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ابو نعیم و مغازلی یا خطیب خوارزم نے اسے روایت کیا ہے تو یہ روایت بالاتفاق حجت نہیں اور اس کا بطلان واضح ہے۔

محدث ابن الجوزی نے کتاب الموضوعات میں یہ روایت حضرت انس سے بیان کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علی بن ابی طالب میرا بھائی میرا وزیر میرے کنبہ میں سے میرا دوست اور میرے بعد میرے قرض کو ادا کرنے والا اور میرے وعدوں کو پورا کرنے والا ہے"۔ یہ روایت موضوع ہے۔ محدث ابن حبان فرماتے ہیں "مطر نامی راوی موضوعات روایت کرتا ہے اس سے روایت کرنا حلال نہیں"۔ ابن عدی کے واسطہ سے بھی یہ روایت اسی طرح بیان کی گئی ہے۔ اس روایت کا مدار مطر نامی راوی پر ہے اس میں "خلیفتی و وصیی" کے الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ "خلیفتی فی اہلی" کے الفاظ ہیں۔

امامت علی کے اثبات میں چھٹی حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "امامت علی کے اثبات میں چھٹی روایت حدیث مواخات ہے۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ مباہلہ والے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ حضرت علی کھڑے تھے اور آپ کو دیکھ رہے تھے آپ نے حضرت علی اور کسی شخص کے درمیان بھائی چارہ قائم نہ کیا۔ حضرت علی روتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ آنحضور نے فرمایا۔ "علی کہاں گئے؟" لوگوں نے کہا "روتے ہوئے چلے گئے" حضرت فاطمہ نے رونے کی وجہ پوچھی تو حضرت علی نے کہا "آپ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کی ہے اور کسی کو میرا بھائی نہیں بنایا"۔ حضرت فاطمہ نے

فرمایا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو رسوا نہیں کرے گا ہو سکتا ہے آنحضور آپ کو اپنا بھائی بنانا چاہتے ہوں"۔

حضرت بلال رضؓ کے بلانے پر علی آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے رونے کا سبب دریافت کیا یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" کیا تجھے یہ بات پسند نہیں کہ تو نبی کا بھائی قرار پائے"؟ حضرت علی نے کہا کیوں نہیں"؟ آنحضور نے علی کا ہاتھ پکڑا اور منبر کے پاس آ کر کہا"علی میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ ان کو مجھ سے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھا جس کا میں مولی ہوں علی اس کا مولی ہے حضرت عمر نے آگے بڑھ کر فرمایا۔ ابو الحسن! آپ میرے اور ہر مسلم کے مولیٰ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کی مواخات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افضل الصحابہ ہیں۔ لہٰذا آپ ہی امام و خلیفہ ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں یہ صریح جھوٹ ہے۔ مہاجرین و انصار کے مابین مواخات کا رشتہ آغاز ہجرت میں استوار کیا گیا تھا۔ جبکہ مباہلہ کا واقعہ ۹ھ میں پیش آیا درا صل مباہلہ وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ نصاریٰ نجران کو دعوت مباہلہ دی گئی تھی۔ انہوں نے مشورہ کی مہلت طلب کی۔ خلوت میں ایک دوسرے سے کہنے لگے یہ نبی ہیں اور جو قوم نبی سے مباہلہ کرتی ہے برباد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جزیہ دینا تسلیم کیا اور چلے گئے۔

ساتویں حدیث سے اثبات امامتِ علی

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ کہ "اس ضمن میں ساتویں حدیث حضرت علی کے ہاتھوں خیبر کا فتح ہونا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ مجھے کوئی ایسا شخص دکھاؤ جو اللہ و رسول کا محب بھی ہو اور محبوب بھی"۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت علی کو چاہتے ہیں۔ اس حدیث میں خوارج و امویہ کی تردید ہے۔ امام ابو الحسن اشعری اپنی کتاب "المقالات" میں لکھتے ہیں۔ حضرت علی کے کفر پر سب خوارج کا اجماع منعقد ہو چکا ہے"۔ اس حدیث میں حضرت علی کی کسی خصوصیت کو بیان نہیں کیا گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دیگر صحابہ کو بھی چاہتے ہیں۔ حضرت علی کے ذریعہ خیبر کا فتح ہونا ان

کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے نہ کہ افضل الصحابہ ہونے پر۔

امامتِ علی کے اثبات میں آٹھویں حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے جمہور نے روایت کیا ہے

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پرندہ لایا گیا تو آپ نے فرمایا "اے اللہ! اس پرندے کا گوشت کھانے کے لیے کسی ایسے شخص کو میرے پاس بھیج جو مجھے اور تجھے سب لوگوں میں سے عزیز تر ہو۔ اتنے میں حضرت علی تشریف لائے"۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث سب محدثین کے نزدیک جھوٹی اور موضوع ہے۔ مشہور محدث امام حاکم سے "حدیث الطیر" کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "یہ حدیث صحیح نہیں"۔ حالانکہ حاکم تشیع کی جانب منسوب ہے۔ مگر حاکم اور دیگر علماء حدیث مثلاً نسائی اور ابن عبدالبر کا تشیع تفضیلِ علی کی حد تک نہیں پہنچا۔ محدثین میں کوئی عالم ایسا نہ تھا جو حضرت علی کو حضرت ابوبکر و عمر سے افضل قرار دیتا ہو۔

دو ہی صورتیں ممکن ہیں (۱) آنحضور جانتے تھے کہ علی اللہ تعالیٰ کو سب مخلوقات کی نسبت عزیز تر ہیں (۲) آپ کو اس بات کا علم نہ تھا۔

بصورت اول آپ نے حضرت علی کو بلا کیوں نہ لیا اور یوں کیوں نہ فرمایا کہ اے اللہ! علی کو حاضر کر دے اگر آپ یوں فرماتے تو بہت سے لوگ اس زعم باطل میں مبتلا نہ ہوتے کہ شاید وہی احب الخلق ہوں۔ بصورت ثانی اس روایت کے الفاظ ہیں "اَحَبَّ خَلْقِکَ اِلَیْکَ وَاِلَیَّ"۔ حیرانی کی بات ہے کہ جب حضرت علی سب مخلوقات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز تر تھے تو آپ کو یہ بات کیونکر معلوم نہ تھی۔ اس روایت کے ناقابل اعتماد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ آنحضور نے فرمایا۔

"اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا"۔

یہ خبر متواتر ہے اور مختلف طرق سے مروی ہے اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابن مسعود و ابن عباس و ابو سعید و ابن زبیر رضی اللہ عنہم ایسے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا کہ سب

لوگوں میں سے آپ کو عزیز تر کون ہے؟ فرمایا "عائشہ"۔ عرض کیا گیا مردوں میں سے کون؟ فرمایا "ان کے والد ابوبکر"۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے روز حضرت عمر نے صحابہ کے ہجوم میں حضرت ابوبکر کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"آپ ہم میں سب سے بہتر اور رسول اللہ کو عزیز تر ہیں"۔ صحابہ میں سے کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی تھی۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی۔ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰی (سورۃ اللیل۔ ۱۷۔ ۱۸)

ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ آیات حضرت ابوبکر کے بارے میں نازل ہوئیں۔ ہم کہتے ہیں "الاتقیٰ" سے شخص واحد بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور پوری جماعت بھی۔ اگر فرد معین مراد لیں تو وہ حضرت ابوبکر ہوں گے یا علی۔

حضرت علی کو اس کا مصداق ٹھہرانا اس لیے صحیح نہیں کہ اس میں یہ آیت بھی ہے "اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی"۔ یہ وصف حضرت علی میں موجود نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ سورت مکی ہے اور علی مکہ میں تنگدست تھے۔ جب مکہ میں قحط پڑا تھا تو آنحضور نے ان کو اپنے کنبہ میں شامل کر لیا تھا۔ بنا بریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت علی پر دو احسان تھے۔ (۱) دنیوی احسان (۲) اخروی و دینی احسان۔ پہلا احسان قابل جزا تھا جبکہ دوسرے احسان کا صلہ اللہ تعالےٰ سے ملے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں ذکر کردہ وصف حضرت صدیق میں موجود تھا اور حضرت علی میں نہیں۔ بے شک علی دوسروں سے زیادہ متقی تھے۔ مگر مذکورہ وصف میں علی حضرت ابوبکر کے ہمسر نہ تھے۔ آنحضور نے فرمایا۔

"مجھے اور کسی کے مال سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا ابوبکر کے مال سے حاصل ہوا"۔

نیز فرمایا "ابوبکر کی صحبت و رفاقت اور صرف مال کے احسانات مجھ پر سب سے زیادہ ہیں"۔

حضرت ابوبکر نے سات ایسے لوگوں کو خرید کر آزاد کیا تھا جن کو اسلام لانے کے جرم

میں ستایا جاتا تھا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "الاتقیٰ" ۔ اسم جنس ہے اس میں سب جلیل القدر صحابہ و تابعین داخل ہیں اور ابو بکر ان کے سر خیل ہیں۔

امامتِ علی کے اثبات میں نویں حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے "امامتِ علی کے اثبات میں نویں حدیث وہ ہے جسے جمہور علماء نے روایت کیا ہے کہ آپ نے صحابہ کو حضرت علی پر سلام بھیجنے کا حکم دیا اور فرمایا۔ آپ سید المسلمین امام المتقین اور اہل جنت کے قائد ہیں لہٰذا حضرت ہی خلیفہ و امام ہوں گے۔"

ہم شیعہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کی اسناد بیان کریں اور اس کی صحت ثابت کریں ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت کسی صحیح کتاب اور قابل اعتماد مسند میں موجود نہیں اس کی اسناد میں متہم بالکذب راوی پائے جاتے ہیں بلکہ علماء حدیث اس سے بڑھ کر اسے موضوع قرار دیتے ہیں اور اسے آنحضور کی طرف منسوب کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ آنحضور کے سوا کوئی شخص سید المسلمین اور امام المتقین نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں مذکورہ روایت میں یہ الفاظ موجود نہیں کہ حضرت علی میرے بعد امام المسلمین ہوں گے نیز اس لیے کہ "خیر المسلمین و المتقین" قرن اول کے مسلمان تھے اور آنحضور ان کے اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کے قائد تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب سب مسلمان شیعہ کی نگاہ میں کافر و فاسق ہیں تو حضرت علی کس کی قیادت کریں گے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"بروز قیامت وضو کے آثار کی وجہ سے میری امت کے لوگوں کی پیشانی اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے اور میں حوض پر تمہارا پیشوا اور راہنما ہوں گا۔"

مذکورہ صدر حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شخص وضو کرتے وقت اپنا منہ اور ہاتھ پاؤں دھوتا ہے وہ بروز قیامت ان لوگوں میں سے ہو گا جن کے ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے اس کی مصداق شیعہ کے سوا آپ کی جمہور امت ہے چونکہ شیعہ وضو کرتے وقت پاؤں نہیں دھوتے۔ لہٰذا ان کے پاؤں سفید نہیں ہوں گے۔ لہٰذا سرور کائنات

اور حضرت علی بروز قیامت ان کی قیادت بھی نہیں کریں گے۔ سفیدی پاؤں پر اسی طرح ہو گی جس طرح ہاتھوں پر آپ کا ارشاد ہے۔

"ایڑیوں اور پاؤں کی اندرونی جانبوں کو آگ کی وجہ سے بڑی تکلیف کا سامنا ہو گا"

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وضو کرتے وقت پاؤں کا جو حصہ خشک رہے وہ آگ میں جلے گا۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ محجل گھوڑا وہی ہوتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں پر سفیدی کا نشان ہو ورنہ اسے محجل نہیں کہتے۔ بنابریں جو شخص اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک نہیں دھوتا۔ بروز قیامت اس کے پاؤں سفید نہیں ہوں گے۔

جس حقیقت واقعی سے اس روایت کا کذب واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ علانیہ حضرت ابوبکر و عمر کو حضرت علی سے افضل قرار دیا کرتے تھے اس کی حد یہ ہے کہ خاص و عام بلکہ مشرکین بھی اس سے آگاہ تھے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ جب حضرت عمر کی نعش لوگوں کے سامنے لائی گئی تو لوگوں نے اس کو گھیر لیا وہ آپ کے حق میں دعا کرنے اور آپ کی مدح وستائش کرنے لگے۔ اچانک ایک شخص نے میرا کندھا تھام لیا۔ میں نے دیکھا تو وہ علی تھے۔ انہوں نے حضرت عمر کے حق میں دعا کی اور فرمایا تو نے اپنے پیچھے کسی آدمی کو نہیں چھوڑا کہ جس کے اعمال کو لے کر میں بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اللہ تعالےٰ آپ کو دونوں ساتھیوں (نبی کریم اور ابوبکر) کے ساتھ ملا دے گا۔ میں اکثر سرور کائنات کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا کہ میں اور ابوبکر و عمر آئے، میں اور ابوبکر و عمر داخل ہوئے، میں اور ابوبکر و عمر نکلے" مجھے امید تھی کہ اللہ تعالےٰ آپ کو ان دونوں ساتھیوں کی ملاقات نصیب کرے گا۔"

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت علی پر حضرت ابوبکر و عمر کی عظمت و فضیلت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین شیعہ حضرت علی کے ساتھ انتہائی الفت و محبت رکھنے کے باوجود حضرت ابوبکر و عمر کو ان سے افضل قرار دیا کرتے تھے البتہ حضرت علی کو حضرت عثمان کے مقابلہ میں افضل تصور کرتے تھے۔ عبدالرزاق کا قول ہے کہ۔

"میرے لیے یہی جرم کافی ہے کہ میں علی سے محبت کا دعویٰ کروں اور ان کے اس قول کی خلاف ورزی کروں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر و عمر ہیں"۔ اور اگر میں تیسرے خلیفہ کا نام لینا چاہوں تو حضرت علی کا نام لونگا۔"

غزوہ احد میں کفار قریش کے سپہ سالار ابوسفیان نے بلند آواز سے دریافت کیا تھا کیا محمد موجود ہیں؟ کیا ابوبکر و عمر موجود ہیں؟ آپ نے جواب دینے سے منع کر دیا تھا جواب نہ پا کر ابوسفیان کہنے لگا "یہ سب تہ تیغ کیے جا چکے ہیں"۔ حضرت عمر فبطنہ کیسکے تو بولے اے دشمن خدا! ہم زندہ ہیں (بخاری)

یہ امر قابل غور ہے کہ ابوسفیان نے صرف تینوں حضرات کے بارے میں سوال کیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ کفار صرف انہی تینوں کو اہمیت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے دوسروں کو نہیں۔

اسی طرح شیعہ کا یہ قول "ھُوَ وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ"۔ (حضرت علی میرے بعد ہر مومن کے دوست ہیں) آنحضور پر بہتان ہے، بخلاف ازیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بقید حیات تھے اور بعد از وفات ہر مومن کے دوست ہیں اسی طرح ہر مومن زندگی میں اور بعد از وفات آپ کا دوست ہے۔ خلاصہ یہ کہ ولایت جو عداوت کی ضد ہے کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

نیز یہ کہ ولایت بمعنی امارت سے والی کہا جاتا ہے نہ کہ ولی۔

آنحضور کا یہ ارشاد حضرت علی کے بارے میں "اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ" بالکل صحیح ہے حدیث میں آیا ہے کہ سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ "اَنْتَ اَخُوْنَا وَمَوْلَانَا"۔ اسی طرح جعفر بن ابی طالب کو فرمایا: "آپ کی صورت و سیرت میرے جیسی ہے"۔

حضرت ابوموسیٰ کے قبیلہ والوں کی یہ عادت تھی کہ جب جنگ کے موقع پر زاد راہ ختم ہو جاتا تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا اس کو جمع کرتے پھر تقسیم کر لیا کرتے تھے یہ دیکھ کر آنحضور نے فرمایا "ھُمْ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْھُمْ"۔

مندرجہ بالا بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ان الفاظ سے بدرجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کسی کی امامت کا اظہار نہیں۔ آنحضور نے حضرت جُلَیبیب کے بارے میں فرمایا تھا ھٰذَا اِمِّیْ وَاَنَا مِنْہُ۔

امامت علی کے بارے میں دسویں حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے "امامت علی کے اثبات میں دسویں حدیث جمہور علماء نے ذکر کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے یعنی اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوں گے"۔

آنحضور نے فرمایا۔

میرے اہل بیت کشتی نوح کی طرح ہیں کہ جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو پیچھے رہا وہ ڈوب گیا"۔

چونکہ حضرت علی اہل بیت کے سردار تھے لہذا سب پر ان کی اطاعت واجب ہو گی اور وہی امام ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور نے خُم کے مقام پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔"میں تمہارے اندر وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ کی کتاب ہے" وَعِتْرَتِیْ" کے الفاظ ترمذی کی روایت میں پائے جاتے ہیں۔ اس روایت کے نقل کرنے میں زید بن حسن انماطی متفرد نہ ہوا ہے۔ محدث ابو حاتم نے انماطی کو منکر الحدیث کہا ہے۔

ترمذی نے ابو سعید سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم میں وہ چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اسے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے ایک چیز دوسری سے بڑھ کر ہے (۱) اللہ کی کتاب جو خدا کی رسی ہے اور آسمان سے زمین تک لٹک رہی ہے (۲) میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے یہاں تک

کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوں گے۔ غور کرو کہ تم ان سے کیا سلوک کرتے ہو"۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

کشتی نوح والی حدیث صحیح نہیں اور حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں موجود نہیں۔ آنحضور کا ارشاد "لَنْ يَتَفَرَّقَا" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے بعض کی یہی رائے ہے۔ قاضی نے المعتمد میں ذکر کیا ہے کہ عترت سے سب بنو ہاشم مثلاً اولاد علی و عباس و حارث بن عبدالمطلب مراد ہیں۔ اہل بیت کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ حضرت ابن عباس اہلبیت میں سے فقیہ تر تھے اور بعض مسائل میں حضرت علی سے اختلاف کیا کرتے تھے۔ حضرت علی اپنے فتاویٰ کو کسی پر واجب نہیں ٹھہرایا کرتے تھے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اہل بیت نے حضرت علی کی افضلیت یا امامت و خلافت پر اجماع منعقد نہیں کیا تھا۔ بخلاف ازیں حضرت ابن عباس و علی دونوں حضرت ابوبکر و عمر کو افضل الامت قرار دیتے اور ان کی خلافت کو برحق تصور کرتے تھے۔ اسی طرح تمام عباسیہ اکثر علویہ حضرت حسن و حسین نیز علی بن حسین ان کے بیٹے امام باقر اور پوتے جعفر صادق سب یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ ان سے بتواتر نقل ہو کر یہ عقیدہ ہم تک پہنچا ہے۔ امام دارقطنی نے اس ضمن میں ایک کتاب "ثناء الصحابہ علی القرابہ" و "ثناء القرابہ علی الصحابہ" نامی تصنیف کی ہے۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ پوری امت کا اجماع جس میں اہل بیت بھی شامل ہیں بلا نزاع حجت ہے وہ اجماع اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر افضل الصحابہ تھے۔ جس گروہ کا اجماع حجت ہیں اگر اس میں کے افضل ترین شخص کی اطاعت واجب ہے تو وہ ابوبکر تھے اور اگر ایسا نہیں ہے تو امامت علی پر شیعہ کا استدلال باطل ٹھہرا۔

امامت علی کے اثبات میں گیارہویں حدیث

شیعہ مصنف لکھتا ہے "امامت علی کے اثبات میں گیارہویں روایت وہ ہے جو امام احمد نے مسند میں ذکر کی ہے کہ آنحضور نے حضرت

حسن وحسین کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا جس نے ان دونوں اور ان کے والد اور والدہ سے محبت رکھی وہ جنت میں میرے ہمراہ ہوگا"۔

ہم کہتے ہیں کہ صرف امام احمد کے کسی روایت کو نقل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صحیح بھی ہے۔ مگر یہ روایت ہرگز امام احمد نے ذکر نہیں کی بلکہ القطیعی نے کتاب الفضائل میں اس کا اضافہ کیا ہے۔ محدث ابن الجوزی نے اس روایت کو بواسطہ علی بن جعفر از موسیٰ موضوع قرار دیا ہے۔ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسی مبالغہ آمیز بات فرما سکتے ہیں، کہ ایک گناہگار مسلمان صرف اہل بیت کی محبت کی بنا پر جنت میں آنحضور کا ہم درجہ ہو سکتا ہے؟

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "ابن خا کو یہ نے حذیفہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص یاقوت کی ٹہنی کو پکڑنا چاہتا ہو۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا پھر اسے عالم وجود میں آنے کا حکم دیا اور وہ ظہور پذیر ہو گئی۔ تو وہ میرے بعد علی سے دوستی لگائے"۔ یہ روایت شیعہ کے فرقہ "طرقیہ" کی خود ساختہ ہے اس کے الفاظ بعید رکیک اور بے فائدہ ہیں آخر اس کا کیا مطلب کہ پہلے ہاتھ سے بنایا اور پھر کُن کہا۔ ایک قول میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے صرف آدم اور قلم اور جنت عدن کو پیدا کیا تھا باقی سب مخلوقات کُن کہنے سے وجود پذیر ہو گئیں۔

بارہویں حدیث سے امامت علی کا اثبات

شیعہ مصنف لکھتا ہے ابو سعید سے مرفوعاً مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا۔ "تمہاری محبت علامت ایمان ہے اور تمہاری عداوت موجب کفر۔ تیرے محب سب سے پہلے جنت میں جائیں گے اور تجھ سے عداوت رکھنے والے سب سے پہلے جہنم واصل ہوں گے۔

ہم کہتے ہیں یہ صریح جھوٹ ہے۔ کوئی مسلم یہ بات کہہ سکتا ہے کہ خوارج دلو اصحاب فرعون و ابو جہل اور اس قسم کے سرکردہ کفار سے پہلے دوزخ میں جائیں گے۔ یا کوئی مسلم یہ الفاظ اپنی زبان پر لا سکتا ہے کہ غالی اسماعیلیہ جھوٹے روافض اور فاسق امامیہ جب

علی کی بنا پر انبیاء کرام سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے ؟ یہ بات تو اسی طرح ہے جیسے کوئی ناصبی کہے جو شخص یزید و حجاج سے محبت رکھتا ہو یا خارجی کہے جو ابن ملجم کو چاہتا ہو وہ جنت میں جائے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

خطیب خوارزم نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور نے فرمایا "جو حضرت علی کی خلافت کو ناپسند کرتا ہو وہ کافر ہے اور اللہ و رسول کے خلاف جنگ آزمائی کر رہا ہے"۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ میں آنحضور کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے علی کو آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "میں اور علی بروز قیامت اپنی امت پر حجت ہونگے"۔

معاویہ بن حیدہ القشیری کہتے ہیں کہ میں نے آنحضور کو حضرت علی سے یہ کہتے سنا کہ جو شخص آپ سے عداوت رکھتے ہوئے مر جائے تو پرواہ نہ کریں کہ یہودی مرا ہے یا نصرانی"۔

جواباً ہم شیعہ سے ان روایات کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ خطیب خوارزم کا ان روایات کو نقل کرنا ان کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی تصانیف موضوعات کا پلندہ ہیں۔ جن کو دیکھ کر ایک حدیث دان شخص حیرت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے "سبحانک ہذا بہتان عظیم"۔ وہ حقیقت شناس شخص جو واقعات سے آگاہ ہو اور آثار و اقوال میں مہارت رکھتا ہو اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس قسم کی احادیث کذاب راویوں نے عصر صحابہ و تابعین کے اختتام کے بعد وضع کر لی تھیں

ہم کہتے ہیں ہمیں ان موضوع روایات کی نسبت اس بات کا قطعی و حتمی علم حاصل ہے کہ مہاجرین و انصار اللہ و رسول کو چاہتے تھے اور رسول علیہ السلام ان کو چاہتے تھے ہم بہ اذعان و ایقان جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق باتفاق صحابہ آپ کے بعد امام قرار پائے تھے پھر ہم ان یقینیات کو چھوڑ کر شیعہ کی روایات کاذبہ کی بنا پر کس طرح جھٹلا سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ ہمیں ان روایات کے کاذب ہونے کا بخوبی علم بھی ہے

اور ہم جانتے ہیں کہ یہ روایات کسی معتمد کتاب میں باسناد صحیح موجود نہیں۔

شیعہ کی مرویات ناقابل اعتماد ہیں

اس پر مزید یہ کہ قرآن کریم جگہ جگہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مہاجرین والانصار سے رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے (الفتح - ۱۸)

نیز فرمایا۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (سورۃ الحشر ۸)

ان تنگدست مہاجرین کے لیے جن کو اپنے گھر بار سے نکالا گیا وہ خدا کا فضل اور اس کی رضامندی چاہتے ہیں)

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (التوبہ - ۱۱۷)

اللہ تعالےٰ نے نبی کریم اور مہاجرین و انصار کی توبہ قبول کر لی)

اور اس قسم کی دیگر آیات قرآنیہ

ظاہر ہے کہ ان نصوص قطعیہ کو شیعہ کی جھوٹی روایات کی بنا پر کیونکہ ترک کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ شیعہ کی بعض مرویات سے حضرت علی کی شان میں تدرح وارد ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی اللہ و رسول کی تکذیب کرنے والے تھے۔ جن لوگوں نے حضرت علی کے ادعاء خلافت کی مخالفت کی تھی مثلاً نواصب اگر شیعہ ان کو کافر قرار دیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ حضرت علی ان کو مسلم تصور کرنے میں حکم نص کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

خوارج حضرت علی کے بدترین دشمن تھے تاہم آپ ان کو کافر نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپ نے ان کو لونڈی غلام بنانے سے روکا اور ان کے مالوں کو حرام قرار دیا تھا جب ابن ملجم نے حضرت علی کو شہید کر دیا تو انہوں نے فرمایا۔ "اگر میں زندہ رہا تو جیسے چاہوں

کروں گا"

آپ نے ابن ملجم کے فوری قتل کا حکم نہیں دیا تھا اور اگر وہ مرتد ہوتا تو حضرت علی اسے فی الفور قتل کرنے کا حکم صادر کرتے۔ حضرت علی سے بتواتر نقل گیا ہے کہ آپ نے اہل جمل کا تعاقب کرنے سے منع کیا تھا۔ نیز اس بات سے بھی روکا تھا کہ ان کے زخمیوں کو قتل کیا جائے یا ان کا مال لوٹا جائے۔ اگر شیعہ کی ذکر کردہ روایات کو ترک کرنے سے کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے تو حضرت علی اولین شخص تھے جنہوں نے ان احادیث کو جھٹلایا اور ان کے مقتضا پر عمل نہ کیا۔ اسی طرح حضرت علی نے ان لوگوں کا جنازہ پڑھا تھا جنہوں نے جنگ صفین میں حضرت معاویہ کا ساتھ دیا۔

آپ فرمایا کرتے تھے "ہمارے بھائیوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی تھی تلوار نے ان کو پاک کر دیا"۔

ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی ان لوگوں کو کافر قرار نہیں دیتے تھے جو آپ کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر حضرت معاویہ اور ان کے رفقاء حضرت حسن کے نزدیک کافر ہوتے تو آپ بخوشی ان کے حق میں سلطنت و حکومت سے دست بردار نہ ہوتے۔ خصوصاً جب کہ آپ قوت و شوکت سے بہرہ ور تھے اور لشکر جرار آپ کی پشت پناہی کے لیے بھی موجود تھا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ و سلم نے حضرت حسن کے بارے میں فرمایا تھا۔

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اللہ تعالے اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان مصالحت کرائے گا" (بخاری)

اس حدیث میں آنحضور نے دونوں جماعتوں کو مسلم قرار دیا ہے۔ مگر شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کے رفقاء مومن تھے اور حضرت معاویہ کے اعوان و انصار مرتد تھے۔

بنا بریں یہ مصالحت مومنین و مرتدین کے مابین وقوع پذیر ہوئی تھی۔

ایک طرف شیعہ کا دعوی ہے کہ امام معصوم خداوندی لطف و کرم کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مگر ان کے بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ امام خداوندی

عذاب کا مظہر ہوتا ہے نہ کہ لطف و کرم کا۔ اس لیے کہ حضرت علی کے مخالفین بقول شیعہ مرتد ہو گئے اور جو لوگ آپ کے ہمنوا تھے وہ منافق ہیں اور ہر طرح ذلیل و خوار ہیں پھر امام کا فائدہ کیا ہوا؟ اس کے دوش بدوش شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بندوں کے حق میں مفید و سودمند کام انجام دینا اللہ تعالےٰ پر واجب ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ خوارج کو شیعہ پر مسلط کرتا ہے اور وہ حضرت علی کی تکفیر کر کے آپ کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شیعہ کے ائمہ معصومین خائف و ہراساں ہو جاتے ہیں۔ اور ڈر کے مارے ذمیوں کی طرح تقیہ کر لیتے ہیں۔ بلکہ اہل ذمہ تو بعض اوقات اپنے مذہب کا اظہار و اعلان بھی کرتے ہیں۔ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ وہ لطف و مصلحت کیا ہوئی جو شیعہ کے نزدیک خدا پر واجب ہے؟

ائمہ سے متعلق شیعہ کے بلند بانگ دعاوی

شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ ائمہ خدا کے بندوں پر اس کی حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہدایت انہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے اور ان کی اطاعت کے بغیر نجات ممکن نہیں ہے ان کا عقیدہ ہے کہ آخری امام ہنوز پردۂ غیب میں ہے اور کسی نے بھی ان سے دینی یا دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عقیدۂ رفض زنادقہ کا اختراع کردہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ باطنیہ والے سب سے پہلے عقیدۂ تشیع کی دعوت دیتے ہیں جب کوئی شخص اس کا قائل ہو جاتا ہے تو پھر وہ یوں کہنے لگتے ہیں کہ علی دیگر خلفاء کی طرح تھے چنانچہ وہ شخص حضرت علی کو جرح و قدح کا نشانہ بنانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب اس میں پختہ ہو جاتا ہے تو پھر باطنیہ اسے رسول پر اعتراضات وارد کرنا سکھاتے ہیں یہاں تک کہ وہ منکر رسول ہو جاتا ہے پھر اسے باری تعالیٰ کی ہستی کا منکر بناتے ہیں خلاصہ یہ کہ تدریجاً وہ پوری شریعت کا منکر ہو جاتا ہے۔

ہر صاحب عقل و خرد اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ جمہور اہل اسلام کو حضرت علی سے عداوت ہے اور نہ کسی اور سے۔ انہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور آپ کے احکام

کی خلاف ورزی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ نظر بریں اگر مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ آنحضور نے تصریحاً حضرت علی کو خلیفہ مقرر کیا ہے تو اس کی تصدیق کرنے میں انھیں پس وپیش کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو آنحضور کے اس حکم کا پتہ نہ چل سکا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو دین کی کسی بات کا علم نہ ہو وہ یہود ونصاریٰ کی طرح کیونکر ہو سکتا ہے۔ شیعہ کی روایات موضوعہ کی نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی قابلِ غور ہے۔

آپ فرماتے ہیں "جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے" البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص نص رسول کو اللہ ورسول کی مخالفت کے نقطۂ خیال سے چھپالے وہ یقیناً جہنمی ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "ہم نے ثقہ راویوں سے نقل کر کے اہل سنت کی ذکر کردہ روایات سے کئی گنا احادیث بیان کی ہیں"۔

ہم کہتے ہیں اہل السنت والجماعت رواتِ حدیث پر کڑی تنقید کرتے ہیں جس سے شدید تر تنقید کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ رواتِ حدیث کی جرح وتعدیل اور توثیق و تردید کے بارے میں ہمارے علماء نے کئی تصانیف تحریر کی ہیں جن میں راویوں کے زہد وتقویٰ سے قطع نظر ان پر شدید جرح وقدح کی گئی ہے۔ کثرت غلط اور سوءِ حفظ کی بنا پر ان کی روایات کو رد کر دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ اولیاء اللہ ہی میں سے کیوں نہ ہوں۔

بخلاف ازیں شیعہ کے نزدیک ثقہ راوی کی تعریف یہ ہے کہ وہ امامیہ میں سے ہو خواہ سچا ہو یا جھوٹا حافظ ہو یا غیر حافظ۔ حالانکہ شیعہ رُوات کو بھی اہل سنت کے رُوات و رجال کی مانند ہونا چاہئے۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اہل سنت میں بھی کذّاب راوی موجود ہیں اور شیعہ روات تو ان سے بھی کاذب تر ہیں اس سے معلوم ہوا کہ سند پر غور کیے بغیر احادیث پر عمل کرنا حرام ہے۔ شیعہ مصنف کو یہ بات کیونکر زیب دیتی ہے کہ وہ ایسے راویان حدیث کو ثقہ قرار دے جن سے وہ صرف ناآشنا ہی نہیں بلکہ اس کے نام کے حروفِ ہجا سے بھی

نابلد ہے۔ اس کا نام ثقہ راویوں میں بھی مذکور نہیں۔ شیعہ کا ماخذ زیادہ تر معمولی درجہ کے رسائل و مجلات اور حضرت علی سے متعلق من گھڑت اخبار و واقعات ہیں جن کی صحت کا کچھ پتہ نہیں۔ یہود و نصاریٰ کا بھی یہی شیوہ تھا بلکہ شیعہ تو کذب و دروغ میں ضرب المثل کی حد تک معروف ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ خوارج شیعہ سے بدتر ہیں مگر ہم ان کو کذب سے متہم نہیں کر سکتے یہ بات ہمیں تجربہ سے معلوم ہوئی ہے۔ ہم نے ان کو بار بار آزمایا مگر دروغ کا عیب ان میں نہیں پایا۔ شیعہ میں راست گفتار لوگ خال خال پائے جاتے ہیں۔

شیعہ اور روایات کاذبہ

ابن المبارک فرماتے ہیں۔

"دینداری اہل حدیث کا حصہ ہے۔ کلام اور حیلہ سازی اہل الرائے کے لیے مخصوص ہے اور دروغگوئی روافض کا شعار ہے۔"

خلاصہ کلام یہ کہ کذب و دروغ اگرچہ اہل حدیث و سنت کے عقائد و افکار سے ہم آہنگ ہو تو بھی وہ اسے بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ مثلاً نقاش و قطیعی و ثعلبی و اہوازی و خطیب و ابن عساکر نے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب میں بہت سی روایات ذکر کی ہیں جن میں سے علماء حدیث نے کوئی روایت قبول نہیں کی بلکہ ان کا جھوٹا ہونا واضح کیا ہے۔

اہل حدیث کی احتیاط فی الحدیث کا یہ عالم ہے کہ اگر اسناد میں ایک راوی بھی مجہول الحال ہو تو وہ اس حدیث کے قبول کرنے میں توقف کرتے ہیں۔

بخلاف ازیں جو روایات شیعہ کے عقائد و افکار سے ہم آہنگ ہوا نہیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا قطع نظر اس سے کہ صحیح ہو یا ضعیف اور اگر شیعہ کوئی صحیح روایت پیش کرتے ہیں تو اس سے ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے عین برعکس اہل سنت کا اعتماد آیات قرآنیہ۔ احادیث صحیحہ اور مسلمانوں کے اجماعی مسائل پر ہے ان کے خلاف جو چیز ہوگی ہم اسے رد کر دیں گے۔ محدث ابوالفرج ابن الجوزی فرماتے ہیں۔

حضرت علی کے فضائل و مناقب میں بہت سی احادیث صحیحہ بھی موجود ہیں مگر شیعہ ان پر قناعت نہ کرتے ہوئے ان کے فضائل میں موضوع روایات گھڑتے ہیں"۔

شیعہ مصنف نے فضائل علی میں جملہ مرویات ذکر نہیں کیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی ضعیف اور موضوع روایات موجود ہیں جن سے شیعہ کا مدعا ثابت ہوتا ہے مثلاً امام نسائی نے کتاب "خصائص علیؓ" میں عبّاد بن عبداللہ اسدی سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا "میں اللہ کا بندہ اور رسول خدا کا بھائی ہوں۔ میں ہی صدیق اکبر ہوں میرے بعد جو اس کا دعویٰ کرے گا وہ کاذب ہوگا۔ میں نے لوگوں سے سات سال پہلے نماز پڑھی ہے"۔ یہ روایت امام احمد نے اپنی کتاب "الفضائل" میں بیان کی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ "میں لوگوں سے سات سال پہلے اسلام لایا"۔ ابن الجوزی کہتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ عبّاد متّہم بالکذب ہے۔ ابن المدینی نے بھی عبّاد کو ضعیف الحدیث قرار دیا ہے۔ اس کی سند میں منہال نامی راوی بھی ہے جو شعبہ کے نزدیک متروک ہے۔ اثرم کا قول ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا چھوڑیئے یہ منکر حدیث ہے۔

ہم کہتے ہیں حضرت علی ایک راست گفتار بزرگ تھے وہ ایسی جھوٹی بات نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا یا تو راوی نے دانستہ جھوٹ بولا یا اس سے غلطی صادر ہوئی۔ اس کی نظیر وہ حدیث ہے جو عبداللہ بن احمد بن حنبل نے المناقب میں ذکر کی ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں۔ جب آیت "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" نازل ہوئی تو آپ نے اہلبیت کے چند آدمیوں کو بلایا وہ سب خوب کھانے پینے والے آدمی تھے (یہ طویل حدیث ہے) یہ حدیث حضرت علی سے ہرگز مروی نہیں بلکہ آپ پر عظیم بہتان ہے۔ اس روایت کا کذب متعدد وجوہ سے ظاہر ہے۔

امام احمد نے الفضائل میں نیز ابن الجوزی نے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت علی کو یہ فرماتے سنا "میں نے آنحضور کی رفاقت میں باقی لوگوں سے پانچ یا سات سال پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی"۔

محدث ابو الفرج ابن الجوزی فرماتے ہیں" اس کی اسناد میں حبہ نامی راوی بالکل بیکار ہے اور ایک ذرہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا" محدث یحییٰ کہتے ہیں" یہ کچھ بھی نہیں"۔ سعدی اسے غیر ثقہ قرار دیتے ہیں۔ امام احمد کہتے ہیں کہ اس کی سند میں اجلح نامی راوی منکر ہے۔ ابن الجوزی فرماتے ہیں" یہ روایت اس لیے بھی باطل ہے کہ بالاتفاق حضرت خدیجہ وابوبکر وزید رضی اللہ عنہم سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نبوت کے چھٹے سال چالیس آدمیوں کے بعد اسلام لائے تھے۔ پھر یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت علی نے لوگوں سے سات سال پہلے نماز ادا کی؟

حضرت علی صدیق اکبر ہیں موضوع روایت ہے

باقی رہی یہ حدیث مرفوع کہ حضرت علی صدیق اکبر ہیں" تو یہ احمد بن نصر الذراع کی وضع کردہ ہے۔ شیعہ کی ذکر کردہ ایک روایت میں ہے۔" میں خدا کے حکم کو بہت ہی قائم رکھنے والا اور تقسیم میں مساوات کا خیال رکھنے والا ہوں"۔

یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی سند میں بشر بن ابراہیم متہم بالکذب ہے۔ محدث ابن حبان وابن عدی کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔

ایک حدیث میں ہے۔

" تو (علی) پہلا شخص ہے جو بروز قیامت مجھ سے مصافحہ کرے گا۔ تو صدیق بھی ہے اور فاروق بھی تو مومنوں کا یعسوب ہے"۔ ابن الجوزی فرماتے ہیں یہ حدیث موضوع ہے۔ اس کی سند میں عباد بن یعقوب اور علی بن ہاشم دونوں ضعیف ہیں۔ اس کی دوسری سند میں عبداللہ بن داہر ہے جسے محدث ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اب طریقہ ممکن ہے جس پر وہی شخص عمل پیرا ہو سکتا ہے جو فن حدیث سے نابلد محض نہ ہو۔ حدیث کی نقد وجرح کا کام چنداں آسان نہیں، اکثر علماء بھی اسناد کی بنا پر صدق و کذب میں تمیز نہیں کر سکتے۔ یہ بڑے بڑے حفاظ حدیث کا کام ہے۔

اگر ہم متنازع احادیث کو نظر انداز کر دیں اور انہی روایات کو پیش نظر رکھیں جو متواتر

ہیں یا عقل و عادت سے ہم آہنگ ہیں یا صرف ان نصوص سے احتجاج کریں جن پر سب کا اتفاق ہو تو ہم کہیں گے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی خوف و امید کی بنا پر خلافت کا مطالبہ نہیں کیا تھا نہ اس کے لیے مال خرچ کیا نہ تلوار اٹھائی۔ نہ آپ کی پشت پناہی کے لیے کوئی زور آور قبیلہ تھا جس طرح سلاطین کی عادت ہے۔ اس سے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ نے یہ بھی نہیں کہا کہ میری بیعت کر لو بلکہ آپ نے حضرت عمرؓ یا ابو عبیدہ کی بیعت کا مشورہ دیا تھا۔ جن لوگوں نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی مثلاً سعد بن عبادہ آپ نے ان کو نہ مجبور کیا نہ الم و رنج پہنچایا۔

خلفاء اربعہ کی امامت و خلافت

پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں انہی لوگوں نے شرکت کی تھی جو بیعت رضوان میں شریک ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان صحابہ کی مدد سے مرتدین اور فارس و روم کے خلاف جنگ لڑی اور اس طرح نخل اسلام کی آبیاری کی۔ آپ کے طرز بود و ماند اور خورد و نوش میں کچھ فرق نہ آیا۔ جب آپ کا آخری وقت آیا تو خلافت کو اس طرح خیرباد کہا جس طرح اسے قبول کیا تھا۔ نہ ذاتی فائدہ اٹھایا نہ اقارب نوازی کا ثبوت دیا بلکہ ایک شخص (حضرت عمرؓ) کو سب لوگوں سے افضل سمجھ کر ان کا امیر مقرر کر دیا۔ لوگوں نے ان (حضرت عمرؓ) کی اطاعت کی۔ چنانچہ آپ نے بلاد و امصار کو فتح کیا کفار کو مغلوب کیا۔ منافقین کو رسوا کیا۔ عدل کو پھیلایا۔ دفتر بنائے اور باقاعدہ تنخواہ تقسیم کرنے کا انتظام کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرح سادہ زندگی بسر کی۔ یہاں تک کہ شہادت سے مشرف ہوئے۔ نہ مال حرام سے اپنے آپ کو ملوث کیا نہ کسی رشتہ دار کو کسی علاقہ کا حاکم مقرر کیا۔ ہر با انصاف آدمی اس حقیقت سے آگاہ ہے۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے بطیب خاطر حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی۔ آپ بھی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی ہموار کردہ راہ پر گامزن رہے اور سکون و اطمینان اور لطف و کرم کے ساتھ امور سلطنت انجام دیتے رہے۔ مگر آپ فاروق اعظم کے اوصاف سے بہرہ ور نہ تھے نہ آپ میں فاروقی قوت و جلالت تھی نہ وہ حیرت افزا

سیاست رانی اور نہ کمال عدل و انصاف اور نہ فرط زہد جس کا انکار ایک جاہل شخص ہی کر سکتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اسلامی سلطنت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ دولت کی فراوانی ہو گئی۔ اپنے اقارب کو بڑے بڑے عہدے تفویض کر دیئے جس پر لوگ اعتراض کرنے لگے۔ لوگ دنیوی مال میں دلچسپی لینے لگے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ خوف رحمان و خوف عثمان دونوں سے بے نیاز ہو گئے۔ حضرت عثمان حضرت ابو بکر و عمر کے مقابلہ میں طبعاً کمزور تھے۔ چنانچہ فتنہ بازی کا ظہور ہوا جس کے نتیجہ میں حضرت عثمان نے شہادت پائی۔

فتنہ سامانی کے اسی دور میں حضرت علی مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ آپ پر یہ بہتان لگایا گیا تھا کہ آپ نے حضرت عثمان کی مدافعت نہیں کی۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ آپ قتل عثمان کے براہ راست ذمہ دار ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالے کو ان کی پاک دامنی کا علم تھا۔ نہ آپ قتل عثمان پر خوش تھے اور نہ آپ نے قاتلین کی کچھ امداد کی۔ تاہم لوگ آپ کے بیان سے مطمئن نہ ہوئے اور نہ آپ ان کو دبا سکے۔

حضرت حسن نے آپ کو لڑائی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا مگر آپ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ جنگ لڑی جائے اور دیکھا جائے کہ اس سے کیا ثمرات برآمد ہوتے ہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ لڑائی سے شاید سب امت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائے گی۔ مگر آپ کا خیال صحیح ثابت نہ ہوا اور امت کا افتراق و انشقاق بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی جماعت کے بعض لوگوں نے آپ کی تکفیر کا آغاز کیا۔ اور آپ کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ عمر کے آخری حصہ میں آپ اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ جو لوگ آپ کے مطیع نہیں ہیں ان سے جنگ نہ لڑی جائے۔

حضرت علی ان خلفاء راشدین میں سے آخری خلیفہ تھے جن کی خلافت علیٰ منہاج النبوت تھی۔ پھر نوبت حضرت معاویہ تک پہنچی جو اولین بادشاہ تھے۔ آنحضور کا ارشاد ہے کہ۔

"میرے بعد تیس ۳۰ سال خلافت ہو گی پھر ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا۔"
تاہم حضرت معاویہ سیرت و کردار کے اعتبار سے جملہ سلاطین و ملوک سے افضل تھے۔

حضرت علی پر نواصب کے اعتراضات

اگر شیعہ حضرت ابوبکر و عمر کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہیں کہ

(۱) وہ دونوں اقتدار کے حریص تھے اور اصل حق دار کو اس کا حق ادا نہیں کرتے تھے
(۲) حضرت علی کو بصراحت آنحضور نے خلیفہ مقرر کیا تھا مگر ابوبکر و عمر نے ان پر ظلم کیا۔
(۳) انہوں نے اہل بیت کو ورثہ نہیں دیا تھا۔

ایک ناصبی بڑی آسانی سے حضرت علی کو ان اعتراضات کا نشانہ بنا سکتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی اقتدار کے بھوکے تھے۔ حصول اقتدار کے لیے انہوں نے لوگوں کا خون بہایا مگر اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔ شیعہ حضرت علی پر وارد شدہ اعتراضات کا جو جواب دیں گے وہی جواب ہم حضرت ابوبکر و عمر پر وارد شدہ اعتراضات کا دے سکیں گے۔ بلکہ حضرت ابوبکر و عمر اس جواب کے بالاولی مستحق تھے اس لیے کہ وہ اس تہمت سے قطعی طور پر پاک ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حصول اقتدار کے لیے جنگ نہیں لڑی تھی۔ نیز یہ کہ حضرت علی اور کبار صحابہ نے ان کی اطاعت قبول کر لی تھی جب حضرت علی کے بارے میں ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ حق کا عزم رکھتے تھے اور ظلم و فساد کے خواہاں نہ تھے تو ان دونوں حضرات کے بارے میں یہ گمان رکھنا اور بھی ضروری ہے لہذا جدال و نزاع کو چھوڑ کر طریق حق و صواب کو اختیار کرنا چاہیے۔

دوسرا طرز فکر یہ ہے کہ آنحضور کی وفات کے بعد مسلمانوں میں عموماً اتباع حق کا رجحان و میلان پایا جاتا تھا۔ اس قدرت کے ہوتے ہوئے کوئی چیز انھیں اتباع حق سے روک نہ سکتی تھی اندریں صورت جب حق کا داعی موجود ہو۔ مانع منتفی ہو جائے اور فعل

کی قدرت بھی موجود ہو تو فعل واجب ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلم خیر القرون ہیں وہ خیر الامم ہونے کے اعتبار سے ہمیشہ حق کی پیروی کرتے ہیں اللہ تعالےٰ نے ان کے لیے دین کو کامل کر دیا ہے اور دینی نعمت کو ان پر مکمل کر دیا ہے۔ انھوں نے اطاعت کے نقطۂ خیال سے حضرت ابوبکر کی بیعت کی تھی کسی کے ڈر یا لالچ کی بنا پر نہیں اگر وہ اپنی مرضی سے ایسا کرتے تو عباس و علی کو امیر بناتے کیونکہ بنو ہاشم حضرت ابوبکر کے قبیلہ تیم پر فضیلت رکھتے تھے۔

حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ بڑے معمر تھے۔ جب مکہ میں انھیں مژدہ سنایا گیا کہ آپ کا بیٹا منصب خلافت پر فائز ہو گیا ہے تو انہوں نے پوچھا کیا بنو امیہ و بنو ہاشم اور بنو مخزوم رضامند ہو گئے؟ لوگوں نے کہا "ہاں"۔ ابو قحافہ نے اس پر اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا: "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ"۔ کیونکہ ابو قحافہ جانتے تھے کہ بنو تیم کا قبیلہ بڑا کمزور ہے مگر اسلام کے نزدیک عظمت و فضیلت کا معیار تقوےٰ ہے نہ کہ حسب و نسب۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث متواتر میں فرمایا "اس امت میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں (تابعین) پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں (تبع تابعین)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضور کا زمانہ بلا نزاع سب سے بہتر تھا۔ جو شخص قرن ثانی کے مسلمانوں کی حالت پر غور کرتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں زمانے ایک دوسرے سے کس قدر مختلف تھے۔ اگر قرن اول والوں نے امام منصوص کا حق ادا نہیں کیا تھا اور اہل بیت کا ورثہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ نیز ضد و عناد کی بنا پر ایک عادل و عالم کو خلیفہ تسلیم کرنے کی بجائے ایک فاسق و ظالم کو امام بنا لیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرن اول والے شر الخلق تھے۔ اور یہ امت بدترین امت ہے۔ جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

اصحاب ثلاثہ ظاہراً و باطناً صالح تھے

یہ بات تواتر سے معلوم ہو چکی ہے کہ اصحاب ثلاثہ کے آنحضور کے ساتھ گہرے مراسم و روابط تھے۔ ان کو آنحضور کی صحبت و رفاقت حاصل رہتی تھی اور آنحضور کی ان کے ساتھ قرابت مصاہرت بھی تھی۔ مگر آپ نے کبھی ان کی مذمت نہ فرمائی بلکہ ہمیشہ مدح و ستائش کرتے رہے۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔

(۱) یہ ظاہراً و باطناً صالح و متقی ہوں گے

(۲) یہ باطناً متقی نہ تھے۔

اگر پہلی صورت ہے تو ہمارا مطلوب بھی یہی ثابت کرنا ہے۔ بصورت ثانی یا تو آپ کو ان کے خبث باطن کا علم ہو گا اور آپ مداہنت فرما رہے ہوں گے یا آپ کو اس بات کا علم نہیں ہو گا ان دونوں باتوں میں سے جو صورت بھی ہو وہ آپ کی ذات کے لیے موجب قدح ہے اور اگر شیعہ کہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر استقامت کے بعد جادۂ مستقیم سے بھٹک گئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خواص امت کے بارے میں اللہ تعالٰی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیا اور آپ کی مدد نہیں کی تھی جب آنحضور بقول شیعہ وقوع پذیر ہونے والے امور کی خبر دیا کرتے تھے تو آپ کو ان خواص کے خبث باطن کا پتہ کیوں نہ چل سکا۔ نیز جب آنحضور سے وعدہ کیا گیا تھا کہ دین اسلام کو سب دینوں پر غالب کر دیا جائے گا تو ان کی امت کے مرتد کیونکر ہو سکتے تھے؟ یہ آنحضور کی ذات پر بدنما داغ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ باطنیہ و زنادقہ بڑی آسانی سے کہہ سکیں گے کہ یہ شخص (نبی کریم) برا تھا اور اس کے رفقاء بھی اسی قسم کے لوگ تھے اور اگر خود صالح ہوتا تو اس کے اصحاب و اعوان بھی متقی ہوتے۔ اسی لیے اہل علم نے کہا ہے کہ عقیدۂ تشیع الحاد و زندقہ کا نقطۂ آغاز ہے۔

امامت علی کے مسئلہ پر ایک اور طریقہ سے بھی غور و فکر کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت علی باقی صحابہ کی نسبت خلافت کے لیے موزوں تر تھے آپ کی امامت و خلافت کے اسباب قوی تر تھے اور موانع منتفی تھے۔ منصب خلافت پر

فائز ہونے کی قدرت بھی موجود تھی تو ایسے حالات میں آپ کا مسند خلافت پر متمکن ہونا ضروری تھا۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ حضرت علی رسول کریم کے ابن العم تھے۔ آپ حسب و نسب کے اعتبار سے بھی افضل تھے۔ سبقت اسلام و فضیلت جہاد کے دوش بدوش آپ آنحضور کے داماد بھی تھے۔ علاوہ ازیں کوئی آپ کا دشمن نہ تھا۔ آپ نے بنی تیم و بنی عدی میں سے کسی کو قتل بھی نہیں کیا تھا[1]

بخلاف ازیں حضرت علی نے اپنے قبیلہ بنو عبد مناف کے بعض آدمیوں کو قتل کیا تھا تاہم وہ قرابت داری کی بنا پر آپ کی طرفداری کرتے تھے۔ بلکہ ابو سفیان نے اس ضمن میں گفتگو بھی کی تھی۔ ان حالات کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت علی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بصراحت خلیفہ مقرر کیا تھا یا آپ سب صحابہ کی نسبت اس منصب کے لیے موزوں تر ہوتے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ سب لوگ آپ کی حمایت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جاتے اور آپ کو منصب خلافت پر فائز کر کے دم لیتے۔

اگر حضرت علی خلیفہ منصوص ہوتے تو خلافت صدیقی میں اپنے حق کا تقاضا کرتے

---

[1] اگر حضرت علی حضرت ابوبکر و عمر کے قبیلہ کے ان لوگوں کو قتل کرتے جو مشرف باسلام نہیں ہوئے تھے تو آپ حضرت علی کو اور بھی الفت و محبت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے سعید بن عاص اموی کو کہا تھا۔ میں نے تمہارے والد کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ماموں عاص بن ہشام کو موت کے گھاٹ اتارا تھا (سعید کا والد عاص بن ہشام حضرت عمر کا ماموں تھا) سعید نے جواباً کہا اگر آپ میرے باپ کو قتل کرتے تو حق بجانب ہوتے اور میرا باپ باطل پر ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کا مثالی گروہ خدا کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ شیعہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح سے بغض رکھتے ہیں ان کا یہ عالم تھا کہ غزوہ بدر میں اپنے والد کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور حمایت اسلام کی خاطر اسے قتل کرنے سے دریغ نہ کیا کیا حمایت حق اور اس کی خاطر ایثار و قربانی کی اس سے بہتر مثال مل سکتی ہے؟ اور کیا ایسے ایثار پیشہ حضرات کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنے والا حق پرست ہو سکتا ہے؟

اگر کچھ لوگ حضرت علی کے مخالف بھی تھے تو اکثریت آپ کی حامی تھی جو بڑی آسانی سے آپ کو خلیفہ منتخب کر سکتی تھی۔ اگر انصار کہتے کہ حضرت علی سعد اور ابو بکر کی نسبت خلافت کے زیادہ حقدار ہیں تو مہاجرین ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اکثر لوگ حضرت علی کا ساتھ دیتے۔ یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جو لوگ خلوص دل سے اسلام نہیں لائے تھے وہ تشدد کی وجہ سے حضرت عمر کو ناپسند کرتے تھے لہٰذا قیاس یہ ہے کہ وہ آپ کی بیعت کر لیتے ـــــ تاہم جب حضرت ابوبکر نے فاروق اعظم کو خلیفہ مقرر کر دیا تو سب بلا توقف آپ کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا "آپ نے ایک متشدد شخص کو ہمارا خلیفہ بنا دیا ہے آپ خدا کو کیا جواب دیں گے"۔

حضرت ابو بکر نے جواباً فرمایا۔

"تم مجھے خدا سے ڈراتے ہو۔ میں کہوں گا میں نے بہترین شخص کو خلیفہ مقرر کیا تھا"۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ مسلمانوں کی اکثریت حضرت علی کی ہمنوا تھی تو پھر آپ پر غالب کون آسکتا تھا؟ فرض کیجیے اگر حضرت علی کے طرفدار آپ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے مگر غلبہ حاصل کرنے سے قاصر رہتے تو بھی اسباب و دواعی آپ کے حق میں ہوتے اور اگر خلافت پر فائز ہونے میں کامیاب نہ ہوتے تو کم از کم قیل و قال اور جنگ و جدال کا آغاز ضرور ہو جاتا۔ جب انصار کسی شبہ کی بنا پر حضرت سعد کی خلافت کا دعویٰ لے کر کھڑے ہو گئے تھے تو کیا حضرت علی کے اعوان و انصار آپ کی حمایت میں کھڑے نہیں ہو سکتے تھے؟ خصوصاً جبکہ بقول شیعہ امامت علی کے بارے میں نص رسول بھی موجود تھی اور آپ اس کا اولیں استحقاق بھی رکھتے تھے۔

جب کوئی شخص بھی حضرت علی کی خلافت کا دعویٰ لے کر کھڑا نہ ہوا اور نہ کسی نے اس ضمن میں بات چیت کی اور امارت و خلافت کا سلسلہ پورے امن و سکون کے ساتھ حضرت علی کے مسند خلافت پر متمکن ہونے تک جاری رہا۔ اس وقت آپ نے اپنا حق وصول کرنے کے لیے جنگیں لڑیں اور آپ کے احباب و انصار آپ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے تو یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ

خلافت صدیقی وفاروقی میں آپ کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی خلافت وامارت کے مقتضیات موجود نہ تھے یہ نہیں کہ کسی مانع نے روک دیا تھا اگر حضرت علی کے پاس اپنی خلافت کی کوئی منصوص دلیل ہوتی تو حضرت ابوبکر۔ معاویہ کی نسبت آپ کی خلافت میں رکاوٹ پیدا کرنے سے کلیتہً کنارہ کشی اختیار کرتے۔

اگر حضرت ابوبکر ظالم ہونے کے باوجود امارت وخلافت کا دعویٰ لے کر کھڑے ہو جاتے اور دوسری جانب حضرت علی حق وصواب کی بنا پر اس کے مدعی ہوتے تو شرع وعقل کا تقاضا یہ تھا کہ ظالم کے مقابلہ میں امام معصوم ومنصوص کی حمایت کی جائے۔ لہٰذا تحقیق کی راہ پر چل کر صدق وصواب کا ساتھ دینا چاہیئے اور جدال ومکابرہ کو ترک کردینا چاہیئے۔

سفسطہ (باطل استدلال ومغالطہ) کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) کسی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا اور اسے جھٹلانا۔ خواہ اس کے وجود کا انکار کیا جائے یا اس کے علم کا۔

(۲) شک وریب کی بنا پر کوئی بات کہنا یہ فرقہ لاادریہ کا طریق ہے جو کسی چیز کی نہ نفی کرتے ہیں نہ اثبات۔ درحقیقت وہ اپنے علم کا انکار کرتے ہیں۔

(۳) سفسطہ کی تیسری قسم ان لوگوں کا قول ہے جو حقائق کو اپنے عقائد وافکار کے تابع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو شخص عالم کو قدیم سمجھتا ہے اس کے نزدیک وہ قدیم ہے اور جو حادث تصور کرتا ہے اس کے خیال میں حادث ہے۔

بنابریں شیعہ کی روایت کردہ موضوعات کی بنا پر آنحضور اور خلفاء راشدین کے حالات پر معترض ہونا ایک عظیم مغالطہ ہے۔ اسی طرح جو شخص حضرت معاویہ اور ان کے اعوان وانصار کی شان میں ایسے فضائل بیان کرتا ہے جن سے حضرت علی پر ان کی تقدیم وافضلیت ثابت ہوتی ہے بہت بڑا مغالطہ باز اور کاذب ہے۔

حضرت علی کے احوال سے آپ کی امامت پر استدلال

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

ہم اب حضرت علی کے احوال سے آپ کی امامت پر استدلال کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ بہت بڑے عابد و زاہد اور حد درجہ عالم و شجاع تھے۔ شیعہ مصنف نے اس ضمن میں حضرت علی کے چند خوارق عادات کا بھی ذکر کیا ہے"۔

ہم کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑے زاہد حضرت ابوبکر تھے۔ آپ نے اپنا تمام تجارتی سرمایہ خدا کی راہ میں دے دیا تھا[1]۔ جب آپ مسند آرائے خلافت ہوئے تو فروخت کے لیے چادریں اپنے کندھا پر ڈالے بازار جا رہے تھے کہ مہاجرین کو پتہ چلا اور انہوں نے آپ کا وظیفہ مقرر کیا۔ حضرت ابوعبیدہ نے حلف اٹھا کر حضرت عمر کو بتایا کہ ابوبکر دو درہم یومیہ لینے کے مجاز ہیں۔ ابن زنجویہ (ان کا نام حمید بن مخلد ہے۔ یہ بڑے ثقہ راوی اور حافظ حدیث تھے۔ ۲۴۷ھ میں وفات پائی) فرماتے ہیں۔

حضرت علی آغاز اسلام میں تنگدست تھے۔ پھر آپ نے زرعی اراضی، مکانات اور باغات خرید لیے تھے۔ وفات کے وقت آپ کے یہاں چار بیویاں اور انیس[۱۹] لونڈیاں تھیں"۔

محمد بن کعب القرظی روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا۔

"عہد رسالت میں میں بھوک کی شدت کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے رہتا تھا اور آج میری ثروت کا یہ عالم ہے کہ میرے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار تک پہنچتی ہے"۔

ابراہیم بن سعید جوہری روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا "میرے مال کی زکوٰۃ چار ہزار دینار تک پہنچتی ہے"۔

---

[1] ابوداؤد نے بسند صحیح ہشام بن عروہ سے روایت کیا ہے کہ میرے والد نے بتایا جب ابوبکر اسلام لائے تھے تو آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ عروہ کہتے ہیں مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ جب حضرت ابوبکر فوت ہوئے تو انہوں نے کوئی درہم و دینار پیچھے نہیں چھوڑا تھا اسامہ بن زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر تجارت میں مشہور تھے۔ آنحضور کی بعثت کے وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ ان میں سے آپ غلام آزاد کرنے اور مسلمانوں کی امداد کیا کرتے تھے۔ جب مدینہ پہنچے تو ان میں سے کل پانچ ہزار درہم بچے تھے۔ آپ یہ سرمایہ نیک کاموں پر صرف کیا کرتے تھے ۱۲

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی کے زہد کو حضرت ابوبکر کے زہد سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ حضرت ابوبکر کے بعد زہد میں حضرت عمر کا درجہ تھا پھر حضرت ابو عُبیدہ اور ابوذرؓ کا۔ اس کے علاوہ دیگر صحابہ کے مال و دولت میں بڑی وسعت پائی جاتی تھی۔ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"حضرت علی کی اراضی میں سے ایک ینبع کی جاگیر تھی۔ جہاں سے باقی غلہ کے علاوہ ایک ہزار وسق کھجور کی آمدنی ہوتی تھی"۔

زہد کے معنی ہیں اچھی آواز مال دنیوی لذات اولاد اور خدم وحشم کی خواہش سے روگردانی کرنا اور اس کے سوا زہد کا اور کوئی مطلب نہیں۔ حضرت ابوبکر نے اپنا سب مال خدا کی راہ میں صرف کر دیا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے وہ آپ نے تقسیم کر دیئے۔ آپ کے پاس ایک چوغہ باقی رہ گیا تھا جب زمین پر بیٹھتے تو اسے نیچے بچھا لیا کرتے تھے۔ دوسرے لوگوں نے مکانات اور زرعی اراضی خرید لی تھیں۔ مگر آپ نے کچھ نہیں خریدا تھا جب خلافت پر فائز ہوئے تو نہ لونڈی خریدی نہ مال میں اضافہ کیا۔ بخلاف ازیں حضرت علی نے خلیفہ ہونے کے بعد حلال اشیاء میں وسعت پیدا کی تھی۔ وفات کے وقت آپ کی متعدد بیویاں اور انیس[19] لونڈیاں تھیں۔ دیگر خدم وحشم اس کے علاوہ ہیں آپ کے چوبیس لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ آپ نے اتنی زمین چھوڑی تھی جو ان سب کے لیے کافی تھی۔ یہ اس قدر مشہور بات ہے کہ کسی کو اس سے مجال انکار نہیں۔

حضرت ابوبکر کے بیٹوں میں عبدالرحمن بن ابی بکر جیسے ہونہار بھی تھے۔ اسی طرح آپ کے اقارب میں حضرت طلحہ جیسے صحابہ شامل تھے جو عشرہ مبشرہ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ان میں سے کسی کو بھی کسی علاقہ کا عامل مقرر نہیں کیا تھا حالانکہ آپ کے عہد خلافت میں مکہ و مدینہ و یمن و خیبر و بحرین و حضرموت و عمان و طائف و یمامہ کے علاقے آپ کے زیر تسلط تھے۔ پھر حضرت عمر بھی آپ کے نقش قدم پر چلے اور اپنے قبیلہ بنی عدی میں سے کسی کو بھی عہدہ دار مقرر نہیں کیا تھا۔

حضرت عمر نے شام و مصر اور عراق سے لے کر خراسان تک تمام علاقے فتح کر لیے تھے

آپ نے اپنے قبیلہ کے نعمان بن عدی کو میسان کا عامل مقرر کیا تھا مگر جلد ہی اسے اس منصب سے معزول کر دیا۔ حالانکہ بنی عدی میں سعید بن زید، ابو جہم بن حذیفہ و خارجہ بن حذیفہ و معمر بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر جیسے لوگ موجود تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر میں سے کسی نے بھی اپنے بعد اپنے بیٹے کو منصب خلافت پر فائز نہیں کیا تھا۔ بعض لوگ عبد اللہ بن عمر کو خلافت کا اہل تصور کرتے تھے اور اگر حضرت عمر انہیں خلیفہ مقرر کر دیتے تو کسی شخص کو بھی اس پر اعتراض نہ ہوتا۔ تاہم آپ نے اس سے احتراز کیا۔

حضرت علی کی اقارب نوازی

بخلاف ازیں حضرت علی نے اپنے اقارب کو عہدہ ہائے جلیلہ تفویض کیے تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابن عباس کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ عبید اللہ بن عباس کو یمن کا۔ حضرت عباس کے دونوں بیٹوں قثم و معبد کو مکہ و مدینہ کا حاکم بنایا۔ اپنے بھانجا جعدہ بن ہبیرہ کو خراسان اور اپنی بیوی کے بیٹے اور بیٹے کے بھائی محمد بن ابی بکر کو حاکم مصر مقرر کیا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹے کی بیعت پر اظہار خوشنودی کیا تھا۔ ہم آپ کی اہلبیت و صلاحیت اور عظمت و زہد کا انکار نہیں کرتے۔ البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر

ف۱ یہ شیعہ کا دعویٰ ہے۔ شیعہ کا مذہب و مسلک ائمہ کے بارے میں اسی پر مبنی ہے۔ بخلاف ازیں مسند احمد ج ۱ ص ۱۳۰ حدیث نمبر ۱۰۷۸ میں بروایت عبد اللہ بن سبیع منقول ہے کہ میں نے حضرت علی سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ مجھے قتل کیا جائے گا۔ لوگوں نے کہا پھر ہم پر خلیفہ مقرر فرمائیے فرمایا "نہیں میں تمہیں اسی طرح چھوڑ کر جا رہا ہوں جیسے آنحضور تشریف لے گئے تھے۔ اسی طرح مسند احمد ج ۱ ص ۱۵۶ حدیث نمبر ۱۳۳۹ میں تحریر ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۵۰۔ ۲۵۱ پر شقیق بن سلمہ تابعی نیز کتاب مذکور ج ۷ ص ۳۲۳ پر ثعلبہ بن یزید رافضی سے اسی طرح مروی ہے۔ نیز ملاحظہ فرمائیے السنن الکبریٰ بیہقی ج ۸ ص ۱۴۹۔

آپ سے بڑھ کر زاہد اور تارک دنیا تھے۔ ان کے مقابلہ میں حضرت علی مباحات سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے

"حضرت علی نے دنیا کو تین طلاقیں دے رکھی تھیں۔ آپ جَو کا دلیا کھاتے اور موٹا جھوٹا پہنا کرتے تھے۔ آپ کے کوٹ کو پیوند لگے تھے۔ آپ کی تلوار کی پیٹی اور نعل کھجور کی چھال سے بنے ہوئے تھے۔ خطیب خوارزمی نے حضرت عمار سے روایت کیا ہے کہ میں نے سنا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔

"اے علی! اللہ تعالیٰ نے تجھے زہد سے مزین کیا اور دنیا کو تمہاری نگاہ میں بے وقعت کر دیا ہے آپ فقراء کو دوست رکھتے اور وہ تجھے اپنا امام تصور کرتے ہیں۔ اس شخص کے لیے بشارت ہو جو تجھ سے محبت رکھے اور تیرے بارے میں سچی بات کہے۔ اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جو تجھ سے بغض رکھے اور تجھ پر جھوٹ باندھے"۔ سُوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ میں حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کے سامنے کھٹا دودھ پڑا ہے جس میں سے بُو آ رہی تھی۔ آپ کے ہاتھ میں روٹی تھی جس پر جَو کے چھلکے لگے تھے۔ یہ لمبی حدیث ہے۔

ضرار کہتے ہیں حضرت علی کی شہادت کے بعد میں حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے کہا حضرت علی کی تعریف بیان کیجئے۔ میں نے کہا حضرت علی بڑے عالی ہمت اور طاقتور تھے۔ آپ فیصلہ کن بات کہتے اور عدل و انصاف کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتے تھے۔ آپ کی ذات سے علم و حکمت کے چشمے ابلتے تھے۔ دنیا کی سرسبزی و شادابی سے نفرت کرتے۔ رات کی وحشت انھیں عزیز تھی۔ آپ زیادہ روتے اور اکثر سوچ بچار میں مصروف رہا کرتے تھے۔ موٹے جھوٹے لباس کو پسند کرتے اور خشک کھانا کھایا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ اس طرح بے تکلف ہوا کرتے تھے جیسے ہم میں سے کوئی شخص ہو۔"

حضرت معاویہ یہ سن کر رو پڑے اور فرمایا اللہ تعالیٰ ابوالحسن پر رحم فرمائے بخدا وہ ایسے ہی تھے۔ پھر پوچھا ضرار! حضرت علی کی شہادت سے تمہیں کس قدر صدمہ ہوا؟ ضرار نے

کہا۔ "اتنا ہی غم جتنا اس شخص کو ہوتا ہے جو اپنی گود میں اپنے بچے کو ذبح کردے نہ تو اس کے آنسو خشک ہوتے ہیں اور نہ غم ہلکا ہوتا ہے"۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

حضرت علی کا زہد و تقویٰ

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی کے زہد میں کوئی کلام نہیں تاہم حضرت ابوبکر ان سے بڑھ کر زاہد تھے۔ شیعہ نے زہد علی میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ جھوٹ کا طومار ہیں تاہم اس میں مدح علی سے متعلق کوئی بات موجود نہیں۔ دنیا کو طلاق دینے والی روایت کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے فرمایا تھا۔

"اے زرد اور گوری چٹی دنیا! میں نے تجھے طلاق دیدی اب جا کر کسی اور کو مبتلائے فریب کر میں تجھے دوبارہ اپنے گھر میں آباد نہیں کروں گا"۔

حضرت علی کے اس بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ان لوگوں سے زاہد تر ہیں جنہوں نے یہ بات نہیں کہی تھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ جیسے انبیاء سے بھی یہ الفاظ منقول نہیں ہیں۔ ایسے الفاظ کہنے کی نسبت خاموش رہنا مناسب تر اور دلیل اخلاص ہے۔ شیعہ کا یہ قول کہ حضرت علی سالن کے بغیر جو کی روٹی کھایا کرتے تھے صاف جھوٹ ہے مگر یہ کہ اس میں مدح کی کوئی بات نہیں۔ آنحضور امام الزہاد تھے اس کے باوصف جو مل جاتا کھا لیا کرتے تھے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے بکرے اور مرغے کا گوشت کھایا ہے آپ شیریں کھانے اور شہد کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ جب کھانا پیش کیا جاتا تو اگر ضرورت ہوتی کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے نہ موجود کھانے کو واپس کرتے اور نہ غیر موجود کو طلب فرماتے۔ بعض اوقات بھوک کی شدت سے شکم پر پتھر بھی باندھ لیا کرتے تھے۔

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ مسجد نبوی میں ایک صحابی کہنے لگے میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں قیام میں مشغول رہوں گا اور آرام نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی نہیں کروں گا۔ چوتھے نے کہا میں گوشت کھانا ترک کردوں گا۔ آنحضور نے یہ باتیں سن کر فرمایا میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔

قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ بیویوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں جس نے میری سنت سے انحراف کیا اس کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں (بخاری ومسلم)

پھر حضرت علی کے بارے میں یہ گمان کہاں تک صحیح ہے کہ وہ نبی کریم کی سنت سے منحرف ہو گئے تھے؟ بخلاف ازیں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ کی ذکر کردہ یہ بات غلط ہے۔

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی کی تلوار کی پیٹی اور نعل کھجور کی چھال سے بنے ہوئے تھے" یہ صاف جھوٹ ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آنحضور کی تلوار کا نعل چاندی کا بنا ہوا تھا جب اللہ تعالے نے ان کو خوشحالی و فارغ البالی سے نوازا تھا۔ تلوار کے لیے چمڑے کی پیٹی بنانے میں کیا مضائقہ تھا۔ خصوصاً جبکہ حجاز میں چمڑے کی فراوانی ہے اس بات کی ضرورت تب لاحق ہوتی اگر چمڑا نایاب ہوتا۔

جیسے حضرت ابو امامہ فرماتے ہیں "مختلف بلاد و امصار کو اس قوم نے فتح کیا ہے جن کے گھوڑوں کی باگ ڈور رسیوں سے بنی ہوتی تھی اور جن کی رکابیں پٹھوں سے تیار کی جاتی تھیں۔ (بخاری)

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی زہد میں عدیم المثال تھے لہذا آپ ہی خلیفہ ہوں گے"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں احتمال باطل ہیں (۱) حضرت علی حضرت ابو بکر سے بڑھ کر زاہد نہ تھے (۲) یہ ضروری نہیں کہ جو زاہد ہو وہ امام و خلیفہ بھی ہو۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ محمد بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کو یہ فرماتے سنا میرے مال کی زکوٰۃ آج کے دنوں چالیس ہزار تک پہنچتی ہے آپ نے اپنی وفات کے وقت بہت سے غلام لونڈیاں اور کثیر جائداد چھوڑی تھی۔ البتہ نقدی صرف سات سو درہم تھی۔ دوسری طرف فاروق اعظم کی یہ حالت تھی کہ فتح خیبر کے موقع پر مال غنیمت سے جو حصہ ملا تھا وہ راہ خدا میں وقف کر دیا تھا۔

آپ کی زرعی اراضی نہیں تھی۔ جب شہادت پائی تو اس وقت اسی ہزار کے مقروض تھے

حضرت علی کی کثرت عبادت

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "حضرت علی لوگوں سے بڑھ کر عبادت گذار تھے۔ دن بھر روزہ رکھتے اور راتوں کو قیام کیا کرتے تھے۔ نماز تہجد اور دن کے نوافل لوگوں نے علی سے سیکھے آپ سارا وقت عبادات و وظائف میں بسر کیا کرتے تھے۔ شب و روز میں آپ ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیئے آپ مزدوری کر کے جو کچھ کماتے وہ شعب ابی طالب میں آنحضور پر خرچ کیا کرتے تھے"۔

ہم کہتے ہیں یہ اکاذیب کسی صاحب علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ چونکہ یہ سب امور خلاف سنت ہیں اس لیے ان میں مدح والی کوئی بات نہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور نے فرمایا "مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ نے کہا کہ میں تازندگی ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور ہمیشہ قیام کیا کروں گا"۔ عبداللہ نے عرض کیا حضور! یہ بات درست ہے فرمایا "ایسا نہ کر"۔

بخاری و مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ آنحضور نے ہمارے دروازہ پر دستک دے کر فرمایا کیا تم دونوں نماز نہیں پڑھ رہے"؟ میں نے عرض کیا حضور! ہماری جانیں خدا کے ہاتھ میں ہیں جب چاہتا ہے ہمیں جگا دیتا ہے"۔ یہ سن کر آپ ازراہ افسوس اپنی ران پر ہاتھ مارتے اور یہ کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے کہ انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رات کو سویا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ آنحضور نے حضرت علی کے اسلوب کلام کو پسند نہیں فرمایا تھا (بخاری و مسلم)

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "لوگوں نے حضرت علی سے یہ باتیں سیکھیں"۔ اگر شیعہ کی مراد یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے یہ باتیں حضرت علی سے سیکھیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں لوگ ہمیشہ اپنے اکابر سے اچھی باتیں سیکھتے چلے آئے ہیں اور اگر شیعہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ سب لوگوں نے یہ آداب آپ سے سیکھے تو یہ بڑا مکروہ جھوٹ ہے

اس لیے کہ صحابہ نے یہ باتیں آنحضور سے سیکھی تھیں جہاں تک تابعین کا تعلق ہے ان میں سے اکثر نے حضرت علی کو دیکھا تک نہ تھا۔ ان سے آداب عبادت سیکھنا تو درکنار۔

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی کا سب وقت ادعیۂ ماثورہ پڑھتے ہوئے گذرتا تھا" ہم کہتے ہیں حضرت علی سے منقول ادعیہ زیادہ تر موضوع ہیں[۱]۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی یہ دعائیں نہیں پڑھا کرتے تھے۔ سب سے افضل دعائیں وہ ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ بحمد اللہ وہ اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی موجودگی میں دوسری کسی دعا کی حاجت نہیں[۲]

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے"۔ باطل ہے۔ شب و روز میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی نماز چالیس رکعت تھی۔ ایک امیر امت جو لوگوں کے امور متنازعہ فیصل کرتا اور ان کے سیاسی مصالح میں مشغول رہتا ہو ہزار رکعت ادا کرنے پر اسی صورت میں قادر ہو سکتا ہے جب وہ ٹھونگے مارنے والی نماز ادا کرتا ہو ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت علی کا دامن ایسی بیکار نماز سے پاک ہے۔

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی نے نماز کے دوران زکوٰۃ ادا کردی تھی" صریح جھوٹ ہے اس میں مدح کی کوئی بات نہیں۔ بلکہ شرعاً نماز میں ایسی حرکت کرنا ناروا ہے۔

شیعہ مصنف کہتا ہے کہ "حضرت علی نے اپنی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے تھے" یہ صریح کذب ہے اور اسے ایک جاہل شخص ہی تسلیم کر سکتا ہے۔ حضرت علی نے ایک ہزار تو کیا ایک سو غلام بھی آزاد نہیں کیے تھے۔ بلکہ اپنی کمائی سے آپ اس کا عشر عشیر بھی

---

[۱] محمد باقر اصبہانی (۱۰۳۷ – ۱۱۱۰) نے ادعیہ ماثورہ پر مشتمل ایک کتاب "زاد المعاد" نامی ۱۱۰۷ھ میں شاہ حسین صفوی کے لیے تصنیف کی تھی یہ کتاب خلاف دین اکاذیب کا مجموعہ ہے۔ میرے پاس اس کتاب کا ایک نسخہ موجود ہے جو ۱۲۵۱ھ میں تبریز کے مقام پر چھاپا گیا ہے (محب الدین الخطیب)

[۲] امام نووی کی کتاب "الاذکار"۔ نیز امام ابن تیمیہ کی تصنیف "الکلم الطیب" اور ابن قیم کی "الوابل الصیب" میں سب ادعیہ ماثورہ یکجا ہیں ۱۲

انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ آپ زیادہ تر جہاد میں مشغول رہتے تھے۔ تجارت بھی نہیں کرتے تھے۔ صنعت و حرفت سے نا آشنا تھے پھر ایک ہزار غلام آزاد کرنا آپ کے لیے کیونکر ممکن تھا؟

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی مزدوری کر کے شعب ابی طالب میں آنحضور پر خرچ کیا کرتے تھے"۔ صریح کذب ہے۔ اس لیے کہ بنو ہاشم شعب ابی طالب سے باہر نہیں نکلا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہاں ایسا کوئی شخص نہ تھا جو اجرت دے کر ان سے کام لیتا حضرت علی کے والد ان پر خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ بڑی مالدار خاتون تھیں وہ اپنا مال خرچ کرتی تھیں۔ مزید براں شعب ابی طالب کی محصوری کے زمانہ میں حضرت علی کی عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی اور آپ کسی مزدوری کے قابل نہ تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی اعلم الناس تھے"۔

حضرت علی اَعلَمُ النَّاس تھے

ہم کہتے ہیں اعلم الناس حضرت ابوبکر و عمر تھے آنحضور کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کے سوا کوئی شخص نہ فیصلہ صادر کرتا نہ فتوی دیتا اور نہ وعظ کہہ سکتا تھا۔ آنحضور کی وفات لوگوں پر مشتبہ ہو گئی۔ تو حضرت ابوبکر نے ان کا یہ شبہ دور کیا تھا۔ پھر انھیں آپ کی تدفین میں شبہ لاحق ہوا تو حضرت ابوبکر نے اس کا ازالہ کیا۔ پھر مانعین زکوۃ سے نبرد آزما ہونے کے بارے میں تنازع بپا ہوا تو آپ نے نص کی روشنی میں حضرت عمر پر اس کی حقیقت واضح کی۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (الفتح۔ ۲۷)

اگر خدا نے چاہا تو تم خانہ کعبہ میں کامل امن و امان سے داخل ہو گے۔

حضرت[۱] ابوبکر نے آنحضور کی اس حدیث کی تشریح کی تھی۔ کہ اپنے بندے کو اللہ تعالی

---

[۱] امام بیہقی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا مجھے اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اگر ابوبکر مسند خلافت پر متمکن نہ ہوتے تو خدا کی دیا تی پر صفحہ ۷۲۸)

نے اختیار دیا تھا کہ دنیا و آخرت میں سے جسے چاہو پسند کرو"۔ حضرت ابوبکر نے صحابہ کو بتایا کہ کلالہ کسے کہتے ہیں۔ حضرت علی نے بھی آپ سے استفادہ کیا تھا۔ سنن میں حضرت علی سے مروی ہے کہ جب میں آنحضور سے کوئی حدیث سنتا تو جتنا فائدہ اللہ تعالیٰ چاہتے مجھے پہنچاتے۔ جب کوئی اور شخص مجھے حدیث سناتا تو میں اس سے حلف لیتا جب وہ حلف اٹھاتا تو میں اس کی تصدیق کرتا۔ حضرت ابوبکر نے مجھے حدیث سنائی اور انہوں نے سچ کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص بھی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا اور خدا سے اپنے گناہ کی مغفرت طلب کرتا ہے تو اسے بخش دیا جاتا ہے"۔

فضائل شیخین

بہت سے علماء نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر اعلم الصحابہ تھے۔ منصور بن سمعانی نے بھی اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

میرے بعد حضرت ابوبکر و عمر کی پیروی کرو"۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضور کے ساتھ دوران سفر بہت سے مسلمان تھے۔ آپ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۲۷) عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ ابوہریرہ سے لوگوں نے کہا چھوڑیے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ سن کر وہ بولے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سات سو فوجیوں کے ساتھ حضرت اسامہ کو شام روانہ کیا۔ جب ذی خُشُب کے مقام پر پہنچے تو آنحضور نے وفات پائی اور ارد گرد کے لوگ مرتد ہو گئے۔ اصحاب رسول نے حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا اے ابوبکر! جیش اسامہ کو واپس بلا لیجئے یہ لوگ روم کا رخ کیسے ادھر جا رہے ہیں اور ادھر یہ حالت ہے کہ عرب مرتد ہوتے جا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں اگر کتے ازواج النبی کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر لے جائیں جب بھی میں اس جھنڈے کو نہیں کھولوں گا جسے آپ نے باندھا تھا۔ چنانچہ اسامہ لشکر سمیت حازم شام ہوئے جب وہ کسی ایسے قبیلہ سے گذرتے تھے جو مرتد ہونا چاہتا ہو تو قبیلہ والے کہتے اگر ان کے پاس طاقت نہ ہوتی تو یہ مدینہ سے کبھی باہر نہ نکلتے اب ہم انہیں روم پہنچنے دیتے ہیں۔ چنانچہ روم پہنچ کر انہوں نے اہل روم کو شکست دی اور صحیح سلامت مدینہ لوٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرتدین اسلام پر قائم رہے ۱۲

فرمایا۔ اگر لوگ ابوبکر و عمر کی اطاعت کریں گے تو راہ راست پر قائم رہیں گے۔ آنحضور سے مروی ہے کہ آپ نے ابوبکر و عمر کے حق میں فرمایا۔

"جب تم دونوں کسی بات پر متفق ہو جاؤ گے تو میں تمہاری مخالفت نہیں کیا کروں گا"۔

حضرت ابن عباس سے ثابت ہے کہ جب وہ کتاب و سنت میں کوئی نص نہ پاتے تو حضرت ابوبکر و عمر کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کے حق میں دعا فرمائی تھی۔

"اے اللہ! اسے دین کا فہم عطا کر اور اسے قرآن کی تفسیر سکھا دے"۔

علقمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کے ساتھ مختلف امور کے سلسلہ میں بات چیت کیا کرتے تھے میں بھی ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ہجرت کے موقع پر ابوبکر کے سوا آپ کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔ جنگ بدر میں سائبان کے نیچے آنحضور کے ساتھ صرف حضرت ابوبکر ہی تھے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں آنحضور کی خدمت میں حاضر تھا اسی دوران ابوبکر اپنے کپڑے کا کنارا پکڑے ہوئے آئے۔ اور اپنے دونوں زانو ننگے کر دیئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر کسی سے جھگڑ پڑے ہیں۔ ابوبکر نے سلام کے بعد عرض کیا میرے اور عمر کے درمیان کچھ تنازع تھا۔ میں نے جلدبازی سے کام لیا پھر مجھے ندامت کا احساس ہوا تو میں نے کہا معاف کر دیجئے مگر حضرت عمر اس کے لیے تیار نہ ہوئے میں اس مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔ اے ابوبکر خدا تمہیں معاف فرمائے۔ پھر عمر نادم ہوئے اور ابوبکر کے گھر کو آئے ابوبکر کو نہ پایا کہ وہ آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ دیکھ کر آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ابوبکر نے ڈر کر کہا "یا رسول اللہ! مجھ سے زیادتی سرزد ہوئی ہے"۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا۔ تم نے مجھے جھٹلایا مگر ابوبکر نے میری تصدیق کی اور اپنی جان و مال سے میری

ہمدردی کی۔ اب کیا تم میرے رفیق کو میرے لیے رہنے دو گے یا نہیں"؟ آپ نے دو مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد ابوبکر کو کسی نے رنج نہ پہنچایا (بخاری و مسلم)

خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت ابوبکر و عمر کے منصب و مقام کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔ "ابوبکر و عمر کو جو درجہ آنحضور کی زندگی میں حاصل تھا وہ آپ کی وفات کے بعد بھی اسی مرتبہ پر فائز ہیں۔ ابوبکر سے کوئی ایسا قول منقول نہیں جو خلاف نص ہو"۔

اس سے ابوبکر کے علمی تفوق کا اظہار ہوتا ہے دیگر صحابہ سے خلاف نص اقوال منقول ہیں اس لیے کہ شرعی دلائل ان کو نہ پہنچ سکے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ "امم سابقہ میں ملہم موجود تھے اگر میری امت میں کوئی ملہم من اللہ ہوا تو وہ عمر ہیں"۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے خواب میں ایک پیالہ پیش کیا گیا جس میں دودھ تھا وہ میں نے پی لیا یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا جو بچ گیا وہ میں نے عمر کو دیدیا۔ صحابہ نے عرض کیا پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی کہا دودھ سے علم مراد ہے"۔

ترمذی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے"۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا "حضرت ابوبکر تمام صحابہ میں آنحضور کے علم سے زیادہ واقف تھے"۔

حضرت علی فرمایا کرتے تھے۔

جس شخص کے بارے میں مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے ابوبکر و عمر پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر حد قذف قائم کردوں گا"۔

حضرت علی سے تقریباً اسی مختلف طرق سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا۔ "اس امت میں نبی صلی اللہ علیہ کے بعد سب سے افضل ابوبکر و عمر ہیں"۔

امام بخاری نے محمد بن حنفیہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے والد حضرت علی سے پوچھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا بیٹا! کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں"؟ میں نے کہا "نہیں"۔ فرمایا "ابوبکرؓ" میں نے عرض کیا ان کے بعد کون؟ فرمایا "عمرؓ"۔

حدیث "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ" موضوع ہے

شیعہ مصنف لکھتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ہیں اور فصل خصومات علم و دین کو مستلزم ہے۔

ہم کہتے ہیں حدیث "اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ" کی کوئی اسناد معلوم نہیں تاکہ اس سے احتجاج کیا جا سکے اس سے یہ حدیث صحیح تر ہے کہ حضرت معاذ حلال و حرام کے بہت بڑے عالم ہیں" حلال و حرام کا علم دین اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شیعہ کی ذکر کردہ حدیث سنن مشہورہ اور معروف مسانید میں بسند صحیح یا ضعیف کے ساتھ مندرج ہی نہیں۔

یہ جس مناد کے ساتھ مروی ہے اس میں متہم بالکذب راوی پائے جاتے ہیں۔ یہ حضرت عمر کا قول ہے کہ "عَلِیٌّ اَقْضَانَا" (علی صحابہ میں ایک بڑے قاضی تھے) قضاء فصل خصومات کو کہتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ فیصلہ حقیقت حال کے برعکس صادر کیا جاتا ہے احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"تم میرے پاس فصل خصومات کے لیے آتے ہو۔ اس بات کا احتمال ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنا نقطۂ نظر وضاحت سے بیان کر سکتا ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ صادر کر دوں یاد رکھو جس شخص کو میں نے اس کے مسلمان بھائی کے حق میں سے کچھ حصہ دے دیا تو میں نے اسے دوزخ کا ایک قطعہ الاٹ کر دیا"۔

اس حدیث میں سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کیا کہ آپ کے حکم دینے سے نہ حلال چیز حرام ہو جاتی ہے اور نہ حرام چیز حلال ٹھہرتی ہے۔

شیعہ کی پیش کردہ حدیث "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا" حد درجہ ضعیف ہے اگرچہ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے تاہم یہ موضوعات میں شمار کی جاتی ہے۔ ابن الجوزی

فرماتے ہیں کہ اس کے جملہ طرق موضوع ہیں۔ اس کا متن خود اس کے موضوع ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ جب آپ کی ذات علم کا شہر ہوئی اور اس کا دروازہ صرف ایک حضرت علی ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضور کے اقوال وارشادات کے مبلغ صرف علی ہوں گے۔ اس سے دین اسلام کا فساد لازم آتا ہے۔ اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آنحضور کے اقوال وارشادات کو لوگوں تک پہنچانے والے اتنے کثیر التعداد لوگ ہونے چاہئیں کہ جن سے خبر متواتر حاصل ہو اس لیے کہ خبر واحد سے وہ علم حاصل نہیں ہوتا جو قرآن اور احادیث متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ علی اگرچہ واحد ہیں مگر معصوم ہیں۔ اس لیے آپ کی خبر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ شیعہ پہلے آپ کا معصوم ہونا ثابت کریں۔ حضرت علی کی معصومیت ان کے قول ہی سے ثابت نہیں ہو جائے گی۔ کیونکہ اس طرح دور لازم آتا ہے۔ اجماع سے بھی آپ کا معصوم ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لیے کہ آپ کی معصومیت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آنحضور نے کتاب وسنت کا جو علم اکناف عالم میں پھیلایا تھا اس سے سب کرۂ ارضی معمور ہو چکا ہے۔ حالانکہ حضرت علی کی منفرد روایات آنحضور سے حد درجہ قلیل ہیں۔ پھر یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت علی ہی آنحضور کے علم کا واحد دروازہ تھے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مدینہ میں اہل التابعین وہ تھے جو خلافت فاروقی وعثمانی کے تربیت یافتہ تھے نہ کہ علوی خلافت کے حضرت معاذ نے تابعین اور اہل یمن کو جو تعلیم دی وہ حضرت علی کی تعلیمات سے بہت بڑھ کر تھی جب حضرت علی وارد کوفہ ہوئے تو وہاں جلیل القدر تابعین کی خاصی تعداد موجود تھی۔ مثلاً شریح وعبیدہ وعلقمہ ومسروق اور ان کے نظائر وامثال۔

امام محمد بن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"رہ افض کہتے ہیں کہ حضرت علی اعلم الناس تھے۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ کسی صحابی کے علم کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ اس کے فتاویٰ وروایات کی تعداد کس قدر ہے۔ اور

آنحضور نے کس حد تک اسے مختلف کاموں پر مامور کیا۔"

جب ہم نے اس بات کو جانچ پرکھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آنحضور نے حضرت ابوبکر کو اپنی بیماری کے دوران امام صلوٰۃ مقرر کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت حضرت عمر و علی و ابن مسعود و ابی بن کعب اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ غزوہ تبوک کو جاتے وقت جب آپ نے حضرت علی کو اپنا نائب مقرر کیا تھا وہ اس سے مختلف ہے اس لیے کہ مدینہ میں اس وقت صرف بچے اور عورتیں تھیں۔

حضرت ابوبکر کو امام مقرر کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ دیگر صحابہ کی نسبت نماز کے مسائل سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور نماز دین اسلام کا رکن رکین ہے علاوہ ازیں آنحضور نے حضرت ابوبکر کو امیر حج مقرر کیا تھا اور زکوٰۃ کی فراہمی کے لیے عامل بھی بنایا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان مسائل کو دیگر صحابہ کی نسبت بہتر طور پر جانتے تھے۔

علاوہ ازیں آنحضور نے حضرت ابوبکر کو لشکر کا سپہ سالار بھی بنایا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ دیگر مجاہدین کی طرح جہاد کے احکام و مسائل سے بھی آگاہ تھے اور اس ضمن میں آپ کا پایہ حضرت علی سے فروتر نہ تھا۔ جب علمی مسائل صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کے احکام میں حضرت ابوبکر کا حضرت علی پر تفوّق ثابت ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد کے مسائل جاننے میں آپ حضرت علی سے پیچھے نہ تھے تو اس سے آپ کا علمی پایہ واضح ہو جاتا ہے

خلفاء اربعہ کے مسائل و فتاویٰ میں موازنہ

حضرت ابوبکر سفر و حضر میں آنحضور کی صحبت و رفاقت میں رہا کرتے تھے اور اس طرح آنحضور کے فتاویٰ و احکام سے بذات خود آگاہ تھے۔ بنا بریں آپ احکام و مسائل سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں حضرت ابوبکر دوسروں پر فائق نہ ہوں یا کم از کم اس میں دوسروں کے برابر نہ ہوں جہاں تک روایت و فتویٰ کا تعلق ہے آپ کو اس کی ضرورت بہت کم پیش آئی اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضور کی وفات کے صرف اڑھائی سال بعد حضرت ابوبکر کا انتقال ہو گیا تھا۔

اس قلیل عرصہ میں روایت و فتوی کی ضرورت بہت کم پیش آئی۔ کیونکہ آپ کی رعیت کو بھی آنحضور کی صحبت کا شرف اسی طرح حاصل ہو چکا تھا جیسے آپ کو اس لیے وہ شرعی احکام سے کماحقہ آگاہ تھے اور دوسروں سے مسائل دریافت کرنے کی ضرورت انہیں بہت کم پیش آتی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک سو چالیس (۱۴۰) احادیث مروی ہیں آپ کے فتاوی اس پر مزید ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پانچ سو چھیاسی احادیث روایت کی گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی آنحضور کے تیس سال بعد تک زندہ رہے اس طویل عرصۂ حیات میں بکثرت لوگوں سے ملنے کی نوبت آئی۔ چونکہ اکثر صحابہ فوت ہو چکے تھے اس لیے لوگوں نے آپ کے علم سے استفادہ کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ مدینہ و بصرہ و کوفہ و صفین کے لوگوں نے آپ سے علمی مسائل دریافت کیے۔

جب ہم ان تاریخی حقائق پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں کہ حضرت ابوبکر آنحضور کے بعد بہت کم زندہ رہے اس کے برخلاف حضرت علی نے طویل زندگی پائی اور مختلف شہروں میں سکونت پذیر رہے اور وہاں کے رہنے والوں نے آپ سے احکام و مسائل روایت کیے۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر جم کر مدینہ میں رہے اور کہیں ادھر ادھر نہ گئے پھر یہ کہ آپ کے عہد خلافت میں لوگوں کو مسائل دریافت کرنے کی ضرورت بہت کم لاحق ہوا کرتی تھی کیونکہ وہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے ان حقائق کے پیش نظر جب ہم حضرت ابوبکر کی مرویات و فتاوی کا حضرت علی کی روایت کردہ احادیث و فتاوی کے ساتھ تقابل کریں تو ہر صاحب علم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت ابوبکر علم و فضل میں بدرجہا حضرت علی پر فائق تھے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ میں جو قلیل العمر تھے ان کی مرویات کی تعداد طویل عمر پانے والوں کی نسبت بہت کم ہے۔ حضرت عمر مدینہ میں سکونت پذیر تھے۔ آپ ملک شام کو بھی گئے تھے آپ کی مرویات کی تعداد پانچ سو سینتیس (۵۳۷) ہے یہ تعداد

حضرت علی کی مرویات کے لگ بھگ ہے حضرت عمر کی وفات حضرت علی سے سترہ سال قبل ہوئی تھی۔ ہنوز بہت سے صحابہ بقید حیات تھے۔ حضرت عمر کے بعد طویل عرصہ زندہ رہنے کے باوصف حضرت علی نے صرف ۹۴۔ احادیث حضرت عمر سے زیادہ روایت کی ہیں۔

احادیث صحیحہ کا اعتبار کیا جائے تو حضرت علی کی صرف ایک یا دو روایتیں حضرت عمر سے زیادہ ہیں۔ فقہی مسائل میں حضرت عمر کے فتاوی حضرت علی کے مسائل و فتاوی کے مساوی ہے۔ جب ہم حضرت عمر و علی دونوں کی مدت حیات اور سیاحت بلاد کا موازنہ کریں اور اس کے پہلو بہ پہلو ان کی مرویات و فتاوی کا بھی تقابل کریں تو ہر سلیم العقل آدمی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گا کہ حضرت عمر علم و فضل میں حضرت علی سے بڑھ کر تھے۔

چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زمانہ کے اعتبار سے متاخر تھیں اس لیے آپ کی مرویات دو ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔ حضرت ابن عمر اور انس کی روایات بھی اس کے لگ بھگ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے پانچ ہزار احادیث مرفوعہ اور تین صد احادیث غیر مرفوعہ روایت کی گئی ہیں۔ حضرت ابن مسعود کی مرویات کی تعداد آٹھ صد سے زائد ہے۔

حضرت ابن مسعود و عائشہ اور ابن عمر کے فتاوی حضرت علی کے فتاوی سے زیادہ ہیں۔ کیونکہ یہ صحابہ حضرت علی کے بعد بھی زندہ رہے۔

اسی طرح ابن عباس کی مرویات ایک ہزار پانچ صد ۱۵۰۰ سے زیادہ ہیں ان کے فتاوی و تفسیری اقوال کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ لہذا روافض کا قول باطل ٹھہرا یہ درست ہے کہ آنحضور نے حضرت علی کو عامل مقرر کیا تھا اور یہ عہدہ اصحاب علم ہی کو تفویض کیا جاتا ہے۔ مگر اس میں خصوصیت کی کوئی بات نہیں حضرت معاذ اور ابو موسیٰ کو بھی اس عہدہ پر فائز کیا گیا تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی نہایت ذہین وفطین اور علم کے بہت بڑے حریص تھے بچپن سے لیکر تا وفات آنحضور کی صحبت میں رہے"۔

ہم کہتے ہیں یہ بات کیسے ثابت ہوئی کہ حضرت علی حضرت ابو بکر و عمر سے زیادہ ذہین اور ان سے زیادہ شائق علم تھے؟ بخاری و مسلم کی متعدد احادیث سے حضرت ابو بکر و عمر کے علم و فضل پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو سعید خدری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے قمیضیں پہن رکھی ہیں بعض کی قمیض سینہ تک پہنچتی ہے اور بعض کی اس سے نیچے۔ حضرت عمر جب پیش کیے گئے تو وہ قمیض کا دامن کھینچتے ہوئے گذرے۔ لوگوں نے پوچھا پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر کی؟ فرمایا۔ قمیض سے دین مراد ہے"۔

جب حضرت عمر نے شہادت پائی تو حضرت ابن مسعود نے کہا علم کے نو حصے رخصت ہو گئے اور ایک حصہ باقی رہا۔ جس میں سب لوگ شریک ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"بچپن میں جو علم حاصل کیا جائے وہ کالنقش فی الحجر ہوتا ہے بنا بریں حضرت علی دوسروں سے بڑھ کر عالم ہوں گے۔ نیز اس لیے کہ آپ کے استاد (نبی) ہر لحاظ سے کامل تھے اور شاگرد (علی) میں قبول علم کی استعداد موجود تھی"۔

ہم کہتے ہیں یہ ایک عامیانہ کلام ہے اور حدیث رسول نہیں ہے۔ اقتضاء حدیث کے عین برخلاف صحابہ نے کتاب و سنت کا علم بڑی عمر میں سیکھا تھا تاہم اللہ تعالیٰ نے ان پر اس کی تحصیل آسان کر دی تھی۔ حضرت علی کا بھی یہی حال ہے۔ ابھی وحی تکمیل پذیر نہیں ہوئی تھی کہ حضرت علی کی عمر تیس ۳۰ سال کو پہنچ گئی۔ آپ نے قرآن بڑی عمر میں یاد کیا تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا حضرت علی کو پورا قرآن یاد تھا یا نہیں؟ دوسری طرف حضرت ابو ہریرہ کو دیکھئے انہوں نے صرف تین سال کے عرصہ میں جو کچھ یاد کر لیا تھا دوسرے صحابہ وہ طویل عرصہ میں بھی یاد نہ کر سکے تھے۔

حضرت علی علم نحو کے واضع تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی علم نحو کے واضع تھے۔ آپ نے ابوالاسود سے کہا تھا۔ کلام کی تین قسمیں ہیں۔ اسم[۱]۔ فعل[۲]۔ حرف[۳]۔ حضرت علی نے ابوالاسود کو اعراب کے اقسام بھی بتائے تھے۔"

ہم کہتے ہیں علم نحو علوم نبوت میں شمار نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک استنباطی علم ہے۔ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں لوگ اعراب پڑھنے میں غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے تھے اس لیے اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جب حضرت علی کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے تو وہاں عجمی لوگ بود و باش رکھتے تھے جو اکثر اعراب میں غلطیاں کیا کرتے تھے اس لیے آپ نے علم نحو کی ضرورت محسوس کی۔

نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علی نے ابوالاسود سے کہا تھا "اُنحُ هٰذَا النَّحْوَ" (اسی طریقہ پر چلیے)۔ بنابریں اس علم کو نحو کے نام سے موسوم کیا گیا جس طرح دوسرے لوگوں (حجاج بن یوسف ثقفی) نے ضرورت کے پیش نظر نقطے نیز "مد و شد" وغیرہ علامات ایجاد کیں اور خلیل نے علم عروض وضع کیا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"سب فقہاء حضرت علی کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔

ہم کہتے ہیں یہ صاف جھوٹ ہے ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء میں سے کوئی بھی فقہ علی کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ جہاں تک امام مالک کا تعلق ہے آپ اہل مدینہ سے اخذ کرتے ہیں اور اہل مدینہ حضرت علی کے قول سے احتجاج نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک حضرت عمر و زید و ابن عمر رضی اللہ عنہم کے اقوال سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

امام شافعی نے آغاز کار میں اہل مکہ مثلاً اصحاب ابن جریج سے استفادہ کیا اور ابن جریج اصحاب ابن عباس سے اخذ و استفادہ کیا کرتے تھے۔ پھر شافعی نے مدینہ پہنچ کر امام مالک کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور بعد میں اہل عراق کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا۔

امام ابوحنیفہ رح کے استاذ خاص ابراہیم نخعی کے شاگرد حماد بن ابی سلیمان ہیں۔ نخعی علقمہ کے تربیت یافتہ تھے اور علقمہ حضرت ابن مسعود کے ساختہ پرداختہ۔ امام ابوحنیفہ نے مکہ میں عطا سے بھی استفادہ کیا تھا۔

امام احمد بن حنبل رح محدثین کے مسلک پر گامزن تھے۔ آپ نے ہُشیم و ابن عیینہ و وکیع و شافعی سے استفادہ کیا تھا۔

مُحدّث ابن راہویہ اور ابوعُبید بھی اسی شاہراہ پر گامزن رہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"مالکیہ نے حضرت علی اور ان کی اولاد سے استفادہ کیا"

ہم کہتے ہیں یہ صریح جھوٹ ہے۔ مؤطا میں حضرت علی اور ان کی اولاد سے معدودے روایات نقل کی گئی ہیں۔ اسی طرح کتب حدیث وسنن ومسانید میں زیادہ تر غیر اہل بیت راویوں کی مرویات پائی جاتی ہیں[1]۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "امام ابوحنیفہ نے جعفر صادق کی شاگردی اختیار کی تھی"۔ یہ صاف جھوٹ ہے۔ البتہ یہ دونوں حضرات معاصر تھے۔ امام جعفر نے امام صاحب سے دو سال پہلے وفات پائی۔ البتہ ان کا سن ولادت ایک ہی ہے۔ امام ابوحنیفہ رح

---

[1] اہل بیت کی مرویات میں چونکہ جھوٹ کا عمل دخل ہو گیا تھا اس لیے روایت حدیث میں عدالت وضبط کا لحاظ رکھنے والے محدثین اہل بیت علماء سے روایات اخذ کرنے میں احتیاط کیا کرتے تھے۔ اہل بیت کے متعصب شیعہ اپنے علماء سے جھوٹی روایات بیان کرنے میں عام طور سے بدنام تھے۔ جو احادیث اس عیب سے پاک ہوں ان کے ذکر و بیان میں محدثین کوئی باک نہیں سمجھتے تھے۔ اسماء الرجال کے فن کا طالب جو راویان حدیث کے کوائف و احوال معلوم کرنے کا خواہاں ہوں۔ علم حدیث کے علماء وائمہ کے عدل و انصاف سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے دیکھئے ہمارا مقالہ جس کا عنوان ہے۔ "تسامح اہل السنۃ فی الروایۃ عمن یخالفونہم فی العقیدۃ"۔

(مجلہ الازہر مجلد ۲۴ ص ۳۰۶ - ۳۱۲)

نے جعفر صادق اور ان کے والد سے ایک مسئلہ بھی نہیں سیکھا تھا۔ البتہ ان سے زیادہ معمر لوگوں سے آپ نے استفادہ کیا تھا۔ مثلاً عطا بن ابی رباح و حماد بن ابی سلیمان و جعفر بن محمد۔

امام شافعی محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد نہ تھے

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "امام شافعی نے محمد بن حسن شیبانی سے استفادہ کیا تھا" غلط ہے۔ امام شافعی محمد بن حسن کے پاس اس وقت آئے جب آپ پڑھ لکھ کر امام بن چکے تھے۔ البتہ یہ درست ہے۔ کہ آپ محمد بن حسن کی صحبت میں رہے ان کے طرز فکر و نظر کو جانچا۔ ان سے مناظرے کیے اور ان کی تردید میں کتابیں لکھیں۔

بہر کیف ائمہ اربعہ نے امام جعفر سے مسائل و اصول اخذ نہیں کیے تھے۔ مانا کہ انھوں نے امام جعفر سے چند روایات نقل کی ہیں تو اس سے کئی گنا روایات انھوں نے غیر اہل بیت راویوں سے بھی اخذ کی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ امام جعفر صادق پر جس قدر بہتان طرازی کی گئی ہے اور کسی پر نہیں کی گئی۔ تاہم ان کا دامن ان اتہامات سے پاک ہے[1]

---

[1] امام جعفر صادق کے بارے میں شیعہ نے جو جھوٹ تصنیف کیے ہیں ان میں سے مضحکہ خیز جھوٹ وہ ہے جسے شیعہ کے فخر العلماء محمد بن محمد نعمان المفید نے اپنی کتاب "الارشاد فی تاریخ حجج اللہ علی العباد" مطبوعہ ایران صفحہ ۲۷۰ پر جعفر بن محمد کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ "امام جعفر صادق نے فرمایا میرے پاس حضرت موسیٰ کی تختیاں ہیں جن پر تورات مکتوب تھی۔ میرے پاس عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان بھی ہے۔ نیز میرے پاس وہ طشتری بھی ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام قربانی دیا کرتے تھے"۔ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ امام جعفر فی الواقع صادق تھے مگر شیعہ آپ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین ان کی روایات پر اعتماد نہیں کرتے۔ ہمارے دوست سید محمد بن عقیل امام بخاری پر طعن کرتے ہیں کہ وہ اہل بیت سے بہت تھوڑی روایات نقل کرتے ہیں کیا صاحب ممدوح یہ چاہتے ہیں کہ امام بخاری اس بات پر مہر تصدیق ثبت کریں کہ عصائے موسیٰ اور قربانی کی طشتری فی الواقع امام جعفر کے پاس موجود تھی۔ خداوند تعالیٰ ایسے عقائد سے بچائے

چنانچہ شیعہ نے یہ علوم امام جعفر صادق کی طرف منسوب کیے ہیں۔
(۱) علم البطاقہ (۲) علم الہیئت (۳) الجدول (۴) اختلاج الاعضاء (۵) علم الجفر (۶) منافع القرآن (۷) الرعود والبروق (۸) احکام النجوم (۹) القرعہ (۱۰) استقسام بالازلام (۱۱) ملاحم۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امام مالک سے منقول ہے کہ انھوں نے ربیعہ سے پڑھا۔ ربیعہ نے عکرمہ سے۔ عکرمہ نے ابن عباس سے اور ابن عباس حضرت علی کے شاگرد تھے"۔

ہم کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے۔ ربیعہ نے عکرمہ سے کچھ نہیں پڑھا تھا بلکہ وہ سعید بن مسیب کے شاگرد ہیں۔ سعید نے حضرت عمر و زید و ابوہریرہ سے استفادہ کیا تھا یہ بات بھی غلط ہے کہ ابن عباس حضرت علی کے شاگرد ہیں اس لیے کہ ابن عباس رض نے حضرت علی سے بہت کم روایات نقل کی ہیں۔ ان کی اکثر روایات حضرت عمر و زید سے منقول ہیں۔ ابن عباس اکثر امور میں حضرت ابوبکر و عمر کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اور بہت سے مسائل میں حضرت علی کے خلاف تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی علم الکلام کی اصل و اساس ہیں۔ آپ کے خطبات سے لوگوں نے علم الکلام حاصل کیا۔ لہٰذا لوگ اس فن میں آپ کے شاگرد ہیں"۔

ہم کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے۔ علاوہ ازیں اس میں فخر کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ حضرت علی علم الکلام سے پاک تھے جو کتاب و سنت کی تصریحات کے منافی ہے صحابہ و تابعین کے زمانہ میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو حدوث اجسام سے حدوث عالم پر استدلال کرتا ہو۔ نیز حدوث اجسام کو اعراض اور حرکت و سکون کی دلیل سے ثابت کرتا اور کہتا ہو۔ کہ اجسام اس کو مستلزم ہیں۔ بخلاف ازیں پہلی مرتبہ اس کا اظہار پہلی صدی کے بعد جعد بن درہم اور جہم بن صفوان کی طرف سے ہوا۔ پھر عمرو بن عبید اور واصل بن عطاء نے اس میں حصہ لیا۔ ان دونوں نے جب انفاذ وعید اور تقدیر کے مسئلہ پر گفتگو

کی تو ابوالہذیل علاف و نظام و بشر مریسی جیسے بدعتیں ان مسائل پر اظہار خیال کرنے لگے جو خطبات حضرت علی سے ثابت ہیں ان میں معتزلہ کے اصول خمسہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ متقدمین معتزلہ حضرت علی کی تعظیم نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت علی کی عدالت و ثقاہت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ جنگ جمل کے لڑنے والوں کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے۔

"فریقین میں سے ایک فاسق ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ کون"

متقدمین شیعہ صفات الٰہی اور مسئلہ تقدیر کے قائل تھے۔ شیعہ میں سے ہشام بن حکم نے تجسیم کے عقیدہ کا اظہار کیا تھا۔ امام جعفر صادق سے جب پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق تو انہوں نے کہا میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اللہ کا کلام ہے بے شک ابوالحسن اشعری علی جبائی کے شاگرد تھے مگر انہوں نے جبائی کو چھوڑ کر زکریا بن یحییٰ ساجی سے حدیث و سنت کا علم حاصل کرنا شروع کیا تھا۔ امام اشعری نے اپنی کتاب "مقالات الاسلامیین" میں لکھا ہے کہ وہ سلفی المشرب ہیں۔

شیعہ کا مذہب کیا ہے | شیعہ کا مذہب مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے

ایک اچھا خاصہ معجون مرکب ہے۔ انکار صفات باری میں انہوں نے جہمیہ کا مذہب اختیار کیا ہے۔ افعال العباد کے مسئلہ میں وہ قدریہ کے پیرو ہیں۔ امامت و تفضیل کے مسائل میں وہ روافض کے زاویہ نگاہ کے متبع ہیں اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ حضرت علی سے نقل کردہ کلام صاف جھوٹ ہے۔ مزید براں اس میں مدح کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ حضرت علی پر عظیم ترین افتراء یہ ہے کہ قرامطہ و اسماعیلیہ اپنے عقاید و افکار کو حضرت علی کی جانب منسوب کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ کو باطنی علم دیا گیا تھا۔ حضرت علی فرمایا کرتے تھے۔

اس ذات کی قسم جس نے نباتات کو اگایا اور سب مخلوقات کو پیدا کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایسا کوئی عہد نہیں لیا جو باقی لوگوں سے نہ لیا ہو۔ جو کچھ آپ نے فرمایا تھا وہ میرے اس صحیفہ میں درج ہے البتہ اللہ تعالیٰ اگر اپنے کسی بندے کو

کتاب اللہ کا فہم عطا کر دے تو وہ ایک الگ بات ہے۔

اہل بیت پر جو جھوٹ باندھا گیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ شیعہ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی نے اپنے ایک خط میں ان کو چوری کی اجازت دی ہے جس طرح یہود خیبر اس بات کے مدعی تھے کہ حضرت علی نے ایک خط کے ذریعہ ان کا جزیہ معاف کر دیا تھا۔ کیا اس سے زیادہ گمراہی کا بھی امکان ہے؟

باطنیہ جو اپنے عقائد کو حضرت علی کی جانب منسوب کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مقصد و غایت صرف اس بات کا اقرار ہے کہ افلاک ربوبیت کے مرتبہ پر فائز ہیں اور مدبر عالم ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی ان کا بنانے والا نہیں۔ ان کے خیال میں یہ دین اسلام کا باطنی پہلو ہے جس کو لے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تھے۔ آنحضور نے دین کا یہ باطنی پہلو حضرت علی کو سکھایا۔ پھر حضرت علی نے اپنے خواص کو اس کی تعلیم دی۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ محمد بن اسمٰعیل بن جعفر تک پہنچا جن کو وہ "القائم" کہتے ہیں۔ باطنیہ میں سے بنو عُبَید نے مغربی ممالک پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ پھر دو سو سال تک یہ مصر کے حاکم رہے۔ ان کے بارے میں قاضی ابوبکر بن الطیّب و قاضی عبد الجبار بن احمد و قاضی ابو یعلیٰ و غزالی و ابن عقیل و ابو عبد اللہ شہرستانی نے کتابیں لکھیں اور ان کے اسرار ظاہر کیے۔ قلعہ الموت[1]

---

[1] اصحاب الموت چند ملحد شخص تھے یعنی حسن بن صباح دیلمی بزرگ امید نیز اس کا محمد اور پوتے حسن و محمد بن حسن و جلال الدین حسن بن محمد اور اس کا بیٹا علاؤ الدین محمد اور ان میں آخری شخص رکن الدین تھا۔ انہوں نے ۴۸۳ھ سے ۶۵۴ھ تک قلعہ الموت میں اسمٰعیلی فرقہ کی بنیا رکھی اور اس کی نشر و اشاعت میں لگے رہے۔ قلعہ الموت دامغان کے مضافات میں طہران و نیشاپور کے درمیان واقع تھا۔ اسمٰعیلی ملاحدہ کے ہاں سو اور قلعے بھی تھے۔ ان کا نام گرد کوہ۔ میمون ذر تھا۔ حاکم الموت کو شیخ الجبل کہا کرتے تھے ہلاکو خاں نے ۶۵۴ھ اسمٰعیلیہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ملحد اسمٰعیلیہ کا آخری شیخ الجبل اٹلی کے مشہور سیاح مارکوپولو کے زمانہ تک بقید حیات تھا۔ مارکوپولو نے شیخ الجبل کی جنت اور اس کے جرائم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ پروفیسر عبد اللہ عنان نے اپنی کتاب "مواقف حاسمۃ" ص ۲۲۱۔ ۲۲۳ میں مارکوپولو کا یہ بیان عربی میں بیان کیا ہے۔ نیز ملاحدہ کی تفصیلات کے لیے دیکھیے "الحوادث الجامعہ لابن الفوطی" دیاتی بر صفحہ ۷۴۳

والے باطنیہ ہی میں سے تھے۔ سنان ان کا داعی تھا یہ بظاہر شیعہ و بباطن ملحد و زندیق ہوتے ہیں۔ یہ شیعہ کی راہ سے مسلمانوں میں داخل ہوئے اور دین اسلام میں بگاڑ پیدا کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ باطنیہ حد درجہ جاہل خواہش پرست اور دین اسلام سے بیگانہ ہوتے ہیں انہوں نے اپنے داعیوں کو نصیحت کی تھی کہ تشیع کے دروازہ سے مسلمانوں کے یہاں داخل ہوں۔ یہ شیعہ کے اکاذیب و اہواء سے فائدہ اٹھاتے اور ان پر خاطر خواہ اضافہ کیا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا وہ بت پرست اور عیسائی بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"علم تفسیر حضرت علی کی طرف منسوب ہے اس لیے کہ ابن عباس آپ کے شاگرد تھے۔ ابن عباس کہتے ہیں امیر المومنین علی نے بسم اللہ کی 'با' کی تفسیر پوری رات بھر بیان کی۔"

حضرت علی علم تفسیر کے بانی تھے

ہم کہتے ہیں یہ صاف جھوٹ ہے۔ اس قسم کی روایات بیان کرنا جاہل صوفیا کا کام ہے۔ جیسے صوفیاء روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق باتیں کیا کرتے تھے اور میں ان کے پاس یوں بیٹھا رہتا جیسے کوئی حبشی ہو۔ بعض حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ابوبکر کی ایک بیوی سے صرف اس لیے نکاح کیا تھا تاکہ اس سے دریافت کریں کہ ابوبکر خلوت میں کیا کام کیا کرتے تھے۔ اس نے کہا میں آپ سے کلیجی کے کباب کی خوشبو سونگھا کرتی تھی۔ یہ صریح کذب ہے۔ حضرت ابوبکر کی بیوی اسماء بنت عمیس کے ساتھ حضرت علی نے نکاح کیا تھا۔

حضرت ابن عباس نے متعدد صحابہ سے استفادہ کیا تھا۔ تفسیری اقوال آپ نے حضرت ابن مسعود اور صحابہ و تابعین کی ایک کثیر جماعت سے اخذ کیے۔ حضرت علی سے نقل کردہ تفسیری اقوال کسی کتاب میں موجود نہیں۔ آپ سے بہت کم تفسیری اقوال نقل کیے گئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴۲) ص ۳۱۲-۳۱۳ نیز مختصر الدول لابن العبری" ص ۲۶۲ و "عمدۃ المطالب" ص ۳۲۱ و "تاریخ العراق بین احتلالین" ج ۱۶۔ ص ۱۵۰-۱۵۴)

ہیں۔ ابو عبدالرحمن سلمی حقائق التفسیر میں جو اقوال جعفر صادق سے نقل کرتے ہیں وہ بالکل جھوٹ ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"علم طریقت حضرت علی کی طرف منسوب ہے۔ صوفیہ خرقہ کو بھی حضرت علی کی طرف منسوب کرتے ہیں"۔

ہم کہتے ہیں خرقہ جات کی تعداد بہت ہے مگر مشہور دو خرقے ہیں۔

(۱) ایک خرقہ حضرت عمر کی جانب منسوب ہے۔

(۲) دوسرے خرقہ کی نسبت حضرت علی کی طرف کی جاتی ہے۔

جو خرقہ حضرت عمر کی جانب منسوب ہے اس کی اسناد اُویس قرنی اور ابو مسلم خولانی تک پہنچتی ہے۔

جس خرقہ کی نسبت حضرت علی کی طرف کی جاتی ہے اس کی اسناد حضرت حسن بصری تک پہنچتی ہے۔ متاخرین اسے معروف کرخی تک پہنچاتے ہیں اس سے آگے سند کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ کہنے لگتے ہیں کہ معروف کرخی علی بن موسیٰ رضا کی صحبت میں رہے تھے۔ یہ باطل ہے۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ معروف کرخی بغداد سے باہر کہیں نہیں گئے تھے۔ جب کہ علی بن موسیٰ خلیفہ مامون کے یہاں خراسان میں سکونت گزین تھے۔ معروف کرخی عمر میں علی بن موسیٰ سے بڑے تھے بنا بریں کسی ثقہ راوی سے یہ ثابت نہیں کہ دونوں کبھی باہم ملے یا ایک دوسرے کو دیکھا اور استفادہ کیا۔ معروف علی بن موسیٰ کے دربان بھی نہ تھے کہ انہیں موسیٰ کا شرف صحبت حاصل ہوا ہو اور ان کے ہاتھ پہ اسلام بھی نہیں لائے تھے۔

اس کی دوسری اسناد یوں بیان کی جاتی ہے کہ معروف کرخی مشہور بزرگ داؤد طائی کی صحبت میں رہ چکے تھے۔ یہ بے اصل بات ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں حضرات کی ملاقات ثابت نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ داؤد طائی حبیب عجمی سے ملے تھے۔ اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ حبیب عجمی حضرت حسن بصری کے تربیت یافتہ

تھے۔ یہ درست ہے۔ حسن بصری کے کثیر اصحاب و تلامذہ میں سے تھے۔ مثلاً ایوب سختیانی و یونس بن عبید و عبد اللہ بن عوف و محمد بن واسع و مالک بن دینار و حبیب عجمی و فرقد سنجی اور بصرہ کے دیگر عابد و زاہد لوگ۔

صوفیاء کا قول ہے کہ حسن بصری نے حضرت علی کی صحبت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ باطل ہے۔ حضرت حسن کو حضرت علی کی ہمنشینی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

باقی رہی یہ روایت کہ علی جب بصرہ میں داخل ہوئے تھے تو وہاں جتنے افسانہ گو تھے سب کو نکال دیا صرف حسن کو رہنے دیا۔ تو یہ صریح جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن بصری نے حضرت علی کی وفات کے بعد تحصیل علم کا آغاز کیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے حضرت عثمان کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ ابن الجوزی نے حسن بصری کے فضائل و مناقب کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

بقول شیعہ خرقہ پوشی کی ابتداء حضرت علی نے کی تھی

خرقہ کی ایک اسناد حضرت جابر کی جانب منسوب ہے مگر وہ منقطع ہے ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ صحابہ اپنے مریدین کو نہ خرقہ پہناتے تھے نہ ان کے بال ترشوایا کرتے تھے۔ تابعین نے بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ صحابہ کی صحبت میں بیٹھے اور ان کے آداب و علوم سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ تابعین کے ہر گروہ نے ان صحابہ سے استفادہ کیا جو ان کے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ اہل مدینہ نے حضرت عمر و اُبیّ و زید و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایات اخذ کیں۔

جب حضرت علی وارد کوفہ ہوئے تو اہل کوفہ حضرت ابن مسعود و سعد و عمار و حذیفہ رضی اللہ عنہم سے علمی فیوض حاصل کر چکے تھے۔

اہل بصرہ نے عمران بن حُصَین و ابو موسیٰ و ابو بکرہ و ابن مغفّل رضی اللہ عنہم سے اخذ و استفادہ کیا۔

اہل شام نے کتاب و سنت کا علم حضرت معاذ و ابو عبیدہ و ابو الدرداء و عبادۃ

بن صامت، بلال رضی اللہ عنہم سے سیکھا۔

ان بیانات کی روشنی میں یہ بات کہنا کس حد تک درست ہے کہ اہل زہد و تصوف کا طریقہ دیگر صحابہ کے علاوہ حضرت علی سے ماخوذ ہے؟ زہد کے بارے میں متعدد کتب تصنیف کی گئی ہیں۔ چند کتب کے نام ملاحظہ ہوں۔

(۱) امام احمد کی کتاب الزہد (۲) ابن المبارک کی کتاب الزہد (۳) کتاب الزہد وکیع بن جراح (۴) کتاب الزہد ہناد (۵) حلیۃ الاولیاء (۶) صفۃ الصفوۃ۔

مذکورہ بالا کتب میں مہاجرین و انصار نیز تابعین کے اقوال مذکور ہیں۔ ان کتب میں زہد سے متعلق حضرت علی کے جو اقوال و احوال مذکور ہیں وہ کسی طرح بھی حضرت ابوبکر و عمر و معاذ و ابن مسعود و ابی بن کعب و ابوذر و ابوامامہ و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال سے زیادہ نہیں ہیں۔

حضرت علی کی فصاحت و بلاغت

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی فصاحت کا سرچشمہ تھے کہا گیا ہے کہ آپ کا کلام مخلوقات کے کلام سے بہتر اور کلام خالق سے کہتر تھا"۔

ہم کہتے ہیں بلاشبہ حضرت علی صحابہ میں بہت بڑے خطیب تھے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر و عمر و ثابت بن قیس بھی فن خطابت میں مہارت رکھتے تھے حضرت ابوبکر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے روبرو اور آپ کی عدم موجودگی دونوں حالات میں خطبہ دیا کرتے تھے آنحضور خاموش رہ کر سنتے اور اس طرح حضرت ابوبکر کی تائید فرمایا کرتے تھے حضرت ابوبکر نے سقیفہ بنی ساعدہ کے دن بڑا بلیغ خطبہ دیا تھا۔ حضرت عمر کا بیان ہے کہ میں نے سقیفہ کے دن بڑا عمدہ لیکچر تیار کیا تھا۔ جب میں نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا تو حضرت ابوبکر نے کہا "ذرا ٹھہریئے"! چنانچہ میں نے انھیں ناراض کرنا پسند نہ کیا۔ میرے جذبات قدرے تیز و تند تھے۔ حضرت ابوبکر نے جب گفتگو کی تو وہ مجھ سے زیادہ حلیم اور باوقار ثابت ہوئے۔ خدا کی قسم آپ نے میرے تیار کردہ لیکچر کا ایک بھی پسندیدہ جملہ باقی نہ چھوڑا بلکہ وہ ارتجالاً کہہ سنایا اور اس سے کچھ بہتر ہی کہا ہوگا۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
"حضرت ابوبکر نے جب ہمیں خطاب کیا تو ہم لومڑی کی طرح بزدل تھے آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں شیر بنا دیا"۔
حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ خطیب رسول کہلاتے تھے جس طرح حضرت حسان کا لقب شاعر رسول تھا۔ زیاد بہترین خطیب اور ابلغ العرب تھے۔ امام شعبی فرمایا کرتے تھے۔
"جب بھی کوئی شخص بلیغ گفتگو کرتا ہے تو میری تمنا یہ ہوتی ہے کہ یہ خاموش ہو جائے اس ڈر سے کہ کہیں گھٹیا گفتگو پر نہ اتر آئے۔ مگر زیاد کا حال اس سے مختلف تھا وہ جس قدر زیادہ بولتا تھا اس کی تقریر میں نکھار پیدا ہوتا جاتا تھا"۔
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ احنف بن قیس اس پر اظہار حیرت کیا کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے۔
"میں نے مخلوق خدا میں عائشہ سے بڑھ کر کسی کو فصیح و بلیغ نہیں دیکھا"۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی عظیم خطیب تھے۔
ظہور اسلام سے قبل و بعد عرب میں بہت سے بلغا ہوئے ہیں یہ فصاحت و بلاغت میں حضرت علی کے رہین منت نہ تھے اور نہ انھوں نے اس باب میں ان سے کچھ استفادہ کیا تھا۔ قوت خطابت خدا داد ہے۔ حضرت علی اور دیگر خطباء کے کلام میں سجع اور تجنیس کا التزام نہیں ہوا کرتا تھا جو علم البدیع کی مشہور اصلاحات ہیں بلکہ ان کے خطبات میں آمد ہوا کرتی تھی اور یہ سجع کا تکلف نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ تکلفات متاخرین کی ایجاد ہیں۔
شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی فصاحت کا سرچشمہ تھے"۔ دعویٰ بلا دلیل ہے سب لوگوں سے فصیح تر آنحضور کی ذات گرامی تھی۔ گلا پھاڑنے اور چلانے کا نام فصاحت نہیں اور نہ ہی تجنیس و سجع کو بلاغت کہتے ہیں۔ بخلاف ازیں بلاغت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کم از کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر واضح کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک بلیغ آدمی

معانی مقصودہ کو بطریق احسن سامعین پر واضح کر دیتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نہج البلاغت کے اکثر خطبے من گھڑت ہیں اور وہ حضرت علی کا کلام نہیں ہو سکتے۔ شیعہ نے مدح گوئی کے نقطۂ خیال سے ان کو وضع کیا تھا حالانکہ ان میں صداقت و مدح دونوں کا کوئی عنصر کا شامل نہیں ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت علی کا کلام کلام مخلوق سے بالا ہے"۔

یہ قول آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی پر مشتمل ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ابن سبعین نے کہا تھا۔

یہ کلام ایک لحاظ سے انسانی کلام سے ملتا جلتا ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی کلام کو کلام خداوندی کے مماثل قرار دیا جائے ظاہر ہے کہ ایک مسلم اس طرح نہیں کہہ سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کلام علی میں جو باتیں صحیح ہیں وہ دوسروں کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر صاحب نہج البلاغت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے دوسروں کے کلام کو آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بعض باتیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں وہ درست ہیں۔ نہج البلاغت میں مندرج بعض باتیں بجائے خود صحیح ہیں اور وہ کلام علی ہو سکتی ہیں مگر در اصل وہ آپ کی فرمودہ نہیں ہیں بلکہ دوسروں کا کلام ہے۔ مشہور ادیب جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین" میں کثرت سے دوسرے ادباء کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ مگر صاحب نہج البلاغۃ اسے حضرت علی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نہج البلاغت کے خطبات اگر فی الواقع حضرت علی کے فرمودہ ہوتے تو نہج البلاغت کے مصنف سے پہلے ان کا باسناد یا بے اسناد پایا جانا ضروری تھا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کا نہج البلاغۃ

لے ان خطبات کا جامع محمد بن حسین رضی المتوفی ۴۰۶ھ ہے۔ یہ قطعی بات ہے کہ رضی نے اپنے بھائی علی بن حسین مرتضیٰ المتوفی ۴۳۶ھ کے اشتراک سے ان خطبات میں اضافہ کیا تھا۔ خصوصاً وہ جملے جو صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم کی گستاخی سے متعلق ہیں وہ یقیناً بے اصل اور من گھڑت ہیں۔

کے مصنف سے قبل کہیں پتہ نہیں ملتا۔ اس سے ان خطبات کا جھوٹا ہونا واضح ہوتا ہے۔
ورنہ ناقل ہمیں بتائے کہ یہ خصیات کس کتاب میں مذکور ہیں؟ کس نے ان کو نقل کیا اور ان کی اسناد کیا ہے؟ ورنہ صرف دعوی کرنا کچھ مشکل نہیں ہے جو شخص محدثین کے طریق کار سے آشنا ہے اور اخبار و آثار کو اسانید کے ساتھ پہچاننے کا سلیقہ رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ جو لوگ حضرت علی سے اس قسم کی باتیں نقل کرتے ہیں وہ منقولات سے بے بہرہ ہیں اور صدق و کذب میں تمیز نہیں کر سکتے:

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی نے فرمایا۔ میرے گم ہو جانے سے پہلے جو پوچھنا چاہو پوچھ لو۔ مجھ سے آسمان کے راستوں کے بارے میں پوچھو مجھے زمین کے راستوں سے ان کا زیادہ علم ہے"

ہم کہتے ہیں حضرت علی یقیناً یہ بات مدینہ میں نہیں کہا کرتے تھے جہاں ان کی طرح اور بھی اہل علم صحابہ موجود تھے بلکہ آپ نے یہ الفاظ اس وقت فرمائے جب آپ عراق میں ان لوگوں کے درمیان اقامت گزین تھے جو علم دین سے بے بہرہ تھے آپ وہاں ایک امام کی حیثیت رکھتے تھے جس پر رعایا کی تعلیم و تربیت واجب ہوتی ہے۔

اگر فی الواقع حضرت علی نے یہ الفاظ فرمائے تھے کہ "أَنَا أَعْلَمُ بِطُرُقِ السَّمَاءِ" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں جانتا ہوں کہ آسمان والے کن اوامر و نواہی پر عمل کر کے تقرب حاصل کرتے ہیں۔ نیز یہ معنی کہ میں عبادت کرنے کے طریقہ اور جنت و ملائکہ سے بخوبی آگاہ ہوں جبکہ زمین پر مجھے ان چیزوں کا علم حاصل نہیں۔ یہ مراد نہیں کہ آپ بجسد عنصری آسمان پر چڑھ گئے ہیں۔ کوئی مسلم یہ بات نہیں کہتا۔ یہ روایت موضوع ہے اور اس کے اسناد کا کچھ پتہ نہیں۔ ایسی روایات ان غالی شیعہ کی گمراہی کا سبب بنتی ہیں جو ان سے حضرت علی کی نبوت پر احتجاج کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بہت سے عوام اور عابد و زاہد اپنے شیوخ کے بارے میں بھی اس قسم کے اعتقادات رکھتے ہیں۔

شیعہ کا یہ قول کہ صحابہ فتاویٰ میں حضرت علی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"صحابہ مشکل مسائل میں حضرت علی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے حضرت علی نے حضرت عمر کے بہت سے فیصلے مسترد کر دیے تھے یہ دیکھ کر حضرت عمر نے فرمایا اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"

ہم کہتے ہیں صحابہ نے کسی بھی مسئلہ میں کبھی بھی حضرت علی کی طرف رجوع نہیں کیا تھا۔ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو فاروق اعظم حضرت علی و عثمان و ابن عوف و ابن مسعود و زید بن ثابت و ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشورہ فرمایا کرتے تھے حضرت ابن عباس صغیر السن ہونے کے باوجود اس مشورہ میں شرکت فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو باہم مشورہ کرنے کا حکم دیا اور اس بات پر ان کی مدح فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ-۳۸) (وہ اپنے امور باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر کی تدبیر و سیاست صحت و صواب کی آئینہ دار ہوا کرتی تھی۔ حضرت ابن عباس نے جس قدر مشکل مسائل حل کیے تھے حضرت علی طویل عرصہ میں بھی اس قدر مسائل کی گرہ کشائی نہ کر سکے تھے۔ حضرت عمر کثیر العلم ہونے کے باوصف مشکل مسائل میں مشورہ لینے کے عادی تھے۔ لوگ اکثر آپ کے قول کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ مثلاً "عمریتین" اور "عول" کے مسئلہ میں صحابہ نے آپ کے قول پر عمل کیا تھا۔ حضرت عمر اولین شخص تھے جنھوں نے یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ جب میت کا خاوند اور والدین یا بیوی اور والدین موجود ہوں تو میت کی ماں کو باقی ماندہ ترکہ کا ایک تہائی ملے گا۔ اکابر صحابہ و فقہاء مثلاً حضرت عثمان و ابن مسعود و علی و زید اور ائمہ اربعہ نے اس کا اتباع کیا تھا۔ حضرت ابن عباس کو حضرت عمر کے قول کا پتہ نہ چل

سکا اور انہوں نے یہ فتوی دیا کہ میت کی ماں کو پورے ترکہ کا ایک تہائی ملے گا۔ صحابہ کی ایک جماعت نے آپ کے قول کو اختیار کیا ہے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول اقرب الی الصحت ہے۔

حضرت عمر فاروق نے صرف ایک مسئلہ میں فرمایا تھا کہ "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"۔ بشرطیکہ اس کی صحت ثابت ہو جائے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں حضرت عمر اس قسم کے الفاظ ان لوگوں کے حق میں بھی کہہ دیا کرتے تھے جو حضرت علی سے فروتر درجہ کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ جس عورت نے مہر کے مسئلہ میں آپ سے تکرار کی تھی اس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا۔

"آدمی نے غلطی کھائی اور عورت کی بات صحیح نکلی"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی مسائل کا حل الہام کے ذریعہ معلوم کر لیا کرتے تھے"۔

ہم کہتے ہیں کہ الہام کی اساس پر دین اسلام میں کوئی فیصلہ کرنا حلال نہیں ہے۔ اگر الہام کے ذریعہ شرعی احکام ثابت ہو جاتے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ اللہ تعالے وحی کے ذریعہ آپ کو مطلع کرتے کہ حقدار کون ہے اور اس طرح آپ کو شہادت کی ضرورت بھی لاحق نہ ہوتی۔ اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی کو الہام کے ذریعہ شرعی احکام سے باخبر کیا جاتا تھا تو اس کے اثبات کے لیے کسی شرعی دلیل کی ضرورت ہے۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"امم سابقہ میں مُلہم من اللہ ہوا کرتے تھے اگر میری امت میں ایسا کوئی شخص ہوا تو وہ عمر ہیں"۔

اس کے باوجود حضرت عمر کو اپنے الہام کی بنا پر کوئی فیصلہ صادر کرنے کا حق نہ تھا۔ جبتک کہ وہ اسے کتاب وسنت پر پیش نہ کرتے۔ اگر ان کا الہام کتاب وسنت کے معیار پر پورا اترے گا تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ نہیں۔

شیعہ مصنف ذکر کرتا ہے کہ ایک گائے نے ایک گدھے کو مار ڈالا تو حضرت علی نے

اس کے بارے میں فیصلہ صادر کیا تھا۔ شیعہ نے اس کی کوئی اسناد ذکر نہیں کی۔ بلکہ دلائل اس کی تردید کرتے ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جُرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ" (اگر جانور کسی کو زخمی کر دے تو اس کے مالک سے تاوان نہیں لیا جائے گا)

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ جب کوئی گائے یا بکری یا گدھا کسی چراگاہ میں چر رہے ہوں اور وہ کسی کے کھیت میں جا داخل ہوں۔ دن کا وقت ہو اور مالک کا اس میں کوئی قصور نہ ہو تو مویشی کے مالک سے کھیت کا تاوان وصول نہیں کیا جائے گا اور اگر رات کے وقت کسی کا مویشی کھیت میں داخل ہو کر نقصان کر دے تو بقول امام مالک و شافعی و احمد مویشی کا مالک نقصان کا ضامن ہو گا۔ امام ابو حنیفہ و ابن حزم فرماتے ہیں کہ مالک ضامن نہیں ہو گا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی سب لوگوں سے زیادہ شجاع تھے۔ آپ کی تلوار سے اسلام کے قواعد وارکان میں پختگی آئی اور تلوار ہی سے آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تکلیفات کو دور کیا۔ آپ دوسرے لوگوں کی طرح جنگ سے کبھی نہیں بھاگے تھے۔"

شیعہ کا قول کہ علی اَشْجَعُ النَّاس تھے

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی کی شجاعت و نصرتِ اسلام کسی شک و شبہ سے بالا ہے مگر یہ آپ کی خصوصیت نہیں بلکہ متعدد صحابہ اس میں آپ کے سہیم و شریک تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اشجع الناس تھے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ ایک روز اہل مدینہ گھبرا کر جدھر سے آواز آرہی تھی ادھر کو چل پڑے کیا دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابو طلحہ کے گھوڑے پر سوار تلوار گلے میں ڈالے اس طرف سے واپس آرہے ہیں۔ آپ فرما رہے تھے "مت گھبراؤ"۔ مسند میں حضرت علی سے مروی ہے کہ جب سخت خطرہ کا موقع ہوتا تو آپ سب سے آگے دشمن کے قریب تر ہوا کرتے تھے۔

شجاعت قوت قلب اور خطرات میں ثابت قدم رہنے کا نام ہے۔ شدید گرفت اور جنگی مہارت بھی شجاعت میں داخل ہے۔ انتہائی شجاعت کے باوجود نبی اکرم نے ابی بن خلف کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ آپ کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ صحابہ جنگ حنین میں منتشر ہو گئے تھے مگر آپ خچر پر سوار ہو کر بدستور دشمن کی طرف بڑھے جا رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ فرماتے جاتے تھے۔

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب

میں جھوٹا نبی نہیں ہوں   میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں

جب امام میں قلبی شجاعت کی ضرورت ہوتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ صحابہ میں سب سے دلیر حضرت ابوبکر تھے۔ آپ آغاز اسلام ہی سے ان خطرات میں گھرے رہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبتلا تھے۔ نہ کبھی بزدلی دکھائی نہ بے قراری کا اظہار کیا۔ بلکہ خطرات و مہالک میں کود کر آنحضور کی حفاظت کرتے۔ مال و جان اور زبان سے جہاد میں حصہ لیتے۔ جنگ بدر میں سائبان کے نیچے آنحضور کے ہمراہ تھے۔ آپ فرما رہے تھے۔

"اے اللہ! اگر یہ مختصر سی جماعت ہلاک ہو گئی تو دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا"

ابوبکر برابر یہ کہتے جا رہے تھے "یا رسول اللہ! آپ کی یہ دعا کافی ہے اللہ تعالیٰ آپ سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کریں گے"۔

اس سے حضرت ابوبکر کے یقین کامل اور عزم و ثبات پر روشنی پڑتی ہے۔ دعا کرنے سے آنحضور کی شان میں کوئی قدح وارد نہیں ہوتی بلکہ یہ آپ کے کمال کی دلیل ہے اسباب پر تکیہ کرنا توحید کے منافی ہے اور اسباب سے بالکلیہ اعراض کر لینا بھی خلاف شرع ہے۔ رسول پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ جہاد کے ذریعہ اقامت دین کی پوری پوری کوشش کرے اور اس راہ میں اپنی جان و مال اور بارگاہ ایزدی میں دعا کرنے اور اس پر مسلمانوں کو آمادہ کرنے سے گریز نہ کرے۔ بارگاہ ایزدی میں دست

بدعا ہونا ایک عظیم جہاد ہے اور پیغمبر اس کا مامور ہوتا ہے۔ جب دل پہ خوف وہیبت چھا جائے اور عجز و انکسار کا غلبہ ہو تو بعض چیزیں جو ذہن میں محفوظ ہوتی ہیں یاد نہیں رہتیں۔ حضرت ابوبکر کی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ آپ آنحضور کے دست وبازو تھے اور آپ کی مدافعت کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔

وفاتِ رسول کے بعد حضرت صدیق کے کارہائے نمایاں

جب سالار رسل صلے اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو مسلمانوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہر شخص اپنی جگہ بے چین تھا اور ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ قیامت صغریٰ بپا ہو گئی۔ عرب دین اسلام سے منحرف ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق صبر ولقین کی دولت سے بہرہ ور ہو کر کامل استقلال کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور صحابہ کو بتایا کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

"جو شخص محمد کا پرستار تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔ اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا اسے واضح ہو کہ اللہ تعالے زندہ ہے اور اسے موت نہیں آئے گی"

پھر حضرت ابوبکر نے یہ آیت پڑھی۔

"اور محمد تو صرف ایک رسول ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول گذر گئے اگر آپ وفات پا جائیں یا قتل کیے جائیں تو کیا تم دین اسلام سے منحرف ہو جاؤ گے اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے گا تو اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" (آل عمران - ۱۴۴)

لوگوں نے جب یہ آیت سن کر کچھ توجہ نہ دی تو آپ نے ایک خطبہ کے ذریعہ ان کی ڈھارس بندھائی اور ان میں جرأت وجلادت کے جذبات پیدا کیے۔ نیز جیش اسامہ کو روانہ کیا۔ پھر جلد مرتدین کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ فاروق اعظم انتہائی شجاعت کے باوجود حضرت ابوبکر سے کہا کرتے تھے۔ "اے خلیفۂ رسول! لوگوں سے الفت ومحبت کا سلوک کیجئے"۔

جہاں تک کفار کو تہ تیغ کرنے کا تعلق ہے بلاشبہ اس ضمن میں دیگر صحابہ حضرت علی سے گوئے سبقت لے گئے تھے جو شخص سیر ومغازی کے احوال وواقعات بر امعان نظر

پڑھتا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے:۔
حضرت انس کے بھائی براء بن مالک نے مبارزت طلبی کر کے سو کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جن کے خون میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے وہ اس پر مزید ہیں خالد بن ولید کے ہاتھوں جو کفار واصل جہنم ہوئے ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ غزوۂ موتہ میں ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی تھیں آنحضور نے فرمایا تھا: "ہر نبی کا کوئی حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے"۔
آنحضور نے یہ بھی فرمایا تھا۔ "دوران جنگ طلحہ کی آواز ایک کثیر جماعت پر بھاری ہے"
امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔
"شیعہ کا قول ہے کہ حضرت علی جہاد و قتال میں دیگر صحابہ پر فائق تھے۔ جہاد کی تین قسمیں ہیں
(۱) جہاد کی پہلی قسم دین اسلام کی طرف زبان کے ساتھ دعوت دینا ہے۔ یہ جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔
(۲) جہاد کی دوسری قسم یہ ہے کہ مایوسی کے وقت رائے و تدبیر سے کام لیا جائے۔
(۳) تیسری قسم کا جہاد۔ جہاد بالید ہے۔
ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کی قسم اول میں آنحضور کے بعد کوئی شخص حضرت ابوبکر کا ہم پلہ نہیں اکابر صحابہ نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت اسلام کی تھی۔ باقی رہے حضرت عمر تو جب وہ اسلام لائے دین اسلام اس وقت زور پکڑ چکا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ جب سے عمر اسلام لائے ہم معزز ہو گئے"۔
خلاصۂ کلام، حضرت ابوبکر و عمر پہلی قسم کے جہاد میں عدیم النظیر تھے۔ حضرت علی کا اس میں کچھ حصہ نہیں۔
دوسری قسم کا جہاد جس میں رائے و مشورہ سے کام لیا جاتا ہے حضرت ابوبکر و عمر کے ساتھ مختص ہے۔
تیسری قسم کے جہاد میں سرور کائنات نے بہت کم حصہ لیا مگر اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ

بزدل تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کی اس قسم میں حضرت علی منفرد نہ تھے بلکہ دیگر صحابہ اس میں برابر آپ کے سہیم و شریک تھے۔ مثلاً یہ صحابہ کرام حضرت طلحہ و زبیر و سعد و حمزہ و عبیدہ بن حارث و مُصعَب بن عمیر و سعد بن معاذ و سماک بن ابی دجانہ بڑے مجاہد تھے۔ بلاشبہ اس جہاد میں حضرت ابوبکر و عمر نے بھی شرکت کی تھی اگرچہ وہ اس ضمن میں ان مجاہدین تک نہ پہنچ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آنحضور کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ آنحضور نے حضرت علی کی نسبت زیادہ مرتبہ ابوبکر و عمر کو اطراف ملک میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا۔ البتہ حضرت علی نے خیبر کے بعض قلعے یقیناً فتح کیے تھے۔

شیعہ کا قول کہ شمشیر علی سے ارکان اسلام مضبوط ہوئے

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ شمشیر علی سے قواعدِ اسلام وارکانِ ایمان مضبوط ہوئے"۔ صاف جھوٹ ہے اور اسلامی غزوات سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اس کے کذب کا گواہ ہے۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ حضرت علی کی ذات بھی ان اسباب و وسائل میں سے ایک تھی جن کے باعث دین اسلام نے تقویت پائی۔ جس طرح بدر میں بہت سی تلواریں آپ کی تلوار کے علاوہ اور بھی تھیں۔ آنحضور کے وہ غزوات جن میں قتال کی نوبت آئی تھی کل نو تھے۔ سرورِ کائنات کی وفات کے بعد فارس و روم کی خطرناک لڑائیوں میں حضرت علی نے مطلقاً حصہ نہیں لیا تھا۔ عہدِ رسالت کی لڑائیوں میں جو غلبہ حاصل کیا تھا وہ حضرت علی کی کامیابی نہ تھی بلکہ وہ آنحضور کے فیض کا رہینِ منت تھا۔ حضرت علی نے اپنے عہد خلافت میں جمل و صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں جو غلبہ حاصل کیا تھا اس کی وجہ ان کے لشکر کی کثرت تعداد تھی۔ اس کے باوصف آپ نے اہل شام کے خلاف کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی بلکہ فریقین برابر تھے اور کسی کا پلّہ بھی دوسرے سے بھاری نہ تھا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "حضرت علی نے جنگ سے کبھی فرار اختیار نہیں کیا تھا"۔ ہم کہتے ہیں یہ حضرت علی کی خصوصیت نہیں بلکہ حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر صحابہ

بھی اس وصف میں حضرت علی کے برابر شریک ہیں اور اگر اس قسم کی کوئی معمولی چیز وقوع میں آئی بھی ہے تو وہ پوشیدہ ہے اور نقل ہو کر ہم تک نہیں پہنچی۔ اس بات کا احتمال ہے کہ احد و حنین میں ایسی لغزش حضرت علی سے بھی سرزد ہوئی ہو مگر ہم اس سے آگاہ نہ ہو سکے۔

شیعہ کا یہ قول کہ حضرت علی نے آنحضور کی مشکلات کا ازالہ کیا" دعویٰ بلا دلیل ہے حضرت علی نے آپ کی ایک تکلیف کو بھی دور نہیں کیا تھا۔ البتہ حضرت ابو بکر نے اس وقت آپ کی امداد کی تھی جب مشرکین نے مکہ میں آپ کو پیٹنا اور قتل کرنا چاہا تھا قرآن کریم میں اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلاً اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ (سورۃ غافر۔ ۲۸)

کیا تم اس لیے ایک شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے مشرکین نے اس جرم میں حضرت ابو بکر کو پیٹا تھا۔

حضرت طلحہ نے غزوۂ احد میں آنحضور کی حفاظت کی تھی۔ اسی دوران آپ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔ طلحہ کہہ رہے تھے یا رسول اللہ! میں آپ کے دفاع کے لیے آپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہوں۔ یہ بات غلط ہے کہ مشرکین نے احد میں آنحضور کو گھیر لیا تھا اور حضرت علی یا ابو بکر نے تلوار کے ساتھ چھڑایا تھا۔ غالباً شیعہ مصنف کا ماخذ قصہ کہانی کی کتابیں ہیں جو افسانہ گو قسم کے لوگوں نے تصنیف کی ہیں۔ مثلاً البکری کی "تنقلات الانوار" نیز سیرۃ البطال و عنترہ و احمد الدنف وغیرہ یا وہ کتابیں جو سکول کے طالب علم پڑھائی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کرایہ پر لے کر پڑھتے ہیں اور ان بیہودہ کہانیوں کو پڑھ کر وہ رات بھر سو نہیں سکتے۔

بقول شیعہ حضرت علی نے بدر میں چھتیس ۳۶ کافر قتل کیے تھے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"غزوہ بدر کے موقع پر حضرت علی کی عمر صرف ستائیس ۲۷ برس کی تھی آپ نے

تنہا چھتیس ۳۶ آدمیوں کو قتل کیا تھا جس قدر کفار کو غزوۂ بدر میں قتل کیا گیا تھا۔ یہ تعداد اس کے نصف سے بھی زیادہ ہے اس کے علاوہ آپ دیگر کفار کے قتل میں بھی شریک ہوئے تھے"۔

ہم کہتے ہیں یہ صریح جھوٹ ہے روایات صحیحہ سے بہت سے کفار کا بدر میں قتل کیا جانا ثابت ہے جس میں حضرت علی نے شرکت نہیں کی تھی۔ مثلاً ابوجہل و عقبہ و عتبہ بن ربیعہ و ابی بن خلف وغیرہ۔

نقل کیا گیا ہے کہ جنگ بدر میں حضرت علی نے دس کافروں کو قتل کیا تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

احد کے دن حضرت علی کے سوا سب لوگ بھاگ گئے تھے بعد ازاں چند صحابہ لوٹ آئے سب سے پہلے عاصم بن ثابت و ابودجانہ و سہل بن حُنیف آئے۔ حضرت عثمان تین دن کے بعد آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آپ نے بہت دیر لگا دی"۔ فرشتوں نے جب حضرت علی کے ثبات و استقلال پر تعجب کا اظہار کیا تو جبریل نے کہا "تلوار ہے تو ذوالفقار اور جوان ہے تو علی"۔ اس جنگ میں حضرت علی نے اکثر مشرکین کو قتل کیا تھا اور آپ کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شیعہ مصنف شرم و حیا کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر ایسے اکاذیب نقل کرتا چلا آرہا ہے جن کو چوپائے تو تسلیم کر سکتے ہیں مگر ایک سلیم العقل انسان کبھی ماننے کے لیے تیار نہیں۔

اس کا یہ قول بڑا حیرت ناک ہے کہ "حضرت علی کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی"۔ حالانکہ ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ مسلمانوں نے اس جنگ میں شکست کھائی تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"جب تمہیں (غزوۂ احد میں) مصیبت پہنچی جس سے دگنی تم کفار کو (بدر میں) پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ مصیبت کہاں سے آگئی آپ فرمادیں کہ اس کے ذمہ دار تم خود ہو"۔ (سورۂ آل عمران - ۱۶۵)

غزدۂ احد کے آغاز میں مسلمانوں نے کفار کو شکست دی تھی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے درہ پر چند تیر اندازوں کو مقرر کر کے ہدایت کی تھی کہ وہ کسی قیمت پر اس جگہ کو نہ چھوڑیں جب مشرکین شکست کھا کر بھاگنے لگے تو تیر انداز مال غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے ان کے امیر عبداللہ بن جبیر نے بہتیرا روکا مگر وہ باز نہ رہے۔ دشمن نے عقب سے حملہ کر دیا۔ شیطان چلایا "محمد مارے گئے"۔ اس روز تقریباً ستر صحابہ نے شہادت پائی۔ آنحضور کا سر مبارک زخمی ہو گیا اور اگلے دانت ٹوٹ گئے۔ خود آپ کے سر میں دھنس گیا اور اس کی کڑیاں آپ کے سر مبارک میں پھنس گئیں۔ اسی حالت میں آپ فرمانے لگے "وہ قوم کیسے نجات پائے گی جس نے اپنے نبی کے ساتھ یہ سلوک کیا"۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (آل عمران-۱۲۸) (اس امر میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے)

غزدۂ احد کے بارے میں شیعہ کی افترا پردازی

آنحضور کے ساتھ احد میں صرف بارہ صحابہ رہ گئے تھے۔ ان میں ابوبکر و عمر و طلحہ و سعد رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ آنحضور کے اردگرد بہت سے صحابہ نے شہادت پائی۔ رئیس المشرکین نے کہا "ہبل کی جے! آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے"۔ مشرکین کے صرف چند آدمی قتل کیے گئے تھے یہ غلط ہے کہ علی غزوہ احد میں زخمی ہوئے تھے اور جبریل نے آپ کو اٹھایا تھا۔ ہم رافضی مصنف سے پوچھتے ہیں کہ اس کی اسناد کہاں ہے اور اس کا ماخذ موضوعات کی کونسی کتاب ہے؟

شیعہ کا یہ قول جھوٹ ہے کہ جبریل نے کہا تھا۔ "لَا سَيْفَ إِلَّا ذُو الْفَقَارِ"۔ ذوالفقار حضرت علی کی تلوار کا نام نہیں ہے بلکہ ابوجہل کی تلوار کا نام تھا۔ مسلمانوں نے جنگ بدر میں یہ تلوار مال غنیمت میں پائی تھی۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کی ذوالفقار نامی تلوار بدر کے دن نفل (وہ حصہ جو امیر لشکر باقی مجاہدین کی نسبت زائد وصول کرتا ہے) کے طور پر خود لے لی تھی۔ اسی تلوار کے بارے میں آپ نے احد کے روز خواب دیکھا تھا کہ اس میں دندانے پڑ گئے ہیں۔ اس کی تعبیر آپ نے مسلمانوں کی

شکست سے فرمائی۔ نیز فرمایا کہ میں نے دیکھا میں اپنے پیچھے ایک مینڈھے کو سوار کیے ہوں اس سے میں نے سالار لشکر مراد لیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک مستحکم قلعہ میں ہوں میں نے اس کی تعبیر مدینہ سے کی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک بیل کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ بخدا بیل اچھا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ دہرائے (ترمذی۔ ابن ماجہ۔ مسند احمد)

غزوۂ احزاب میں حضرت علی کی شجاعت

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"غزوہ احزاب میں دس ہزار کفار نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ آپ تین ہزار صحابہ کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے اور خندق کھودی کفار میں سے عمرو بن عبدوُد اور عکرمہ بن ابی جہل نے خندق کے ایک شگاف میں سے داخل ہو کر مقابلہ کے لیے للکارا۔ حضرت علی مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے تو آنحضور نے فرمایا "یہ عمرو ہے"۔ علی چپ رہے۔ پھر عمرو نے دوسری اور تیسری مرتبہ للکارا۔ حضرت علی مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے تو آنحضور نے فرمایا "علی جاؤ میں تمہیں مقابلہ کی اجازت دیتا ہوں"۔ آخر کار حضرت علی نے عمرو کو قتل کر دیا تو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عمرو کو قتل کرنا جن و انس کی عبادت سے افضل ہے"۔

ہم کہتے ہیں اس واقعہ میں چند در چند جھوٹ جمع ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب علی نے عمرو کو قتل کر دیا تو کافر بھاگ نکلے۔ یہ صاف جھوٹ ہے۔ کفار بھاگے نہیں تھے بلکہ انہوں نے محاصرہ جاری رکھا تھا۔ یہاں تک کہ نُعیم بن مسعود غطفانی نے ان میں پھوٹ ڈال دی اور اللہ تعالے نے آندھی اور فرشتے بھیج کر کفار کو منتشر کر دیا اور وہ واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِغَیْظِهِمْ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا (الاحزاب-۲۵)

(اور اللہ تعالے نے کفار کو غصہ کی حالت میں لوٹا دیا اور وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالے نے مشرکین کو لڑائی کے ذریعہ واپس نہیں لوٹایا تھا اور نہ مسلمانوں نے انھیں شکست دی تھی۔ شیعہ نے جو روایت بیان کی ہے وہ یقیناً جھوٹی ہے۔ رسول کی ذات ایسی مبالغہ آمیزی سے پاک ہے۔ بھلا ایک

آدمی کا قتل جن و انس کی عبادت سے افضل کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر اس روایت کو درست تسلیم کیا جائے تو پھر آنحضور کو اذیت پہنچانے والے کفار مثلاً ابوجہل اور دیگر صنادید قریش کے قاتل کو بارگاہ ایزدی سے کیا انعام ملے گا؟ اس پر طرہ یہ کہ کسی روایت میں مذکور نہیں کہ عمرو نے آنحضور یا دین اسلام کو کوئی ضرر پہنچایا ہو۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"غزوہ بنی نضیر کے موقع پر حضرت علی نے اس یہودی کو قتل کر دیا تھا جو آنحضور کے خیمہ پر پتھر چلا رہا تھا۔ انہوں نے مزید دس یہودیوں کو قتل کر دیا باقی یہودی بھاگ نکلے"

ہم کہتے ہیں یہ بالکل جھوٹ ہے۔ سورۂ حشر بالاتفاق بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ واقعہ غزوۂ احد سے قبل پیش آیا تھا۔ مسلمانوں نے بنی نضیر کا محاصرہ کر کے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ ڈالے تھے۔ بنی نضیر قلعہ بند ہو گئے تھے۔ آخر اس بات پر مصالحت ہو گئی کہ یہود کو جلاوطن کر دیا جائے گا۔ چنانچہ آپ نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ وہ اسلحہ جنگ کے سوا اپنا تمام سامان اونٹوں پر لاد کر لے گئے۔ یہاں تک کہ مکانوں کا ملبہ بھی اونٹوں پر لاد لیا اور خیبر و شام کی طرف نکل گئے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"غزوۂ سلاسل میں ایک اعرابی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ کفار مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "کون شخص وادی مدینہ کی حفاظت کرے گا؟"۔ ابوبکر نے کہا "حضور! میں کروں گا"۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکر کو سات سو صحابہ کی معیت میں جھنڈا دے کر روانہ کیا۔ جب آپ دشمنوں کی طرف پہنچے تو انہوں نے کہا لوٹ جائیے ہماری تعداد بہت ہے آپ واپس چلے گئے۔ دوسرے روز حضرت عمر کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا علی کہاں ہیں؟ آنحضور نے حضرت علی کو جھنڈا دے کر رخصت کیا۔ آپ نے دشمن کے چھ سات آدمی ہلاک کر دیئے۔ اور باقی بھاگ گئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل کی۔ وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا"۔

ہم کہتے ہیں ایسا کوئی غزوہ سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوا۔ یہ اسی قسم کا افسانہ ہے

جیسے عنترہ اور بطال کے لایعنی افسانے لوگوں میں مشہور ہیں۔

مندرجہ ذیل علماء نے سیر و مغازی کے فن میں بڑی مہارت حاصل کی تھی مگر ان میں سے کسی نے بھی یہ واقعہ بیان نہیں کیا۔

مغازی کے مشہور علماء کے اسماء یہ ہیں۔

عروہؒ، زہریؒ۔ ابن اسحاقؒ۔ موسیٰؒ بن عقبہ۔ ابو معشرؒ سندھی۔ لیثؒ بن سعد۔ ابو اسحاقؒ فزاری۔ ولیدؒ بن مسلم۔ واقدیؒ۔ یونسؒ بن بکیر۔ ابنؒ عائذ اور ان کے نظائر و امثال وغیرہ۔

مذکورہ صدر آیت کریمہ اس واقعہ میں نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ بہ اتفاق یہ سورت مکہ میں اتری۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت علی سے منقول ہے کہ "العادیات" سے حاجیوں کے اونٹ مراد ہیں جو مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان بھاگتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور اکثر مفسرین اس سے مجاہدین کے گھوڑے مراد لیتے ہیں۔

غزوہ خیبر میں حضرت علی کی شجاعت

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی نے بنی مصطلق میں سے مالک اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا تھا۔ جن میں حضرت جویریہ بھی تھیں"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ واقعہ روافض کی بے اصل و بے اسناد مرویات میں شامل ہے شیعہ کی بیان کردہ روایات یا تو بلا اسناد ہوتی ہیں یا ان کے راوی مجہول، کذاب اور متہم بالکذب ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ کسی سیرت نویس نے نہیں لکھا کہ حضرت علی نے غزوہ بنی مصطلق میں یہ کارنامہ سرانجام دیا یا حضرت جویریہ کو قیدی بنایا تھا۔ جویریہ کو جب قیدی بنایا گیا تو انہوں نے بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آنحضور نے یہ رقم ادا کر کے ان کو آزاد کرا لیا اور پھر ان کے ساتھ عقد نکاح باندھا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ مصاہرت کے احترام میں سب لوگوں نے اپنے اپنے قیدی رہا کر دیئے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

غزوہ خیبر میں اللہ تعالٰی نے حضرت علی کے ہاتھوں مسلمانوں کو فتح عنایت فرمائی۔ آنحضور نے باری باری ابوبکر و عمر کو جھنڈا عنایت فرمایا مگر دونوں نے شکست کھائی۔ حضرت علی نے قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کر اس کا پل بنا لیا۔ اس دروازہ کو بیس آدمی بند کیا کرتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "علی نے یہ دروازہ جسمانی قوت سے نہیں بلکہ تائید ربانی سے اکھاڑا ہے۔ فتح مکہ بھی حضرت علی کی شجاعت و بسالت کی رہین منت تھی۔

ہم کہتے ہیں خیبر کی فتح ایک ہی دن میں حاصل نہیں ہوئی تھی۔ خیبر کے متعدد قلعے تھے بعض جنگ سے فتح ہوئے تھے اور بعض مصالحت سے۔ یہود نے مصالحت کے بعد پھر جنگ چھیڑ دی۔ حضرت ابوبکر و عمر نے ہزیمت نہیں اٹھائی تھی۔ شیعہ کا یہ بیان جھوٹ ہے۔ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علی نے دروازہ اکھاڑا تھا۔ مگر یہ بے اصل ہے کہ بیس آدمی اسے بند کیا کرتے تھے یا یہ کہ اس کا پل بنا لیا گیا تھا۔ جہاں تک فتح مکہ کا تعلق ہے حضرت علی نے اتنا ہی حصہ لیا تھا جتنا دیگر صحابہ نے۔ فتح مکہ کی روایات متواترہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو دائیں بازو اور حضرت زبیر کو بائیں بازو اور ابو عبیدہ کو لشکر کے پچھلے حصہ پر متعین کیا گیا تھا۔ آپ نے کو ابوہریرہ کو بلا کر انصار کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انصار بھاگتے ہوئے آئے۔ فرمایا کیا تم قریش کے کمینوں کو دیکھ رہے ہو؟ عرض کیا "ہاں"۔ فرمایا جب میدان جنگ میں کل ان سے ملو تو انہیں تہس نہس کر دو۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر رکھ کر بتایا کہ یوں انہیں ملیا میٹ کر دو۔ فرمایا کوہ صفا کے قریب یہ مقابلہ ہوگا۔ اگلے روز جو شخص بھی نظر آیا انصار نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ آنحضور کوہ صفا پر چڑھ گئے۔ انصار کوہ صفا کے ارد گرد گھومنے لگے۔ اسی دوران ابو سفیان آئے اور کہا یا رسول اللہ! قریش کا نام و نشان

مٹ گیا۔ آج کے بعد قریش کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ یہ سن کر آنحضور نے فرمایا "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا وہ با امن رہے گا جو ہتھیار ڈال دے اس سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا جو اپنا دروازہ بند کرلے گا ہم اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے" (بخاری و مسلم)

غزوۂ حُنین میں حضرت علی کی جلادت وبسالت

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"غزوۂ حُنین میں آپ دس ہزار کا لشکر لے کر نکلے تو ابوبکر نے فخریہ انداز میں کہا آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے"؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ صرف نو ہاشمی اور ابن ام ایمن رہ گئے۔ حضرت علی سب سے آگے تھے آپ نے مشرکین کے چالیس آدمی قتل کر دیئے باقی مشرک بھاگ گئے"۔

ہم کہتے ہیں یہ خود ساختہ جھوٹ ہے۔ ہمارے سامنے کتب مسانید اور سیر اور تفاسیر پڑی ہیں کسی کتاب میں مذکور نہیں کہ مسلمانوں کو حضرت ابوبکر کی نظر لگ گئی تھی۔ مسلمانوں نے صرف یہ الفاظ کہے تھے کہ "آج ہم قلتِ تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوسکتے"۔ یہ بات بھی جھوٹ ہے کہ آپ کے ساتھ نو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ مہاجرین و انصار اور آپ کے اہل بیت کی ایک جماعت آپ کے ساتھ باقی رہی تھی۔ حضرت ابوبکر و عمر و علی و عباس و ابوسفیان و ربیعہ و اسامہ و ایمن رضی اللہ عنہم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو آنحضور کی رفاقت میں ثابت قدم رہے تھے۔

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت علی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چالیس آدمیوں کو قتل کیا تھا" صریح کذب ہے۔ کسی قابل اعتماد شخص نے یہ بات نہیں کہی۔ بخاری و مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور خچر سے اتر پڑے۔ بارگاہِ ایزدی میں دعا کی اور فرمایا ؎ اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب + اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ (میں جھوٹا نبی نہیں ہوں۔ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں)

حضرت براء فرماتے ہیں شدید جنگ کی حالت میں ہم آنحضور کی اوٹ میں بچاؤ حاصل
کیا کرتے تھے۔ ہم اس شخص کو بہادر سمجھا کرتے تھے جو آپ کے برابر ہوا کرتا تھا۔ صحیح
مسلم میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ حنین میں جب
کفار نے آپ کو گھیر لیا تو آپ نے سواری سے اتر کر مٹی کی ایک مٹھی لی اور کفار
پر پھینک دی پھر فرمایا "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ"۔ (خدا کرے یہ چہرے ذلیل ہوں) وہاں
جتنے آدمی موجود تھے سب کی آنکھیں مٹی سے بھر گئیں اور وہ پیٹھ پھیر کر چل دیئے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"حضرت علی غیب کی خبریں دیا کرتے تھے اور وقوع پذیر ہونے والے واقعات
سے قبل از وقت آگاہ کر دیا کرتے تھے۔ طلحہ و زبیر نے جب عمرہ کرنے کی اجازت
طلب کی تھی تو حضرت علی نے فرمایا تھا کہ آپ کا مقصد عمرہ کرنا نہیں بلکہ آپ بصرہ
جانا چاہتے ہیں۔ آپ کا ارشاد بجا تھا۔ حضرت علی ذی قار کے مقام پر بیعت لے
رہے تھے تو آپ نے فرمایا کوفہ کی طرف سے ایک ہزار آدمی آئیں گے۔ نہ کم نہ زیادہ
وہ موت پر میری بیعت کریں گے۔ چنانچہ اسی طرح ہوا ان میں سے آخری شخص اُوَیس
قرنی تھے۔ آپ نے پستان والے خارجی کے قتل کی خبر دی تھی آپ نے قبل از وقت
اپنے قتل سے آگاہ کر دیا تھا۔ آپ نے ابن شہریار ملعون کے بارے میں فرمایا تھا کہ اسے
سولی دی جائے گی چنانچہ معاویہ نے اسے سولی چڑھا دیا۔ آپ نے ہیثم کھجور فروش سے
کہا تھا کہ دس آدمیوں کو پھانسی دی جائے گی ان میں دسواں شخص میثم ہوگا۔ آپ
نے اسے وہ کھجور کا درخت بھی دکھایا تھا جس پر اسے پھانسی دی جانے والی تھی اور اسی
طرح وقوع میں آیا۔ آپ نے رُشید الہجری کو بتایا تھا کہ اسے پھانسی دی جائے گی۔ آپ
نے خبر دی تھی کہ حجاج۔ کُمیل بن زیاد اور قنبر کو قتل کرے گا۔ چنانچہ اسی طرح ہوا۔

اِخبار بالمغیبات اور حضرت علی

حضرت علی نے براء بن عازب سے کہا
تھا کہ میرے بیٹے حسین کو قتل کیا جائے
گا اور تم اس کی مدد نہیں کرو گے اور اسی طرح ہوا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ بنو عباس آسانی

سے اقتدار سنبھال لیں گے اور اگر ترک و دیلم اور ہند و سندھ کے لوگ مل کر انکی سلطنت چھیننا چاہیں تو اس پر قادر نہ ہوں گے جب تک کہ ان کے موالی اور ارباب دولت ان سے الگ نہ ہو جائیں۔ ترک کا ایک بادشاہ ان پر مسلط ہو گا وہ اس جگہ سے آئے گا جہاں سے ان کی سلطنت کا آغاز ہوا تھا۔ جس شہر پر سے اس کا گذر ہو گا اسے فتح کرے گا اس کے مقابلہ کے لیے جو جھنڈا بلند کیا جائے گا وہ اسے سرنگوں کر دے گا جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے لیے ہلاکت و تباہی ہے وہ سب پر کامیابی حاصل کرے گا۔ اس کی کامیابی کا انحصار میرے اہل بیت کے ایک شخص پر ہو گا جو حق کی بات کہے گا اور حق پر عمل پیرا ہو گا۔ حضرت علی نے جس طرح فرمایا تھا اسی طرح ہوا اور ہلاکو خان خراسان کے علاقہ سے نکل کر حملہ آور ہوا" (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

ہم کہتے ہیں غیب کی خبریں تو حضرت علی سے کم درجہ کے صلحاء بھی دیا کرتے تھے جو امامت و خلافت کے اہل نہ تھے۔ حضرت ابوہریرہ و حذیفہ و دیگر صحابہ سے اس سے کئی گنا زیادہ خبریں نقل کی گئی ہیں۔ ابوہریرہ مرفوعاً ایسی روایات بیان کرتے اور حذیفہ کبھی مرفوع کرتے اور کبھی نہ کرتے اس قسم کی یا تو انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کی ہیں یا وہ حضرت عمر و علی کے کشف پر مبنی ہیں۔

امام احمد کی کتاب الزہد۔ ابو نُعیم کی حلیۃ الاولیاء اور ابن ابی الدنیا و خلال ولالکائی کی کرامات الاولیاء میں بکثرت ایسی روایات صحابہ و تابعین و تبع تابعین سے نقل کی گئی ہیں۔ شیعہ مصنف نے غیبی خبروں سے متعلق حضرت علی کے جو واقعات تحریر کیے ہیں ہم ان کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان میں سے بعض تو بالکل جھوٹے ہیں۔ ہلاکو نے کسی علوی کو ضرر نہیں پہنچایا تھا۔ اس لیے یہ خبر شیعہ کے تملق و نفاق کی دلیل ہے حضرت علی بعض اوقات اپنی لڑائیوں اور دیگر معاملات کے بارے میں ایک رائے قائم کرتے اور وہ غلط ثابت ہوا کرتی تھی۔ اگر آپ کو یہ علم ہوتا کہ لڑائیوں میں لاتعداد جانیں ضائع ہوں گی اور مقصد بھی حاصل نہ ہو گا تو آپ لڑائی میں حصہ نہ لیتے۔ جنگ آزمائی سے کنارہ کش ہونے کی صورت میں آپ زیادہ کامیاب و کامران ثابت ہوتے۔

اگر آپ جانتے ہوتے کہ میرے مقرر کردہ حَکَم یہ فیصلہ صادر کریں گے تو آپ تحکیم پر راضی نہ ہوتے۔ پھر آپ کا غیبی علم کہاں گیا؟ اور شیعہ کا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ آپ تلوار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکلات کا ازالہ کیا کرتے تھے؟ مقام حیرت ہے کہ صفین میں آپ کی پشت پناہی کے لیے نوے ہزار اشخاص موجود تھے آپ پھر بھی معاویہ پر غالب نہ آسکے۔

حضرت علی کے بارے میں روافض کے اکثر دعاوی ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ شیعہ کے غلو کا یہ عالم ہے کہ آپ کو معصوم قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ آپ سے سہو کا امکان نہیں۔ شیعہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی غیب دان تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کو جو شجاعت ودیعت کر رکھی تھی شیعہ اس پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آپ کے بارے میں ایسی ایسی باتیں اختراع کرتے ہیں جو فوق البشر ہیں اور جن کو کوئی سلیم العقل آدمی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کے عین برعکس شیعہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر مسند خلافت پر متمکن ہوئے تھے تو حضرت علی ان کے مقابلہ سے عاجز تھے۔ حالانکہ ابوبکر اس وقت مال و رجال دونوں کے لحاظ سے کمزور تھے۔ یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ

(الانفال ۶۲-۶۳)

(وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تجھے اپنی اور مومنوں کی نصرت سے نوازا اور مومنوں کے دلوں میں الفت پیدا کر دی)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب مومنین سے آنحضور کی تائید فرمائی تھی اس میں حضرت علی اور دیگر اہل ایمان سب شامل ہیں حضرت علی کے مندرجہ ذیل قول سے ان کے علم غیب کی نفی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

لَقَدْ عَجَزْتُ عَجْزَةً لَا اَعْتَذِرُ ۔۔۔ سَوْفَ اَكِیْسُ بَعْدَهَا وَاَسْتَمِرُّ

وَاَجْمَعُ الرَّاْیَ الشَّتِیْتَ الْمُنْتَشِرَ

ترجمہ:- میں معذرت نہیں کر رہا بلکہ یہ سچ ہے کہ میں عاجز آگیا ہوں۔ اس کے بعد میں غور و فکر سے کام لوں گا اور (سیدھی راہ پر) چلتا رہوں گا۔ نیز بکھری ہوئی پراگندہ رائے یکجا کروں گا۔)

حضرت علی جنگ صفین میں فرمایا کرتے تھے۔ "اے حسن! تیرے باپ کا یہ خیال نہ تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچے گا۔ سعد بن مالک اور عبداللہ بن عمر نے فتنہ سے الگ رہ کر کتنا اچھا موقف اختیار کیا تھا۔ اگر وہ نیک تھے تو انہیں بڑا اجر ملے گا اور اگر گنہگار تھے تو اس میں چنداں خطرہ نہیں ہے"۔

حضرت علی سے بتواتر منقول ہے کہ آپ اپنے اصحاب و احباب کے اختلاف سے بڑے بے چین رہا کرتے تھے۔ واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ جنگ آزمائی سے باز رہ کر حضرت حسن نے امت پر عظیم احسان کیا تھا۔ آپ نے سعد و سعید و ابن عمر و محمد بن مسلمہ و زید بن ثابت و عمران بن حُصَین اور دیگر صحابہ کی طرح ترک قتال کا موقف اختیار کیا تھا یہ اکابر اپنے موقف کے اثبات میں نصوص کتاب و سنت سے استناد کرتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ "ایک فتنہ بپا ہوگا جو شخص اس میں بیٹھ رہے گا وہ کھڑا ہونے والے سے افضل ہوگا"۔ تاہم جو لوگ حضرت علی کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے آپ نے کسی کی تکفیر نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ وہ خوارج کو بھی کافر قرار نہیں دیتے تھے۔ آپ نے ان کی اولاد کو لونڈی غلام نہیں بنایا تھا۔ آپ طلحہ و زبیر سے رضامند تھے۔ حضرت معاویہ و عمرو بن العاص کے حق میں بد دعا کیا کرتے تھے مگر انکو کافر نہیں قرار دیتے تھے۔

حضرت علی مُستَجَابُ الدَّعوات تھے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

حضرت علی مستجاب الدعوات تھے۔ آپ نے بسر بن ارطاۃ کے حق میں بد دعا کی کہ خدا اسے پاگل کر دے۔ چنانچہ اسی طرح ہوا۔ عیزار کے حق میں اندھا ہونے اور انس نے جب شہادت چھپائی تو اس کے حق میں برص کا عارضہ لاحق ہونے کی دعا کی۔ آپ کی

یہ بد دعا مقبول ہوئی زید بن ارقم کی بد دعا سے اندھا ہو گیا۔"

ہم کہتے ہیں کہ یہ حضرت علی کی خصوصیت نہیں بلکہ صحابہ و دیگر صلحاء میں دعا کی مقبولیت ایک عام چیز ہے۔ سعد بن ابی وقاص کے حق میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ ان کی ہر دعا مقبول ہو چنانچہ آپ کی کوئی دعا مسترد نہیں کی جاتی تھی۔ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ جب کسی بات پر حلف اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خدا کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ کسی بات پر حلف اٹھائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں"۔

براء بن مالک کا شمار بھی اسی قسم کے لوگوں میں سے ہوتا تھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے ایک سو آدمیوں سے مبارزت طلبی کی تھی۔ علاء بن حضرمی جو پہلے آنحضور اور بعد ازاں حضرت ابوبکر کی طرف سے بحرین کے عامل تھے۔ قبولیت دعا میں مشہور تھے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"جمہور سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بنی المصطلق کی طرف روانہ ہوئے تو ایک دشوار گذار وادی میں سے گذرے۔ جبریل نے آکر اطلاع دی کہ اس وادی میں جن پوشیدہ ہیں اور آپ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں آنحضور نے حضرت علی کو بلا کر اس وادی میں اترنے کا حکم دیا اور آپ نے ان کو تہ تیغ کر دیا"۔

ہم کہتے ہیں کہ جنوں کو ہلاک کرنا اتنا بڑا کارنامہ نہیں ہمارے خیال میں صرف حضرت علی کا مقام اس سے کہیں بلند تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ خود ساختہ اور جھوٹا ہے کسی انسان نے کبھی جنوں سے مقابلہ نہیں کیا یہ اسی قسم کا من گھڑت واقعہ ہے جیسے شیعہ کا ساختہ پرداختہ یہ قصہ کہ حضرت علی نے بجاہ ذات العلم میں جنوں سے لڑائی کی تھی اس قسم کے خود ساختہ واقعات ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ شیعہ انہیں تسلیم کر لیں۔ ہماری نگاہ میں حضرت علی کا منصب و مقام اس سے کہیں بلند تر تھا کہ جن آپ کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے۔

حضرت علیؓ کی جنوں سے جنگ آزمائی

کسی شیعہ نے مشہور محدث ابو البقاء خالد بن یوسف نابلسی سے حضرت علی کی جنوں سے لڑائی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ انہوں نے کہا گروہ شیعہ عقل وخرد سے کس قدر بیگانہ ہے۔ تمہیں اتنی بھی عقل نہیں؟ اچھا یہ بتاؤ عمر افضل تھے یا علی؟ شیعہ نے جواباً کہا "علی" وہ کہنے لگے جب آنحضور نے حضرت عمر کے بارے میں فرمایا تھا کہ جب عمر ایک راہ پر چلتے ہیں تو شیطان وہ راستہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے"۔ جب شیطان عمر سے دم دبا کر بھاگتا تھا تو اس کی اولاد حضرت علی سے کیونکر لڑ سکے گی؟

محدث ابن الجوزی نے اپنی کتاب "الموضوعات" میں حضرت علی کی جنوں سے نبرد آزمائی کے بارے میں ایک طویل روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عازم مکہ ہوئے تو لوگوں کو سخت گرمی اور پیاس لگی۔ آپ جحفہ کے مقام پر اترے اور فرمایا جو شخص چند آدمیوں کی معیت میں جاکر چاہ ذات العلم سے پانی کی مشکیں بھر لائے میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔ پھر طویل حدیث بیان کی اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے یکے بعد دیگرے دو آدمی بھیجے مگر وہ جنوں سے ڈر کر واپس آگئے پھر آپ نے حضرت علی کو بھیجا وہ انتہائی خطرہ کے باوجود پانی کی مشکیں بھر لائے۔ آپ نے فرمایا جس جنؓ نے آپ کو آواز دی تھی وہ سماعہ بن غراب تھا جس نے دشمن خدا اصنام قریش کے شیطان مسخر نامی کو واصل جہنم کیا تھا۔ ابن الجوزی کہتے ہیں یہ روایت موضوع ہے اس روایت میں المفید محمد بن جعفر وسکونی تینوں مجروح راوی ہیں ابو الفتح ازدی کہتے ہیں اس حدیث کی سند میں عمارہ بھی ہے جو حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔

حضرت علی کے لئے رجوع آفتاب

شیعہ مصنف لکھتا ہے "دو مرتبہ حضرت علی کے لیے سورج کو لوٹایا گیا تھا۔ ایک مرتبہ رجوع آفتاب کا واقعہ عہد رسالت میں پیش آیا۔ جابر و

ابو سعید نے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ جبرائیل نازل ہو کر آنحضور کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے آنحضور حضرت علی کی ران پر سر رکھے لیٹے رہے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ حضرت علی نے اشارہ سے عصر کی نماز ادا کی۔ جب آنحضور بیدار ہوئے تو حضرت علی سے کہا کہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالے سورج کو لوٹا دے تاکہ آپ کھڑے ہو کر عصر کی نماز پڑھ سکیں۔ چنانچہ حضرت علی کی دعا سے آفتاب واپس آگیا اور آپ نے عصر کی نماز پڑھی۔ دوسری مرتبہ رجوع آفتاب کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ بابل کے مقام پر دریائے فرات کو عبور کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے رفقاء اپنے مویشیوں کے ساتھ مصروف ہو گئے اسی دوران آپ نے چند ساتھیوں کے ساتھ نماز عصر ادا کر لی۔ جو ساتھی نماز ادا نہ کر سکے تھے جب انہوں نے شکوہ کیا تو حضرت علی نے رجوع آفتاب کے لیے دعا کی۔ چنانچہ سورج لوٹ آیا۔ سعید حمیری نے یہ واقعہ نظم میں بیان کیا ہے ؎

رُدَّتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ لَمَّا فَاتَهُ ۔۔۔ وَقْتُ الصَّلٰوةِ وَقَدْ دَنَتْ لِلْمَغْرِبِ
حَتّٰى تَبَلَّجَ نُوْرُهَا فِيْ وَقْتِهَا ۔۔۔ لِلْعَصْرِ ثُمَّ هَوَتْ هُوِيَّ الْكَوْكَبِ
وَعَلَيْهِ قَدْ رُدَّتْ بِبَابِلَ مَرَّةً ۔۔۔ أُخْرٰى وَمَا رُدَّتْ لِخَلْقٍ مُعْرِبِ

ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی کے فضل و کمال پر جو یقین ہمیں حاصل ہے وہ اس دروغگوئی کا محتاج نہیں۔ عہد رسالت میں رجوع آفتاب کا واقعہ طحاوی اور قاضی عیاض نے بالفاظ دیگر نقل کیا اور اسے آنحضور کا معجزہ شمار کیا ہے مگر ماہرین فن جانتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح نہیں یہ روایت ابن الجوزی نے موضوعات میں اسماء بنت عمیس سے نقل کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی جارہی تھی اور آپ کا سر علی کی گود میں تھا۔ چنانچہ حضرت علی نے غروب آفتاب تک عصر کی نماز ادا نہ کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی "اے اللہ اگر علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں مشغول تھا تو اس کے لیے سورج کو لوٹا دے۔ حضرت اسماء کا بیان ہے کہ آفتاب غروب ہو چکا تھا پھر میں نے دیکھا کہ وہ دوبارہ طلوع ہو گیا۔

ابن الجوزی کہتے ہیں کہ یہ روایت بلاشبہ موضوع ہے۔ اس کی سند میں اضطراب ہے فضیل بن مرزوق کو یحییٰ نے ضعیف قرار دیا ہے ابو حاتم بن حبّان کہتے ہیں کہ فضیل موضوعات روایت کرتا اور ثقات سے غلط بیانی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ابو الفرج کہتے ہیں اس روایت کا انحصار عبید اللہ بن موسیٰ پر ہے۔ عروہ بن عبد اللہ بن قشیر کہتے ہیں میں فاطمہ بنت علی بن ابی طالب کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے رجوع آفتاب کا واقعہ سنایا۔ ابو الفرج کہتے ہیں یہ روایت باطل ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں اس کی اسناد میں ابن شریک ضعیف راوی ہے۔ ابن الجوزی کہتے ہیں میرے نزدیک اس کی اسناد میں ابن شریک ضعیف راوی ہے۔ ابن الجوزی کہتے ہیں میرے نزدیک اس کی اسناد میں ابن عقدہ متہم بالکذب ہے وہ شیعہ تھا اور صحابہ کے معائب بیان کیا کرتا تھا۔ ابن عدی کہتے ہیں میں نے ابو بکر بن ابی غالب کو یہ کہتے سنا کہ ابن عقدہ حدیث نبوی پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔

یہ شیوخ کوفہ کو جھوٹی روایات بیان کرنے پر آمادہ کیا کرتا تھا۔ جب امام دارقطنی سے ابن عقدہ[1] کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "وہ برا آدمی ہے"۔ اس کی اسناد میں داؤد بن فراہیج نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے امام شعبہ نے داؤد کو ضعیف قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ صحیح نہیں کہ داؤد نے یہ روایت بیان کی ہے۔ یزید نوفلی نے یہ روایت داؤد سے نقل کی ہے اور یزید ضعیف

---

[1] ابن عقدہ کا نام احمد بن محمد سعید کوفی المتوفی (۲۴۹ - ۳۳۲) ہے اس کا ترجمہ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۴ - ۶۵ نیز تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۵۵ - ۵۷ پر مذکور ہے۔ شیعہ کی تصانیف میں بھی اس کا ترجمہ مندرج ہے (دیکھئے تنقیح المقال ج ۱ ص ۸۵ - ۸۶) شیعہ اس کے امامیہ ہونے کی نفی کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ زیدی جارودی تھا۔ تاہم وہ اسے صرف اس لیے الفت و مودّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ اس کا سینہ عداوت صحابہ سے معمور تھا۔ وہ مناقب صحابہ سے اعراض کر کے جھوٹے نقائص و معائب بیان کیا کرتا تھا۔ شیعہ کی مشہور کتاب الحاوی میں لکھا ہے کہ وہ فاسد المذہب ہونے کے باوجود ثقہ ہے"

راوی ہے۔ یزید سے اس کا بیٹا یحییٰ روایت کرتا ہے وہ بھی ضعیف[1] ہے

بعض انبیاء کے لیے رجوع آفتاب

اگر سوال کیا جائے کہ بخاری و مسلم میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ بعض انبیاء کے لیے آفتاب کو لوٹایا گیا تھا تو ہم جواباً کہیں گے کہ آفتاب لوٹا یا نہیں گیا تھا بلکہ دن کو لمبا کر دیا گیا تھا اور اس طرح آفتاب دیر سے غروب ہوا۔ بعض دفعہ ہمیں دن کی چھوٹائی بڑائی کا احساس نہیں ہوتا۔ یوشع علیہ السلام کے لیے دن ٹھہر جانے کا علم ہمیں نص کے ذریعہ حاصل ہوا۔ اگر نص سے آفتاب کا لوٹ آنا ثابت ہو جائے تو ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسا ہوا بھی تھا؟ روایات متواترہ اور قرآن کریم میں جس طرح انشقاق القمر کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے اسی طرح رجوع آفتاب کا واقعہ بتواتر کہیں بھی نقل نہیں کیا گیا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت یوشع کو رجوع آفتاب کی ضرورت تھی اس لیے کہ غروب آفتاب کے بعد ہفتہ کا آغاز ہو رہا تھا جس میں لڑائی حرام تھی اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ سورج لوٹ آئے تو حضرت یوشع اپنے مشن کی تکمیل کر سکیں بخلاف ازیں اس امت میں اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ سہل انگاری کی بنا پر جس کی نماز عصر فوت ہو جائے تو اس کا یہ گناہ توبہ سے معاف ہو گا اور اگر اس میں وہ بے قصور ہے مثلاً سویا رہا یا بھول گیا تو وہ بڑی آسانی سے بعد از غروب فوت شدہ عصر ادا کر سکتا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ عصر کا وقت جاتا رہتا ہے بالفرض اگر سورج لوٹ آئے اور کوئی شخص رجوع آفتاب کے بعد نماز عصر ادا کرے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ اس نے عصر کی نماز اصلی وقت پر ادا کی۔ اسی طرح غروب آفتاب کے ساتھ روزہ کا افطار کرنا اور نماز مغرب ادا کرنا درست ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے

[1] حضرت علی کے لیے رجوع آفتاب کے بارے میں دیکھئے مختصر تحفہ اثنا عشریہ ص ۱۸۵-۱۸۷ حوالہ مذکور میں محدث ابن حزم کا کلام قابل ملاحظہ ہے۔

کہ بار ثانی آفتاب کے طلوع پذیر ہونے سے آیا افطار کرنے والے کا روزہ اور اس کی نماز باطل ہو جائے گی یا نہیں ؟ یہ ایک فرضی بات ہے جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ غزوۂ خندق میں آنحضور کی نماز عصر فوت ہو گئی تھی آپ نے کثیر صحابہ کی معیت میں بصورت قضا ادا کی تھی اور رجوعِ آفتاب کی دعا نہ فرمائی حالانکہ آپ کو اس سے بڑا دکھ ہوا اور آپ نے اس سے رد کرنے والے کفار کے حق میں بد دعا بھی فرمائی تھی۔ اس بات کا احتمال ہے کہ آفتاب بادل کے نیچے چھپا ہوا ہو اور پھر نمودار ہو گیا ہو تو انہوں نے سمجھا کہ دوبارہ طلوع ہوا ہے۔

ردِّ شمس کی حدیث ایک اور اسناد سے بھی منقول ہے۔ اسماء بنت عُمیس سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کی گود میں اپنا سر رکھے سو رہے تھے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ! تیرا بندہ علی تیرے نبی کی وجہ سے رکا رہا اور نماز ادا نہ کر سکا براہ کرم آفتاب کو لوٹا دے تاکہ وہ نماز ادا کر سکے۔ اسماء کا بیان ہے کہ آفتاب دوبارہ نمودار ہو گیا یہاں تک کہ وہ زمین اور پہاڑوں پر نظر آنے لگا۔ حضرت علی نے وضو کر کے عصر کی نماز پڑھی۔ یہ واقعہ غزوۂ خیبر کے موقع پر مقام صہباء میں پیش آیا۔

اس کی اسناد میں عون بن محمد سے ابن الحنفیہ مراد ہیں۔ عون کی ماں محمد بن جعفر بن ابی طالب کی بیٹی تھیں۔ یہ روایت منکر ہے عون اور اس کی ماں معروف بالحفظ نہیں ہیں ان کی روایت سے معمولی مسائل کے بارے میں بھی احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ ایسے اہم مسائل میں ان کی روایت تسلیم کی جائے۔ عون کی ماں کا سماع اسماء بنت عُمیس سے ثابت نہیں۔ ممکن ہے کسی اور راوی کے توسط سے اس نے اسماء سے سنا ہو۔ شیعہ مصنف نے دیگر رُوات کو چھوڑ کر صرف ابن ابی فُدَیک اور القطری کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ثقہ ہیں اس نے دیگر راویوں کا نسب ضرور بیان کیا ہے مگر نسب دانی سے ان کا حافظ و ثقہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مزید براں شیعہ مصنف کے یہ الفاظ کہ حضرت علی نے نماز عصر رجوعِ آفتاب کے بعد اصلی وقت پر ادا کی تھی"۔ درست نہیں کسی راوی نے یہ الفاظ بیان نہیں کیے۔

باقی رہا بابل کے شہر میں حضرت علی کے لیے رجوعِ آفتاب تو یہ شیعہ کے اباطیل میں سے ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

کوفہ کا سیلاب اور حضرت علی "کوفہ میں ایک دفعہ اتنا سیلاب آیا کہ ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضرت علی آنحضور کے خچر پر سوار ہوئے لوگ بھی آپ کے ہمراہ تھے حضرت علی ساحلِ فرات پر اترے نماز پڑھی اور دعا کی۔ پھر ایک چھڑی لے کر پانی کی سطح پر دے ماری۔ چنانچہ پانی خشک ہو گیا۔ مچھلیاں آپ سے بولنے لگیں مگر ایک خاص قسم کی مچھلی خاموش رہی جب آپ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا جو مچھلیاں پاک تھیں ان میں اللہ تعالے نے قوت گویائی پیدا کر دی اور جو نجس تھی اسے گونگا اور خاموش کر دیا۔

ہم شیعہ سے اس کی اسناد پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں بلا اسناد تو ایسی کہانیاں ہر شخص بیان کر سکتا ہے ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ جھوٹا ہے اگر یہ صحیح ہوتا تو لوگ کثرت سے بیان کرتے۔ مزید براں سب قسم کی مچھلیاں اجماعاً حلال ہیں ایسی بے بنیاد روایتوں سے ہم خدا کی حلال کردہ ایک خاص مچھلی کو حرام قرار نہیں دے سکتے۔ مچھلیوں میں قوت گویائی کا پیدا ہونا ایک خارق عادت چیز ہے جس میں اللہ تعالے نے یہ قدرت پیدا کر دی وہ ناطق ہو گئی اور جس میں یہ قوت پیدا نہ کی وہ حسب معمول خاموش رہی۔ اس میں مچھلی کا کیا گناہ ہے؟ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی کی عظمت و فضیلت ان موضوعات سے بے نیاز ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"علماء کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی کوفہ کے منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک سانپ نکلا اور منبر پر چڑھ آیا۔ لوگوں نے ڈر کر اسے مارنا چاہا۔ حضرت علی نے اس سے روکا اس کے ساتھ کچھ بات چیت کی تو وہ منبر پر سے اتر گیا۔ جب لوگوں نے حضرت علی سے دریافت کیا تو فرمایا وہ جنوں کا حاکم تھا اور ایک پیچیدہ مسئلہ دریافت کرنے آیا تھا۔ میں نے وہ مسئلہ بتا دیا۔ جس دروازہ سے وہ سانپ داخل ہوا تھا اہل کوفہ اسے باب ثعبان (سانپ والا دروازہ) کہا کرتے تھے۔ بنو امیہ نے یہ نام مٹانے کے لیے اس دروازہ پر عرصہ تک بہت سے مقتولوں کو لٹکائے رکھا اب لوگ اسے باب القتلیٰ"

(مقتولوں کا دروازہ) کہہ کر پکارنے لگے"۔

ہم کہتے ہیں جن تو دوسرے علماء کے پاس بھی مسائل دریافت کرنے کے لیے آتے ہیں اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے پھر اس میں حضرت علی کی کیا خصوصیت ہے؟ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ حضرت علی کا مقام اس سے بہت بلند تھا اور اگر یہ واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا تو اس سے حضرت علی کی عظمت وجلالت میں کوئی قدح وارد نہیں ہوتی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ کے ائمہ معتزلہ اولیاء کی کرامات کے منکر ہیں۔ جو شخص صلحاء و اولیاء سے صدور کرامات کا انکار کرتا ہے وہ مکابرہ کا ارتکاب کرتا ہے مگر تقوی کا انحصار کرامات پر نہیں جو شخص زیادہ متقی ہو خدا کے نزدیک زیادہ باعزت وہی ہے اگرچہ اس سے ایک کرامت بھی صادر نہ ہوئی ہو۔

حضرت علی جامع فضائل تھے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"فضائل کی تین قسمیں ہیں (۱) نفسانی (۲) بدنی (۳) اور خارجی۔

حضرت علی فضائل سہ گانہ کے جامع تھے۔ چنانچہ آپ زہد اور علم و حکمت کے حامل تھے یہ نفسانی فضیلت ہے۔

آپ میں عبادت و شجاعت کے اوصاف پائے جاتے تھے آپ صدقہ بھی دیا کرتے تھے یہ بدنی اوصاف ہیں۔

خارجی اوصاف یعنی حسب و نسب میں آپ عدیم المثال تھے۔ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر جو خواتین جنت کی سردار ہیں آپ کے نکاح میں تھیں خطیب خوارزم حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالے نے حضرت علی و فاطمہ کا نکاح ساتوں آسمانوں کے اوپر پڑھا دیا تھا۔ خطبہ جبریل نے پڑھا۔ میکائیل واسرافیل دونوں گواہ تھے اللہ تعالے نے جنت کے درخت طوبیٰ کو حکم دیا کہ اس پر جتنے جواہرات ہیں وہ سب نچھاور کر دے۔ چنانچہ طوبی نے حکم کی تعمیل کی جنت کی حوروں نے وہ جواہرات اٹھالیے"۔

ہم کہتے ہیں جو امور ایمان و تقوی سے خارج ہوں صرف ان کی وجہ سے کسی کی عظمت و فضیلت عند اللہ ثابت نہیں ہوتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عربی کو عجمی پر تقوی کے بغیر کوئی فضیلت حاصل نہیں"۔

آپ سے جب دریافت کیا گیا کہ سب لوگوں سے زیادہ باعزت کون ہے تو آپ نے فرمایا "جو سب سے زیادہ متقی ہو"۔ صحابہ نے عرض کیا ہم یہ نہیں پوچھتے۔ آپ نے فرمایا تو پھر سب سے باعزت حضرت یوسف علیہ السلام تھے جو خود نبی، نبی کے بیٹے، نبی کے پوتے اور نبی کے پرپوتے تھے۔ حضرت ابراہیم خدا کے نزدیک حضرت یوسف سے زیادہ باعزت تھے تاہم نسب کے اعتبار سے حضرت یوسف بنی آدم میں عدیم النظیر تھے اگر دو شخص ہوں ان میں ایک کا والد نبی ہو اور دوسرے کا کافر مگر وہ طاعت و تقوی میں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں تو جنت میں دونوں کا درجہ مساوی ہوگا۔ مگر دنیوی احکام اس سے مختلف ہیں مثلاً امامت و خلافت نیز زوجیت و شرف اور صدقہ کی حرمت وغیرہ۔ اشراف میں جو بھلائی پائی جاتی ہے وہ نسب کے ہیٹے لوگوں میں موجود نہیں ہوتی۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں۔

"اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ"

اللہ تعالے نے حضرت آدم و نوح اور آل ابراہیم و آل عمران کو سب جہانوں سے چن لیا۔

(سورت آل عمران۔ ۳۳)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ

(الحدید۔ ۲۶)

ہم نے نوح و ابراہیم کو مبعوث کیا اور ان کی اولاد کو نبوت اور کتاب عطا کی۔

نیز فرمایا۔

اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (سورۃ ھود۔ ۴۶)

یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے اس کے اعمال اچھے نہیں۔

جس طرح علویہ میں نیک و بد ہر قسم کے آدمی موجود ہیں۔ دوسری جانب یہود کو دیکھئے انبیاء کی اولاد میں سے ہونے کے باوجود مورد غضب الٰہی بنے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا (لقمان۔ ۳۳)

اس دن سے ڈرتے رہو جب والد اپنی اولاد کے کسی کام نہیں آئے گا اور نہ ہی اولاد اپنے جننے والے کے کسی کام آئے گی۔

ہم جب کہتے ہیں کہ عرب عجمیوں کی نسبت افضل ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں میں جو خیر و تقوی اور فضائل و محاسن پائے جاتے ہیں وہ عجمیوں میں موجود نہیں۔ ابوداؤد میں آنحضور سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ اسی طرح نہ گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کالے کو گورے پر۔ فضیلت صرف تقوے سے حاصل ہوتی ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہوئے تھے"

سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

"اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے کبر و غرور اور آباء و اجداد پر فخر کرنے کو تم سے دور کر دیا ہے۔ انسان دو ہی قسم کے ہوتے ہیں (۱) مومن متقی (۲) فاسق و فاجر"

اس بات میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت علی کمال کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ نزاع و جدال صرف اس بات میں ہے کہ حضرت علی خلفاء ثلاثہ سے افضل و اکمل اور امامت و خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔ شیعہ مصنف نے جو دلائل ذکر کیے ہیں ان سے اس کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔

افضلیتِ شیخین کے اثبات کے دو طریقے

فضیلت کے اثبات کے لیے علماء کے یہاں دو طریقے رائج ہیں۔

(۱) ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص کی فضیلت دوسرے پر صرف نقل کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قلبی حقائق کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا لہٰذا وہی جانتا ہے کہ دونوں میں سے افضل کون ہے۔

(۲) فضیلت معلوم کرنے کا دوسرا طریقہ بعض علماء کے نزدیک نظر و استدلال ہے اہلسنت کے نزدیک مندرجہ بالا دونوں طریقوں سے خلفاء ثلاثہ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

پہلا طریقہ جس سے اصحاب ثلاثہ کا افضل ہونا المنشرح ہوتا ہے نقل و اجماع ہے یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کی افضلیت پر شیعہ کو چھوڑ کر پوری امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ جہاں تک افضلیت شیخین کے بارے میں نصوص کا تعلق ہے وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو اپنے عصر و عہد کے مشہور راست گفتار تھے کہ ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کہا کرتے تھے۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر ہیں پھر عمر"۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ "پھر یہ بات آنحضور تک پہنچ جاتی اور آپ اس کی تردید نہ فرماتے"۔

باقی رہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ کہ حضرت عثمان حضرت علی سے بڑھ کر عالم قرآن تھے البتہ حضرت علی حدیث نبوی میں زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں عثمان اپنے مال کے ساتھ جہاد کرنے میں پیش پیش تھے اور علی جہاد بالنفس میں ان سے آگے تھے۔ حضرت عثمان حکومت و سلطنت سے بے نیاز تھے اور علی مال و دولت سے ان کا قول ہے کہ سیرت عثمان کا پلڑا حضرت علی کی سیرت سے مقابلۃً بھاری ہے حضرت عثمان عمر میں حضرت علی سے بتیس سال زیادہ بڑے تھے۔ اس بات پر صحابہ کا اجماع قائم ہو چکا ہے کہ حضرت عثمان حضرت علی افضل تھے۔ ان دلائل سے حضرت عثمان کی افضلیت واضح ہوتی ہے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علی آنحضور سے قرابت داری کی بنا پر افضل تھے۔
ہم کہتے ہیں سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سابقین اولین صحابہ میں شامل تھے وہ نسباً حضرت علی کی نسبت آنحضور سے قریب تر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حدیث نبوی کے مطابق سید الشہداء بھی تھے۔ نظر بریں وہ حضرت علی سے افضل ہوں گے
شیعہ حضرت عثمان کو مورد طعن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے فلاں فلاں کام کیے اپنے اقارب کو عہدے عطا کیے اور بے دریغ بیت المال کی دولت اڑائی۔
ہم کہتے ہیں حضرت عثمان نے بنا بر اجتہاد جو کام کیے وہ مصلحت سے قریب تر تھے۔ حضرت عثمان نے بیت المال کا روپیہ خرچ کیا تھا مگر حضرت علی نے ہزار دل جانیں تلف کیں۔ ظاہر ہے کہ مال کا معاملہ اتنا شدید نہیں جتنا خون کا ہے۔
یہی وجہ کہ خلافت عثمانی میں امن و سکون کا دور دورہ تھا اس دور میں مسلمانوں کو بڑی فتوحات حاصل ہوئیں اور کثرت سے مال غنیمت مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ تاہم خلافت عثمانی کے مقابلہ میں خلافت صدیقی و فاروقی یقیناً بہتر تھیں۔ یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ جن لوگوں نے حضرت عثمان کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا انہوں نے آپ کو فاسق قرار دیا تھا کافر نہیں۔ بخلاف ازیں حضرت علی کے مخالفین نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ حضرت علی و عثمان کے خلاف خروج کرنے والے دونوں گروہ نیکی و بھلائی سے یکسر بیگانہ تھے۔

اَلْفَصْلُ الرَّابِعُ

ائمہؒ اثنا عشرہ کی امامت کا اثبات

شیعہ مصنّف لکھتا ہے۔

"ہم کئی طریقوں سے بارہ اماموں کی امامت ثابت کرتے ہیں۔ اس کا پہلا طریق نص ہے۔ چنانچہ شیعہ تمام بلاد و امصار میں خلفاً عن سلفٍ نقل کرتے چلے آئے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسین سے کہا: "یہ خود امام۔ امام کا بھائی اور امام کا بیٹا ہے اس کی نسل سے نو امام ہوں گے امام قائم کا نام میرا نام اور کنیت بھی میرے جیسی ہو گی۔ وہ زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ جور و استبداد سے بھر چکی ہو گی"۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ شیعہ پر بہتان ہے۔ تمام شیعہ نے یہ بات نہیں کہی بلکہ یہ بعض شیعہ کا قول ہے۔ اکثر شیعہ خصوصاً زیدیہ اس کو اسی طرح جھوٹ سمجھتے ہیں جیسے اہل سنت۔ زیدیہ کا فرقہ تمام شیعہ فرقوں میں زیادہ دانشمند صاحب علم اور مقابلۃً بہتر ہے اسمٰعیلیہ کے نزدیک بھی یہ جھوٹ ہے۔ شیعہ کے تقریباً ستر فرقے ہیں۔ مذکورہ بالا نظریہ متاخرین شیعہ کی اختراع ہے۔ یہ اس وقت گھڑا گیا جب حسن بن علی عسکری نے (بلا وارث) وفات پائی اور آنحضور کی وفات کے اڑھائی سو (۲۵۰) سال بعد یہ دعویٰ کیا گیا کہ امام عسکری کا بیٹا غائب ہو گیا ہے۔ دوسری جانب علماء اہل سنت اور ناقلین آثار جو شیعہ سے کئی گنا زیادہ ہیں جانتے ہیں کہ یہ رسول کریم پر عظیم بہتان ہے بلکہ اس پہ مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

تواتر کی شرط یہ ہے کہ کسی روایت کے ناقلین کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ طرفین اور وسط کے لوگوں کو یقینی علم حاصل ہو جائے۔ حسن عسکری کی موت سے پہلے کوئی شخص امام منتظر

کا قائل نہ تھا البتہ شیعہ حضرت علی اور بعد میں آنے والے ائمہ کی امامت کے دعویدار تھے۔ بارہ اماموں کی امامت کا دعویٰ جن کا آخری امام ہنوز معدوم ہے۔ متقدمین میں سے کسی نے نہیں کہا تھا اور نہ کسی ناقل نے اسے نقل کیا۔ پھر تواتر کا دعویٰ کس حد تک صحیح ہے؟ بخلاف ازیں متواتر وہ اخبار احادیث ہیں جو خلفائے اربعہ کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔

کہا گیا ہے کہ شیعہ امامیہ نے پہلی مرتبہ حضرت علی کی امامت کے اثبات میں بالنص کا دعویٰ خلافت راشدہ کے آخری دور میں کیا۔ عبداللہ[1] بن سباء اور اس کے ہمنواؤں نے اسے اختراع کیا تھا۔ اس بارے میں ہم حتمی طور پر جانتے ہیں کہ وہ اپنی امامت کے منصوص علیہا ہونے کے دعویٰ دار نہ تھے۔ مثلاً امام جعفر صادق ان کے والد اور ان کے دادا امام زین العابدین علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم یہ اپنی امامت کو مبنی بر نص نہیں قرار دیتے تھے۔

---

[1] بارہ اماموں کی امامت کو نص کے ساتھ ثابت کرنے میں شیعہ کے دعویٰ کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) حضرت علی کی امامت وولایت کی نص۔ امام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں اس کے ابطال کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت علی نے نص صریح کے مطابق اپنے بیٹے حسن کو امام مقرر کیا تھا ہم قبل ازیں اس کا بطلان ثابت کر چکے ہیں ۱۲

(۲) شیعہ کا دوسرا دعوی یہ ہے کہ حضرت علی کا وصی ہونا نص سے ثابت ہے۔ مشہور شیعہ عالم الکشی نے اعتراف کیا ہے کہ اس عقیدہ کا موجد عبد اللہ بن سباء تھا ہم قبل ازیں یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں ۱۲

(۳) شیعہ کا تیسرا دعوی یہ ہے کہ چند معدود معین اشخاص کو بالتعیین امام مقرر کیا گیا تھا۔ یہ عقیدہ شیطان الطاق رافضی کی ایجاد ہے مشہور شیعہ عالم المامقانی تنقیح المقال میں الکشی سے نقل کیا ہے کہ شیطان الطاق نے کہا کہ میں امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر تھا اسی دوران شیعہ زیدیہ کے امام زید بن علی تشریف لائے اور مجھے کہا اے محمد بن علی! تمہارا دعوی ہے کہ آل محمد میں ایک معین امام موجود ہے جو واجب الاطاعت ہے میں نے کہا آپ کے والد بھی ان میں سے ایک ہیں انہوں نے کہا پھر میرے والد نے یہ بات مجھ سے کیوں نہ کہی کہ میں امام ہوں؟ بخدا میرے والد کے پاس گرم کھانا لایا جاتا اور وہ اسے ٹھنڈا کر کے میرے منہ میں ڈالتے جب وہ ڈرتے تھے (باقی بر صفحہ ۷۸۳)

بخاری ومسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ لوگ اس وقت تک امن وچین اور عزت سے زندگی بسر کرتے رہیں گے جب تک بارہ آدمی ان کے حاکم دامام رہیں گے پھر آہستہ آواز سے ایک بات کہی جو مجھ سے پوشیدہ رہی۔ جب میں نے اپنے والد سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ بارہ اشخاص سب کے سب قریش میں سے ہوں گے"۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث سے اثنا عشریہ کے بارہ امام مراد نہیں لیے جاسکتے۔ شیعہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی امام کے زمانہ میں بھی امت کا شیرازہ متحد نہ رہا بلکہ امت تفرق وانتشار کا شکار رہی اور ظالموں اور کافروں نے انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا۔ اہل حق ان کے عہد امامت میں یہود سے بھی زیادہ ذلیل رہے مزید براں امام منتظر کی امامت شیعہ کے نزدیک تا قیام قیامت باقی رہے گی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابن عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ آخری زمانہ میں میری اولاد میں سے ایک شخص نکلے گا جس کا نام میرا نام اور جس کی کنیت میری کنیت ہوگی وہ زمین کو اسی طرح عدل وانصاف سے بھر دے گا جیسے وہ ظلم واستبداد سے بھر چکی تھی۔ یہ مہدی ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صہ ۷۸۲) کہ مبادا گرم کھانے سے مجھے نقصان پہنچے تو انہیں یہ خطرہ دامنگیر نہیں تھا کہ اگر میں نے ان کو امام تسلیم نہ کیا تو مجھے جہنم رسید کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ آپ ان کی امامت کا انکار کرکے وعید کے مستحق نہ بن جائیں۔ میں نے یہ واقعہ مجلہ الفتح ماہ شعبان ۱۳۶۶ھ میں نقل کرکے اس پر اظہار حیرت کیا تھا کہ شیطان الطاق کی یہ جسارت کا یہ عالم ہے کہ اس جھوٹ کا اظہار اس نے امام زید اور امام جعفر صادق رحمہما اللہ کی موجودگی میں کیا۔ بنابریں میں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ شیطان الطاق نے یہ عقیدہ بعد ازاں گھڑ لیا تھا"

خروجِ مہدی کی حدیثیں صحیح ہیں

ہم کہتے ہیں خروج مہدی کی حدیثیں صحیح ہیں ان کو احمد و ابو داؤد و ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

"اگر دنیا میں ایک دن بھی باقی رہا تو اللہ تعالے اس دن کو لمبا کر دیں گے یہاں تک کہ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص نکلے گا جس کا نام محمد بن عبد اللہ ہو گا وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا جیسے وہ ظلم وجور سے بھر چکی ہو گی"۔

ترمذی و ابو داؤد یہ روایت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں۔

"مہدی اولاد فاطمہ میں سے ہو گا"۔

ابو داؤد نے یہ روایت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے ذکر کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"وہ سات سال تک زمین کا مالک رہے گا"۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت حسن کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"اس کی نسل سے ایک شخص پیدا ہو گا جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام ہو گا۔ وہ سیرت و کردار میں ان جیسا ہو گا۔ مگر شکل وصورت مختلف ہو گی۔ وہ زمین کو عدل سے معمور کر دے گا"۔

باقی رہی حدیث "لَا مَهْدِیَّ اِلَّا عِیْسٰی"۔ تو وہ ضعیف ہے لہٰذا ان احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والے مہدی کا نام محمد بن عبد اللہ ہو گا۔ اس میں شیعہ کے دعویٰ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ امام منتظر کا نام محمد بن حسن ہے۔

ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام مہدی حسن کی اولاد میں سے ہو گا۔ حضرت حسین کی اولاد میں سے نہیں۔

باطنیہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا امام ہی مہدویت کا بانی تھا۔ حالانکہ اس کا دعویٰ مبنی بر کذب و دروغ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ میمون القداح کی اولاد میں سے تھا۔ پھر باطنیہ نے یہ دعویٰ کیا کہ میمون محمد بن اسمٰعیل بن جعفر کا بیٹا ہے جس کی طرف اسماعیلیہ منسوب ہیں باطنیہ" دراصل کفار ہیں ان کا مذہب مجوسیت فلسفہ اور صابی مذہب کا معجون مرکب ہے

مختلف علماء مثلاً ابن باقلانی و قاضی عبد الجبار و امام غزالی نے ان کے نقائص و معائب پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔

محمد بن عبد اللہ بن تومرت بربری نے اپنے شجرہ نسب کو حسن بن علی سے ملا لیا۔ اور مہدی کا لقب اختیار کیا تھا۔ یہ اپنے آپ کو معصوم کہا کرتا تھا۔ ابن المنصور محمد بن عبد اللہ نے مذکورہ صدر احادیث کی بنا پر مہدی کا لقب اختیار کیا تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

"ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر زمانہ میں امام معصوم کا وجود ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ائمہ کے بغیر اور کوئی معصوم نہیں ہو سکتا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک امام معصوم کا وجود ہر زمانہ میں ضروری نہیں اگر شیعہ کے دعویٰ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہمارے زمانہ میں شیعہ جس امام معصوم کے دعوی دار ہیں وہ چار سو ساٹھ سال سے گم ہے اس کا کوئی نشان ظاہر نہیں ہے۔ بخلاف ازیں امام غائب سے بڑھ کر دوسرے وُلاۃ و حکام کے آثار ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ بنا بریں ہم کہتے ہیں کہ ایسے امام کا وجود و عدم برابر ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ معدوم ہے ہم شیعہ سے دریافت کرتے ہیں کہ ایسے امام سے انھیں قدیم و جدید زمانہ میں کیا مصلحت حاصل ہوئی؟

اَلفَصلُ الخَامِسُ

اصحاب ثلاثہ کے بارے میں شیعہ کی دروغگوئی

شیعہ مصنف لکھتا ہے متعدد وجوہ کی بنا پر

حضرت علی سے پہلے خلفاء امام نہ تھے"۔

شیعہ مصنف کا یہ بیان غلط ہے۔ خلفاء ثلاثہ امام تھے اور ہر لحاظ سے منصب امامت کی اہلیت و صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ ان کی وجہ سے اسلام اکناف ارضی میں پھیلا اور مسلمانوں نے بلاد و اقالیم کو فتح کیا۔ یہ صحیح معنی میں خلفائے راشدین تھے شیعہ کے سوا اس میں مسلمانوں کے سب فرقے متحد الخیال ہیں وہ بہمہ وجوہ اس کے اہل اور حقدار تھے ہمارا یہ حتمی و قطعی نقطۂ نظر ہے کوئی قطعی یا ظنی دلیل اس کی مخالف نہیں ہے۔ جہاں تک قطعی دلائل و نصوص کا تعلق ہے ان میں تناقض کا احتمال نہیں ہے باقی رہے ظنی دلائل تو وہ قطعیات کا معارضہ نہیں کر سکتے۔

قادحین خلفائے ثلاثہ کے مخالف جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں

(۱) وہ ایسے نقلی دلائل ہیں جن کی صحت کا کچھ پتہ نہیں

(۲) یا وہ دلائل بجائے خود صحیح ہیں مگر ان سے خلفاء ثلاثہ کی خلافت کا ابطال نہیں ہوتا دلیل کے دونوں مقدمات میں سے جو مقدمہ بھی معلوم نہ ہو وہ دلائل و مقدمات معلومہ کا معارض نہیں ہو سکتا۔ جب ہم اعتراض کے متعلق ثابت کر دیں کہ واضح اور قطعی نہیں ہے تو جواب دینا ہمارے لیے ضروری نہ ہوگا۔ اگر ہم شیعہ کے شکوک و شبہات کی وجہ فساد و بطلان بھی واضح کر دیں تو یہ علمی اضافہ کا موجب ہے اور مناظرہ کے دوران اس سے حق کی تائید بھی ہو جاتی ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر کا قول ہے بسا اوقات مجھے شیطان کا سامنا ہوتا ہے اگر میں سیدھا رہوں تو میری مدد کیجئے اور اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کیجئے۔ خلیفہ و امام کا اصلی کام رعیت کی تکمیل ہے بنابریں وہ ان سے اپنے کمال کا مطالبہ کیونکر کر سکتا ہے؟"

ہم کہتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں "مجھے ایک شیطان کا سامنا ہوتا ہے اور وہ غصہ ہے جب میں اس میں گرفتار ہو جاؤں تو مجھے اس سے بچائیے"

حضرت ابوبکر نے فرمایا۔

"جب تک میں خدا کا مطیع رہوں میری اطاعت کرتے رہو جب خدا کی نافرمانی کرنے لگوں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں"۔

اس قول کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیق لائق مدح و ستائش ہیں۔ آپ کو یہ خطرہ دامنگیر رہتا تھا کہ غصہ کے عالم میں آپ کسی پر ظلم و تعدی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب قاضی پر غصہ طاری ہو تو وہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ صادر نہ کرے"۔

غصہ سب بنی نوع انسان کو آتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں ایک بشر ہوں اور مجھے بھی اسی طرح غصہ آتا ہے جیسے دوسرے انسانوں کو"۔

(بخاری و مسلم)

صحیح مسلم میں ہے کہ دو آدمی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو ناراض کیا جس کے نتیجہ میں آپ نے ان پر لعنت بھیجی اور سخت سست الفاظ کہے۔ بنابریں جو شخص حضرت ابوبکر کی نافرمانی کرے یا آپ کو تکلیف دے تو آپ کو سرزنش کر سکتے ہیں جس طرح حضرت علی اپنے مخالف کی تادیب و سرزنش کے مجاز ہیں۔

حدیث صحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور نے فرمایا۔

"تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اس کے ساتھی جن کو مسلط کیا گیا ہے صحابہ نے عرض کیا "یارسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی جن ہے"؟ فرمایا "ہاں مگر میں توفیق الٰہی اس سے محفوظ

رہتا ہوں اور وہ مجھے اچھی بات ہی کا حکم دیتا ہے"۔
حدیث صحیح میں حضرت عائشہ سے اسی طرح مروی ہے۔
حضرت ابوبکر کا یہ ارشاد کہ "اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو" آپ کے کمال عدل و انصاف اور تقوی کی دلیل ہے۔
شیعہ کا یہ قول کہ "امام کا کام رعیت کی تکمیل کرنا ہے۔ درست نہیں اس لیے کہ امام و رعیت دونوں باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے اور بر و تقوی میں ایک دوسرے کے معاون ہوا کرتے ہیں۔ جہاں تک کامل بنانے کا تعلق ہے تو وہ خدائے غنی کا کام ہے جو کسی کا دست نگر نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحابہ سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے۔
شیعہ مصنف لکھتا ہے۔
"عمر کا قول ہے ابوبکر کی بیعت ایک عاجلانہ اقدام تھا جس کی برائی سے اللہ نے بچا لیا۔ اگر کوئی شخص پھر ایسا کام کرے تو اسے قتل کر دو۔ یہ قول ابوبکر کی خلافت پر طعن کے مترادف ہے"
ہم کہتے ہیں بخاری و مسلم میں منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
"مجھے پتہ چلا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں اگر عمر فوت ہو چکے ہوتے تو میں فلاں شخص کی بیعت کرتا۔ کوئی شخص دھوکہ میں آکر یوں نہ کہے کہ حضرت ابوبکر کی بیعت ایک عاجلانہ اقدام تھا جو پایۂ انجام کو پہنچا۔ بے شک بات یونہی تھی مگر اللہ نے اس کی برائی سے بچا لیا۔ تم میں سے ایک شخص بھی ابوبکر جیسا نہیں جس کی خاطر گردنیں کٹوائی جائیں"۔
شیعہ مصنف لکھتا ہے۔
"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" (البقرہ ۲-۱۲۴) اس آیت میں بتایا کہ امامت کا عہد ظالم تک نہیں پہنچتا اور ظالم کافر ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا۔ "الْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ" (البقرہ ۲-۲۵۴) (کافر ہی ظالم ہوتے ہیں) آپ کی بعثت سے پہلے بلاشبہ اصحاب ثلاثہ بتوں کی پرستش کرنے والے کافر تھے"۔

شیعہ کا یہ اعتراض کہ خلفائے ثلاثہ پہلے کافر تھے پھر اسلام لائے

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ کفر کے بعد جب کوئی شخص مشرف بہ اسلام ہو جائے تو وہ قابل مذمت نہیں ہوتا اس لیے کہ اسلام لانے سے پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں یہ ایک مسلمہ بات ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلم پیدا ہونے والا شخص نو مسلم سے افضل ہو ورنہ اس کا صحابہ سے افضل ہونا لازم آئے گا۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سب زمانوں سے بہتر قرن اول ہے جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے تھے حالانکہ وہ سب بعد از کفر اسلام لائے تھے مگر اس کے باوجود یہ مسلم پیدا ہونے والوں سے افضل تھے۔ اسی لیے اکثر علماء کا مذہب ہے کہ جو شخص نبی پر ایمان لا چکا ہو اسے نبی بنایا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ" (العنکبوت۔ ۲۶) (لوط اس پر ایمان لائے)

شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

"اگر ہم تمہارے دین سے نجات حاصل کرنے کے بعد پھر اس میں لوٹ گئے تو ہم نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا" (الاعراف۔ ۸۹)

جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے تو قریش میں سے چھوٹا بڑا کوئی بھی مومن نہ تھا اگر ان کے بارے میں یہ بات کہی جائے کہ وہ بتوں کو پوجتے تھے تو ان کے بچے بھی بتوں کے پرستار ہوں گے جن میں علی بھی شامل ہیں۔

اگر کہا جائے کہ بچے کا کفر ضرر رساں نہیں ہے تو ہم کہیں گے کہ بچے کا ایمان بھی مرد بالغ کے ایمان جیسا نہیں ہے۔ کافر جب حالت بلوغت میں ایمان لے آئے تو اسے مومن کہیں گے مگر بچے کے لیے کفر و ایمان کا حکم بلوغت سے قبل بھی ثابت ہو جاتا ہے وہ بچہ جس کے والدین کافر ہوں اس پر اجماعاً دنیا میں کفر کا حکم جاری ہو گا جب بچہ قبل از بلوغ اسلام قبول کر لے تو آیا اسے مسلم تصور کیا جائے گا یا نہیں؟ اس کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔ بخلاف ازیں جب ایک بالغ اسلام لائے گا تو وہ اجماعاً مسلم کہلائے گا۔

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کی جا سکتی کہ حضرت علی نے بت کو سجدہ نہیں

کیا تھا۔ اسی طرح حضرت زبیر کے بارے میں بھی یہ فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا جو اسلام قبول کرتے وقت قریب البلوغ تھے۔ جو شخص پہلے کافر ہو پھر اسلام قبول کر لے اور مومن و متقی بن کر رہے اسے ظالم کہہ کر پکارنا جائز نہیں۔

"لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ امامت کا منصب عادل کو ملے گا ظالم کو نہیں۔ جب کوئی شخص ظلم و تعدی کا مرتکب ہونے کے بعد عادل ہو جائے تو وہ امامت کا اہل ہو سکتا ہے۔ وہ درج ذیل آیات کے مطابق مدح و ستائش کا سزاوار ہوگا۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ (الانفطار-۱۳) (نیک لوگ نعمتوں سے لذت اندوز ہونگے)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ (الدخان-۵۱) (خدا سے ڈرنے والے پر امن جگہ میں ہوں گے)

جو شخص یہ کہے کہ ایک کافر ایمان لانے کے بعد بھی کافر ہی رہتا ہے وہ اجماعاً خود کافر ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر کا قول ہے۔ میری بیعت واپس کردو میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں اگر آپ سچے امام ہوتے تو یوں نہ کہتے"۔

ہم اس کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو بات نقل کی جائے وہ صحیح بھی ہو۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ابوبکر نے اپنی موت کے وقت کہا تھا۔ کاش! کہ میں آنحضور سے دریافت کر لیتا کہ انصار کا بھی خلافت میں حق ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر بذات خود اپنی خلافت کو مشکوک تصور کرتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے ثقیفہ بنی ساعدہ میں خود ہی انصار کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا تھا"۔

ہم کہتے ہیں کہ حضور کا ارشاد گرامی "اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ" حق ہے۔ یہ غلط ہے کہ حضرت ابوبکر اپنی خلافت کو شک و شبہ کی بنا سے دیکھتے تھے۔ نیز شیعہ کی نقل کردہ روایت صریح

کذب ہے یہ بات صحابہ کے نزدیک واضح تھی کہ امامت قریش کے ساتھ مختص ہے۔
اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ حضرت ابوبکر کا قول ہے تو اس سے ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ گویا آپ کو حدیث نبوی "اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ" کا علم نہ تھا۔ آپ نے اجتہاد کیا اور آپ کا اجتہاد موافق نص ثابت ہوا۔ اس قول سے یہ بھی واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر کے پاس امامت علی کے بارے میں آنحضور کی کوئی نص موجود نہ تھی۔

حضرت فاطمہ کی خانہ تلاشی کا واقعہ من گھڑت ہے

شیعہ مصنف لکھتا ہے، "ابوبکر نے اپنی وفات کے وقت حسرت بھرے الفاظ میں کہا تھا کہ اے کاش! میں فاطمہ کے گھر کی تلاشی نہ لیتا اور اے کاش! میں ثقیفہ بنی ساعدہ میں دونوں میں سے ایک کی بیعت کر لیتا وہ امیر ہوتا اور میں وزیر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر نے علی و زبیر کی موجودگی میں حضرت فاطمہ کے گھر کی تلاشی لی تھی اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابوبکر دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے۔"

ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی صحت ثابت کرے۔ ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر نے حضرت علی و زبیر کو کسی قسم کا الم و رنج نہیں پہنچایا تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے حضرت سعد بن عبادہ سے بھی کچھ تعرض نہیں کیا تھا جو آپ کی بیعت کیے بغیر فوت ہو گئے تھے۔ بفرض محال یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے یہ معلوم کرنے کے لیے حضرت فاطمہ کی خانہ تلاشی لی تھی کہ اس میں بیت المال کی کوئی چیز موجود نہ ہو جس کی تقسیم کرنے کا حکم آپ کو دیا گیا تھا۔ وفات کے وقت یہ خیال آیا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔ جہلاء کہا کرتے ہیں کہ صحابہ نے حضرت فاطمہ کا گھر منہدم کر دیا اور آپ کو اس قدر پیٹا تھا کہ حمل ساقط ہو گیا۔ کیا کوئی سلیم العقل انسان باور کر سکتا ہے کہ امت کے چیدہ و برگزیدہ صحابہ نے ایک معمولی بات کی وجہ سے اپنے پیغمبر کی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کیا؟ خدا اس واقعہ کو گھڑنے والے پر لعنت بھیجے اور اس پر جس نے رفض کا عقیدہ ایجاد کیا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جیش اسامہ کو تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ ابوبکر و عمر بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ حضرت علی کو اس لشکر میں اس لیے روانہ نہ کیا تاکہ آپ کے بعد کوئی اور شخص خلافت پر قابض نہ ہو جائے مگر صحابہ نے یہ بات قبول نہ کی"۔

ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی صحت ثابت کرے کسی نقلی دلیل سے استجاج اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب اس کی صحت معلوم ہو جائے مگر یہ روایت صاف جھوٹ ہے۔ ابوبکر جیش اسامہ میں ہرگز شامل نہ تھے البتہ ایک قول کے مطابق حضرت عمر اس میں موجود تھے۔ روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں حضرت ابوبکر کو امام صلوٰۃ مقرر کیا تھا۔ جس روز آپ کی وفات ہوئی حضرت ابوبکر نے صحابہ کو صبح کی نماز پڑھائی تھی آنحضور نے حجرہ کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو صحابہ حضرت ابوبکر کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے تھے آپ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوئے پھر یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت ابوبکر جیش اسامہ میں شامل تھے۔؟

اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کو خلیفہ بنانا چاہتے تو صحابہ آپ کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے صحابہ کرام اللہ و رسول کے سچے اطاعت کیش تھے اور وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے تھے کہ بصراحت آنحضور کے مقرر کردہ خلیفہ کی جگہ از خود کسی اور کو مقرر کر دیں۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر حضرت علی کو خلیفہ بنانا مقصود ہوتا تو آپ مرض الموت میں ان کو امام صلوٰۃ مقرر فرماتے اور ابوبکر کو نماز پڑھانے کی اجازت نہ دیتے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"نبی کریم نے ابوبکر کو کوئی منصب عطا نہیں کیا تھا اس کے برعکس حضرت علی کو ابوبکر پر امیر مقرر کر کے بھیجا تھا"۔

ہم کہتے ہیں ولایت نماز و حج و زکوٰۃ سے بڑھ کر اور کونسی امارت ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ منصب عالی حضرت ابوبکر کو تفویض کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر کے سوا بہت سے

لوگوں کو مختلف علاقوں کی امارت عطا کی گئی تھی۔ مثلاً عمرو بن عاص و ولید بن عقبہ اور ابوسفیان بن حرب۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ ابوبکر سے افضل تھے اور ولایت و امارت نہ ملنے کی وجہ سے ابوبکر ان سے فروتر درجہ کے تھے۔ امارت نہ دینے کی وجہ وجیہ یہ تھی کہ ابوبکر آپ کے وزیر تھے اور آپ مہمات امور میں ان سے بے نیاز نہیں ہوا کرتے تھے۔ حضرت عمر کا مرتبہ بھی اس سے قریب قریب تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

"آنحضور نے ابوبکر کو سورۂ توبہ دے کر روانہ کیا۔ پھر ان کے پیچھے حضرت علی کو روانہ کیا کہ ابوبکر کو واپس مدینہ بھیج دیں۔ جو شخص ایک سورت پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا وہ خلافت و امارت کا اہل کیسے ہوگا؟"

حضرت ابوبکر کی امارت حج کا واقعہ

یہ افترا محض ہے اور روایات متواترہ کے خلاف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ھ میں حضرت ابوبکر کو امیر حج بنا کر مکہ بھیجا تھا۔ یہ غلط ہے کہ آپ واپس بلالیے گئے تھے۔ بخلاف ازیں دوران حج وہ امیر تھے علی ان کے محکوم تھے اور ان کی اقتداء میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجال انکار نہیں۔ پھر شیعہ کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ آنحضور نے حضرت ابوبکر کو واپس بلالیا تھا؟ البتہ مشرکین سے کیے ہوئے معاہدوں کے اختتام کا اعلان کرنے کے لیے آنحضور نے حضرت علی کو روانہ کیا تھا۔ عربوں کے یہاں رسم تھی کہ عہد باندھنے یا توڑنے کا کام حاکم خود کرتا یا اس کے اہل بیت میں سے کوئی شخص یہ کام انجام دیتا۔ بنا بریں اعلان براءت کے لیے حضرت علی کو بھیجا گیا تھا۔[۱]

---

[۱] اس میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ سورۂ توبہ حضرت صدیق کی مدح و ستائش پر متضمن ہے آنحضور چاہتے تھے کہ اس ثناء کا اظہار حج کے موقع پر علی بن ابی طالب کی زبان سے ہو تاکہ خدا کے دشمن ہمیشہ کے لیے شرمسار ہوں اور جب بھی اس پر غور و فکر کریں ان کا مصنوعی دین دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ متقدمین شیعہ میں سے دشمن خدا شیطان الطاق نے بدحواسی دباقی بر صفحہ ۷۹۵)

مقام حیرت ہے کہ شیعہ مصنف آنحضور کے سیرت و سوانح اور عصر و عہد کے واقعات سے نابلد محض ہونے کے باوجود علم و فضل کا دعویدار ہے اس قسم کے لوگوں کو خاموش رہنا زبان سخن دراز کرنے سے بہتر ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو اندھا کر دیا ہو اور اس کی نیت خراب ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ وہ کٹر شیعہ ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"امام جملہ احکام شرع امت کی طرف پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے"۔

ہم کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام شرعی احکام امت کو سکھا دیئے تھے۔ اس لیے امت اس ضمن میں امام کی دست نگر نہیں ہے البتہ امام رسول سے حاصل کردہ احکام کو امت تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق عام شرعی مسائل و احکام سے آگاہ تھے۔ جو مسئلہ معلوم نہ ہوتا وہ صحابہ سے دریافت کر لیتے مثلاً آپ نے میراث جدہ کا مسئلہ صحابہ سے دریافت کیا تھا۔ صحابہ نے بتایا کہ آپ نے جدہ کو ۱/۶ حصہ دیا تھا۔ آپ کا کوئی قول ایسا نہ تھا جو نص سے ٹکراتا ہو۔ البتہ حضرت عمر و عثمان کے بعض اقوال مخالف نص تھے۔ حضرت علی کے مخالف نص اقوال کی تعداد عمر و عثمان کے اقوال کی نسبت زیادہ ہے مثلاً حضرت علی کا یہ قول کہ جس حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴) کے عالم میں کہا کہ یہ الفاظ ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ خدا کے فرمودہ نہیں ہیں۔ جیسا کہ مشہور ادیب جاحظ نے اپنے استاذ ابراہیم نظام و بشر بن خالد سے سن کر بیان کیا۔

(دیکھیے الفصل امام ابن حزم ج ۴ ص ۱۸۱)

متاخرین شیعہ میں سے طاغوت الکاظمیہ نے سو اس راسخہ ہو کر کہا کہ آیت قرآنی "لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ" ابوبکر و عمر کو شامل نہیں بلکہ یہ خالص الایمان لوگوں کے لیے مختص ہے۔

(دیکھیے کاظمی کی کتاب احیاء الشریعۃ فی کتب الشیعہ ص ۶۳-۶۴)

حضرت علی کو سورۃ توبہ دے کر مکہ بھیجنے کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم اور ابوبکر و علی ایک صف میں تھے اور اعداء صحابہ ان کے مدمقابل دوسری جانب ان دونوں کا اتصال دین دنیا میں کسی طرح ممکن نہیں (۱۲ علامہ خطیب) درحقیقت حضرت ابوبکر صدیق کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر الحج بنا کر روانہ فرمایا تھا اس وقت ابھی سورہ توبہ کی یہ آیات نازل نہیں ہوئی تھیں حضرت ابوبکر ابھی اثنائے سفر میں ہی تھے کہ سورہ توبہ کی چالیس آیتیں نازل ہوئیں جس کا اعلان براءت حج میں ہونا ضروری تھا

ابعد الاجلین (عدت وفات اور وضع حمل میں سے جس کی مدت بعید تر ہو) ہے حالانکہ سُبیعہ کی روایت کردہ حدیث صحیحین میں موجود ہے کہ وضع حمل کے بعد آنحضور نے اسے نکاح کی اجازت دیدی تھی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی و ابن مسعود کے اختلافات کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی تھی ان کے بعد محمد بن نصر مروزی نے اس سے زیادہ اختلافات جمع کیے۔ جب کوفہ کے لوگ حضرت علی سے مناظرہ کرتے تو آپ نصوص سے احتجاج کیا کرتے تھے وہ لوگ کہتے تھے ہم نے علی و ابن مسعود کے قول پر عمل کیا ہے چنانچہ ان کے لیے حضرت علی و ابن مسعود کے وہ اقوال جمع کیے گئے تھے جن کو لوگوں نے ترک کر رکھا تھا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"جب ان مسائل میں تم دونوں سے اختلاف کرنے کو اس لیے جائز سمجھتے ہو کہ ان کے خلاف حجت قائم ہو چکی ہے تو باقی مسائل میں بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔"

ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر سے ایسی بات معروف نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سب صحابہ نے قرآن کریم آنحضور سے سن کر لوگوں تک پہنچا دیا تھا لہذا یوں کہنا درست نہیں کہ تبلیغ قرآن حضرت علی کا خاصہ ہے اس لیے کہ قرآن خبر واحد کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عمر نے کہا تھا کہ محمد فوت نہیں ہوئے یہ بات ان کے قلیل العلم ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ عمر نے ایک حاملہ عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی اس سے منع کیا تب عمر نے کہا۔ "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

ہم قبل ازیں دلائل و براہین کی روشنی میں حضرت عمر کا علمی مقام واضح کر چکے ہیں۔ حضرت عمر حضرت ابوبکر صدیق کے بعد اعلم الناس تھے۔ باقی رہا یہ کہ انھوں نے آنحضور کے بارے میں یہ گمان کیا کہ آپ فوت نہیں ہوئے تو یہ ایک لمحہ کے لیے تھا۔ فوری طور پر ان پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں ایسے واقعات حضرت علی کو بھی پیش

آئے تھے کہ انہوں نے ایک رائے قائم کی اور وہ غلط نکلی۔ اس سے ان کی امامت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حضرت عمر کو معلوم نہ تھا کہ وہ عورت حاملہ ہے حضرت علی نے آگاہ کر دیا اس میں حضرت عمر کی کوئی غلطی نہیں۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات حضرت عمر کی تائید و موافقت میں نازل ہوئیں۔ نیز سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے"۔

شہادت پانے کے بعد جب حضرت عمر کو چارپائی پر رکھا گیا تو حضرت علی نے ان کی تعریف فرمائی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ "اے کاش! آخری وقت میں مجھے حضرت عمر کے اعمال کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں پیش کیا جائے"۔

شیعہ کے نزدیک نماز تراویح بدعت ہے

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔ "عمر نے تراویح کی بدعت جاری کی۔ حالانکہ آنحضور نے فرمایا تھا۔ لوگو! رمضان کی راتوں میں نماز باجماعت بدعت ہے۔ چاشت کی نماز بھی بدعت ہے لہٰذا رمضان کی راتوں میں جمع نہ ہوا کرو۔ صلوٰۃ الضحیٰ بھی نہ پڑھا کرو۔ عمر رات کو نکلے تو مساجد میں چراغ جلتے دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم نفلی نماز کے لیے جمع ہوئے ہیں فرمایا "یہ ہے تو بدعت مگر اچھی ہے"۔

ہم کہتے ہیں تمام اسلامی فرقوں میں شیعہ کذب بیانی میں پیش پیش ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ یہ لوگ آنحضور پر بھی افترا پردازی کرتے ہوئے نہیں جھجکتے اور شرم و حیا کے جذبات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ شیعہ اس کی اسناد پیش کرنے اور اس کی صحت کے اثبات سے قاصر ہیں۔ کسی عالم نے اسے روایت نہیں کیا جو شخص علم حدیث سے معمولی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ روایت موضوع اور بے اسناد ہے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ عہد رسالت میں لوگ رمضان کی راتوں میں باجماعت نماز تراویح ادا کیا کرتے تھے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے دو یا تین راتوں میں لوگوں کو باجماعت تراویح کی نماز پڑھائی تھی چوتھی رات لوگ انتظار کرتے رہے مگر

آپ اس لیے مسجد میں نہ آئے کہ یہ نماز فرض نہ ہو جائے اور لوگ اس کے ادا کرنے سے قاصر رہیں۔

بخاری نے عبدالرحمن بن عبدالقاری سے روایت کیا ہے کہ رمضان کی ایک رات میں میں حضرت عمر کے ساتھ مسجد میں گیا تو دیکھا لوگ ادھر ادھر منتشر تھے کچھ لوگ انفرادی طور پر نماز میں مشغول تھے۔ چند آدمی نماز با جماعت ادا کر رہے تھے۔ حضرت عمر نے فرمایا میرا خیال ہے کہ میں ایک قاری کو مقرر کر دوں جس کی اقتداء میں سب لوگ مل کر نماز ادا کیا کریں تو یہ بہتر ہو گا۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابی بن کعب کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ پھر میں ان کے ساتھ دوسری رات نکلا تو لوگ قاری کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے یہ دیکھ کر فرمایا "یہ بڑی اچھی بدعت ہے جس نماز سے تم سو رہتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جو تم ادا کرتے ہو آپ کا مطلب یہ تھا کہ رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

حضرت عمر نے قیام رمضان کو بدعت قرار دیا اس سے مراد وہ بدعت نہیں جو ضلالت ہوتی ہے اس لیے کہ یہ نماز شرعی دلیل کے بغیر نہیں ادا کی گئی تھی۔ اگر قیام رمضان باجماعت کوئی مذموم فعل ہوتا تو آپ کو نہیں اسے بند کر دیتے۔ حضرت علی نے فرمایا تھا۔ "اللہ تعالے حضرت عمر کی قبر کو منور کرے جس نے ہماری مسجدوں کو روشن کر دیا"۔

ابو عبدالرحمن السلمی سے روایت ہے کہ حضرت علی نے رمضان میں قاریوں کو بلا کر ان میں سے ایک قاری کو حکم دیا کہ انھیں بیس رکعات پڑھائے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی انھیں وتر پڑھایا کرتے تھے۔

عرفجہ ثقفی کہتے ہیں کہ حضرت علی قیام رمضان کا حکم دیا کرتے تھے ایک امام آدمیوں کے لیے مقرر کرتے اور ایک عورتوں کے لیے۔ میں عورتوں کا امام ہوا کرتا تھا۔ امام بیہقی نے یہ دونوں روایتیں سنن میں نقل کی ہیں۔ احادیث صحیحہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ضحی کی ترغیب دی ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"عثمان نے بہت سے ناروا کام کیے تھے یہاں تک کہ سب مسلمان آپ پر اعتراض کرنے لگے اور آپ کو قتل کرنے پر متفق ہو گئے"۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ شیعہ کے جہل و افتراء کی کرشمہ سازی ہے۔ لوگوں نے کامل اتحاد اور یگانگت کے ساتھ حضرت عثمان کی بیعت کی تھی اور کوئی شخص بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ بخلاف ازیں بہت سے لوگوں نے حضرت علی کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی۔

یہ جھوٹ ہے کہ لوگ حضرت عثمان کو قتل کرنے کے بارے میں متحد الخیال تھے۔ اگر اہل شر و ظلم نے یہ ارادہ کیا ہو تو وہ الگ بات ہے۔ سابقین اولین صحابہ میں سے کوئی بھی قتل عثمان میں شریک نہ تھا۔ البتہ حضرت علی سے لڑنے اور ان پر طعن و تشنیع کرنے والوں کی تعداد قاتلین عثمان سے کئی گنا زیادہ تھی۔ آپ کے لشکر کے ہزاروں آدمیوں نے آپ کو کافر قرار دیا اور آپ کے خلاف خروج کیا تھا آخر کار حضرت علی نے بھی اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عثمان کی طرح شہادت حاصل کی۔ خدا ان کے قاتل کو غارت کرے۔

اَلْفَصْلُ السَّادِسُ

حضرت ابوبکر صدیق کی امامت و خلافت کے دلائل | شیعہ مصنف رقمطراز ہے

"ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ابوبکر کی خلافت پر اجماع منعقد ہوا تھا۔ اس لیے کہ بنو ہاشم کی ایک جماعت ان کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتی تھی۔ صحابہ میں سے سلمان و ابوذر و مقداد و عمار و حذیفہ و سعد بن عبادہ و زید بن ارقم و اُسامہ و خالد بن سعید العاص ابوبکر کو خلیفہ نہیں مانتے تھے۔ ابوبکر کا والد بھی آپ کی خلافت کا منکر تھا۔ اس نے پوچھا لوگوں نے کس کو خلیفہ منتخب کیا؟ لوگوں نے کہا "تیرے بیٹے کو" اس نے پوچھا۔ "علی و عباس کو کیا ہوا؟" لوگوں نے بتایا کہ وہ آنحضور کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے تھے ابوبکر کو بڑا سمجھ کر لوگوں نے امام بنالیا۔ بنو حنیفہ کا قبیلہ ابوبکر کی خلافت کا منکر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آپ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ابوبکر نے ان کو مرتد قرار دے کر ان کو قتل کیا اور قیدی بنایا۔ عمر نے اس کی مخالفت کی اور اپنی خلافت کے زمانہ میں ان لونڈی غلاموں کو آزاد کر دیا تھا۔"

ہم کہتے ہیں معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی اس حقیقت سے آشنا ہے کہ ایسی بات کہنے والا یا تو جاہل مطلق ہے یا بہتان طرازی کا مرتکب ہے۔ روافض جاہل اور اندھے ہیں جو شخص ان کے افکار و عقائد کے مطابق کوئی بات کہے وہ اسے مان لیتے ہیں خواہ کہنے والا دجال ہی کیوں نہ ہو۔ بخلاف ازیں جو ان کے افکار و معتقدات کے خلاف کوئی بات کہے وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی حق گو کیوں نہ ہو ایسے لوگ کیونکر فلاح پائیں گے اور جو اس مرض کا شکار ہو اس کی عافیت

کی کیا امید کی جا سکتی ہے؟

شیعہ اس آیت کے مصداق ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ (العنکبوت - ۶۸)

اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے یا جب اس کے پاس حق آئے تو اس کی تکذیب کرے۔

اہل سنت بحمد اللہ اس آیت کے مصداق ہیں۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر ۳۳)

جو شخص حق کو لایا اور اس کی تصدیق کی وہی متقی ہیں۔

کیا کسی نے کبھی ایسی بات سنی ہے؟ ہر صاحب علم اس بات سے آگاہ ہے کہ بنو حنیفہ کافر تھے اور مسیلمہ کذاب کی پیروی کرتے تھے۔ مقام حیرت ہے کہ شیعہ کفر پر ان کے اتفاق کو اجماع قرار دے رہے ہے، بنو حنیفہ کو قتل کرنے اور قیدی بنانے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کرنے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں بہتان طرازی اور ہذیان گوئی سے بچائے۔ ایک شاعر کا قول ہے ؎

اِذَا مَحَاسِنِیَ الّٰتِیْ اُدِلُّ بِھَا كَانَتْ ذُنُوْبًا فَقُلْ لِّیْ كَیْفَ اَعْتَذِرُ

جب میرے نیک اعمال جن پر مجھے ناز تھا گناہ بن گئے تو مجھے بتا کہ میں کیسے معذرت کروں

بنو حنیفہ کا ارتداد اور حضرت ابوبکر صدیق

بنو حنیفہ کا قتل اور ان کا قیدی بنانا حضرت صدیق کا عظیم کارنامہ ہے۔ آپ نے عدم ادائیگی زکوٰۃ کی بنا پر ان کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ مسیلمہ پر ایمان لائے تھے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ حضرت علی کے بیٹے محمد بن حنفیہ کی ماں بنو حنیفہ ہی میں سے تھی۔ جن قبائل کے خلاف حضرت صدیق عدم ادائیگی زکوٰۃ کی بنا پر نبرد آزما ہوئے تھے وہ بنو حنیفہ کے علاوہ دیگر قبائل تھے۔ انہوں نے ترک زکوٰۃ کو مباح قرار دیا تھا اس لیے ان کے خلاف جنگ آزمائی کی نوبت آئی۔ امام ابو حنیفہ

واحمد بن حنبل اور دیگر ائمہ کا خیال ہے کہ جب کوئی قوم یہ کہے کہ ہم زکوٰۃ دینے کے لیے تیار ہیں مگر ہم فلاں امام کو نہیں دیں گے تو ان کے خلاف صف آرائی جائز نہیں۔ ہم شیعہ مصنف سے پوچھتے ہیں کہ اس نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہ کرنے والوں میں یہود و بربر اور قیصر و کسریٰ کو کیوں نہ شامل کیا؟ بنو حنیفہ کا معاملہ تاریخ اسلام میں اس قدر مشہور ہے کہ پردہ نشینان حرم بھی اس سے آگاہ ہیں پھر شیعہ کی اس سے بے خبری بڑی حیرت کی موجب ہے۔

سیف بن عمر کی کتاب الردۃ اور الواقدی کی کتاب الردۃ سے سب لوگ واقف ہیں مگر شیعہ ان سے بھی نابلد ہے ورنہ بنو حنیفہ کے ارتداد سے جاہل نہ رہتا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "عمر نے مرتدین کے خلاف جنگ آزما ہونے پر اعتراض کیا تھا" صریح بہتان ہے۔ بلاشبہ حضرت عمر نے اس میں توقف کیا تھا مگر حضرت ابوبکر سے تبادلہ افکار کرنے کے بعد آپ نے اپنے زاویۂ نگاہ سے رجوع کر لیا اور حضرت ابوبکر کے ساتھ متفق ہو گئے تھے۔ شیعہ نے جن صحابہ کا نام لے کر بتایا ہے کہ انھوں نے حضرت صدیق کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ ان پر بہتان ہے ان لوگوں کا بیعت ابوبکر و عمر میں شرکت کرنا اظہر من الشمس ہے البتہ سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی۔ حضرت اسامہ لشکر کے ساتھ اس وقت روانہ ہوئے تھے جب آپ نے حضرت صدیق کی بیعت کر لی تھی۔ خالد بن سعید نبی اکرم کے نائب تھے جب آپ نے وفات پائی تو خالد نے کہا میں اور کسی کا نائب نہیں بننا چاہتا۔ یہ بات تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ سعد بن عبادہ کے سوا سب صحابہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تھی۔

جہاں تک حضرت علی اور دیگر بنو ہاشم کا تعلق ہے ان میں سے کوئی بھی حضرت صدیق کی بیعت کیے بغیر فوت نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک قول کے مطابق انھوں نے چھ ماہ بعد آپ کی بیعت کی تھی۔ دوسرے قول کے مطابق انھوں نے آپ کے انتخاب کے دوسرے دن بخوشی آپ کی بیعت کر لی تھی۔ حضرت سعد کے سوا سب صحابہ نے حضرت فاروق اعظم کی بیعت میں شرکت کی تھی۔ حضرت سعد خلافت فاروقی میں فوت ہوئے تھے۔ سقیفہ

بنی ساعدہ کے روز حضرت سعد نے منصب امامت پر فائز ہونے کا قصد کیا تھا مگر آپ یہ بات معلوم نہ تھی کہ یہ قریش کا حق ہے۔

شیعہ مصنف نے حضرت ابوبکر کے والد ابوقحافہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ باطل ہے ابوبکر عمر میں سب صحابہ سے بڑے نہ تھے۔ آپ عمر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قدرے چھوٹے تھے۔ حضرت عباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سال بڑے تھے۔ ابوقحافہ سے منقول ہے کہ جب سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو مکہ کے شہر پر لرزہ طاری ہوگیا۔ ابوقحافہ نے لوگوں سے دریافت کیا "کیا بات ہے"؟ لوگوں نے بتایا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے۔ ابوقحافہ بولا "بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ ان کے بعد کون شخص خلیفہ قرار پایا"۔ لوگوں نے کہا "تیرا بیٹا"۔ ابوقحافہ بولا "کیا بنو عبد مناف اور بنو مغیرہ اس پر راضی ہوگئے"؟ لوگوں نے کہا "ہاں"۔ ابوقحافہ نے یہ سن کر کہا۔ "جس کو خدا دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے"۔

حضرت علی نے وفات فاطمہ کے بعد ابوبکر کی بیعت کر لی

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر سے مطالبہ کیا کہ مدینہ میں جو مال غنیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا نیز خیبر اور فدک کے خمس میں سے جو مال باقی ہے وہ آپ کی میراث کے طور پر مجھے دے دیں حضرت ابوبکر نے کہا آنحضور کا ارشاد ہے کہ "ہم کسی کو وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے"۔ یہ درست ہے کہ آنحضور کے اہل بیت بسر اوقات کے لیے اس میں سے کھا سکتے ہیں۔ خدا کی قسم میں صدقہ کی تقسیم میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا بلکہ اسے اسی حالت پر رہنے دوں گا جس پر وہ عہد رسالت میں تھا۔ آنحضور کے زمانہ میں جس بات پر عمل کیا جاتا تھا میں اسے کسی قیمت پر ترک نہیں کروں گا ورنہ اندیشہ ہے کہ میں راہ حق سے منحرف ہو جاؤں گا۔

حضرت فاطمہ اس بات سے حقیقت کو پاگئیں اور تادم حیات پھر دوبارہ حضرت ابوبکر سے اس مسئلہ میں گفتگو

آپ کی وفات کے بعد وہ چھ ماہ بقید حیات رہیں۔ جب فوت ہوگئیں تو حضرت علی نے ان کو راتوں رات دفن کر دیا اور حضرت ابوبکر کو اطلاع نہ دی۔

جب حضرت فاطمہ بقید حیات تھیں تو لوگ حضرت علی کا احترام کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد وہ بات نہ رہی مجبوراً آپ نے حضرت ابوبکر سے مصالحت و مبایعت کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ ہنوز آپ نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ حضرت علی نے ابوبکر کو کہلا بھیجا کہ آپ تنہا میرے گھر آئیں۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمر آپ کے ہمراہ نہ ہوں حضرت عمر نے ابوبکر سے کہا آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں۔ ابوبکر نے کہا: "وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے بخدا میں علی کے ہاں ضرور جاؤں گا"۔ حضرت علی نے کلمہ شہادت پڑھ کر کہا ابوبکر! ہم آپ کی خداداد صلاحیتوں سے آگاہ ہیں اور آپ کی امامت و خلافت پر شک نہیں کرتے۔ مگر آپ نے ہم پر زیادتی کی۔ ہم قرابت رسول کی بناء پر اپنے آپ کو خلافت کا حقدار قرار دیتے تھے۔ حضرت علی مصروف گفتگو رہے۔ یہاں تک کہ ابوبکر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت ابوبکر نے حضرت علی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

مجھے اس ذات کی قسم جس کے زیر تصرف میری جان ہے قرابت رسول کا مجھے اپنے رشتہ داروں کی نسبت زیادہ پاس ہے۔ جہاں تک ہمارے مالی تنازعات کا تعلق ہے میں نے ان میں حق سے انحراف نہیں کیا بلکہ آنحضور کو اس ضمن میں جو کچھ کرتے دیکھا وہی کیا"۔

حضرت علی نے فرمایا۔ "میں آج بعد دوپہر آپ کی بیعت کروں گا"۔ حضرت ابوبکر ظہر کی نماز پڑھ کر منبر پر کھڑے ہوئے۔ مسنون خطبہ کے بعد حضرت علی کی عظمت و فضیلت اور بیعت نہ کرنے کی وجہ بیان کی۔ پھر حضرت علی نے تقریر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کے فضائل و مناقب پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ رشک کی وجہ سے میں نے بیعت میں تاخیر نہیں کی تھی۔ نہ میں آپ کے فضائل کا منکر ہوں۔ بات یہ تھی کہ میں اپنے کو خلافت کا اہل خیال کرتا تھا۔ جب ابوبکر خلافت پر فائز ہو گئے تو ہم اس سے ناراض

ہوئے۔ مسلمان یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا "آپ نے ٹھیک کیا"
اس بات سے مسلمان حضرت علی سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

ایک یا دو اشخاص کی مخالفت انعقاد خلافت کے لیے مضر نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ امامت کے لیے جو اجماع معتبر ہے۔ اس میں ایک یا دو آدمیوں کا تخلف ضرر رساں نہیں ہے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو کسی خلیفہ کی امامت و خلافت بھی منعقد نہ ہوتی۔ عام شرعی احکام کے بارے میں جو اجماع منعقد ہوتا ہے اس میں اختلاف ہے کہ آیا ایک یا دو اشخاص کی مخالفت معتبر ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے دو قول منقول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ایک یا دو آدمیوں کی مخالفت معتبر نہیں ہے محمد بن جریر طبری وغیرہ کا قول بھی یہی ہے۔ امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ احکام میں ایک یا دو شخصوں کی مخالفت معتبر ہے۔

جب ایک شخص نص کی مخالفت کرے تو اس کے قول کو شاذ قرار دیا جائے گا۔ مثلاً سعید بن مُسَیَّب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ جس عورت کو تین طلاقیں دی جائیں جب وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے تو صرف نکاح کرنے ہی سے وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔ مزید براں انعقاد خلافت کے لیے صرف ارباب حلّ و عقد اور جمہور کا اتفاق شرط ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جماعت سے وابستہ رہیئے اس لیے کہ جماعت پر اللہ کا فضل و احسان ہوتا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔
"سواد اعظم کا دامن نہ چھوڑیئے۔ جو جماعت سے الگ ہوا وہ الگ ہو کر جہنم میں جائیگا۔"

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابوبکر کی بیعت پر امت کا جو اجماع ہوا تھا وہ حضرت علی کی بیعت پر نہیں ہو سکا تھا۔ ایک تہائی بلکہ اس سے زیادہ لوگوں نے حضرت علی کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی۔ بہت سے اکابر نے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور وہ حضرت علی کے خلاف جنگ آزما نہیں ہوئے تھے اگر امت کے چند افراد کی عدم شرکت سے

کسی شخص کی خلافت میں قدح وارد ہوتی ہے تو حضرت علی کی خلافت جرح وقدح کی زیادہ مستحق ہو گی۔

اگر شیعہ کہیں کہ امامت علی نص سے ثابت ہے لہذا اجماع کی ضرورت نہ تھی۔ تو ہم کہیں گے کہ قبل ازیں ذکر کردہ نصوص سے صراحۃً حضرت ابوبکر کی افضلیت واضح ہوتی ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ صحابہ نے اجماعاً آپ کی بیعت کی تھی اور آپ کو خلیفۂ رسول کا لقب بخشا تھا۔

خلافت صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں دو طرح سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

(۱) پہلا موضوع کلام یہ ہے کہ فی الواقع حضرت ابوبکر منصب خلافت پر فائز ہوئے تھے یا نہیں؟

(۲) دوسرا یہ کہ آپ خلافت کی صلاحیت و اہلیت سے بہرہ ور تھے بھی یا نہیں؟

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے آپ کا خلیفہ ہونا تواتر اور لوگوں کے اتفاق سے ثابت ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ابوبکر نائب رسول تھے۔ آپ نے شرعی حدیں قائم کیں۔ واجب الوصول حقوق وصول کیے۔ کفار و مرتدین کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔ عمال مقرر کیے مال تقسیم کیا اور امیر و خلیفہ سے متعلق جملہ امور انجام دیئے بلکہ وہ اوّلین شخص تھے جو امامت پر فائز ہوئے۔

باقی رہا امر دوم یعنی آپ کا مستحق امامت ہونا تو اجماع کے سوا اور بھی کثیر دلائل موجود ہیں۔ شیعہ جس طریقہ سے بھی امامتِ علی کا اثبات کرتے ہیں ہم اسی طریقہ سے حضرت ابوبکر کا مستحق امامت ہونا ثابت کرتے ہیں۔ بہر کیف اجماع کی حاجت امر اول میں ہے امر دوم میں نہیں۔ تاہم امر ثانی پر بھی اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اجماع کسی مسئلہ پر دلالت کرنے میں اصل شرعی کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے لیے دلیل عقلی یا نقلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک عقلی دلیل کا تعلق ہے کوئی عقلی دلیل امامت پر دلالت نہیں کرتی۔ باقی رہی نقلی دلیل تو اہل سنت کے نزدیک آنحضور نے کوئی امام

مقرر کیے بغیر وفات پائی تھی۔ بنا بریں اگر اجماع منعقد ہوا بھی ہے تو وہ کسی مسئلہ پر دلالت نہیں کرتا"۔

حجیتِ اجماع کی بحث

ہم کہتے ہیں اگر اس قول سے تمہاری مراد یہ ہے کہ ارباب اجماع کے امیر کی اطاعت بذات خود واجب نہیں ہے بلکہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ و رسول کا حکم معلوم ہوتا ہے تو یہ صحیح ہے مگر اس سے ہمارے نظریہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا اس لیے کہ رسول بھی بذات خود مطاع نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ اس کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ اسلام میں مُطاع حقیقی صرف خدا کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف۔ ۵۴)

نیز فرمایا۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام۔ ۵۷)

اور اگر تمہارا (شیعہ کا) مقصد یہ ہے کہ اجماع کبھی حق کے موافق ہوتا ہے اور کبھی مخالف تو یہ حجیتِ اجماع پر طعن ہے۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ پوری امت خطا پر جمع ہو سکتی ہے جیسا کہ نظام اور بعض روافض کا خیال ہے۔ یہ غلط ہے۔ ہم امامت صدیق کے اثبات میں ایسے دعوی کے محتاج نہیں ہیں اور ہمیں شرط لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اجماع سے جو حکم ثابت ہوتا ہے اس پر دلالت کرنے والی نص موجود ہوتی ہے۔ اجماع سے صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فلاں مسئلہ کے بارے میں نص موجود ہے۔

اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ اجتہاد کی اساس پر اجماع منعقد کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مگر نص سب لوگوں سے۔ بلکہ بعض لوگوں کو اس کا علم بھی ہوتا ہے۔ خلافت صدیقی اسی قبیل سے ہے اس کے بارے میں نصوص موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی امامت و خلافت مبنی بر حق و صواب تھی۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف

کا مبنیٰ یہ ہے کہ آیا خلافت کا انعقاد نص خاص کی بنا پر ہوتا ہے یا اجماع کی اساس پر؟
ہمارا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ نص و اجماع باہم لازم ملزوم ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت
قرآنی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران۔ ۱۱۰)

تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی تم نیک کاموں کا حکم دیتے اور برے کاموں
سے روکتے ہو۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر امت پر واجب ہے۔
اس میں قطعی طور پر سب واجبات و محرمات شامل ہیں۔ لہذا امت کو چاہئے کہ واجبات
کو ضروری ٹھہرائیں اور خدا کے محرمات سے لوگوں کو باز رکھیں اور خاموش نہ رہیں۔ پھر حق
کی نقیض باطل کی تائید میں بولنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ نظر بریں اگر حضرت ابوبکر کی خلافت
حرام و منکر ہوتی تو اس سے لوگوں کو باز رکھنا امت پر واجب اور اس سے خاموش رہنا
ناروا ہوتا اور اگر حضرت علی کی اطاعت واجب ہوتی تو یہ ایک بڑی نیکی تھی جس کا حکم
دینا نہایت ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے
روکتے ہیں" (سورۂ توبہ۔ ۷۱)

نیز فرمایا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
(البقرۃ۔ ۱۴۳)

اسی طرح ہم نے تم کو ایک درمیانہ امت بنایا تاکہ تم دوسروں پر نگاہ رکھو۔

جب اس امت کو شاہد کا درجہ دیا گیا ہے تو ان کو یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ وہ
کس بات کی شہادت دیں گے۔ اگر یہ امت خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام اور محرمات کو
حلال قرار دینے والی ہوتی تو اس کو شاہد نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اگر اس امت کے
افراد قابل مدح اشخاص کی مذمت کرتے اور مذموم اشخاص کی مدح میں رطب اللسان ہوتے

تب بھی وہ اس منصب پر فائز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ بنا برایں جب یہ امت حضرت ابوبکر کے استحقاق خلافت کی گواہی دے تو اس کا صادق ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جب یہ بالاتفاق کسی کے نیک یا بد ہونے کی شہادت دیں تو ان کی یہ گواہی قبول کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

جو شخص بھی ظہور ہدایت کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ پر چلے گا تو جدھر کو وہ مڑے گا ہم اس کو اسی طرف موڑ دیں گے اور اسے جہنم رسید کریں گے" (سورۃ النساء-۱۱۵)

اس آیت میں مخالفت رسول اور مومنین کی راہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہ دونوں باتیں مذموم ہیں۔ جب اس امت کے لوگ کسی چیز کی حلت یا حرمت پر متفق ہوں اور کوئی شخص ان کی مخالفت کرے تو اس نے مومنین کے سوا دوسروں کی راہ اختیار کی۔

قرآن پاک میں فرمایا۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران-۱۰۳)

سب مل کر خدا کی رسی کو تھام لو اور فرقے فرقے نہ ہو۔

اگر حالت اجتماع میں بھی مسلمانوں کے درمیان کامل اتحاد و یگانگت موجود نہ ہو تو پھر اجتماع و انتشار میں کیا فرق ہوا؟ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا (المائدہ-۵۵)

اللہ تعالیٰ۔ اس کا رسول اور اہل ایمان تمہارے دوست ہیں۔

اس آیت میں مومنین کی دوستی کو اللہ و رسول کی دوستی کی طرح قرار دیا گیا ہے یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو ضلالت پر جمع نہیں ہونے دیتا۔ اس کے سب سے زیادہ حقدار صحابہ ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کا حضرت ابوبکر کو خلیفہ منتخب کرنا ایک جائز اقدام تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کی تم مدح بیان کرتے ہو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے اور جس کی مذمت

کرتے ہو اس کے لیے دوزخ واجب ہو جاتا ہے۔ تم زمین پر خدا کے گواہ ہو"۔

اجماع پر شیعہ کے اعتراضات

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"اجماع میں سب لوگوں کا قول معتبر ہوتا ہے۔ اور یہ بات موجود نہ تھی۔ اکثر لوگ قتل عثمان پر متفق تھے"۔

ہم قبل ازیں اس کا جواب دے چکے ہیں۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ ارباب حل و عقد کے اجماع میں چند افراد کے شرکت نہ کرنے سے کچھ حرج واقع نہیں ہوتا۔ یہ بات غلط ہے کہ اکثر لوگ حضرت عثمان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ بخلاف ازیں آپ کی قاتل ایک باغی و ظالم جماعت تھی۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"جب غلطی کا صدور ہر شخص سے ممکن ہے تو اجماع میں کذب کے احتمال سے کونسی چیز مانع ہے"؟۔

ہم کہتے ہیں کہ اجماع سے وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو احاد سے نہیں ہوتے بنا بریں فرد واحد کو اجماع کا درجہ حاصل نہ ہو گا۔ مثلاً احاد سے خطا و کذب کا صدور ممکن ہے مگر جب وہ تواتر کی حد کو پہنچ جائیں تو یہ احتمال باقی نہیں رہتا اس کی نظیر یہ ہے کہ جتنے لقمے کھائے جاتے ہیں ان میں سے کسی ایک لقمہ سے بھی سیری حاصل نہیں ہوتی مگر ان کے مجموعہ سے آدمی سیر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تنہا ایک آدمی دشمن کے مقابلہ سے قاصر ہوتا ہے جب چند افراد جمع ہو جائیں تو وہ آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کثرت قوت و علم کی موجب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (البقرۃ۔ ۲۸۲)

(اس لیے کہ اگر ایک عورت بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ایک کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور وہ دو آدمیوں سے دور رہتا ہے"۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ انسان ایک تیر کو با آسانی توڑ سکتا ہے مگر بہت سے تیر

کو توڑنا مشکل ہے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اجماع میں خطا کا امکان ہوتا ہے تو حضرت علی کی عصمت ثابت نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے کہ عصمت علی کا اثبات بھی اجماع کا رہین منت ہے۔ نیز حضرت علی کے سوا دوسرے لوگ بھی معصوم ہو سکیں گے۔ اگر شیعہ اجماع پر معترض ہوں گے تو ان کا ایک مذہبی قاعدہ باطل ٹھہرے گا اور اگر اسے حجت قرار دیں گے تو اصحاب ثلاثہ کی خلافت پر منعقد شدہ اجماع کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ہم وہ نصوص ذکر کر چکے ہیں جن سے امامت علی کا اثبات ہوتا ہے لہذا اس کے خلاف جو اجماع بھی انعقاد پذیر ہوگا وہ غلط ہوگا"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قبل ازیں امامت علی کے اثبات میں شیعہ کے دلائل کا ابطال کر کے اس کے خلاف براہین و دلائل قائم کر چکے ہیں۔ مزید براں ہمارے پیش کردہ دلائل مؤید بالاجماع ہیں۔ بفرض محال اگر کوئی دلیل خلاف اجماع ہوگی تو وہ باطل ہوگی یا اس سے مدعا کا اثبات نہیں ہوگا۔ نص معلوم اور اجماع معلوم کے مابین تعارض ممتنع ہے اس لیے کہ یہ دونوں حجت قطعی ہیں اور قطعیات میں تعارض جائز نہیں ہے ورنہ اجتماع نقیضین لازم آئے گا۔

جس نص کی مخالفت پر پوری امت جمع ہو جائے وہ دوسری نص سے منسوخ ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ امت میں ایک نص معلوم باقی ہو وہ منسوخ بھی نہ ہو اور اس کے خلاف اجماع منعقد ہو جائے۔ حضرت صدیق کی خلافت کے بارے میں نص و اجماع کے وجود سے ان دلائل کا ابطال ہوتا ہے جو شیعہ حضرت علی کی خلافت کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔

شیعہ اقتداء شیخین کی روایت کے منکر ہیں

شیعہ مصنف لکھتا ہے اہل سنت یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "میرے بعد ابوبکر و عمر کی پیروی کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مزید براں یہ ان کی امامت و خلافت پر روشنی نہیں

ڈالتی۔ اس حدیث میں ان کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم فقہاء کی بھی اقتداء کرتے ہیں اس سے ان کا خلیفہ ہونا لازم نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ان میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے اس لیے دونوں کی پیروی ممکن ہی نہیں۔ نیز یہ روایت مشہور حدیث "اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ" کے خلاف ہے"۔

ہم کہتے ہیں یہ روایت شیعہ کی پیش کردہ نص سے بہرحال اقوی ہے۔ یہ روایت امام احمد و ابوداؤد و ترمذی نے نقل کی ہے۔ بخلاف ازیں امامت علی کے اثبات میں پیش کردہ نصوص سب باطل ہیں۔ محدث ابن حزم فرماتے ہیں۔

"ہم نے امامت علی کی نص ایک مجہول راوی سے پائی ہے جو دوسرے مجہول راوی سے نقل کرتا ہے اس کی کنیت ابوالحمراء ہے ہمیں نہیں معلوم وہ کون ہے"۔

اس حدیث میں حضرت ابوبکر و عمر کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ظالم و مرتد نہ تھے کیونکہ ظالم و مرتد دوسروں کا پیشوا نہیں بن سکتا۔ حضرت ابوبکر و عمر کے مابین اختلاف شاذ و نادر مسائل ہی میں پایا جاتا ہے مثلاً اس مسئلہ میں کہ جب میت کا دادا زندہ ہو اور اس کے بھائی بھی بقید حیات ہوں تو ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ نیز یہ مسئلہ کہ مال غنیمت کی تقسیم مساوی طور پر کی جائے گی یا اس میں تفاوت درجات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ حضرت خالد بن ولید کے عزل و نصب میں بھی ان کے مابین اختلاف پیدا ہوا تھا۔ زیر تبصرہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جن مسائل میں ابوبکر و عمر متحد الخیال ہوں۔ ان کی پیروی کرو۔ باقی رہی حدیث اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ تو وہ ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے اس لیے قابل احتجاج نہیں۔

شیعہ مصنف نے یہاں متعدد اعتراضات کیے ہیں چونکہ شیخ الاسلام نے اپنے جواب میں ان اعتراضات کو دہرا دیا ہے لہذا ہم شیعہ کے اعتراضات کو قلم انداز کرکے شیخ الاسلام کے جوابات پر اکتفاء کرتے ہیں۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

ہم شیعہ مصنف کے اعتراضات کے جواب میں کہتے ہیں کہ غار کے واقعہ سے حضرت ابوبکر کی فضیلت

واضح ہوتی ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا جب ہم غار میں تھے تو میں نے دیکھا کہ دشمنوں کے پاؤں ہمارے سر کے اوپر تھے۔ میرے جی میں آیا کہ اگر کفار میں سے کوئی اپنے پاؤں پر نظر ڈالے تو ہم کو دیکھ لے۔ آنحضور نے فرمایا ابوبکر! ان دو آدمیوں کے بارے میں آپ کو کیا خطرہ لاحق ہے جن کا تیسرا خدا ہو۔ معیت کا لفظ اس آیت میں اسی طرح استعمال کیا گیا ہے جیسے اس آیت میں اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ - ۴۶) یہ معیت خاصہ ہے۔

معیت عامہ علم کے ساتھ ہوتی ہے جیسے اس آیت میں وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (الحدید - ۴) (جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

محدث ابن عیینہ فرماتے ہیں۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے ابوبکر کے سوا سب لوگوں کو معتوب کرتے ہوئے فرمایا۔

اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ

(التوبہ - ۴۰)

(اگر تم آپ کی مدد نہیں کرتے تو کچھ مضائقہ نہیں اللہ تعالےٰ نے آپ کی مدد کی تھی۔ جب کافروں نے آپ کو نکال دیا تھا۔ جب آپ دو کے دوسرے تھے)

امام ابوالقاسم سہیلی فرماتے ہیں۔

"یہ معیت خاصہ حضرت ابوبکر کے سوا کسی اور کے لیے ثابت نہیں ہوئی"۔

زیر تبصرہ آیت کی مزید توضیح

"اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ" کے قرآنی الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر چیدہ و برگزیدہ صحابہ میں شامل تھے۔ آپ آغاز بعثت سے لے کر تا وفات آنحضور کے رفیق رہے بلکہ یوں کہیے کہ موت و حیات میں آپ کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"ھَلْ اَنْتُمْ تَارِکُوْا لِیْ صَاحِبِیْ" (کیا آپ میرے ساتھی کو میرے لیے رہنے دیں گے یا نہیں؟)

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا اس وقت میرے والدین اسلام لا چکے تھے۔ ہم پہ کوئی دن ایسا نہ گذرتا جب صبح و شام آنحضور ہمارے گھر میں تشریف نہ لاتے ہوں۔

بخاری میں صلح حدیبیہ سے متعلق جو حدیث مذکور ہے اس میں ہے کہ حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں؟ فرمایا "درست ہے"۔ حضرت عمر نے کہا "پھر ہم ذلت کو کیوں گوارا کر رہے ہیں"؟

آپ نے فرمایا۔ میں خدا کا فرستادہ ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ وہ میرا مددگار ہے۔

حضرت عمر نے کہا۔ کیا آپ ہمیں بتایا نہیں کرتے تھے کہ ہم بیت اللہ پہنچ کر اس کا طواف کریں گے"؟

آپ نے فرمایا۔ یہ ٹھیک ہے۔ "کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ امسال ہی طواف کعبہ کریں گے"؟

حضرت عمر نے کہا۔ "نہیں"۔

آپ نے فرمایا۔ "تو آپ ضرور خانہ کعبہ جا کر اس کا طواف کریں گے"۔

حضرت عمر کا بیان ہے کہ پھر میں ابوبکر کے یہاں آیا اور کہا "کیا محمد رسول اللہ سچے نبی نہیں ہیں"؟ ابوبکر نے کہا۔ "بے شک"۔

حضرت عمر نے کہا۔ "کیا ہم سچے اور ہمارے دشمن جھوٹے نہیں ہیں"؟

حضرت ابوبکر نے کہا۔ "یہ درست ہے"۔

حضرت عمر نے کہا۔ "پھر ہم ذلت کیوں گوارا کریں"؟

حضرت ابوبکر نے کہا۔ "اے انسان! آنحضور خدا کے رسول ہیں اور حکم ربانی کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ خدا ان کا ناصر ہے۔ لہٰذا ان کی رکاب تھام لیجئے۔ بخدا وہ حق پہ ہیں۔

اس قسم کے واقعات کی بنا پہ حضرت ابوبکر کو صدیق کے لقب سے نوازا گیا۔

بخاری میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اے لوگو! ابوبکر کی قدر پہچانو خدا کی قسم اس نے کبھی مجھے الم و رنج نہیں پہنچایا۔

جب ایک سلیم العقل شخص بنظر غائر احادیث نبویہ کو جانچتا پرکھتا ہے تو صدق وکذب اس پر روشن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص حفاظ حدیث کی صف میں شامل ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ کس اعزاز و اکرام کے سزاوار ہیں۔ جو شخص اس میدان میں اترنے کی جرأت نہیں کر سکتا اسے چاہیئے کہ علم حدیث میں دخل اندازی نہ کرے اور اس فن کو ان لوگوں کے لیے چھوڑ دے جو اس کے اہل ہیں جس طرح علم طب و نحو اور نقد و جرح کا کام انہی لوگوں کو تفویض کیا جاتا ہے جو اس میں کامل بصیرت رکھتے ہیں۔

احادیث نبویہ سے حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت کا اثبات

اس سے بڑھ کر یہ کہ محدثین و فقہاء کے سوا جملہ ارباب فنون سے غلطی صادر ہو سکتی ہے۔ محدثین و فقہاء کسی باطل مسئلہ پر جمع ہو سکتے ہیں نہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ قرار دے سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جو شخص بھی زحمتِ فکر و تامل گوارا کرتا ہے اس پر حضرت صدیق کے فضائل روز روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ فضائل آپ کی ذات کے ساتھ مختص ہیں مثلاً یہ آیات و احادیث نبویہ۔

(۱) آیت قرآنی "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا"۔

(۲) حدیث نبوی "اِنَّ صَاحِبَکُمْ خَلِیْلُ اللّٰہِ"۔

(۳) یہ حدیث کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضور کو سب مردوں سے محبوب تر تھے۔

(۴) وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آنحضور نے ایک عورت کو فرمایا کہ اگر مجھے زندہ نہ پاؤ تو ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو۔

(۵) وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو عہد نامہ لکھ کر دیا تھا۔

(۶) وہ حدیث جس میں حضرت ابوبکرؓ کے لقب صدیق کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۷) یہ حدیث "فَهَلْ اَنْتُمْ تَارِكُوْا لِيْ صَاحِبِيْ"۔

(۸) جس حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب عقبہ بن ابی معیط نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے گلے میں چادر ڈالی تھی تو ابوبکر نے آپ کو چھڑایا۔

(۹) جس حدیث میں حضرت ابوبکر کو امام صلوٰۃ اور امیر حج مقرر کرنے کا واقعہ مذکور ہے

(۱۰) وہ حدیث جس میں وفات رسول کے بعد حضرت ابوبکر کے ثبات و استقلال اور امت کی فرمانبرداری کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۱) وہ حدیث جس میں حضرت ابوبکر کے ان اعمال صالحہ کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ نے ایک دن میں انجام دیئے تھے۔

حضرت ابوبکر کے کچھ فضائل ایسے بھی ہیں جن میں حضرت عمر آپ کے سہیم و شریک ہیں چنانچہ یہ احادیث نبویہ ملاحظہ ہوں۔

(۱) حضرت علی سے روایت کہ وہ یہ حدیث کہ آنحضور فرمایا کرتے تھے "میں اور ابوبکر و عمر آئے میں اور ابوبکر و عمر گئے"۔

(۲) وہ حدیث جس میں کنوئیں سے پانی کھینچنے کا ذکر ہے۔

(۳) یہ حدیث کہ "میں اور ابوبکر و عمر اس پر ایمان رکھتے ہیں"۔

یوں تو حضرت علی کے مناقب و فضائل بھی بہت ہیں مگر وہ آپ کے ساتھ مختص نہیں۔ صحاح میں حضرت ابوبکر کے فضائل سے متعلق بیس احادیث مذکور ہیں ان میں سے اکثر میں آپ کے خصائص بیان کیے گئے ہیں۔

بہرکیف حضرت ابوبکر گوناگون اوصاف و محامد کی بنا پر خلیل رسول (آپ کے گہرے دوست) تھے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان میں آپ کا کوئی خلیل موجود ہو۔ اگر حضرت ابوبکر آں حضور کے دشمن ہوتے جیسا کہ روافض کہتے ہیں تو وہ دشمن کی آمد پر ہم و غم کی بجائے فرح و سرور کا اظہار کرتے۔ جب حضرت ابوبکر نے اظہار غم کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نصرت ان کے شامل حال ہے۔

ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ ایک شخص جو ہر طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں ہو دوران سفر اپنی رفاقت کے لیے کیسے شخص کو انتخاب کرتا ہے۔ یہ امر موجب حیرت ہے کہ ایسے نازک حالات میں بقول شیعہ رفاقت کے لیے آپ نے ایسے شخص

کو منتخب کیا جو بظاہر آپ کا دوست اور بباطن آپ کا دشمن تھا جو شخص اپنی رفاقت کے لیے ایسے منافق شخص کو اختیار کرتا ہے وہ حد درجہ غبی اور جاہل ہوتا ہے۔ خدا ان لوگوں پر لعنت بھیجے جو رسول کریم کو جاہل و غبی تصور کرتے ہیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے رفیق سفر بنایا ہو کہ مبادا وہ آپ کے معاملہ کو ظاہر کر دے"۔

ہم کہتے ہیں یہ چند وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر آنحضور سے الفت و محبت کا سلوک کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ حضرت کا مومن و محب رسول ہونا تواتر معنوی کے ساتھ معلوم ہے اور اس کی شہرت حاتم طائی کی سخاوت اور عنترہ کی شجاعت سے بھی زیادہ ہے مگر روافض کے تعصب و عناد کا کیا علاج؟

روافض کے عناد کا یہ عالم ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر و عمر حجرہ نبویہ میں مدفون ہیں۔

شیعہ مصنف نے اس ضمن میں جو کچھ کہا ہے وہ اس کی جہالت کا بین ثبوت ہے خصوصاً واقعۂ ہجرت کے بارے میں اس نے جو ہرزہ سرائی کی ہے وہ بھی اس کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔

ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر غار میں چھپے ہوئے تھے۔ اہل مکہ کو بھی اس کا پتہ چل گیا اور انہوں نے دونوں کو تلاش کرنے کے لیے ہر طرف آدمی بھیج دیئے۔ قریش مکہ نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص دونوں میں سے کسی کو پکڑ لائے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کی حب رسول سے آگاہ تھے۔ اگر حضرت ابوبکر آپ کے دشمن ہوتے تو قریش مکہ آپ کی گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان نہ کرتے۔ مزید براں آپ رات کے وقت نکلے تھے جب کہ کوئی شخص اس سے آگاہ نہ تھا پھر حضرت ابوبکر کو ساتھ لیجانے

کی کیا ضرورت تھی؟ اگر شیعہ یہ کہیں کہ حضرت ابوبکر کو غالباً آپ کے گھر سے نکلنے کا علم تھا تو ہم کہیں گے کہ جس طرح مشرکین مکہ کو آپ کے گھر سے نکلنے کا علم نہ تھا۔ اسی طرح آپ ابوبکر سے بھی اس ارادہ کو پوشیدہ رکھ سکتے تھے۔

سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر کی رفاقت

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے جب ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا ذرا صبر کیجئے۔ آپ میرے ساتھ ہجرت کریں گے۔ بخاری و مسلم میں حضرت براء حضرت ابوبکر سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رات بھر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی اور راستے خالی ہو گئے۔ ہم نے ایک بلند پتھر دیکھا جس کا سایہ تھا ہم اس کے نیچے اتر آئے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے زمین ہموار کی تاکہ آپ سایہ میں آرام کر سکیں پھر میں نے چادر بچھائی اور آپ کو سو جانے کے لیے عرض کیا۔ چنانچہ آپ سو گئے۔ زوال آفتاب کے بعد پھر ہم نے سفر کا آغاز کیا۔ اتنے میں سراقہ بن مالک بھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہم اس وقت سنگلاخ زمین پر تھے۔ میں نے عرض کیا حضور! مکہ والے آگئے۔ فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ آپ نے بددعا فرمائی سراقہ کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ نے کہا میں جانتا ہوں کہ تم دونوں نے میرے حق میں بد دعا کی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ خدا اس سے مجھے نجات دے میں مکہ والوں کو واپس کر دوں گا"۔

آنحضور نے دعا فرمائی تو اس کا گھوڑا زمین سے باہر نکل آیا سراقہ واپس چلا گیا راستہ میں جو شخص ملتا اسے کہتا واپس لوٹ جاؤ اب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ کہا جب مکہ والوں نے مسلمانوں کو تکلیف دی تو ابوبکر عازم حبشہ ہوئے جب برک الغماد کے مقام پر پہنچے تو راستہ میں قبیلہ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا ابوبکر! کہاں جا رہے ہو؟ فرمایا: میری قوم نے مجھے مکہ سے نکال دیا ہے اب میں خدا کی زمین پر چل پھر کر اس کی عبادت کرنا چاہتا ہوں (یہ طویل حدیث ہے)

مزید براں جب آنحضور اور ابوبکر غار میں اقامت گزیں تھے۔ عبدالرحمن بن ابی بکر ان کے پاس خبریں لایا کرتے تھے عامر بن فہیرہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ جب کفار آ گئے تھے اور ابوبکر ان کے پاؤں دیکھتے تھے تو باہر نکل کر نبی کریم کو پکڑا کیوں نہ دیا؟ آنحضور کو تکلیف پہنچانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ خدا کی ذات پاک ہے جس نے روافض کو بصیرت و فراست سے محروم کر دیا۔

شیعہ کا یہ قول کہ "لا تحزن" کے الفاظ ابوبکر کی بے صبری ظاہر کر رہے ہیں"۔

ہم کہتے ہیں کہ شیعہ کے اقوال باہم تناقض ہیں وہ پہلے کہہ چکا ہے کہ نبی کریم نے ابوبکر کو غار میں اپنے ساتھ اس لیے رکھا تھا کہ اگر وہ مکہ میں رہا تو آپ کے راز کو دانشگاف کر دے گا اور اب کہہ رہا ہے کہ وہ ضعیف القلب اور قلیل الصبر تھے۔ بخدا شیعہ کے کس وصف پر رشک کیا جائے وہ علم و فہم دونوں سے یکسر بیگانہ تھے۔

جان لینا چاہیئے کہ مہاجرین صحابہ میں کوئی بھی منافق نہ تھا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ نفاق کا وجود ان میں محال تھا۔ اس لیے کہ مشرکین مکہ قوت و شوکت سے بہرہ ور تھے اور جو شخص مشرف با سلام ہوتا اسے جی بھر کر سزا دیتے۔ اس لیے جو شخص بھی دین اسلام کو قبول کرتا تھا وہ رضائے خداوندی کے لیے یہ خطرہ مول لیتا تھا کسی کے ڈر سے نہیں۔

نفاق کا آغاز اسلام میں مدنی زندگی سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے وہاں جب کفر و شرک پر غلبہ حاصل کر لیا تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے دل میں کجی اور حسد و عناد کا جذبہ موجزن تھا اس لیے وہ دولت ایمان سے بہرہ ور نہ ہو سکے۔ چنانچہ تلوار کے ڈر سے "تقیہ" کے طور پر وہ بظاہر مسلمان ہو گئے مگر دل سے کافر رہے مہاجرین کا معاملہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ انہوں نے دین اسلام کو کسی کے خوف یا جبر و اکراہ کی وجہ سے قبول نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی شان میں فرماتے ہیں۔

"ان تنگ دست مہاجرین کی طرح جن کو ان کے گھربار سے نکالا گیا وہ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ و رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں"۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالاتفاق مہاجرین میں سب سے افضل تھے۔ سب صحابہ

آپ کو خلیفۂ رسول کہہ کر پکارتے تھے ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے مذکورہ صدر آیت میں ان کو صادقین کے لقب سے نوازا ہے تو وہ ضلالت پر جمع نہیں ہو سکتے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ "غمزدہ ہونا حضرت ابوبکر کے ناقص ہونے پر دلالت کرتا ہے"۔ ہم کہتے ہیں آنحضور کے مقابلہ میں سب اہل اسلام ناقص ہیں۔ مزید یہ کہ ہم عصمت ابی بکر کے قائل نہیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (النحل - ۱۲۷)

آپ غم نہ کریں اور جو تدبیریں وہ کر رہے ہیں ان سے دل تنگ نہ ہوں

عام اہل ایمان کے حق میں فرمایا۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا (آل عمران - ۱۳۹) (سستی نہ کرو اور غم زدہ نہ ہو)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (الحجر - ۸۸) (ان پر غم نہ کیجئے)

حُزن ایمان کے منافی نہیں ہے

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ حُزن و ایمان کے مابین منافات نہیں ہے۔

جو شخص حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے یقین وصبر کو دیگر صحابہ کے صبر و یقین کے مشابہ و مماثل قرار دیتا ہے وہ بڑا جاہل آدمی ہے۔ حضرت ابوبکر کے فضائل و مناقب حضرت عثمان سے بہت زیادہ ہیں اس کے باوصف حضرت عثمان نے بے مثال صبر وثبات کا مظاہرہ کیا تھا۔ فتنہ پرداز عناصر نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور آپ کو قتل کرنا چاہا مگر آپ برابر اپنے اعوان و انصار کو ان کے مقابلہ سے روکتے رہے یہاں تک کہ اسی حالت میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

مزید براں "لاتحزن" سے وقوع حُزن لازم نہیں آتا۔ نہی کے الفاظ جہاں کہیں بھی وارد ہوئے ہیں ان سے کہیں بھی یہ لازم نہیں آتا کہ منہی عنہ فعل وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ یہ آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ (الاحزاب - ۱)

ترجمہ :- کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کر۔

(۲) وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـهًا اٰخَرَ (القصص - ۸۸)

خدا کے سوا کسی اور معبود کو نہ پکار۔

(۳) فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (الانعام - ۳۵)

جاہلوں میں سے نہ ہو۔

فرض کیجئے حضرت ابوبکر غمزدہ ہوئے بھی تھے تو محض اس لیے کہ کفار کہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل نہ کر دیں۔ ابن ابی ملیکہ روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضور نے ہجرت فرمائی تو غار ثور کا راستہ اختیار کیا۔ دوران سفر ابوبکر کبھی آپ کے پیچھے چلنے لگتے کبھی آگے جب آپ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا حضور! جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ دشمن عقب سے آپ پر حملہ آور ہو گا تو پیچھے چلتا ہوں اور جب اگلی جانب سے خطرہ محسوس کرتا ہوں تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں۔ جب غار کے قریب پہنچے تو عرض کیا کہ ٹھہریئے! تا کہ میں غار میں داخل ہو کر اس کو صاف کر لوں۔ نافع کا قول ہے کہ ایک شخص نے ابن ابی ملیکہ سے سن کر مجھے بتایا کہ حضرت ابوبکر نے غار میں ایک سوراخ دیکھا اس کے آگے اپنا پاؤں رکھ کر اسے بند کر دیا تا کہ اس میں اگر سانپ یا بچھو وغیرہ ہو تو آنحضور کی بجائے ابوبکر کو کاٹے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث بیان فرمائی کہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے والدین و اولاد سب سے مجھے عزیز تر نہ سمجھے"۔ تو ابوبکر بے حد غمزدہ ہوئے جب آپ نے وجہ پوچھی تو بتایا "میں اس لیے مغموم ہوں کہ شاید میری وجہ سے آنحضور کو کوئی تکلیف پہنچ جائے۔ اور میرا ایمان ہی جاتا رہے"۔ یہ حدیث اس بات کی آئینہ داری کرتی ہے کہ حضرت ابوبکر آنحضور کے ساتھ کس قدر گہری محبت رکھتے تھے۔

قرآن کریم میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا۔

اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللّٰہِ (سورہ یوسف - ۸۶)

ترجمہ:- میں خدا کے حضور اپنے الم و رنج کا اظہار کرتا ہوں۔

شیعہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر انتہائی غم وہم کا اظہار کیا تھا اور شب و روز "بیت الاحزان" (غم خانہ) میں گذارا کرتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہل اپنے طور پر کسی کی مدح کرتا ہے در اصل وہ مذمت ہوتی ہے۔ اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ ابوبکر کو اپنے قتل کیے جانے کا غم تھا تو ہم کہیں گے ——— اس سے حضرت ابوبکر کا مومن ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ لازم آتا ہے کہ آپ قریش کے دشمن تھے اندرونی طور پر ان کے دوست نہ تھے۔ ورنہ ان سے خائف رہنے کی وجہ نہ تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لخت جگر ابراہیم کی وفات پر فرمایا تھا "اے ابراہیم! ہمیں تیری جدائی کا صدمہ ہے"۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حزن مباح ہے۔ نصوص سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ "اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ" کے الفاظ سے ابوبکر کا ایمان ثابت نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ "صاحب" رفیق اور ساتھی کو کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ایماندار ہو۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ وَھُوَ یُحَاوِرُہٗ (سورہ کہف) اس آیت میں صاحب کا لفظ مطلق ساتھی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

ہم جواباً کہتے ہیں یہ درست ہے کہ صاحب کا لفظ عام ہے۔ قرآن کریم کی آیت "وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ" اس کی روشن دلیل ہے۔ تاہم سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ" میں صاحب کا لفظ محب مخلص کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت ابوبکر کا یقین و ثبات

شیعہ مصنف کا یہ اعتراض کہ آیت کریمہ "فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْمُؤْمِنِیْنَ" میں واضح طور پر اہل ایمان کو سکون و اطمینان کا مورد قرار دیا گیا ہے مگر آیت زیر تبصرہ میں یہ صراحت موجود نہیں"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ابوبکر کے لیے جداگانہ طور پر نزول سکینت کے اظہار کی ضرورت نہیں اس لیے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع و مطیع اور رفیق و مصاحب تھے اور اللہ تعالیٰ معیت دونوں کو حاصل تھی۔ بنا بریں جب متبوع کو سکون و اطمینان اور ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی تو لازماً تابع بھی اس میں شریک ہوگا۔

چونکہ حضرت ابوبکر کو صاحب کے لقب سے نوازا گیا ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ اور ہر حال میں آنحضور کے وابستۂ فتراک رہا کرتے تھے۔ خصوصاً ایسے نازک وقت میں جبکہ دوستی نباہنا بڑا مشکل ہوتا ہے تو اس سے بطریق دلالۃ النص واضح ہوتا ہے کہ ابوبکر نصرت و تائید ربانی کے وقت بھی آنحضور کے ساتھ شریک و سہیم ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جس موقع پر آنحضور کو تائید و نصرت سے نوازا گیا آنحضور کے بعد اسی قسم کے حالات میں تائید ربانی حضرت صدیق کے شامل حال ہوئی اسی بنا پر جمیع صحابہ میں حضرت ابوبکر یقین و ثبات میں سب سے آگے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابوبکر کے ایمان کو کرۂ ارضی پر بسنے والے سب انسانوں کے ایمان کے ساتھ تولا جائے تو ابوبکر کا ایمان بڑھ جائے گا۔"

سنن میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کیا تم میں سے کسی نے آج خواب دیکھا ہے؟ ایک صحابی نے کہا میں نے دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک ترازو اترا جس میں آپ اور ابوبکر کو تولا گیا تو آپ بڑھ گئے پھر ابوبکر و عمر کو تولا گیا تو ابوبکر والا پلڑا جھک گیا۔ پھر عمر و عثمان کو تولا گیا تو عمر والا پلڑا جھک گیا پھر ترازو کو اٹھا لیا گیا۔"

آیت وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى سے شیعہ کا استدلال

ہم شیعہ مصنف کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ آیت قرآنی وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ابوالدحداح سے متعلق ہے اور حضرت ابوبکر سے

نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ سورت مکی ہے اور ابوالدحداح کا واقعہ بالاتفاق مدینہ منورہ میں پیش آیا اگر کسی مفسر نے یہ کہا بھی ہے کہ یہ آیت ابوالدحداح کے بارے میں نازل ہوئی تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ آیت ابوالدحداح کے واقعہ کو بھی شامل ہے۔ بعض صحابہ و تابعین جب کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی تو اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کو شامل ہے اور اس کے حکم پر دلالت کرتی ہے۔ بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت دو مختلف اسباب کی بنا پر دو مرتبہ نازل ہوئی ہے۔

امام ابن حزم حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر کے بارے میں نازل ہوئی۔ ثعلبی نے بھی سعید بن مسیب سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ محدث ابن عُیَینہ عروہ کے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے سات ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جن کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں ستایا جاتا تھا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

بلالؓ۔ عامر بن فہیرہؓ۔ نہدیہؓ۔ بنتؓ نہدیہ۔ زنیرہؓ۔ ام عمیسؓ۔ بنی مومل کی ایکؓ لونڈی۔

زنیرہ رومی الاصل اور بنی عبدالدار کی مملوکہ تھیں جب اسلام لائیں تو ان کی بصارت جاتی رہی۔ لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ لات و منات نے اسے اندھا کر دیا زنیرہ نے کہا میں لات و منات کو معبود نہیں تصور کرتی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ان کو دوبارہ قوت بینائی عطا فرمائی۔ حضرت ابوبکر نے جب بلال کو خریدا تو وہ پتھروں میں دبے ہوتے تھے۔ ان کے مالک نے کہا اگر کوئی شخص مجھے ایک اوقیہ بھی دے تو میں بلال کو فروخت کر دوں گا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا اگر آپ ایک سو اوقیہ بھی طلب کریں تو میں دے کر انہیں خرید لوں گا۔ فرماتے ہیں اسی ضمن میں مذکورہ صدر آیت نازل ہوئی۔

جب حضرت ابوبکر ایمان لائے تو اس وقت آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے وہ سب آپ نے راہ خدا میں صرف کر دیئے۔ مزید براں کوئی شخص اس بات کا قائل

نہیں کہ ابو الدحداح پوری امت میں سے سب سے بڑے متقی تھے۔ بلکہ عشرہ مبشرہ اور دیگر صحابہ بالاتفاق ان سے افضل تھے۔ لہٰذا ان مفسرین کا قول زیادہ قرین صحت وصواب ہے جو کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس لیے آپ امت بھر میں اَتقی واکرم تھے۔

احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی شخص کے مال سے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا ابوبکر کے مال سے ہوا۔"

بخاری شریف میں آیا ہے کہ آنحضور مرض الموت میں گھر سے نکلے مسجد میں آئے اور منبر پر بیٹھ کر فرمایا۔

"کسی شخص نے اپنی جان ومال سے مجھ پر اتنا احسان نہیں کیا جتنا ابوبکر نے۔ اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا مگر دین اسلام کی بنا پر جو دوستی استوار کی جائے وہی اچھی ہے۔ مسجد کی جانب کھلنے والی سب کھڑکیاں ابوبکر کی کھڑکی کے سوا بند کر دی جائیں۔ (بخاری)

امام ترمذی نے بروایت صحیحہ حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صدقہ کا حکم دیا۔ اتفاق سے میرے پاس مال موجود تھا میں نے کہا اگر میں کبھی صدقہ دینے میں ابوبکر سے بڑھ سکا تو وہ آج ہی کا دن ہوگا۔ چنانچہ میں نے آدھا مال لا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آنحضور نے پوچھا گھر میں کیا چھوڑا؟ عرض کیا حضور! اس کے برابر۔ ابوبکر نے اپنا سب مال لا کر بارگاہ نبوی میں حاضر کر دیا۔ آنحضور نے پوچھا ابوبکر! گھر میں کیا باقی رکھا؟ عرض کیا "اللہ ورسول"۔

حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے کہا آئندہ میں کبھی آپ کا مقابلہ نہیں کروں گا۔

امام شافعی امام اشعری اور ابن حزم رحمہم اللہ نے سورۃ الفتح کی آیت "قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ" (الفتح: ۱۶) سے امامت ابوبکر پر احتجاج کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ آیت کریمہ۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ (توبہ۔۸۳)

میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ میں شرکت نہ کرنے والوں کے بارے میں یہ حکم دیا گیا ہے

اس آیت کے مضمون پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ قتال کے داعی و محرک آنحضور نہیں بلکہ آپ کے خلیفہ و نائب ہیں جو ابوبکر و عمر ہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے آنحضور کے بعد فارس و روم کے خلاف جنگیں لڑیں۔ ان کے نزدیک سورہ الفتح میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ توبہ میں بھی انہی سے خطاب کیا گیا ہے اسی بنا پر یہ دلیل محل نظر و تامل ہے یہ مسلمہ بات ہے کہ سورہ الفتح بالاتفاق صلح حدیبیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضمن میں کھل کر گفتگو کی اور بڑی تفصیل سے اپنا زاویۂ نگاہ واضح کیا ہے فرماتے ہیں یہ آیت حضرت علی کی لڑائیوں کو شامل نہیں اس لیے کہ آیت زیر تبصرہ کے الفاظ ہیں "تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ"۔ حالانکہ حضرت علی جن لوگوں کے خلاف صف آرا ہوئے تھے وہ بنص قرآن مسلم تھے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (الحجرات - ۹)

اس آیت میں قتال و بغی کے باوجود لڑائی میں شرکت کرنے والے فریقین کو مومن اور ایک دوسرے کے بھائی قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا۔

"ان کے ذریعہ اللہ تعالے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائیں گے"۔

چنانچہ اسی طرح وقوع پذیر ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصالحت کے سلسلہ میں حضرت حسن کی مساعی جمیلہ اللہ تعالیٰ کو جنگ و قتال کی نسبت عزیز تر ہیں۔

غزوہ بدر سے ابوبکر کے فرار کا واقعہ جھوٹ ہے

شیعہ مصنف کا یہ بیان کہ "ابوبکر متعدد مرتبہ غزوات سے بھاگ گئے تھے"۔ کذب و دروغ و فریب دہی پر مبنی ہے۔ غزوہ بدر سے پہلے آنحضور اور ابوبکر نے کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ پھر بھاگے کب اور کہاں؟۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر کسی لڑائی سے نہیں بھاگے تھے۔ غزوہ احد میں بھی حضرت ابوبکر ان لوگوں میں تھے جو ثابت قدم رہے تھے۔ البتہ حضرت عثمان سے جو لغزش ہوئی تھی وہ بدلیل نص بیان کی جا چکی ہے۔ حضرت ابوبکر ان لوگوں میں تھے جو غزوہ حنین میں ثابت قدم

رہے تھے۔ اگر حضرت ابوبکر بزدل ہوتے تو آنحضور غزوۂ بدر کے سائبان میں آپ کو شرف رفاقت سے مشرف نہ کرتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ بدر میں مشغول دعا و مناجات تھے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا "حضور! یہ دعا کافی ہے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر عزم و ثبات و قوت ایمان و ایقان کا زندہ پیکر تھے نیز یہ کہ آنحضور اور ابوبکر اصحاب بدر میں سب سے افضل تھے حالانکہ دونوں نے لڑائی میں عملی حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ لڑائی میں عملی حصہ لینے والا نہ لڑنے والے سے افضل ہو۔

امام ذہبی فرماتے ہیں۔

"اگر رافضی مصنف یہ کہتا ہے کہ ابوبکر بزدل تھے اور لڑائیوں سے بھاگ جایا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ مفلس و قلاش تھے۔ وہ درزی تھے۔ ان کی پشت پناہی کے لیے کوئی قبیلہ نہ تھا۔ ان کا خاندان بنی عبد مناف اور بنو مخزوم کی طرح معزز نہ تھا یا یہ کہ ان کے خدم و حشم نہ تھے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ سابقین اولین صحابہ نے کس کے سامنے گردن تسلیم خم کی اور اسے خلیفۂ رسول کہہ کر پکارا؟ آخر نص شرعی کے سوا کونسی چیز ان کو ابوبکر کے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ اگر ابوبکر سب امت میں افضل نہ ہوتے۔ تو حضرت عمر یوں نہ فرماتے۔

بخدا جس قوم میں ابوبکر جیسا شخص موجود ہو مجھے اس کا امیر مقرر کرنے سے بہتر ہے کہ مجھے تہ تیغ کر دیا جائے"۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"یہ جھوٹ ہے کہ ابوبکر آنحضور پر خرچ کیا کرتے تھے اس لیے کہ ابوبکر مالدار نہ تھے"

ہم کہتے ہیں کہ قطعی و متواتر روایات کا انکار ایک عظیم معصیت ہے ہم شیعہ مصنف سے پوچھتے ہیں کہ آخر کس ثقہ یا ضعیف راوی نے کہا ہے کہ حضرت ابوبکر مفلس آدمی تھے؟

بے شرمی اور ڈھیٹ پن سے حاتم کی سخاوت۔ شجاعت علی۔ علم معاویہ اور حضرت ابوبکر کی تونگری و ثروت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان لوگوں کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا۔ مگر قرآن کریم سے حضرت ابوبکر کی تونگری کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر مسطح کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ جب اس نے واقعۂ افک میں منافقین کا ساتھ دیا تو حضرت ابوبکر نے ان کی مالی امداد بند کر دی۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

"تم میں سے فارغ البال اشخاص اس بات کی قسم نہ کھالیں کہ وہ اپنے اقارب اور مساکین و مہاجرین پر خرچ نہیں کریں گے۔ چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگذر سے کام لیں کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے"۔ (سورۂ نور۔ ۲۲)

یہ سن کر ابوبکر نے کہا "بخدا میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمائے" چنانچہ پھر مسطح کی مالی امداد شروع کر دی۔

سات اشخاص جو غلام تھے اسلام کے جرم میں ان کو پیٹا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ آنحضور نے فرمایا "ابوبکر کے مال سے مجھے جو فائدہ پہنچا کسی اور کے مال سے نہیں پہنچا"۔

جب ہجرت کی تو جتنا مال تھا سب ساتھ لے لیا ایک قول کے مطابق آپ کے پاس اس وقت چھ ہزار درہم تھے آپ اس مال سے تجارت کیا کرتے تھے۔

شیعہ کا یہ جھوٹ کہ ابوبکر ایک پیشہ ور معلم تھے

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ابوبکر ایک پیشہ ور معلم تھے صاف جھوٹ ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہوتا تو اس سے حضرت ابوبکر کی شان میں کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ ابوبکر اگر پیشہ ور معلم ہوتے تو قریش کے بہت سے لوگ لکھے پڑھے ہوتے۔ حالانکہ لکھنے والوں کی قریش میں بڑی قلت تھی

یہ جھوٹ ہے کہ حضرت ابوبکر درزی تھے۔ یہ پیشہ قریش میں بڑا کمیاب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش عام طور سے تہبند باندھتے اور اوپر چادر اوڑھ لیا کرتے تھے۔ اس

لیے کپڑے سینے کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوا کرتی تھی۔ حضرت ابو بکر جب منصب خلافت پر فائز ہوئے تو اس وقت بھی تجارتی مشاغل جاری رکھنا چاہتے تھے مسلمانوں نے بیت المال سے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا تاکہ فارغ البالی سے امور خلافت انجام دے سکیں۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ جب قریش مکہ نے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تو ابوبکر نے ہجرت کا ارادہ کیا۔ جب برک الغماد کے مقام پر پہنچے تو قبیلہ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا ابوبکر! تیرے جیسے آدمی کو نکالا نہیں جاتا نہ وہ خود نکلنا پسند کرتا ہے۔ آپ بے کاروں کو کام پر لگاتے۔ صلہ رحمی کرتے لوگوں کا بار اٹھاتے مہمان نوازی کرتے اور حوادث روزگار میں لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میں آپ کو پناہ دیتا ہوں مکہ میں چل کر اپنے رب کی عبادت کیجیے۔ چنانچہ وہ حضرت ابو بکر کو لے کر مکہ پہنچا قریش نے ابن الدغنہ کو کہا ابو بکر سے کہیے کہ وہ اپنے گھر میں خدا کی عبادت کرے اور اس کا اعلان کر کے ہمیں دکھ نہ پہنچائے ہمیں خطرہ ہے کہ کہیں ہمارے بیوی بچوں کو فتنہ میں مبتلا نہ کر دے" (یہ طویل حدیث ہے)

شیعہ کا یہ قول کہ اگر حضرت ابو بکر خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہوتے تو ان کے بارے میں اسی طرح قرآن نازل ہوتا جس طرح حضرت علی کے بارے میں آیت "هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ" اتری تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں مذکورہ صدر آیت کے نازل ہونے کا ذکر ہے وہ موضوع ہے۔ اگر ہر واقعہ کے بارے میں قرآن کا نازل ہونا ضروری ہوتا تو قرآن بیسیوں بڑی بڑی مجلدات پر مشتمل ہوتا۔

شیعہ کا یہ قول کہ "حضرت ابو بکر کو امام صلوۃ مقرر کرنا عائشہ کا کام تھا" حد درجہ کی افترا پردازی پر مبنی ہے۔

علاوہ ازیں یہ مکابرہ اور انکار متواتر کی بدترین قسم ہے ہم شیعہ مصنف سے اس کی صحت ثابت کرنے اور اس کی اسناد ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ واقعہ

ابن المطہر رافضی کے اساتذہ مثلاً شیخ المفید وکراجکی اور ان کے نظائر و امثال نے بیان کیا ہو جن کی تصانیف جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت صرف ایک نماز سے تعلق رکھتی تھی جس کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا جاسکے۔ اہل علم اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ ہیں کہ حضرت ابوبکر نے حجرۂ نبوی کے پاس کئی روز نمازیں پڑھائی تھیں جہاں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بآسانی قراءت کی آواز سنا کرتے تھے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا امام ہونا آپ سے مخفی نہ تھا۔ یہ بات تواتر سے ثابت ہو چکی ہے کہ آپ آنحضورؐ کی اجازت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے اثبات میں متعدد نصوص موجود ہیں۔

امامتِ ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔

"اپنے والد اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں انھیں ایک تحریر لکھ دوں مجھے ڈر ہے کہ مبادا کوئی خواہش کنندہ اپنی خواہش کا اظہار کرے اور کہنے والا کہے کہ میں خلافت کے لیے موزوں تر ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اہل ایمان ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کر سکتے۔"

آپ کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ جب آپ کو (بنا بر وحی) معلوم ہو گیا کہ اہل ایمان آپ کو بالاتفاق خلیفہ تسلیم کر لیں گے اور آپ کی بیعت پر راضی ہو جائیں گے تو آپ نے دستاویز لکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ آپ پر واضح ہو گیا تھا۔ کہ اہل ایمان آغاز خلافت میں بھی آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کریں گے اور اس وقت بھی آپ کی اطاعت کریں گے جب دنیا سے رخصت ہوتے وقت امت کے بہترین شخص (حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ) کو ان کا امام و خلیفہ مقرر کریں گے۔ خدا کے

ہمارا خاتمہ اصحاب اربعہ کی الفت و محبت پر ہو۔ اس لیے کہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ ۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى الْاِسْلَامِ وَالسُّنَّةِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحَابَتِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔

مترجم عفی عنہ

غلام احمد حریری

ایم۔ اے

دُنیا کا ایک مثالی گروہ

(بقلم محب الدین الخطیب)

ازمنہ قدیمہ میں مثالی گروہ کی تلاش یونان کے مشہور مفکر افلاطون (۴۳۰-۳۴۰ قبل مسیح) اور اس کی کتاب "الجمہوریہ" پھر مشہور حکیم فارابی (۲۶۰-۳۳۹ھ) اور اس کی کتاب "المدینۃ الفاضلۃ" نیز سر ٹامس مور TOMAS'MORE (۱۴۷۸-۱۵۳۵ عیسوی) اور اس کی کتاب UTOPIA سے لے کر تا ہنوز ہر عصر و عہد کے لوگوں میں یہ آرزو پائی جاتی رہی ہے کہ اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ دنیا میں ایک مثالی گروہ موجود ہے تو صلح و جنگ، رنج و راحت اور انسانی زندگی کے مختلف اطوار و احوال میں ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرکے کمال انسانی کے غایت عظمیٰ کو حاصل کر سکیں۔

ازمنۂ قدیمہ سے لے کر تا ہنوز اقوام عالم میں کسی نہ کسی طرح یہ آرزو موجود رہی ہے۔ حکماء ہوں یا شعراء ہر کسی نے اپنے اپنے اسلوب و انداز میں یہ بات لکھی ہے۔ کسی نے شعر کی زبان میں کسی نے نثر میں کسی نے چپکے اور کسی نے علانیہ اس سے بڑھ کر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اولوالعزم انبیاء بھی ایسا معاشرہ پیدا کرنے کے متمنی رہے اور اس کے لیے انہوں نے جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حکماء و علماء بھی ایسے گروہ کے آرزومند رہے۔ غرضیکہ بنی نوع انسان ازابتداء تا ابد سوتے جاگتے ایسے انسانی گروہ کا خواب دیکھتے رہے ہیں اور دیکھتے رہیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ اطراف عریش اور وادیٔ سینا کے

پہاڑی راستوں میں چالیس سال تک بادلوں کو لحاف اور زمین کو بچھونا بنائے گھومتے رہے۔ آپ کا مقصد ایک ایسی مثالی جماعت کو وجود میں لانا تھا جو سنت الٰہی کی راہ پر گامزن، رفق و احتیاط کی خوگر، ایثار و قربانی کے جذبہ سے سرشار اور استقامت و اعتدال کے اوصاف سے بہرہ ور ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اللہ تعالےٰ ان سے راضی ہو جائیں اور وہ اللہ تعالےٰ سے رضامند ہوں مگر موسیٰ علیہ السلام کی تمنا بر نہ آئی اور آپ عالم بقا کو سدھارے۔

چین اور مثالی گروہ ملک چین میں وہاں کے عظیم فلاسفر نے جنم لیا جس کو چینی کُنغ فُوتس کہتے اور انگریز مصنف کانفیوشس (۵۵۰-۴۷۹ قبل مسیح) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکیم مذکور بڑے خلوص سے لوگوں کو مروت اور حسن سلوک کی تعلیم دیتا تھا تاہم وہ اپنی مساعی میں ناکام رہا اور چین والوں کو آسمان کے بیٹے (شہنشاہ) اور دیگر اجرام فلکی مثلاً شمس و قمر و کواکب کی غلامی سے چھڑا نہ سکا۔ چین کے لوگ زمین اور اس کے متعلقات مثلاً پہاڑوں دریاؤں اور نہروں کی عبادت کیا کرتے تھے وہ حکیم مذکور کے کہنے پر اس سے باز نہ آئے خلاصہ یہ کہ کانفیوشس اپنے جملہ مقاصد میں ناکام رہا اور اپنے شہر واپس آکر پھر مروت و حسن سلوک کی تعلیم دینے لگا۔ چنانچہ اس کی کتاب "الحوار" میں تمام تفصیلات موجود ہیں۔ احقر کی فرمائش پر سید محمد مکین چینی نے اس کتاب کا چینی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب المطبعۃ السلفیہ میں چھپ چکی ہے۔

حکمائے یونان کی اس ضمن میں ناکامی حکمائے یونان نے حکمت و تہذیب نفس سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس ضمن میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں اور لیکچر دیئے۔ ان تصانیف و تقاریر میں انہوں نے حد درجہ مبالغہ آمیزی سے کام لیا تھا چنانچہ افلاطون کی کتاب "الجمہوریہ" مبالغہ آمیزی کی روشن ترین مثال ہے۔ الغرض حکمائے یونان اپنے مشن میں کامیاب ہوئے بغیر رخصت ہو گئے۔ اور ان کی قوم نے ان کی دعوت

کو قبول نہ کیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ داعی اور مدعوین میں سے کوئی بھی اس کا اہل نہ تھا۔

مثالی گروہ اور حضرت مسیح علیہ السلام

حضرت مسیح علیہ السلام نے سر زمین فلسطین میں اپنے عوام و خواص اہل وطن کی عقلی تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ اہل فلسطین میں سے بعض لوگ یروشلم کے ہیکل کا قصد کرتے تھے۔ بعض جبل زیتون پر چڑھتے یا جبیرۂ طبریہ کے آس پاس چکر لگاتے یا موضع جلیل کے باغات اور کھیتوں میں آیا جایا کرتے تھے مگر آپ کی مساعی جمیلہ بار آور نہ ہوئیں اور آپ کی دعوت کو اس قدر قلیل لوگوں نے قبول کیا جن کو جماعت کے لفظ سے بھی تعبیر نہیں کر سکتے امت تو در کنار۔

بلاشبہ انسانیت نے آغاز آفرینش سے لے کر مختلف قطعات ارضی میں مثالی گروہ کو صحرائے عرب میں صرف ایک ہی دفعہ قوت و رحمت کے ساتھ حق و خیر کی دعوت دیتے دیکھا ہے۔ تاریخ کا یہ نادرۂ روزگار واقعہ ان تمام لوگوں کے لیے بے حد حیرت و استعجاب کا موجب ہوا تھا جنہوں نے اسے ایک نظر دیکھا خواہ دیکھنے والے رومی ہوں یا فارسی یا آرامی و کنعانی یا کسی اور خطۂ ارضی کے باشندے ہوں۔

اس گروہ کا غیر متوقع ظہور و شیوع اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی اعجوبۂ روزگار تھا اور احوال و اطوار کے لحاظ سے بھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ آج تک تاریخ کا معجزہ تصور کیے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کہاں پیدا ہوئے؟ امم و اقوام کی غفلت کے باوجود انھوں نے کیونکر جنم لیا؟ وہ کس پیام کے حامل تھے؟ وہ پیام کیونکر کامیاب ہوا اور اس کی کامرانی و کامیابی کے وسائل کیا تھے؟

یہ سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جونہی لوگ پہلا سوال کریں گے تو اس کے ساتھ ہی دوسرا سوال ان کے ذہن میں ابھرے گا جس سے پہلا سوال فراموش ہو جائے گا۔ سوالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹے گا جب لوگوں پر یہ حقیقت عیاں

ہوگی کہ اصحاب رسول انسانیت کی طرف حق وخیر کا پیام لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنے اخلاق واعمال اور سیرت وکردار سے وہ پیام لوگوں تک پہنچایا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اصحاب رسول کے معتقدات وافکار ان کے اخلاق واعمال اور ان کی دعوت اس حق پر مشتمل تھی جس کی وجہ سے زمین وآسمان کا نظام قائم ہے۔

جس طرح لوگ صحابہ کے کارہائے نمایاں کے بارے میں ان دنوں پوچھتے تھے جب وہ ظہور میں آ رہے تھے اور ہر آنے والا واقعہ سابقہ واقعہ کو لوح ذہن سے مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح ہم آج بھی حیرت کے عالم میں ان کے اسرار ورموز دریافت کر رہے ہیں حالانکہ ہمارے ماخذ ومصادر قدیمہ کی ایک کثیر مقدار الفسطاط کے مکانات اور مدارس وجوامع کے ساتھ نذر آتش ہو چکی ہے۔ یہ آگ وہاں ۵۴ دن تک جلتی رہی اور اس نے تباہی وبربادی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مزید برآں قدیم کتب کا معتدبہ ذخیرہ مشہور شیعہ ابن العلقمی اور اس کے مشیر ابن ابی الحدید کے زمانہ میں دریائے دجلہ کی موجوں کی نذر ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اسلامی مقبوضات میں سے اندلس کے نکل جانے نیز صلیبی جنگوں اور جہل والخطاط کے باعث بھی اس میں شدید علمی نقصان ہوا۔

مثالی گروہ کے اسباب کمال

بایں ہمہ اذہان وقلوب آج کل انسانی تاریخ کے اس مثالی گروہ کے احوال واعمال کا جائزہ لینے اور ان کے اصلی وجعلی واقعات واخبار کو جانچنے پرکھنے کے لیے بیدار ہو چکے ہیں۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں کونسے عناصر خیر وفلاح پائے جاتے ہیں اور وہ کونسے اسباب ہیں جن کی بنا پر وہ مثالی گروہ قرار پائے۔ اسباب وعوامل کی تلاش وتحقیق کا مقصد وحید یہ ہے تاکہ انسانیت ان کی پیروی کر سکے اور ان کے اخلاق واطوار کو اپنا سکے۔

ہمارے علم اور ایمان کی حد تک صحابہ کے مثالی گروہ کے اسباب کمال میں سے اولین سبب یہ تھا کہ انہوں نے معلم خیر خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے

تربیت حاصل کی تھی۔ مومن تو درکنار ہر صاحب عقل و خرد اس بات کو تسلیم کرے گا کہ صحابہ کی عظمت و فضیلت کی وجہ و جیہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت تھی مگر ہمیں یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام پیغمبر برحق نہیں تھے؟ اور کیا وہ چالیس سال کے عرصہ تک سفر و حضر میں اپنی قوم کی تربیت نہیں کرتے رہے تھے؟ اس کے باوجود موجودہ تورات کی کتاب العدد (۱۴: ۲۶-۲۷) میں لکھا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے موسیٰ و ہارون کو مخاطب کر کے فرمایا میں کب تک بنی اسرائیل کی شریر اور غصہ ناک قوم کو معاف کرتا رہوں گا میں اس جنگل میں بیس سال سے زیادہ عمر کے سب لوگوں کو ہلاک کر دوں گا"۔

بنی اسرائیل اور صحابہ کا موازنہ

اصحاب موسیٰ کے مقابلہ میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت پر غور فرمائیے۔

آنحضور تین صد سے کچھ زائد صحابہ کے ساتھ ان سے تین گنا بہادر و جنگجو قریش کے مقابلہ کے لیے میدان بدر کی طرف نکلتے ہیں جب آپ اس قلیل ترین جماعت کی معیت میں وادی ذفران کے قریب پہنچے تو قریش کے حالات سے آگاہ کر کے ان کے ایمان کو آزمانا چاہا۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکر نے اور پھر حضرت عمر نے آپ کی ڈھارس بندھائی پھر فارس الاسلام مقداد بن عمرو الکندی نے کھڑے ہو کر کہا۔

"یا رسول اللہ! آپ جس طرف جانا چاہیں چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بخدا ہم یوں نہیں کہیں گے جیسے بنی اسرائیل نے کہا تھا۔

"اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ" (سورہ مائدہ)

(تم اور تمہارا رب دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے)

بلکہ ہم یوں کہیں گے "اِنَّا مَعَكُمَا مُقَاتِلُوْنَ" (ہم تمہارے ساتھ مل کر اعداء سے جنگ لڑیں گے) مجھے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول برحق بنا کر مبعوث کیا اگر آپ ہمیں برک الغماد تک بھی لے چلیں تو ہم وہاں جا کر بھی دشمنوں کا مقابلہ کریں گے"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی پھر فرمایا "لوگو! مجھے

مشورہ دو"۔

قبیلہ خزرج کے سردار اور انصار کے عظیم لیڈر سعد بن معاذ نے یہ سن کر کہا۔

"گویا آپ کا اشارہ انصار کی جانب ہے"۔

میدانِ حرب و ضرب میں صحابہ کی شجاعت

آپ نے فرمایا "ہاں"۔

حضرت سعد نے کہا۔

"ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں اور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ جو کچھ خدا کی طرف سے لائے ہیں وہ حق ہے۔ ہم آپ پر اطاعت شعاری و فرمانبرداری کا عہد کر چکے ہیں۔ آپ جس طرف بھی چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ مجھے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا پیام دے کر بھیجا اگر آپ سمندر میں چھلانگ لگانے کا حکم دیں تو سب انصار اس میں کود پڑیں گے اور ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہیں رہے گا ہم جنگ اعداء کو مذموم نہیں سمجھتے۔ دورانِ جدال و قتال ہم صبر و ثبات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ ہمارے رویہ کو دیکھ کر مطمئن ہو جائیں گے۔ بہ توفیق ربانی اب ہمارے ساتھ چلئے"

صحابہ نے اپنے عمل سے اس قول کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

حالتِ امن میں صحابہ کی انصاف پسندی

میدان حرب و ضرب میں صحابہ کی شجاعت و بسالت کا یہ عالم تھا۔ حالتِ امن و امان میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے صحابہ کی انصاف پرستی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

امام احمد نے مُسند میں اور امام ابو داؤد نے سنن میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ دو شخص ایک قدیم ورثہ کے بارے میں جھگڑتے ہوئے بارگاہ نبوی میں پہنچے۔ کسی کے پاس بھی گواہ موجود نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میرے پاس جھگڑے چکانے آتے ہو۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنا نقطہ نظر دوسرے شخص کی نسبت زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کر سکتا ہو اور میں تو اسی طرح اپنا فیصلہ صادر کرتا ہوں جیسے سنتا ہوں۔ یاد رکھیے کہ جس شخص کو میں

اس کے بھائی کا حق دیدوں تو وہ اسے قبول نہ کرے بلکہ یوں سمجھے کہ میں نے دوزخ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اسے دیدیا۔ وہ آگ جلانے والی لکڑی (کرہ بلینی) کی طرح اسے گردن میں ڈالے بروز قیامت بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوگا"۔

یہ سن کر دونوں شخص رو پڑے اور ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ میں نے اپنا حق اپنے بھائی کو دیا۔ آنحضور نے فرمایا۔"اب جا کر قرعہ اندازی کر لو پھر حق کی جانب متوجہ ہو کر دوبارہ قرعہ اندازی کرو۔ پھر ہر شخص اپنے ساتھی کو معاف کر دے"۔

یہ دونوں شخص حق و انصاف پر ایمان لانے میں ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے لطف کی بات یہ ہے کہ ہم ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں عام صحابہ میں سے تھے۔ یہ ان خواص صحابہ میں شامل نہیں جو عشرہ مبشرہ کی طرح نادر فضائل انسانیہ میں معروف و ممتاز تھے اور اس بنا پر انھیں بارگاہ نبوت میں خصوصی تقرب حاصل تھا۔

صحابہ کے اخلاق جلیلہ

جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حق و انصاف پر کاربند رہنے کی تربیت دی اور صحابہ نے جس حد تک آپ کی تعلیمات وارشادات پر عمل کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اخلاق اس مثالی گروہ کے ہر ہر فرد کی رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو انہوں نے منصب قضا عدل و انصاف کے زندہ پیکر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تحویل میں دے دیا۔ حضرت عمر کی یہ حالت تھی کہ کئی کئی مہینے گذر جاتے اور فیصلہ چاہنے والا کوئی شخص آپ کے پاس نہ آتا۔ سچ یہ ہے کہ جو امت بذات خود عدل و انصاف کی خوگر ہو وہ محکمہ قضا کی ناز برداری سے بے نیاز ہے۔

صحابہ کے مثالی گروہ میں جو لوگ نمایاں مقام نہیں رکھتے تھے — اور وہ ایسے لوگ تھے جو شیطان کے ورغلانے سے بعض اوقات ایسے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے جو حد شرعی لگانے کا موجب ہوتا — ان کا یہ عالم تھا کہ بارگاہ نبی میں

پہنچ کر اعتراف جرم کرتے اور بڑے اصرار سے اپنی ذات پر حد شرعی قائم کرنے کی درخواست کرتے۔ یہ تاریخ انسانی کا وہ اعجوبہ ہے جو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ حد شرعی ان کی موت کی متقاضی ہوتی اور اس طرح وہ اپنی جان دے کر گناہ سے پاکیزگی حاصل کرتے۔ نبی کریم چونکہ رحمۃ للعالمین تھے جب اپنے پاکیزہ اصحاب میں ایمان کا یہ بلند درجہ دیکھتے تو شرعی حدود کے اندر رہ کر آپ ہر ممکن کوشش کرتے کہ ان پر حد نہ قائم کی جائے مگر وہ جلد از جلد دنیوی سزا اٹھا کر اخروی عذاب سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے۔

صحابہ کے حق میں ایک شیعہ عالم کی شہادت

زیدیہ یمن کے ائمہ اہلبیت میں سے ایک بڑے امام المنصور باللہ عبداللہ بن حمزہ بن سلیمان بن حمزہ ـــــ جن کی وفات یمن کے شہر کوکبان میں ۶۱۴ھ میں ہوئی تھی ـــــ نے بھی اس نظریہ کا اظہار کیا۔ نویں صدی کے مشہور زیدی عالم سید محمد بن ابراہیم بن علی المرتضیٰ الوزیر المتوفی (۷۷۵۔۔۔ ۸۴۰) نے اپنی کتاب الروض الباسم ج ۱ ص ۵۵۔۵۶ پر ان سے یہ بات نقل کی ہے۔ وہ صحابہ کے اس طبقہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صحابہ میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو دینی معاملات میں سہل انگاری کی بنا پر کبائر خصوصاً زناکاری کا مرتکب ہوتا۔ اس کی وجہ امانت و دیانت کی قلت تھی اس کے باوصف جب ہم ان کے حالات پر نظر غائر ڈالتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ وہ ایسے کام بھی انجام دیتے تھے جو متاخرین میں سے وہی شخص کر سکتا ہے جو ورع و تقوی و خوف خداوندی میں ضرب المثل کی حد تک مشہور ہو اور جس کی الفت و محبت کو تقرب الٰہی کا زینہ تصور کیا جاتا ہو اور وہ یہ ہے کہ صحابہ کا یہ طبقہ رضائے الٰہی کے لیے جان دینے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو دیندار اور متقی لوگوں میں منصب امامت کا اہل ہو۔"

مصنف کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اس مثالی گروہ میں سے جو لوگ گاہے کبائر کے مرتکب ہوا کرتے تھے ان کے اخلاص ایمان اور استقامت علی الحق کا یہ عالم تھا کہ وہ

دیندار اور اہل تقوی لوگوں میں منصب امامت پر فائز ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھے
آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خواص صحابہ کس مرتبہ اور مقام پر فائز ہوں گے - جو
معمولی لغزش سے بھی پاک اور اعلیٰ درجات پر فائز تھے اگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ
وسلم پر رسالت و نبوت کا خاتمہ نہ ہو چکا ہوتا تو یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کا
مرتبہ انبیاء سابقین سے کم نہ ہوتا۔

یہ امر محتاج غور و فکر ہے کہ جو شخص بدکاری کا ارتکاب کرنے والے ادنیٰ صحابہ کے
بارے میں یہ فیصلہ صادر کر رہا ہے کہ وہ منصب امامت کے اہل ہیں وہ علمائے اہلبیت
میں سے ایک عظیم امام ہے اور اپنے قول کی اہمیت سے غافل نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت
سے بخوبی آگاہ تھا کہ صحابہ کے مثالی گروہ میں گناہوں کا ارتکاب کرنے والا طبقہ اپنے اندر
جو ایمان صادق رکھتا تھا اس کی نظیر اقوام عالم میں کہیں بھی موجود نہیں۔ بنابریں امام
مذکور نے اپنے علم کے مطابق اپنی ذات حق و صداقت اور دعوت اسلام کے ساتھ انصاف
کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کیا۔

امام منصور باللہ کے قول پر زیدیہ شیعہ کے مشہور علامہ سید محمد بن ابراہیم الوزیر
نے اپنی کتاب الروض الباسم ج ۱ ص ۵۶ - ۵۷ پر جو تبصرہ کیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے
کتاب کے قاری کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خدارا انصاف کیجئے اور بتائیے
کہ کیا ہم سے پہلے یا دور حاضر میں کسی شخص نے بخوشی خاطر موت کو دعوت دی ہے
اور اپنے جرم کا اعتراف کر کے اپنی جان کو قربان کرنے کے لیے وُلاۃ و حکّام کے دربار
میں حاضر ہوا ہے؟ یہ باتیں غافل کے لیے موجب تنبیہ اور ایک دانا شخص کی بصیرت و
فراست میں اضافہ کی موجب ہیں۔ ورنہ صحابہ کے فضائل و مناقب کے لیے یہ آیت کافی ہے
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران - ۱۱۰) (تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں
کے لیے ظاہر کی گئی ہے)

اس کی تائید آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شہادت سے بھی ہوتی ہے کہ خَيْرُ الْقُرُونِ
قَرْنِی۔ (سب سے بہتر میرا زمانہ ہے) آپ نے یہ بھی فرمایا کہ صحابہ کے علاوہ اگر کوئی اور شخص

احد پہاڑ اتنا سونا بھی خرچ کرے تو صحابہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اسکے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث صحابہ کے فضائل و مناقب میں مروی ہیں۔

اب ہم پھر امت محمد اور امت موسیٰ کے موازنہ کی جانب عود کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت محمدؐ و موسیٰؑ دونوں اولوالعزم انبیاء میں سے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی امت کی تعلیم و تربیت میں جو وقت صرف کیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت و رسالت سے دوگنا تھا۔ مقام حیرت ہے کہ پھر امت محمدی نے یہ مقام کیونکر حاصل کر لیا اور وہ مثالی گروہ کیسے بن گئی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر کرکے ایک ابدی زندگی عطا کر دی ہے فرمایا: "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" (آل عمران ۱۱۰)

اس کے عین برعکس امت موسیٰ کو ملیا میٹ کر دیا گیا جیسا کہ ہم موجودہ تورات کی کتاب العدد (۲۶:۱۴-۲۷) کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں تورات کی نشر و اشاعت کا یہ عالم ہے کہ ہر زبان میں اس کے لاکھوں نسخے چھاپ کر ہر سال تقسیم کیے جاتے ہیں۔

میں پچاس سال کے عرصہ سے تا ہنوز برابر اس سوچ بچار میں مصروف ہوں اور اس ضمن میں علماء کی تحقیقات اور ان کے افکار و آراء کا بامعان نظر مطالعہ کر رہا ہوں تاکہ یہ معلوم کر سکوں کہ اصحاب رسول کو تاریخ انسانیت میں ایک مثالی گروہ بنانے میں اللہ تعالیٰ کی کونسی حکمت و مصلحت مضمر تھی۔

ظہور اسلام سے قبل عربوں کی خصوصیات

میں نے اقوام عالم کے حسب و نسب ان کی خداداد صلاحیتوں اور ان کے اخلاق و اطوار پر ایک نگاہ ڈالی اور یہ دیکھا کہ جب وہ اقوام تہذیب و ثقافت علوم و صناعات اور نظم اجتماعی سے روشناس نہ تھیں اس وقت ان کی کیا حالت تھی۔ فکر و تامل کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلام کا مثالی گروہ جس امت سے تعلق رکھتا ہے وہ قبل از تہذیب اپنی بدویانہ حالت میں دیگر اقوام کی وحشیانہ حالت سے استحکام عقل و فہم نزاکت خیال اور بجودت اخلاق کی بنا پر ممتاز تھی اس امت کی دوسری وجہ امتیاز اس کی زبان تھی جو اپنی بدویانہ حالت میں کرۂ ارضی پر بسنے والے تمام انسانوں کی بدوی عہد کی زبانوں

کی نسبت اعلیٰ وارفع تھی۔ عربی کے سوا دنیا بھر میں جس قدر السنہ رائج ہیں ان کی ترقی اس قوم کے تہذیبی ارتقاء اور صنعتی و عمرانی کی رہین منت ہے اگر کوئی ماہر لسانیات اپنے ہاتھ میں سرخ روشنائی والا قلم لے اور انگریزی یا جرمنی یا فرانسیسی زبان کی کسی ڈکشنری کے ان الفاظ کو کاٹتا چلا جائے جو صنعتی یا علمی یا اقتصادی و فنی ترقی کی پیداوار ہیں اور ابتدائی حالت میں موجود نہ تھے تو بڑی سے بڑی ڈکشنری میں اتنے ہی الفاظ باقی رہیں گے جو عربی کی مشہور ڈکشنری لسان العرب کی بیس[۲۰] مجلدات میں سے نصف جلد کے برابر بلکہ اس سے بھی کم ہوں گے۔

جب عرب تاج و تخت اور بڑے بڑے لشکروں کے وارث بنے اور ان کے یہاں لاتعداد عسکری و اداری و فلسفی و علمی و صناعی اصطلاحات پیدا ہوگئیں تو علمائے لغت نے ان نو پید اصطلاحات کو کتب میں داخل کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصطلاحات جمع کرنے کیلئے انھوں نے مستقل کتابیں لکھیں اور قبل ازیں جمع کردہ لغوی معاجم، اشعار عرب اور حِکَم و امثال کے شواہد سمیت اصلی زبان کی نمائندگی کرتے رہے۔ یہ عربی زبان کے تفوق و براعت کی ایک حسی دلیل اور اس امر کا ایک بین ثبوت ہے کہ جس امت میں سے اس مثالی گروہ نے جنم لیا وہ اپنی انسانیت عکیا اور اقوام غیر سے حسن سلوک حب امن اور مہمان نوازی وغیرہ اخلاق و عادات کے اعتبار سے ممتاز تھی۔

اگر قبائل عرب کے باہمی جنگ و جدل کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ جزیرہ عرب ازمنہ قدیمہ سے لے کر تا ہنوز تمام خطہ ہائے ارضی کی نسبت امن و امان کا دائمی مستقر چلا آتا ہے جو شخص جہاں چاہے عرب بھر میں چلے پھرے رات ہو یا دن جہاں کہیں بھی اسے روشنی کی چمک دمک نظر آئے گی یا دن کے وقت کوئی خیمہ نظر پڑے گا وہاں ہی اس کے لیے بلاقیمت ایک بہترین آرام گاہ موجود ہوگی۔ جس میں ممنون ہوئے بغیر اسے تین دن تک مہمانی کا حق حاصل ہوگا اور میزبان اس پر کوئی احسان نہیں جتلا سکے گا۔ عربوں کے یہاں یہ بات آداب ضیافت میں داخل ہے کہ وہ اس کا نام تک دریافت نہیں کرتے۔

حرام مہینوں کا نظام عربوں کے یہاں پہلے سے رائج تھا۔ ان مہینوں میں متحارب

فریقین جدال وقتال سے باز رہا کرتے تھے۔ حدود حرم میں یہ عالم تھا کہ کبوتر، ہرن اور دیگر شکاری جانور جب حرم میں داخل ہو جاتے تو سال بھر میں ان سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا اگر کوئی شخص ارض حرم میں اپنے والد کے قاتل سے بھی ملتا تو اس سے کچھ چھیڑ چھاڑ نہ کرتا۔

بعثت نبوی کے لیے عربی قوم کا انتخاب

میں کامل وثوق سے کہتا ہوں کہ جس طرح ذات باری نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آخری رسالت کے لیے منتخب کیا اسی طرح عربی زبان کو کتاب حکیم کیلئے چنا۔ اس لیے کہ عربی زبان جمیع السنہ کی نسبت اکمل واغنیٰ ہے۔ بعینہ اسی طرح قادر مطلق نے رسول کریم کو اس قوم میں مبعوث فرمایا جو جملہ اقوام عالم سے بلحاظ حسب ونسب اصدق واکرم اور ان صفات کی حامل تھی جو آپ کی دعوت کے فلاح ونجاح کی کفیل تھیں۔ یہ قوم بہمہ وجوہ اس عظیم امانت کی ذمہ داری سنبھالنے کی اہل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو "خیر اُمّتٍ" کے لقب سے نوازا گیا۔

چنانچہ اس قوم نے اپنی سیرت وکردار، اخلاق واعمال اور احوال وتصرفات سے اسلامی دعوت کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقوام عالم نے شنید سے زیادہ صحابہ کی سیرت کو دیکھ کر رسالت محمدیہ سے شناسائی حاصل کی۔

صحابہ کے اوصاف خصوصی

اصحاب رسول نے جب اسلامی دعوت کو قبول کیا اور دین اسلام سے مشرف ہوئے تو اپنی قوم کے اخلاق وعادات سے بہرہ ور ہونے میں وہ سب مساوی نہ تھے۔ بعض فہم وادراک میں دوسروں پر فائق تھے بعض میں کوئی دوسرا وصف نمایاں تھا۔ بہر کیف اگر ایک صحابی نیکی کی ایک قسم میں ممتاز تھا تو دوسرا صحابی کسی اور نیکی میں اس سے آگے تھا۔ حضرت ابوبکر دعوت اسلامی کے قبول کرنے میں حضرت عمر سے سبقت لے گئے تھے۔ حضرت عمر اسلام کے شدید مخالف تھے تاہم جب انھیں پتہ چلا کہ ان کی بہن اور بھائی مسلمان ہو چکے ہیں اور وہ ان کو پیٹنے کے لیے ان کے یہاں گئے تو حق وصداقت کی ایک آواز ان کے کان تک پہنچی جس نے تعصب کی آگ کو فرو کر دیا اور وہ دو منٹ کے قلیل

عرصہ میں حق کا ساتھ دینے والوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

خالد بن ولید خود رئیس اور رئیس زادہ تھے۔ جنگ احد میں مشرکین مکہ کا ساتھ دیا اور فتح کے نشہ میں سرشار مکہ واپس لوٹے۔ حق کی آواز نے خالد کے کانوں پر دستک دی خالد نے جب اس پر غور کیا تو اسے حق پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باپ کی جاہ و ثروت اور مکہ میں اپنے گھوڑوں کے وسیع اصطبل کو خیرباد کہہ کر دین حق کو قبول کرنے کی نیت سے عازم مدینہ ہوئے۔ راستہ میں عمرو بن عاص اور کعبہ کے کنجی بردار سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں بھی قبول اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے مدینہ جا رہے ہیں جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مکہ نے اپنے جگر پارے تمہاری طرف بھیج دیے ہیں"۔

اقوام عالم میں اخلاق عالیہ کا فقدان

صحابہ کے مثالی گروہ میں ایسے اخلاق عالیہ کی کمی نہیں۔ جبکہ اقوام عالم میں اس کی وہ فراوانی نہیں۔ یہ درست ہے کہ دنیا کی اقوام خیر سے یکسر خالی نہیں تاہم وہ اس ضمن میں اصحاب محمدؐ کی حریف نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ

امام بخاری حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگ حسب و نسب کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے ہیں جو لوگ دور جاہلیت میں سب سے بہتر ہوں وہ اسلام میں بھی سب سے افضل ہوں گے بشرطیکہ وہ دین اسلام کے فہم و شعور سے بہرہ ور ہوں"۔

یہ درست ہے کہ ظہور اسلام سے قبل عرب بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس دور میں کونسا قبیلہ بتوں کی لعنت سے پاک تھا؟ البتہ عربوں نے بت پرستی دیگر اقوام کے بہت عرصہ بعد قبول کی تھی۔ ظہور اسلام سے چند صدیاں پہلے عمرو بن لحی خزاعی کے زیر اثر عربوں نے بت پرستی کا آغاز کیا۔ یہ ایک لمبا واقعہ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ بت پرستی اختیار کرنے سے پہلے عرب ابراہیم حنیف کے مذہب پر چلتے تھے۔ بنو اسمعیل مکہ سے نکل کر جزیرہ عرب کی شمالی جانب دمشق کی دیوار عل

تک پھیل گئے تھے۔

عرب کے کچھ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کے پیرو تھے۔ اس کے اثبات میں ہمارے پاس تاریخی شواہد موجود ہیں۔ عربوں کے یہاں دیگر اقوام کی طرح بت پرستی کے لوازم مثلاً ہیکل، بتوں کے مجاور اور بتوں کو آراستہ کرنے والے رنگ وغیرہ بھی نہیں تھے۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ عرب باقی اقوام کی نسبت دین فطرت سے قریب تر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں ان کی تعریف فرمائی ارشاد ہوتا ہے: "وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" (سورۂ بقرہ - ۱۴۳) (اسی طرح تم کو ایک متوسط امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو) دوسری جگہ فرمایا "يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ انفال - ۶۴) (اے نبی آپ اور آپ کی پیروی کرنے والے مومنوں کے لیے خدا کی ذات کافی ہے) نیز فرمایا "وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ - ۱۰۰) (مہاجرین و انصار میں سے اولین سابقین اور وہ لوگ جنہوں نے نیکی کے کاموں میں ان کی پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ خدا سے راضی ہو گئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے یہ بڑی بھاری کامیابی ہے)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاصابہ ج ۳ ص ۲ طبع سلطان عبد الحفیظ میں زبیر بن بکار سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عمرو بن عاص سے پوچھا۔ دانشمند ہونے کے باوجود تم دیر سے کیوں اسلام لائے؟ عمرو بن عاص نے کہا ہم ایسے لوگوں کے زیر اثر زندگی بسر کر رہے تھے جو عمر میں ہم سے بڑے تھے اور وہ نہایت عقلمند بھی تھے۔ جب آنحضور مبعوث ہوئے تو ہمارے ان اکابر نے آپ کی رسالت کو قبول نہ کیا۔ اس ضمن میں ہم نے بھی ان کی تقلید کی۔ ان کی وفات کے بعد جب ہم بااختیار ہوئے تو غور و فکر کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ دین اسلام حق ہے۔ اسلامی صداقت مجھ پر بھی اثر

کئے بغیر نہ رہی۔ میں ہر معاملہ میں قریش کی فوری امداد کیا کرتا تھا۔ جب اس میں تاخیر ہوئی تو ان کو بھی میرے میلان و رجحان کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک نوجوان کو بھیجا جس نے مجھ سے تبادلہ افکار کیا۔ میں نے کہا "میں تجھے اس خدا کی قسم دیتا ہوں جو تیرا بھی رب ہے اور ان لوگوں کا بھی جو تجھ سے پہلے تھے اور جو پیچھے آئیں گے مجھے یہ بتاؤ کہ آیا ہم ہدایت پر ہیں یا روم و فارس والے؟" اس نے کہا "ہم ہدایت پر ہیں"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ صداقت، امانت و عدالت اور قابل تعریف تعاون کے اوصاف ہم میں زیادہ ہیں۔ میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ معاشی لحاظ سے کون خوشحال ہے؟ اس نے کہا "فارس و روم والے"۔ میں نے کہا "جب دنیا میں وہ ہم سے بہتر ہیں تو ہماری افضلیت کس کام کی؟"۔ میرے دل میں اس وقت یہ بات تھی کہ محمد بعث بعد الموت کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ درست ہے۔ اس طرح نیکوکار کو جزا اور بدکار کو سزا ملے گی۔ میں نے سوچا پھر اس طرح باطل پر اڑے رہنے سے کیا حاصل؟

دور حاضر میں نہ صرف اہل اسلام بلکہ پوری انسانیت کو اصحاب رسول کے فضائل و مناقب، شرف و مجد اور آنحضور کی تربیت کے اثرات معلوم کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ نیز اس امر سے آگاہ ہونا بحد ناگزیر ہے کہ وہ کس منصب رفیع پر فائز تھے جس کی بنا پر وہ انسانی تاریخ میں ایک عدیم المثال مثالی گروہ قرار پائے۔ دور حاضر کا مسلم نوجوان اصحاب رسول کے مثالی گروہ کے اتباع و اقتداء سے اس لیے معذور ہے کہ اسے صحابہ کے صحیح اعمال و احوال تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ جو دل ان مومنین اولین کے بغض سے معمور ہیں۔ انہوں نے دانستہ صحابہ کے حالات کو مسخ کیا۔ ان میں کتر بیونت اور کمی و بیشی کی اور تاویل کر کے انھیں غلط معنی پہنائے۔ حسد و عداوت کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے صحابہ کو نعمت ایمان تک سے محروم قرار دیا۔

جو شخص صدر اسلام کی تاریخ کی تصحیح پر قدرت رکھتا ہے اس کا یہ دینی، قومی اور وطنی فرض ہے کہ وہ اسے افضل العبادات سمجھ کر فوری طور پر اس کام کا بیڑا اٹھائے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو اس عظیم کام کے لیے وقف کر دے۔ تاکہ مسلم نوجوان

کے سامنے سلف صالحین کا ایک بہترین نمونہ موجود ہو جس کی روشنی میں وہ اپنے عہد کی تجدید کر سکیں اور اپنی سیرت و سوانح کو اسی سانچہ میں ڈھال سکیں۔

اس عظیم کارنامہ کو انجام دینے کے لیے بڑے گہرے علمی مطالعہ کی ضرورت ہے اس کی تکمیل کے بعد ہی یہ حقیقت الم نشرح ہو گی کہ خاتم الرسل کے ذریعہ اصحاب رسول کے مثالی گروہ کی تکوین و تخلیق میں کونسا راز مضمر تھا۔ افسوس ہے کہ اس مختصر فصل کی تنگ دامانی اختصاراً بھی ان معانی کی متحمل نہیں ہو سکتی جو تفکیر اور مطالعہ کے دوران ذہن پر وارد ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں اور پر امید ہیں کہ ذہین طلبہ اور مسلم نوجوان اس اہم موضوع کو اپنی تحقیقات و تدقیقات کا عنوان بنائیں گے۔ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مصنّف

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ رحمۃ اللہ علیہ

(۶۶۱ — ۷۲۸ھ)

مُلخِّص

حافظ ابو عبد اللہ محمد بن عثمان الذہبی

رحمۃ اللہ علیہ (۶۷۳ — ۷۴۸)

خاکسار مترجم

غلام احمد حریری۔ ایم۔ اے (عربی) ایم اے (علوم اسلامیہ) ایم او۔ ایل (عربی)

فاضل السنہ شرقیہ، صدر شعبۂ اسلامیات

اسلامیہ کالج لائلپور۔ ۲۹ فروری ۱۹۶۶ء

۶۱۔ ڈی پیپلز کالونی۔ لائل پور